رجسٹرڈ نمبر ان ۲۰۸

جلد (۱۰) شمار (۱)

بھوپال سے ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ...

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

بسم اللہ

ایڈیٹر، نیاز فتحپوری

شمارہ (۱)	جولائی سنہ ۱۹۲۶ء	جلد (۱۰)

ملاحظات

یہ رسالہ دسویں جلد کا پہلا نمبر ہے، گزشتہ مہینے سے نگار کی ترتیب میں جو تھوڑی سی تبدیلی پیدا کی گئی ہے، امید ہے کہ احباب اسے پسند فرمائیں گے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ پبلک کو ان موانع سے کوئی غرض نہیں ہوتی جو کسی شخص کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ حوادث طبیعی کا مقابلہ نہایت دشوار ہے اور انسان کی تمام مساعی ان کے سامنے بیکار ثابت ہوتی ہیں۔ پھر جو لوگ انصاف پسند ہیں، وہ رواداری سے کام لے کر ایک شخص کی مجبوریوں کو نظر رحم سے دیکھتے ہیں، اور جن میں یہ صفت نہیں ہوتی وہ تاریک پہلو کو سامنے رکھکر نکوہش و ملامت پر اتر آتے ہیں۔ مجھے اس دوران میں ان دونوں قسموں کے احباب کے مطالعۂ خیال کا موقع ملا اور خدا کا شکر ہے کہ میں اس امتحان میں ثابت قدم نکلا۔

جس فضا میں نگار کی اشاعت ہو رہی ہے اس میں بہت جلد تبدیلی کی توقع کی جارہی ہے اور اگر اس میں کامیابی ہوگئی تو میں کہہ سکونگا کہ حقیقی معنی میں کامیابی کی طرف پہلا قدم میں نے اٹھایا ہے۔ صراحت کی ضرورت نہیں کہ بجائے قول کے فعل سے کسی امر کو ثابت کرنا زیادہ اچھا ہے۔ اس قدر میں نے اس لئے لکھدیا کہ احباب میری کوششوں کی طرف سے بدگمان نہ ہوں۔

اس رسالہ میں پہلا مضمون "کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے" غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ جناب ابوالمنصور حمید عرصہ سے نگار میں معاشی مضامین لکھ رہے ہیں اور حقیقت یہی ہے کہ ملک کو ایسے مقالات کی سخت ضرورت ہے۔ نگار کی ابتدائی اجرا سے اس امر کا التزام رکھا گیا ہے کہ کم از کم ایک مضمون ضرور اس قسم کا درج رسالہ ہو اور اس وقت تک اس کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ ابوالمنصور حمید جامعۂ عثمانیہ کے طالب علم ہیں اور مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوتی ہے کہ وہاں کے طلبہ اکثر و بیشتر مفید مضامین کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

اور کالجوں کے طلبہ جب مضمون نگاری کی طرف توجہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے "تغزل" و "عشقیہ فسانہ نگاری" کی مشق کرتے ہیں، جو یقیناً تعلیم کا نقص ہے اور اس فضا کے غیر صالح ہونے کا ثبوت ہے جس میں وہ تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

دوسرا مضمون حضرت مجنوں گورکھپوری کا فسانہ "سمن پوش" ہے۔ اس فسانہ کا تعلق مابعد الطبیعیات سے ہے اور اس عہد میں جبکہ "تحقیق روح" کی طرف عام توجہ پیدا ہو رہی ہے، امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔

"پتھر کی موجیں" ہارون احمد صاحب بی اے سی کا نتیجۂ فکر ہے، لیکن اس قسم کے علمی مضامین کے لئے جس قدر سادگی بیان اور صراحت مدعا کی ضرورت ہے وہ اس میں نہیں ہے، امید ہے کہ قابل مقالہ نگار آئندہ کوشش کریں گے کہ وہ اس سے زیادہ سہل طریقے سے اپنے مقصود کو پیش کر سکیں۔

"رودکی" پر جناب صادق ایوبی کا مضمون مشہور مستشرق ڈنی سن راس کے ایک مقالہ کا ترجمہ ہے جو ایشیاٹک جرنل میں شائع ہوا تھا۔ اس زمانہ میں رودکی کے متعلق مختلف مضامین رسائل و جرائد میں نکل چکے ہیں، اس لئے امید ہے کہ ان کے مطالعہ کے وقت اس کو بھی نظر انداز نہ کیا جائیگا کہ بعض بعض حقائق اس کے بہت اہم ہیں۔

"حضرت شیخ حسن محمد چشتی" پر جناب ناظر دہلوی کا مضمون تمام ان خصوصیات کا حامل ہے جو فاضل مضمون نگار کے تمام مضامین میں پائی جاتی ہیں، اولیاء کرام کے حالات کا سلسلہ عرصہ سے نگار میں جاری ہے، اور خیال ہے کہ جس وقت یہ ختم ہو جائے تو اسے کتابی صورت میں پیش کیا جائے۔ کیونکہ بزرگان دین کے حالات لکھنے میں جن احتیاطوں کی ضرورت ہے ان سب کا ناظر صاحب نے خیال رکھا ہے اور دور از کار باتوں سے علیحدہ ہو کر محض سیرۃ نگاری کے اصول پر ان کو مرتب کیا ہے۔

اپریل اور مئی کے نگار میں محمد یوسف صاحب اعظمی کا ایک مضمون "ہندو مسلمانوں کے دور حکومت میں" شائع ہوا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس مضمون میں بعض بعض تاریخی غلطیاں پائی جاتی ہیں، مجھ کو موقع نہیں ملا کہ اس مضمون پر کوئی بسیط تبصرہ کرتا، تمکین الکاظمی صاحب نے اس کے بعض فروگذاشتوں پر توجہ کر کے ایک مختصر سا مضمون لکھا ہے جس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

"روح تنقید" پر رسالہ اردو میں جو تبصرہ شائع ہوا ہے اس کے متعلق جناب ناصر علی بیگ صاحب بی۔اے نے ایک مضمون بھیجا ہے جو نگار میں صرف اس لئے درج کیا جاتا ہے کہ لوگ اس تصنیف کی اہمیت کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔ اس کتاب پر نگار میں عرصہ ہوا ریویو شائع ہو چکا ہے۔

جامعۂ ملیہ کی تازہ اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ دہلی منتقل ہوکر اس میں پھر تجدید حیات ہوئی ہے، اور طلبہ کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ میں نے نگار میں متعدد بار اس تعلیم گاہ کا ذکر کیا ہے اور ہمیشہ اس کی سقیم حالت و بدنظمی پر تاسف کیا ہے۔ جس وقت تک جامعۂ ملیہ علیگڑھ میں تھا میں اس کی حالت سے باخبر رہا، اور اس کے انحطاط کو حد درجہ تاثر کے ساتھ دیکھتا رہا، لیکن اب دہلی میں آجانے کے بعد اسکے کارکنوں کی کوششیں پھر بڑھ گئی ہیں، اور امید کی جاتی ہے کہ اگر اُن کی مساعی کا یہی حال رہا تو ایک زمانہ آئیگا، جب ہم اسکے ثمرات سے مستفید ہوں گے۔

جامعۂ ملیہ جن اصول کے ماتحت قائم کیا گیا ہے اُن کے بہتر ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم لوگوں میں تقسیم کار کا فقدان ہے، اور ایک ہی شخص اس قدر ذمہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے کہ وہ ان میں سے کسی کو پورا نہیں کر سکتا۔ جامعۂ ملیہ کی ناکامیابی کا بھی یہی سبب تھا کہ جن ہاتوں نے اُس کی بنیاد ڈالی تھی، وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے، لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ اس سبب کی تشخیص ہوگئی ہے، اور بعض اکابر قوم نے اپنی توجہ کا مدار اسی کو قرار دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ خدا کرے اُن کا فعل بھی اُن کے قول کی تصدیق کرے۔

اس زمانہ میں جامعۂ ملیہ کے وفود ملک کے اندر دورہ کر رہے ہیں اور یقین ہے کہ اس طرح تبادلۂ خیالات سے جامعہ کو بہت فائدہ پہنچیگا اور ہندوستان کے مسلمان اس تعلیم گاہ کی اہمیت کو سمجھکر اس کی اعانت بھی کریں گے، لیکن میں پھر یہی کہونگا کہ جب تک کسی مستحکم نظام کے ساتھ اس کو وابستہ نہ کیا جائے خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ کیا ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر عابد حسین اُن لوگوں سے بے نیاز ہوکر اس کام کو نہیں کر سکتے جو "یک سر و ہزار سودا" کے مصداق ہیں؟

دہلی کے "ریاست" اخبار نے اپنی ۲۹ مئی کی اشاعت میں "بھوپال میں نیا دور" کے عنوان سے ایک افتتاحیہ سپرد قلم کیا تھا جو سراسر غلط بیانی سے معمور تھا، میں نے ایڈیٹر ریاست کو اس کی تردید میں ایک مراسلہ بھیجا، جس کو انھوں نے شائع نہیں کیا، بلکہ ۵ جون کی اشاعت میں ایک نوٹ اس پر لکھکر پھر انہیں خیالات کا اظہار کیا جن کی غلطی میں نے ثابت کرنی چاہی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے میرا مراسلہ قصداً شائع نہیں کیا، کیونکہ اُس کے شائع ہونیکے بعد وہ کسی طرح اپنے آپ کو اس الزام سے بری نہ کر سکتے تھے، جو اُن پر عائد ہوتا ہے۔ میں ریاست اخبار کو برا نہیں سمجھتا اور نہ اسکے ایڈیٹر دیوان سنگھ صاحب مفتوں کو متعصب قرار دیتا ہوں، لیکن اس میں کلام نہیں کہ انکے ذرائع معلومات نہایت ناقص ہیں اور ریاستوں کے باب میں اُن کے مضامین کا انحصار صرف بازاری خبروں پر ہوا کرتا ہے۔

اس دور میں جبکہ صحافت، تنقید سے علیحدہ کوئی چیز نہیں رہی ہے، اخبار ریاست کا ایسی مجہول، ناقابل اعتبار اور غلط روایات کے بنا پر اخبار کو مرتب کرنا اور پھر پبلک سے اسکی داد چاہنا بہت حیرت انگیز ہے۔ میں انکو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر وہ اپنے اخبار کو کامیاب بنانا چاہتے ہیں تو زیادہ موثق ذرائع معلومات پیدا کریں، مجھے افسوس ہے کہ ایڈیٹر ریاست نے میرا مراسلہ شائع کرکے اُسکا تفصیلی جواب نہیں دیا۔ ورنہ لوگوں کو خود معلوم ہو جاتا کہ میں نے کیا لکھا تھا اور ایڈیٹر ریاست اسکا جواب کس طرح دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسن استدلال، استخراج نتائج اور محاکمہ تنقید میں ایڈیٹر ریاست اپنا نظیر نہیں رکھتا، اور ہندوستانی صحافت کے یہی وہ نمونے ہیں جنکو دیکھکر خود اپنے آپ کو شرم آنے لگتی ہے۔

کیا ہندوستان ایک صنّاع ملک بن سکتا ہے؟

صنعت و حرفت کی اہمیت

دنیا میں حصول دولت کے دو ہی بڑے ذریعے ہیں' ایک زراعت، دوسرا صنعت و حرفت۔ صنعت و حرفت کو زراعت پر جس قدر فوقیت ہے، مخفی نہیں صنعت و حرفت کی ترقی نے عجیب و غریب انقلابات پیدا کر دئے ہیں۔ اسی سبب سے آج دنیا میں یہ چہل پہل نظر آرہی ہے۔ کروڑوں بڑے بڑے کارخانے اسی کا نتیجہ ہیں۔ آج راک فیلر اور ہنری فورڈ اسی کے بدولت مشہور ہیں۔ سائنس کی حیرت انگیز ترقی بجلی اور بھاپ کی قوت کو اسی کی وجہ سے اس قدر رواج ہوا۔ اگر گوناگوں مصنوعات میں ترقی نہ ہوتی تو آج دنیا جاہل اور مفلس ہوتی جیسی کہ زمانہ گزشتہ میں تھی۔ انگلستان کو جو یہ رتبہ حاصل ہوا ہے وہ سب صنعت و حرفت کی ترقی کی بدولت کیونکہ تین صدی قبل یہی انگلستان جب صنعت و حرفت میں بہت پیچھے تھا، تو اس کی امارت آج جیسی نہ تھی۔

ایک تاریخی مثال

سولہویں صدی عیسوی میں بہ لحاظ دولت مندی اسپین یورپ کا امیر ترین ملک تھا اور جرمنی کی تو اس کے سامنے کوئی حقیقت ہی نہ تھی، اس کو امریکہ میں چند سونے کی کانیں دستیاب ہوگئی تھیں جن کی بدولت اس کی دولتمندی مشہور تھی اس نے دولت کے نشہ میں آئندہ کا خیال نہ کیا اور ملکی صنعت و حرفت کی طرف توجہ نہ کرکے عیاشی میں پڑ گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی صنعت میں روز بروز زوال نمودار ہونے لگا۔ اور رفتہ رفتہ یہ اپنی پرانی وقعت کھو کر مفلس ہوگیا، برخلاف اس کے گو جرمنی غریب تھا مگر اس نے اسباب دولت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور جہاں تک اس نے اسباب دولت پیدا کرسکتا تھا پیدا کئے اور کوشش میں لگا رہا جسکا نتیجہ آج روز روشن کی طرح ظاہر ہے، جرمنی باوجود اس جنگ عظیم میں شکست کھانے کے خصوصاً اپنی سائنس اور گوناگوں مصنوعات کی بدولت یورپ کا ممتاز ترین ملک ہے، اگر رقبہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس کی بساط ہی کیا، مگر دنیا میں جو فوقیت رکھتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ صنعت و حرفت کو زراعت پر کس قدر فوقیت حاصل ہے اور اس کی آج کل کتنی اہمیت ہے ہم صنعت و حرفت اور زراعت کا ہر پہلو سے مقابلہ کرتے ہیں، اور یہ بتلاتے ہیں کہ ہر دو کا جداگانہ اثر کسی ملک و قوم کی دماغی۔ معاشرتی۔ سیاسی اور معاشی ترقی پر کیا پڑتا ہے۔

زراعت کا دماغی ترقی پر اثر

پہلے ہم زراعت کو لے کر اس کے اثرات پر نظر ڈالتے ہیں۔ زراعت ایک نہایت قدیم پیشہ ہے، اور جہاں تک انسانی تاریخ کا پتہ ملتا ہے تقریباً اس وقت سے جاری ہے، باوجود اس قدامت کے اس میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ ظاہر ہے، وہی اجناس جو پہلے پیدا کی جاتی تھیں اب بھی پیدا ہوتی ہیں کسی شخص نے آج تک کوئی نئی جنس پیدا نہیں کی، اور نہ نئے قسم کے تخم ایجاد کئے، زراعت میں دماغی ترقی کی بہت کم گنجائش ہے، وجہ یہ کہ طریق زراعت نہایت سیدھے سادے ہیں، مثلاً ہل جوتنا، پانی ڈالنا، فصل کاٹنا، یہ ایسے کام ہے جن میں زیادہ تر جسمانی طاقت کی ضرورت ہے۔ ایک بالکل

جاہل شخص بھی نہایت آسانی سے زراعت کے کام انجام دے سکتا ہے۔ زراعتی کام ایسے ہیں جن میں بہت زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں ہوتی، تھوڑی سی مہارت کے بعد عوام اس کام کو نہایت آسانی سے انجام دے سکتے ہیں، یہ کم مہارت طلبی اور آسانی ہی کی وجہ تھی کہ جب ہندوستان میں انقلاب صنائع ظاہر ہوا تو لوگ زراعت پر ٹوٹ پڑے، زراعت کے آلات بھی نہایت سیدھے سادے ہوتے ہیں۔ اُن کو گاؤں کے بڑھئی اور لوہار آسانی سے بنا لیتے ہیں، اس میں جدت کا میدان بہت تنگ ہے، کاشتکار کا کام صرف اس قدر ہے کہ کھیت ٹھیک طرح جوت کر بیج ڈال دے، حسب ضرورت کھاد اور پانی دے، اس کے بعد بارش کا وقت پر ہونا نہ ہونا کمی یا زیادتی۔ موسم کی اچھائی اور برائی، آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رہنا یہ سب قدرت کے اختیار میں ہے اگر قدرت بھی کاشتکار پر مہربان ہے تو وہ خوشحال ہے ورنہ تباہ حال۔

معاشرتی ترقی

زراعت ایسی چیز ہے جس کے لئے لوگوں کو دیہاتوں چھوٹے چھوٹے قریوں میں کھیتوں کی نگرانی کے لئے رہنا پڑتا ہے اس لئے کاشتکاروں کو متمدن زندگی بسر کرنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں، جس معاشرت کے وہ عادی ہیں اس لئے ترقی یافتہ معاشرت پر اُن کی نظر نہیں پڑتی۔ مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں سے نہ ملنے کی وجہ سے اُن کے خیالات محدود اور پست ہوتے ہیں۔ دیہاتوں میں وہ نہ اپنے مکانوں سے وہ عمدہ مکان اور نہ اپنے مرتبہ سے بلند مرتبہ دیکھتے ہیں، لہٰذا اُن کو اس کی خواہش بھی پیدا نہیں ہوتی، کاشتکاروں کی احتیاجات بہت تھوڑی اور معمولی ہوتی ہیں، جب احتیاج ہی نہ ہو تو اُن کے پورا کرنے کی کیا ضرورت محسوس ہو سکتی ہے کاشتکاروں کی تجارت بھی بہت محدود اور معمولی ہوتی ہے وہ اپنا مال قریب کی منڈی میں فروخت کرتے ہیں، وہ مختلف بازاروں کے نرخوں اور لوگوں کی احتیاج سے پوری طرح واقف نہیں ہوتے، تجارت نہ ہونے کی وجہ سے ذرائع آمد و رفت بھی بہت کم اور خراب ہوتے ہیں۔ سیر و سیاحت کا موقع کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ چونکہ کاشتکاری میں جدت کا میدان تنگ ہے، اس لئے کاشتکاروں میں ہمیشہ ایک ہی کام اور ایک ہی طور پر کرنے کی وجہ سے بلند خیالی اور علو حوصلگی مفقود ہو جاتی ہے۔ چونکہ زراعت میں ذاتی جد و جہد کا موقع بہت کم ہے اس لئے کاشتکار بہت زیادہ قناعت پسند ہو جاتے ہیں اور اُن کی قناعت پسندی بڑھتے بڑھتے تساہل کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ تمام صورتیں ایسی ہیں جن کی بنا پر زراعتی آبادی کی معاشرت نہایت سیدھی سادی ہوتی ہے اور بغیر معاشرتی ترقی کے مادی ترقی بھی پوری طرح نشو و نما نہیں پا سکتی۔

معاشی ترقی

زراعت میں معاشی ترقی بھی بہت پست حالت میں رہتی ہے، چونکہ زراعت میں زیادہ تر جسمانی طاقت کی ضرورت ہے اس لئے دماغی ترقی کے نشو و نما موقع نہیں ملتا۔ ایسی صورت میں وہ دماغ جن میں بہترین صلاحیت موجود ہے بیکار رہ جاتے ہیں، کیونکہ قدرت نے انسان میں جتنی قابلیتیں ودیعت کی ہیں وہ اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتیں جب تک اُن کو نشو و نما کا موقع نہ دیا جائے۔ مگر زراعت ایسی چیز ہے جس میں دماغی قابلیت کی چنداں ضرورت نہیں انسان کی بہت سی قابلیتیں دبی پڑی رہتی ہیں۔

سیاسی ترقی

کسی ملک کے صرف زراعت پیشہ ہونے سے بھی سیاسی ترقی میں بے حد رُک پیدا ہو جاتی ہے، اور ایسی صورت میں

سیاسی آزادی حاصل کرنا محال ہے، وجہ یہ کہ زراعت کی وجہ سے دماغی قوت کمزور اور ایک حد تک زائل ہوجاتی ہے۔ رسم و رواج کا اثر غالب ہوجاتا ہے۔ ترقی کی امنگ مفقود ہوجاتی ہے، آبادی چھوٹے چھوٹے دیہاتوں میں منتشر ہوجاتی ہے، سیر و سیاحت کا موقع نہیں ملتا، مسابقت کا میدان تنگ ہوجاتا ہے، خودداری کے جذبات سرد ہوجاتے ہیں۔ کاشتکار کو اپنے کام پر پورا اعتماد نہیں ہوتا۔ اُن کو اپنی پستی کا احساس نہیں ہوتا، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ سیاسی آزادی کس طرح نصیب ہوسکتی ہے۔

صنعت و حرفت کا دماغی ترقی پر اثر

زراعت کے مقابل اب ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ صنعت و حرفت کا انسانی ترقی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کا اثر بالکل برعکس نمایاں ہوتا ہے اور یہ ہر طرح سے انسانی ترقی کی معاون ہے۔

صنعت و حرفت میں دماغی قابلیتوں کا بہت موقع ہے، کیونکہ اس کا مدار ہی غور و تحقیق اور نئی نئی ایجادات و اختراعات پر ہے۔ صنعت و حرفت میں بیشمار مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں اس لئے ہر شخص اپنی قابلیت کے مطابق کوئی نہ کوئی کام حاصل کرسکتا ہے۔ صنعت و حرفت میں نہ چیزیں محدود ہیں، اور نہ طریقِ پیدائش تنگ۔ روز نت نئی ایجادات ہوتی رہتی ہیں، ہزاروں دماغ غور و فکر میں لگے رہتے ہیں۔ صنعت و حرفت میں قدرت کو بہت زیادہ دخل نہیں۔ صناع ہر موسم میں اپنا کام انجام دے سکتا ہے کاشتکار کے برخلاف صناعوں میں وقت شناسی اور معاملہ فہمی ہوتی ہے، اُن کی ترقی بھی اسی پر منحصر ہے، اُن میں استقلال کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے کاروباری آزادی کی وجہ سے مقابلہ کا جوش ہوتا ہے مسابقت ہی سے ان کو فروغ ہوسکتا ہے۔

معاشرتی ترقی کے مواقع

صنعت و حرفت کا معاشرت پر بھی بہت اچھا اثر پڑتا ہے۔ صناعوں کو اپنے کاروبار کی وجہ سے قصبوں اور شہروں میں رہنا پڑتا ہے جہاں آبادی بہت زیادہ اور مکانات قریب قریب ہوتے ہیں، صناعوں کو بڑے بڑے کارخانوں میں جہاں ہزاروں بلکہ لاکھوں آدمی ایک جگہ ہوتے ہیں مل جل کر کام کرنا پڑتا ہے، اس لئے ان کی ملاقات نئے اور مختلف قسم کے مذاق کے لوگوں سے ہوتی رہتی ہے، اور آپس میں تبادلہ خیالات کا موقع ملتا رہتا ہے۔ غرض یہ کہ انکو اجتماعی زندگی کے تمام فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اُن کو اپنے کام کی وجہ سے سفر کے مواقع پیش آتے ہیں۔ ان کی معیارِ زندگی کاشتکاروں سے بہت بلند ہوتی ہے۔ نئی نئی چیزوں کے دیکھنے سے اُن کو حاصل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، اُس کے حاصل کرنے کے لئے وہ پوری محنت صرف کرتے ہیں، اور اپنے وقت کو ضائع نہیں کرتے، چونکہ صنعتی شہروں میں کام کی سرگرمی ہوتی ہے اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر عمدہ کام کریں گے اُس کا معاوضہ اسی قدر عمدہ ملے گا۔ اور اس طرح ان میں استقلال اور جرأت کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے۔

صنعت و حرفت کی وجہ سے صناعوں کی معاشرت کاشتکاروں سے اعلیٰ ہوتی ہے۔

سیاسی اہمیت

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی صنعت و حرفت کو خاص اہمیت حاصل ہے، کیونکہ بغیر اس شعبہ میں ترقی کئے آزادی حاصل کرنا محال ہے۔ صناع کو اپنے کام پر بھروسہ ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اس کو اپنی محنت کا خاطر خواہ صلہ ملے گا، وہ محسوس کرتا ہے کہ محنت ہی ایسی چیز ہے جس سے اُس کو ترقی ہوسکتی ہے۔ دنیاوی حالات سے باخبر رہنے اور اخبار کے مطالعہ سے احساس پیدا ہوتا ہے۔ سیر و سیاحت کے مواقع پیش آنے سے اُس کی نظر میں وسعت ہوتی ہے، کاروبار کے لئے علم کی

ضرورت ہوتی ہے، اور تعلیم سے خودداری، اسی خودداری اور احساس کے بعد وہ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرتا ہے، اور پھر آزادی حاصل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اگر ہم غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے کہ آزادی کی لہریں شہروں سے اٹھکر قصبوں اور دیہاتوں کی طرف بڑھتی ہیں۔

پیدائش دولت کی صورتیں

ہر ملک یا قوم کے لئے تین مسلک ہو سکتے ہیں، اوّل یہ کہ محض زراعت کی جائے، دوم یہ کہ صنعت و حرفت اور سوم یہ کہ زراعت و صنعت و حرفت کو ساتھ ساتھ ترقی دی جائے۔

کسی ملک کے صرف زراعت یا صنعت و حرفت اختیار کرنے کا جو نتیجہ ہوتا ہے، وہ اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے۔ یوں تو صنعت و حرفت بجائے خود بہت اہمیت رکھتی ہے، لیکن اگر زراعت کے پہلو بہ پہلو ہو تو کیا کہنا، جس طرح امریکہ میں آج کل عمل ہو رہا ہے۔ ہم کو یہاں پر یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہندوستان کے حق میں کونسا مسلک مفید ہے۔

اس سوال کے جواب میں لوگوں کے دو گروہ ہو گئے ہیں، ایک جو آزاد تجارت کے حامی اور حکومت کا نقطۂ نظر رکھنے والے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کو مسلک اوّل پر عمل کرنا چاہیئے، اور اسی میں اس کی بہتری ہے، کیونکہ یہ قدرتاً ایک زرعی ملک ہے، ہندوستان کو دیگر ممالک کے لئے پیداوار خام مہیّا کر کے نفع کمانا چاہیئے۔ اور چونکہ یہ صنعت و حرفت کے لئے موزوں نہیں ہے اس لئے اس کو اس کا خیال ترک کر دینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں ہمدردان ملک یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان نہ صرف زراعت بلکہ صنعت و حرفت میں بھی ترقی کر سکتا ہے۔

چند تاریخی حوالے

اس ثبوت کے لئے کہ ہندوستان ایک صنعت گر ملک بن سکتا ہے ہم اس کے گزشتہ زمانہ پر نظر ڈالتے ہیں اور چند تاریخی حوالے پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ اس نے اس شعبہ میں کس قدر ترقی کی تھی۔ پہلے یہاں بڑے بڑے کارخانے مصنوعات کے مختلف شہروں میں قائم تھے۔ اور سواحل سندھ سے کوچین اور راس کماری سے چاٹگام تک بہت سی بارونق بندرگاہیں بحری تجارت کا مرکز تھیں جن پر سولہویں صدی عیسوی میں عرب تجار کا قبضہ تھا۔

نہ صرف یہ کہ بلکہ عربوں کی حکومت سندھ کے زمانہ میں ہند کی بّری تجارت یورپ اور افریقہ کے بعید ممالک سے بھی قائم تھی، مورلینڈ لکھتا ہے "اہل ہند نے اپنی بحری تجارت کی طرح بّری تجارت و سفر کا بھی ایسا انتظام کیا تھا کہ اس عہد میں یقیناً اسے ان کا بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیئے" آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "لوہے کے صاف کرنے پگھلانے اور طرح طرح کی توپ و بندوق ڈھالنے کی صنعت نے عہد اکبری میں حیرت انگیز ترقی کی تھی۔ اور بڑی بڑی توپوں سے جنھیں کھینچنے کے لئے کئی ہاتھی اور ہزاروں بیل لگائے جاتے تھے، ان توپوں سے سات من وزن تک کا گولہ چلایا جا سکتا تھا" "خود حیدرآباد میں توپ و بندوق ڈھالنے کے بڑے بڑے کارخانے بن گئے تھے" اسی طرح ابوالفضل کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ "بندوقیں بغیر فتیلہ کی صرف گھوڑا گرانے سے چل جاتی تھیں" فنون لطیفہ کو بھی دسویں و گیارہویں صدی میں بہت فروغ ہوا، جس کی تصدیق طامس رو کے بیان سے ہوتی ہے، فن عمارات کے ہر شعبہ نے عہد مغلیہ میں جو حیرت انگیز ترقی کی تھی وہ تعجب انگیز ہے، شاہجہاں اس فن کا بہترین ماہر تھا، اس کے شاہانہ ذوق و شوق نے

اپنی پرشکوہ عمارات میں جو استحکام و حسن پیدا کیا ہے اس کے بعض نمونے آج تک عجائبات میں شمار ہوتے ہیں۔ سترہویں صدی عیسوی میں شاہجہاں کے عہد میں ہندوستان صنعت و حرفت کے اعتبار سے دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک میں داخل تھا۔ مورلینڈ اپنی تصنیف India at the death of Akbar میں تسلیم کرتا ہے کہ "صنعت و حرفت میں ہندوستان موجودہ زمانہ کی بہ نسبت اس وقت مغربی یورپ سے کہیں زیادہ ترقی کر چکا تھا" ہندوستان کے مختلف حصوں میں بہترین قسم کا ریشمی، اونی، اور سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ لوہا، ہیرا، اور تانبا وغیرہ وسیع پیمانہ پر کانوں سے نکالا جاتا تھا، گو دھاتوں کے عام استعمال کی یہ کثرت نہ تھی اور نہ اتنی سستی چیزیں تیار ہوتی تھیں، تاہم یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ توپ تفنگ سے لے کر سوئی تک ضرورت کی ہر شئے ہندوستان میں بن سکتی تھی اور یہ مسلم ہے کہ اس زمانہ میں اہل ہند اپنے اسباب معاشرت کے لئے کسی بیرونی ملک کے دست نگر نہ تھے۔

عاملین صنعت و حرفت

پھر جب ابھی ہندوستان نے صنعت و حرفت میں اتنی ترقی کی تھی تو کیا وجہ ہے کہ اب نہیں کر سکتا، اس تاریخی ثبوت کے جواب میں مخالفین یہ استدلال پیش کرتے ہیں کہ گو اس نے پہلے اس قدر ترقی کی تھی مگر اب نہیں کر سکتا وجہ یہ کہ پہلے کے طریق پیدائش جدا تھے اور اب کے جدا، پہلے ہاتھ سے مصنوعات تیار کی جاتی تھیں اور اب نہایت اعلیٰ و بیش قیمت مشینوں سے۔ پہلے جو کام آدمی انجام دیتے تھے وہ اب بھاپ اور برق انجام دے رہی ہیں، بھلا انسان کی قوت کو اس سے کیا نسبت اس کے جواب کے لئے ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ آج کل صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ ہندوستان میں کہاں تک موجود ہیں۔ اگر ہیں، یا آسانی سے بہم پہنچائی جا سکتی ہیں تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان صنعت و حرفت میں ترقی نہ کر سکے، جس طرح پیدائش دولت کے لئے چند عاملین کی ضرورت ہے، اسی طرح اس کے لئے بھی چند عاملین درکار ہیں، اول ملک میں پیداوار خام وافر ہو اور آسانی سے ملے دوم سرمایہ کی فراہمی، سوم محنت کی رسد (Labour Supply) چہارم قوت محرکہ (motive power) پنجم تنظیم (organization) جس جگہ یہ تمام باتیں بہم ہو سکیں وہاں صنعت و حرفت کو فروغ ہو سکتا ہے اب ہم ان تمام عاملین کو علیحدہ علیحدہ لے کر دیکھتے ہیں کہ یہ ہندوستان میں کہاں تک موجود ہیں۔

پیداوار خام

پیداوار خام پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہاں پیداوار خام کی جس قدر افراط ہے، اتنی کسی دوسری جگہ نہیں لہٰذا ہم یہاں کے پیداوار خام کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہیں، سہولیت کے لئے پیداوار خام کو چار حصوں میں منقسم کیا جاتا ہے، اول زرعی پیداوار۔ دوم معدنی، سوم جنگلاتی، اور چہارم حیوانی پیداوار خام میں بھی ہم صرف نہایت اہم چیزوں کو لیں گے تاکہ مضمون میں طوالت نہ ہو۔

ہندوستان کے علاوہ صرف امریکہ اور مصر ہی ایسے ممالک ہیں جہاں کپاس مقدار کثیر میں پیدا ہوتی ہے، یہاں کپاس کی کاشت کثرت سے ہوتی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ایک سو نو کروڑ اور سنہ ۱۹۲۴ء میں چوراسی کروڑ کی کپاس برآمد کی گئی۔ کپاس دکن میں سب سے زیادہ اور عمدہ قسم کی پیدا ہوتی ہے۔ دکن میں ناڈیڑ کی کپاس مشہور ہے، لنکاشائر کے گرد

مینچسٹر کے کپڑوں کے کارخانے بہت کچھ ہندوستان ہی کی روئی سے چلتے ہیں۔ ابھی اس ترک موالات کی تحریک میں جب روئی کی برآمد کم کردی گئی اور کپڑوں کی درآمد بھی کم ہوئی تو اس قلیل مدت میں لنکا شائر کے کئی کارخانے بند ہوگئے۔ اور وہاں ہل چل مچ گئی، کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ یہی کپاس ہم سے سستے داموں لی جاتی ہے اور پھر اسی کے کپڑے بنا کر ہم ہی سے چوگنی قیمت وصول کی جاتی ہے اگر یہاں کپڑے کی صنعت کو فروغ دیا جائے تو اس کے لئے ضرورت سے زیادہ روئی موجود ہے۔

"جوٹ" اعلیٰ قسم کا سن ہوتا ہے اس کی ضرورت آج کل تمام متمدن ملکوں میں بڑھتی جا رہی ہے، اسی کے تھیلے بنائے جاتے ہیں جن میں روغن دار تخم اور دیگر اجناس بھر کر بھیجی جاتی ہیں، جوٹ کو صاف کر کے اعلیٰ قسم کے کپڑے بنائے جاتے ہیں جو اب ریشم کا مقابلہ کرنے لگے ہیں ساری دنیا کو اس کی ضرورت ہے، اور لطف یہ کہ سوائے ہندوستان کے کہیں پیدا نہیں ہوتا بنگال اس کا خاص گھر ہے، وہاں اس کے بہت سے کارخانہ بھی قائم ہیں تو سب کے سب انگریزوں کے ہیں اور اس کی بڑی مقدار امریکہ اور لندن چلی جاتی ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ۶۲ کروڑ کا جوٹ برآمد کیا گیا۔ دوران جنگ میں جوٹ کی قیمت گر گئی تھی، جس کی وجہ سے اس کی کاشت بھی کم ہوگئی تھی، مگر جنگ کے بعد اس کی قیمت بڑھی تو جن کے پاس پہلے کا رکھا ہوا تھا ان کمپنیوں کو سو ڈیڑھ سو اور دو سو فی صدی تک منافع ہوا،

"نیشکر" ایک قیمتی پیداوار ہے، اور اس کی کاشت میں بہت منافع ہے اس کے رس سے فی صدی جتنی مٹھاس حاصل ہوتی ہے اتنی کسی اور چیز سے حاصل نہیں ہو سکتی، مگر یورپ میں شکر بڑی مقدار میں چقندر سے حاصل کی جاتی ہے۔ ایک زمانہ میں جرمنی نے چقندر کی شکر سازی میں اس قدر ترقی کی کہ وہاں کے چقندر کی شکر دنیا کے بازاروں میں پھیل گئی، اور لطف یہ کہ دیسی گنوں کی شکر سے سستی تھی اس کے فروغ کے لئے خود حکومت نے بڑی بڑی کوشش کی بڑے بڑے انعامات مقرر کئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گنے کی کاشت گھٹ گئی آخر یورپ کے دیگر ممالک سے جرمنی کی شکر کی ترقی دیکھی نہ گئی، اس کے لئے انہوں نے بہت سی کانفرنسیں منعقد کیں جن میں سے آخری کانفرنس سنہ ۱۹۰۲ء میں بمقام برسلیس منعقد ہوئی اور یہ طے پایا کہ اس کی تجارت سے تمام ممالک برابر فائدہ اٹھائیں، ہندوستان میں گنا ایک کثیر مقدار میں پیدا ہوتا ہے، مگر شکر سازی کی صنعت روز بروز تباہ ہوتی جاتی ہے، اور اب تو جہاں دیکھو ولایتی ہی شکر نظر آتی ہے البتہ دیہاتوں میں گڑ استعمال ہوتا ہے۔ ہر سال کروڑوں روپیہ کی شکر باہر سے آتی ہے چنانچہ سنہ ۱۹۲۴ء میں پندرہ کروڑ کی آئی۔
ہندوستان میں جس قدر گنا کاشت ہوتا ہے اس سے تقریباً دس کروڑ من شکر تیار ہو سکتی ہے۔ ہندوستان میں اور دوسری چیزوں سے بھی شکر بن سکتی ہے، مثلاً شکرقندوں اور تاڑی یا سیندھی سے اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان میں شکر سازی کی صنعت کے لئے وسیع میدان موجود ہے اگر یہ صنعت ملک میں جاری ہو جائے تو ہر سال ہندوستان کا کروڑوں روپیہ بچ جائے گا، اور لاکھوں بیکار مزدور کام سے لگ جائیں گے۔

"روغن دار تخموں" کی اہمیت قابل خیال ہے، ہندوستان میں ان کی کوئی کمی نہیں، اس کی کاشت بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے اور بڑی مقدار میں برآمد کر دی جاتی ہے، اور اس کی برآمد روز بروز ترقی پذیر ہے، چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء میں ۲۹ کروڑ کے تخم برآمد کئے گئے۔ مختلف قسم کے روغن سے مختلف قسم کے کام لیتے ہیں، مثلاً تل، سرسوں، ناریل، مونگ پھلی، ارنڈی، اور بنولہ وغیرہ

اگر خود ہندوستان میں تیل نکالنے کے باضابطہ کارخانے نئے طرز پر قائم ہوں تو اس سے دو فائدہ ہونگے، اول تو اس کی صنعت کو فروغ ہوگا، اور روغن دار تخم کے بجائے، روغن نکالکر بیچنے میں زیادہ فائدہ ہوگا، ملک کی آمدنی بڑھے گی دوسرے کھلی سے جانوروں کی غذا اور کھاد تیار ہو سکے گی۔

ہندوستان اور معدنیات

مسٹر ڈی۔ ایل۔ ماہر معدنیات ہندوستان کی معدنیات کے متعلق لکھتے ہیں کہ "جہاں تک معدنیات کا تعلق ہے اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن زندگی کی شاید ہی کوئی ایسی ضرورت ہو جس کو ہندوستان اپنے یہاں مہیا نہ کر سکے"، سر ٹی۔ ہالینڈ کے لکھنے کے مطابق ہندوستان میں پچاس ساٹھ قسم کی معدنیات دریافت ہو چکی ہیں، اب ہم ہندوستان کی چند مشہور اور ایسی معدنیات کا جنکا صنعت کے کاموں میں خاص اہمیت ہے نہایت مختصراً کچھ حال لکھتے ہیں۔

کوئلا۔ ہندوستان میں اکثر جگہ نکلتا ہے، مگر بہار اور بنگال میں اس کی کثرت ہے، چھوٹا ناگپور میں جھریا اور گردہی کی کانیں مشہور ہیں، بنگال میں رانی گنج کی کان بہت مشہور ہے اس کے بعد حیدر آباد میں سنگارینی کی کان ہے، ہندوستان میں کان کنی کا انتظام یورپی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔

مغنیسیہ۔ (Magnesia) بہت کارآمد دھات ہے اور دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے یہ مختلف صنعتوں میں کام آتی ہے اس سے شیشہ صاف کرتے ہیں۔ فولاد بنانے میں اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے، یہ قریب قریب کل کی کل انگلستان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو برآمد کر دی جاتی ہے۔

مٹی کا تیل۔ اس کے بڑے مرکز برما، آسام اور پنجاب ہیں اس سے ویسلین بناتے ہیں اور ہر سال ہزاروں من ویسلین برآمد کیجاتی ہے۔

ابرک۔ دنیا میں جتنا ابرک پیدا ہوتا ہے اس کا آدھے سے زیادہ ہندوستان سے حاصل ہوتا ہے، یورپ میں اس سے بہت کام لیتے ہیں، اس کو بجلی کا غلاف بناتے ہیں بہار میں بمقام گیا عمدہ قسم کا اور کثیر مقدار میں حاصل ہوتا ہے یہ امریکہ کو ۵۰ فی صدی سے زیادہ برآمد کر دیا جاتا ہے۔

لوہا۔ ہندوستان میں کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔ بنگال اور جنوبی ہند میں اس کی بہت سی کانیں ہیں، یہاں لوہا صاف کرنے کا صرف ایک بہت بڑا کارخانہ ہے جو ٹاٹا آہن فولاد کمپنی کے نام سے مشہور ہے۔

جتنی دھاتوں کا اوپر ذکر کیا گیا اگر ان سب سے ہندوستان میں کام لیا جائے تو یہاں کی صنعت کو بہت کچھ فروغ ہو سکتا ہے جب تک ملک میں صنعت و حرفت نہ ہو معدنیات بیکار پڑی رہتی ہیں، یا اس ملک پر کسی دوسرے کا قبضہ ہوتا ہے تو وہ اسے اٹھا کر اپنے یہاں لیجاتا ہے جو ملک کی سخت بدقسمتی کا باعث ہے۔

جنگلات

آج کل روز بروز جنگلات کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے اور ان کی طرف خاص توجہ اور خیال کیا جارہا ہے سنہ ۱۹۱۶ء میں یہاں کے جنگلات کا کل رقبہ دو لاکھ انچاس ہزار مربع میل تھا ایک ملک کے جنگلات کا اس کی معاشی حالت پر بہت اثر پڑتا ہے، اوّل تو یہ کہ جہاں جنگل ہوتے ہیں وہاں بارش کثرت سے ہوتی ہے دوسرے جنگل میں جو اعلیٰ قسم کی لکڑیاں اور جڑی بوٹیاں

پیدا ہوتی ہیں ان سے بہت سی مصنوعات تیار ہو سکتی ہیں اور ہندوستان میں عمدہ قسم کے جنگلات کی کوئی کمی نہیں۔

ساگون۔ یہ برما اور دکن کے جنگلوں میں کثرت سے ہوتا ہے یہ بہت کارآمد درخت ہے۔ یہ جہاز ریل کے ڈبوں اور اعلیٰ قسم کے فرنیچر بنانے میں کام آتا ہے ساگون ہندوستان کی بڑی دولت ہے ہر سال بڑی مقدار میں یورپ جاتا ہے۔

شیشم، آبنوس۔ یہ بھی یہاں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سے اعلیٰ قسم کے فرنیچر بنتے ہیں۔ آبنوس بھی یہاں پیدا ہوتا ہے اور فرنیچر کے کام آتا ہے۔

صندل۔ دنیا میں جتنا صندل پیدا ہوتا ہے اس کا ⅘ ہندوستان سے حاصل ہوتا ہے اور ہندوستان کی پیداوار کا ⅘ ریاست میسور سے۔ یہ بہت قیمتی جنگلی پیداوار ہے، یہ بھی ممالک غیر کو برآمد ہوتا ہے۔ اس سے تیل اور اعلیٰ قسم کا عطر بھی نکالا جاتا ہے۔

بانس۔ یہ یہاں بے انتہا پیدا ہوتا ہے، جا بجا اس کے بڑے بڑے اور گھنے جنگل موجود ہیں۔ یہ بہت کارآمد چیز ہے اور اس سے سینکڑوں کام لئے جاتے ہیں مگر اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے گودے سے عمدہ قسم کا کاغذ تیار ہو سکتا ہے اور دیگر ممالک میں اس سے کاغذ بنایا بھی جاتا ہے اگر یہاں بھی کاغذ سازی کے کارخانے بڑے پیمانہ پر قائم ہوں تو یہ صنعت بہت ترقی کر سکتی ہے۔

ربڑ۔ آج کل ربڑ کے گوناگوں فوائد سے ہر شخص واقف ہے اس کی ہندوستان میں کوئی کمی نہیں اور اس میں ترقی کی گنجائش بہت باقی ہے۔

دیا سلائی کی لکڑی۔ یہاں کے جنگلوں میں یہ لکڑی بھی کافی پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی صنعت کیلئے یہاں وسیع میدان کھلا ہوا ہے۔

یہاں سیکڑوں چیزیں ایسی پیدا ہوتی ہیں جن سے رنگ سازی کی صنعت کو فروغ ہو سکتا ہے۔ جرمنی کے رنگ آنے سے قبل یہاں دیسی رنگ ہی استعمال ہوتے تھے، نیل۔ چوب تنگ۔ کسم۔ ہارسنگھار اور لاک سے عمدہ قسم کا رنگ حاصل ہو سکتا ہے۔

دواسازی کی صنعت کے لئے جنگلاتی پیداوار کی سخت ضرورت ہے۔ کیونکہ جنگلوں ہی سے ہزاروں قسم کی جڑی بوٹیاں حاصل ہوتی ہیں اور ایسے جنگلوں کی ہندوستان میں کوئی کمی نہیں۔

الغرض ہندوستان کے جنگلوں میں بے انتہا ایسی چیزیں موجود ہیں جو صنعت و حرفت میں بہت کام آتی ہیں اگر ان تمام چیزوں کے صنعتی کارخانے یہاں قائم ہوں تو سیکڑوں صنعتیں ترقی کر سکتی ہیں۔

حیوانات یہاں حیوانات کی بھی کوئی کمی نہیں جن میں سے بعض صنعت کے لئے بیحد مفید ہیں۔ حیوانات کو دو قسم میں تقسیم کر سکتے ہیں، اہلی اور صحرائی جانوروں سے طرح طرح کے کام لئے جاتے ہیں، ان کا گوشت، پوست، ہڈی، اور خون کوئی چیز بیکار نہیں جاتی۔ ان کی کھالوں کی تجارت زبردست پیمانے پر ہوتی ہے، اس سے بہت سی مصنوعات تیار کی جاتی ہیں، ہڈی سے بھی مصنوعات میں بہت کام لیتے ہیں، یہ بڑی مقدار میں برآمد کر دی جاتی ہے، اس سے شکر صاف کرتے اور فاسفورس نکالتے ہیں ان کے سینگوں سے بٹن، برش، کنگھیاں، چھریوں کے دستے، اور کھلونے بناتے ہیں۔ ان کے خون سے رنگ تیار ہوتا ہے، ہاتھی دانت

تو بہت قیمتی چیز ہے، اس سے آرائش کی چیزوں میں بہت کام لیا جاتا ہے۔

بھیڑ کی اون سے کمبل اور دوسرے اونی کپڑے تیار ہوتے ہیں، کشمیر کی بھیڑیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان کے پشم لانبے اور نرم ہوتے ہیں۔ ان سے اعلیٰ درجہ کی شالیں۔ کشمیرے۔ پٹو۔ بنتے ہیں جو ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ کشمیر سے نیپال تک بلند پہاڑیوں پر صحرائی بکرے اور بکریاں کثرت سے ہیں اُن کا اون ہی اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

ہندوستان میں اصل کی حالت صنعتی ترقی کے لئے پیداوار خام کا جہاں تک تعلق ہوسکتا ہے وہ ہندوستان میں کثرت سے موجود ہے، اس لئے اصل پر غور کرنی چاہیئے کیونکہ آج کل بغیر زیادتی اصل یا سرمایہ کے کسی صنعت کو فروغ نہیں ہوسکتا، اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اصل کی بہت کمی ہے، اور جو دولت ہے وہ بھی اصل کی صورت میں نہیں۔ بلکہ دفینوں کی شکل اختیار کئے ہوئے ہے، ہندوستان کی اصل سے اہلِ مغرب کو سخت شکایت ہے اور وہ یہاں کی صنعتی پستی کا اصل سبب اسی کو بتاتے ہیں، اور اسی کی بناء پر کہتے ہیں کہ یہاں صنعتی ترقی ناممکن ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں اصل اس قدر آسانی سے فراہم نہیں ہوتا جتنا انگلستان میں لیکن پھر بھی اگر فراہمی اصل کی مشکلات ایسی ہوں جو انسانی کوشش سے رفع ہوسکتی ہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ فراہم ہوسکتا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس خرابی کے اسباب قدرتی ہیں یا بعض وجوہ سے پیدا ہوگئے ہیں، اور آیا وہ خرابیاں رفع بھی ہوسکتی ہیں یا نہیں۔

فراہمی اصل کی دقتیں سرمایہ اور اصل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ لوگوں کے پاس دولت ہو اور دولت جمع ہونے کی صورت یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی میں سے پہلے ضروریات زندگی پوری ہوں اور اس کے بعد کچھ بچ رہے اگر کل کا کل ضروریات زندگی میں صرف ہوجائے تو دولت کہاں سے جمع ہوسکتی ہے۔ کوئی شخص اپنی ضروریات زندگی میں سے بچا کر دوسرے کام میں روپیہ نہیں لگا سکتا۔ بیچارہ ہندوستان ازحد غریب ہے، یہاں کے باشندے امریکہ اور انگلستان کے سے دولت مند نہیں، یہاں کی آمدنی کا سالانہ اوسط ڈھائی پونڈ ہے اور انگلستان کا پچاس پونڈ سے بھی زیادہ۔ دنیا کا کوئی ملک اس قدر پست حالت میں نہیں جتنا ہندوستان ہے لہٰذا اصل اور سرمایہ کی فراہمی کے لئے سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ بحیثیت مجموعی ملک کی دولت زیادہ ہو۔ جب مالی حالت کی یہ کیفیت ہو تو یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ ہندوستانی اپنی اس قدر قلیل آمدنی میں سے بچا کر دوسرے کاموں میں لگائیں گے جس ملک میں دولت جتنی کم ہوگی اتنا ہی اصل بھی کم ہوگا۔

فراہمی اصل کی دوسری دقت کی وجہ یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اور برطانوی حکومت کے پوری طرح قائم ہونے سے پہلے ہندوستان میں ایسی سخت بدامنی کا زمانہ گزرا ہے کہ لوگوں کی جان و مال کی حفاظت سخت دقت طلب ہوگئی تھی، اس پریشانی کے زمانہ میں لوگوں نے قصداً جمع کرنا چھوڑ دیا تھا، کیونکہ دولت کی حفاظت بہت مشکل ہوگئی تھی، اگرچہ اب پورا امن و امان ہے، مگر اس جمع نہ کرنے کا اثر اب بھی باقی ہے۔

تیسری دقت یہ ہے کہ پس انداز کرنے کے لئے، لوگوں میں آئندہ زندگی کا احساس ہونا چاہیئے۔ اور یہ یہاں جہالت کی وجہ سے مفقود ہے

جو چند لوگ دولت مند اور تعلیم یافتہ ہیں، وہ اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتے ہیں۔
چوتھی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگ عموماً تجارت کرتے ہیں اور کارخانے قائم نہیں کرتے، وجہ یہ کہ کارخانے جاری کرنے میں یہاں بڑے بڑے خطرات ہیں، اُن خطرات کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ساری دنیا کا مال آتا ہے اور جن ملکوں سے مال آتا ہے وہ ایک زمانہ سے کارخانے قائم کئے ہوئے ہیں، بڑے پیمانہ پر کام کر رہے ہیں، کام کرتے کرتے لوگوں کو مہارت بہت بڑھ گئی ہے اُن کے یہاں مشینیں خود ڈھلتی ہیں، وہاں قابل آجر (Home market) ملتے ہیں ان سہولتوں کی بنا پر اُن کا مال بہت سستا پڑتا ہے چونکہ ہندوستان کو یہ سہولتیں میسّر نہیں، اس لئے یہاں کارخانے قائم کرنے میں دوسرے ممالک کی بہ نسبت مال گراں تیار ہوگا، اور سستا مال چھوڑ کر گراں کون خریدے گا۔ دوسرے کارخانوں کے چلنے اور نہ چلنے کا بھی خوف لگا رہتا ہے۔ ان خطرات کی بنا پر یہاں کے لوگ تجارت پر اکتفا کرتے ہیں، اگر حکومت اپنی ہوتی تو یہ تمام دقتیں باقی نہ رہتیں، بیرون مال پر اتنا محصول لگایا جاتا کہ وہ دیسی مال سے ارزاں فروخت نہ ہو سکتا۔

ان موانع کو رفع کرنیکی صورتیں

ان تمام دقتوں پر نظر کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ تمام قدرتی نہیں بلکہ چند اسباب کے ماتحت ہیں اور اگر ان مخالف اسباب کو رفع کر دیا جائے تو یہ تمام خرابیاں بھی دور ہو سکتی ہیں۔ دولت بڑھانے کی صورت یہ ہے کہ زراعت کو ترقی دی جائے، صنعت و حرفت کا رواج ہو، پس اندازی کی ترغیب کے لئے علم کی ضرورت ہے۔ علم سے حوصلہ اور آئندہ زندگی کا احساس پیدا ہوگا۔ اس ترغیب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ملک میں طریقۂ بنک کثرت سے رائج ہو، انگلستان میں چھوٹے چھوٹے بنکوں کا جال بچھا ہوا ہے، ہندوستان میں اس کی حالت بہت ردی ہے۔ چونکہ حفاظت سے روپیہ رکھنے کے ذرائع بہت کم ہیں اس لئے لوگ اپنا روپیہ مجبوراً دفن کرکے رکھتے ہیں۔ صنعتی ترقی کے لئے ان خطرات کو بھی رفع کرنا ضروری ہے، اور اس میں حکومت کی امداد کی ضرورت ہے، جب ان تمام موانع کو ہٹا دیا جائے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اجتماع اصل میں دقت ہو، اور یہ دقتیں ایسی ہیں جو تھوڑی کوشش سے رفع ہو سکتی ہیں۔

صنعتی بنکس

فراہمی اصل کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں مثلاً بنک حصص (Shares) ڈبنچر (Debentures) اسی طرح صنعتی بنک بھی ہیں جنھوں نے جرمنی اور جاپان میں بہت ترقی کی ہے۔ صنعتی بنکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف صنعتی کاموں کے لئے قرض دیتی ہیں اور اُن کے قرض کی مدت بھی کافی طویل ہوتی ہے، جو لوگ اس میں روپیہ جمع کرتے ہیں وہ بھی ایک مدت معینہ سے کم پہلے روپیہ جمع نہیں کر سکتے، اس کے معاوضہ میں صنعتی بنک جمع کنندوں کو دوسرے بنکوں سے زیادہ سود دیتی ہے، صنعتی بنک جس کام کے لئے روپیہ دیتے ہیں اُس پر پہلے غور کر لیتے ہیں یعنی جو شخص جس کام کے لئے روپیہ لے رہا ہے وہ شخص یا کمپنی اُس کام کو چلانے کی قابلیت بھی رکھتی ہے یا نہیں۔ دوسرے جس صنعت کے لئے روپیہ لیا جا رہا ہے اس میں ترقی کی کہاں تک امید ہو سکتی ہے، جہاں کارخانہ قائم کیا جائیگا وہاں اُس کے چلنے کے لئے سہولتیں موجود ہیں یا نہیں، کارخانہ دار کے پاس کس قسم کے ماہر ہیں۔ ان تمام باتوں کے دریافت کرنے کے بعد بھی صنعتی بنک اس بات کی نگرانی رکھتے ہیں کہ

وہ روپیہ جو اُن سے قرض لیا گیا ہے اسی کام پر صرف ہو رہا ہے یا نہیں جس کے لئے لیا گیا تھا۔ اس تمام کام کیلئے صنعتی بنکوں کے پاس ماہرانِ فن کی ایک جماعت ہوتی ہے جو روپیہ قرض دینے سے پہلے اور اس کے بعد ہر چیز کا معائنہ کرتی ہے۔

صنعتی کمیشن کی سفارش

چونکہ صنعتی بنک ہونا دیر طلب ہے اس لئے صنعتی کمیشن نے جو ۱۹۱۶ء میں قائم ہوئی تھی یہ سفارش کی کہ جب تک یہاں صنعتی بنک قائم ہوں اس وقت تک عام بنکوں سے صنعت و حرفت کے لئے روپیہ لیا جائے مگر عام بنک صنعتی کاموں کے لئے روپیہ نہیں دیتے اور دیتے بھی ہیں تو بہت قلیل مدت کے لئے، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہاں کارخانے قائم کرنے میں بہت خطرات ہیں دوسرے عوام جو ضمانت پیش کرتے ہیں وہ زیادہ اعلیٰ نہیں ہوتی اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ روپیہ لینے والوں کی وہ خود ضامن بنے جب حکومت ضامن ہوگی تو ہر بنک روپیہ دینے کے لئے تیار ہو جائیگا۔

اس بیان میں کہ ہندوستان کا اصل بیکار پڑا رہتا ہے اور وہ کچھ کام نہیں کرتا بہت مبالغہ سے کام لیا ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ دورانِ جنگ میں جب بہت سی چیزوں کی درآمد بند ہوئی تو ان صنعتوں کو ہندوستان میں ترقی ہونے لگی، اور بیسیوں صنعتیں جو مُردہ ہو چلی تھیں جاری ہو گئیں، مثلاً رنگ اور چمڑے کی لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو ترقی کا موقع دیا جائے۔

بیرونی اصل

مندرجۂ بالا بیان سے یہ بات ظاہر ہوئی ہوگی کہ ہندوستان میں اصل کی کمی ہے مگر جلد یا بدیر اصل فراہم ضرور ہو سکتا ہے اس کے علاوہ یہ کچھ ضرور نہیں کہ جس ملک میں اصل کی کمی ہو، وہاں صنعت و حرفت کو فروغ ہی نہ ہو، اگر خود کسی ملک میں اصل کی کمی ہو تو وہ بیرونی ممالک سے قرض لے سکتا ہے اور کاروبار کے منافع سے سود ادا کر سکتا ہے اس قسم کے قرض کا رواج جاری ہے اور ایک ملک دوسرے ملک کو دیتا ہی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ انگلستان کا بہت سا اصل ہندوستان اور مصر میں لگا ہوا ہے دوسری جگہ سے اصل بہت آسانی سے آسکتا ہے۔

آجکل انگلستان میں دولت اور اصل کی زیادتی کی وجہ سے روپیہ پر منافع ملنے کی راہیں کم ہوتی جا رہی ہیں وہاں شرح سود روز بروز کم ہوتی ہے اس لئے وہاں کے سرمایہ داروں کو خود انگلستان میں قرض دینے سے منافع کم ملتا ہے اگر دوسری جگہ ان کو سود زیادہ ملے تو یقیناً وہ اپنا روپیہ وہاں لگائیں گے، لہذا ہندوستان کو چاہیئے کہ دیگر ممالک یا انگلستان سے اصل قرض لے، کچھ عرصہ قبل جب ہندوستان میں ریلوے جاری کرنیکا خیال ہوا تو اس کے لئے انگلستان ہی سے اصل فراہم کیا گیا تھا، اور یہاں کی تمام ریلیں انگلستان ہی کے اصل سے قائم ہوئی تھیں، اس وقت حکومت ہند نے روپیہ اپنی ذمہ داری پر لیا تھا اور جب تک ریلوے سے منافع نہیں ملا حکومت اپنی جیب سے اصل کا سود ادا کرتی رہی، اب ہندوستان کو صنعت و حرفت کے لئے اصل کی ضرورت ہے اس لئے حکومت کو چاہیئے کہ پہلے کی طرح اپنی ضمانت پر انگلستان سے روپیہ حاصل کر کے صنعت و حرفت میں لگائے مگر افسوس کہ حکومت اپنی ضمانت پر قرض لینے کے لئے آمادہ نہیں۔

بیرونی ممالک سے قرضی اصل

اس سے تو قریب قریب سب کو اتفاق ہے کہ بیرونی ممالک سے اصل قرض لینا چاہیئے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ایسے قرضوں کی صورتیں کیا ہوتی ہیں۔ عام سرمایہ فراہم کرنے کا تو یہ طریقہ ہے کہ پہلے کاروبار کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔

کہ اس میں کتنے سرمایہ کی ضرورت ہوگی پھر اُن کو مساوی حصوں میں تقسیم کرکے حصّے بیچکر رقم وصول کی جاتی ہے دوسری صورت یہ ہے، کہ بنکوں سے قرض لیا جائے۔ بیرون ممالک سے بھی اصل حاصل کرنے کی یہی صورتیں ہوتی ہیں، یعنی یہ کہ پروسپکٹس شائع کرکے بھیجدیے جائیں اور حصے بیچے جائیں، دوسرے یہ کہ کسی معتبر بنک کی ضمانت پر دوسرے ملک کے بنک سے روپیہ لیا جائے کیونکہ بغیر کسی معتبر بنک کی ذمہ داری کے دوسرے ممالک اصل قرض نہیں دے سکتے، ہندوستان میں صرف امپیریل بنک ہی ایسا معتبر بنک ہے مگر یہ بنک ایک مدت معیّنہ سے زیادہ کے لئے قرض نہیں دے سکتا دوسرے اُسکے قوانین ایسے ہیں کہ اس کو صنعتی کاروبار کے لئے روپیہ نہیں مل سکتا، مگر مشکل تو یہ ہے کہ جب صنعتی کاروبار کے لئے خود ملک کے بنک قرض نہیں دیتے تو باہر والے کیوں دینے لگے، لہٰذا بیرونی اصل حاصل کرنے کے لئے بھی حکومت کی ذمہ داری ہے، مگر حکومت اس کے لئے آمادہ نہیں اس لئے دوسری صورت یہاں مفقود ہے۔

فسکل کمیٹی جب ہندوستان میں فراہمی اصل کے لئے اس قدر مشکلات اور اس کی فراہمی نا ممکن نظر آئی تو حکومت نے یہاں کے مالی معاملات پر غور کرنے کے لئے سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک کمیٹی مقرر کی جس کا نام فسکل کمیٹی رکھا گیا اس کے صدر سر ابراہیم رحمۃ اللہ تھے، اس کمیٹی نے بہت غور و خوض اور تحقیق کے بعد اپنی رپورٹ مع سفارش پیش کی، اس کمیٹی میں دو فریق ہوگئے اور ان کی رایوں میں اختلاف ہوگیا۔ بہرحال ہر دو نے اس بات کی سفارش کی ہے کہ یہاں بجائے آزاد تجارت (Free Trade) کے تجارت مامون (Protectional Trade) پر عمل کیا جائے۔ جس کے لئے ہندوستانیوں کا عرصے سے مطالبہ ہے، اب تک ہندوستان میں تجارت آزاد پر عمل کیا گیا اور اس کے حق میں اسی کو بہتر بتایا گیا۔ اس لئے کہ یہ انگلستان کا ماتحت ہے اگر یہاں بھی تجارت مامون پر عمل درآمد ہوجاتا تو انگلستان کی تجارت خاک میں مل جاتی، کیونکہ وہاں کی مصنوعات کا سب سے بڑا بازار ہندوستان ہی ہے اور وہاں کی صنعت کے فروغ کا دارومدار بہت کچھ ہندوستانی تجارت پر ہے ہندوستان نے جب کبھی تجارت مامون کا سوال پیش کیا تو دیگر ممالک کی مصنوعات کے خلاف اس کو تامین عطا کیا جانے لگا مگر اس پر غور کرنا چاہیے کہ انگلستان کا کتنا مال ہندوستان آتا ہے، اور دیگر ممالک کا کتنا ہندوستان کی درآمد کا ستر اسّی فی صدی مال انگلستان سے آتا ہے اور بیس تیس فی صدی میں تمام دیگر ممالک شامل ہیں۔ اگر صرف بیس پچیس فی صدی کے لئے تامین عطا بھی کی جائے تو یہاں کی مصنوعات کو کیا فروغ ہو سکتا ہے۔ جبکہ اسّی فی صدی کے قریب آزاد ہو، اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ دیگر ممالک کی مصنوعات کی جگہ بھی انگلستان ہی لے لے۔ لہٰذا ہندوستان کا اگر کوئی حریف ہے تو وہ انگلستان ہی ہے۔

تجارت کے مامون بنانے کیلئے تو کمیٹی کے کل اراکین متفق ہیں مگر دوسری سفارش میں اختلاف ہے مجورٹی (majority) کے اراکین یہ سفارش کرتے ہیں کہ جب ہندوستان میں اصل نہیں اور فراہمی اصل کی دوسری صورتیں بھی مفقود ہیں اور ہندوستان کی صنعت و حرفت کو فروغ دینا بھی ضروری ہے تو فراہمی اصل کی یہ صورت اختیار کی جائے کہ بیرون ممالک کو اجازت دیدی جائے کہ وہ اپنے ملک سے سرمایہ فراہم کرکے ہندوستان میں کارخانے قائم کریں اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے ممالک کے باشندے اپنے سرمایہ سے ہندوستان میں کارخانے جاری کریں گے، اُن کارخانوں کے قائم ہوجانے سے ہندوستان میں نئی نئی صنعتوں کو ترقی ہوگی۔

کاروبار میں چہل پہل بڑھ جائے گی نئے نئے شہر آباد ہو جائیں گے بہت سی پیداوار خام جو اب تک بیکار ہے کام میں آئے گی زیادتی سے بیکار مزدور روزی سے لگ جائیں گے، اور مزدوروں کی اجرت میں اضافہ ہو گا۔ منورٹی کے اراکین یعنی ہندوستانی اس کے خلاف ہیں ان کا بیان ہے کہ ہم دیگر ممالک سے سرمایہ صرف سود پر لینے کے لئے تیار ہیں مگر یہ وہ خود آ کر کارخانے قائم کریں اس کے لئے آمادہ نہیں اس لئے کہ دوسروں کے آنے سے بجائے اس کے کہ ہندوستان کو فائدہ ہو نقصان ہو گا، اور وہ نقصان اہم ترین ہے اس لئے بہتر ہے کہ چند روز یہ پستی برداشت کی جائے مگر دوسروں کو آنے کی اجازت نہ دیجائے، کیونکہ جب باہر کے لوگوں کو کارخانے قائم کرنے کی اجازت دیجائیگی تو وہ یہاں آ کر کارخانے قائم کریں گے اور چونکہ یہاں تامین تجارت پر عمل درآمد کرنیکا وعدہ کیا گیا ہے اس لئے کارخانہ داروں کو ایک ہی مقدار میں خالص منافع ملیگا اس صورت میں ہندوستانیوں کا صرف اتنا فائدہ ہو گا کہ چند بیکار مزدور نہایت ادنی اجرت پر کام سے لگ جائیں گے اس کے برخلاف منافع میں ہندوستانیوں کا کوئی حصہ نہیں رہے گا، اور تمام صنعتی کارخانے دوسروں کے ہوں گے اس طرح ہندوستانی صنعتی ترقی نہیں کر سکیں گے جو اصل مقصد ہے۔

مجورٹی یعنی یورپین جماعت کا یہ استدلال ہے کہ جب تامین تجارت کی وجہ سے ملک کی مصنوعات کو گراں کر دیا گیا تو اس کو ارزاں کرنا بھی ضروری ہے تاکہ عوام گرانی سے زیر بار نہ ہوں اس گرانی سے بچنے اور مصنوعات کو ارزاں کرنیکا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ نئے نئے کارخانے قائم ہوں، چونکہ یہاں اصل نہیں اور مہیا ہونے کی بھی کوئی آسان صورت نہیں اس لئے جس طرح بھی ہے بیرونی ممالک سے اصل لیا جائے اور اس کی آسان صورت صرف یہی ہے کہ ان کو یہاں کارخانے قائم کرنے کی اجازت دیدی جائے اس صورت میں یہاں جلد سے جلد کارخانے قائم ہو جائیں گے تامین تجارت سے ان کارخانوں کو جلد ترقی ہو گی، اور مصنوعات ارزاں ہو جائیں گی، اس طرح لوگوں کا جو نقصان مال مہنگا ہونے کی صورت میں ہوتا وہ جلد سے جلد رفع ہو جائیگا۔

اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ باہر سے اصل حاصل کرنیکا یہ مقصد ہے کہ صنعت و حرفت کو ترقی دیجائے صنعتی ترقی کا مقصد ملک کی دولت بڑھانا اور افلاس کا دور کرنا ہے مگر ممالک غیر کے باشندوں کو ہندوستان میں کارخانے قائم کرنے کی اجازت دینے سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ جب باہر کے لوگوں کو سرمایہ فراہم کر کے کارخانے قائم کرنے کی اجازت دی جائے گی تو اس کے حصہ دار بھی باہر ہی کے لوگ ہوں گے اور حصہ دار ہی کارخانہ کے مالک ہوتے ہیں اس کا نفع بھی انھیں کو ہو گا، اور کارخانوں کو جس قدر فائدہ ہو گا وہ سب باہر چلا جائے گا۔ اور دوسرے جب کارخانے ہندوستانیوں کے نہ ہوں گے تو ان کے ذمہ صرف پیداوار خام کا مہیا کرنا رہ جائیگا اور صنعتی ترقی کا مقصد یہ ہے کہ کسب معاش کے راستے کھلیں نہ کہ مسدود ہوں مگر وہ اس صورت سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ تیسرے اگر کارخانہ کے حصہ دار ملکی ہوتے تو کم از کم وہ حصہ دار منافع اٹھاتے اور بحیثیت مجموعی ملک کی دولت میں اضافہ ہوتا۔

بیرونی ممالک کو کارخانے قائم کرنے کی اجازت دینے میں صرف اسی قدر نقصان نہیں بلکہ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہو گا کہ اس وقت ملک میں جو کچھ بھی قومی تحریکیں بڑھ رہی ہیں وہ سب مفقود ہو جائیں گی کیونکہ رائے دینے کا معیار دولت یا علم قرار دیا گیا ہے، اگر ان دونوں معیاروں کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ باہر کے لوگ تعلیم یافتہ بھی ہیں اور دولتمند بھی ایسی صورت میں وہ رائے دینے

محتاج ہوں گے اور اس طرح ہندوستانیوں کی سیاسی ترقی میں حد درجہ رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ اگر ہم ریلوے ترقی پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ریلوے نے جہاں دیگر ممالک میں تجارتی اور صنعتی ترقی میں مدد دیکر من برسایا، اس کے برخلاف اس نے ہندوستان میں زہر ہلاہل کا کام کیا۔ ریلوے کمپنیوں نے اپنے اصول ایسے رکھے کہ باہر سے آنے والے مال اور ہندوستان سے پیداوار خام باہر جانے میں سہولت ہو مگر یہاں کی مصنوعات لیجانے میں دقت پیدا کی جائے۔ تیسرے یورپین منیجر اور مہارت یافتہ مزدوروں نے ہمیشہ تعصب سے کام لیا اور ہندوستانی کام سیکھنے والوں کو پورے پورے کام اور نکات نہیں بتلائے اس لئے اگر باہر کے سرمایہ دار آئیں گے تو کام کے ماہرین یہاں کے لوگوں کو اچھی طرح کام نہیں سکھائیں گے۔

ان تمام باتوں کو مد نظر رکھکر منورٹی کے اراکین نے باہر کے لوگوں کو کارخانے قائم کرنے کی اجازت دینے کے لئے چند شرائط پیش کی ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جو کمپنی قائم ہو اس کی رجسٹری ہندوستان میں کی جائے، اس سے مقصد یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی بہت سے ایسے دولت مند موجود ہیں جو کاروبار میں اپنا روپیہ لگانا چاہتے ہیں، چونکہ ہندوستان میں صنعتی کارخانوں کو خطرہ ہے اس لئے وہ یہاں روپیہ نہیں لگاتے، باہر جو کمپنیاں قائم ہوتی ہیں ان کے حصے پونڈ میں فروخت ہوتے ہیں اور پراسپکٹس بھی باہر ہی شائع ہوتے ہیں اس لئے قبل اس کے کہ اس کی خبر ہندوستان پہنچے تمام حصص باہر ہی فروخت ہو جاتے ہیں اگر ہندوستانیوں کو حصے ملے بھی تو ان کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور منافع بھی یقینی نہیں ہوتا کیونکہ پونڈ کی شرح مبادلہ بدلتی رہتی ہے کبھی اٹھارہ روپیہ ہے تو کبھی سترہ روپیہ۔ غرضیکہ یہ تمام دقتیں ہیں کہ باہر کارخانوں میں ہندوستانی روپیہ نہیں لگا سکتے، لہٰذا اس نقصان کی تلافی اس طرح ہو سکتی ہے کہ کمپنی کی رجسٹری یہاں ہو، اور حصے بجائے پونڈ کے ملکی سکوں کی شکل میں فروخت ہوں۔

دوسری شرط یہ ہے کہ چونکہ مجلس تنظیم (Board of Directors) میں باہر کے لوگ رہتے ہیں اس لئے وہ یورپی مفاد پیش نظر رکھتے ہیں، اس لئے خواہ کارخانہ دار باہر کے ہوں مگر مجلس انتظامی میں ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد ہونی چاہئیے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ ہندوستانی کارآموزوں کو کام سکھانیکا کافی انتظام اور وعدہ کیا جائے۔ اگر ان تمام شرائط کو بیرونی کارخانہ دار منظور کریں تو وہ کارخانے قائم کر سکتے ہیں، اور اگر یہ شرائط منظور نہیں تو ان کو کسی طرح اجازت نہیں دینی چاہئیے۔

منورٹی کی اس تجویز کا مجورٹی نے کوئی جواب نہیں دیا وہ صرف یہ کہتے ہیں کہ ان شرائط کی ضرورت ہی کیا ہے، یورپین لوگ خود ہندوستانیوں کو کام سکھائیں گے تاکہ ان کو محنت سستی ملے۔ دوسرے اراکین کے قید کی کیا ضرورت ہے۔ جو ہندوستانی اس لائق ہوں گے وہ اس کے رکن بنائے جائیں گے۔ اس کے بعد اراکین مجورٹی نے یہ کہا کہ انہیں حکومت کی طرف سے کچھ مراعات عطا ہوں۔ مثلاً زمین مفت دی جائے، لگان معاف کر دیا جائے، یا کچھ مال خریدنے کا وعدہ کیا جائے، اور جن کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے وہ ان شرائط سے بری رکھے جائیں۔ منورٹی نے اس کا یہ جواب دیا کہ بیرونی سرمایہ داروں کو ان حالات کے ماتحت کارخانے قائم کرنے کی اجازت دینا ہی بڑی رعایت ہے، کیونکہ ان کا مال مسلماً خریدنے کا وعدہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا کارخانوں کی ترقی اور اسمیں منافع ضروری ہے اور یہ خود کیا کم رعایت ہے۔ لہٰذا کسی مزید مراعات کی کوئی ضرورت نہیں۔

محنت

اوپر ہم پیداوار خام اور اصل کی کیفیت بیان کرچکے ہیں۔ اب یہاں کی محنت پر غور کرنا چاہئیے۔ محنت پر بحث کرنے سے قبل اس کی مختصر سی تعریف اور اس کا مفہوم بیان کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے محنت سے ایسے تمام جسمانی اور دماغی کام مراد ہیں جو بغرض حصول معاوضہ کئے جائیں۔ اور یہ معاوضہ عموماً بشکل مادی مطلوب ہوتا ہے۔ معاشیات میں محنت سے مراد نہ صرف جسمانی محنت ہوتی ہے بلکہ بسا اوقات اس سے مراد محنت کرنے والے یعنی مزدور ہوتے ہیں۔ اب ہم کو ہندوستان کی محنت پر غور کرنا ہے، اور یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں کے مزدور، اور اُن کی کارکردگی (Efficiency) کا کیا حال ہے۔ آیا یہاں جتنے مزدوروں کی ضرورت ہے وہ مل سکتے ہیں یا نہیں، اور اُن کی کارکردگی اور مہارت (Skill) کا کیا حال ہے، با مہارت اور بے مہارت محنت سے یہ مراد ہے، کہ جس کام کے سیکھنے میں دقت اور ذہانت درکار ہو وہ با مہارت کہلاتے ہیں اور جس کے سیکھنے میں دقت نہ ہو وہ بے مہارت کہلاتے ہیں مگر با مہارت اور بے مہارت کے معیار جداگانہ ہو سکتے ہیں یہ ممکن ہے کہ قصبوں میں جو محنت با مہارت خیال کی جائے وہ شہروں میں بے مہارت سمجھی جائے۔

خصوصیات محنت

اسی کے ساتھ محنت کی چند خصوصیات کو بیان کردینا بھی غیر موزوں نہ ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مزدور سے جدا نہیں کی جا سکتی، جہاں محنت کی ضرورت ہو وہاں مزدور کا موجود ہونا ضروری ہے دوسرے یہ کہ مزدور کو بغیر محنت کے مفر نہیں ایک تو اس وجہ سے کہ اس کے پاس اتنی دولت نہیں کہ گھر بیٹھکر کھائے دوسرے بیکار بیٹھنے سے اس کی مہارت خراب ہوتی ہے۔ تیسرے یہ کہ محنت میں مزدور کی مرضی کو بڑا دخل ہے اگر یہ چاہے تو باوجود نگرانی کام خراب کردے اور اگر چاہے تو بغیر کسی نگہداشت کے کام عمدہ اور جلد کرے۔ چوتھے یہ کہ مزدور ایک وقت معیّنہ سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، مزدور کچھ مشین تو ہے نہیں کہ یکساں چلتی رہے، اس کے واسطے اُن تمام چیزوں پر عمل کرنا جو صحت برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہیں، لازمی ہیں روزانہ تھوڑی دیر کام کرنے کے بعد مزدور تھک جاتا ہے اور بغیر آرام لئے کام نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ محنت عمر کی پابند ہے۔

ہندوستان میں محنت کی حالت،

یہ تو اصولی بحث تھی اب ہم کو ہندوستانی محنت کی حالت دیکھنی ہے۔ کسی جگہ کی محنت بتانے کے لئے صرف یہ بتانا کافی نہیں کہ وہاں کی آبادی اتنی ہے اور مزدور اتنے، بلکہ اسی کے ساتھ یہ بتانا چاہئیے کہ ان کے قویٰ کیسے ہیں ان کی کارکردگی کیسی ہے وہ کس قسم کی محنت کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں صرف مزدوروں کی صورت دیکھنی منظور نہیں، بلکہ اس کی کارگردی سے بحث ہے اگر کوئی شخص بالکل کام ہی نہ کرے تو اس کا وجود اور عدم برابر ہے، بلکہ وجود سے عدم بہتر اس لئے کہ جب وہ کچھ دولت پیدا نہیں کرتا تو اس کا خرچ قوم اور ملک پر بار ہے۔ محنت کی ضروری شرائط میں کارکردگی کا عمدہ ہونا ہے۔ اور یہ کسی قوم کی عام جسمانی و دماغی صحت اور اخلاق و معاشرتی حالت پر منحصر ہے۔ ہندوستان کی ۳۱ ½ کروڑ آبادی کو دیکھکر یہ نتیجہ نہیں نکال لینا چاہئیے کہ چونکہ یہاں کی آبادی دوسرے بڑے بڑے ممالک سے بہت زیادہ ہے اس لئے یہاں محنت کی بھی بہتات ہے۔ اگر ہندوستان کے کاروبار کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں کی محنت کی کمی نہیں، بلکہ ضرورت سے زیادہ ہے مگر یہاں جو دقت ہے وہ یہ کہ محنت میں توازن (Equilibrium) نہیں یعنی جہاں مزدوروں کی

ضرورت ہے وہاں مزدور نہیں۔ اور جہاں ضرورتیں وہاں ان کی کثرت ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں ترک وطن کا رواج نہیں۔ یہاں کے باشندے حد درجہ قدامت پسند ہیں اور اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسری جگہ جانا گوارا نہیں کرتے۔

چونکہ ہندوستان کا عام پیشہ زراعت ہے، اور صنعت و حرفت کا رواج بہت کم ہے اس لئے تقریباً نوّے فی صدی لوگ دیہات میں رہتے ہیں اور صرف دس فی صدی قصبات میں۔ انگلستان کی حالت اس کے برعکس ہے وہاں کی ۷۸ فی صدی آبادی قصباتی ہے، ہندوستان میں صنعتی کاروبار کے لئے مزدور نہ ملنے کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ ہندوستان کی آبادی از حد غیر مساوی طریق سے پھیلی ہوئی ہے، مثلاً بنگال اور بہار میں آبادی کا اوسط فی مربع میل ۵۰۰ کے قریب ہے تو بمبئی میں صرف ۱۴۰۔ برما میں ۵۳۔ اور بلوچستان میں صرف ۶۔ ہندوستان کی غیر مساوی آبادی کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ فی مربع میل ۶ سے لیکر ایک ہزار تک پڑتا ہے لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ترک وطن کا رواج ہو اور آبادی میں توازن پیدا ہو۔

لوازم کارکردگی

ہندوستان میں مزدوروں کی کارکردگی دوسرے ممالک کے لحاظ سے بہت کم ہے مگر اس کے بھی چند اسباب ہیں اگر وہ موانع دور ہو جائیں تو یہاں کی کارکردگی بھی بہت بڑھ جائے مثلاً کارکردگی کی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ ملک کی آب و ہوا اور موسم عمدہ ہو آب و ہوا اور موسم کا اثر صحت پر پڑتا ہے۔ انتہا درجہ کی گرم و سرد آب و ہوا، اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہو جانا صحت کیلئے بہت مُضر ہے اور بغیر صحت انسان کام نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں موسم جلد جلد بدلتا ہے دوسرے یہاں کی آب و ہوا بھی صاف نہیں رہتی۔ آئے دن ہیضہ، پلیگ، ملیریا، اور چیچک جیسی بیماری آبادی کا صفایا کرتی رہتی ہیں۔ موسم کی تبدیلی کے اوقات کو تو نہیں بدلا جا سکتا۔ مگر ان وباؤں کا دور کرنا ایک حد تک انسان کے بس میں ہے اگر صفائی کا اعلیٰ انتظام کیا جائے تو یہ وبائیں دور ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپین ممالک میں جہاں صفائی کا عمدہ انتظام ہے، ان وباؤں کا نام تک نہیں سنا جاتا۔

کارکردگی بڑھانے کے لئے صاف ستھری، زود ہضم اور پیٹ بھر غذا ملنا ضروری ہے۔ مگر یہاں غربت کی وجہ سے صاف ستھری تو کہاں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا بھی مشکل سے ملتا ہے۔

خوراک کے بعد لباس اور مکان کی ضرورت ہوتی ہے۔ لباس ایسا ہو جو سردی اور موسمی اثرات سے بچا سکے۔ لباس کا صاف ہونا بھی ضروری ہے۔ تاکہ گندگی سے انسان بیمار نہ پڑ جائے گو ہندوستان میں زیادہ اور قیمتی گرم لباس کی ضرورت نہیں کیونکہ یہاں کی آب و ہوا بہت سرد نہیں، پھر بھی جتنے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی یہاں کے مزدوروں کو بمشکل میسر آتے ہیں۔ مکان کے لئے ضروری ہے کہ کشادہ اور ہوادار ہو۔ دوسرے بارش میں پانی جاڑے میں سردی اور گرمی میں دھوپ سے بچا سکے۔ مگر یہاں کے غرباء کے جیسے مکان ہوتے ہیں وہ سب پر روشن ہے۔

مزدوروں کی کارکردگی بڑھانے کے لئے جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ تعلیم کی ہے اور تعلیم میں بھی صنعتی تعلیم کی۔ Technical Education غیر صنعتی تعلیم تو خیر بھلی بُری کچھ ہے بھی اور اس میں ترقی بھی ہو رہی ہے۔

ہندوستان میں صنعتی تعلیم کی سخت ضرورت ہے کیونکہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہر شخص موجودہ تعلیم پا کر عالم و فاضل بنے۔ قدرت نے ہر دماغ میں مختلف قسم کی قابلیت ودیعت کی ہے۔ اگر وہ اپنے صحیح راستے پر لگائے جائیں تو بہت ترقی کر سکتے ہیں یہی حال ہماری تعلیم کا ہے۔ آج سیکڑوں اشخاص اندھے کی لاٹھی کی طرح ایک قسم کی مروجہ تعلیم کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت اور روپیہ ضائع کرتے ہیں۔ اگر ان کو صنعتی تعلیم دیجاتی تو ان میں سے اکثر ترقی کے علمی زینہ پر پہنچ سکتے تھے۔ یہ ہماری خراب تعلیم کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں قابل دماغ جو ترقی کر سکتے تھے دو کوڑی کے بھی نہیں رہے۔ یورپ کی ترقی کا راز ان ہی مزدوروں صناعوں اور پیشہ وروں کی کارگزاری میں پوشیدہ ہے اگر یہاں بھی صنعتی تعلیم کی طرف خیال کیا جائے تو علمی کارکردگی کے مزدور پیدا ہو سکتے ہیں۔ آبادی کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کی تعلیمی حالت بھی جس قدر پست ہے وہ ذیل کے نقشے سے معلوم ہو سکتی ہے۔

صوبہ	زیر تعلیم بچے فی صدی		خواندہ لوگ فی دس ہزار		انگریزی داں فی دس ہزار	
	لڑکے	لڑکیاں	مرد	عورتیں	مرد	عورتیں
برما	۳۹٫۴	۸٫۹	۳۷۲۰	۶۰۸	۹۱	۲۰
بمبئی	۳۷٫۱	۵٫۸	۱۲۰۶	۱۴۵	۱۷۱	۲۸
مدراس	۳۴٫۴	۷٫۰	۱۳۷۹	۱۳۵	۱۲۱	۱۳
بنگال	۳۲٫۶	۵٫۲	۱۱۷۴	۸۳	۱۲۸	۷
صوبہ متوسط	۲۴٫۲	۲٫۶	۶۰۴	۳۲	۶۱	۶
پنجاب	۱۹٫۸	۴٫۰	۶۵۳	۶۴	۹۰	۱۱
صوبہ متحدہ	۱۷٫۹	۱٫۷	۶۱۱	۵۰	۴۹	۷
سرحدی صوبہ	۱۷٫۲	۲٫۹	۵۶۸	۵۹	۸۳	۷

(یہ نقشہ پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی کی تصنیف معیشت الہند سے نقل کیا گیا ہے اور اس میں ۱۹۲۱ء کی سرکاری تحقیقاتی رپورٹ سے لیا گیا ہے)

اس تمام بیان سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ یہاں جو محنت کی خراب حالت ہے وہ چند اسباب کے ماتحت ہے اگر ان کو دور کر دیا جائے تو یہاں کی کارکردگی بڑھ جائے گی۔ لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہاں محنت کی کمی ہے اور صنعت و حرفت کو فروغ نہیں ہو سکتا اب حکومت بھی اس کی طرف خیال کر رہی ہے اور روز بروز اس قسم کے موانع دور کئے جا رہے ہیں۔

جون ۱۹۲۱ء میں حکومت ہند نے مسٹر میلونی (Mr. Maloney) کو اس بات کے لئے مقرر کیا کہ وہ روئی کی گرنیوں

میں کام کے حالات کا معائنہ کر کے اس بارے میں اپنی رپورٹ پیش کریں اٹھارہ مہینے کی تحقیقات کے بعد مسٹر میلونی نے اپنی رپورٹ پیش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کارخانوں میں ہوا کی آمد اور دوسرے ضروری امور جن کا کام کرنیوالوں کی صحت پر اثر پڑتا ہے بتدریج انتظام کیا جا رہا ہے اس تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کام کے حالات کی اصلاح کے لئے خاص خاص تدابیر حکومت اور پبلک کے سامنے موجود ہیں اور اب یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اسی طرح دوسرے مسائل پر غور کر کے مناسب تدابیر اختیار کی جائیں گی۔

مزدوروں کی بین الاقوامی کانفرنس (International labour Conference) نے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں کے متعلق چند تحریکیں منظور کی ہیں انہیں تحریکات کی بنا پر بمبئی۔ بہار۔ بنگال۔ اور پنجاب کی مقامی حکومتوں نے اپنے اپنے علاقوں میں مفصل تحقیقات کی اور اس بارے میں متعدد تدابیر اختیار کیں۔ اس تمام جد و جہد کا ایک اور خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ کارخانہ دار بھی اپنے مزدوروں کی آرام و آسائش کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں اور عوام الناس میں بھی اس قسم کے مسائل سے دلچسپی ظاہر ہونے لگی ہے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں قانون کارخانہ جات میں متعدد اصلاحیں کی گئی ہیں۔ منجملہ اور اصلاحات کے چند یہ ہیں کہ کام کے اوقات ہر ہفتہ ساٹھ گھنٹے مقرر کئے گئے۔ دوسرے یہ کہ بچوں کے لئے ملازمت کی عمر نو سال سے بڑھا کر بارہ سال کر دی گئی ان کے علاوہ سنہ ۱۹۲۳ء میں بھی قانون کارخانہ جات میں بہت سی اصلاحیں کی گئیں۔

ایک اور قانون جس پر حال میں نظر ثانی کی گئی ہے وہ قانون معدنیات ہے ان اصلاحات کی رو سے تیرہ سال سے کم عمر کے لڑکوں کو معدنیات میں کام کرنے کی ممانعت ہے۔ اور یہاں بھی کام کے اوقات میں کسی قدر تخفیف کی گئی ہے، اور اب اس امر کی اجازت نہیں کہ وہ لوگ جو زمین کے نیچے رہ کر کام کرتے ہیں ہر ہفتہ ۵۴ گھنٹے سے زیادہ کام کریں اس کے علاوہ ہر ہفتہ ایک دن کی چھٹی بھی لازمی ہے۔

قوت محرکہ | اس کے بعد قوت محرکہ (motive power) کا نمبر ہے قوت محرکہ سے مراد وہ قوت ہے جس سے انجن اور کلیں چلائی جاتی ہیں یہ تو ظاہر ہے کہ جب تک قوت محرکہ نہ ہو اس وقت تک دنیا کی کوئی صنعت ترقی نہیں کر سکتی آج کل یہ قوت دو طریقوں سے حاصل کی جاتی ہے ایک بھاپ (Steam) اور دوسرے برق (Electricity) بھاپ حاصل کرنے کے لئے کوئلے کی ضرورت ہے چونکہ انگلستان میں لوہے اور کوئلے کی کانیں بکثرت ہیں اس لئے وہاں نئی نئی کلیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں۔ جس کی بدولت صنعت و حرفت کو روز بروز فروغ ہو رہا ہے، مگر کچھ عرصہ سے ماہرین ارضیات (Geologists) کا یہ خیال ہو رہا ہے کہ جب کوئلے کی کانیں دنیا میں ختم ہو جائیں گی تو اس وقت کیا کیا جائیگا، اس لئے کسی دوسرے مادہ کی تلاش جاری ہے اور اسی وجہ سے اب برق کو زیادہ فروغ دیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں کوئلے کی چند بڑی بڑی کانیں ہیں مگر یہ بالکل ناکافی ہیں اسلئے یہاں بھی بہت سے کارخانوں میں برق سے کام لیا جا رہا ہے اور برق پیدا کرنیکا خیال بڑھ رہا ہے۔

قوت محرکہ حاصل کرنیکے ذرائع | مخالفین ہند جو یہ کہتے ہیں کہ قوت محرکہ کی کمی کی وجہ سے یہاں صنعتی کارخانے قائم نہیں ہو سکتے۔

بڑی حد تک غلطی پر ہیں گو یہ صحیح ہے کہ اسوقت ہندوستان میں بڑے بڑے کارخانے ہیں جل رہے کوئلے کی بہتات ہیں اور برق سے بھی کم کام لیا جاتا ہے مگر ان کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ قوت محرکہ حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہیں یا نہیں اگر موجود ہیں تو کیا وجہ کہ قوت محرکہ حاصل نہ ہوسکے اور کارخانے نہ چل سکیں۔ ذیل میں ہم چند مثالیں پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی کی کتاب معیشت الہند سے پیش کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا کہ یہاں کس قدر قوت محرکہ موجود ہے۔ چنانچہ:-

"ریاست میسور جو معاشی ترقیات کے لحاظ سے ہندوستان میں بہت پیش پیش نظر آتی ہے، دریائے کاویری کے آبشار سے برقی قوت کی مقدار کثیر حاصل کرتی ہے جس سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر بنگلور میں روشنی ہوتی ہے اور نوّے میل دور کولار کی سونے کی کانوں میں کلیں چلتی ہیں اور زائد مقدار حکومت مدراس کے ہاتھ فروخت کردی جاتی ہے - - - - - - -
مغربی گھاٹ میں مشہور عالم ٹاٹا کمپنی ایک مصنوعی آبشار سے بمقام لوناولا برقی قوت حاصل کرکے وہ کار نمایاں انجام دے رہی ہیں کہ ہندوستان کے واسطے باعث فخر ہے - - - - - - - - - - - - -
ایک اور بڑی تجویز زیر پیش ہے وہ یہ کہ پنجاب میں دریائے ستلج پر نالاگڈھ کے قریب ایک بند باندھا جائے جو تقریباً چار سو فٹ بلند ہوگا اور بھکرا بند کہلائے گا سیلاب کے زمانہ میں یہ بند ستلج کا پانی روک کر ایک جھیل میں بھر دیگا چونکہ مجوزہ بند اور جھیل پہاڑی پر واقع ہے اس لئے ساڑھے تین ہزار فیٹ کی بلندی سے پانی زور و شور سے نیچے کو دوڑے گا، جس سے تقریباً تین لاکھ گھوڑوں کی برقی قوت روزانہ حاصل ہوگی اور دہلی سے لائل پور تک بہ آسانی ہر طرح کا کام دے گی، علاوہ بریں اس پانی سے کوئی بیس لاکھ ایکڑ زمین کی سالانہ آبپاشی ہوسکے گی - - - - - - - - - - - -
علیٰ ہذا ایک جدید برقی قوت کا کارخانہ مغربی گھاٹ میں بمقام تنشی پٹ۔ ایک کشمیر میں اور تین پنجاب میں دریائے ستلج پر زیر تجویز یا زیر تعمیر ہیں۔ سرکار ہند آبشاروں سے برقی قوت حاصل کرنے کے مسئلہ پر آج کل خاص توجہ کر رہی ہے، ماہرین تحقیقات میں مصروف ہیں۔ اس کے متعلق جو تازہ ترین سرکاری رپورٹ شائع ہوئی ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمالیہ کے دامن میں اس سرے سے اس سرے تک برما۔ بہار۔ بنگال۔ صوبہ متحدہ۔ پنجاب، کشمیر اور نیز سرحدی صوبہ میں جابجا دریاؤں کے قدرتی یا مصنوعی آبشاروں سے بہت کچھ برقی قوت حاصل ہوسکتی ہے، علیٰ ہذا احاطہ بمبئی میں مغربی گھاٹ پر جہاں پہلے سے ایک برقی قوت کا کارخانہ جاری ہے اور دوسرا زیر تعمیر، مزید کارخانوں کی گنجائش موجود ہے۔ مدراس اور صوبہ متوسط میں بھی برقی قوت کا انتظام ہونا ممکن ہے - - - - - - - - - - - -
حاصل کلام یہ ہے کہ تقریباً ستر (۷۰) لاکھ گھوڑے کی طاقت کی مقدار تک برقی قوت بہ آسانی پیدا ہوسکتی ہے، جو سال کے پورے ۳۶۵ دن برابر ۲۴ گھنٹے روزانہ کام دے گی۔ اس کی مقدار ایک کروڑ گھوڑوں کی طاقت تک پہنچانی بھی کچھ زیادہ دشوار نہیں، اور اگر پوری پوری کوشش کی جائے تو مجموعی مقدار ایک کروڑ ستر لاکھ گھوڑوں کی طاقت تک پہنچنی ممکن ہے۔ واضح ہو کہ بجلی کی قوت محرکہ گھوڑے کی طاقت یا کشش کے حساب سے شمار ہوتی ہے، اور گھوڑے کی

"طاقت دس تندرست مردوں کی طاقت کے برابر مانی جاتی ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں کس قدر"
"قوت محرکہ ہزارہا سال سے بیکار بہ رہی ہے، اگر اس سے کام لیا گیا تو بلا مبالغہ چاندی سونے کے دریا بہ نکلیں گے ـ ـ ـ ـ"
اس تمام بیان کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں کہاں تک قوت محرکہ کے ذرائع موجود ہیں۔

آج کل تعلیم حاصل کرنے کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کو اپنا ذریعہ معاش بنالے اور زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرے وہ زمانہ گیا جب تعلیم صرف علم حاصل کرنے کی غرض سے ہوتی تھی، کسی پیشے یا ہنر کی تعلیم حاصل کرنے سے قبل اس کو سوچ لینا چاہیئے کہ وہ آئندہ زندگی میں کیا کرنا چاہتا ہے، اس طرح ایک مقصد کے ماتحت تعلیم حاصل کرنے میں تعلیم صحیح اور جلد حاصل ہو سکتی ہے، بدقسمتی سے ہندوستان میں اس کا رواج بہت کم ہے، لوگ بلا سوچے سمجھے آنکھ بند کرکے لڑکوں کو اسکول میں داخل کر دیتے ہیں۔ اگر ان سے سوال کیا جائے کہ آپ اپنے لڑکے کو کس پیشے کی طرف لگانا چاہتے ہیں تو عموماً یہ جواب ملتا ہے کہ پہلے میٹرک یا بی۔ اے تو پاس کرلے اس کے بعد دیکھا جائیگا۔ یہ تعلیم کا بہت بڑا نقص ہے یورپ میں ایسا نہیں ہوتا، وہاں لوگ اپنے لڑکوں کو تعلیم دلانے سے قبل سوچ لیتے ہیں کہ کس چیز کی تعلیم دینی مناسب ہے اور اس میں ترقی کی کہاں تک گنجائش ہے۔

تنظیم کی ضرورت

جس طرح یورپ میں اور شعبوں کی تعلیم دیجاتی ہے اسی طرح ایک شعبہ تنظیم کا بھی ہے اور وہاں کے باشندے اپنے بچوں کو تنظیم کی تعلیم بھی دلواتے ہیں اور فن تنظیم ایک بڑا فن مانا جاتا ہے۔ چونکہ وہ ایک صنعتی ملک ہے اس لئے وہاں اس کی طلب بھی زیادہ ہے۔ اب ہندوستان میں آجر (Employment) پیدا کرنے کی یہی صورت ہے کہ نئے نئے کارخانے قائم کئے جائیں اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں جنسے صنعت کو فروغ ہو، چونکہ ہندوستان میں کارخانے بہت کم ہیں اس لئے اس کی تعلیم کی طرف لوگوں کا خیال بھی نہیں ہوتا لہذا اس کی طلب پیدا کرنی چاہئیے۔ دوسرے آجر اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جبکہ ملک میں صنعتی کارخانے ہوں کیونکہ صرف کتابی قابلیت حاصل کر لینے سے پوری کامیابی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ ایسے کاموں میں تجربے کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اور جب تک کارخانے نہ ہوں تجربہ کس طرح حاصل ہو سکتا ہے اسکے علاوہ جو لوگ اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہیں ان کے لئے یہاں موقع نہیں ان کو باہر جانا پڑتا ہے اور اس میں ایک کثیر رقم صرف ہونیکے علاوہ بہت دقتیں اٹھانی پڑتی ہیں اور اسی بنا پر بہت سے لوگ جو اس کی تعلیم حاصل کرنی بھی چاہتے ہیں مجبوراً نہیں کر سکتے۔ لہذا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا، کہ ہندوستان میں تنظیم نہیں کیونکہ جب کسی چیز کی طلب (Demand) ہی نہ ہو تو رسد (Supply) کہاں سے ہو سکتی ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ پہلے اس کی طلب پیدا کی جائے یعنی کارخانے قائم کئے جائیں تو رسد خود بخود مہیا ہونے لگے گی اس کے بعد بھی اگر انتظام کرنیوالے نہ ملیں تو شکایت ہو سکتی ہے، لیکن قبل از وقت بغیر آزمائے ہوئے کہدینا کہ یہاں تنظیم نہیں مل سکتی غلط ہوگا۔

ابو المنصور حمید

سمن پوش

ناہید سے میرا تعارف لکھنؤ میں ہوا جبکہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی، ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گذر جائے یہ ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی، اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے، مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ اس کو کسی مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھکو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا، میں اس پیکر جمیل میں محو ہو گیا جو صفحۂ قرطاس سے مجھکو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، کہ اس عورت کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی، جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا۔ گویا وہ کہہ رہی تھی "ٹھہرو اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو" اس کے رخسار گلابی تھے۔ بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے۔ اور۔ میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں جوہی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا کہ ناصری جو اپنا سامان نقاشی لینے دوسرے کمرے میں چلا گیا تھا واپس آگیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا اور میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ تصویر میں ایک ناقابل بیان چیز ہے جس کو کاغذ پر بجنسہ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اسی کی صنعت تھی جس کا نہ مجھکو اس وقت یقین تھا نہ اب ہے۔ میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔

باہر برآمدہ میں پہنچکر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی جو مجھکو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہاں وہی متوحش مگر شیریں مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی! میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آرہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ سے ہو کر جا رہا تھا، یکایک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی۔ میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ مجسمہ کے پاس بنچ پر بیٹھا ہوا کون پڑھ رہا تھا؟ وہی سفید پوش عورت یہاں بھی سرنگوں بیٹھی تھی! اس کے گلے میں وہی چنبیلی کا ہار تھا جس کے ساتھ وہ بلا ارادہ شغل کر رہی تھی۔ رعشہ براندام میں اس کی جانب بڑھا۔ میرے قدموں کی آہٹ سے وہ چونکی اور اس کی خمار آگیں آنکھوں نے ایک الم ناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ باوجود دماغ کی پراگندگی کے میں نے اس قدر جائزہ لے لیا

اس کا چہرہ زرد تھا جسم کی ساخت نازک تھی۔ رنگ میں صباحت تھی۔ دوش تک وہ عریاں تھی۔ اس کی بلورین گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے۔ اور وہ ان کو برابر کرتی جاتی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، راستہ چلنے والوں میں کوئی اور بھی اس "زہرۂ ارضی" کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن ہماری طرف کوئی بھی متوجہ نہ تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرا متخیلہ مجھے دھوکا دے رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا۔ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات، عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے جس نے مجھکو متشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر نے مجھ پر وہ ہیبت طاری کی کہ میں بےساختہ چلّا اٹھا، پھر دیکھا تو نشست خالی تھی، وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فریخ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں اپنے چند احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا تو مضحکہ کا نشانہ بنتا۔ لہذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا، جس کو ناصری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھکو بےقابو کر دیا تھا، میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا صرف شادکیشی کا۔ ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سمن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا۔ اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا، نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش۔ میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا۔ یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کئے ہوئے ارکسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ تنہا تھی، اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "اس عورت کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے؟ وہی جس کے گلے میں ہار ہے"

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی اور سر ہلا کر جواب دیا۔ "نہیں تو۔ کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے" میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا "آرکسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے"

میرا مخاطب تعجب سے مجھکو دیکھنے لگا "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرکسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے" اس نے مجھ سے کہا۔

کوئی عورت نہیں! اب مجھے ہوش آیا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "شاید مجھکو مغالطہ ہوا" اور فوراً بحث بدل دیا۔ جبتک میں تھیٹر ہال میں رہا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہوں، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا جہاں "وہ" اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی دردمند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی، آج اس کے سامان

آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آرہا تھا۔ یعنی ایک خوبصورت پنکھا جسکو وہ کبھی کبھی جنبش دیدیتی تھی۔ رہ رہ کر وہ اسی پرحسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشا ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا اور چلنے کے لئے اُٹھے تو وہ بھی اُٹھی اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی ہجوم میں غائب ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہزادہ پر پھر اس کی ایک جھلک دیکھی، اس کا جسم اس قدر نازک تھا، وہ اس قدر کم عمر اور نا آزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اُس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اُس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ "کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سر نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ مجھے پریشان کر رہا ہے؟" میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ "لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لئے دُکھ رہا ہے خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو"

اسی کشاکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پیاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا، میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے دیکھتے غائب ہوگیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا، یعنی میری دہشت دور ہوگئی اور مجھے خیال ہوگیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی، عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے، میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھکر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا، اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنؤ میں پندرہ روز اور قیام رہا۔ لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی البتہ ناصری کے ساتھ جاکر میں نے اُس تصویر دا ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔اے کیا تھا اور اس دورِ تعطل سے گزر رہا تھا جس سے اسکول اور کالج کا زمانہ ختم کرکے کم و بیش ہر شخص کو گزارنا ہوتا ہے یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ایس۔سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لئے اُن کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی ایک تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالیشان عمارت کے خریدا ہے اور لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب اُن کی مسرتوں میں شرکت کریں سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی صحبت کی کیفیتوں سے اُس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی معاف نہ کریگی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف حاصل ہو سکتا تھا، جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر المناکیوں سے ہوا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں۔ بہرحال سائرہ کو میری طرف سے حسنِ ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا

ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا۔ وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا۔ میں نے فوراً سامانِ سفر درست کر لیا میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی، جو ایک وسیع احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پھاٹک میں لا کر اتارا ہے، تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا، جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوس ارضی" کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہو گا، اس میں ذوقِ سلیم اور حسِ لطیف کہاں تک رچا ہو گا، اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اسکے اصل مالک کی مالی استطاعت کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی صاحب اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہے تھے اور پھر بھی ان کو سیری ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا۔ شمیم نے کہا "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بدنصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تیار کرایا تھا، وہ مصنف تھا۔ شاعر تھا، نقاش تھا۔ اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گزرا کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لئے بیتاب معلوم ہوتے ہو۔ اس کا نام جمال الدین تھا"

"جمال الدین"! میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما "قربانِ محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا۔ مگر میں یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی تھا، اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی، وہ خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا "آپ نے برا کیا جو سہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آ رہے ہیں آپ نے ان کو راحتِ شب سے بھی محروم کر دیا"

میں نے مسکرا کر کہا "نہیں نہیں قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر و نقاش اپنی زندگی سے کیوں بیزار ہو گیا؟"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ سنا ہے کہ اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی، جس کو کسی نے واللہ اعلم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو زیادہ نہ برداشت کر سکا اور غالباً سال ڈیڑھ سال بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعر یوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں، اور ان کا کسی رو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں" شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزا پایا جاتا تھا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بھی بے حس ہو سکتا ہے۔ میں نے جواب دیا "شمیم تمہاری گفتگو نے مجھے دکھ تو بہت پہنچایا لیکن تم سے اسکے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی۔ یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں، یہ مرض عالمگیر ہے جو ساری دنیا میں وبا کی طرح پھیلا ہوا ہے جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ

کے کوئی معنی بھی نہ ہوں تم جو دل کو ایک پارۂ گوشت سمجھتے ہو جو پمپ کا کام دیتا ہے۔ تم جو انسان کو اک آلہ سمجھتے ہو۔ بتاؤ تم نے اپنی عمر ضائع کرکے کون سی نئی بات حاصل کی۔۔۔۔۔ ایں کہ دل نام کردۂ بہ مجاز

روبہ پیش سگان کو انداز۔۔۔۔۔۔ شاید ہر شخص جو انسانوں اور جانوروں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے، اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے، جو غلاف قلب (Pericardium) میں ملفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے۔ مگر تم کو کیا کہوں بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہیں خود فریبیوں میں مبتلا ہے، وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت و بداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش" (Logic choppers) رکھا ہے کمبخت سب ہی جانتے ہیں کہ انسان کا علم صرف وضعی اور اعتباری ہو سکتا ہے اس لئے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا عقل کی قوا نے انسان سے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقاء کا سد باب ہو گیا وہ اپنا نصب العین بھول گیا، بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو نہایت صائب رائے اس بارے میں دی ہے۔

"ہر چند عقل کل شدۂ بے جنوں مباش"

غنیمت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیتے تھے اور جو ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے تھے ورنہ آج میتھ کی طرح وہ مخلوق بھی صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی جو انسان کہلاتی ہے۔"

میرے ہیجان کا دورہ شروع ہو گیا، میں انسان کا "جہل مرکب" نہیں برداشت کر سکتا، یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔ شمیم بے کیف ہونے لگے تھے۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں سوئی سے کام لینا چاہئیے وہاں میں تیروں اور بھالوں کے وار کرنے لگتا ہوں۔ ملنے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل مجھ سے ہمیشہ متنفر ہو جاتا ہے چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ۔ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا، جس کا سلسلہ نہ جانے کیا اور کہاں ختم ہوتا۔ اگر ان کی والدہ درمیان میں بول نہ اٹھتیں کہ "اچھا بس اس بیکار بحث کو جانے دو ایک لطیفہ اور سنو گاؤں والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے، اور میرا قیاس ہے کہ نیچے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا ہی کیا ہے۔ مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔"

میں نے اپنے دل میں کہا "نہ جانے گاؤں والے جاہل ہیں یا آپ" شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور ایک اور حملہ مجھ پر کر ہی بیٹھے انھوں نے کہا "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے، اگر مجھ پر کوئی راز منکشف بھی ہوگا تو میں اسکو تم سے مخفی رکھوں گا"

(اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے عطر خانے ہندوستان میں خاص شہرت حاصل کی ہے)

رات زیادہ جا چکی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے کہا "آپ کا چہرہ دھندلا ہو گیا ہے۔ دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں، خدا کے لئے آج کے مبحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا"

میں نے ہنسکر جواب دیا "سائرہ بچوں کی سی باتیں نہ کرو" اور اپنے بستر پر آ کر لیٹ رہا۔ نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی میں دو بجے رات تک پڑا سوچتا رہا۔

گرمی کی سہانی رت تھی۔ پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھیں لگ گئیں، لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے۔ میں اٹھ بیٹھا، شمیم نے کہا "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں۔ یا رات کی کبیدگی ہنوز باقی ہے۔؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو نہیں گرم کئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیئے، اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے "تم شاید رات بھر سوئے نہیں، اچھا چلو ہوا کسل دور کر دیگی"

"ہاں اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی" یہ کہکر شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امید و ں سے کہیں زیادہ دلکش اور فرحناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا، قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے، عالم تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں۔ تالاب کے چار طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آ گئی تھوڑی دیر کے لئے میں پھر اپنے عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے دیکھکر پوچھا "کیا سوچ رہے ہو"

"کوئی خاص بات نہیں" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھا دوں" میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔

چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں، جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی۔ اس پر گھاس اُگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی میں نے بیٹھکر اس کو صاف کیا تو اس پر "ناہید" لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرا ایما پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا۔ دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا، اس لئے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا، اور زمانہ کی رگڑ نے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا۔ میری رگ رگ بیچین ہو رہی تھی کہ کسی تدبیر سے اس کتبہ کو پڑھ لوں، لیکن کچھ بس نہ چلا، شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا، تا کہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا۔ آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبد العلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چاے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید" کا مزار رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم، فونوگراف، تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ کچھ لکھوں یا مطالعہ کروں مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر میں "نماز" کے لئے جہاد کرنے سے

کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے۔ مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح کے کتبہ پر نظرِ ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی لیلیٰ ارم دیکھتا رہا۔ نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے۔ رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا، میرا مطالعہ بدستور جاری تھا۔ کبھی کبھی کتاب بند کرکے کچھ سوچنے لگتا۔

تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا، اور سامنے کے کمرے سے سگریٹ لیکر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلہ پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "سمن پوش" اس وقت میں نے حیرت کو اپنے اعصاب پر قابو پانے دیا نہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس کو قائم رکھنے میں کامیاب رہا، میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا، گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں نے آہستگی سے دریافت کیا "اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟"

اس نے پھر اسی طرح اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا "اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے" !

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"بالکل" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا، جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا، تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھا دیں جو نم آلود تھیں۔ "میرے لئے دعا کیجئے جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لئے دعا نہیں کی بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا"۔ اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔ اب "سمن پوش" قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا۔ اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بیساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں" اس نے کہا "آپ میرا پورا افسانۂ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئیے۔ میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن اس احاطہ میں دیکھا ہے"۔

"ناہید جمال الدین کی موضوعہ پرستش؟" میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔

"ہاں ...."

"تم کو قتل کس نے کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے، میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے گویا اپنی

داستان کو دہرانا اس کے لئے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

"ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کروں کہ اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کردوں" اُس نے کہا "میرا قاتل میرا شوہر تھا لیکن اُس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اُس کو دھوکا ہوا جس کا مرتے دم اس کو علم نہ ہوسکا۔ وہ میری محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھئے وہ مجھکو پوجتا تھا - - - - - - - - - - - - - - - - - -

آپ خاموش سُنتے جائیے میرے لئے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہوگیا، اور اس ویرانے کو آباد کرکے بیٹھ رہا۔ وہ کہا کرتا تھا میرے دونوں جہان تیری آنکھوں میں ہیں۔ "جمال منزل" اُس نے میرے لئے بنوائی تھی۔ اور میں۔ میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین آسمان، چاند سورج، دن رات، سب اسی کی تجلیاں ہیں۔ مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اسی کے طفیل میں ملی تھی۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برا نہیں سکتیں"

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑگئے تھے، وہ دم لینے کے واسطے رک گئی۔ میں بیخودی کی حالت میں اُس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی یعنی آتش پرست" اُس نے آخری لفظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان کرنا شروع کیا۔ "اور ایکٹنگ میرا ذریعۂ معاش۔ لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا مجھے کسی سے کبھی کوئی اُنس نہ ہوا تھا، جمال نے مجھکو ایک نئی لذت سے آشنا کیا، اُس کو مجھ سے محبت پیدا ہوگئی۔ اُس کے ایک ایک لفظ، اُس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اُس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اُس کی ہستی مجھکو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اُس کی ہنسی میں ہمیشہ دُکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں میٹھے کی سی دلدوز تاثیر تھی، سوز و گداز اس کے خمیر میں تھا، وہ سراپا تصویر درد تھا، میرا میلان ٹریجڈی کی طرف تھا، اس لئے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا"

وہ پھر ایک مرتبہ زبان تر کرنے کو رُکی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا قصہ بیان کرجائے، لہٰذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں"؟ اُس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا۔ اُس کا چہرہ اُس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں۔ میں مدت سے اس گھڑی کا مشتاق تھا" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غمخواری کریں گے" اُس نے مسترحمانہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی ————

ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے منہ موڑ کر مجھ سے شادی کرلی اور ہم دونوں نے دنیا کے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی، دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحۂ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لئے وقف کردی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اُس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہوچلا تھا، اُس نے میری تصویریں کھینچیں اور اُن میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی، جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا، میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی۔ اس طرح دو سال گزر گئے دفعۃً یک زمانہ نے ایسی گردش کی کہ بات کی بات ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔

جمال مجھ سے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے ہوتی تھی بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ رہ چکی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی تاہم کبھی کبھی اُس کے احباب اُس سے ملنے آ جایا کرتے تھے اور وہ اُن سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اُس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اُس کا شاید مشہور تھا ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں رہا کرتا تھا فیروز کی طبیعت متبذل اور عامیانہ تھی۔ اُس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھیں، مگر جمال اُس کی بوالہوسیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا۔ شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی تیز کیوں نہ سمجھئے، لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکہ کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گزرتی تھیں اُس کی [illegible] باتیں مجھے ناگوار ہوتی تھیں، میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کر دوں مگر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے، مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کر سکے گا اور چونکہ وہ عموماً میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی۔ جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے بمبئی جانا پڑا۔ رات کو آٹھ بجے جبکہ اُس کی واپسی کا وقت تھا میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی۔ دفعتاً کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ روشنی کیوں گل کر دی؟" میں سوال ختم نہ کرنے پائی تھی کہ میرا بازو اُس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور دل میں خوفناک بہیمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں نے اپنے تمام جسم کی طاقت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسری نشست میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی، میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی اس کے آنے میں تاخیر ہوئی، فیروز پھر میری سمت بڑھا لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا۔ فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی۔ میرا ارادہ تھا کہ اس سے سب کہہ دوں کہ سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی، مگر اس کی نوبت نہیں آئی اُس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا۔ اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اُس نے [illegible] دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑایا۔ "جمال" "اُف! اُف!!" کرتا ہوا اپنے اسٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا، میں نے اُس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا، اُس کی آنکھیں خون کے مانند سرخ ہو رہی تھیں، صورت جوشِ غضب میں مسخ ہو گئی تھی، میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اُس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا "دغاباز! تیری زندگی کا ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ دغاباز خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی برأت کے لئے ایک [illegible] بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اُس کے عضلات پھڑک رہے تھے اُس کا دم گھٹ رہا تھا، اُس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے ان دنوں وہ بڑی محنت کر رہا تھا اور میری

دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تباہی کا شیطان فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھکو میری محبت سے محروم کر گیا، اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا، اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا"۔ ناہید کے آنسو گرنے لگے میں تڑپ گیا۔ چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں، لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور یہ سلسلہ یوں شروع کیا۔

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا بیان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شکسپیئر کے مشہور ڈرامہ "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی، میں نے جمال سے کہا تھا کہ کاش مجھے اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا اس پر اس نے مجھکو بہت پیار کیا تھا۔ آہ!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرہ سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی۔ وہ رخصت ہونے کیلئے اٹھی چلتے چلتے اس نے کہا "ہاں ایک بات بھول گئی، جمال نے ایک ظلم بھی کیا ہے۔ مجھے مار کر اس کی تسکین نہ ہوئی، تو اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کر دیا۔؎

وفا آموختی از ما بکارِ دیگراں کردی
ربودی گوہرے از ما نثارِ دیگراں کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔؎

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام
گر بخود ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائیگا اور میں سکون سے رہ سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں اگر آپکا جی چاہے تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا، اور جو اسٹوڈیو میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔"

یہ کہکر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے صحن زار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کر چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا اور اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا اسٹوڈیو رہ چکا تھا، سب سے پہلے میری نگاہیں جس چیز پر ٹھہریں وہ ایک شکستہ صندوق تھا، اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا، میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں، اس لئے کہ تم بھی مجھکو دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھو گی" میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھکو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی

یہی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اُس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کیا کہ شاید فرار کی لوح پر وہ دوسرا شعر لکھ کر ادا کیا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی، لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی میں امید کر رہا تھا، یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اُڑایا گیا۔ مجھکو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں، کیونکہ میرا دعائی اعتقاد یہ ہے کہ مردوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا، بحث یہی کیا تھا ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول موضوعہ اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا ہے اور ہم دیکھ لیتے ہیں کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا عمل یہی ہے۔ ہم اس گتھی کو ہیگل اور اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔

اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اس واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباسِ نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لیں گے، لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ نہ ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعہ سے اپنے اس کرب و اضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں، جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہید کی جو تصویر ناصری کے پاس تھی وہ اس مشہور مصوّر کی صنّاعی نہیں ہے جس کا نام مجھے بتایا گیا، بلکہ جمال کی سحر طرازی ہے، مگر اس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

مجنوں گورکھپوری

غزل

اک عمر میں اب سمجھا دنیا کا یہ حاصل تھا — جو نقش تھا دھوکا تھا، جو رنگ تھا باطل تھا
ہنگامۂ ہستی سے فرصت جو ملی دیکھا — اک داغِ ندامت ہی کل زیست کا حاصل تھا
اے موجِ لبِ دریا سر پیٹ نہ تو ایسا — جو غرق ہوا اس میں آزردۂ ساحل تھا
یہ ذوقِ سماعت ہی دنیا کو نہ تھا ورنہ — ہر ساز خموشی میں اک زمزمۂ دل تھا
طوفانِ حوادث میں جب غور کیا میں نے — خود آپ ہی دریا تھا، خود آپ ہی ساحل تھا
دنیائے محبت میں کعبہ تھا نہ بت خانہ — ہر نقشِ قدم تیرا اک سجدہ گہِ دل تھا
ہر سانس سے پیدا تھا اک محشرِ رسوائی — مانا کہ ترا رزمی خاموش تھا غافل تھا

سعید رزمی

ایتھر کی موجیں

مغرب میں سائنس کی جدید تحقیقات جس سرعت سے ساتھ ترقی کر رہی ہے، وہ محتاج بیان نہیں۔ ایک سال کا قلیل زمانہ ہم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ ایک سائنس داں اس رفتار کو ہر لحظہ اور ہر ساعت محسوس کرتا ہے اور ہر صبح اپنے کو ایک نئی دنیا میں پاتا ہے لیکن عام شخص کے لئے یہ کافی ہے جبکہ وہ دیکھتا ہے کہ سلسلۂ خبر رسانی جو کل تک تار و پود کا محتاج کا نظر آتا تھا، آج وہ ان فضولیات سے مستغنی ہے۔ اور وہ ٹیرین کی پچاس ساٹھ میل فی گھنٹہ رفتار والی گاڑی کی بجائے ایک پٹری کی دو سو تین سو میل فی گھنٹہ رفتار والی برق رفتار ٹرین اپنے مسافروں کو چشم زدن میں کہیں سے کہیں پہنچانے کے لئے تیار ہے، ایک سائنس داں جو چار پانچ برس پیشتر ہم میں موجود تھا اگر پھر ہم میں آ جائے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہے۔ جب وہ یہ دیکھے کہ وہ تمام نظریئے جو اس نے اس قدر کاوش و جانفشانی سے تیار کئے تھے وہ دفعتاً ایک انکشاف کی بدولت چشم زدن میں ناکارہ ہو گئے۔ ہم کو ان انقلابات سے یہاں پر بحث نہیں ہے، بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ ہم اب کہاں پر ہیں، یہاں پر یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ تحقیقات پارینہ اور باطل شدہ نظریئے علاوہ تاریخی اہمیت کے ایک اور اہمیت اپنے اندر رکھتے ہیں اور وہ وہی اہمیت ہے جو ایک شاہراہ کے مقابلہ میں جادہ کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ہم نے ان کو پس پشت ڈال دیا تو صرف اس وجہ سے کہ ہم ان سے بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ ہر ایک جدید انکشاف کو مثل ایک نشانِ راہ سے سمجھنا چاہیئے جو ہماری رفتار کا رخ بدل دیتا ہے۔ اور اصلی شاہراہ سے نزدیک تر کر دیتا ہے۔

ایتھر کیا ہے — اگرچہ ہم مکان کو غیر محدود ماننے پر مجبور ہیں۔ لیکن ہم پر اس قسم کی کوئی مجبوری عاید نہیں ہوتی۔ کہ جس سے ہم مکان کو کسی واسطہ (madium) سے کلاً یا جزاً پُر مانیں۔ یا یہ کہ ہم مکان کو بالکل خالی مانیں لیکن روشنی اور حرارت کے متعلق جو مشاہدات ہوئے ہیں اُن سے لامحالہ ہم اس بات پر مجبور ہوئے ہیں کہ تمام مکان کو یا کم از کم وہاں تک کہ جہاں تک کہ سب سے بعید فاصلہ پر نظر آنے والا ستارہ موجود ہے کسی واسطہ سے بھرا ہوا مانیں ہم گویا اس لئے فرض کرنا پڑا ہے کہ حرارت اور روشنی ایک مقررہ رفتار سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی ہیں اور اس لئے کسی خاص کیفیت یا حالت کی ایک شے سے دوسری فاصلہ پر رکھی ہوئی شے تک پہنچنے کے صرف دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔

فرض کرو کہ سمندر میں دو جہاز ساکت کھڑے ہیں ان میں سے ایک جہاز دوسرے جہاز کو حرکت میں لانے کے لئے یا تو اس جہاز پر گولے برسائے یا پانی میں (جو کہ اُن کے درمیان ایک واسطہ ہے) موجیں پیدا کرے۔ یہ موجیں بڑھتے بڑھتے دوسرے جہاز تک پہنچکر اس کو حرکت میں لے آئیں گی۔ پہلے طریقہ میں ایک شے پھینکی گئی ہے جو کہ واقعی جہاز پر جا کر لگی ہے، لیکن دوسرے طریقے میں جہاز سے قریب صرف ایک حرکت پیدا کی جو کہ بالواسطہ رفتار کے ذریعہ سے دوسرے جہاز تک جا پہنچی۔ پہلا طریقہ

اس نظریہ کی بنیاد ہے جس میں مانا گیا ہے کہ روشن جسم سے ذرات نکلتے ہیں اور یہ ذرات آنکھ پر روشنی پیدا کرتے ہیں لیکن دوسرا طریقہ نظریہ تموج کی بنیاد ہے جس میں یہ مانا گیا ہے کہ روشن جسم صرف اسی واسطہ میں موجیں پیدا کر دیتا ہے جو کہ تمام مکان کو پُر کئے ہوئے ہے۔
اگرچہ یہ واسطہ جہاں تک ہمارے جسمی احساسات کا تعلق ہے فرضی ہے۔ یعنی نہ نظر آتا ہے نہ محسوس ہو سکتا ہے، لیکن برقی مقناطیسی اور دیگر مشاہدات سے پورے طور پر اس کا ثبوت پہنچ چکا ہے کہ ایسا واسطہ موجود ہے۔ ایسے واسطہ کا خیال نہ تو کوئی جدت ہے نہ توہم ہے۔ نہ یہ سائنس دانوں کا بے حقیقت قیاس سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ثبوت فراہم شدہ شہادت پر مبنی ہے، مکان کو کسی واسطہ سے پُر خیال کرنا اتنا ہی سہل ہے جتنا کہ اس کو خالی تصور کرنا۔ اور اگر اس سوال کو نظر غور سے ملاحظہ کیا جائے تو ایک مکانی واسطہ کو ماننے کی بہ نسبت [illegible] کے ماننے کی زیادہ وجہ موجود ہے۔

روشنی کا نظریہ قدیم

قدیم حکمائے یونان (افلاطون و ارسطو وغیرہ) کے خیال کے مطابق روشنی صرف آنکھ کے ساتھ مخصوص ہے گویا آنکھ میں ایسی قوت موجود ہے کہ وہ غیر مرئی ذرے اپنے اندر سے خارج کرے۔ اور اس طریقہ سے فاصلہ کی چیزوں کو محسوس کرے۔ یہاں پر ان آرا کے متعلق بحث کرنا خارج از بحث ہے، کیونکہ فن فوٹوگرافی اور بہت سے دیگر تحقیقاتی واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ روشنی کے اثرات بغیر آنکھ کی کسی قسم کی مدد کے محسوس کئے جا سکتے ہیں۔ نیوٹن کے نظریہ کے مطابق روشنی عبارت ہے۔ مادی ذرات کی تراوش سے جو کہ بہت تیزی سے حرکت کرتے ہیں۔ یہ ذرات ایک منور جسم سے خارج ہوتے ہیں جس طرح بندوق سے گولیاں نکلتی ہیں، یہ ذرات آنکھوں کے پردے کو مس کر کے اس کو متاثر کر دیتے ہیں، اور ہم اس طریقہ سے روشنی کا احساس کرتے ہیں۔ یہ ذرات ایک خط مستقیم میں حرکت کرتے ہیں اس کو نظریہ جسیمی کہتے ہیں۔

نظریہ تموج روشنی

لیکن ایک ایسے نظریے کے لئے یہ ضروری ہے کہ روشنی کی تمام معلوم شدہ خواص پر حاوی ہو۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ روشنی نہ صرف حس بصارت کو تحریک دیتی ہے بلکہ جن اجسام پر پڑتی ہے ان کی حرارت میں بھی اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔ نیوٹن کے نظریہ جسیمی کے مطابق حساب لگانے سے ثابت ہوتا ہے کہ روشنی کی رفتار بہ نسبت خلا کے شفاف مادی اشیا (ہوا۔ پانی۔ کانچ وغیرہ) میں زیادہ ہے یہ تجربہ کے بالکل خلاف ہے۔ اس کے متعلق بہت سے تجربے کئے گئے ہیں اور سب اس نتیجہ کے خلاف ہیں، یہاں نیوٹن کا نظریہ جسیمی بالکل ناکارہ ہو جاتا ہے اب صرف یہی ایک چارہ کار باقی رہ جاتا ہے کہ روشنی ایک غیر مادی واسطہ (ایتھر) کے اندر اہتزازی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ یہ نظریہ تموج تمام معلوم شدہ واقعات و تجربات سے بالکل صحیح ثابت ہوا ہے، اور روشنی کے متعلق کسی انکشاف نے بھی اس کی تردید نہیں کی ہے، جو جو انکشافات ظہور میں آتے رہے ہیں ان سب سے ان کی تائید ہوتی رہی ہے۔

سرخ بنفشی

پائین سرخ لطیف مرئی بالائے بنفشی

آفتاب کی مرئی اشعاع

یہ ایک غیر قابل انکار حقیقت ہے کہ آفتاب کی روشنی سات مختلف قسم کے رنگوں سے مرکب ہے یہ رنگ بالترتیب بنفشی۔ نیلا۔ آسمانی۔ سبز۔ زرد۔ نارنجی۔ سرخ ہیں۔ یہ ساتوں رنگ مل کر سفید روشنی پیدا کرتے ہیں، جس کو ہم روز دھوپ کی شکل میں دیکھتے ہیں، یہ ساتوں رنگ کیا ہیں۔ اس کا جواب نظریہ امواج سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ سورج سے پیدا شدہ امواج کا طول یکساں نہیں ہے بلکہ بہت سے مختلف طول کی امواج پیدا ہوتی ہیں۔ یہ مختلف طول موج جب آنکھ پر اپنا علیحدہ علیحدہ اثر ڈالتی ہیں۔ اگر چھوٹی موج بنفشی اثر رکھتی ہے تو اس سے بڑی موج نیلا اثر رکھیگی، اور اس سے ذرا بڑی موج آسمانی اثر دکھائے گی، اور اسی طرح علی الترتیب سرخ رنگ ان ساتوں رنگوں میں سب سے بڑی موج کا نتیجہ ہے۔ یہ تو ان سب کا الگ الگ اثر ہے، لیکن یکجائی طور پر ان سب کا اثر سفید روشنی ہوتا ہے اگر روشنی کی ایک پتلی سی تحریر ایک چھوٹے سے سوراخ میں ہو کر ایک تاریک کمرے میں لائی جائے اور ایک مثلث کانچ کا ٹکڑا (موشور) اس کے راستہ میں رکھا جائے تو سامنے کی دیوار پر مختلف رنگ ایک سیدھ میں برابر برابر نظر آئیں گے۔ اس کے مجموعہ کا ایک سر سرخ ہوگا، اور دوسرا سرا بنفشی ہوگا، اور بیچ میں مندرجہ بالا رنگ بالترتیب نظر آئیں گے اس مختلف اللون مجموعہ کا نام طیف (Spectrum) ہے۔

آفتاب کی غیر مرئی اشعاع

آنکھ کو متاثر کرنے والی اشعاع کے علاوہ اور بھی اشعاع سورج سے ہم تک پہنچتی ہیں، ان اشعاع سے انسان کی آنکھ اس طرح بے بہرہ ہے۔ جس طرح ایک کور چشم سورج کی مرئی اشعاع سے یہ غیر مرئی اشعاع بھی مثل مرئی اشعاع کے ایتھر کے تموج کے سوائے اور کچھ نہیں ہیں۔ یہ امواج کچھ تو مرئی امواج سے چھوٹی ہیں اور کچھ بڑی ہیں یعنی یہ امواج اگر ایک طرف بنفشی امواج سے چھوٹی ہوتی چلی گئی ہیں تو دوسری طرف سرخ امواج سے بڑی ہوتی چلی گئی ہیں (یہاں پر الفاظ "بنفشی امواج" اور "سرخ امواج" سے غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ امواج نہ بنفشی ہوتی ہیں نہ سرخ نہ زرد ہوتی ہیں۔ نہ آسمانی بلکہ اُن میں بجز اس کے کہ آنکھ ان سے عجیب و غریب طور پر متاثر ہوتی ہے اور کچھ نہیں) چونکہ ایک موشور روشنی کی تمام امواج کو بالترتیب یکے بعد دیگرے ایک سیدھ میں پھیلا دیتا ہے، اس لئے سورج کی یہ غیر مرئی امواج بھی طیف کی مرئی امواج کے دونوں سروں کی طرف اپنی اپنی جگہ اختیار کر لیتی ہیں بنفشی سرے والی غیر مرئی اشعاع کا نام "اشعاع بالائے بنفشی" اور سرخ سرے والی غیر مرئی اشعاع کا نام "اشعاع پائیں سرخ" ہے۔ اب غالباً یہ واضح ہو گیا ہوگا کہ (۱) بالائے بنفشی (۲) طیف مرئی (۳) پائیں سرخ یہ تمام اشعاع ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں اور سب ایتھر کے اندر تموج کا نتیجہ ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ طیف مرئی کی اشعاع آنکھ کو ایک خاص طور پر متاثر کرتی ہیں اور بالائے بنفشی اور پائیں سرخ آنکھ پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتیں، اور آنکھ ان کو محسوس کرنے سے قاصر ہے، لیکن یہ شعاعیں جس چیز پر پڑتی ہیں، اس کو گرم کرنے کی خاصیت بھی رکھتی ہیں اگر ان کے راستے میں تھرمامیٹر رکھا جائے تو ٹمپریچر بڑھنا شروع ہو جائے گا، اور یہ ان کے محسوس کرنیکا اچھا ذریعہ ہے، بالائے بنفشی شعاعیں فوٹوگرافی کی مدد سے نظر آ سکتی ہیں یہ موجیں چاندی کے مرکبات پر خاص اثر رکھتی ہیں اور اسی لئے ان کو کیمیاوی actinic موجیں بھی کہتے ہیں، ان شعاعوں کا فوٹوگراف بہت آسانی سے لیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ

موشو جو استعمال کیا جائے وہ ان کو جذب نہ کرے، کیونکہ اکثر اشیاء ان شعاعوں کو جذب کرلیتی ہیں۔ کانچ کا موشو بیکار ثابت ہوا ہے۔
نمک، کوارٹز Quartz کا موشو چھوٹی موجوں کے لئے بہت اچھا ثابت ہوا اور یہ موجیں اس میں جذب نہیں ہوتیں اسلئے
وہ عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہوا بھی ان میں سے بہت سی موجوں کو جذب کرلیتی ہے اس لئے اس کے متعلق تجربے خلا میں ہونے
چاہئیں۔

بالائے سرخ امواج کو سب سے پہلے ہرشل Herschel نے سنہ میں دریافت کیا تھا اس نے ایک تھرمامیٹر کو کالا کر کے طیف کے
سرخ حصے سے ذرا ہٹا ہوا رکھ دیا۔ جس سے ٹمپریچر بڑھ گیا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ امواج اس پر پڑ رہی ہیں۔ ان امواج کی تحقیق کیلئے
بھی ایک ایسا موشو ہونا چاہئے جو ان کو جذب نہ کرے۔ علاوہ ازیں کے ایسا آلہ استعمال ہونا چاہئے جو ٹمپریچر کا تھوڑے سے تھوڑا
فرق بھی بتادے نمک اور کوارٹز Quartz کے موشو استعمال کئے جاسکتے ہیں ان کی پوری تحقیقات امریکن پروفیسر لینگلے
Langley نے اپنے آلہ بولومیٹر Bolometer کی مدد سے کی۔

نظریہ تموج حرارت

یہ ایک پرانا خیال ہے کہ حرارت بالآخر کسی نہ کسی قسم کی حرکت سے پیدا ہوتی ہے۔ رگڑ اور تصادم سے اجسام
کی ظاہری حرکت ضائع ہوکر حرارت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس میں یہ مانا گیا ہے کہ حرکت ضائع نہیں ہوئی بلکہ اجسام
کی ظاہری حرکت ذرات کی حرکت میں تبدیل ہوگئی جس طرح روشنی ایتھر کے تموج کا نام ہے اور اس کے متعلق کافی شہادت موجود ہے اسی طرح
اشعاع حرارت کے متعلق بھی شہادت و ثبوت موجود ہے۔ حرارت اور روشنی کی شعاعیں بالکل یکساں ہیں فرق یہ ہے کہ روشنی جو حرارت
کے تمام اوصاف اپنے اندر رکھتی ہے وہ ساتھ ہی ساتھ بصارت کی حس کو بھی تحریک دے سکتی ہے۔ اس لئے حرارت بھی مثل
روشنی کے ایتھر کے اندر تموج کا نتیجہ قرار دی گئی ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ایک گرم جسم کے سالمے بہت تیز اہتزازی کیفیت میں
ہیں۔ اور اس طرح سے ایتھر میں تموج پیدا کر رہے ہیں اور یہ امواج ایتھر میں سفر کرکے ہم تک پہنچ رہی ہیں اور ان کی رفتار بھی بالکل
روشنی کی برابر ہے۔ جب یہ ہمارے جسموں پر پڑتی ہیں تو ہمارے جسم ان کو جذب کرلیتے ہیں۔ اور ہمارے جسم کے سالموں میں بھی
یہی حرکت پیدا ہوجاتی ہے، اس لئے ہم گرمی محسوس کرنے لگتے ہیں اس طرح ہمارے اعصاب گرم چیز سے پیدا شدہ امواج سے اسی
طرح متاثر ہوتے ہیں جس طرح ہماری حس بصارت (آنکھ) ایک روشن چیز کے پیدا شدہ امواج سے متاثر ہوتی ہے۔ یا جس طرح ہمارے
کان ہوا میں پیدا ہونے والی آواز کی موجوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایتھر کے اندر دو مختلف جنس کی
موجیں پیدا ہوتی ہیں۔ کیا حرارت کی موجیں اور روشنی کی موجیں بالکل دو چیزیں ہیں، یا یہ موجیں ایک ہی قبیل سے ہیں۔ ہم کو معلوم
ہے کہ روشنی کی موج حرارت پیدا کرنے کی قوت بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس لئے گمان غالب ہوتا ہے کہ ہماری بصارت کی
حس کو متاثر کرنے والی موجوں میں کوئی اصلی فرق نہیں ہے۔ اس کی تشریح کے لئے ہم ہوا کے اندر پیدا ہونے والی موجوں یعنی
امواج آواز کی مثال لیتے ہیں جو کہ قریب الفہم ہے اگر ایک گھنٹی کو ایک سیکنڈ میں ایک سو مرتبہ جنبش دیجاتی ہے تو ہوا کے اندر
تقریباً گیارہ گیارہ فیٹ لمبی موجیں پیدا ہوتی ہیں اور اگر ایک سیکنڈ میں گیارہ سو مرتبہ جنبش دی جائے تو ہوا کے اندر تقریباً

ایک ایک فیٹ لمبی موجیں پیدا ہوں گی ، اور پچاس مرتبہ جنبش دینے سے تقریباً ۲۲ گز لمبی موجیں پیدا ہوں گی ، یعنی اگر نسبتاً فی سکنڈ جتنی موجیں کان پر زیادہ پڑیں گی آواز اتنی ہی زیادہ باریک اور تیز ہوگی یعنی اگر نسبتاً زیادہ اور کم موجیں ہمارے کان پر پڑ رہی ہیں تو ہم کہیں گے کہ سُر اونچا ہے یا نیچا ہے ۔ لیکن کان صرف ایک حد تک سُن سکتا ہے ۔ اگر ایک گھنٹی کی جنبش فی سکنڈ حد سے زیادہ گذر جائے گی تو کان اُس کے سننے سے قاصر رہے گا ۔ اور اگر جنبش حد سے کم ہوگی تب بھی نہیں سُن سکے گا ۔ یا بالفاظ دیگر آواز کی ہوائی موجیں کان پر اثر ڈالنے کے لئے ایک حد کے اندر ہونی چاہئیں نہ بہت چھوٹی نہ بہت بڑی ۔ یہ حد ۱۳ گز کی لمبی موج سے لے کر ½ انچ تک ہے ، یہ حدود قدرت کی صناعی نے کان کے اندر رکھے ہیں اور مختلف افراد کے کانوں میں ان حدود کے متعلق تھوڑا تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے ۔ یہ بہت چھوٹی اور بہت لمبی موجیں جو کان پر کوئی اثر پیدا نہیں کرتیں وہ بھی بجنسہ اسی قسم کی ہیں جس قسم کی وہ ہیں جو اثر پیدا کرتی ہیں ۔ فرق صرف ان کی لمبائی کا ہے ، یہ کان کا نقص ہے نہ کہ موجوں کا ہم یہ نہیں کہتے کہ دو مختلف جنس کی ہوائی موجیں ہیں ۔ یا ایک وہ جو کان کو سنائی دیتی ہیں اور ایک وہ جو سنائی نہیں دیتیں ۔ بلکہ سب کو ایک ہی جنس کی ماننا پڑے گا ۔

اسی طریقے سے ہر جسم ایتھر کی امواج کا مرکز ہے ۔ مادہ کا ایک سالمہ جنبش میں ہے اور ایتھر میں امواج پیدا کر رہا ہے ۔ بادل اگرچہ سورج کو ڈھک لیں لیکن وہ خود گرم ہوتے ہیں اور امواج حرارت ان سے پیدا ہوتی ہے ، خود زمین گرم ہے اور حرارت کی موجیں اس میں سے ہر وقت نکلتی رہتی ہیں ۔ اس طریقے سے ہم ہر وقت موجوں میں ڈوبے ہوئے رہتے ہیں ۔ ایتھر کبھی ساکت نہیں رہتا ۔

ایتھر کا یہ کبھی ختم نہ ہونے والا ارتعاش ہم کو دو طریقے سے متاثر کرتا ہے ہماری آنکھیں روشنی حاصل کرتی ہیں اور جسم میں گرمی پیدا ہوتی ہے ۔ ایک ایتھر کی موج اگر معینہ حد کے اندر ہے تو آنکھ کو روشن کر دے گی یہی موج اگر ہمارے جسم پر پڑے گی تو ہمارے جسم کے سالموں میں ارتعاش پیدا کر دے گی ، جس سے ہم کو گرمی محسوس ہوگی ، گویا ایک ہی موج دو مختلف اثر پیدا کرے گی ایک بصارت دوسرا حرارت ۔

برقی ارتعاش

اگر ایک طاس کثفہ (Condenser) کو برق سے بھر جائے اور پھر طاس کو ایک برق رو کی مزاحمت کرنے والے تار کے ذریعہ سے ملا دیا جائے تو برق کی رہائی شروع ہو جائے گی ۔ اور برق ایک طاس سے دوسرے طاس میں جا کر برقی غلبہ (Potential) کو معدوم کر دے گی اور دونوں طاس مساوی غلبہ پر ہو جائیں گے لیکن اگر مذکورہ بالا مزاحمت ایک مقررہ مقدار سے کم ہو تو رہائی خاموشی کے ساتھ بلکہ بہت تیز ارتعاشی اہتزازی کیفیت کے ساتھ ہوتی ہے ۔ فرض کرو کہ طاس الف کا برقی غلبہ طاس ب سے زیادہ ہے اب اگر ان کی مزاحمت س کے ذریعے ملا دیا جائے تو الف سے ب کی جانب کو رہائی شروع ہو جائے گی لیکن اگر یہ مزاحمت مقررہ مقدار سے کم ہو تو رہائی بہت تیزی کے ساتھ ہوگی اور بجائے غلبے کے مساوی ہونے کے ب کا برقی غلبہ الف سے زیادہ ہو جائیگا جس کا نتیجہ ہوگا کہ ب سے الف کی جانب رہائی ہوگی اور پھر الف کا غلبہ ہو جائے گا اور اسی طرح سے پھر الف سے ب کی جانب
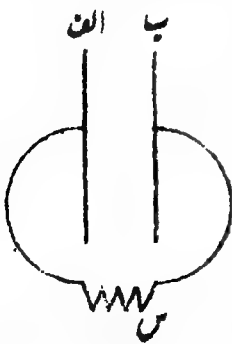
کو رہائی ہوگی اور اسی طرح سے ہوتا رہے گا۔ البتہ ہر ارتعاش اپنے پہلے ارتعاش سے کمزور ہوگا اور اسی طریقہ سے چند مرتبہ ارتعاش کے بعد دونوں طاسوں کے غلبے برابر ہو جائیں گے اور ارتعاش بند ہو جائیگا۔ جب تک ارتعاش جاری رہے گا ایتھر کے اندر تموج پیدا ہوتا رہے گا، اور موجیں چاروں طرف پھیل جائیں گی اور وہ مقرّرہ رفتار سے بڑھیں گی۔ فیڈرسن نے ۱۸۵۸ء میں کاسۂ لیڈن Leyden jar کے شرارہ کی ارتعاشی کیفیت کی تصدیق ایک تیزی کے ساتھ گھومتے والے آئینہ کے ذریعہ سے کی آئینہ کے اندر روشن اور سیاہ دھاریاں نظر آئیں لیکن اگر طاسوں کے درمیان بہت زیادہ مزاحمت رکھی جائے تو صرف روشنی نظر آئے گی جس سے معلوم ہوگا کہ ارتعاش نہیں ہو رہا ہے۔

(Hertz) ہرٹز نے برقی ارتعاش ایک ایسے سامان کی مدد سے پیدا کیا جس میں مرتعش جسم ایک ڈمبل کے شکل کا پیتل کا ٹکڑا تھا۔ الف اور ب کو جوڑنے والی سلاخ کو اس طرح کاٹا کہ بیچ میں جگہ ہوگئی اور دونوں سروں پر ج اور د دو چھوٹے لٹو لگا دیئے۔ حصہ ب ج اور الف د کو ایک برقی مشین کے دو سروں سے جوڑ دیا۔ جب مشین کو گھمانا شروع کیا جاتا ہے۔

الف　　د　　ج　　ب
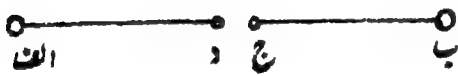
تب ج۔ د۔ کے درمیان ایک شرارہ ظاہر ہوتا ہے؛ اور چونکہ شرارہ کی مزاحمت برقی رو کے لئے نسبتاً کم ہوگی اس لئے الف ب قریب قریب ایک ہو جائیں گے اور برقی غلبہ بہت جلد برقی ارتعاش کے ذریعہ سے مساوی ہوتا رہے گا۔ یہ ارتعاش ایتھر کے اندر ارتعاش پیدا کر دیگا۔ اور برقی موجیں پیدا ہو جائیں گی۔ اگر یہ موجیں ایک برقی شے سے گزریں گی تو اس شے میں بھی ارتعاش پیدا کر دیں گی اور اگر دو برق گزار قریب قریب رکھے ہوں تو اُن کے درمیان شرارہ پیدا ہو جائیگا اس لئے برقی موجوں کو معلوم کرنے کا یہ عمدہ ذریعہ ہے۔ (Hertz) ہرٹز اس ذریعہ کو عمل میں لایا اُس نے ایک موٹے تانبے کے تار کو ایک چوڑی کی شکل میں موڑا، لیکن دونوں سروں کے درمیان فاصلہ رکھا یہ فاصلہ کم زیادہ ہو سکتا تھا۔ جونہی کہ موجیں اس چوڑی سے گزریں اُس چوڑی کے سروں میں سے شرارے نکلتے ہوئے نظر آئے۔

ان موجوں کے دریافت کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے جس کو مارکونی Marconi نے استعمال کیا۔ لیکن جس کا اصول لوج Lodge نے معلوم کیا تھا، اس آلہ کو Coherer کہتے ہیں پیتل۔ تانبے یا چاندی کی گول ٹکیہ کی شکل کے ٹکڑوں (د، د) کو دو تانبے کے تاروں (و، و) کے ایک ایک سرے سے جوڑ دیا گیا۔ اور ان کو کانچ کی ایک نلکی خ، خ میں ٹھیک بٹھایا گیا ہے اور دونوں ٹکڑوں کے درمیان لوہے کے برادہ کی ایک تہ بچھا دی گئی ہے، ایک بیٹری اور ایک گھنٹی بھی اس آلہ کے ساتھ لگا دی گئی۔

ج　　د　　د　　ج
و　　و
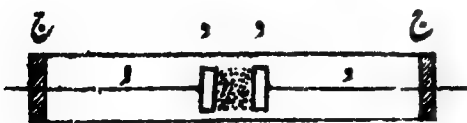
اب اس نلکی کو ہلاکر اس طرح رکھا جاتا ہے کہ لوہے کا برادہ دونوں ٹکڑوں (د۔ د) کے درمیان وصل نہ کرنے پائے اور اب سطح گھنٹی بجنا لگائی گئی ہے وہ بجنے نہیں پاتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں ٹکڑے بیٹری کے سلسلے میں رکھے ہوئے ہیں اور جب تک ان دونوں ٹکڑوں میں وصل نہ ہو برقی رو نہیں پیدا ہو سکتی، اور گھنٹی نہیں بج سکتی، لیکن اب اگر کسی فاصلہ پر رکھے ہوئے مرتعش جسم سے برقی موجیں پیدا ہوکر اس پر پہنچیں گی تو ان دونوں ٹکڑوں کے درمیان وصل ہو جائیگا، جس کے سبب سے برقی رو دوڑ جائیگی اور گھنٹی بجنے لگے گی، اب اگر اس کو پھر تھوڑا سا ہلادیں تو پھر دونوں ٹکڑوں کے درمیان سے وصل جاتا رہیگا اور پھر اگر موجیں اس پر پڑیں گی تو پھر برقی رو دوڑ جائے گی اور گھنٹی بجنے لگے گی۔ مارکونی نے اپنے آلہ میں دونوں ٹکڑے چاندی کے رکھے تھے اور بجائے لوہے کے برادے کے نکل اور چاندی کا برادہ استعمال کیا تھا اور نلکی کی ہوا پمپ کے ذریعہ سے نکال کے دونوں طرف سے نلکی کا منہ بند کر دیا تھا۔

بے تار برقی کا اصول یہی ہے جو اوپر بیان ہوا ہے اس سے ناظرین کو معلوم ہو جائیگا کہ برقی اور روشنی کی موجیں ایک ہی جنس کی ہیں سوائے اس کے کہ برقی موجیں بہ نسبت روشنی کی موجوں کے لمبائی میں زیادہ ہوتی ہیں، اگر روشنی کی موجیں ایک انچہ میں ایک ارب سما سکتی ہیں تو بے تار برقی کی موجیں چند سو فیٹ سے لے کر پانچ میل تک لمبی ہو سکتی ہیں۔

رانجنی شعاعیں

سب سے زیادہ حیرت انگیز ان شعاعوں کا انکشاف ہے جو پچھلی صدی میں پروفیسر رانجن نے دریافت کیں اور ان کا نام X - rays رکھا، لیکن وہ اب عام طور پر "رانجن کی شعاعیں" کہلاتی ہیں ان شعاعوں کے پیدا کرنیکا طریقہ اور ان کے خواص یہاں پر ہم بیان کرتے ہیں جس سے ناظرین یہ اندازہ لگا سکیں گے کہ ان سے روشنی کا کہاں تک تعلق ہے ان کے پیدا کرنے کے لئے ایک نلکی کافی ہے، اس کی شکل اکثر ایسی ہوتی ہے جیسی کہ تصویر سے ظاہر ہے۔
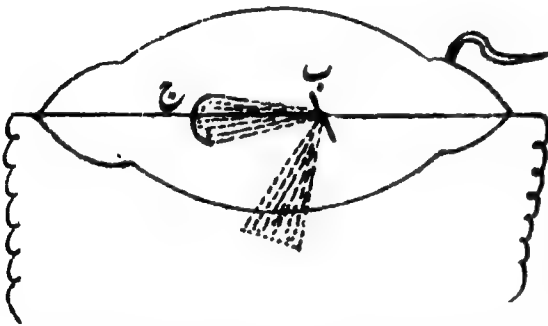
نلکی کے اندر ج ایک المونیم کا گہرا آئینہ ہے، یہ آئینہ ایک پلاٹینم دھات کے تار سے جڑا ہوا ہے، اس تار کو اندر سے لاکر نلکی میں خوب مضبوطی سے جوڑ دیا گیا ہے، اور اسکا سرا باہر نکلا ہوا رہنے دیا گیا ہے، اس سرے کو امالی پچھے کے منفی سرے سے ملا دیا گیا ہے، برقی رو ب سے داخل ہوتی ہے اور ج سے نکلجاتی ہے، یعنی برقی رو کا راستہ نلکی کے اندر ب کی جانب سے ج کی طرف ہے۔ اس لئے ب کو زبر برقیرہ کہتے ہیں، اور ج کو زیر برقیرہ۔

اب جوں جوں نلکی کے اندر ہوا کم ہوتی جاتی ہے، ویسے ہی نلکی کے اندر عجیب و غریب تبدیلیاں نظر آتی ہیں جب تک نلکی کے اندر ہوا پوری موجود رہتی ہے تب تک ایک شرارہ نکلتا رہتا ہے، جیسے جیسے ہوا کم ہوتی جاتی ہے یہ شرارہ پھیلتا جاتا ہے، اور اسکی شکل ایک برش کی سی ہو جاتی ہے جس سے تمام نلکی بھر جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ برش تھون میں تبدیل ہو جاتا ہے اور زیر برقیرہ

تج پر ایک تاریک تہ نظر آنے لگتی ہے۔ جب ہوا اور کم ہو جاتی ہے تو یہ تاریک تہ پھیل جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نلکی کی دیوار وں سے چھو کر کانچ میں ایک چمک پیدا کر دیتی ہے جس کو Phosphorescence کہتے ہیں۔ تاریک جگہ میں ہلکی نیلی دھاریاں نظر آئیں گی، یہ دھاریاں آہنی تج سے بالکل سیدھی تیر کے مانند نکلتی ہیں اور تب پڑتی ہیں ان نیلی دھاریوں کو زیر برقیرہ کہتے ہیں۔ یہ در اصل منفی برق کے بہت چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں جو نہایت تیزی سے حرکت کرتے ہیں یہاں پر ایک تغیر عظیم واقع ہوتا ہے۔ پروفیسر رونجن نے معلوم کیا کہ ایک فوٹوگرافی کا پلیٹ جو کہ نزدیک پڑا ہوا تھا وہ ایک دم متاثر ہو گیا اس سے رونجن نے جانچ لیا کہ کسی نامعلوم قسم کی شعاعیں پیدا ہو رہی ہیں اُن کا نام اس نے X - rays رکھا۔ اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شعاعیں ایتھر کی تحریک کا نتیجہ ہیں۔ ان کے متعلق ذیل کی معلومات دریافت ہوئی ہیں۔

(۱) ان شعاعوں پر مقناطیس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(۲) یہ شعاعیں ہوا کی کئی فیٹ موٹی تہ میں گھس جاتی ہیں، اور کئی ٹھوس چیزوں میں سے گزر جاتی ہیں۔ ان کا یہ گزرنا اشیاء کی کثافت پر منحصر ہے، یہ گوشت میں بہ نسبت ہڈی کے زیادہ آسانی سے گزر جاتی ہیں اس لئے اُن کا سرجری میں بہت زیادہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اور فوٹوگرافی کے ذریعہ سے شکستہ ہڈیاں وغیرہ معلوم کی جا سکتی ہیں۔

(۳) یہ بہت سی چیزوں میں چمک پیدا کر دیتی ہیں، اگر یہ شعاعیں ایک پردہ پر جس پر Barium Platinocyanide لگا ہوا ہو اور اُن کے راستہ میں ہاتھ حائل کر دیا جائے تو ہاتھ کی ہڈیوں کا سایہ پردہ پر نظر آئیگا۔ کیونکہ ہڈیاں بہ نسبت گوشت کے زیادہ شعاعوں کو روکتی ہیں اور اس لئے ہڈیوں میں جو شعاعیں گزریں گی وہ کم چمک پیدا کریں گی اور اس لئے اُن کا سایہ نظر آئیگا۔

(۴) یہ شعاعیں منعطف نہیں ہوتیں۔ انعکاس بہت کم وقوع میں آتا ہے۔

اور بھی کئی خاصیتیں دریافت ہوئی ہیں۔ جو جداگانہ بحث چاہتی ہیں۔

ہارون احمد بی۔ ایس۔ سی

فاطمہ

قاہرہ کے ایک بڑے اور آباد محلہ میں ایک مکان ہے، جس پر سکون، خاموشی، اور دحشت چھائی ہوئی ہے۔ اور جو ایک عرصہ سے ویران ہے، محلے کے پرانے خیال کے لوگ اور بڑھیاں اس ویرانہ کو جنات وشیاطین کا مسکن سمجھتے ہیں، اور اس کے متعلق عجیب وغریب روایات مشہور ہیں۔ گویا اس عہد کی روشن خیال آبادی کے محلے میں یہ ویرانہ عہد قدیم کی توہم پرستی کا ایک ظلمت کدہ ہے اس اجڑے ہوئے گھر میں ایک وسیع صحن ہے جہاں صبح کے دھندلکے اور شام کی تاریکی میں چمگادڑیں ادھر سے اُدھر اُڑتی پھرتی ہیں اور ان کی پرواز کی آواز جب قرب وجوار کے مکانوں میں پہنچتی ہے تو وہاں کے باشندوں کے توہمات میں اور ایک نیا اضافہ ہوتا رہتا ہے ایک روز شام کے وقت اس ویرانہ کے ہمسایوں نے دیکھا کہ ایک بڈھا اس مکان میں داخل ہوا، یہ نہایت بدصورت تھا؛ اسکی کمر جھکی ہوئی تھی، اور لاٹھی ٹیکتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک نہایت بدصورت حبشی تھا۔ جو اُس کا ہاتھ پکڑے ہوئے لا رہا تھا۔ لوگ اُسے دیکھکر بہت متوحش اور خوف زدہ ہوئے اور خیال کیا کہ شاید کوئی ساحر ہے، جو شیاطین کو مسخر کرنیکا عمل جانتا ہے۔

یہ بڈھا ہفتہ میں صرف جمعہ کے دن نماز پڑھنے کے لئے ویرانہ سے باہر نکلتا تھا۔ جب وہ جمعہ کے دن اُس کھنڈر سے نکلتا تو لوگ متعجبانہ انداز میں اُس کی طرف اشارہ کرتے اور اس کی نسبت قسم قسم کے خیالات قائم کرتے تھے۔

اس ویرانہ سے ملا ہوا ایک شاندار مکان تھا جس میں ایک معزز شخص کی سکونت تھی۔ صاحب خانہ کا نام لطیف پاشا تھا۔ اُس کی ایک بیوی تا دره اور ایک لڑکی فاطمہ تھی؛ فاطمہ کی عمر انیس سال کی تھی اور وہ اپنے عہد طفولیت ہی میں ماں کی آغوش شفقت سے محروم ہو چکی تھی۔ پاشا کی عمر چالیس سال سے زیادہ تھی وہ اپنی زندگی کے مراحل کو لہو ولعب، اسراف وتنعم اور کثرت ازدواج میں گزار چکا تھا۔ اور اب اپنے شباب کے معاصی کا خمیازہ اٹھا رہا تھا۔ اس کی بیوی، ایک فضول خرچ عورت تھی، جو رات دن اپنے شباب کی نمائش، زیور ولباس کی تزئین میں روپیہ اور وقت صرف کیا کرتی تھی۔ اور اس کو مطلق اس کی پروا نہ تھی کہ ایسا کرنے سے اُس کا گھر آباد ہوتا ہے؟ یا ویرانی کے غار کی طرف گرا چلا جا رہا ہے۔

فاطمہ میں تمام خصوصیات جمال پائی جاتی تھیں۔ اسکی آنکھیں سیاہ تھیں اور بال لمبے، لیکن لوازم شباب میں سے صرف شوخ نظری ذہانت اور ذکاوت قلب اُس میں باقی رہگئی تھی، کیونکہ علامات حسن اور شباب کی شادابی کا نصف حصہ تو اُس کی ماں کے مرجانے سے ضائع ہوگیا تھا اور باقی نصف حصہ سوتیلی ماں کے آجانے سے برباد ہو چکا تھا، الغرض وہ ان ناسازگار حالات میں جوان ہوئی تھی، اور چونکہ تیمی اک ایسا حجاب ہے جو خوبیوں کو بھی بُرائی اور محاسن کو بھی عیوب کی صورت میں پیش کرتا ہے

اس لئے وہ شروع ہی سے ایک مایوس دل رکھتی تھی، اور زندگی کی تلخیوں کو برداشت کرنے کی عادی ہو گئی تھی۔
اُس کا باپ چونکہ بہت مُسرف تھا اس لئے آہستہ آہستہ اُس پر قرض کا بار بڑھتا رہا جاتا اور تکلیف ہوتی رہی، یہاں تک کہ وہ دن آگیا جس کا آنا ضروری تھا اور اس کا مکان نیلام ہو گیا۔ اب اُس کی آنکھیں کھلیں تو اُسنے دیکھا کہ فقر سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور مکان چھوڑنا اس کے لئے ضروری ہے۔
دوسرے دن کی صبح کو یہ مکان خالی ہو رہا تھا، رہنے والوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور پاشا غم والم کا نہایت سنگین بار لئے سینے پر ٹہل رہا تھا کہ اسی بڈھے کا خادم حبشی آیا اور ایک گوشہ میں پاشا کو لیجا کر کہا کہ "میرے آقا نے ایک خاص غرض سے آپ کے پاس مجھے بھیجا ہے"
میں نے پوچھا "تمہارا آقا کون ہے" وہ بولا "کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے میں آپ کے نئے پڑوسی مختار آفندی کا خادم ہوں، اور مجھے سعید کہتے ہیں"
پاشا بولا کہ "مجھ سے ایسے آدمی کو کیا کام ہو سکتا ہے جو ساری دنیا سے علیحدہ ہو گیا ہے۔ علاوہ اس کے میں ابھی یہاں سے جا رہا ہوں اور ایک گھنٹہ میں یہ پڑوس مجھ سے چھوٹ جائیگا۔ میرا دل ایسے فریب کار دوست ملنے کو نہیں چاہتا"
خادم نے کہا کہ "جناب کسی ایسے شخص کے متعلق حکم لگانے میں جلدی نہ کیجئے جس کو آپ نے اچھی طرح دیکھا بھی نہیں ہے۔ مجھے اس نے بھیجا ہے تاکہ اس مکان کے متعلق آپ سے گفتگو کروں"
پاشا: "میں اب اس مکان کا مالک نہیں ہوں اس لئے مجھ سے گفتگو فضول ہے"
خادم: "میں یہ جانتا ہوں کیونکہ میرے ہی آقا نے اس کو نیلام میں لیا ہے"
پاشا: "تو شاید تجھے یہ پیغام دے کر بھیجا ہے کہ میں اس مکان کو جلدی خالی کر دوں، سو تم اپنے مالک سے جا کر کہو کہ میں یہاں سے جا رہا ہوں، وہ خوش ہو جائے"
خادم: "نہیں مجھے اس لئے بھیجا ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں، کہ اسی مکان میں قیام رکھئے۔ اور کہیں تشریف نہ لیجائیے"
پاشا نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا اور بولا کہ "میں نہیں سمجھا تمہارا اس سے کیا مطلب ہے؟"
خادم نے کہا کہ "میرا مطلب بالکل واضح ہے۔ میرا آقا اس مکان کا مالک ہو گیا ہے۔ لیکن اس کی خواہش یہی ہے کہ آپ بدستور قیام رکھیں، بلکہ وہ آپ کو .... ۵ گنی بھی بطور ہدیہ کے پیش کرنا چاہتا ہے"
پاشا نے کہا "کیا تم لوگ مجھ سے تمسخر کر رہے ہو؟"
خادم نے جواب دیا کہ "ذرا صبر سے کام لیجئے، پوری بات سن لیجئے، میرا آقا یہ ایثار بلا وجہ نہیں کرنا چاہتا، بلکہ وہ اس کے عوض میں یہ چاہتا ہے کہ آپ اپنی بیٹی فاطمہ کو اس سے منسوب کر دیں"
پاشا یہ سُنکر ہنسا اور بولا کہ "تیرا آقا پاگل ہے، میں کیونکر اپنی بیٹی کی شادی، ایک اپاہج بدصورت بڈھے سے کر سکتا ہوں۔ مجھ

فقر و فاقہ گوارا ہے لیکن یہ سودا منظور نہیں۔
خادمہ نے کہا کہ "مہربانی فرما کر ذرا غور فرمائیے۔"
یہ سنکر باشا کو غصہ آگیا اور بولا کہ "اے رو سیاہ یہاں سے دور ہو۔" لیکن سعید اپنی جگہ قائم رہا۔
باشا کی بیوی اور لڑکی نے بھی اس آواز کو سنا اور دوڑتی ہوئی آئیں "کیا بات ہے"۔ باشا نے سارا قصہ بیان کیا، اور اس طرح دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد اس کو کچھ سکون ہوا۔ اب تھوڑی دیر کے لئے ہر شخص اپنی جگہ خاموش تھا، اور باشا غصہ فرو ہونے کے بعد یہ سمجھنے کا اہل ہو گیا تھا کہ اگر وہ ایک لفظ "اجازت" اپنے منہ سے نکالدے تو پھر اس کو وہی اگلی زندگی لطف و مسرت، اور عیش و نشاط کی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فاطمہ آگے بڑھی اور اپنے باپ سے بولی کہ "جو کچھ سعید نے کہا ہے اُسے آپ منظور کر لیجئے۔ میں اُس شخص کے ساتھ نکاح کرنے کے لئے راضی ہوں۔ اس بات کو جو ہمیں اس مصیبت سے نجات دلانے کیلئے بڑھاہے روانہ کر دینا چاہئے، میں نہایت مسرت کے ساتھ اپنی قربانی کرنے کے لئے تیار ہوں، اگر اس سے میرے خاندان کی عزت بچ سکتی ہے"
باشا نے سنا اور غور کرنے کے بعد وہ بھی اس نتیجہ پر پہنچا کہ اب سوائے اس کے کوئی چارہ کار نظر ہی نہیں آتا کہ اس تجویز کو منظور کر لیا جائے۔ آخر کار یہ صورت منظور کر لی گئی، اور فاطمہ کا نکاح اُس ضعیف آدمی سے ہو گیا۔

(۲)

فاطمہ اپنے شوہر کے مکان میں داخل ہوئی اس حالت سے کہ اُس کا دل دھڑک رہا تھا، اس کھنڈر کے وحشت ناک افسانے اُسکے کانوں میں گونج رہے تھے، اور اُس کے مالک کی کریہ صورت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی، لیکن چونکہ وہ شروع ہی سے مصائب برداشت کرنے کی عادی تھی، اس لئے وہ اب بھی حد درجہ صبر و سکون کے ساتھ اِن تازہ آلام کے جھیلنے کے لئے تیار ہو گئی۔
جب وہ مکان میں داخل ہوئی تو اُس کے شوہر مختار آفندی نے اُس کا ہات پکڑا اور اس ویران مکان کے تمام کمرے اور سارا سامان اُس کو دکھانے لے چلا، لیکن فاطمہ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے خلاف توقع اُس مکان کی آرائش دیکھی، یہاں نہایت قیمتی فرش بچھا ہوا تھا، جابجا تخت رکھے ہوئے تھے، برآمدہ کے سامنے گلاب و یاسمین کے درخت پھولوں سے لدے ہوئے صحن کو معطر کر رہے تھے، ہر طرف سے عود و مشک کی خوشبو آ رہی تھی، اور بلور کے قیمتی فانوسوں سے لطیف روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔
آخر میں یہ ایک نہایت وسیع کمرہ کے اندر پہنچی، جس کے درمیان ایک فوارہ اپنے موتی بکھیر رہا تھا، مختار آفندی نے فاطمہ کو اسی فوارہ کے قریب بٹھایا اس حال میں کہ وہ سخت حیرت زدہ ہو رہی تھی، اور اُس کا ہات اپنے ہات میں لے لیا اور فاطمہ نے محسوس کیا کہ ایک برقی رو اُس کے جسم میں دوڑ رہی ہے، چنانچہ اس کا نازک ہاتھ کانپنے لگا، جس کو اس کے شوہر نے بھی محسوس کیا۔ مختار آفندی نے نہایت نرم اور پر لطف لہجہ میں کہا "خدا کرے اس نئے مکان میں تم کو وحشت نہ ہو، اور اپنے خواہشات قلب

یہاں پا سکو۔ اس کی آواز میں لحن تھا، اُس کے الفاظ میں شیرینی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی پرشباب انسان کے زبان سے نکل رہے ہیں۔ فاطمہ نے یہ محسوس کرکے اپنا سر اٹھایا جیسے وہ کسی گہرے خواب سے بیدار ہوئی ہو لیکن اپنے سامنے جب پھر اُسی بدصورت بڈھے کو دیکھا تو اُس کی نگاہیں پھر مایوسانہ لوٹ آئیں۔

مختار آفندی نے پھر ایک شیریں تبسم کے ساتھ نہایت دلکش آواز میں اُس سے خطاب کیا "یقین کرو کہ تم اپنے باپ کے مکان سے منتقل ہو کر ایسی جگہ آئی ہو جہاں لطف و محبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے، اور تم اپنی راحت و آسائش اور نشاط و مسرت کے لئے ہر چیز مہیا کرسکتی ہو، کیونکہ تم یہاں کی ملکہ ہو، اور تمہاری ہی اجازت اور مرضی سے سارے کام ہونگے۔"

وہ یہ گفتگو کر رہا تھا اور فاطمہ حیران تھی کہ ایک ضعیف انسان کے منہ سے ایسے الفاظ کیونکر نکل سکتے ہیں جن سے شباب ہی شباب ٹپکتا ہے۔ اُس نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اُس کی پیشانی اور آنکھوں میں اُس نے خاص قسم کی ملاحت و کیفیت پائی، لیکن اُس کے بعد ہی جب اُس نے اس کی داڑھی اور بدصورت ناک کو دیکھا تو پھر وہی اضمحلال محسوس کیا، لیکن اُسی وقت مختار آفندی نے بھی اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھ لیا اور اس طرح نگاہوں کے اختلاط سے فاطمہ کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں آدھی رات ہوگئی تو مختار آفندی اُس سے رخصت ہو کر اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

صبح ہوئی اور فاطمہ کی آنکھ اُن چڑیوں کی آواز سے کھلی جو مکان کے اندر متعدد زریں پنجروں میں بند تھیں، وہ خاموش اُنکے نغموں کا لطف اٹھا رہی تھی کہ اُس کا شوہر آیا اور بولا کہ "ایک ضروری کام سے مجھے سفر کرنا ہے" اس خبر سے فاطمہ کا دل کڑھا اور اُس نے سوچا کہ "کس قدر عجیب بات ہے کہ شادی کے دوسرے ہی دن یہ شخص سفر کے لئے آمادہ ہوگیا" مختار آفندی نے اُسکے چہرہ سے اس اضمحلال کو معلوم کرکے کہا کہ "تم پریشان نہ ہو میرا سفر دو مہینے سے زیادہ کا نہیں ہے تمہاری تفریح کے لئے مکان میں بہت سی چیزیں موجود ہیں، میری غیبت میں ان سے دل بہلانا، میرا ملازم سعید بھی یہیں رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نہایت سلیقہ مند اور دلچسپ رفیق ثابت ہوگا"

فاطمہ نے جواب دیا (اور یہ پہلی گفتگو تھی جو اُس نے اپنے شوہر سے کی) "کیا یہ باتیں مجھے آپ کی طرف سے بے پرواہ کردیگی"

[illegible] نے جواب دیا کہ "یہ صحیح ہے تاہم کچھ نہ کچھ تو تمہارا دل بہلے گا۔ علاوہ اس کے میں نے اپنے بھتیجے شکیب کو بھی کہدیا ہے، وہ میری غیبت میں یہاں آتا رہے گا، اور اُس کے لئے یہ مکان بغیر کسی حجاب کے ہر وقت کھلا رہے گا۔ یقیناً وہ تمہارے لئے باعثِ دلچسپی ہوگا، شکیب نہایت اچھے اخلاق و آداب کا نوجوان ہے، وہ ایک ماہر طبیب بھی ہے" یہ کہکر مختار آفندی اُس سے رخصت ہوگیا۔

سعید نے اپنی مالکہ کو خوش رکھنے کی بہت کوشش کی، وہ اچھے اچھے قصے بیان کرتا، لطائف و نوادر سنایا کرتا اور اس میں شک نہیں کہ فاطمہ کا جی بہل گیا، چوتھے دن سعید آیا اور بولا کہ "شکیب آئے ہیں اور سلام عرض کرتے ہیں" فاطمہ اپنے لہو و سرور میں

اس نام کو بھول گئی تھی اور اُسے قطعی خیال نہ رہا تھا کہ اُس کے شوہر نے اُس کے بابت کیا کہا تھا اس لئے پہلے تو اس کو تامل ہوا لیکن جب اُسے یاد آیا تو اُس نے سعید سے کہا کہ "میرا بھی سلام اور شکریہ پہنچا دو"

جب سعید چلا گیا تو فاطمہ نے کھڑکی کے پردہ سے اُس شخص کو دیکھنا چاہا، جس کی تعریف اُس کے شوہر نے کی تھی شکیب نہایت خوبصورت جوان تھا اور جس وقت فاطمہ اس کی اور اپنے شوہر کی شباہت کا مقابلہ کرتی تھی تو سوائے پیشانی اور آنکھوں کے کوئی چیز نہیں ملتی تھی، کیونکہ یہاں حسن ہی حسن تھا اور وہاں وہی بدنما داڑھی، اور موٹی بھدی ناک۔ فاطمہ نے یہ دیکھکر ایک ٹھنڈی سانس لی، اور کھڑکی سے علیحدہ ہوکر فرش پر تکیہ کی آڑ سے بیٹھ گئی ——— اُس نوجوان کے قیام کے لئے گوشے کے ایک کمرے میں انتظام کیا گیا تھا۔ فاطمہ وقتاً فوقتاً جھروکے سے اس کو دیکھتی رہتی اور اپنے شوہر کی طرف سے کراہت میں اضافہ ہوتا رہتا۔ وہ اپنے نفس کو ملامت کرتی کیونکہ یہ اُس میثاق شرافت کے خلاف تھا، جو اُس کی قسمت اور مختار آفندی کے درمیان ہو چکا تھا، لیکن بعض اوقات وہ شکیب کو دیکھکر اس خیال پر مجبور ہو جاتی۔ اُس نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے شکیب کی طرف دیکھنا ہی نہیں چاہیئے۔ اور اس لئے اس نے سعید کو حکم دیا کہ کھڑکی کو مستحکم طور سے بند کردے، جس کی تعمیل ہوگئی۔ شکیب کو آئے ہوئے دو ہفتے گزر چکے ہیں، فاطمہ اس کے وجود کی طرف سے تجاہل کر رہی ہے اور یہ نہیں چاہتی کہ سعید اس کا ذکر کرے۔

لیکن چونکہ شکیب اور فاطمہ دونوں جوان تھے اور شباب کے برقپارے ایسے نہیں ہوتے کہ اُن کے درمیان دیوار یا پردہ حائل ہو سکے، اس لئے جب وہ رات کے سکون میں اس کی آواز سن لیتی تھی، اس کے گانے کی آواز کان میں پڑ جاتی تھی، اُس کے دل و دماغ میں پھر تلاطم پیدا ہو جاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ شکیب اور اپنے شوہر کی آواز میں بہت کچھ مماثلت پاتی تھی اس لئے پھر کوئی نہ کوئی تاویل کرکے وہ ضبط سے کام لیتی اور اپنے جذبات کو مغلوب کر لیتی، کھڑکی بدستور بند رہی اور شکیب اسی طرح تنہا زندگی بسر کرتا رہا۔

اس کے بعد تین دن ایسے گزرے کہ فاطمہ نے شکیب کے گانے کی آواز نہیں سنی، جس سے اُس کو تھوڑا سا انقباض پیدا ہوا، اُس نے چاہا کہ سعید سے سوال کرے، لیکن پھر باز رہی، تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس نے ہمت کی، اور سعید سے اُس کا سبب دریافت کیا، اُس نے کہا کہ "شکیب تین دن سے بیمار ہے اور صاحب فراش ہے"

فاطمہ نے کہا کہ "تم نے مجھے پہلے ہی دن کیوں خبر نہیں کی" سعید نے جواب دیا کہ "آپ کی بے پرواہی اور تغافل نے مجھے اجازت نہیں دی۔ میرے آقا نے آپ سے کہا تھا کہ شکیب کی مدارات کیجیئے گا لیکن آپ نے اس طرف توجہ نہیں کی" فاطمہ یہ سُن کر خاموش ہو گئی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سعید پھر بولا کہ "میرے نزدیک یہ مناسب ہے کہ آپ خود چل کر مزاج پرسی کریں۔ اور تسلّی دیں" یہ سُن کر فاطمہ نے اپنی چادر اٹھائی اور اوڑھ کر مریض کے کمرہ کی طرف چلی۔ جس وقت وہ وہاں پہنچی اور نگاہ سے نگاہ ملی تو اُس کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ دل سینے سے باہر نکل پڑیگا۔ فاطمہ نے اپنا ہاتھ دل پر رکھا اور مضطربانہ و منفعلانہ انداز سے داخل ہوئی، شکیب سہارا لیکر اُٹھ کھڑا ہوا اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر قریب ہی ایک کرسی پر بٹھایا اور اس عنایت کا

شکریہ ادا کیا لیکن فاطمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سعید نے سکوت توڑنے کے خیال سے شکیب کو مخاطب کرکے کہا کہ "آپ کی بیماری کا علم انہیں آج ہی ہوا ہے اور میں مورد الزام ہوں کہ میں نے اطلاع نہیں دی تھی، لیکن جب آج انہوں نے خود سوال کیا تو میں نے آپ کی بیماری کا حال بیان کر دیا"

یہ کہکر سعید کمرے سے باہر چلا گیا

شکیب بولا کہ "آپ کے آنے سے مجھے بہت سکون ہوا اور میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا آنا اور مرض کا جانا ساتھ ہی ساتھ ہوا ہے۔"

فاطمہ نے اس حال میں کہ اس کی زبان لڑکھڑائی جاتی تھی کہا کہ "آپ کو کیا شکایت ہے۔"

شکیب "مجھے نہیں معلوم"

فاطمہ "تعجب ہے کہ آپ طبیب ہیں اور ایسا کہہ رہے ہیں"

شکیب "جی ہاں میرا مرض وہ نہیں جسے طبیب پہچان سکے۔"

فاطمہ "تاہم کچھ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئیے"

شکیب "مجھے تو صرف اس قدر معلوم ہے کہ اس مکان میں داخل ہوتے ہی قلب میں اضطراب اور جسم میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی"

فاطمہ "میں جب اس مکان میں آئی تھی تو میرا بھی یہی حال ہوا تھا، جو میرے لئے یہ مرحیرتناک نہ تھا۔ لیکن آپ تو.........."

شکیب "میں تو یہاں نہایت مطمئن قلب کے ساتھ آیا تھا، لیکن بدقسمتی کہ اس دریچہ کی طرف نگاہ اٹھ گئی، اور نگاہ اُٹھتے ہی وہاں سے ایک تیر چلا جو میرے قلب میں پیوست ہو گیا" یہ کہکر شکیب نے اپنا منہ رومال سے چھپا لیا اور رونے لگا

یہ سن کر فاطمہ کی آنکھوں کے سامنے تاریکی سی چھا گئی، سارا جسم کانپ اُٹھا اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا آسمان زمین پر لرزہ طاری ہے وہ سمجھ گئی کہ اس تلمیح سے شکیب کا کیا مدعا ہے اور اس نے چاہا کہ اس آگ کے مشتعل ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلی جائے چنانچہ وہ گھبرا کر اپنے ملبوس کو سمیٹتی ہوئی اس طرح اُٹھی گویا آگ بالکل قریب ہے اور اس کے دامن کو لے لینا چاہتی ہے۔

رات آئی اور فاطمہ شب بھر کرب میں مبتلا رہی عقل کہہ رہی تھی کہ اپنے بوڑھے شوہر ہی کا ساتھ نبھانا چاہئیے، اور نفس کا تقاضہ تھا کہ شکیب کی آغوش میں سونپ دینا چاہئیے۔ بہر بدنصیب ہیں وہ نفوس جو نفس کے عارضی جذبہ سے مغلوب ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فاطمہ کا قلب اب چور چور ہو چکا تھا۔ سب سے پہلے ماں کی موت نے اُسے مجروح کیا، پھر سوتیلی ماں کے طعن وتشنیع نے اس کو ٹکڑے ٹکڑے کیا، اس کے بعد شادی کے واقعہ نے خوب پامال کیا، اب یہ آخری تیر شکیب کا تھا جس نے حسن کی اذیت کو تکمیل کی حد تک پہنچا دیا۔ الغرض وہ رات بھر تڑپتی رہی اور ایک لمحہ کے لئے نہیں سوئی۔

صبح ہوئی تو سعید روتا ہوا آیا اور بولا کہ "شکیب کو چل کر دیکھ لیجئے ان کی حالت بہت نازک ہے، اور وقت آخر آ گیا ہے، وہ آپ کو دیکھنا چاہتے ہیں اور ہذیان میں آپ ہی کا نام لے لے کر پکار رہے ہیں"

فاطمہ یہ سن کر پھر شکیب کے کمرہ میں گئی اور جب سعید چلا گیا، تو شکیب نے اپنے بازو پھیلا کر کہا کہ "اے فاطمہ میرا وقت آخر ہے، اب تو

آغوش میں آجاؤ کہ دنیا کو آسانی کے ساتھ چھوڑ سکوں "

یہ سنکر فاطمہ کا چہرہ سرخ ہوگیا اور پیچھے ہٹ کر بولی "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں تمہارے چچا کی بیوی ہوں اور اُس نے مجھ سے تمہارے اخلاق کی بہت تعریف کی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ تم یہاں ایک بھائی کی طرح آؤگے نہ کہ ایک بے صبر عاشق کی مانند،

شکیب: "میرا چچا تو گنہگار ہے کہ اُس نے اپنے اوپر تمہارے شباب کی قربانی کو منظور کر لیا اور مال کی قوت سے تم کو مجبور کیا کہ اپنا دل توڑ کر ساری زندگی کو تباہ کر لو، یقیناً تمہیں اُس کی محبت میں کوئی لطف حاصل نہیں ہوسکتا، رہا چچا بھتیجے کا رشتہ سو تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ محبت ان تمام قیود سے آزاد ہے اور وہ اس سے زیادہ نازک و قریب کے رشتے توڑ کر اپنا رشتہ قائم کرتی ہے"

فاطمہ: "یہ غلط ہے تمہارے چچا پر ــــ کوئی الزام نہیں عاید ہوسکتا، اُس نے ایسے وقت میں میری مدد کی کہ کوئی دوسرا مدد نہ کرسکتا تھا۔ اُس نے میرے خاندان کو تباہی سے بچایا، اور اتنا زبردست ایثار کیا صرف اس معاوضہ میں کہ میں اُس کی ہوجاؤں۔ رہا عیش و نشاط سو میں شروع ہی سے اس کی محرومی کی عادی ہوں، مجھ سے تم کوئی توقع قائم نہ کرو کیونکہ میں خائن نہیں ہوں"

شکیب: "میں طبیب ہوں اور اس حقیقت سے واقف ہوں کہ تمہارا شوہر ذیابیطس میں مبتلا ہے، اور بہت جلد مر جائیگا"

فاطمہ: "تو پھر اس سے زیادہ سعادت میرے لئے کیا ہوسکتی ہے کہ سارا وقت اسی کی خدمت میں بسر کر دوں"

شکیب: "اچھا تو یہی وعدہ کر لو کہ اگر وہ مر گیا تو تم میرے ساتھ شادی کر لوگی"

فاطمہ: "میں یہ وعدہ بھی نہ کروں گی، کیونکہ اُس کی زندگی میں ایسا وعدہ بھی میرے نزدیک خیانت ہے"

شکیب: "یاد رکھو کہ میں مر جاؤں گا اور یہ خون تمہاری گردن پر ہوگا"

فاطمہ: "اگر تم مر گئے حالانکہ میں جانتی ہوں تم نہیں مروگے، تو میں تمہارے شباب پر بھی اسی طرح آنسو بہاؤں گی جس طرح اپنی جوانی پر بہا رہی ہوں، اور تمہاری موت کے واقعہ کے بار کو برداشت کروں گی، کیونکہ یہ بار خیانت و کفران نعمت کے بار سے ہلکا ہے"

شکیب: "بہتر ہے تو میں اس مکان سے جاتا ہوں اور اب تم میری خبر کبھی نہ سنوگی"

فاطمہ: "فی امان اللہ"

(۳)

شکیب اپنے چچا کے مکان سے رخصت ہوگیا اور وہ وقت بھی ختم ہوگیا، جب مختار آفندی نے واپسی کا وعدہ کیا تھا۔

پہلا دن شام کو جب شہر میں اُس انقلاب کی خبر عام ہوئی جو ترکی کے حزب اتحاد و ترقی کے ہاتھوں ظہور میں آیا تھا، تو سعید خوشی سے چیخنے لگا، فاطمہ نے بھی سُنا، لیکن اُس کو سبب نہ معلوم ہوا، کہ یہ کیوں اس قدر مسرور ہے، اتنے میں اُس نے دیکھا کہ اُس کا شوہر داخل ہوا، اور سعید اور وہ دونوں ایک دوسرے سے انتہائے مسرت کی حالت میں لپٹ گئے، اس کے بعد اُس نے کوٹھے پر جانا چاہا، لیکن سعید نے روک کر کہا کہ "اس داڑھی اور ناک کے ساتھ میں نہ جانے دوں گا۔ ان کو علیحدہ کیجیے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی۔ سعید نے یہ کہکر اس کی مصنوعی داڑھی اور ناک دونوں علیحدہ کرکے پھینکدیں، اور فاطمہ کو یہ دیکھکر کس قدر حیرت

ہوئی کہ مختار آفندی شکیب ہی تھا۔ لیکن یہ حیرت زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی، کیونکہ جلد ہی یہ حقیقت معلوم ہوگئی، کہ اس کا شوہر ایک نہایت ہی مشہور شخص تھا۔ اور ترکی کے اُن نوجوانوں میں سے تھا، جو شخصی حکومت کے ظلم سے بچکر مصر میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس نے مصنوعی داڑھی اور ناک اس لئے لگائی تھی کہ ترکی کے جاسوس اسے پہچان نہ سکیں۔ شکیب کا پارٹ اس نے ادا کیا تھا کہ وہ مصر کی اس نوجوان خاتون کی عفت و امانت کا امتحان کر سکے۔

(ترجمہ از عربی)

درسِ حقیقت

دیکھ ادھر کو بھی ذرا محوِ تماشائے بہار — تک رہے ہیں تجھے پژمردہ نہالانِ چمن
نگہِ لطف سے جب تیری یہ ہونگے سرشار — گلِ خوش رنگ سے بھر دینگے یہ دامانِ چمن

حسنِ فطرت کے تملیگا یہ قیامت ہے کہ تو — اتنا دلدادہ ہے گلہائے گلستانوں کا
نگہِ شوق تری ڈھونڈتی ہے گل کو ہر سو — اور خیال آتا نہیں تجھکو کبھی خاروں کا!

تو نے جس سبزہ کو بیگانہ سمجھ رکھا ہے — اور تو کرتا ہے بیدردی سے جسکو پامال
وہ بھی گل سے بہ ادا ان کہیں اچھا ہے — تجھکو معلوم نہیں حسنِ دو روزہ کا مآل

سنبل و غنچہ و گل، برگ و ثمر، سبزہ و خار — حسنِ گلشن میں بنا سب کی اگر خاک سے ہے
سب پہ ہے لطفِ صبا سب پہ ہے احسانِ بہار — اور تعلق انہیں مشاطۂ افلاک سے ہے

محمود اسرائیلی

رودکی

(افادات ڈنی سن راس)

آج دنیا میں کلام رودکی کا کوئی ایسا مستند مجموعہ موجود نہیں، جس کی صحت پر اعتبار کیا جاسکے، اس مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ کلام رودکی کی صحیح طور پر کتنی مقدار ہے، اور اس کے نام، اوروں کا کتنا کلام غلطی سے منسوب کیا جاتا ہے، اس میں شک نہیں کہ وہ اُن شعراء میں سے تھا جنھوں نے موجودہ فارسی شاعری کی بنیاد ڈالی اور کلیلہ دمنہ کو بھی اُس نے منظوم کیا لیکن اسمیں بھی کلام نہیں کہ اُسکا کلام اب سے بہت پہلے مفقود ہوچکا۔ پھر اسدی نے لغات فارس میں رودکی ہی کا کلام زیادہ نقل کیا ہے، اور فارسی کی تمام فرہنگوں میں اس کے مصرع کثرت سے نقل کئے گئے ہیں، لیکن سولھویں صدی کے تمام تذکرہ نویس بھی شاکی ہیں کہ کلام رودکی نایاب ہے۔

رودکی کے سوانحی حالات بہت کچھ لکھے جاچکے ہیں، جن میں سب سے زیادہ حالات وہ ہیں جنھیں پروفیسر ولیم جیکسن نے اپنی کتاب Early Persian Poetry میں درج کیا ہے۔

وہ نصر ابن احمد سامانی (۹۱۳ء تا ۹۴۲ء) کے دربار کا شاعر تھا، لیکن اس کی تاریخ ولادت و وفات کی تحقیق نہیں ہوسکی، کہا جاتا ہے کہ وہ مادرزاد اندھا تھا، اُنکی شاعری کے متعلق اساتذہ فارسی نے جو کچھ لکھا ہے اور جسطرح اُسکی تعریف کی ہے اُس کا اعادہ بیکار ہے۔ لیکن "راحت الصدور" کے اُن دو عربی شعروں کا یہاں نقل کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جس سے رودکی کے مرتبہ پر کافی روشنی پڑتی ہے، وہ اشعار یہ ہیں:

" لولا جریر والفرزدق لم یدم ذکر جمیل من بنی مروان "
" وتری ثناء الرودکی مخلدا من کل ما جمعت بنو ساسان "

" الرودکی بضم الراء وسکون الواو وفتح الذال المعجمۃ وفی آخرہا الکاف ہذہ النسبۃ الی رودک ہی ناحیۃ "
" بسمرقند وبہا قریۃ یقال لہا بنج وہذہ القریۃ قطب رودک وہی علی فرسخین من سمرقند والمشہور منہا "
" الشاعر الملیح القول بالفارسیۃ السائرہ دیوانہ فی بلاد العجم ابوعبداللہ جعفر بن محمد بن حکیم بن عبدالرحمن "
" ابن آدم الرودکی الشاعر السمرقندی۔ کان حسن الشعر متین القول۔ قیل اول من قال الشعر الجید بالفارسیۃ ہو "
" وقال ابوسعد الادریسی الحافظ ابوعبداللہ الرودکی کان مقدما فی شعر بالفارسیۃ فی زمانہ علی اقرانہ "
" وروی عن اسمعیل بن محمد بن اسلم القاضی السمرقندی حکایۃ حکاہا عنہ ابوعبداللہ بن ابی حمزۃ السمرقندی "
" لا نعلم لہ حدیثا مسندا وبعد ان رایت لہ۔ روایۃ لم یمکن ترک ذکرہ) قال وکان ابوالفضل البلعمی وزیر "

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا کارخانہ ہندوستان میں بہت مشہور ہے

"اسمٰعیل بن احمد والی خراسان یقول الیس الرودکی فی العرب والعجم نظیر۔ وفات بہ رودک سنہ ۳۲۹"

"رودک سے اس کے نام کو نسبت ہے، جو سمرقند کا ایک ضلع ہے۔ اس میں ایک بستی بنج ہے، جو رودک کا مرکز ہے۔ سمرقند سے کوئی دو فرسخ دور ہے۔ فارسی شعرا میں بڑا بلیغ کہنے والا شاعر جس کا کلام ایران میں بہت مشہور ہے، ابوالحسن جعفر بن محمد بن عبدالرحمٰن بن آدم رودکی سمرقندی ہے۔

فارسی شاعری کا ابوالآباء تھا، ابو سعد الادریسی الحافظ کا قول ہے کہ ابو عبداللہ رودکی کا مرتبہ اس کے تمام ہمعصروں سے بلند ہے۔ ابوالفضل البلعمی وزیر اسمٰعیل بن احمد والی خراسان کہا کرتا تھا کہ رودکی عرب اور عجم میں آپ اپنی نظیر ہے۔ ۳۲۹ ہجری میں وفات پائی۔"

محقق یہ ہے کہ خطوط وحدانی کے اندر کی عبارت چہار مقالہ کے حاشیہ پر مرزا محمد نے کسی وجہ سے بڑھا دی ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ روایت کسی حدیث کی طرف اشارہ کرتا ہے، لیکن عربی میں لفظ روایت اسم ہے راوی اور راویۃ دونوں کا، اور راویۃ اشعار کے روایت کرنے والے اور یاد کرنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ فارسی میں لفظ راوی شاعری کے سلسلہ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ چونکہ سامانی نے صرف فقہا کے حوالے دیئے ہیں، اس لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ رودکی کے کسی راوی کی طرف اشارہ کرتا۔ نظامی عروضی نے دوسرے مقالہ میں بتایا ہے کہ فردوسی کا راوی کوئی شخص ابو دلاب تھا، اور "فارسی فرہنگوں" سے معلوم ہوتا ہے کہ رودکی کے راوی کا نام "مج" تھا، اور اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی مثنوی کلیلہ دمنہ کیونکر بالکل نایاب ہوگئی۔ آئندہ ہم اس کی مشہور و معروف مثنوی کلیلہ دمنہ کے بعض اشعار جو گم ہونے سے رہ گئے ہیں درج کریں گے لیکن یہاں ہم شاہنامہ سے وہ اشعار نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں جن میں رودکی کے اس ضائع شدہ تصنیف کا ذکر پایا جاتا ہے:-

کلیلہ بتازی شد از پہلوی ۔۔۔ بریں ساں کہ اکنوں ہمی بشنوی
بتازی ہمی بود تا گاہ نصر ۔۔۔ بدانگہ کہ شد در جہاں شاہ نصر
گرانمایہ بوالفضل دستور اوی ۔۔۔ کہ اندر سخن بود گنجور اوی
بفرمود تا پارسی و دری ۔۔۔ بگفتند و کوتاہ شد داوری
وزاں پس بدو رسم ورائے آمدش ۔۔۔ بدو بر خرد رہنمائی آمدش
ہمی خواستی آشکار و نہاں ۔۔۔ کزو یادگاری بود در جہاں
گزارندہ را پیش بنشاندند ۔۔۔ ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بپیوست گویا پراگندہ را ۔۔۔ بسفت اینچنیں دُرِّ آگندہ را

رودکی اور قطران

ڈاکٹر ایتھی نے ۱۸۷۳ء میں ایک مضمون رودکی پر لکھا تھا، اس نے ۲۶ مختلف کتابوں سے رودکی کے منتشر کلام کو جتنا مل سکا مہیا کیا تھا۔ یہی مضمون بعد کے یورپین نقادوں کا ماخذ ہے۔

اور اسی مضمون کے ۲۵۲ اقتباسات جن میں آٹھ رباعیاں بھی شامل ہیں، عام طور پر رودکی کا صحیح کلام سمجھے جاتے ہیں (مولانا شبلی کا خیال ہے کہ وہ رباعی جو "چون کار دلم" سے شروع ہوتی ہے رودکی کے زمانہ کی نہیں ہوسکتی۔) ایتھی کے مضمون کا تمام تر انحصار عوفی کے تذکرہ "لباب الالباب" پر تھا۔ لیکن اس کے بعد اور متعدد تذکرے شائع ہوئے مثلاً اسدی کی لغات فرس جو سنہ ۱۰۶۰ء میں مکمل ہوئی یا معجم شمس قیس کی جو سنہ ۱۲۳۰ء کے قریب تیار ہوئی، اور تیسری سب سے زیادہ اہم بیہقی کی کتاب "تاریخ مسعود غزنوی" ہے، لیکن ڈاکٹر ایتھی نے اسے نظر انداز کر دیا، حالانکہ اس میں بھی رودکی کے کلام کے چار اقتباس درج ہیں، اور چونکہ یہ کتاب سنہ ۱۰۵۰ء میں لکھی گئی تھی اس لئے ان اقتباس کے صحیح ہونے میں شک نہیں ہوسکتا۔ بیہقی کی کتاب سے جو انتخاب میں نے کیا ہے وہ یقیناً قصائد رودکی کے پس ماندہ کلام میں بہت اہم ہے۔

اسدی نے رودکی کے کلام کی ایک رباعی اور کلیلہ دمنہ کے ۶ شعر نقل کئے ہیں، اور شمس قیس نے ۲۹ بیت لکھے ہیں۔ ایتھے کا مضمون چھپنے کے بعد یورپ میں ایک چھوٹی سی بیاض چالیس نظموں کی دیوان رودکی کے نام سے شائع ہوئی۔ اس مجموعہ میں ساری نظمیں قیطران کی ہیں جو ایک سو سال رودکی کے بعد گزرا ہے۔ پانچ نظموں کے سوا باقی تمام نظمیں میں نے خود قیطران کے دیوان میں دیکھی ہیں۔ یہ دیوان ڈاکٹر ایتھی کی نظر سے نہیں گزرا، لیکن جب وہ اپنا مضمون "عہد حاضر کے فارسی لٹریچر" پر لکھ رہا تھا تو وہ "مجمع الفصحا" میں اتنا پڑھ چکا تھا کہ بعض نظمیں غلطی سے رودکی کے نام موسوم کی جاتی ہیں جو دراصل قیطران کی ہیں۔

رودکی کے اس فرضی کلام کے دو مجموعے برٹش میوزیم میں ہیں اور ایک میرے قبضہ میں ہے اور یہ تینوں بالکل ایک سے ہیں، ایک نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نسخے اس قلمی نسخہ سے نقل کئے گئے تھے جو تہران کی مسجد سپہ سالار کی ملکیت میں تھا۔ میرے قبضہ کا نسخہ ان دونوں نسخوں سے ملتا جلتا ہے۔ تقریباً یہ نسخہ انیسویں صدی کے نصف ثانی میں لکھا گیا ہے۔ ان نسخوں کی کل کائنات چالیس نظمیں اور دو رباعیاں ہیں۔

سب سے پہلے جب مجھے اس کی صحت پر شبہ ہوا تو اس کا سبب یہ تھا کہ ان نسخوں کا پہلا قصیدہ مسٹر [illegible] کی کتاب [illegible] جلد دوم میں قیطران کے نام سے شائع کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ میرے اپنے نسخہ میں وہ مرثیہ بھی پایا جاتا ہے جسے قیطران نے تبریز میں زلزلہ آنے کے وقت لکھا تھا۔ یہ زلزلہ سنہ ۴۳۴ھ میں آیا تھا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجموعہ بعد میں رودکی کے نام غلطی سے منسوب کیا گیا ہے۔

تعجب ہے کہ بعض تذکرہ نویس قیطران کی بابت بالکل خاموش ہیں۔ شمس قیس اور عوفی نے اس کے کلام کا نمونہ دیا ہے، اسدی نے قیطران کا ذکر تک نہیں کیا اور نہ نظامی عروضی نے چہار مقالہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔ سب سے قدیم تذکرہ جس میں [illegible] کی مثال بیان کرتے ہوئے [illegible] کا شعر نقل کیا گیا ہے، رسالہ "حسین وفائی" ہے۔

اگر گیارھویں صدی میں قیطران کی شہرت محض جنوبی ایران تک محدود تھی تو اسدی کو تو اس کا علم ہونا چاہیئے تھا جس نے "ابو دلف" [illegible] کے نام اپنی کتاب "گرشاسپ نامہ" معنون کیا تھا، اور یہ [illegible] قطران کا [illegible]

(کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ کارخانہ حوض حیدرآباد دکن میں ہے)

عوفی اور دولت شاہ کے اقتباسات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیطران محض اپنی تغزلیات کی وجہ سے مشہور تھا، لیکن اس کا تمام دیوان ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ صفت بہت تھوڑے قصائد میں دکھائی ہے، اور اس کے بعد ہونے کا ثبوت یہی ہے کہ دنیا نے اس کو رودکی کا کلام سمجھا۔

تذکرہ نویسوں میں سے سوانحی حالات کا زیادہ تر ماخذ تقی کاشی کا "خلاصۃ الاشعار" اور رضا قلی خاں کا تذکرہ "مجمع الفصحا" تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ قیطران کے مربیوں کے نام معلوم کیے جائیں کیونکہ اسی پر انحصار اس امر کا ہے کہ جو قصائد رودکی سے منسوب کیے جاتے ہیں وہ رودکی کے ہیں یا قطران کے۔ لیکن چونکہ اس مسئلہ پر بسیط گفتگو کرنے کا ابھی موقعہ نہیں ہے، اس لئے فی الحال سرسری تحقیق پر قناعت کرتا ہوں کہ رودکی کے کلام کے متعلق ہماری موجودہ معلومات کیا ہیں۔

تمام تذکروں کا ذکر یہاں ضروری ہے، تقی کاشی قیطران کی وفات سنہ ۴۴۵ھ میں اور رضا قلی خاں سنہ ۴۶۵ھ میں قرار دیتا ہے۔ مگر دیگر ذرائع سے یہ امر تحقیق ہوتا ہے کہ سنہ ۴۳۴ھ میں جب تبریز میں زلزلہ آیا تھا قطران وہاں موجود تھا۔ اور سنہ ۴۳۸ھ میں ہی وہ ناصر خسرو مشہور سیاح شاعر سے تبریز میں ملا تھا۔

رضا قلی خاں (مجمع الفصحا لیتھوگراف جلد دوم صفحہ ۲۲۴) کہتا ہے کہ قیطران کے ممدوح، ابو نصر مملان، عزیز الدولہ، ابو منصور اور شاہ مملان تھے۔

تقی کاشی کہتا ہے کہ امیر ابو منصور گورنر آذربائیجان، امیر ابو الخلیل جعفر اور ابو الہیجہ منوچہر تھے، یہ تمام نام قیطران کے قصائد میں موجود ہیں، لیکن حیرت یہ ہے کہ تقی کاشی نے ابو نصر کا نام نہیں لیا۔ اور رضا قلی نے ابو الخلیل جعفر کا ذکر نہیں کیا جس کا نام قطران کے متعدد قصائد میں نظر آتا ہے۔

اب فارسی مورخین کا بیان ہے کہ قطران کے کلام کو رودکی کے نام سے منسوب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ قطران کے ممدوح ابو نصر کو نصر بن احمد سامانی سمجھ لیا گیا۔ جو رودکی کا ممدوح تھا۔ لیکن میرے نزدیک یہ غلطی قصداً کی گئی، اور ایران کے لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ رودکی کا کلام اس قدر نایاب ہے انھوں نے ایک غیر معروف شاعر قطران کے دیوان کا نسخہ پاکر اسے رودکی سے منسوب کر دیا۔ قیطران کے کلام کا کل مجموعہ ۳۰ قصائد اور دو رباعیات ہیں، اور ۱۶ قصائد میں اس کے ممدوح کا نام آتا ہے۔

نمبر قصیدہ	نام ممدوح	نمبر قصیدہ	نام ممدوح
۱	ابو نصر مملان	۷ و ۸	ابو نصر محمد ابو نصر
۹	ابو منصور مسعود	۱۰	میر ابو نصر محمد
۱۱	امیر ابو نصر بن مسعود بن مملان	۱۶	میر ابو نصر
۱۴	شاہ ابو منصور	۱۸	میر ابو نصر
۲۰	امیر ابو نصر	۲۱	ابو نصر

نمبر قصیدہ	نام ممدوح	نمبر قصیدہ	نام ممدوح
۲۴	ابوجعفر محمد ابن احمد	۳۰	ابونصر
۲۳	ابونصر مملان	۳۴	ابونصر
۲۵	ابونصر بن مسعود بن مملان		

ہم دیکھتے ہیں کہ تیرہ قصائد ابونصر کے نام ہیں، جس کا پورا نام امیر ابونصر محمد ابن مسعود مملان ہے۔ پروفیسر براؤن کا دیوان قیطران جو محض ایک انتخاب ہے، ۲۰۴ قصائد، ۱۰ رباعیات اور ایک مثنوی کے ٹکڑے پر مشتمل ہے۔

اس مجموعہ میں قریب ۲۰ قصائد مختلف حضرات کے نام معنون ہیں، ۴۶ قصائد میں "ابونصر" کا نام ہے۔ اور بارہ قصائد میں ابومنصور کا، اسی طرح ۲۲ دفعہ ابوخلیل جعفر کا نام آیا ہے۔

کلام رودکی کے سلسلہ میں میری توجہ اس نادر تذکرہ کی طرف مبذول کی گئی جسے حسن رازی بن لطف اللہ طہرانی نے سنہ ۱۰۴۰ھ میں مرتب کیا تھا، اور جس کا نسخہ برٹش میوزم میں موجود ہے۔

اس نے رودکی کے بیان میں لکھا ہے کہ رودکی کا تمام اصلی کلام ضائع ہو گیا۔ اور اب (یعنی سنہ ۱۰۲۵ھ میں) جو اس کے ۵-۶ ہزار اشعار مختلف کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں وہ سب قیطران کے ہیں اور ممدوحین کے نام ہونے کی وجہ سے انھیں رودکی سے منسوب کر دیا گیا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:-

"راقم الحروف حسن رازی نے رودکی کے تقریباً ۲۰ دیوان دیکھے اور جب ان کا مقابلہ قیطران کے دیوان کے ایک قدیم نسخہ سے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سوائے چند قصائد کے سارا کلام قیطران کا ہے۔"

اس کے انتخاب میں چھ قصائد اور ۲۰ رباعیات رودکی کی ہیں، یہ کلام جہاں کہیں سے لیا گیا ہے اس نے وہاں کا حوالہ بھی دیا ہے میں نے رازی کے تمام قصائد نقل کئے ہیں، سوائے تیسرے قصیدہ کے، جس کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ یہ کسی مجموعہ سے لیا گیا ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں مرتب کیا گیا تھا، یہ قصیدہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

آمد بہار خرم با رنگ و بوئے طیب
با صد ہزار نزہت و آرایش عجیب

سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ لکھتا ہے کہ "میں نے اعتماد الدولہ کا کتب خانہ (آگرہ) بھی دیکھا ہے"

(باقی)

صادق ایوبی

حضرت شیخ حسن محمد چشتی رحمۃ اللہ علیہ

حسن محمد نام، قطب الدین لقب، ابو صالح کنیت۔ والد کا نام شیخ احمد تھا، مرز بوم قریہ پور ہے۔ تاریخ ولادت میں اختلاف ہے، لیکن [illegible][1] مرجح ہے۔

شیخ احمد ایک نہایت زاہد و متورع اور صاحب علم و وجاہت بزرگ تھے، ان کے جد قدیم الایام سے مالوہ کے ایک قصبہ قریہ پور ہی میں رہتے تھے۔ آبائی پیشہ زراعت تھا، لیکن شیخ احمد پڑھ لکھ کر ان کاموں سے بے لگاؤ ہو گئے۔ وہ چاہتے تھے کہ اس خشک و جامد زندگی سے نکل کر مذہبی اور علمی خدمات انجام دیں[2]۔ اسی غرض سے انہوں نے بارہا احمد آباد آ رہنے کی کوشش کی۔ احمد آباد اس زمانہ میں علم و طریقت کا مرکز تھا، لیکن معاش کی مجبوری سے ایسا نہ کر سکے، اور وہیں رہ کر یہ سلسلہ جاری کیا۔ سلسلۂ عامیہ میں لکھا ہے

"غالب وقت او در تعلیم و تدریس می گزشت"[3]

سب سے پہلے اپنے نونہالوں کو سمیٹا، اور پھر گاؤں کے تمام مسلمان بچوں کو پڑھانے لگے، لیکن کیا پڑھاتے تھے؟ اس کے لئے اخبار الاولیا کی یہ عبارت ملاحظہ ہو،

"از تفسیر القرآن و علم حدیث شغف مجذوبانہ داشت، در فقہ حنفی و بیع المعاملات بود، اما مسلکاً اہل حدیث بود، درس حدیث و تفسیر می داد"

شیخ احمد کو تقلید شخصی سے بیحد نفرت تھی ائمہ میں ان کو حضرت امام احمد بن حنبل سے زیادہ شیفتگی تھی، عبادات و معاملات اور معتقدات میں انہی کا اتباع کرتے تھے[4]

قریہ پور کی فضا میں اول اول جب یہ آواز بلند ہوئی تو لوگوں نے حیرت سے سنا، انہوں نے دیکھا کہ شیخ احمد کی تعلیم سے انکے بچے نئی نئی باتیں سیکھ رہے ہیں، اور اسلاف نے جو عمارتیں بنائی تھیں وہ گرائی جا رہی ہیں، اس سے وہ بہت برہم ہوئے، بولے یہ باتیں جو تم سیکھ گئے ہو کس نے بتلائیں؟ کیا تم اپنے بزرگوں کے خلاف جاؤ گے؟ ہماری سعادت صرف تقلید و اتباع میں ہے، یہ طریقہ جو تم اختیار کر رہے ہو غلط اور خطرناک ہے، ہر شخص ایسا فاضل نہیں بن سکتا کہ اجتہاد کرے، اور اپنے معاملات میں خود

---

[1] اخبار الاولیاء [2] تذکرۃ الفضلا [3] صفحہ ۱۰۰ [4] تذکرۃ الفضلا

فتوی نہ دے۔ مفتی اور مجتہد کے لئے تقوی، طہارت، ایثار، اتباع سنت اور کشف کی ضرورت ہے" مگر ان کو اجتہاد کا مزا پڑ گیا تھا نہ مانے۔ دو شرع و آئین کو اپنی من مانی راہوں پر چلانے لگے۔ یہ دیکھکر اُن کا جوش حرکت میں آگیا، غصہ میں بھرے ہوئے شیخ کے پاس آئے، ان کو بہت کچھ سخت سست کہا، یہاں تک کہ مارنے کو تیار ہو گئے، وہ یہ سب باتیں پی گئے، اور صبر و تحمل کا چھینٹا دیکر اُن شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ پھر ایک محققانہ تقریر کرکے دلائل کے زور سے اپنے مسلک کی فضیلت منوا دی، وہ خاموش ہو کر چپ گئے[۵۱] لیکن عمل بالحدیث کے اُس نادان دوست کی غلطی اللہ نے بہت جلد واضح کر دی۔ جتنوں کو پڑھایا تھا، سب اُن کے مسلک سے علیحدہ ہو گئے، عمل بالحدیث کی جگہ عمل بالنفس پر کام چلنے لگا۔ شریعت چوگان کی گیند بن گئی، جسے ہر پاؤں نے جس طرح چاہا ٹھکرایا۔ مگر ان خان و ماں سوز شعلوں کا سب سے بڑا آتش کدہ اُن ہی کا گھر تھا، اخبار الاولیا میں لکھا ہے:۔

شیخ احمد کی اولاد میں، حسن محمد سب سے زیادہ ذہین و فطین تھے، انہیں جب ابتدا سے یہ سبق ملا تو اُن کی ذہانت و فطانت اس بے قیدی کو لے اڑی، اور وہ زمانۂ طالب علمی ہی میں من مانے اجتہاد کرنے لگے، جب پڑھ لکھکر فارغ ہوئے تو نقد خود کھو چکے تھے، نفس کی خود رائی جو باتیں کہتی تھی وہی کرتے تھے۔ قرآن و حدیث ان کے جذبات کا محور تھی۔ فتح یمانی اجتہاد کے شوق میں ضعیف، متصل مرفوع، موقوف، مرسل، منقطع، تعلیق، تدلیس، موضوع، مفصل آحاد، معلل، متروک، مضطرب، مقطوع، مدرج بھی بنائے اجتہاد بن گئیں۔ والد نے چاہا کہ بے قیدی کو اس حد تک نہ بڑھنے دیں، لیکن جو آگ خود لگائی تھی وہ آسانی سے بجھنے والی نہ تھی۔

روضۃ الاخیار، سلسلۂ نظامیہ اور اخبار الاولیا تینوں ہم زبان ہیں کہ حسن محمد زمانۂ تعلیم ہی میں والد کے بس کے نہ رہے تھے، اسی وجہ سے سفر اختیار کیا اور مستقل گیارہ برس مختلف شہروں میں رہکر شیوخ علم سے استفادہ کیا۔ فہم و فراست، ذکاوت و ذہانت حافظہ کی تیزی، اخذ و استدلال کی قوت اور بحث و تقریر کی مخصوص سحر بیانی و طلاقت لسانی کا یہ حال تھا کہ ہم چشموں اور ہم درسوں کو بولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ جو کتاب ایک بار دیکھ لیتے پھر اس سے مستغنی ہو جاتے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ مناظرہ کی مجلسوں میں بیٹھے ہیں، اور تمہیدی تقریر کے زور بیان نے تسلیم و اعتراف کے جھکے ہوئے سروں کی قطاریں باندھ دی ہیں۔ ان قطاروں میں کبھی کبھی اِن کے اساتذہ بھی دیکھے گئے ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے حریفان معرکہ صرف ایک ہی داؤ جانتے تھے، مگر یہ مجموعۂ ہر علم و فن تھا۔ تاریخ میں وہ اپنے وقت کا ابن اثیر و جریر تھا، ادب و انشا میں اُس کی جگہ ابن قدامہ کے برابر تھی، اسرار شریعت میں وہ ابن قیمؒ کا جانشین تھا، اور فلسفہ، منطق، کلام میں، باقر، طوسی، اور نظام کا ہم پایہ تھا۔ مگر اس کا خاص فن حدیث و تفسیر تھا، جس کی مسند پر بیٹھکر اجتہاد و فتوی کی مجلس گرم ہوتی تھیں، اور جس کے پردہ میں وہ ہر ایک سے لڑتا تھا، اور فاتحانہ نکلتا تھا۔

لیکن دائرۃ المعارف کی یہ سنہری جلد صرف ظاہری نظروں کے لئے تھی۔ یعنی وہ علم و فضل کا فیل پیکر وجود تھا مگر روح صلاح و تقوی نہ تھی۔ مختلف علوم کا برقی کنول تھا، مگر ظلمات کے تو بر تو پردوں میں الفاظ و مصطلحات کا فانوس تھا، مگر معانی سے خالی۔ کیونکہ

---

[۵۱] سلسلۂ نظامیہ و اخبار الاولیا۔

یہ جو کچھ سکھایا گیا تھا، صرف وجود آرائی کیلئے سکھایا گیا تھا، اس کا مقصد معرفت ایزدی نہ تھا بلکہ نمائش۔ اسی کے زور سے انہوں نے گجرات کی اکثر آبادیوں کو زیر کیا، اور علماء کی ایک بڑی جماعت اپنے ہم خیال بنائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بے تقلیدی بے انتہا ترقی کر گئی۔ عقائد و اعمال کے نئے نئے باب قائم ہو گئے حلت و حرمت کے مسائل جس نے جس طرح چاہا بدل لئے جائز و ناجائز کی تعین اٹھ گئی، ایمان کا دیا جو پہلے ہی ٹمٹما رہا تھا، اصلاح کی ہوا کے جھونکوں سے ایک دم بجھ گیا؛ اور علماء فقہا کی اس قدر بے قدری ہوئی کہ علانیہ گالیاں دی جانے لگیں، جو زبان جس قدر زیادہ تیر پھینکتی اسی قدر زیادہ صالح و متقی سمجھی جاتی، لیکن جو ذرا بھی لکنت کرتی اور دینی دینی کو برا سمجھتی وہ ان بے قید و ساتے مجموعہ تعزیرات کی سنگین مجرم قرار پاتی۔[۵۱]

پہلے پہل جب یہ تخم ریزی ہوئی تھی، لوگوں نے اعتراض کیا تھا، لیکن اس وقت فقہا کی جزئیات مزعومہ، ان کے قیاس غیر صالح اور ان کے مشاعر و معتقدات خود ساختہ و پرداختہ کے خلاف جہاد تھا۔ قیام سنت اور اخماد بدعت کی دعوت تھی، تقلید مالک و نعمان کے بجائے اتباع رسالت و خلفاء رسالت کی مقدس پکار تھی، لیکن اب خود احکام وحی و رسالت حس وخاشاک کا انبار بن گئے، آیات و احادیث کو جس طرح چاہا توڑ مروڑ لیا گیا، ائمہ خاطی سمجھے گئے، قانون فقہ ناقابل عمل قرار پایا، طریق سلف ترقی کے لئے سد راہ سمجھا گیا اہل تقلید ستائے جانے لگے، اور ہر شخص کو اختیار مل گیا کہ وہ اپنے معاملات میں خود ہی فتویٰ دے اور شریعت میں حسب ضرورت جیسی چاہے ترمیم و تنسیخ کر لے، کہ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر نص قطعی ہے۔

شیخ احمد اپنے پیشوا و علما کو مذہب کا نادان دوست کہا کرتے تھے مگر اس معاملہ میں ہم ان کو کیا کہیں؟ وہ غریب تو مذہب کے نادان دوست تھے، مگر دانا دوستوں نے بھی تو حق دوستی ادا نہ کیا، بلکہ ایک پوری آبادی کو ایسا بے زنجیر بنا دیا کہ ان کے اعمال و عقائد میں ملل و نحل اور کتاب الفرق جیسی کئی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، انہیں خطرات کا لحاظ کر کے فقہا نے کہا تھا۔

"عموم الاجتھاد دالبرہان اثم یستوجب التعذیر"[۵۲]

حسن محمد کی تعلیم جن اصول پر ہوئی تھی، اور ان کے خد و خال میں ابتدا سے جو رنگ بھرا گیا تھا، وہ علم و فضل عزت و جاہ، دولت و قبولیت کے رنگوں سے اس قدر گہرا ہو گیا کہ کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ اس رنگ میں کوئی ادنیٰ سی ادنیٰ تبدیلی بھی ہو سکیگی۔ خود والد یہ کہتے تھے کہ "لکڑی بغیر ٹوٹے سیدھی نہیں ہو سکتی" لیکن علم و قابلیت میں بیٹے کے ہمسر نہ تھے اور اجتہاد کی تعلیم انہی نے دی تھی، کچھ بول نہ سکے۔[۵۳]

آپ کی علمی قابلیت کی وجہ سے مالوہ کی آبادی کا بڑا حصہ حلقہ بگوش تھا، جو بات زبان سے نکل جاتی پتھر کی لکیر ہوتی اور ہر شخص اپنے قول و فعل سے اس کی تصدیق کرتا۔ مخالفین میں بڑے بڑے اہل علم سینہ سپر ہو کر نکلتے مگر ایک ہی مقابلہ میں پسپا ہو جاتے۔[۵۴]

---

۵۱ - یہ واقعات شیخ صابر کے مکتوبات اور اخبار الاولیاء سے ماخوذ ہیں۔ ۵۲ طحطاوی ۵۳ - سلسلۂ نظامیہ۔ ۵۴ سلسلۂ نظامیہ۔

عقیدتمندوں کی آمدنی اتنی تھی کہ ایک ہزار ماہانہ مطبخ کا خرچ تھا، دسترخوان بہت وسیع اور لذیذ کھانوں سے لبریز ہوتا تھا۔ پندرہ میں ملازم تھے، لباس بہت قیمتی پہنتے، اور بغیر سواری کہیں جاتے نہ تھے۔ گھر فرش فروش اور سامانِ آرائش سے ایسا آراستہ تھا کہ کسی بڑے امیر کی مجلس معلوم ہوتا تھا۔[1]

ایک دفعہ محکمۂ قضا کے بعض علماء نے کسی مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے بلایا، اُن کے پندار و انانیت کے لئے یہ بہت ہی سخت ضرب تھی، کہلا بھیجا مجھے فرصت نہیں، کسی کے پاس جانا وضع کے خلاف ہے، گفتگو کرنی ہے تو خود تشریف لے آئیے۔[2]

لیکن ہر چیز کی ایک انتہا ہوتی ہے، ہر عمل کے ساتھ اس کے رد کا قانون یقینی ہے۔ اس لئے خرمن خود پرستی جلا، خزاں کی ہوائیں اُٹھیں، غرور و فضل دانش کے باغ میں ویرانی پھیلی۔ رات کو بادۂ پندار کے نشہ میں بدمست سوئے تھے، صبح اُٹھے تو خود فروشی کے نشہ میں چور تھے عمر بھر کی محنت سے جو عمارت تیار کی تھی، وہ چشم زدن میں خاک بسر ہوگئی، دیکھنے والے اس اچانک نیرنگی کو دیکھکر حیران رہ گئے، لوگوں نے پوچھا تو بولے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوگیا، اور کیسے ہوگیا، البتہ یہ جانتا ہوں کہ کسی نے سوتے سے جگا دیا ہے"

عزیز و اقارب، دوست احباب بچپن سے مستقل مزاجی کے مداح تھے، تلامذہ و معتقدین کیرکٹر کی مضبوطی کے ثناخواں تھے، لیکن اس فوری انقلاب سے سب محو حیرت رہ گئے۔

مگر اُن کی حیرت فطرتِ بشری کے خلاف تھی، کوئی شخص ہمیشہ ایک حالت میں نہیں رہتا، خارجی موثرات اور بیرونی ہیجانات سے متاثر ہونا ہر فطرت کا طبعی خاصہ ہے۔ موثرات جتنے زیادہ اور جتنے قوی ہوتے ہیں انسان اتنا ہی اُن سے متاثر ہوتا ہے، اور ہر شخص پر ایک دائمی تبدیلی اور مستمر تلون طاری رہتا ہے۔

پس حسن محمد کی زندگی میں انقلاب ہوگیا اور اُن کی حالت نفسی یکایک بدل کر اپنی اصلی راہ چلنے لگی تو اس میں کونسی بوالعجبی ہے یہ انقلاب و تغیر تو انسانی زندگی کا معیار، اور کامل و ناقص فطرت کی کسوٹی ہے۔

تذکروں میں اس استحالۂ نفسی کے مختلف واقعات لکھے ہیں۔ لیکن اُن کا سب کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت شیخ جمال الدین، اور آپکے درمیان مدت سے کچھ اختلافات چلے آتے تھے۔ بعض تذکروں میں یہ بھی لکھا ہے۔ کہ وہ حسن محمد سے مناظرہ کے لئے چند طالب علم تیار کر رہے تھے، اور انھوں نے اپنے حلقہ اثر میں اُن کے طریقہ کی بہت مخالفت کی تھی، یہ سُن کر حسن آگ بگولا بن کر اُٹھے، سفر کی تیاری کی اور معتقدین خاص کی ایک جرار جماعت ساتھ لیکر احمد آباد روانہ ہوگئے، راستہ میں بعض لوگوں نے منع کیا، اور شیخ کی جلالت علمی کے واقعات سُنا کر روکنا چاہا، لیکن اس پانی نے تیل بن کر اور شعلے اُٹھا دیئے۔ شیخ کو آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تو شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا، اور اپنے گھر لاکر بہت خاطر تواضع سے مہمانداری کی، گو انہیں مقصد سفر کا علم ہوچکا تھا، تاہم وہ خاموش رہے اور اپنی طرف سے چھیڑ نہ کی، لیکن یہاں ضبط کی تاب کہاں تھی، دوہی دن میں کھل پڑے۔

---

[1] اخبار الاولیا۔ [2] اخبار الاولیا

دل میں جو کچھ تھا لب پر آگیا، اور جو کچھ نہ کہنا تھا وہ بھی کہہ دیا۔ جب یہ اپنی گفتگو ختم کر چکے تو شیخ نے ایک تقریر کی[51]۔ تقریر کیا تھی ایک بجلی تھی، جس نے سب کو لرزا دیا۔ ایک جادو تھا جس سے سب مسحور ہو گئے۔ ایک تیر تھا جس نے سب کے دلوں کو چھلنی کر دیا۔ تقریر عربی میں تھی، بعض طلبہ نے جستہ جستہ مقامات سے مضامین لکھ لئے تھے۔ جو دو آبادی کاغذ کے ۲۰ صفحوں پر محیط تھے[52]۔ حسن کہتے ہیں[53] یہ تقریر سُن کر میرے خیالات بالکل بدل گئے، میں اپنے اندر ایک نمایاں تبدیلی پانے لگا، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پرانا کثیف لباس میرے جسم سے اتر رہا ہے۔ اور دوسرا نیا اور نورانی لباس غسل کرا کے کسی نے مجھے پہنا دیا ہے۔ اب تک میں سمجھتا تھا کہ ہر علم و فن میں میں ہی سب سے بڑا ہوں، لیکن اس تقریر نے پہلی دفعہ مجھے بتلایا کہ میں سب سے چھوٹا ہوں ؎

ہم بڑی چیز سمجھتے تھے یہ میخانے میں
نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ پیماں اپنا

یا خود پرستیوں کا وہ عالم تھا، اور یکتائی کے غرور میں اس قدر سرشاری تھی کہ اپنے آگے کسی کی کچھ اصل و حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ اور جو گردن جھکنے میں ذرا بھی تامل کرتی اس کو جھکانے کے لئے سازشیں کرتے تھے، یا خاکساریوں اور نیازمندیوں کا یہ حال ہو گیا کہ سب کو اپنے سے بہتر سمجھنے لگے۔ اور جن جن سے لڑے تھے ان کے پاس جا کر ہاتھ جوڑے معافیاں[54] مانگیں عشق خالق و خدمت حق کے سوا سب کاموں کو چھوڑ دیا، سچائی کی لگن ایسی لگی کہ عجز و شکستگی کی چادر اوڑھ لی۔ اور خود فروشی کی خرید و فروخت کرنے لگے۔

کسی ملنے والے نے پوچھا کہو کس حال میں ہو، پہلے اچھے تھے یا اب؟ بولے "پہلے ظلمت کدۂ حیات میں بے خبر سوتا تھا، اب قلزم ہوشیاری کے ساحل پر کھڑا ہوں وہ زندگی فسق و فجور کی تمثال عریاں تھی اور یہ نفی معصیت آلودہ پر اشک حسرت ہے[55]۔ ساتھیوں میں بڑے بڑے سرکش عقل پرست، اور بزعم خود عالم یا محدث تھے، ہر شخص اپنے تئیں عزم و استقلال کی آہنی چٹان سمجھتا تھا، اور اس خیال میں مست تھا کہ جمال الدین کو نیچا دکھائیگا۔ مگر کچھ ایسی سنی کہ وہی باتوں میں سب کچھ بھول گئے شیخ کی تقریر ختم ہوتے ہی سب نے نیازمندانہ سر جھکا دیئے اپنی بدعملیوں سے توبہ کی اور بیعت ہو کر ساری پابندیوں سے آزاد ہو گئے

دہلی پر یہ خبریں پہنچیں تو جھوٹی سمجھی گئیں[56]۔ وہاں سب کو حسن محمد کی تیغ زبانی پر پورا بھروسہ تھا، جو کھتا دراُن کے تغیر حال کے واقعات سناتا، جھٹلا دیتے۔ لیکن واقعات نے بہت جلد خود انہی کو جھٹلا دیا، اور گمراہی کے جادو نے صراط مستقیم کے آستانہ نیاز پر نیازش کی۔ یہاں سے تحقیق حال کے لئے پے در پے چند قاصد بھیجے گئے، مگر جو آیا یہیں کا ہو رہا۔ تاہم یہاں اب تک کسی کو یقین کلی نہ تھا، کہ ان کے مرشد اعظم کی حالت بدل گئی ہے۔ ان کے کانوں تک روز آتہ یہ خبریں پہنچتیں

---

[51] اخبار الاولیا [52] روضۃ الاخیار [53] اخبار الاولیا [54] سلسلۂ نظامیہ [55] سلسلۂ نظامیہ [56] سلسلۂ نظامیہ۔ [57] اخبار الاولیا

اور، وزانہ ان کے ماننے سے انکار کرتے۔ کیونکہ اُن کے دماغوں میں یہ عقیدہ راسخ ہوگیا تھا کہ حسن محمد فوق الفطرت انسان ہے، تغیر، تبدیلی، شکست، جھکاؤ، اس کے اندر راہ نہیں پا سکتا۔ لیکن جھوٹ کا طلسم سچائی کی مشاطگری کرتا ہے، صداقت اپنے چہرۂ نگارین سے نکلتی ہے اور باطل پرستوں کو تصویرِ حیرت بنا دیتی ہے۔ خبروں کی تکرار اور تواتر نے سب کے دلوں میں تزلزل پیدا کر دیا۔ اور خلفاء و نائبین کی اس جماعت کو بھی جانا پڑا جو تمام کاموں کی ذمہ دار تھی[۵۱] مگر نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ کے غمزۂ صد کرامات کے یہ بھی اسیر ہوگئے ؎

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں
دیرینہ سال پیرے بردش بہ یک نگاہے

شیخ ان سب کے آنے کی غرض سمجھ چکے تھے، لیکن وہ منتظر تھے کہ اس جماعت کے تمام سربرآوردوں کو دیکھ لیں۔ اس گروہ کے آنے کے بعد اُن کا انتظار ختم ہوگیا، اور اب انہوں نے فرداً فرداً سب کو بیعت کرکے اپنے اپنے گھروں کو جانے، اپنے اہل و عیال کی خبر لینے اور تناسب توازن کے ساتھ ایک ہی ہاتھ میں دین و دنیا کو رکھنے کی ہدایت کی، چنانچہ ایک بڑی جماعت چلی گئی[۵۲] اور اس نے واپس جا کر اس ہدایت کی پوری تعمیل کی۔ حسن محمد اور اُن کے ہمراہی ٹھہرے رہے، اور ایک سال بعد شیخ کے ہمراہ فرید پور جا کر کچھ دن رہے اور پھر واپس آکر ہمیشہ کے لئے احمد آباد میں مقیم ہوگئے[۵۳]

فرید پور میں جب پیر و مرید کے آنے کی خبر پہنچی تو سب لوگوں نے بڑی بڑی تیاریاں کیں[۵۴] اور دور دور سے مشتاقانِ زیارت نے آکر فیضِ دیدار حاصل کیا، توبہ کی جماعتیں کی جماعتیں بیعت ہوئیں اور یہ سلسلہ ایک مہینہ تک جاری رہا[۵۵]۔ دن میں کئی دفعہ ایسا ہوتا کہ انبوہ در انبوہ لوگ آتے اور شیخ اُن کے سروں پر چادر ڈال کر بیعت کرتے۔[۵۶]

ایک جمعہ کو جلسہ بھی کیا گیا، جس میں حاضرین کی تعداد اسّی نوّے ہزار سے متجاوز تھی۔ ہندو بھی بکثرت شریک ہوئے تھے، دونوں بزرگوں نے تقریریں کیں، تمام حاضرین اثر و تاثر سے لبریز تھے، بہت سے ہندو مسلمان ہوئے اور بیعت کرکے مسند نشینی کے درجہ تک پہنچے۔[۵۷]

سیر الصلحا میں لکھا ہے کہ شیخ کی صحبت اور تربیت نے حسن محمد کو دوہر شب تاب بنا دیا تھا جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا تھا، اُن پر ایک نئی کیفیت طاری ہوتی جاتی تھی، اور ہر مقام اُن کو شیخ کے سانچہ میں ڈھال دیتا تھا، تا آنکہ پیر و مرشد دونوں ایک ہوگئے۔

شیخ نے اپنے حلقہ درس و ارشاد میں آپ کے لئے ایک علیحدہ مسند بچھوا دی۔ صبح سے گیارہ بجے تک درس دیتے۔ جمعہ کا دن وعظ و خطبہ کے لئے مقرر کیا۔ باقی اپنے باطنی کاموں میں مشغول و منہمک رہتے۔ ذریعہ معاش شیخ کی طرح محنت و مزدوری تھا[۵۸]

انقلاب و تغیر کا یہ حیرت انگیز واقعہ تم نے دیکھا۔ ایک زندگی جو شروع سے بالکل بے درد تھی، دردمندیوں کا شیون ہوگئی۔

---

[۵۱] سلسلہ نظامیہ۔ [۵۲] اخبار الاولیا [۵۳] تذکرۃ الفضلا و سلسلہ نظامیہ [۵۴] اخبار الاولیا [۵۵] سلسلہ نظامیہ [۵۶] سلسلہ نظامیہ و اخبار الاولیا۔ [۵۷] اخبار الاولیا۔ [۵۸] روضۃ الاخیار۔

ایک دل جو ابتدا سے ناآشنائے رسم الفت تھا، گرفتار محبت ہوگیا، اور لطف یہ کہ گرفتاری پر محزون و مغموم نہیں خرم و شاداں ہے

رشتۂ درگردنم افگندہ دوست
مے برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اخبار الاولیا میں لکھا ہے کہ آپ کو متعدد سلسلوں میں بیعت و ارشاد کی اجازت تھی۔ خاندان قادریہ میں محمد غیاث نوربخش سے کازرونیہ میں محمد حیات سے، فردوسیہ میں ولی الدین سے ہمدانیہ میں شاہ عبدالسلام سے اور سلسلۂ چشتیہ و نظامیہ میں حضرت جمال الدین کے علاوہ دو اور بزرگوں سے بھی خرقۂ خلافت حاصل تھا۔

ابتدائی اور آخری دونوں زندگیوں میں تصنیف و تالیف کا کام جاری رہا۔ عہد اول کے آثار علمی انقلاب حیات کے ساتھ ہی جگہ جگہ سے جمع کرکے جلا دئے کہ اُن کا حرف حرف نور باطنیوں کا آئینہ تھا۔ عہد آخر کی مصنفات تمام تر تصوف پر تھیں، لیکن اب صرف تفسیر سورۂ محمدؐ اور تقسیم الاوراد باقی ہیں۔ یہ دونوں کتابیں قلمی میں نے دیکھی ہیں۔ باقی ناپید ہیں۔

۱۲ ذی قعدہ سنہ ۹۸۲ھ کو یکایک قلب کی حرکت رک کر، روح نزہت کدۂ قدس کی طرف پرواز کر گئی۔ مزار پیران پٹن میں ہے۔

ناظر دہلوی

غزل

ہنگامہ خیز عشق میں افتاد ہوگئی
قائم وہیں پہ درد کی بنیاد ہوگئی

مٹنے پہ بھی یہ عالم دل ہے کہ الاماں
دنیا ہر ایک ذرہ میں آباد ہوگئی

افسوس! اک اسیر قفس کی تمام عمر
وقف نظر شناسیِ صیاد ہوگئی

یوں چشم سرمگیں سے مجھے دیکھنا نہ تھا
اب تو کچھ اور ہمت فریاد ہوگئی

ہے ہے یہ بیکسیِ محبت کہ خاک دل
اپنی نظر کے سامنے برباد ہوگئی

شامل وہ ہوگئی مرے دل کی سرشت میں
جو خاک راہ عشق میں برباد ہوگئی

ہے یہ رنگ آرزوئے دلِ عشق میں
اُف بنگئی کبھی، کبھی فریاد ہوگئی

ذرات دل کو عشق مجسم بنائیں گے
درکار ہے وہ خاک جو برباد ہوگئی

انکی نگاہ گرم کا چرچا نہیں کہیں
مشہور خلق میں مری فریاد ہوگئی

اے دل قیام عشق سے یہ سرزمین دل
ویران ہوگئی کبھی آباد ہوگئی

دل شاہجہاں پوری

فرشتے سے خطاب

اے فرشتے! اے مقدس روح! تجھ پر ہو سلام — آج ہمت کرکے ہوتا ہوں میں تجھ سے ہمکلام
میرے دل میں جاگزیں ہیں تیری سب اعلیٰ صفات — پوچھتا ہوں میں بعد تعظیم تجھ سے ایک بات
تیری دنیا ہے جہاں، ہوتا نہیں ہے غم وہاں — غم سے تو نا آشنا ہے تو سکون دل کہاں
غم میں کتنا کیف ہے یہ بھی تجھے معلوم ہے — کیفیت سے یہ تری روحانیت محروم ہے
لطف راحت کا نہیں ملتا ہے جبتک غم نہ ہو — وہ خوشی کی قدر کیا جانیں جہاں ماتم نہ ہو
ہوتی ہے رنج و مصیبت سے جلا ہر روح کو — غم سے رفعت ہوتی ہے اکثر میسر روح کو
کچھ خبر ہے دل کی دھڑکن میں ہے لذت کسقدر — آنسوؤں میں کیف بھرتی ہے محبت کس قدر

خواب میں بھی جب نظر آئے نہ تاریکی تجھے — نور والے! نور ہی کی قدر کیا ہوگی تجھے
رنج و غم لازم نہیں ہے کچھ گناہوں کے لئے — اور بھی اکثر سبب ہوتے ہیں آہوں کے لئے
حد سے جب گزرے اولوالعزمی تو ہوتا ہے ملال — غم گناہوں کا نتیجہ ہی نہیں اے خوش خصال

میں نے یہ مانا خدا سے ہے بہت ہی تو قریب — جانتا ہوں تجھکو ہر لحظہ حضوری ہے نصیب
لیکن اے نور مجسم یہ بھی ہے تجھکو خبر — ہم سے ہے نزدیک تیرا حسن والا کس قدر
آکے دیکھے گر تو رگ رگ میں اسے پائیگا تو — اتنی قربت دیکھکر حیران رہ جائیگا تو
خاک کے پتلوں میں جلوہ اپنا دکھلاتا ہے وہ — دیکھ تو آکر ہر انساں میں نظر آتا ہے وہ

ہائے افسرؔ ہے ہمارا دکھ مبارک کس قدر
دل میں سکھ بنکر وہ آتا ہے کبھی دکھ بنکر

حامد اللہ افسر میرٹھی

سنما اور تعلیم

اس وقت دنیا میں بہت سی ایجادات مقبول و مشہور ہیں، لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ باستثناء موٹر وہ کون سی ایجاد ہے جس نے بہت قلیل مدت میں نہایت وسیع مقبولیت حاصل کر لی ہے، تو اس کے جواب میں سنما یا صور متحرکہ کا نام لینا پڑیگا۔

اب سے پندرہ سولہ سال قبل جب اس کی ابتدا ہوئی تو اس کی حیثیت صرف لہو و لعب کی سی تھی، اور اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ چند سال کے بعد گراموفون کی طرح اس سے بھی جی سیر ہو جائیگا۔ اور پھر لوگ اس طرف توجہ کرنی چھوڑ دیں گے۔ لیکن چند سال نہ گزرے تھے کہ مختلف ملکوں میں اس کا شمار بہترین وسائل تفریح میں ہونے لگا۔ اور تھیٹروں کے وہ ایکٹر جو سنما میں کام کرنا کسر شان اور انحطاط فن کا باعث سمجھتے تھے جوق در جوق اس طرف متوجہ ہونے لگے اور تمنائیں کرنے لگے کہ کسی طرح ان کی خدمات بھی سنما میں قبول کر لی جائیں۔

اس کے درجۂ قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک (صرف دس سال کے اندر) چالیس ہزار عکاسخانے (سنما گھر) دنیا میں تیار ہو گئے۔ جن میں ۱۷،۰۰۰ امریکہ میں تھے، ۳۵۰۰ بلاد انگلستان میں، ۳۲۰۰ جرمنی میں، ۲۷۰۰ فرانس میں، ۱۱۰۰ اطالیہ میں، ۱۰۰۰ اسپین میں، ۸۰۰ اسٹریلیا میں، ۷۰۰ سوئیڈن میں، ۶۰۰ جاپان میں اور اسی طرح دیگر ممالک میں۔ اور اب (پانچ سال کے اندر) تو اس کی ترقی کا یہ عالم ہے کہ شاید ہی کوئی حصۂ زمین ایسا ہوگا جہاں اس سے دلچسپی نہ لیجاتی ہو، یہاں تک کہ وہ مقامات جو حضارت و عمران کے مرکز سے دور ہیں وہاں بھی اس کا رواج ہو گیا ہے، چنانچہ جمہوریۂ ارجنٹین کے صدر مقام بیونس ایرس میں سنہ ۱۹۲۲ء تک ۱۳۱ عکاسخانے تیار ہو گئے تھے اور وہاں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جس کی آبادی ایک ہزار سے زیادہ ہو، اور وہاں عکاسخانہ نہ ہو۔ ہندوستان میں، چین برما اور سیام کا حصہ ایسا ہے جو یورپی ذوق سے بالکل علیحدہ ہے اور وہاں مغربی اثر بہت کم پایا جاتا ہے، لیکن اگر آج آپ "بنکاک" کانٹن۔ تینتسین، اور رنگون وغیرہ کو جا کر دیکھیں تو حیرت ہو جائے کہ کس طرح شوق کے ساتھ لوگ متحرک تصویروں کی طرف مائل ہیں۔

[illegible] کی آبادی جس شوق کے ساتھ اس میں حصہ لیتی ہے یا جس وسعت کے ساتھ وہاں کی کمپنیاں اس کو رواج دے رہی ہیں [illegible] کے ظاہر کرنے کے لئے غالباً یہ اعداد و شمار کافی شہادت سمجھے جائیں گے کہ سنہ ۱۹۲۰ء میں روزانہ تماشہ دیکھنے والوں کی تعداد امریکہ میں ایک کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ (حکومت امریکہ نے جو نقشہ شائع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف فلم بنانے والی [illegible] کا سالانہ نفع ۹۰ ملین ڈالر ہوتا ہے) اسی طرح انگلستان کے عکاسخانوں کو سنہ ۱۹۲۰ء میں ۳۵ ملین گنی اور فرانس والوں کو ۵۰ ملین فرانک کا فائدہ ہوا۔ لیکن اسی کے ساتھ مصارف کو بھی دیکھئے تو حیرت ہوتی ہے کہ ایک ایک فلم کی تیاری میں

لاکھوں کروڑوں روپیہ صرف ہوتا ہے اور بعض بعض ایکٹر ایسے ہیں جن کو تین تین لاکھ کی سالانہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر زر خطیر جو سنما پر صرف کیا جاتا ہے تو اس کا فائدہ کیا ہے اور ملک کی تعلیم و تربیت پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے

یوروپ و امریکہ کے ماہرین تعلیم و تربیت کا خیال ہے کہ صور متحرکہ تعلیم و تربیت کا بہترین ذریعہ ہے، اور اسی غرض کے لئے خاص خاص فلم تیار کرائے جاتے ہیں جو لوگوں کی معلومات میں اضافہ کر سکیں۔ چنانچہ دنیا کے تمام مشہور حوادث و واقعات کے فلم تیار کرانا اسی اصول کی بنا پر ہے تاکہ ساری دنیا انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ظاہر ہے کہ دیکھنے سے جن حقیقتوں کا علم ہو سکتا ہے وہ صرف تقریر و تحریر سے نہیں حاصل ہو سکتا۔ گویا اس طرح فلم سے صحیفہ اخباری کا کام لیا جاتا ہے۔

انگلستان کی وہ کمیٹی جو فلم کے اختساب کے لئے مقرر ہے اپنی رپورٹ میں ظاہر کرتی ہے کہ وہ طلبہ جو سنما دیکھتے ہیں ان کی معلومات دوسرے ہم عمر طلباء سے جو سنما نہیں دیکھتے کہیں زیادہ وسیع و عمیق ہوتی ہیں۔ چنانچہ جب ایسے طلبا کا امتحان لیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کی معلومات صرف ایک موضوع پر حاوی نہیں بلکہ جغرافیہ۔ آداب۔ علم طبیعی۔ صناعت۔ تاریخ۔ عادات اجتماعیہ و واقعات عالم ان سب پر ان کو آگاہی تھی اور اسی کے ساتھ یہ بھی تھا کہ جو حقائق کتابوں کے ذریعہ سے انہیں حاصل ہوئے تھے وہ ایسے مستحکم طور پر دماغ میں راسخ نہ ہوئے تھے جیسے وہ حقائق جن کو انہوں نے سنما میں دیکھا تھا

اسی لئے ظاہر ہے کہ اگر سنما سے نشر حقائق کا کام لیا جائے اور لوگوں کو ملکوں کے نقشے، اجناس بشری کی شکلیں، عادات اقوام اور اسالیب صنعت وغیرہ سے آگاہ کیا جائے تو بڑا فائدہ مترتب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ سنما میں دس منٹ بیٹھنے سے جو درس حاصل ہو سکتا ہے وہ گھنٹوں کتاب پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتا۔

بڑی بڑی حکومتوں نے گزشتہ جنگ کے بھی فلم تیار کرائے تھے۔ جس سے مقصود یہ تھا کہ لوگ اسی کو دیکھکر متاثر ہوں، فوجوں میں بھرتی کی کثرت ہو جائے، اور دشمن کے خلاف پروپاگنڈا ہو سکے۔ علاوہ اس کے اس سے یہ فائدہ بھی متصور تھا کہ فوجوں کی نقل و حرکت میدان جنگ کے نقشے۔ فنون حرب کے نکات، آلات جنگ کا استعمال مستقل طور پر محفوظ ہو جائے، تاکہ ضرورت کے وقت سپاہیوں یا طلبہ کو بطور درس کے دکھایا جا سکے۔

اسی بنا پر بعض علماء کی رائے ہے کہ اس وقت تمام تاریخ کو فلم میں منتقل کر کے سربمہر عجائب خانوں وغیرہ میں محفوظ کر دینا چاہیئے تاکہ آنیوالی نسلیں اس کو دیکھکر تاریخی فائدہ حاصل کر سکیں۔

الغرض اس افادہ کے خیال سے تازہ ترین اہم واقعات کے فلم تیار کرنے کا اس قدر اہتمام کیا جاتا ہے کہ بعض کمپنیوں نے اپنے اپنے نمائندے دنیا کے تمام بڑے بڑے شہروں میں متعین کر دیے ہیں تاکہ جلد سے جلد وہاں کے واقعات کی متحرک تصویریں تیار کر کے بھیجتے رہیں۔ اس کا ایک نہایت دلچسپ واقعہ وہ ہے کہ جب آخر سنہ ۲۲ء میں ترک فوجیں سمرنا میں داخل ہوئی تھیں اور شہر کے ایک بڑے حصے میں ان کے داخلہ کے وقت آگ لگا دی گئی تھی اور جس کی تصویریں اس واقعہ کے بعد ہی

نیویارک اور امریکہ کے تمام بڑے بڑے مقامات میں دکھائی گئیں۔ ان تصاویر کے حاصل کرنے کی صورت یہ ہوئی کہ نیویارک کے ایک کمپنی نے یہ معلوم کر کے کہ ایشیا کوچک میں سیاحت حربی بدلنے والی ہے اپنے ایک نمائندہ کو جو وہاں تھا تار دیا کہ فوراً سمرنا جا کر ترکی فوج کی نقل و حرکت کی تصویریں لے۔ یہ اسی وقت وہاں پہنچا جب فوجیں سمرنا میں داخل ہو رہی تھیں اور اس کو جانے کی اجازت نہیں ملی۔ اس نے ایک ہوائی جہاز کرایہ کر کے اوپر اڑا اور وہاں سے تصویریں لیں۔ اس کے بعد وہ حلفاء کے ایک جہاز میں جو بندرگاہ سمرنا سے اور لنگر انداز تھا اس کے مسطح پر چڑھ کر آگ لگنے کا فلم حاصل کیا۔ اسی وقت اس کو دوسرا تار ملا کہ جس قدر جلد ممکن ہو فلم کو پیرس پہنچا دے۔ تاکہ وہاں تیار کیا جائے۔ یہ فوراً ایک کشتی کرایہ کر کے فرانس کے قریب ترین ساحلی مقام تک پہنچا اور وہاں سے پھر ہوائی جہاز پر پیرس گیا۔ یہاں یہ فلم دھویا گیا اور قرار پایا کہ اکوٹانیا جہاز سے امریکہ بھیجا جائیگا۔ اتفاق سے یہ جہاز تین گھنٹہ قبل فلم تیار ہونے سے روانہ ہو گیا تھا۔ یہ لوگ پھر ہوائی جہاز لیکر چلے اور راستہ میں اکوٹانیا جہاز کو پکڑ کر فلم سپرد کیا اور نیویارک تار دیدیا۔ یہ جہاز نیویارک سے فاصلہ ہی پر تھا کہ کمپنی کے منیجر نے ہوائی جہاز بھیجکر اکوٹانیا سے یہ فلم منگوایا اور اس کی بہت سی نقلیں کر کے سارے ملک میں منتشر کر دیا۔

اسی طرح واشنگٹن میں صدر جمہوریہ (ہارڈنگ) کا اعلان ہوا تو ۶ گھنٹہ کے بعد جلسۂ اعلان کی تصویریں نیویارک کے ۶ کا نخانوں میں دکھائی جا رہی تھیں۔

امریکہ شاید پہلی حکومت ہے جس نے مزارعین کے لئے فلم تیار کرائے، یہاں کی وزارت زراعت نے سو فلم حکومت کے کارخانوں میں ایسے تیار کرائے ہیں جن میں کاشت اور اہلی جانوروں کی پرورش کے متعلق ضروری ہدایات بتائی گئی ہیں۔ یہ فلم وہاں ہر ہر گاؤں میں دکھائے جاتے ہیں تاکہ کاشتکار اس سے فائدہ اٹھائیں۔ اسی طرح وہاں کے محکمۂ تعلیم نے اس کا انتظام کیا ہے اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ہال ۱۵۰۰ یونیورسٹی، کالج اور مدرسے ایسے تھے جہاں تعلیمی عکاسخانے قائم ہو چکے تھے اور طلبہ کو مختلف علوم کے درس متحرک تصویروں کے ذریعہ سے دیئے جاتے تھے۔ اب اس تعداد میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ وہاں اس غرض کے لئے "فلم لائبریری" بھی قائم کی گئی ہے تاکہ جس طرح کتابیں مستعار دی جاتی ہیں اسی طرح ان فلموں کو مدارس میں مستعار دیا جائے اور طلبہ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

جب نیویارک میں ۲۴ جون کو پورا سورج گرہن پڑا تو اس کا فلم تیار کیا گیا اور لوگوں کو دکھایا گیا تاکہ وہ کسوف کی حقیقت اور اس کی تدریجی کیفیت کا علم حاصل کر سکیں اسی طرح ہیئت اور علم طبقات الارض کے متعلق بہت سے فلم تیار کئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اجرام فلکی نے موجودہ صورت کیونکر اختیار کی، زمین کیونکر رفتہ رفتہ منجمد ہوئی اور اس میں کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے حتیٰ کہ آئنسٹین کے نظریۂ اضافیت [illegible] کا بھی فلم تیار ہو گیا ہے، علم الجراثیم کو بھی مصور کر لیا ہے۔ خاص خاص اعمال جراحی کی بھی تصویریں محفوظ کر لی ہیں اور ان سیاحتوں کے فلم بھی بن گئے ہیں جو علمی و تحقیقی اصول کی بنا پر نہایت سنسان و غیر آباد مقامات میں اختیار کی گئی تھیں۔

الغرض دنیا کا کوئی علم و فن ایسا نہیں ہے جس پر فلم کے ذریعہ سے کامیاب لکچر نہ دیا جا سکے۔

”مسلمانوں کے دورِ حکومت“ پر ایک نظر

اپریل نمبر میں ایک مضمون ”ہندو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں“ محمد یوسف صاحب اعظمی کا دیکھنے میں آیا۔ اس میں بعض جگہ لائق مقالہ نگار سے فروگذاشت ہوگئی ہے جن کو میں واضح کر دینا چاہتا ہوں۔

اعظمی صاحب نے صفحہ ۳۰ پر تحریر فرمایا ہے ”محمد تغلق کے زمانہ میں جبکہ فتنہ و فساد کی لہر ہر جگہ دوڑنے لگی تو امراء دکن بھی سلطنت دہلی سے قطع تعلق کرکے خود مختار بن بیٹھے، اور بہمنی کے نام سے دکن میں پانچ عظیم الشان حکومتوں کی بنیاد ڈالی۔ دکن میں اوّل اوّل اسلامی سلطنتیں ہندو راجاؤں سے برسرپیکار رہیں، قدیمی بغض و کینہ جو چند دنوں کے لئے پژمردہ ہوگیا تھا پھر از سرِ نو تازہ ہوگیا۔ لیکن امتداد زمانہ کے بعد ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے مغرورانہ برتاؤ کم ہوگئے، اور انہوں نے ان کو کثرت کے ساتھ ملک کے انتظامی محکموں اور فوج میں داخل کرنا شروع کیا، چنانچہ فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں ہندو کثرت سے امور ملکی پر قابض ہوگئے۔ ......

مگر ابراہیم عادل شاہ نے برہمنوں کی حالت پر رحم کرکے شاہی دفتروں سے فارسی نکال کر اس کے بجائے ہندی رائج کر دی چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے ”دفترِ فارسی برطرف ساختہ ہندوی کرد و معاملہ را صاحب دخل گردانید“

ان سطور کی تردید کے لئے تاریخ دکن کے کئی باب الٹنے پڑتے ہیں، مگر میں حتی الامکان مختصر عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

محمد تغلق کا زمانہ فتنہ و فساد سے پُر تھا اور اس کے اثرات نے دکن میں بھی جداگانہ سلطنت قائم کر دی۔ مگر یہ غلط ہے کہ ”امراء دکن بھی سلطنت دہلی سے قطع تعلق کرکے خود مختار بن بیٹھے“۔ واقعہ یہ ہے کہ محمد تغلق کے ایک بھائی بہاؤالدین گرشاسپ نے ساگر میں علم بغاوت بلند کیا، اور تغلق نے اس فتنہ کو مٹانے کے لئے دولت آباد کو پایہ تخت بنا لیا۔ مگر چند ہی روز کے بعد ملک طغی نے گجرات میں بغاوت کی اور سلطان نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے پھر دولت آباد سے سب کو دلی طلب کیا۔ حسن نامی ایک مصاحب ومعتمد نے جو تغلق کا منظورِ نظر اور بہت ہوشیار شخص تھا تغلق کی اس حماقت سے فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کو جو دلی سے دولت آباد گئے تھے یہ باور کرایا کہ سلطان اسی طرح ہمیں نکر مارا مارا پھریگا، اور پھر کبھی دن خفا ہو کر قتل بھی کرا دیگا، مناسب یہی ہے کہ ہم یہیں رہیں سب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور حسن نے تمام باغیوں کو جمع کرکے دولت آباد میں ایک مجلس قائم کی۔ اور اسمٰعیل فتح نامی ایک امیر کو صدرِ مجلس بنا دیا، چونکہ بعض امراء دلی کو دکن میں جاگیریں ملی تھیں اس لئے وہ بھی شریک مجلس ہوگئے، اور پھر ایک نے اپنی اپنی جاگیر میں بغاوت شروع کی، حسن نے راجہ کولاس کی مدد سے گلبرگہ پر قبضہ کرلیا۔ اور حسن آباد نام رکھ کر اپنی بادشاہت کا اعلان کرنا چاہا۔ کہیں جب تغلقی فوج نے دولت آباد کا محاصرہ کرلیا تو حسن دولت آباد آیا۔ اسی اثناء میں اسمٰعیل فتح نے ظفر خاں

(خطاب) اور ناصر الدین (لقب) اختیار کر کے حکومت شروع کر دی تھی حسن نے تغلقی فوج کو تو بھگا دیا مگر اس کا اثر اسمٰعیل پر یہ ہوا کہ اس نے حسن کی حالت دیکھ کر خود کنارہ کشی اختیار کی اور بتاریخ ۳ اگست ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء حسن کو تخت نشین کر دیا۔ اسی حسن نے "علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی" لقب اختیار کیا۔ حسن کے گنگو اور بہمنی لقب اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ حسن جس وقت دہلی پہنچا تو شدتِ اشتہا کی وجہ سے دریا پر بیہوش ہو گیا۔ گانگو برہمن نے جو شاہی منجم تھا اس کو اپنے گھر لا کر مہمان رکھا۔ زراعت کے لئے زمین دی، شاہزادے کے پاس پیش کرایا اور امیرانِ صدہ میں داخل کرا دیا۔ انتہا یہ کہ حسن کو بادشاہت کی خوش خبری سنا دی اور اپنے احسانات گنا کر استدعا کی کہ حسن جس وقت بادشاہ ہو تو برہمن نام بھی جزو نام بنا لے جسے حسن نے منظور کر لیا۔ جب یہ زمانہ آیا تو اس نے نہ صرف یہی کیا بلکہ دفتر دیوانی یا حساب گنگو برہمن کے تفویض کر دیا اور انقضاع سلطنت بہمنیہ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ دفترِ حساب برہمن ہی کے خاندان میں رہا۔

اعظمی صاحب نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ "بہمنی کے نام سے دکن میں پانچ عظیم الشان حکومتوں کی بنیاد ڈالی" یہ بھی خلافِ واقعہ ہے۔ علاؤ الدین حسن نے بہمنی کے نام سے صرف ایک سلطنت قائم کی جو ۷۴۸ھ / ۱۳۴۷ء سے ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء تک قائم رہی اس دوران میں کوئی دوسری اسلامی سلطنت دکن میں نہ تھی۔ البتہ زوال سلطنت بہمنیہ کے چند سال قبل سے امیر برید نے بہمنیہ سلطنت کو برید شاہیہ بنا لیا تھا، مگر کلیم اللہ کی وفات پر ۹۳۲ھ میں اس نے باضابطہ برید شاہیہ سلطنت قائم کی۔ یوسف عادل خاں نے ۸۹۵ھ / ۱۴۹۰ء میں عادل شاہی سلطنت قائم کی اور بیجا پور دارالسلطنت بنایا۔ نظام الملک کے بیٹے احمد نے احمد نگر میں ایک سلطنت قائم کی اور "نظام شاہی" نام رکھا۔ قطب الملک نے گولکنڈہ میں "قطب شاہی" سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ ۸۹۰ھ میں عماد الملک کے بیٹے فتح اللہ خاں نے برار میں خود مختاری کا اعلان کیا اور "عماد شاہی" سلطنت قائم کی جو چند پشت کے بعد احمد نگر میں شامل ہو گئی یہ وہ پانچ سلطنتیں ہیں جن کو اعظمی صاحب نے بہمنی کے نام سے مخاطب کیا ہے۔ در اصل انہیں سلطنت بہمنیہ سے کوئی تعلق نہیں۔

اعظمی صاحب نے فیروز شاہ کے عہد حکومت میں ہندوؤں کا انتظامی اور فوجی محکموں میں داخل ہونا بیان کیا ہے۔ یہ بھی صحیح نہیں، ہندو تو سلطنت بہمنیہ کے قائم ہوتے ہی انتظامی محکموں میں داخل ہو گئے تھے چنانچہ جب حساب گانگو برہمن کے تفویض ہوا تو اس کے اعزہ و اقارب بھی ملکی عہدوں پر سرفراز ہوئے اور فوج میں بکثرت ہندو سپاہی بھرتی ہوئے۔

فرشتہ کے حوالہ سے فارسی کو برطرف کر کے ہندی کا رواج دینا جو بیان کیا گیا ہے یہ ذرا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ ہندی وہی ہندی ہے جس میں کہ اعظمی صاحب نے مضمون لکھا ہے اور جو اس وقت میں لکھ رہا ہوں در اصل اردو ہی کو ہندی کہا گیا ہے۔ اگر میں اس پر تفصیلی نظر ڈالوں تو طوالت ہوگی۔ علی گڑھ میگزین بابتہ ماہ اگست و ستمبر ۱۹۲۲ء جلد (۲) نمبر ([illegible]) میں "اردو کے تعریف الوطن" کے تحت میں مولوی احسن مارہروی نے اس پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ملاحظہ سے سارے شکوک رفع ہو سکیں گے۔

صفحہ ۴ پر اعظمی صاحب نے لکھا ہے "احمد نگر کی عادل شاہی حکومت نے کثرت کے ساتھ مرہٹہ سرداروں کو بھرتی کرنا شروع کر دیا" احمد نگر کو عادل شاہی حکومت سے قطعاً تعلق نہ تھا۔ عادل شاہی حکومت بیجا پور کی تھی اور احمد نگر "نظام شاہی" تھا اسی طرح

"عادل شاہی حکومت کی غفلت۔ شعاری نے آخیر وقت میں سیواجی کا اس قدر اقتدار بڑھا دیا" اس میں بھی ایک لطیف مغالطہ ہے وہ یہ کہ سیواجی کو عادل شاہی حکومت سے مطلقاً تعلق نہیں۔ یا اگر "نظام شاہی" کہا جاتا تو کسی قدر مناسب تھا۔ مگر یہاں تو اعظمی صاحب نے بہمنیہ ہی کو پانچ سلطنتیں اور بیجاپور کے عادل شاہ کو احمد نگر کا نظام شاہ سمجھ رکھا ہے۔

چونکہ میں تاریخ بہمنیہ کی تدوین میں مصروف ہوں اس لئے ان عنوانات پر میری نظر خاص طور پر پڑی اور ساری باتیں ذہن میں ہونیکی وجہ سے فوراً دیدہ لگی رہ جاتیں دوسری تاریخی فروگذاشتیں اور کیا ہوئی ہیں جن پر میں غور نہیں کر سکا۔

نئی نمبر میں تمہ مضمون میں نے بالکل سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ مگر اس میں بھی لغزش ہوئی ہے صفحہ ۴۳ پر "سید محمد گیسو دراز دکھنی" کہا گیا ہے یہ دکھنی لکھنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ آپ کا تعلق دلی سے تھا، تغلق نے دلی اجاڑ کر دولت آباد آباد کیا تو آپ کے والد دولت آباد تشریف لائے اور پھر دلی تشریف لے گئے آپ فیروز شاہ کے زمانہ میں گلبرگہ تشریف لائے، اگر اس خیال سے آپکو دکھنی کہا جاتا ہے، کہ دکن میں مدفون ہیں تو یہ بے اصل بات ہوئی اور جس قدر اولیا ہند و عجم دکن میں مدفون ہیں وہ سب دکھنی کہلائیں گے۔ دراصل حضرت گیسو دراز دہلوی کہلانے کے مستحق ہیں نہ کہ دکھنی۔

اعظمی صاحب نے آگے چلکر لکھا ہے کہ "منشی لچھمی نرائن شفیق، عہد اکبری کے نامی اشخاص میں سے تھے فارسی ادب میں ید طولیٰ رکھتے تھے آزاد بلگرامی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ انہوں نے خلاصۃ الہند کے نام سے فارسی میں شعراء ملک کا ایک دلچسپ تذکرہ لکھا ہے اس کے علاوہ دستور محبت بھی ایک ان کی مشہور کتاب ہے۔"

شفیق کی مختصر لائف یہ ہے کہ لچھمی نرائن نام تھا اور شفیق تخلص۔ قوم کھتری کپور سے تھے۔ ان کے دادا بھوانی داس عالمگیری لشکر کے ساتھ لاہور سے دکن آئے اور اورنگ آباد میں متوطن ہوئے۔ نوکری پیشہ تھے۔ شفیق کے والد منسا رام صغیر سنی ہی میں یتیم ہو گئے اور لالہ جسونت رائے کی تربیت میں رہے انہیں کے پاس تعلیم و تربیت پائی اور نواب آصف جاہ بہادر کے زمانہ میں عہدہ پیشکاری اور منصب سے سرفراز ہوئے بخشی الملک کہلاتے تھے۔ ایک رسالہ آصف جاہ بہادر اول کی مدح میں لکھا اور اس میں ان کے زمانہ کے قوانین قلم بند کئے، یہ رسالہ طبع بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کتاب گوشوارہ دکن بھی لکھی۔ ۲۰ صفر ۱۱۵۸ھ کو شفیق اورنگ آباد میں تولد ہوئے۔ مولانا غلام علی آزاد علیہ الرحمۃ کی خدمت میں رہے وہیں تعلیم و تربیت پائی نواب صمصام الدولہ نے منصب اور دو لیمید خطاب دلوایا، پہلے صبا تخلص کرتے تھے ۱۱۷۶ھ سے مولانا آزاد کے حسب الحکم شفیق تخلص اختیار کیا، فارسی اُردو کے ضخیم دیوان (غیر مطبوعہ) موجود ہیں ماثر آصفی، ماثر حیدری، تذکرہ گل رعنا، تذکرہ شام غریباں، بساط الغنائم، مراۃ الہند، نخلستان، تذکرہ گرو بابا نانک، تذکرہ چمنستان شعراء تصانیف موجود ہیں، عہد اکبری میں شاید ان کے جد اعلیٰ ہوں تو ہوں مگر انکے جد بزرگوار تو عالمگیری ہیں نہ جانے اعظمی صاحب نے کس بنیاد پر ان کو عہد اکبری میں شمار کیا۔ اور پر لطف یہ کہ غلام علی آزاد کی شاگردی کا حال بھی بتلا دیا اس پر بھی غور نہ کیا کہ مولانا آزاد کو عہد اکبری سے کیا نسبت۔ شفیق کا کوئی تذکرہ "خلاصۃ الہند" نامی نہیں البتہ مراۃ الہند ایک کتاب ضرور ہے مگر یہ تذکرہ نہیں ہے۔ اور نہ "دستور محبت" کے نام سے ان کی کوئی تصنیف ہے۔ یہ بہت موٹی موٹی غلطیاں ہیں جنھیں تاریخ کا مبتدی طالب علم بھی فوراً محسوس کر سکتا ہے۔ ندوۃ العلماء کے ایک فرزند کے قلم سے ایسی فروگذاشت یقیناً قابل معافی نہیں۔

تمکین کاظمی

روح تنقید اور رسالہ اُردو کی پرلطف تنقید

ہمارے ملک کی مشہور انجمن "انجمن ترقی اُردو" جو ہمارے علمی کارناموں کی بہترین مظہر ہے بڑی خوش قسمت سمجھنی چاہیے کہ اُس نے مولوی عبدالحق سا فاضل معتمد پایا۔ انجمن ترقی اُردو کے کارنامے بیشک قابل داد ہیں، ان میں ایک عمدہ چیز اس کا آرگن رسالہ اُردو ہے "اُردو" اپنی متعدد خوبیوں کی وجہ سے ہندوستان کا ایک بہترین رسالہ ہے، اور کسی ترقی یافتہ قوم کے علمی پرچوں سے کسی طرح کم نہیں۔ مگر جب ہم اس اعلیٰ علمی رسالہ کو کبھی تنقیدات یا تعصب کی حد تک مائل دیکھتے ہیں تو بڑی حیرت ہوتی۔ لائق ایڈیٹر صاحب کے علمی تبحر ان کی لاجواب انشا پردازی ان کے ذوق تحقیق کے ماہر ہیں کوئی کلام نہیں، لیکن بعض اوقات وہ اپنی علمی تحقیق سے الگ ہو کر تفریحاً، بقول اُن کے "بے تہ مضامین" لکھنے پر اتر آتے ہیں۔۔۔ جب کبھی وہ کسی مصنف یا مؤلف سے بدگمانی کے سبب اس کی کتاب پر زور انتقاد صرف کرتے ہیں تو اُن کی انشاپردازی عجیب لطف دکھاتی ہے۔

لائق ایڈیٹر اُردو کی اس قسم کی تنقیدیں اکثر نظر سے گزری ہیں، لیکن حال میں اس قسم کا ایک اور نمونہ انہوں نے پیش فرمایا اُردو کے جدید نمبر (حصہ بست و دوم) میں منجملہ اور تنقیدوں کے ان کی ایک تنقید سید محی الدین صاحب قادری زور بی۔ اے کی کتاب "روح تنقید" پر ہے یہ بات ظاہر ہے کہ فن تنقید پر اب تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور یہ پہلی کوشش ہوئی ہے۔ اس کی جناب عبدالحق صاحب نے عجیب داد دی ہے۔

اس زمانہ میں فن تنقید پر کوئی کتاب لکھنے اور نقادوں کو صحیح اصول تنقید بتانے کی سخت ضرورت تھی۔ ایڈیٹر اُردو کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے تنقید کے اصول کی اس عمدگی اور سچائی سے پیروی کی ہے۔ تنقید کا ایک بڑا اصول یہ ہے کہ نقاد جانبداری یا تعصب سے قطعاً بری رہے۔ ایڈیٹر اُردو نے "روح تنقید" کے مصنف کو اپنے گمان میں اس قابل نہ سمجھا، کہ ان کے پیش کردہ اصول پر اپنے جیسے بلند پایہ عالم کو کاربند کرتے۔ شاید اُن کے نزدیک سعدی کا یہ قول ؎

مرد باید کہ گیرد اندر گوش　　گر نوشت است پند بر دیوار

اب قابل عمل نہیں رہا۔ چنانچہ "روح تنقید" پر اُن کی تنقید اس طرح شروع ہوتی ہے:-

" تنقید جس قدر عام ہے، اسی قدر مشکل ہے، جس طرح یہ ہمیشہ سے چلی آتی ہے، اسی طرح ہمیشہ تک چلی جائے گی، اور اُسکے مختلف مذاہب اور فرقے اور اس کے متعلق مختلف خیالات، اور متضاد رائیں ہیں اور یہ سب چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں"

پہلے فقرہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ خود ایڈیٹر صاحب کی رائے ہے، اسی طرح دوسرے فقرے سے بھی اسی بات کا ثبوت دیتے

ہیں کہ یہ انہی کی رائے ہے لیکن بعد کا فقرہ کتنا مزہ کا ہے کہ "یہ سب چیزیں اس کتاب میں موجود ہیں" میری ناقص فہم اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایک ہی کتاب میں تنقید جس قدر عام ہے۔ اسی قدر مشکل ہے، ہمیشہ سے چلی آئی ہے، ہمیشہ تک چلی جائیگی۔ اس کے مختلف نوشتے ہیں؛ اور اس کے متعلق مختلف اور متضاد رائیں ہیں، ان سب مختلف باتوں کا ہونا کیا معنی! شاید قابل نقاد ان فقروں کو بطور اقتباس کے درج کرنا چاہتے تھے اور مطبع کے مرتب الفاظ نے واوین کو غائب کر دیا۔

اس کے بعد ایڈیٹر صاحب فرماتے ہیں:-

"پڑھنے والا یہ رائے مشکل سے قائم کر سکتا ہے کہ تنقید کیا ہے، وہ مختلف اور متضاد رایوں کو پڑھکر الجھن میں پڑجاتا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔"

مجھے افسوس ہوتا ہے کہ قابل نقاد صاحب نے "روح تنقید" کا ساتواں حصہ ملاحظہ نہیں فرمایا؛ جہاں شروع ہی سے تنقید کے متعلق متفرق نقادوں کے خیالات پیش کرنے کے بعد مصنف نے اس طرح سے اپنی رائے ظاہر کرکے فیصلہ کر دیا۔ کہ "پس فن تنقید اس فن کو کہتے ہیں جس میں دوسروں کی حرکات و اقوال پر انصاف کے ساتھ فیصلے صادر کئے جاتے ہیں۔ صحیح و غلط اچھے اور برے، اور حق و باطل کے درمیان فرق کرنا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر دکھانا، وقتیہ معتقدات اور ذاتیات کو ملیامیٹ کرنا نیز صحیح مذاق پیدا کرانے کی کوشش کو تنقید کہتے ہیں۔ تنقید میں نہ صرف تقریظی پہلو ہوتا ہے بلکہ تخلیقی بھی، اس کا کام نہ صرف برائی کی مذمت کرنا ہے، بلکہ اچھائیوں کی بھی صحیح طور پر ترجمانی کرکے ان میں ترقی دینا"

کیا کتاب کی یہ عبارت پڑھنے کے بعد بھی نقاد صاحب کو الجھن پیش آئی؟ کیا یہ عبارت فیصلہ کن نہیں ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"تنقید پر وہی لکھ سکتا اور دوسروں کو ہدایت کر سکتا ہے جس کا مطالعہ گہرا اور نظر دور بین ہو، جو صرف ذوق ہی صحیح نہ رکھتا ہو بلکہ دریائے ادبیات کا شناور بھی ہو جس نے ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد ان امور کے متعلق خاص رائے قائم کی ہے، اور وہ اس رائے کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اور دوسروں کے دل نشین کر سکتا ہے۔"

اگر یہ قول صحیح ہے تو فلسفہ کی کتاب صرف وہی شخص لکھ سکتا ہے، جو بذات خود فلاسفر ہو، جس نے خود کوئی نظریہ قائم کیا ہو اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو فلسفہ پر ان مصنفین کی کتابیں جنھوں نے خود کوئی نظامی فلسفہ نہیں پیش کیا، بالکل فضول اور واہیات ہیں، نیز دوسرے حقیقی فلاسفروں کے ترجمے بھی اسی طرح لایعنی اور لغو ہیں، کیونکہ ان کا ترجمہ کرنے والے خود بڑے فلاسفر نہیں ہیں۔

کیا اچھا ہوتا کہ وہ خود اپنے وسیع تجربے، گہرے مطالعہ، دوربین نظر، ذوق صحیح، اور "دریائے ادب کی شناوری" سے کام لیتے، کہنے کو تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اب تک بہتیرے دریائے ادب کے شناور پیدا ہو چکے ہیں، مگر کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے کہ کسی نے ایڈیٹر اردو کے منشائے مطابق فن تنقید پر کوئی کتاب نہیں لکھی۔

ادب پر تنقید کرنا ایک علیحدہ چیز ہے اور خود تنقید کو بحیثیت فن کے دیکھنا اور اس کے اصول مقرر کرنا ایک علیحدہ چیز ہے، نقاد نے حالی کا نام اس سلسلہ میں پیش کیا ہے اس میں شک نہیں کہ حالی بہت بڑے نقاد تھے مگر انہوں نے فن تنقید پر کچھ نہیں لکھا فن تنقید جیسا کہ اوپر لکھا گیا ایک علیحدہ چیز ہے خود تنقید سے۔

نقاد صاحب لکھتے ہیں "یہ کتاب (روح تنقید) تنقید پر نہیں بلکہ تنقید کے متعلق ہے اس میں اس کے باطن سے نہیں بلکہ اس کے ظاہر سے اس کی روح سے نہیں بلکہ اس کے جسم سے بحث کی گئی ہے"

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تنقید کے متعلق روح اور جسم کی تشبیہ کہاں تک ٹھیک اترتی ہے، تنقید کا جسم کس کو قرار دیا جائے اور روح کس کو، کیونکہ تنقید ایک علیحدہ چیز ہے، اور تنقید کا فن ایک جداگانہ شے ہے پھر فرماتے ہیں کہ "مولف نے اپنے پروفیسروں کے لکچروں اور نوٹوں اور انگریزی تصانیف سے اسے مرتب کیا ہے" یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ نقاد صاحب کو یہ راز کہاں سے معلوم ہوگیا تاہم اگر اس کو مان بھی لیا جائے تو انگریزی کتابوں پروفیسروں کے لکچروں اور نوٹوں سے فائدہ اٹھانا کیا کوئی ناقابل عفو جرم ہے۔ اگر یہ ایک جرم ہے تو ادب میں تالیفات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ نقاد صاحب کے منشا کے مطابق لایعنی چیز ہو جائیگا۔ لیکن ساتھ ہی ایڈیٹر صاحب کو اعتراف بھی ہے کہ مولف نے "اس کی ترتیب اور تحریر میں بہت سلیقہ سے کام لیا ہے اور غیر ملک کے مضمون اور غیر زبان کے خیالات کو اپنی زبان میں خوبی سے ادا کیا ہے"

نقاد صاحب لکھتے ہیں "بجز دیباچہ کے چند صفحوں کے جن میں چند اردو تنقید نگاروں کا ذکر ہے باقی تمام کتاب میں یورپ کی تنقیدی تاریخ اور تنقیدی ارتقا سے بحث کی گئی ہے"

اس قول میں جہانتک صداقت ہے کتاب کا مطالعہ اس کو واضح کرسکتا ہے، دیباچہ ۴۴ صفحوں پر ختم ہوتا ہے، اور کتاب میں جگہ جگہ اردو مصنفین اور ان کے مصنفات کے متعلق حسب ضرورت بحثیں کی گئی ہیں۔ مثلاً ملاحظہ ہوں صفحہ ۱۲-۱۳-۱۷-۲۴-۳۱-۳۸-۳۹-۴۰-۴۴-۵۵-۶۰-۶۱-۶۲-۶۳-۶۷-۶۹-۷۹-۸۱- وغیرہ وغیرہ۔

نقاد صاحب (اردو) کے صفحہ ۲۴۰ پر لکھتے ہیں کہ "تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی، بلکہ اعلیٰ درجہ کا کلام اور اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے" یہ نقاد کی اس تنقید کا لاجواب ٹکڑا ہے، یہ بیان کہ تنقید پر کتابیں پڑھنے سے تنقید نہیں آتی خواہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر دریافت طلب یہ امر ہے کہ کیا کہ کیا "روح تنقید" کا مولف اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس کو تنقید آتی ہے، پھر ساتھ ہی تنقید کا ایک لاجواب نمونہ ملاحظہ ہو کہ نقاد صاحب خود ہی لکھتے ہیں کہ اعلیٰ پایہ کی تنقیدیں پڑھنے سے اس کا ذوق پیدا ہوتا ہے" گویا ایک ہی فقرے میں تنقید بھی فرماتے ہیں، اور ساتھ ہی اپنے اعتقاد کی تردید بھی کیا یہ تنقید کا ایک لاجواب ٹکڑا نہیں ؟

نقاد صاحب کا ایک اور خیال قابل ملاحظہ ہے، وہ لکھتے ہیں "مثنوی میر حسن پر ایک تنقید لکھی ہے اور یہ بہت اچھا کام کیا ہے، مگر اس میں نکتہ کی باتیں تقریباً سب وہی ہیں جو مولانا حالی اپنے مقدمہ دیوان میں بیان کرچکے ہیں" اس

اس خیال میں کہاں تک صداقت ہے اس کا اظہار اسی وقت کافی طور پر ہو سکتا ہے جبکہ "مقدمہ دیوان" میں میر حسن کی مثنوی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے "روح تنقید" کے ان صفحات کا مقابلہ کیا جائے جن میں مصنف نے مثنوی "سحرالبیان" پر تنقید پیش کی ہے۔
یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ "روح تنقید" میں اس کے مصنف نے ۶۰ صفحات میں مثنوی ہذا کے متفرق پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور مولانا حالی نے صرف تین صفحات میں اس کا کہیں کہیں ضمناً ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہوں روح تنقید صفحات ۱۱۹ تا ۱۷۵ اور مقدمہ شعر و شاعری مطبوعہ انوار المطابع لکھنؤ صفحات ۱۷۰ - ۱۸۰ اور ۱۹۰) صفحات کی مقدار سے مضمون کی نوعیت پر روشنی نہیں پڑ سکتی۔ مولانا حالی نے مثنوی میر حسن کے حسب ذیل پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے اُن کی عبارت یہ ہے:۔
"جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی جائے وہ لفظاً اور معناً نیچرل اور عادت کے موافق ایسی ہونی چاہئیے جیسی کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے، اس موقع پر ہم بطور مثال کے شوق اور میر حسن دونوں کی مثنویوں سے کچھ کچھ اشعار نقل کرتے ہیں" اس کے بعد اشعار نقل کئے ہیں اور اُس کے ذریعہ یہ ثابت کیا ہے کہ میر حسن کی زبان نسبتاً زیادہ صاف اور نیچرل ہے، اس سے پہلے انہوں نے اور ایک خوبی میر حسن کی یہ دکھائی ہے کہ وہ مقتضائے حال کے مطابق کلام ایراد کرتے ہیں۔ اس کے بعد صفحہ ۱۹۰ پر انھوں نے لکھا ہے کہ میر حسن نے قصہ نگاری کے تمام فرائض پورے پورے ادا کر دیئے ہیں اس کے بعد سحرالبیان کے واقعات پر نظر ڈالی ہے اور بس۔ برخلاف اس کے "روح تنقید" میں اس کے حسب ذیل پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے:۔

(۱) مثنوی سحرالبیان کے مصنف کا ماحول
(۲) اردو کی مثنویوں پر ایک نظر۔
(۳) سحرالبیان کے متعلق خارجی معلومات۔
(۴) مثنوی سحرالبیان ظاہری شکل کے لحاظ سے جس صنف ادب سے تعلق رکھتی ہے، اس کی تمام خصوصیات پر حاوی ہے یا نہیں۔
(۵) مطالب اور معانی کے لحاظ سے سحرالبیان اپنے موضوع کی تمام خوبیوں سے متصف ہے یا نہیں،
(۶) سحرالبیان کا اسلوب بیان۔
(۷) میر حسن کی مثنوی اپنے ماحول کی تمامتر خصوصیات کی ترجمان ہے۔
(۸) سحرالبیان میں فطرت کی نقاشیاں اور جذبات کی تصویریں۔

کیا یہ صحیح ہے کہ "اس میں نکتہ کی باتیں تقریباً سب وہی ہیں جو مولانا حالی اپنے مقدمہ دیوان میں بیان کر چکے ہیں"؟
نقاد صاحب کس مزے سے فرماتے ہیں کہ "کتاب میں بہت سے ایسے امور اور مسائل ہیں، جن پر بحث کی بہت کچھ گنجائش ہے لیکن چونکہ اُن کا تعلق مولف سے نہیں بلکہ مولف اُن کے ناقل ہیں، اس لئے اُن پر کچھ لکھنا بے سود ہے۔"
اگر مولف کو ناقل سمجھتے ہیں تو اصل مصنفین کی رایوں پر بحث کرنا خصوصاً اس وقت جبکہ وہ اردو زبان میں روشناس کیجا رہی ہیں

ایک علمی خدمت نہیں ہے؟ اس کو بے سود کیسے کہا جا سکتا ہے ایک حقیقی بہی خواہ اُردو کا پہلا کام یہی ہونا چاہئیے کہ وہ غلط معتقدات اور خیالات کو اُردو میں روشناس ہونے اور رواج پانے سے بچائے۔ ساتھ ہی نقاد صاحب کے اس متذکرہ بالا فقرہ میں "بلکہ" کا استعمال کتنا صحیح کیا گیا ہے، یہ مقام "بلکہ" کا نہیں بلکہ "کیونکہ" کا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے متعلق نقاد صاحب نے ایک کمال ہی کر دکھایا ہے، وہ لکھتے ہیں "ارسطو کی پیدائش مسیح سے ۳۸۴ سال قبل مسیح اور افلاطون کی ۳۲۰ سال قبل مسیح لکھی ہے (ص ۱۶۷) اور اسی لحاظ سے لائق مؤلف نے ترتیب میں ارسطو کو اول اور افلاطون کو اس کے بعد رکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے افلاطون ارسطو سے اوّل ہے اور اس کی پیدائش مسیح سے ۴۲۷ سال قبل ہے"

اس تنقید کے پہلے فقرہ میں دو جگہ "مسیح" کا لفظ نہیں معلوم کس ضرورت سے لکھا گیا پھر صفحہ ۱۶۷ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ ہم نے صفحہ ۱۶۷ دیکھا یہ بیان نہیں پایا گیا۔ پھر یہ خیال کر کے کہ شاید مرتب حروف نے غلطی کی ہو صفحہ ۲۶۷ دیکھا وہاں بھی یہ بیان نہیں تھا۔ پھر سہو کتابت کے خیال سے مختلف صفحات کو جن کے نمبروں سے ۱۶۷ کا سہو ہو سکتا تھا دیکھا، مگر ان میں کہیں یہ بیان نہیں پایا گیا البتہ صفحہ ۱۹۰ میں ارسطو کا سن پیدائش لکھا ہوا ہے، اور صفحہ ۱۹ میں افلاطون کا جو بجائے ۴۲۷ کے ۳۲۷ لکھا گیا ہے لیکن نقاد صاحب کا یہ فرمانا کتنا عجیب ہے کہ کتاب کی ترتیب میں ارسطو کو پہلے اور افلاطون کو بعد کو لکھا گیا ہے!

افلاطون اور ارسطو کی وہ شخصیتیں ہیں جن کے کم و بیش حالات سے نہ صرف مغربی اہل علم بلکہ مشرقی تعلیم یافتہ بھی واقف ہیں اور اگر صحیح سن پیدائش نہ جانتے ہوں تو بھی مذکورہ بالا گروہوں کا شاید ہی کوئی شخص یہ نہ جانتا ہوگا کہ ارسطو افلاطون کا شاگرد ہے۔ نقاد صاحب کا اس فقرے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ مؤلف کو باوجود ایک کتاب کے مؤلف ہونے کے علمی دنیا سے بالکل خارج کر دینا چاہتے ہیں۔

نقاد صاحب کا یہ فقرہ کہ "یہ صحیح نہیں" میری غرض یہ ہے کہ یہ تنقید صحیح نہیں کیا سچائی کی آنکھوں میں خاک ڈالنا نہیں ہے جو نقاد صاحب فرماتے ہیں کہ کتاب کی ترتیب میں ارسطو کو اول اور افلاطون کو اس کے بعد رکھا گیا ہے۔ ذیل میں کتاب "روح تنقید" کا وہ حوالہ درج کیا جاتا ہے، جس میں افلاطون سے بحث کی گئی ہے، کتاب کی فہرست مضامین میں افلاطون پہلے اور ارسطو بعد ہے (صفحہ ۶) کتاب کے حصۂ دوم (ارتقائے تنقید) جہاں افلاطون اور ارسطو پر مفصل بحث کی گئی ہے پہلے افلاطون ہی کا ذکر کیا گیا ہے جو صفحہ ۱۸۰ سے شروع ہوتا ہے اور صفحہ ۱۸۵ تک جاری رہتا ہے اس کے بعد وہیں سے ارسطو کا ذکر شروع ہوتا ہے جس کے بعد افلاطون اور ارسطو دونوں کے خیالات کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور یہ ۱۹۱ صفحہ پر ختم ہوتا ہے، جہاں ان دونوں کی تاریخ پیدائش کا ذکر ہے۔ آخر میں پھر نقاد صاحب مؤلف کی داد دیتے ہیں کہ انہوں نے نہایت خوبی سے یوروپی مصنفوں اور نقادوں کی رایوں کو اردو میں پیش کیا ہے اس تنقید کے پڑھنے کے بعد ہمیں مولانا حالی کا یہ شعر بے اختیار یاد آیا ؎

شیخ جی کو آپ یہ کیا کیا گمان ہے
بات انکی کاٹتے ہے اور ہمزباں ہے

مرزا ناصر علی بیگ
بی۔اے

انگلستان کا طریق تعلیم و تربیت

(افاداتِ خلیل طوطح)

انگلستان میں جتنی درسگاہیں ہیں، وہ اپنے مقاصد کے لحاظ سے دو قسموں میں تقسیم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) وہ درسگاہیں، جہاں معنویات اور تہذیب اجتماعی کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

(۲) وہ، جہاں طلبہ کو نفع بخش معلومات اور فنون کی عملی تعلیم دی جاتی ہے۔

قسم اول کے مدارس میں صرف امراء، اہل دولت اور طبقۂ وسطیٰ کے نہایت شریف افراد کی اولاد داخل ہو سکتی ہے، اور ان کو وظائف بھی ملتے ہیں۔ ایسے مدارس تعداد میں فنی مدارس سے زیادہ ہیں۔

قسم دوم کے مدارس جن میں فن کی تعلیم ہوتی ہے وہ ہیں جنھیں پبلک اسکول کہتے ہیں اور جامعۂ آکسفورڈ و کیمبرج بھی اسی ذیل میں شمار کئے جاتے ہیں۔ لیکن انہیں بھی پبلک درسگاہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، جبکہ یہ بھی صرف شرفا، اور ذی وجاہت و ثروت لوگوں کی اولاد کے لئے مخصوص ہیں۔ مثلاً ایک ایٹون (Eton) کا مشہور مدرسہ ہے جہاں ایک تاجر کے لڑکے کو بھی داخل نہیں کرتے چہ جائیکہ نجار یا لوہار کا لڑکا۔ مجھ سے بیان کیا گیا کہ اگر یہاں کسی تاجر کے لڑکے کو داخل بھی کیا جاتا ہے تو یہ دیکھکر کہ اس کے ہاں تھوک فروشی ہوتی ہے یا خوردہ فروشی، اگر وہ خوردہ فروش ہے تو اجازت نہیں مل سکتی۔

جب میں ایٹون گیا تو وہاں دریافت کیا کہ آیا اس بیان میں کچھ حقیقت ہے یا نہیں۔ لیکن مجھے اس کا کوئی صاف جواب نہیں ملا، تاہم میں سمجھ گیا کہ یہاں صرف اونچے طبقہ کی اولاد داخل ہو سکتی ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت وہاں کے بڑھے ہوئے مصارف ہیں۔ کیونکہ یہاں ایک طالب علم کو سالانہ ۲۳۰ گنی فیس ادا کرنی پڑتی ہے۔ تفریحی مجالس اور لہو و لعب کی فیس اور کتابوں، لباسوں اور سفر وغیرہ کے مصارف اس کے علاوہ ہیں۔ یہ ہیں مصارف ان مدارس کے جہاں ثانوی تعلیم دی جاتی ہے اور جہاں تیرہ اور اٹھارہ سال کے درمیانی عمر کے لڑکے پڑھتے ہیں۔

ان مدارس کی آمدنی کا بڑا حصہ اُن کے مدیروں کے جیب میں جاتا ہے، چنانچہ مجھ سے ایک استاد نے کہا کہ بعض منیجروں یا مدیروں کا سالانہ مشاہرہ ۲ ہزار گنی تک ہے۔ گویا دو یا تین وزیروں کی تنخواہ اس کو ملتی ہے۔ اس کی تائید سانڈرس فورڈ کی کتاب Comparative Education سے بھی ہوتی ہے جس میں اس نے تحریر کیا ہے کہ "ان مدارس

عموی کے ناظروں کی تنخواہ ہزاروں گنی تک پہنچتی ہے اور ایک ایک ناظر امریکہ کے صدر جمہوریہ سے زیادہ مشاہرہ پاتا ہے "

امریکہ کے ایک دلچسپ شخص کی رائے بھی ان مدارس کی بابت سننے کے قابل ہے جو کہتا ہے کہ "انگلستان کے پبلک اسکول، سکول تو اس لئے ہیں کہ وہاں وقت کا دوتہائی حصہ کھیلوں میں صرف ہوتا ہے۔ انگریزی کی نسبت اس لئے ہے کہ وہاں لاطینی زبان سکھائی جاتی ہے اور پبلک منا اسی بنا پر ہے کہ وہ بالکل خصوصی ہیں"

یہ بات بالکل ویسی ہی ہے جیسے انگلستان کے سفیر متعینہ امریکہ جیمس برائس نے "رومانیہ کی سلطنت مقدسہ" کے متعلق ظاہر کی تھی کہ "نہ وہ سلطنت ہے، اور نہ اس میں کوئی رومانیت ہے اور نہ کوئی تقدس"

یہ گفتگو تو ہوئی ان مدارس کے اسمی حیثیت سے، اب رہ گئی یہاں کی تعلیم، سو اس کا انحصار صرف تہذیب معاشرت مردانہ کھیلوں، اور اعتماد ذاتی کی تعلیم پر ہے۔ نہ وہاں کوئی خاص کتابی تعلیم ہوتی ہے، اور نہ معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ مجھے خود خوش بختی سے ایک ایسے جلسہ میں شریک ہونیکا موقع ملگیا جس میں ایک پبلک اسکول کے ناظم پارمیں کا خطبہ تھا۔ اس نے پبلک مدارس کے قیام کی غایت جن الفاظ میں ظاہر کی وہ یہ تھے:۔

"ان مدارس کا قیام صرف کھیل کود کے لئے ہے تاکہ قوم کے بچوں میں جذبۂ مردانگی و مسابقت اور خوئے صبر و تحمل پیدا ہو مکر و فریب سے نفرت ہو جائے، اور مصیبت کے وقت یاس و ناامیدی دل کو مغلوب نہ کرلے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مدارس وہ ہیں جہاں سلطنت کے اکابر رجال، مستعمرات کے حکام عظام اور رائے عامہ کے بڑے بڑے قائد و رہنما بنتے ہیں اور بقول ڈیوک ولنگٹن کے جنگ واٹرلو کی فتح تو مدرسہ ایٹون ہی کے فٹ بال کے میدان میں ہو چکی تھی"

یہی سبب ہے کہ اس مدرسہ میں باوجود کثرت مصارف کے سیلاب کی طرح طلبہ کا ہجوم ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس وقت سنہ ۱۹۳۰ء تک کے لئے وہاں کی تمام جگہیں پر ہو چکی ہیں اور سنہ ۱۹۳۶ء تک کے لئے طلبہ کے نام درج رجسٹر ہو چکے ہیں۔

الغرض یہاں کے پبلک مدارس طلبہ کو تیار کرتی ہے کہ وہ آئندہ چلکر حکمرانیں، سیاسی، عسکری سیادت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ معاشری تہذیب و شائستگی کے علمبردار ہوں اور تجارت عامہ کے اصول کو سمجھ سکیں، اسی لحاظ سے جو درس ان کو دیئے جاتے ہیں، ان کا تعلق تربیت ادب سے ہوتا ہے، مثلاً یونانی و لاطینی زبان، ریاضیات، اور بعض اور زندہ زبانوں میں سے ایک آدھ۔ یہاں نہ تہذیب دفاتر نہ تربیت حساب کا کام سکھایا جاتا ہے نہ ٹائپ رائٹرا اور مختصر نویسی جو عام لوگوں کے لئے کسب معاش کے لئے ضروری ہے۔

آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بھی انہیں پبلک مدارس کے تتمے ہیں اور ان کے قیام کی غرض بھی وہی ہے جو ابھی بیان ہو چکی ہے۔ چنانچہ اکثر انگریز بطور مزاح کہتے ہیں کہ "ہم اپنی اولاد کو آکسفورڈ اور کیمبرج میں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ کھیلنے اور آداب معاشرت سیکھنے کے لئے بھیجتے ہیں۔ مجھے یہاں بھی جانیکا اتفاق ہوا، اور بعض اساتذہ و طلبہ سے گفتگو کرنے کے بعد اور زیادہ اس کی تصدیق ہوئی اور انہوں نے بیان کیا کہ طلبہ کا یہاں داخل ہونا صرف اس غرض سے ہوتا ہے

کہ وہ ایک ترقی یافتہ اور بلند سوسائٹی کے دائرہ میں رہکر آداب معاشرت حاصل کریں۔ انہیں دنیا کی دیگر معلومات سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ یہاں آتے ہیں تاکہ ان کو تعلقات شرافت حاصل ہو، اجتماعی و ادبی تہذیب سے آگاہی ہو، اور علم مجلس سے واقفیت۔ کیونکہ ان کے ہاں سب سے اہم چیز قوم کی معاشرت ہے، یہاں تک کہ وہ چائے نوشی کے وقت میز کے چاروں طرف بیٹھکر تبادلۂ خیالات کو لکچروں سے زیادہ بہتر خیال کرتے ہیں۔

الغرض انگلستان کے مدارس عمومی اور یہ دونوں قدیم یونیورسٹیاں حیات اجتماعی پیدا کرنے کے لئے ہیں، اور اس طرف اتنی توجہ صرف کی جاتی ہے، کہ اگر کوئی طالب علم یونیورسٹی کے احاطہ میں نہیں آیا تو ڈائننگ ہال میں سب کے ساتھ کھانا کھانا اس کے لئے لازم ہے، یہاں تک کہ کسی کو وہاں سے ڈپلوما مل ہی نہیں سکتا جب تک تین سال یہاں صرف نکرے اس سے مقصود یہ ہے کہ یہاں کی فضا کا اثر اس پر اچھی طرح قائم ہوجائے اور یہاں کے نقوش اس کے دل و دماغ پر بخوبی ثبت ہوجائیں۔

یہاں کا اصول یہ ہے کہ ماضی کی روایات کو جہاں تک ممکن ہو برقرار رکھا جائے اور مستقبل کی طرف کوئی خیال نہ کیا جائے، چنانچہ وہاں کی عمارات، وہاں کی فضا، وہاں کے طریقے اور آداب معاشرت سب سے اس کا ثبوت ملتا ہے اور فنون جدیدہ کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں چنانچہ علم الکیمیا کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے حدود میں "فن کریہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم کے مدارس عام لوگوں کی تربیت کے لئے ہیں خواص کو ان سے کوئی علاقہ نہیں، اس میں ثانوی مدارس اور آکسفورڈ و کیمبرج کے علاوہ تمام یونیورسٹیاں شامل ہیں جنہیں Provincial Universities کہتے ہیں، گویا "مدارس ثانوی" "مدارس عمومی کے مقابلہ میں ہیں، اور یونیورسٹیاں آکسفورڈ اور کیمبرج کے مقابلہ میں۔ لیکن ان دونوں کا فرق سوسائٹی میں بہت ہے، کیونکہ جو مرتبہ مدرسۂ ایٹن اور آکسفورڈ کے طالب علم کا ہیئت اجتماعی میں ہوتا ہے، وہ ثانوی مدارس اور دوسری یونیورسٹی کے طلبہ کا نہیں ہوتا۔ خواہ وہ کتنے ہی ذکی کیوں نہ ہوں۔

ہرچند لنڈن یونیورسٹی، آکسفورڈ یونیورسٹی سے زیادہ ترقی یافتہ ہے اور وہاں کامیابی حاصل کرنا بھی دشوار ہے، اس کے ساتھ ذہنی و فنی ترقی کا معیار وہاں بہت کچھ بلند ہے۔ لیکن سوسائٹی میں لنڈن یونیورسٹی کا [illegible] نہیں چنانچہ جو غریب لوگ ہیں وہی دوسری یونیورسٹیوں میں اپنی اولاد کو بھیجتے ہیں، ورنہ جس کو ذرا بھی استطاعت ہے وہ آکسفورڈ اور کیمبرج ہی کو ترجیح دیتا ہے، اور قوائے عقلی کی ترقی کے مقابلہ میں سوسائٹی کی عزت کو بہتر سمجھتا ہے۔

ان دونوں قسم کے مدارس میں جو فرق ہے اس کو ہم مختصراً اس طرح ظاہر کرتے ہیں:-

قسم اول	قسم دوم
مصارف .. ۳۰۰ گنی سالانہ	مصارف نصف یا کچھ زائد
طالب علم مجبور ہے کہ مدرسہ یا یونیورسٹی میں رہے	طالب علم اپنے گھر میں یا کسی اور جگہ رہ سکتا ہے

قسم اول	قسم دوم
قدیم لغات، فلسفہ اور آداب کی تعلیم	جدید علوم و فنون کی تعلیم
یہاں کی زندگی اجتماعی اور رہبانہ ہے۔	حیات اجتماعی بالکل مفقود ہے۔
اس کا احاطہ گویا احاطۂ کلیسا ہے	اس کا احاطہ احاطۂ بازار اور تجربہ گاہ ہے۔
خوش باشی اور معاشرت کا لطف	درس و انہماک
تجارت اور عمل کی طرف مطلق توجہ نہیں ہے	تمام ضروریات زمانہ کی طرف توجہ کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایشیائی جو طلبہ وہاں جاتے ہیں ان کے لئے کس قسم کے مدارس مفید ہوسکتے ہیں، ہر چند مشرق کا انسان بالطبع قسم اول کے مدارس کو پسند کریگا کیونکہ بقول پروفیسر قطب حق جب وہ برکلن کے پل اور آبشار نیاگرا کو اول اول دیکھتا ہے تو سب سے پہلے اس کے دل میں یہی بات آتی ہے کہ ان کو دیکھ کر کوئی نظم لکھنی چاہئیے اور کوئی علمی و عملی تفصیل اس کے ذہن میں نہیں آتی، حالانکہ ہمیں ضرورت ہے ایسے آدمیوں کی جو موٹر درست کرسکیں، مشین کو چلاسکیں، نہریں کھود سکیں، سڑکیں بنا سکیں، ریل کی پٹریاں بچھا سکیں، تاکہ ضرورت کے وقت غیروں کے سامنے دست سوال دراز نہ کرنا پڑے۔

اس میں شک نہیں کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کی زندگی نہایت دلکش و جمیل ہے انتہا شائستہ و مہذب، حد درجہ شاعرانہ و لطیف ہے لیکن ہم کو تو احتیاج ہے ایسے افراد کی جن کے ہات کوئلے کی خاک سے سیاہ اور جن کے کپڑے تیل سے آلودہ ہوں، اور ہماری یہ ضرورت صرف دوسری ہی قسم کے مدارس سے پوری ہوسکتی ہے۔

بیخودی

نے زماں نے مکاں کی ہستی ہے　　　سب یہ دل کی دراز دستی ہے
آذری سر بسر تصور کی　　　عقل کافر کی بت پرستی ہے
ہے طلسمِ شعور سے رونق　　　ورنہ ہستی! اجاڑ بستی ہے
دل نے بھولے سے بھی کبھی سوچا؟　　　روح کس چیز کو ترستی ہے

از زماں، و مکاں، بروں بودن
چشم بر پائے بے خودی سودن

بھولتا کون ہے؟ کہاں ہے تو؟　　　پیر ہے تو کہ نوجواں ہے تو
دیکھ بیگانۂ زماں، ہو کر　　　ذرۂ خاک! آسماں ہے تو
وقت عبث ہے تیرا آئینہ　　　وقفِ صد گونہ امتحاں ہے تو
ہے ابھی تک ظہورِ خود بینی　　　کہ رہا ہے یہی کہاں ہے تو

تا ازیں آئینہ نہ رو تابد
دل حزیں۔ بیخودی نمی یابد

امین حزیں

غزل

چوں نہ خونِ دلِ مجروح ز چشماں ریزد　　　نیش بر سرِ ہر زخم چو پیکاں ریزد
ہرگز از شیوۂ او حرف زدن آساں نیست　　　او کہ گلہا ز تبسم سرِ داماں ریزد
اے فلک گرچہ زمن دور نشیمن داری　　　نالہ ام بر سرِ تو بیں کہ چہ آساں ریزد
گوئیا پارۂ از لذتِ دردم ببرد　　　قطرۂ اشک کہ از دیدہ بداماں ریزد
شیشہ چوں بشکن آنرا نتواں برداشت　　　دل بہر جنبشِ مژگانِ تو آساں ریزد
این نہ اشک است کہ از دیدہ سرازیر شود　　　رنگِ بشکستۂ من از سرِ مژگاں ریزد
بذلِ تیرِ تو عجب رنگ بہارے دارد　　　اشکِ خونیں کہ ز چشمم سرِ داماں ریزد
برق و باراں و بلاہا و مصائب ز فلک　　　ہرچہ ریزد بسرِ خاک نشیناں ریزد
بدلم تیرِ نگاہ تو خورد یا گوئی　　　سنگ بر شیشہ و آتش بگلستاں ریزد
بیں چو از حالِ دلِ خوں شدہ ام بیخبری　　　اندراں نقش کہ نوکِ سرِ مژگاں ریزد
آذرے ہست کہ از آتشِ دل جلوہ کند　　　قطرۂ اشک کہ ہادی سرِ داماں ریزد

ہادی مچھلی شہری

استفسارات

خضر علیہ السلام

(جناب محمد عمر صدیقی تلہری۔ بمبئی)

بذریعۂ "نگار" مطلع فرمائیے کہ :-

"(۱) حضرت خضر علیہ السلام کی نسبت آپ کا کیا عقیدہ ہے۔"

"(۲) کیا قرآن وحدیث سے ان کا وجود ثابت ہے۔"

"(۳) اور کیا وہ اب بھی زندہ ہیں"

"(۴) حضرت موسیٰ اور خضر کا جو واقعہ مشہور ہے، اسکی اصلیت کہاں تک ہے۔"

(نگار) بعض استفسار تو ایسے ہوتے ہیں کہ میں ایک شخص ثالث کی حیثیت سے نہایت آزاد ہو کر اُن کا جواب دیدیتا ہوں، لیکن بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جن میں میری دُکھتی ہوئی رگ پکڑ لی جاتی ہے اور اُس وقت میرے لئے یہ فیصلہ سخت دشوار ہو جاتا ہے کہ مصلحت سے کام لے کر وہی کہدوں جو دنیا سُننا چاہتی ہے یا حرّیتِ ضمیر کو قائم رکھکر وہ جواب دوں جو میرے یقین و اعتقاد سے متعلق ہے۔ اور معاف کیجیے اگر میں یہ کہوں کہ آپ کا سوال بھی اسی قسم کا ہے، اور جواب لکھنے سے قبل میں گھنٹوں متردد رہا کہ کیا کروں، پہلے خیال ہوا کہ آپ کو پرائیویٹ جواب دیدوں، لیکن خط دیکھا تو اُس میں آپ کا پتہ درج نہ تھا، پھر یہ رائے ہوئی کہ سکوت اختیار کردوں، لیکن طبیعت نے اس کو بھی گوارا نہ کیا، اور آخر کار لکھنے کو بیٹھ گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جو کچھ میں لکھوں گا اُس سے آپ کو تسکین ہوگی، اور میرا جواب آپکے اعتقاد کے مطابق ہوگا یا نہیں، لیکن چونکہ جواب کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے اس لئے عرض کرتا ہوں۔

خضرؑ و موسیٰؑ کے اس تمام قصے میں جو عام طور پر مشہور ہے حسب ذیل امور قابل غور ہیں :-

(۱) حضرت موسیٰ کسی ایسے شخص سے ملے یا نہیں جس کو خضر کے نام سے موسوم کرتے ہیں؟

(۲) یہ کیونکر معلوم ہوا کہ اس کا نام خضر تھا اور یہ ذریعۂ علم کہانتک قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے؟

(۳) آبِ حیات کوئی چیز ہے یا نہیں: اور ہے تو کہاں ہے اور خضر نے اُسے پیا یا نہیں!

(۴) اگر خضر نے آبِ حیات پی کر زندگیِ دوام حاصل کر لی ہے تو یہ زندگی عام انسانی حیات کی طرح ہے، یا کسی اور قسم کی۔ اگر ایسی ہی

معمولی انسانی زندگی ہے تو خضر کا مسکن کہاں ہے، اور ان کے کیا مشاغل ہیں۔

(۵) پھر اسی سلسلہ میں "مجمع البحرین" کی جغرافی تحقیق، مچھلی کے دوبارہ زندہ ہوکر دریا میں چلے جانے کی اصلیت، اور ان تین عجیب و غریب باتوں کی تفصیل بھی شامل ہے جو خضر سے موسیٰ کی معیت کے دوران میں سرزد ہوئی تھیں (یعنی ایک کشتی میں سوراخ کر دینا، ایک لڑکے کو مار ڈالنا، ایک گری ہوئی دیوار کو درست کر دینا)

پہلے اور سب مسلمانوں کے نزدیک کسی واقعہ کے ثبوت میں مستحکم ترین دلیل جو پیش کی جاتی ہے، وہ نص قطعی ہے، اس لئے ہمارا فرض ہے کہ سب سے پہلے کلام مجید میں اس واقعہ کی تفصیل تلاش کریں اور پھر غور کریں کہ اس سے زائد جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ کہاں سے لیا گیا ہے، اور یہ ماخذ کس حد تک قابل وثوق ہے۔

قرآن میں حضرت موسیٰ کا واقعہ دو جگہ سورۂ کہف، اور سورۂ قصص میں مذکور ہے فرق یہ ہے کہ سورۂ قصص میں شروع سے لیکر آخر تک کے تمام واقعات حضرت موسیٰ کے بیان کئے گئے ہیں اور سورۂ کہف میں صرف وہ واقعہ لیا گیا ہے جب ایک قبطی کو قتل کرکے گرفتاری کے ڈر سے مدین کی طرف گئے ہیں اور راستہ میں خضر سے ملاقات ہوئی ہے، چونکہ سورۂ قصص میں سفر مدین کا حال درج نہیں ہے اس لئے آپ کے استفسار کے جواب میں اس سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ سورۂ کہف کی آیتوں پر غور کرنا ضروری ہے، کہ سفر مدین کا حال، خضر و موسیٰ کی ملاقات کا بیان، آب حیات اور مچھلی وغیرہ کے قصے (اگر ان کی کوئی حقیقت ہے) تو انہیں آیتوں سے متعلق ہو سکتے ہیں۔

بحث ذرا طویل تو ہو جائے گی، لیکن ضروری ہے کہ ہم اس جگہ کلام مجید کی ان آیتوں کو نقل کر دیں کہ انہیں پر انحصار فیصلہ ہے۔

یہ آیتیں سورۂ کہف میں آٹھویں رکوع سے اس طرح شروع ہوتی ہیں۔

وَاِذْ قَالَ مُوسٰی لِفَتٰهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰی اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَیْنِ اَوْ اَمْضِیَ حُقُبًا ٥ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَیْنِهِمَا نَسِیَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ سَرَبًا ٥ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا لَقَدْ لَقِیْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ٥ قَالَ اَرَاَیْتَ اِذْ اَوَیْنَآ اِلَی الصَّخْرَةِ فَاِنِّیْ نَسِیْتُ الْحُوْتَ وَمَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ وَاتَّخَذَ سَبِیْلَهٗ فِی الْبَحْرِ عَجَبًا ٥ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ٥ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ٥ قَالَ لَهٗ مُوسٰی هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓی اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ٥ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ٥ وَكَیْفَ تَصْبِرُ عَلٰی مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ٥ قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَكَ اَمْرًا ٥ قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْئَلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ٥ فَانْطَلَقَا حَتّٰٓی اِذَا رَكِبَا فِی السَّفِیْنَةِ خَرَقَهَا قَالَ

اور جب موسیٰ نے اپنے ساتھی جوان سے کہا کہ میں نہ رکوں گا جب تک "مجمع البحرین" نہ پہنچ جاؤں یا برسوں یونہی طرح چلا جاؤں گا، پھر جب پہنچے "مجمع البحرین" پر تو وہ بھول گئے اپنی مچھلی کو اور وہ چلی گئی سمندر میں لیکن جب وہ اور آگے بڑھے تو موسیٰ نے اپنے رفیق سے کہا کہ لاؤ ہمارا صبح کا کھانا، بیشک ہم کو اس سفر سے تکلیف پہنچی ہے، اس نے کہا کیا تم نے دیکھا تھا جب ہم چٹان پر بیٹھے تھے، پھر میں بیشک بھول گیا مچھلی کو اور نہیں بھلایا مگر شیطان نے کہ ذکر کروں اس کا اور اختیار کی اس مچھلی نے اپنی راہ دریا میں تعجب ہے۔ کہا موسیٰ نے یہی ہم چاہتے تھے پس وہ لوٹ پڑے الٹے پاؤں، پھر پایا انھوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کہ دی تھی اس کو رحمت ہم نے اپنے پاس سے اور سکھایا تھا اپنے پاس سے اسے علم، اس سے موسیٰ نے کہا

اخرقتها لتغرق اهلها لقد جئت شیئاً امراً ۔ قال الم اقل انک
لن تستطیع معی صبراً ۔ قال لا تؤاخذنی بما نسیت ولا ترهقنی
من امری عسراً ۔ فانطلقا حتی اذا لقیا غلماً فقتلہ قال اقتلت
نفساً زکیۃ بغیر نفس لقد جئت شیئاً نکراً ۔ قال الم اقل لک انک
لن تستطیع معی صبراً ۔ قال ان سالتک عن شیء بعدها فلا
تصحبنی قد بلغت من لدنی عذراً ۔ فانطلقا حتی اذا اتیا اهل قریۃ
استطعما اهلها فابوا ان یضیفوهما فوجدا فیها جداراً یرید ان
ینقض فاقامہ قال لو شئت لتخذت علیہ اجراً ۔ قال هذا فراق
بینی وبینک سانبئک بتاویل ما لم تستطع علیہ صبراً ۔ اما السفینۃ
فکانت لمسٰکین یعملون فی البحر فاردت ان اعیبها وکان وراءهم
ملک یاخذ کل سفینۃ غصباً ۔ واما الغلم فکان ابوٰہ مومنین فخشینا
ان یرهقهما طغیاناً وکفراً ۔ فاردنا ان یبدلهما ربهما خیراً منہ زکوٰۃ
واقرب رحماً ۔ واما الجدار فکان لغلمین یتیمین فی المدینۃ وکان
تحتہ کنز لهما وکان ابوهما صالحاً فاراد ربک ان یبلغا اشدهما
ویستخرجا کنزهما رحمۃ من ربک وما فعلتہ عن امری ذالک
تاویل ما لم تستطع علیہ صبراً ۔

کیا میں تیری پیروی کروں اس شرط پر کہ تو بتادے مجھے جو کچھ سکھایا
گیا ہے تجھے، اُس نے کہا کہ تو میرے ساتھ رہکر صبر نہ کرسکے گا، اور صبر
کر بھی کیسے سکتا ہے اس امر پر جس کا تجھے پورا علم نہیں ہے، کہا
موسیٰ نے کہ اگر اللہ نے چاہا تو تو مجھے صابر پائیگا اور میں کسی امر میں
تیری نافرمانی نہیں کروں گا، کہا اُس نے اگر تو میرے ساتھ چلتا ہے
تو مجھ سے کسی امر کی نسبت سوال نہ کرنا، یہاں تک کہ میں خود تجھسے
اس کا ذکر نہ کروں گا۔ پس وہ دونوں چلے، یہاں تک کہ وہ دونوں
سوار ہوئے ایک کشتی میں تو اُس نے سوراخ کردیا اس کشتی میں،
موسیٰ نے کہا تو نے ڈبونے کے لئے یہ سوراخ کیا ہے: بیشک تو نے
نقصان کا کام کیا ہے، اُس نے کہا کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا
کہ تو میرے ساتھ رہکر صبر نہ کرسکے گا۔ موسیٰ نے کہا کہ مجھے الزام نہ دے
اس بات پر جسے میں بھول گیا۔ اور میرے کام میں مشکل نہ پیدا کر۔ پھر
وہ دونوں چلے یہاں تک کہ انہیں ایک جوان ملا۔ پس اُس نے اُس کو
مار ڈالا، موسیٰ نے کہا کیا تو نے ہلاک کردیا ایک بیگناہ شخص بغیر بدلہ
جان کے۔ بیشک تو نے نہایت ہی نامناسب کام کیا ہے۔ اُس نے
کہا کیا میں نے تجھ سے نہیں کہا تھا کہ تو میرے ساتھ رہکر صبر نہ کرسکے گا
موسیٰ نے کہا کہ اگر اب میں کوئی سوال تجھ سے کروں تو مجھے اپنے ساتھ
نہ رکھنا، بیشک تجھے میری طرف سے یہ عذر پہنچ گیا ہے۔ پھر دونوں
چلے اور جب وہ ایک بستی کے لوگوں کے پاس پہنچے تو اُن سے کھانے
کو مانگا، مگر ان لوگوں نے کھلانے سے انکار کردیا، پھر ملی اُن کو ایک
دیوار اُس بستی میں جو گرنے والی تھی پس اس نے اس دیوار کو درست
کردیا، موسیٰ نے کہا کہ اگر تو چاہتا تو اس کام کی اُجرت لے سکتا تھا،
اُس نے کہا اب ہماری تمہاری جدائی ہوتی ہے، اب میں تجھے ان
باتوں کا سبب بتاتا ہوں، جن پر تو صبر نہیں کرسکا تھا۔ کشتی بعض
غریب آدمیوں کی تھی جو دریا میں کام کرتے ہیں، میں نے اُسے

اس لئے معیوب کر دیا کیونکہ وہاں ایک بادشاہ ہے جو ہر کشتی کو
چھین لیتا ہے۔ اب رہا وہ جوان، سو اس کے ماں باپ مسلمان ہیں
اور میں ڈرا کہ یہ اُن کو اذیت پہنچائے گا اور نافرمانی کرے گا اسلئے
میں نے چاہا کہ خدا ایسا بدل اُنہیں دے جو خلوص و محبت میں اس سے
بہتر ہو۔ رہی دیوار سو وہ دو یتیم لڑکوں کی ہے اور اس کے نیچے
خزانہ ہے، اور اُن کا باپ دیندار شخص ہے، اس لئے چاہا تیرے
پروردگار نے کہ وہ جوان ہو کر خدا کی رحمت سے خزانہ کو نکالیں
اور یہ سب میں نے اپنی خوشی سے نہیں کیا۔ یہ ہے بیان ان باتوں کا
جن پر تو صبر نہ کر سکا تھا۔

یہ ہے نہایت صاف و صریح بیان حضرت موسیٰ کے اس سفر کا جسے انہوں نے اوّل بار مصر سے نکلنے کے بعد اختیار کیا تھا، اس میں نہ کہیں خضر کا نام آیا ہے، نہ آب حیات کا ذکر ہے، اور نہ کسی اور بات کا، جسے عقل باور نہ کر سکے اور پھر اس کی تاویل کی ضرورت ہو۔ تاہم بعض امور صراحت طلب ضرور ہیں۔

سب سے پہلے "مجمع البحرین" کو سمجھ لینا چاہیئے، کہ اس سے کیا مراد ہے اس کے لغوی معنی ہیں دو سمندروں یا دریاؤں کے ملنے کی جگہ یعنی اُنکا سنگم۔ اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ اس سے مراد وہ جگہ ہے جہاں بحر فارس اور بحر روم آپس میں ملتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں نہ کبھی ملے اور نہ مل سکتے تھے۔ اس لئے یہ تحقیق بالکل غلط قرار پاتی ہے۔ اب اگر موسیٰ کا یہ سفر مدین کے طرف کا قرار دیا جائیگا جیسا کہ تمام اسلامی تاریخوں سے پایا جاتا ہے تو "مجمع البحرین" سے مراد وہ مقام ہو گا جہاں بحر قلزم کی دو شاخیں آپس میں ملی ہیں، کیونکہ وہیں سے مدین کو جا سکتے ہیں، لیکن اگر یہودی روایتوں کی بنا پر موسیٰ کا یہ سفر اتھوپیا کی طرف کا قرار دیا جائیگا تو پھر "مجمع البحرین" سے مراد وہ مقام ہو گا، جہاں دریائے نیل کی دو شاخیں خرطوم کے پاس آپس میں ملی ہیں اور جن میں سے ایک کو بحر ابیض اور دوسری کو بحر اسود کہتے ہیں۔ بہر حال یہ بالکل یقینی ہے کہ اس سے مراد بحر فارس و بحر روم کا سنگم نہیں ہو سکتا جیسا کہ مفسرین نے ظاہر کیا ہے۔

اس کے بعد "واتخذ سبیلہ فی البحر عجبا" پر غور کرنا ہے، عام طور پر اس کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ وہ سمندر میں عجیب طریقہ سے چلی گئی، اور بعض مفسرین نے اس لفظ عجبا کی تفسیر میں یہاں تک لکھ دیا ہے کہ مچھلی بھنی ہوئی تھی، اور اس کی ضمنی تائید میں بخاری شریف کی ایک حدیث بھی انہیں مل گئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مچھلی کا غائب ہو جانا ایک خاص علامت تھی، جو انہیں بتادی گئی تھی، یعنی جس جگہ مچھلی غایب ہو گی وہیں خضر سے ملاقات ہو گی، اور اس کی تائید ایک طرح خود آیتوں سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بعد ہی حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ "یہی تو ہم چاہتے تھے" اور پھر اُلٹے پاؤں اسی جگہ واپس جانا، اور وہاں ایک اللہ کے بندے کا ملنا سب اس کی تائید کرتے ہیں۔ لیکن اگر اس امر پر غور کر لیا جاتا کہ "اتخذ فی سبیلہ" کے بعد علامت تو موجود ہے تو آسانی سے سمجھ میں آجاتا کہ عجبا کا تعلق اس سے نہیں ہے۔

بلکہ اس واقعہ سے ہے کہ موسیٰ کے ساتھی مچھلی کے گم ہو جانے کو موسیٰ سے ذکر کرنا بھول گئے۔ اس صورت میں آیت قال ارایت اذا آوینا۔۔۔ عجبا" کا مطلب یہ ہوگا کہ جب حضرت موسیٰ نے اپنے ساتھی سے کھانا مانگا تو انھوں نے جواب دیا کہ مچھلی تو میں وہیں بھول گیا تھا، جہاں ہم نے آپنے ایک چٹان پر قیام کیا تھا، اور وہاں سے وہ مچھلی پھر سمندر میں چلی گئی۔ میں اس واقعہ کا ذکر کرنا بھول گیا جس پر خود مجھے بھی تعجب ہے۔ یہ سن کر موسیٰ نے کہا کہ "ذلک ما کنا نبغ" یعنی یہی تو ہم چاہتے تھے، اس ذلک (یہی) سے مراد جیسا کہ سرسید مرحوم نے لکھا ہے یقیناً غذاء (کھانا) ہے نہ مچھلی کا چلا جانا۔ خبر سننے کے بعد حضرت موسیٰ کا پھر اس جگہ واپس آنا صرف اس بنا پر تھا کہ وہ وہاں پہنچکر دریا سے دوسری مچھلی پکڑنے کی کوشش کریں۔

مجمع البحرین سے آگے نکلنے کے بعد جنگل میں کوئی چیز کھانے کی نہ مل سکتی تھی اور جب وہ واپس آئے تو انہیں اتفاق سے ایک رہبر مل گئے اور یہ ان کے ساتھ ہو لئے۔

اس رہبر کے متعلق بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ پیغمبر تھے اور جس کے ثبوت میں "آتینہ رحمۃ من عندنا وعلمنہ من لدنا علما" اور "ما فعلتہ عن امری" پیش کیا جاتا ہے، اس کے متعلق زیادہ بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، ہر چند امام فخر رازی نے ان کو ثبوت نبوت کے لئے کافی نہیں سمجھا۔ لیکن ان کو نبی مان لیا جاوے تو بھی کوئی حرج پیدا نہیں ہوتا، بہرحال یہ نبی ہوں یا نہ ہوں یہ یقینی ہے کہ اس نواح سے واقف تھے اور ان کی وجہ سے موسیٰ کی صحرا نوردی میں بہت کمی ہو گئی۔

اب اس پر غور کرنا چاہئیے کہ جب کلام مجید میں نہ کہیں خضر کا نام آیا ہے اور نہ کسی اور خلاف عقل بات کا ذکر ہے تو پھر خضر و موسیٰ کا اتنا طویل افسانہ کہاں سے پیدا ہو گیا، اس غرض کے لئے جب احادیث کی جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کے ان تمام بیانات کا ماخذ بخاری کی بعض احادیث ہیں۔

ہم ان احادیث کو یہاں نقل نہیں کرتے بلکہ ان کا مفہوم بیان کئے دیتے ہیں وہ مفہوم یہ ہے کہ:۔

ایک دن حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو وعظ و نصیحت کی تو کسی نے پوچھا کہ اے رسول خدا دنیا میں تم سے بھی زیادہ کوئی صاحب علم موجود ہے یا نہیں، آپ نے کہا کہ نہیں، اس پر خدا نے وحی بھیجی کہ مجمع البحرین پر میرا ایک بندہ تجھ سے زیادہ صاحب فہم و ادراک ہے، موسیٰ نے کہا کہ میں کیونکر اس سے مل سکتا ہوں، خدا نے کہا کہ تم اپنی زنبیل میں ایک مچھلی لے لو جہاں وہ گم ہو جائے سمجھ لینا کہ وہیں تم کو وہ شخص ملے گا، چنانچہ موسیٰ نے ایسا ہی کیا اور چل کھڑے ہوئے، جب وہ ایک چٹان کے پاس پہنچے تو موسیٰ سو گئے اور مچھلی تڑپ کر سمندر میں چل دی، جب آگے بڑھکر موسیٰ کو اپنے ساتھی (یوشع بن نون) سے یہ حال معلوم ہوا تو پھر اسی جگہ واپس آئے جہاں انہیں ایک شخص سبز چادر اوڑھے ہوئے ملے جن کا نام خضر تھا"

یہ میں نے ایک عام مفہوم ظاہر کر دیا ہے ورنہ احادیث کے الفاظ میں بہت اختلاف ہے چنانچہ ایک روایت یہ بھی ہے کہ "جس جگہ چٹان پر مچھلی رکھی تھی اس کے نیچے چشمہ آب حیات کا تھا، جب مچھلی کے جسم سے اس پانی نے مس کیا تو وہ زندہ ہو کر چلدی"۔ یا خضر کے متعلق ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "وہ سمندر کے درمیان سبز سجادہ بچھائے ہوئے بیٹھے تھے"۔

چونکہ ان تمام احادیث کے الفاظ میں باہم گر بہت اختلاف ہے، اور یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام روایتیں با لفاظ رسول اللہ بیان نہیں کی گئیں، اس لئے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ اصول و روایت کی رو سے بھی انہیں جانچے۔ میرے نزدیک اگر ان روایات کی بہت سی خلاف عقل باتوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی ایک ایسی قوی دلیل ہمارے پاس ان احادیث نبوی نہ سمجھنے کی ایسی موجود ہے کہ اس سے کسی کو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ ان روایات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ کا ذکر ایک نبی کی حیثیت سے کیا گیا ہے اور ان پر وحی بھیجنے کا بھی ذکر ہے اس لئے اگر ان روایات کو درست سمجھ لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ موسیٰ مجمع البحرین کا سفر اختیار کرنے سے قبل ہی نبی ہو چکے تھے حالانکہ یہ بالکل غلط ہے اور خود سورۂ قصص کی آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے بہت زمانہ بعد آپ کو شرف نبوت عطا ہوا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ رسول اللہ کبھی ایسی بات نہ بیان کر سکتے تھے، جو خلاف واقعہ یا نص قطعی کے منافی ہو۔

سر سید کی رائے اس باب میں بہت درست معلوم ہوتی ہے کہ چونکہ رسول اللہ نے قصص بنی اسرائیل کی روایت کی اجازت دیدی تھی، اس لئے لوگوں نے خضر و موسیٰ کے اس واقعہ کو بھی یہودیوں کی روایت کے مطابق بیان کیا، لیکن اخیر کے راوی نے یہ خیال کر کے کہ پہلے راوی نے اس واقعہ کو رسول اللہ ہی سے سنا ہو گا آپ سے منسوب کر دیا حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی۔

الغرض اس تمام بیان کا خلاصہ یہ ہوا کہ خضر کا نام یا آب حیات کا ذکر کلام مجید میں تو ہے نہیں، اور جن احادیث میں آیا ہے ان کا حال بھی آپ کو معلوم ہو چکا اس لئے ماننا پڑے گا کہ مسلمانوں میں جو یہ سارا قصہ مشہور ہے وہ صرف یہودیوں کی روایت کے مطابق ہے۔ سو اب آپ کو اختیار حاصل ہے، خواہ یہودیوں کی اس روایت کو صحیح سمجھ کر بہت سی خلاف عقل باتوں کا اعتراف کرتے رہیئے، یا کلام مجید کے بیان کے مطابق اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر ان عجائب پرستیوں سے احتراز کیجئے۔

کوہ نور

(جناب سید مجید حسین صاحب۔ شکوہ آباد)

"کوہ نور ہیرا جو اس وقت تاج برطانیہ میں پایا جاتا ہے، کیوں اس قدر مشہور ہے، کہاں کی معدن سے یہ نکلا تھا، اور انگلستان کس طرح پہنچ گیا۔ اس کی مختصر تاریخ کیا ہے؟"

(نگار) کوہ نور کے مشہور ہونے کا سبب ایک تو یہ ہے کہ وہ نہایت وزنی پارۂ الماس ہے؛ اور دوسرے یہ کہ اس سے بہت سی تاریخی روایات وابستہ ہیں، اس کی گزشتہ تاریخ اور انگلستان پہنچنے کے متعلق اختلاف ہے، تاہم جو کچھ مجھے معلوم ہے عرض کرتا ہوں۔

اس وقت دنیا میں صرف نصف درجن ایسے الماس ہیں جو اپنے بے بہا ہونے کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں، اور ان میں "کوہ نور"

سب پر فوقیت ہے۔ "کوہ نور" کس زمانہ میں اور کہاں پایا گیا، یہ امر بالکل تاریکی میں ہے۔ اگر قدیم روایات پر اعتبار کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ اس کی عمر ہزاروں سال کی ہے، کیونکہ کم از کم پانچ ہزار سال تک تو ہندوستان کے قدیم راجاؤں کے قبضہ ہی میں اس کا پایا جانا بیان کیا جاتا ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے حملۂ ہند سے قبل کی تاریخ نامعلوم ہے۔ لیکن یہ غالباً ایک حد تک یقینی ہے کہ جب سلطان علاؤالدین خلجی نے مالوہ کے راجہ کو شکست دی تو یہ ہیرا اس کے قبضہ میں آیا (بیان کیا جاتا ہے کہ مالوہ کے اس فرمانروا خاندان میں یہ ہیرا پشتہا پشت سے محفوظ چلا آرہا تھا) اس کے بعد خزانۂ شاہی کے انتقال کے ساتھ ساتھ سنہ ۱۵۲۶ء میں ہمایوں کے قبضہ میں آیا، اور جب اورنگ زیب حکمراں ہوا تو اس کو تختِ طاؤسی میں نصب کیا گیا۔

جب نادر شاہ نے محمد شاہ کو شکست دیکر خزانۂ مغلیہ پر قبضہ کیا تو اس میں یہ ہیرا موجود تھا۔ نادر کو معلوم ہوا کہ محمد شاہ نے اپنے صافہ میں اس کو چھپا لیا ہے، اس لئے جس وقت وہ محمد شاہ کو دوبارہ تخت پر بٹھانے لگا تو اس نے خواہش کی کہ آپس میں صافہ بدل لیا جائے اور اس طرح جب احمد شاہ کے سر سے صافہ نے کر نادر نے اپنے سر پر رکھا تو اس میں سے یہ ہیرا برآمد ہوا جس کی چمک اور ضخامت کو دیکھکر نادر شاہ نے اس کو "کوہ نور" کے لقب سے یاد کیا اور اسی وقت سے یہ نام اس کا مشہور ہے۔

نادر کے بعد یہ ہیرا اس کے بدنصیب بیٹے شاہرخ کو ملا، اور اس نے احمد شاہ ابدالی کو، احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو دیا، اس کے بعد عرصہ تک یہ ہیرا اسی خاندان میں رہا، اور پھر مختلف ہاتھوں میں ہوتا ہوا رنجیت سنگھ تک پہنچا، اور ۱۸۳۹ء میں جب رنجیت سنگھ مرا تو یہ ہیرا لاہور کے خزانہ میں داخل ہوا، اور جب ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، تو ملکہ وکٹوریہ کے تاج کے لئے لندن بھیجدیا گیا۔ وہاں اس کو تراشا گیا اور اس کا وزن ۱۸۶ قیراط سے گھٹ کر ۱۰۶ قیراط رہ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے تراشنے میں ۳۸ دن ۱۲ گھنٹے صرف ہوئے تھے۔

بعض کا خیال ہے کہ وہ ہیرا جسے انگریزی میں گریٹ مغل (Great Moghul) کہتے ہیں، یہی کوہ نور ہے اور بعض اُسے دوسرا ہیرا بتاتے ہیں جو ۱۶۵۰ء میں معدن گولکنڈہ میں دریائے کرشنا کے ساحل پر پایا گیا تھا۔ اور اس کا وزن ۲۸۰ قیراط تھا، کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ اسے بھی لے گیا تھا اور بعد کو اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئیے گئے۔

یہ بیان تو ہوا ان لوگوں کے نقطۂ نگاہ سے جو اس پر آج کل قابض ہیں، لیکن اس کے ساتھ افغانی روایت بھی سننے کے قابل ہے۔ اس کی رُو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو یہ ہیرا نادر شاہ کی بیوی نے اس کے حسنِ خدمات کے صلہ میں دیا تھا، اور اس وقت سے برابر فرمانروایانِ افغانستان کے پاس رہا، یہاں تک کہ جب محمد زئی خاندان کی حکومت شروع ہوئی، تو امین الدولہ شاہ شجاع کے حکم سے جو بعد کو قتل کیا گیا یہ ہیرا لے کر ہندوستان چلا آیا۔ لاہور میں بعض انگریزی تاجروں کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے اس سے زبردستی چھین لیا۔ اور لندن بھیجدیا، امین الدولہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اور اس نے ولایت پہنچکر ملکہ وکٹوریہ سے درخواست کی یہ ہیرا اُسے واپس دیدیا جائے۔ لیکن جب یہ التجا قبول نہ ہوئی تو اس نے کہا کہ ایک نگاہ ہیرے کو دکھا ہی دیا جائے، چنانچہ یہ ہیرا اس کو دکھایا گیا تو وہ دیر تک روتا رہا، اور پھر ہندوستان واپس آکر چند دن کے بعد مر گیا۔

افغانستان میں یہ قصہ بہت مشہور ہے، وہ ہر شخص اپنی اولاد کو وصیت کر جاتا ہے کہ اس ہیرے کو واپس لانے میں اپنی ساری کوشش صرف کر دے۔ چنانچہ جب ۱۹۲۶ء میں افغانی وفد ہندوستان سے واپس گیا اور سرحد پر افغانی سرداروں نے اس کا استقبال کیا تو اُن میں سے ایک نے سلام کرنے سے پہلے ہی یہ پوچھا کہ "کوہ نور بھی لائے ہو یا نہیں"

ماتم دار

(جناب محفوظ اللہ صاحب ایڈیٹر)

"(۱) لفظ ماتم دار کا استعمال آپ کے نزدیک صحیح ہے یا نہیں، میں نے اپنے ایک شعر میں جس کے قوافی دار، تار وغیرہ ہیں "

" لکھ دیا ہے، وہ شعر یہ ہے۔ "

" وہ آجائیں تو شاید کوئی ماتم دار ہو جائے "

"(۲) میرے ایک مہربان شاعر کا مطلع ہے جس کے مصرع ثانی پر بعض اصحاب معترض ہیں آپ کے نزدیک اس میں کوئی "

" نقص شاعری ہے یا نہیں۔ "

" دیکھ کر بیخود کوئی جب تک رہا آغوش میں "

" ہوش بھی آیا مجھے تو میں نہ آیا ہوش میں "

" بعض کہتے ہیں اپنے آپ کو ہوش آنا یا اپنا ہوش میں آنا ایک ہی بات ہے۔ "

(نگار) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو لفظ ماتمدار کی صحت کی طرف سے کیوں شبہ پیدا ہوا، جب کہ اُردو، فارسی شعرا نے اس لفظ کو کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ماتم دار کی صحت و عدم صحت کے متعلق صرف اتنی تحقیق کافی ہے کہ آیا لفظ ماتم، داشتن مصدر یا اس کے مشتقات کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یا نہیں، اور ادنےٰ استقصاء سے آپ کو معلوم ہو سکتا ہے کہ فارسی میں کثرت سے اس طرح استعمال ہوا ہے چنانچہ عرفی لکھتا ہے۔

عادتِ عشاق چیست مجلس غم داشتن
حلقۂ شیون زدن، ماتم بہم داشتن

آپ کے "مہربان شاعر" کے مطلع پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ بھی لغو ہے، یہ درست ہے کہ اپنے آپ کو ہوش آنا، یا اپنا ہوش میں آنا ایک ہی بات ہے، لیکن یہاں تو شاعر کا مقصود ہی کچھ اور ہے، وہ کہتا ہے کہ "مجھے ہوش بھی آیا تو میں ہوش میں نہ آیا یعنی قصداً

بیہوش بنا رہا تا کہ لطف آغوش کچھ دیر اور حاصل رہے "۔

ہر چند اس شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے، لیکن وہ اعتراض اس پر وارد نہیں ہوتا جو آپ نے بیان کیا۔

مختلف سوالات

(جناب حکیم عبدالحفیظ صاحب ۔ کھگڑیا، مونگیر)

"(۱) از روئے فلسفۂ جدید تکوین کائنات کی نوعیت کیا ہے اور سائنس تخلیق انسان کے اسباب فاعلی و مادی کیا بتاتی ہے۔"

"(۲) ارواح خبیثہ کون ہیں اور وہ کیوں ہر شکل میں متشکل ہو کر انسانی افراد کو ایذائیں کیوں پہنچاتی ہیں درانحالیکہ روح و ذرات غریزی کے تحلّل کا نام موت ہے۔"

"(۳) جزا و سزا قبر موتی کے لئے از روئے حدیث امر لازمی ہے اور ارواح کی تعلیق علّیین و سجّین کی روایت بھی صحیح ہے، پھر روح واحد کا آن واحد میں مختلف احوال پیدا کرنا تعجبات سے ہے۔"

"(۴) بہشت و دوزخ کا وجود فی الحقیقت ہے یا محض ہدیہ کے لئے جزا و سزا موعود ہے۔"

"(۵) حاجیوں کا بیان ہے کہ زائرین کعبہ سر اٹھا کر کعبہ کی طرف نہیں دیکھ سکتے ورنہ اندھے ہو جائیں، کیا فی الحقیقت واقعہ یہی ہے اور ایسا کیوں ہے۔"

"(۶) سیّد کا وجود دنیائے اسلام میں کس طرح ثابت ہے جبکہ رسول اللہ کی اولاد نرینہ کا سلسلۂ تناسل نہیں ہوا، انتساب اولاد ذکور کا مسلم ہے یا اولاد اناث کا۔"

(**نگار**) آپ نے یہ استفسارات کر کے گویا مجھ سے مطالبہ کیا ہے کہ دنیا کے سارے کام چھوڑ کر اپنی ساری عمر ان مسائل کی تحقیق میں صرف کر دوں، اور پھر بھی نتیجہ میں سوائے دردسری کے اور کچھ حاصل نہ ہو۔ آپ نے جو سوالات کئے ہیں ان میں سے بعض کے متعلق اس وقت تک خدا جانے کتنی کتابیں، کتنے مضامین شائع ہو چکے ہیں اور آج تک حقیقت کسی پر واضح نہیں ہوئی، اس لئے میں کوئی تفصیلی جواب تو آپ کو نہیں دے سکتا، البتہ اجمالاً کچھ عرض کرتا ہوں:۔

(۱) تکوین کائنات کی "نوعیت" سے مراد شاید آپ کی یہ ہے، کہ کائنات کیونکر عالم وجود میں آئے۔ اس کے متعلق میں نگار میں ایک مستقل مضمون لکھ چکا ہوں، اسے ملاحظہ فرمائیے، اور تخلیق انسان کے متعلق آپ نگار کے دو مضامین ملاحظہ فرمائیے جو نوامید کی حیات

کے تحت میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۲ و ۳) چونکہ یہ دونوں سوال روح سے متعلق ہیں اور اس وقت تک روح کی حقیقت باوجود انتہائی کوشش کے کسی پر واضح نہیں ہو سکی اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ "ارواح خبیثہ" کا وجود ممکن ہے یا نہیں، اور اگر ممکن ہے تو وہ اجسام کے ساتھ کیونکر نمودار ہوتی ہیں۔ یہ آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ روح کے تحلیل ہو جانیکا نام موت ہے۔ روح کے قیام و بقا پر تو اب تقریباً ساری دنیا کا اتفاق ہے۔

(۴) بہشت و دوزخ میرے نزدیک صرف روحانی نشاط و تاذی کا نام ہے، اس سے قبل بارہا اس پر گفتگو کر چکا ہوں تکرار کی ضرورت نہیں۔ احادیث و نص قطعی سے بھی میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

(۵) جو حاجی ایسا بیان کرتا ہے وہ غالباً اندھا ہوگا اور اس نے اپنی بصارت زائل ہونے کے سبب یہ بیان کیا ہوگا، تاکہ اس میں بھی اہمیت پیدا ہو جائے، ورنہ ظاہر ہے کہ کعبہ کے دیکھنے سے بینائی میں کوئی فتور واقع نہیں ہو سکتا۔ اسے تو بینائی اور بڑھنی چاہئے۔

(۶) رسول اللہؐ کی اولاد اناث سے جو سلسلہ قائم ہوا ہے اسے بہرحال آل رسول تو ماننا ہی پڑیگا، پھر اب آپ کو اختیار ہے اسے سید کے نام سے موسوم کیجئے یا کسی اور نام سے۔ رسول اللہؐ اور صحابہ کے زمانہ میں یہ لفظ کسی قوم یا نسل کے تعین کے لئے کبھی استعمال نہیں ہوا۔ یہ سب بعد کی باتیں ہیں لیکن اگر آلِ رسول کو ہم لفظ سید سے تعبیر کریں تو اس میں حرج بھی کیا ہے۔

اقتباسات و معلومات

طب استخوانی

جس وقت کوئی طبیب اوّل اوّل کام شروع کرتا ہے تو وہ دواؤں کے اثرات کا بڑا قائل ہوتا ہے، لیکن جوں جوں اُس کو تجربہ ہوتا جاتا ہے وہ دواؤں کا استعمال کم کرتا جاتا ہے۔ اور تدابیر صحت میں صرف طبیعت کے عمل پر زیادہ اعتماد کرتا ہے، چنانچہ اب عام رجحان تمام ڈاکٹروں کا یہی ہے۔ "ڈاکٹر ولیم آسلر، جامعۂ آکسفورڈ کا پروفیسر کہتا ہے کہ "سب سے بہتر طبیب وہی ہے جو یہ جان لے کہ دواؤں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا" اور سر فریڈرک (ملک معظم کا ڈاکٹر) کا بھی یہی خیال ہے کہ امراض کے دور کرنے کے لئے دواؤں کا استعمال اب روز بروز زوال پذیر ہے۔

چنانچہ اسی اصول کی بنا پر ڈاکٹر انگلو ٹیلر نے سنہ ۱۸۷۴ء میں ایک نیا طریق علاج دریافت کیا جس کا نام طب عظمی یا طب استخوانی — (Osteopathy) ہے۔ اس کا خیال تھا کہ جو مرض پیدا ہوتا ہے اُس کا تعلق ہڈیوں، عضلات و مفاصل کے خلل سے ہے چنانچہ سب سے پہلے ان میں چیزوں پر غور کرنا چاہیے اور انھیں کے ملنے دلنے سے مرض کو دفع ہونا چاہیے۔

سب سے پہلے طب استخوانی کا مدرسہ سنہ ۱۸۹۲ء میں بمقام کرکسول قائم کیا گیا تھا، اور اس وقت تک سیکڑوں ڈاکٹر یہاں سے فارغ ہو کر علاج کر رہے ہیں اور متعدد اسپتال اس کے امریکہ میں قائم ہو گئے ہیں جہاں بہت سے امراض کا کامیاب علاج ہوتا ہے۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ طریق علاج نیا نہیں ہے بلکہ لوئی کوہنی اس سے قبل اس مسئلہ پر غور کر کے علاج بالمالش (Massage) کا قائل ہو چکا تھا، اور لوئی کوہنی سے بہت پہلے ابن سینا ملنے دلنے کے فوائد معلوم کر چکا تھا چنانچہ علاج فالج کے سلسلہ میں وہ کہتا ہے کہ تیل اسمندر اور گندھک کے چشموں کا پانی ملنے سے جو فائدہ ہوتا ہے یا عرق النسا وغیرہ میں جو فائدہ روغنوں کے ملنے سے ہوتا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ عضلات وغیرہ اس صورت سے ملے دلے جاتے ہیں۔

فلکی شعاعیں

آفتاب کی روشنی کیسی ہی تیز ہو لیکن ایک باریک سا ورق بھی اُس کے لئے حجاب ہو جاتا ہے، یہ دنیا میں ہر شخص کو معلوم تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ روشنی کی حقیقت صرف یہی ہے۔ جب انجنی شعاع دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لکڑی اور گوشت کے اندر بھی نفوذ کر جاتی ہے، اس کے بعد دوسری شعاع اور معلوم ہوئی جو معدنی ٹھوس اشیا کے اندر بھی نفوذ کر جاتی ہے، اس شعاع کے دریافت ہونے کی تاریخ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۰ء میں بعض علماء طبیعیہ نے محسوس کیا کہ الکٹرس کوپ کو کیسا ہی مضبوط طور پر بند کر دیا جائے، لیکن اس سے کہربائیت مترشح ہوتی ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ سلبی یا ایجابی کہربائی شعاعیں اس میں داخل ہوئیں اور اس کہربائیت سے مل کر جو اس آلہ کے اندر تھی زائل ہو گئیں، یعنی معلوم یہ ہوا کہ زمین میں بعض مواد ایسے ہیں جن سے کہربائی شعاعیں پیدا ہو کر الکٹرسکوپ کی کہربائیت سے ملجاتی ہیں۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں بعض جرمن علماء غبارہ میں بیٹھکر اڑے اور اپنے ساتھ الیکٹرسکوپ بھی رکھ لیا، جب بلند ہوئے، تو معلوم ہوا کہ اس آلہ کی کہربائیت بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہوگئی ہے۔ اس کے بعد چونکہ جنگ شروع ہوگئی اس لئے مزید تجربات نہ ہوسکے۔ اختتام جنگ کے بعد پھر یہ تجربہ شروع ہوا اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جدید کہربائی شعاعیں زمین سے نہیں بلکہ فضا سے پہنچتی ہیں اور معدنی اجسام کے اندر بھی نفوذ کرجاتی ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ فضا میں اُن کا منبع یا مخرج کیا ہوسکتا ہے، اس کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ریڈیم لوہے کے جواہر مادی میں جو تغیر پیدا ہوتا ہے اُس سے یہ شعاعیں نکلتی ہیں، بعض کا خیال ہے کہ ہوا کے بلند طبقات میں جو کہربائی (Electrons) پائے جاتے ہیں اُن سے پیدا ہوتی ہیں۔

کواکب اور وہاں کے باشندے

آفتاب بجوم میں سب سے چھوٹا ستارہ ہے اور زمین اُن کواکب میں جو آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں سب سے زیادہ حقیر سیارہ ہے، لیکن باوجود اس کے وہ انسان کا وطن ہے اور لاکھوں قسم کے حیوانات و نباتات اس میں پائے جاتے ہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ کیا یہ شرف صرف زمین ہی کو حاصل ہے اور دوسرے کواکب اس سے محروم ہیں؟

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ جاندار کے وجود کے لئے ایک خاص درجۂ حرارت و برودت کی ضرورت ہے (یعنی حرارت ایسی جو صفر سے ۱۰۰ درجہ سے زیادہ بلند نہ ہو اور برودت ایسی جو ۱۰۰ درجہ سے زیادہ کم نہ ہو) اور یہ کہ اجسام کا قوام عبارت ہے کاربن، آکسیجن اور ہیڈروجن کی ترکیب و امتزاج سے اور اسی کے ساتھ یہ کہ اس کو ہوا اور پانی کی بھی ضرورت ہے، تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑیگا کہ سوائے مریخ اور زہرہ کے یہ خصوصیات کسی اور سیارہ میں نہیں پائی جاتیں (یہ ذکر صرف اپنے نظام شمسی کا ہے کہ دوربین یہیں تک کام دے سکتی ہے، باقی اور نظام شمسی جو خدا معلوم کتنی تعداد میں پائے جاتے ہیں، ان کا علم کسی کو نہیں اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہاں کس قسم کی مخلوق آباد ہے)

اب سب سے پہلے آفتاب کو لیجئے، سو ظاہر ہے کہ وہاں اس قدر شدید حرارت ہے کہ کوئی جاندار نہیں پایا جاسکتا، کیونکہ وہ مرکبات جن سے جسم انسانی کی تشکیل ہوتی ہے اتنی حرارت میں قائم نہیں رہ سکتے۔

مشتری، زحل، اورانوس، اور نپٹون میں بھی کسی جاندار کا وجود ممکن نہیں ہے کیونکہ یہاں سردی نہایت سخت ہے، حتیٰ کہ مشتری میں بھی جس کی حرارت زحل وغیرہ سے بڑھی ہوئی ہے، حرارت صفر سے ۲۰۰ درجے نیچی ہے۔ عطارد، زہرہ، اور مریخ، ضرور ایک حد تک زمین سے مشابہ ہیں، لیکن عطارد کا درجۂ حرارت ۴۶۰ ہے اور مریخ کا ۶۰ درجے صفر سے نیچے ہے، اس لئے یہاں بھی جاندار نہیں پیدا ہوسکتے، اب رہگیا زہرہ سو اس میں شک نہیں کہ اس میں بہ نسبت اور سیاروں کے زیادہ صلاحیت جاندار پیدا کرنے کی ہے، کیونکہ اس کی حرارت کا اوسط زمین کی اوسط حرارت سے ۹ درجہ سے زیادہ نہیں بڑھتا، لیکن چونکہ یہاں بھی پانی کا وجود نہیں معلوم ہوتا ہے اس لئے جاندار کا پایا جانا یہاں بھی دشوار ہے، اسی طرح چاند میں بھی پانی اور ہوا نہیں ہے، اور یہاں بھی کوئی جاندار نہیں پایا جاسکتا۔ ذیل کے نقشے سے ہر سیارہ کی حرارت وغیرہ کا اجمالی علم حاصل ہوسکتا ہے۔

نام سیّارہ	قطر میلوں میں	دوریِ آفتاب سے	دن کی لمبائی	سال کی لمبائی	درجۂ حرارت
آفتاب	۸۶۵۰۰۰	-	۶۰۰ گھنٹے	-	+ ۱۲۰۰۰
عطارد	۳۰۳۰	۳۶۰۰۰۰۰۰ میل	؟	۸۸ دن	+ ۳۶۰
زہرہ	۷۷۰۰	″ ۶۷۲۰۰۰۰۰	؟	″ ۲۲۵	+ ۶۸
زمین	۷۹۱۸	″ ۹۲۹۰۰۰۰۰	۲۴ گھنٹے	″ ۳۶۵	+ ۵۹
مریخ	۴۲۲۰	″ ۱۴۱۰۰۰۰۰۰	″ ۲۴½	″ ۶۸۷	— ۶۰
مشتری	۸۶۵۰۰	″ ۴۸۳۰۰۰۰۰۰	″ ۹٫۸	″ ۴۳۳۲	— ۲۰۰
زحل	۷۰۰۰۰	″ ۸۸۶۰۰۰۰۰۰	″ ۱۰٫۲	″ ۱۰۷۵۹	— ۳۳۰
اورانوس	۳۱۵۰۰	″ ۱۷۸۱۹۰۰۰۰۰	؟	″ ۳۰۶۸۷	— ۳۸۰
نیپٹون	۳۴۸۰۰	″ ۲۷۹۱۰۰۰۰۰۰	؟	″ ۶۰۱۸۱	— ۴۰۰

مکھی بطور غذا کے

شہر مکسیکو سے جانب شرق ریل کی ایک گھنٹہ کی مسافت پر نہایت چھوٹا سا گاؤں نظر آتا ہے جو دلدل کے کنارے واقع ہے۔ اس گاؤں کا شمالی غربی جانب دلدل کے کیچڑ سے محصور ہے جو سانپوں اور حشرات سے بھرا ہوا ہے یہی حال شمالی شرقی حصے کا ہے، جنوبی طرف ایک خشک بلند پہاڑ ہے جس کے دامن سے مکسیکو کو راستہ جاتا ہے، اس قریہ کی آب و ہوا خراب ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ لوگ یہاں کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہاں کے باشندوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ پانی کی مکھی اور اس کے انڈے ہیں۔ صبح ہوتے ہی یہاں کے لوگ دلدل کے کنارے پہنچ جاتے ہیں اور جتنی زندہ یا مردہ مکھیاں انھیں ملتی ہیں پکڑ لیتے ہیں۔ ان کو وہ ریت پر دھوپ میں پھیلا دیتے ہیں، اور پھر شہر مکسیکو (پایۂ تخت) میں لیجا کر انھیں فروخت کرتے ہیں۔ یہ بہت گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، اور لوگ نہایت شوق سے مول لیتے ہیں، بعض لوگ کشتیوں میں بیٹھکر دور نکل جاتے ہیں اور ایک خاص جال کے ذریعہ سے کشتی بھر کر مکھیاں پکڑ لاتے ہیں، ان کے انڈے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گھاس کے پولے قطار در قطار پانی کے اندر گاڑ دیتے ہیں، جن کے سرے پانی سے اوپر ہوتے ہیں، مکھیاں شام کو آکر یہاں بیٹھتی ہیں اور انڈے دیتی ہیں، چند دنوں میں ساری گھاس انڈوں سے بھر جاتی ہے۔ جنھیں خشک کرکے آٹے کی طرح پیس لیتے ہیں، اور پھر ان کی گول ٹکیاں بنا کر گراں قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

عریانی اور صحت

اس وقت یورپ میں یہ خیال بہت ترقی پکڑتا جا رہا ہے کہ "کپڑوں کو اتار دینا چاہیئے"، چنانچہ وہاں اس وقت ہزاروں آدمی ایسے ہیں جو تمام جسمانی ورزشیں بالکل برہنہ ہو کر کرتے ہیں۔ اس کی ابتداء

سب سے پہلے جرمنی میں ہوئی اور وہ اس طرح کہ ایک مرتبہ ستارہ کا ایک فلم دکھایا گیا جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ روشنی صحت انسانی کے لئے بہت مفید ہے، دیکھنے والوں میں ہزاروں آدمی ایسے تھے جنھوں نے اس سے قبل کیمیاوی شعاعوں کا نام بھی نہ سُنا تھا، اور وہ مطلق واقف نہ تھے کہ نادرا، البنفسجی شعاعیں دفع امراض میں جسم کو کس قدر تقویت پہنچاتی ہیں۔ اس فلم میں بتایا گیا تھا، کہ بہت سے جلدی امراض ایسے ہیں جو صرف نور آفتاب ہی سے دور ہو سکتے ہیں، اور دریچوں کے شیشے اور کپڑے آفتاب کی ان مخصوص شعاعوں کو جسم انسانی تک نہیں پہنچنے دیتے۔

اس فلم کے دیکھنے کے بعد ہی وہاں متعدد انجمنیں قائم ہوئیں، تاکہ لوگوں کو کپڑوں کی طرف سے نفرت دلائیں، اور نور آفتاب میں ریاضت بدنی کی ترغیب دیں، بعد کو یہ انجمنیں باہم متحد ہو گئیں، اور اب اس مجلس کے ۰۰ باغ، ۹۰۰ کھیل گھر اور ۳۰۰ حمام ایسے ہیں جہاں لوگ آکر کھیلتے ہیں، نہاتے ہیں اس حال میں کہ ایک تار بھی ان کے بدن پر نہیں ہوتا۔ اوّل اوّل پولیس نے اسکی ممانعت کرنی چاہی، لیکن یہ خیال اس قدر کثیر الاشاعت ہو گیا کہ وہ بھی مجبور ہو گئی، اور اب وہ زیادہ سے زیادہ یہ دیکھتی ہے کہ کوئی شخص بازاروں میں تو ننگا نہیں پھرتا۔

اب یہ تحریک بلاد انگلستان، سوئٹزرلینڈ، اور سویڈن میں بھی بہت ترقی پذیر ہے اور پولیس اس کا سدباب نہیں کر سکتی۔ ڈاکٹر لیونارڈ جو علاج شمسی کا بڑا علمبردار ہے لکھتا ہے کہ مردوں کو اپنے لباس میں عورتوں کی طرح کمی کر دینی چاہئے، اور جو عورتیں اپنے حسن و صحت کی قدر کرتی ہیں انہیں چاہئے کہ بہت چھوٹے کپڑے استعمال کریں اور بازو و گردن کھلی رکھیں۔

جدید ترین اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ یورپ کے مرد بہ نسبت عورتوں کے زکام میں زیادہ مبتلا ہوتے ہیں اور بیمہ کمپنیوں کے اعلانات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ ربع صدی کے اندر مرد بہ نسبت عورتوں کے سینہ کے امراض میں زیادہ ہلاک ہوئے اسکا سبب یہی بیان کیا جاتا ہے کہ مرد زیادہ کپڑے استعمال کرتے ہیں۔

سل کا علاج سونے کے نمک سے

عالم طب کے اس وقت دو بڑے کارنامے یہ ہیں کہ سرطان کا سبب دریافت ہو گیا اور سل کا یقینی علاج ہات آگیا، سل کا علاج دریافت کرنیوالا ڈنمارک کا ایک ڈاکٹر ہے جس کا نام Hogler Meollagard ہے اور اس طریق علاج کو معالجہ کیمیاوی (Chemotherapy) کہتے ہیں۔

یہ جس دوا سے مسلول کا علاج کرتا ہے اس کا نام سانکروسین (Sanocrysin) یعنی سونے کا نمک ہے، اس دوا کو پچکاری کے ذریعہ سے مسلول کے جسم میں پہنچاتا ہے، اس دوا کی نسبت وزن کے لحاظ سے فی کیلو گرام ۶ سنٹی گرام ہوتی ہے۔

یورپ کی تجارت اور فن پرواز

یورپ میں تجارتی طیران نے اب ایک منتظم صورت اختیار کر لی ہے اور ہزاروں مسافر اور خدا جانے کتنا اسباب تجارت ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے اِدھر اُدھر منتقل ہونے لگا ہے، جس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہاں کی حکومتیں اس فن کو ترقی دے رہی ہیں، چنانچہ انگلستان کی ہوائی کمپنیاں ہر سال حکومت سے دس لاکھ گنی کی امداد حاصل کرتی ہیں، اس طرح ہالینڈ کی کمپنی اپنی حکومت سے سالانہ ۱۶ ہزار گنی، اور فرانسیسی کمپنیاں اپنی

اپنی حکومت سے ۱۰ ملین فرانک کی مدد حاصل کرتی ہیں۔ — سنہ ۱۹۲۴ء میں ۹۰ ہزار مسافروں نے ہوائی جہاز پر سفر کیا اور سنہ ۱۹۲۵ء میں یہ تعداد دو چند ہو گئی ہے۔ اسباب تجارت کا کوئی شمار نہیں۔

ہوائی جہاز ٹھیک ساڑھے نو بجے صبح کو ٹمپلہوف (جرمنی) سے روانہ ہوتا ہے اور ۲ ½ بجے ایمسٹرڈم پہنچ جاتا ہے۔ اگر یہاں سے لندن جانا ہوتا ہے تو ساڑھے ۶ بجے شام کو اور اگر پیرس جانا ہو تو ۶ بجے شام کو پہنچ جاتا ہے۔ گویا برلن اور لندن کی مسافت ۹ گھنٹوں میں اور برلن و پیرس کی مسافت ۹ ½ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے حالانکہ تیز سے تیز ریل گاڑی ۲۲ گھنٹے میں پہنچتی ہے۔

دوسرا جہاز ماسکو سے سات بجے صبح کو روانہ ہو کر کونگسبرگ ۶ بجے شام کو پہنچ جاتا ہے اور یہاں سے ایکسپریس ملتا ہے، صبح کو برلین پہنچا دیتا ہے گویا اس طرح سوویٹ حکومت کے پایۂ تخت سے لندن تک انسان ۲۴ گھنٹے میں پہنچ سکتا ہے، حالانکہ یوں پورے تین دن کا سفر ریل سے ہے۔

پیرس سے وائنا تک صرف ۱۲ گھنٹہ کا سفر ہے اور پیرس سے بلغراد تک ۲۰ گھنٹہ اور آستانہ تک ۲۴ گھنٹے کا راستہ ہے۔ یعنی پیرس سے آستانہ (قسطنطنیہ) تک ایک آدمی ۲۴ گھنٹے میں پہنچ جاتا ہے، ورنہ اس سے قبل ریل میں پانچ دن صرف ہوتے تھے۔ اس طرح فنلینڈ کا پایۂ تخت، کوپن ہیگن، ماسکو، وئینا، بوڈاپسٹ، بلگراڈ اور آستانہ سب برلن، پیرس اور لندن کے ہوائی خطوط سے متصل ہیں۔

فرانس کے طیران تجارتی کے ۹ خط ہیں جو افریقہ کی نوآبادیوں کو جاتے ہیں اور باقی یورپ کی مختلف سمتوں میں۔ لیکن برلن تجارتی طیران کا مرکزی نقطہ سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں سے روزانہ ۱۰ جہاز روانہ ہوتے ہیں اور سارے یورپ پر چھا جاتے ہیں۔ جرمنی کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ اس کے جہازرات کو بھی سفر کرتے ہیں اور ہوائی اسٹیشن اس لئے نہایت مکمل و منظم حالت میں ہیں۔

چین میں تعلیمی ترقی

سنہ ۱۹۱۰ء تک چین میں تعلیم کا طریقہ وہی تھا جو ہندوستان کے مکتبوں میں رائج تھا لیکن سنہ ۱۹۰۲ء کے بعد سے لوگوں کے خیال میں اس قدر تبدیلی پیدا ہوئی کہ دفعتاً جدید تعلیم کی طرف مائل ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت وہاں یورپ کے انداز و اصول پر دو لاکھ مدرسے قائم ہیں جن میں ستر لاکھ لڑکے اور لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں سنہ ۱۹۱۲ء سے (جب وہاں جمہوریت قائم ہوئی) تو نظام تعلیم اور بہتر ہو گیا اور تمام بلاد چین میں ایک عام تحریک ترقی تعلیم کی پیدا ہو گئی اور یورپ و امریکہ کے سند یافتہ مدرسین متعین کئے گئے جو جدید ترین اصول پر کام کر رہے ہیں۔

زمین کی عمر

زمین کی عمر کا اندازہ اُن معدنوں سے کیا جاتا ہے جو اس کے اندر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً سیسہ ہے کہ اگر اس کی نسبت کا اندازہ ان چٹانوں سے کیا جائے جن میں وہ پایا جاتا ہے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ایک سال میں وہ کتنا پیدا ہوتا ہے، تو اس سے زمینوں کی عمر معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس حساب سے زمین کی عمر کا اندازہ ۳۰۰۰ ملین سال کیا گیا تھا، لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ جن چٹانوں کو دیکھ کر اندازہ کیا گیا تھا وہ ناری تھیں اور ان میں سیسہ کی پیدائش کا سبب کچھ اور بھی ہو سکتا ہے اس لئے جب دوسری معدنوں کے لحاظ سے اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ زمین کی عمر ۱۶۰۰ ملین سال سے زیادہ نہیں ہے۔

ہدیۂ مجہول

گزشتہ موسم بہار میں ایک شخص لندن کے اسپتال میں آیا اور اس کے مہتمم سے مل کر بولا کہ میں اسپتال کی کچھ مالی امداد

کرنا چاہتا ہوں، اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ یہ کس غرض کے لئے استعمال کی جائے گی۔ مہتمم نے جواب دیا کہ اس وقت ہمیں ضرورت اس امر کی ہے کہ طبی مسائل کی تحقیق کی جائے اور قابل طبیبوں کو معقول وظائف دیکر معاش سے فارغ کر دیا جائے تاکہ وہ اطمینان سے تحقیق و تدقیق کر سکیں۔ یہ سنکر اس آدمی نے کچھ تامل کیا اور پھر پچاس ہزار گنی پیش کیں، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ دینے والے کا نام ظاہر نہ کیا جائے۔

فوق البنفسجی شعاع اس شعاع کا اثر یہ ہوتا ہے کہ خون کے سفید ذروں میں جراثیم امراض پر غالب آنے کے لئے قوت پہنچتا ہے اور یہ قوت دائمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا خیال ضروری ہے کہ جو لوگ دھوپ میں اس شعاع سے فائدہ اٹھانے کے لئے بیٹھیں، اُن کو صرف اتنی دیر بیٹھنا چاہیئے کہ جلد میں ہلکی سی سرخی پیدا ہو جائے، کیونکہ اگر یہ سرخی زیادہ بڑھ گئی تو بجائے قوت پہنچانے کے اور ضعیف کر دیگی۔

مصنوعی خلایا تمام جاندار اجسام مرکب ہیں خلایا (Cells) سے جو غذا کو چوستے ہیں نشو و نما پاکر منقسم ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے اقسام غذا کو چوس کر اور نشو و نما پاکر منقسم ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے لیکن اب بعض علمائے نباتیات نے جلاتین وغیرہ کی مدد اور فولاد، پوٹاشیم، اور سوڈیم وغیرہ کے محلولات سے مصنوعی خلایا ایسے تیار کئے ہیں جو اصلی خلایا کی طرح غذا کو چوس سکتے ہیں۔ اگر اس کا تجربہ نباتات پر صحیح ثابت ہوا تو پھر حیوانات و انسان بھی اس تجربہ کے دائرہ میں آ جائیں گے اور یقیناً وہ وقت دنیائے طب کے لئے بہت زیادہ فخر و مباہات کا ہوگا۔

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۸۰۰ جلد ۱-۱ ؛ شمار (۲)

بھوپال سے ہر ماہ کی ۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ستار روپیہ

فہرست مضامین اگست سنہ ۱۹۲۶ء

بسم اللہ

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

شمار (۲)	اگست - سنہ ۱۹۲۶ء	جلد (۱۰)

ملاحظات

میرا ایک مضمون "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" جون کے رسالہ میں شائع ہوا ہے، اس کے متعلق بعض تحریریں میرے پاس اس قسم کی آئی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جس ہستی کا ذکر میں نے اس میں کیا ہے، اس کو واقعی کوئی "موجود فی الخارج" شخصیت سمجھا گیا ہے، حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہے' میں نے اس میں صرف ایک خیالی شخص کو پیش کیا ہے اور اُس کا نام "وارث علی" بغیر کسی غور و فکر کے میرے قلم سے نکل گیا ہے، لیکن دنیا کا کوئی فرضی نام ایسا نہیں ہے، جس کا مسمّیٰ موجود نہ ہو، اس لئے بعض اصحاب اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے۔

اس فسانہ سے میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہمارے ہاں کے طبقۂ متصوفین و علماء میں بعض ایسے "نفوس مقدسہ" بھی پائے جاتے ہیں جنکے ظاہر و باطن میں بالکل سفید و سیاہ کی نسبت ہوتی ہے۔ اور اس لئے صرف ظاہر کو دیکھکر باطن پر حکم لگانا قرین مصلحت نہیں، کیونکہ بسا اوقات نتیجہ میں جو منظر ہمارے سامنے پیش ہوتا ہے، اُس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ

چوں بازکنی مادر مادر باشد

عام طور پر صوبۂ یو۔پی میں اس امر کی شکایت کی جاتی ہے کہ پنجاب اپنی "جدیدہ خیز" سرزمین سے اُردو میں نہایت ناقص لٹریچر کا اضافہ کر رہا ہے اور وہاں کا ممتاز سے ممتاز رسالہ بھی زبان کی فاحش اغلاط سے پاک نہیں ہوتا، یہاں تک کہ یو۔پی کے اہل قلم بھی وہاں پہنچکر "طوطی در پس آئینہ" ہوجاتے ہیں، لیکن اس حقیقت کا اعتراف کبھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس "زندہ دلانہ" طریقہ پر خدمت زبان کے لئے مستعد نظر آتے ہیں اور جس ولولہ و نشاط کے ساتھ وہ کام کر رہے ہیں، اس سے کس درجہ اُن کے تقدم ادبی پر روشنی پڑتی ہے۔

اگر وہاں بہت سے ناکارہ رسائل شائع ہوتے رہتے ہیں، تو وہ بند بھی ہوجاتے ہیں لیکن یہ "اجرا و انقطاع" وہاں کی فضا میں کوئی بددلی پیدا نہیں کرتا، بلکہ جس طرح ایک شاخ قلم ہونے کے بعد زیادہ قوت کے ساتھ نشو و نما قبول کرتی ہے، اسی طرح وہاں بھی اگر رسالہ بند ہوتا ہے تو اس کی جگہ لے لیتے ہیں، جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ تنقید صحیح کے ماتحت ہر جدید رسالہ کا معیار بلند ہوتا جائیگا۔ اور ایک وقت آئیگا جب پنجاب اپنے رسائل کی "کمیت و کیفیت" دونوں حیثیتوں سے ترقی یافتہ نظر آئیگا۔

اس سے قبل جون کے نگار میں بہ سلسلۂ ملاحظات، پنجاب کے ڈرمٹیک کلب کے قیام کا ذکر آچکا ہے جس نے بہترین ڈراما کے لئے ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا ہے، اب لاہور کی انجمن ارباب علم نے ادبی مقابلہ کے لئے ۱۲۵۰ روپیہ کا انعام تجویز کیا ہے جس کے شرائط کی تفصیل آپ کو ملک کے مختلف اخباروں سے معلوم ہوگئی ہوگی اور نگار کی آئندہ اشاعت میں ہم بھی اسے درج کریں گے۔ اس سے قبل یہی انجمن ڈھائی سو روپیہ کا انعام ۲۶-۱۹۲۵ء کے ادبی مقابلہ میں ابو محمد صاحب ثاقب کانپوری، اور علمدار حسین صاحب واسطی (دو سید دن) کو دیچکی ہے۔ یہ ہے ادبی ثبوت اہل پنجاب کے آثار نہضت و ارتقا کا۔

اب اس کے مقابلہ میں یو۔پی کی گراں خوابی کو ملاحظہ کیجئے کہ اہل علم و قلم کی ترغیب و تشویق کے لئے مادی اعانت تو خیر بڑی چیز ہے، اس "گہوارۂ زبان" اور "مہد ادب" میں جو چند رسائل نظر آتے ہیں، اُن کا بھی یہ حال ہے کہ ہر مہینہ کا رسالہ اس طرح نکلتا ہے جیسے آخری سانس۔ تلخ نوائی معاف، کیا اسی کارگاہ عمل پر یہ "طنطنۂ افتخار" ہے اور اسی حقیقت پر دعوائے "انا ولا غیری" زیب دیتا ہے، ع

طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ !

اپریل و مئی کے نگار میں ایک مضمون بہ عنوان "ہندو مسلمانوں کے دورِ حکومت میں" مسلسل شائع ہوا ہے، اس پر کسی ہندو فاضل کا ایک ناقدانہ مضمون اخبار شجاع بریلی میں نکل رہا ہے، اس میں شک نہیں کہ قابل مضمون نگار نے پوری "سعی ناشکور" سے معاندانہ انداز تحریر کو چھپاتے ہوئے حق تنقید ادا کیا ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہ تھا کہ وہ اس کو نگار ہی میں اشاعت کے لئے بھیجتے، تاکہ ہمیں بھی تحسین کا موقع ملتا۔ جس قوت کے ساتھ وہ مسلمان بادشاہوں کی ستمرانیوں کا ثبوت پیش کر رہے ہیں، ہر چند وہ کوئی نئی چیز نہیں، بلکہ

صد بار خواندہ و دگر از سر گرفتہ ایم

کی قبیل سے ہے، لیکن پھر بھی ہم اس "زور بازو ناآزمودہ" کی داد دینے میں اپنے آپ کو کم حوصلہ ثابت نہ کرتے، اگر اس کا محل نمائش نگار کے صفحات کو قرار دیا جاتا۔

ماہ جون کی ڈاک میں سب سے زیادہ پُرلطف تحریر یہی ہے کسی اہل کلیسا مسٹر جے، مارٹن کی تھی، جس میں صاحب موصوف نے مجھے مخاطب کرکے تحریر فرمایا تھا کہ :-

"سنتا ہے آپ دین مسیحی کی طرف رجوع ہونا چاہتے ہیں، اگر یہ سچ ہے تو میں خوش ہوں کہ آپ نے دین حق کی طرف توجہ کی اور آپ جیسے قابل کی ضرورت بھی تھی، سو خدا اور اس کا بیٹا بہت جلد پوری کرے گا۔"

لیکن اس تحریر میں قیامت کے فقرے تو یہ تھے کہ :-

"دین اسلام ایک تنگ و اوہام پرست مذہب ہے، اس میں رہکر آپ روحانی ترقی نہیں کرسکتے"

مجھے حیرت ہے کہ میرے عزیز دوست کو کیونکر یہ اطلاع بہم پہنچی کہ میں "دین مسیحی کی طرف رجوع" ہونا چاہتا ہوں، حالانکہ اس سے قبل کبھی مجھے دین مسیحی قبول کرنیکا شرف حاصل نہیں ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد میں پھر اس طرف "رجوع" کرتا، لیکن اگر اس رجوع کے فقرے سے اُن کا مقصد مجھے دین مسیحی کی طرف دعوت دینا ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جے مارٹن، جو مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور جو مین شباب کے عالم میں انکے مصلوب ہونے اور زندہ آسمان پر اُٹھائے جانے کے قائل ہیں وہ ایسے مرتد شخص کو اپنے مسلک میں داخل کرکے کیا فائدہ اُٹھاسکتے ہیں، جو خود انجیل مقدس کی استناد سے مسیح کو ایک انسان کا بیٹا سمجھتا ہے، جو اعتقاد رکھتا ہے کہ مسیح عمر طبیعی کو پہنچکر عام انسانوں کی طرح اپنی موت سے مرے اور جو یقین رکھتا ہے کہ

دیگران ہم بکنند انچہ مسیحا می کرد

البتہ اگر مسٹر جے مارٹن یا کوئی اور عیسائی فاضل کسی صحیفۂ مقدس سے یہ ثابت کردیں کہ میرا اعتقاد غلط ہے تو میں مسیحی کیا معنی، یہ دعا کرنے کے لئے تیار ہوں کہ :- خدایا جوہر میرا انم

رہا ان کا وہ فقرہ جس میں انہوں نے اسلام کو تنگ و اوہام پرست مذہب بتا کر روحانی ترقی کا دشمن ظاہر کیا ہے، سو اس کے متعلق میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ؎

ز خار خار محبت دل تراچہ خبر
کہ گل بہ جیب نہ گنجد قبائے تنگ ترا

آپ اور اسلام پر اوہام پرستی کا الزام (جے مارٹن صاحب اور دین محمد پر روحانیت کی دشمنی کا بہتان !!

ایں بہ بیداری ست یارب یا بہ خواب

وہ شخص جس کے مذہب کی روحانیت کو مادہ پرستی ہمیشہ کے لئے محو کرچکی ہو، وہ اسلام کو روحانیت کا منافی خیال کرے، وہ اسلام جس کے مقلدین میں بعض مادہ پرست لوگ بھی روحانیت کا واسطہ قائم کئے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہ کرسکتے ہوں، افسوس ہے کہ میرے معزز ناصح نے کافی غور نہیں کیا، ورنہ اس فقرے کو وہ اپنے ہی مسلک کے لئے زیادہ موزوں پاتے۔

ہرچند اہل اسلام کے لئے یہ دور سخت انحطاط و زوال کا دور ہے، لیکن با اینہمہ جو "محرم باد صبا" ہے وہ جانتا ہے کہ اسلام میں اب بھی

یاد جو دخزاں بوئے یاسمن باقی ست

اس نوع کی دعوت دیکر بڑے وقت سے ڈریئے کہ مبادا کوئی "رند ژولیدہ مو" سن لے اور اپنی ادنیٰ توجہ سے کام لے کر آپ ہی سے یہ کہلوالے کہ "نکلا اک جام کی قیمت بھی نہ ایمان اپنا"

اس ماہ کے رسالہ میں ادبی نقطۂ نظر سے سید محی الدین صاحب قادری کا مضمون جو آئندہ اشاعت میں ختم ہوگا، اور علمی لحاظ سے مسٹر شمعون احمد کا مقالہ مخصوص طور پر قابل لحاظ ہے۔

جناب قادری نے غالب کی ذہنیت پر نہایت تکمیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، اس میں کلام نہیں کہ بہت سے اشعار غالب کے جذبۂ رشک سے لبریز نظر آتے ہیں لیکن میرے نزدیک قادری صاحب نے حقیقی سطح سے کچھ نیچے اتر کر تحدید کی ہے، اگر وہ ذرا اور بلند نظری سے کام لیتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ غالب کی حقیقی ذہنیت "رشک" نہیں تھی بلکہ خودداری تھی جس کے ماتحت جذبات رشک کا ظاہر ہوجانا قدرتی نتیجہ تھا، مجھے مسرت ہے کہ قادری صاحب نے، وجہ تنقید لکھنے کے بعد تنقید ہی کو اپنے فکر و خیال کا موضوع قرار دیا اور اگر وہ اس جادہ سے نہ ہٹے تو یقیناً اردو لٹریچر کو ان کے تنقیدی مقالات سے بہت مدد ملے گی۔

مسٹر شمعون احمد چونکہ سائنس کے گریجویٹ ہیں، اس لئے ان کے اکثر مضامین سائنٹفک ہوتے ہیں تاہم ضرورت ہے کہ وہ ایسے مسائل کو زیادہ آسان زبان میں اور زیادہ واضح طور پر سمجھانے کی کوشش کریں۔ اگر انھوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا تو آخیر میں نہایت اچھا مجموعہ علمی مضامین کا تیار ہوجائیگا، جو عوام و خاص سب کے لئے مفید ثابت ہوگا۔

"سرگزشت اشرف خاں" سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں ایک وقت (اور شاید اب بھی) ملک کا نظم و نسق کن ہاتھوں میں تھا اور اس کی حالت کس درجہ ردی تھی۔ "سنہ ۳۱۰۵ء" ایک علمی افسانہ ہے جس میں دنیا کے مستقبل کے متعلق گویا ایک پیشین گوئی کی گئی ہے۔

"فنون لطیفہ اور اسلام" تاریخی نقطۂ نظر سے غور سے پڑھنے کے قابل ہے اور "شیطان کی جیت" پلاٹ کی سادگی کے لحاظ سے لائق داد ہے۔

نظم "انتظار" میں حضرت جگر نے شوق قدوائی مرحوم کے "عالم خیال" کا تتبع کیا ہے، اور کامیابی کے ساتھ۔

سید محمد قادری صاحب بی۔ اے نے "حیدر بخش حیدری" کا تذکرہ محنت سے مرتب کیا ہے اور جناب اختر کی نظم "عرض نیاز" بھی خوب ہے۔

جناب درد کاکوروی نے تذکرۂ شاہ نظام الدین قادری کاکوروی کے متعلق ناظر دہلوی پر جو اعتراض کیا ہے وہ صحیح ہے، میں ممنون ہوں کہ اس سلسلہ میں انھوں نے قاری نظام الدین کاکوروی کا حال مرتب کرکے بھیجا۔

ہندوستان کے موجودہ دور صحافت میں غالباً روزنامہ ہمدرد (دہلی) ہی ایک ایسا اخبار ہے جو نہایت موزوں متانت و سنجیدگی کے ساتھ مسائل حاضرہ میں پبلک کی بہترین رہنمائی کرنیوالا کہا جا سکتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک پبلک نے کوئی ثبوت اپنی قدرشناسی کا پیش نہیں کیا۔ مولانا محمد علی کی خدمات قومی کا اگر ملک کو اعتراف ہے تو اسکا یہ فرض ہی ہوجانا چاہیئے کہ ان اسباب کی فراہمی میں مدد کرے جن کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کر سکتے ہیں۔

فنونِ لطیفہ اور اسلام

اس سے قبل نگار کی کسی گزشتہ اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے عہد حضارت میں فن رقص نے بھی کافی ترقی حاصل کر لی تھی اور اسکو کوئی عیب نہ سمجھا جاتا تھا۔ آج کی صحبت میں ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ فن تصویر و تمثیل کا رواج مسلمانوں میں کس حد تک پایا جاتا تھا اور اس میں انہوں نے کوئی حصہ لیا یا نہیں؟ لیکن اس جگہ ہم کو واضح کر دینا چاہئیے کہ فن تصویر سے ہماری مراد وہ نقوش ہیں جو کپڑے، دیوار، ظروف اور کتابوں وغیرہ میں بنائے جاتے ہیں، اور تمثیل سے مراد مجسمہ سازی یا بت تراشی ہے خواہ پتھر سے ہو یا کسی اور جامد چیز سے۔ اس لئے سلسلۂ مضمون میں جہاں جہاں لفظ تصویر یا تمثیل ہو اس کو اس معنی میں لینا چاہئیے جو ابھی ظاہر کئے گئے ہیں۔

کپڑوں پر تصویروں کا استعمال تو جاہلیت و اسلام دونوں زمانوں میں بہت معروف و مروج تھا، اور شعرائے عرب کے کلام سے اس کا کافی ثبوت مل سکتا ہے۔ چنانچہ امرؤ القیس لکھتا ہے:۔

خرجت بہا تمشی تجر وراءنا — علی اثرینا ذیل مرط مرحل

"مرط مرحل" یعنی ایسی چادر جس پر محمل کی تصویریں بنی ہوں اور اگر اس کو "مرحل" پڑھا جائے تو یہ معنی ہونگے کہ اس پر آدمیوں کی صورتیں منقوش تھیں۔ خود رسول اللہ کا ایسی چادریں استعمال کرنا بعض احادیث سے ثابت ہے مثلاً:۔

(۱) ان رسول اللہ صلعم خرج ذات یوم و علیہ مرط مرحل

(۲) کان یصلی و علیہ من ہذہ المرحلات

عربی زبان میں جو کپڑوں کے نام رائج تھے خود ان سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس قسم کے نقوش ان میں پائے جاتے تھے۔ مثلاً جب کسی کپڑے پر تیروں کے نقوش ہوتے تھے تو اسے "مسہم" کہتے تھے (اسہم تیر کو کہتے ہیں) اسی طرح جس کپڑے پر چڑیوں کی صورت ہوتی تھی اسے "مطیر" جس پر گھوڑے بنے ہوئے تھے اسے مخیل جس پر درخت وغیرہ منقوش ہوتے تھے اسے مشجر کہتے تھے اور اسی طرح کے اور بہت سے نام اسی نسبت سے رکھے گئے تھے مثلاً مسیف، مہلل، مکعب، معرض، معمد، معضد وغیرہ۔ جس کپڑے پر انگوٹھیاں بنی ہوتی تھیں اسے سجلاط اور جس پر ترنج بنے ہوتے تھے اسے سبنیہ کہتے تھے۔

ایک شاعر معرکہ عضد الدولہ کی تعریف کرتا ہے کہ:۔

والجو ثوب بالنسور مطیر — والارض فرش بالجیاد مخیل

یعنی فضا میں جو عقاب ہی عقاب اڑ رہے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی کپڑا ہے جس پر پرندوں کی صورتیں منقوش ہیں، اور زمین گھوڑوں کی کثرت سے ایک ایسا فرش نظر آتی تھی جس پر گھوڑے ہی گھوڑے بنے ہوئے ہیں۔

عربوں کا خود اس صنعت کو اختیار کرنا کرمی کے ان تحقیق سے ثابت ہوتا ہے جو بطور آثار کے قاہرہ کے میوزیم میں موجود ہیں۔ پردوں پر بھی تصاویر و نقوش کا رواج عربوں میں پایا جاتا تھا جس کی سب سے بڑی شہادت حضرت عائشہ کی یہ حدیث ہے:۔

"قدم رسول اللہ صلعم من سفر وقد سترت سھوۃ لی بقرام فیہ تماثیل فلما راٰہ رسول اللہ صلعم تلون وجہہ وقال یا عائشۃ اشد الناس عذاباً عند اللہ یوم القیامۃ الذین یضاھون بخلق اللہ فقطعناہ فجعلنا منہ وسادۃ او وسادتین"

یعنی رسول اللہ صلعم سفر سے تشریف لائے۔ میں نے ایک طاق پر پردہ ڈال رکھا تھا جس پر صورتیں منقوش تھیں، یہ دیکھکر رسول اللہ کے چہرہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا اے عائشہ قیامت کے دن ان لوگوں پر سخت عذاب ہوگا جو اللہ کے مخلوق کی شبیہیں بناتے ہیں، پس ہم نے اُس پردہ کو کاٹ کر ایک یا دو تکیہ کے غلاف بنائے، اسی بنا پر بعض فقہائے فرش وغیرہ کے لئے جہاں تصویریں پامال یا غیر محترم بالشان حالت میں رہیں، تصویر دار کپڑوں یا اشیاء کا استعمال جائز قرار دیا ہے۔

اہل عرب صرف دروازوں ہی پر نہیں بلکہ زیبائش کے لئے دیواروں پر بھی پردے لٹکاتے تھے جنھیں حائطیہ کہتے تھے۔ صاحب نفح الطیب نے ان پردوں کے نقوش کی بہت تعریف کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں دیواروں اور دروازوں پر پردے آویزاں کرنے کا رواج اہل عرب ہی سے منتقل ہوا ہے۔

خیموں میں بھی تصویریں منقوش کرنے کا رواج عہد اسلام میں پایا جاتا تھا، چنانچہ متنبی نے سیف الدولہ کے خیمہ کی تعریف میں اس کے نقوش وغیرہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ مقریزی نے بھی مصوّر خیموں کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ اُن میں سے بعض مُفَیَّل، مُسَبَّع، مُخَیَّل، مطوّس، مُطیّر ہوتے تھے (یعنی ہاتھی، درندے، گھوڑے، طاؤس اور پرندوں کی تصویریں اُن پر منقوش ہوتی تھیں) اور بعض بعض میں آدمیوں کی بھی صورتیں ہوتی تھیں۔

دیواروں کے نقش و نگار کا حال بھی ابن حمدیس، ابو الصلت اور دیگر شعراء کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ فاطمی خلیفہ آمر باحکام اللہ نے اپنے ایک قصر میں تمام شعراء کی تصاویر دیواروں پر بنوائیں اور ہر شاعر کے ایک شعر اس منظر کی تعریف میں لکھوا کر درج کرایا اور ہر تصویر کے پاس طاق میں ایک ایک تھیلی ۵۰ اشرفیوں کی سربمہر رکھوا دیں ہر شاعر آتا تھا اور اپنے حصہ کی تھیلی طاق سے اُٹھا کر لیجاتا تھا۔

جب اشرف خلیل قلعۃ الجبل پر قابض ہوا تو اُس نے اس کو بہت بلند کرایا، سپید رنگوایا، دیواروں پر تمام امراء دولت کی تصویریں بنوائیں اور قبہ کو نہایت نفیس نقش و نگار سے آراستہ کرایا۔

وزیر شمس الدین جوینی کے بیٹے شرف الدین ہارون نے جو حمام بغداد میں تیار کرایا تھا وہ اپنی آرائش کے لحاظ سے عجیب و غریب چیز تھا، اسکی دیواریں صیقل کی ہوئی تھیں، اُن پر نہایت حسین تصویریں کی گئی تھیں، فرش رنگین ٹائل کا تھا۔ تمام برتنوں پر سونے چاندی کی قلعی تھی اور بعض فواروں پر چڑیاں قائم کی گئی تھیں جن سے پانی نکلتے وقت آواز پیدا ہوتی تھی۔

ظروف وغیرہ پر بھی اہل عرب عمدہ عمدہ نقوش و تصاویر کندہ کرتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے شمعدان، فانوس، عطردان، پینے اور کھانے کے برتن وغیرہ اب بھی ایسے موجود ہیں جن سے اُن کی اس صنعت پر کافی روشنی پڑتی ہے، فسطاط کے کھنڈروں میں سے حال ہی میں بعض چینی کے

برتن نہایت صاف و رنگین دستیاب ہوئے ہیں اور ان پر انسانوں اور حیوانوں کی تصویریں منقوش ہیں۔ یہ برتن خالص عربی صنعت کے نمونے ہیں کیونکہ ان پر صناعوں کے جو نام لکھے ہوئے ہیں وہ سب مصر و شام کے ہیں۔ قاہرہ کے دار الآثار میں ایک عطردان عربی صنعت کا ایسا پایا جاتا ہے جس پر چاندی کا ملمع ہے اور ارباب نشاط کی تصویریں منقوش ہیں جو آلات موسیقی بجا رہے ہیں، ایک برتن یہاں محمد بن فضل اللہ کا بنایا ہوا ہے جس میں چڑیوں کی صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ دوسرے برتن میں ایک سوار کی تصویر ہے۔ اسی طرح اور متعدد ظروف ہیں جن پر مختلف جانوروں اور چڑیوں کی تصویریں کندہ ہیں۔ کانچ کے فانوس اور شمعدان بھی اس صنعت کے پائے جاتے ہیں اور یہ سب کے سب اہل عرب کے بنائے ہوئے ہیں۔

ناصر خسرو نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ قصر فاطمیین میں خلیفہ مستنصر کا ایک آفتابہ ہے جو خالص سونے چاندی کا ہے، اس پر چڑیوں اور شکاریوں کی نہایت نازک و پاکیزہ تصویریں منقوش ہیں، دار الآثار میں ایک لکڑی کی تختی ہے جس پر کسی طائر کی عجیب و غریب صورت کندہ ہے۔ ایک لکڑی کے دروازہ کا بھی اسی سفرنامہ میں ذکر ہے جس میں نہایت نازک تصویریں جانوروں کی کندہ کی ہوئی ہیں۔

سکوں پر بھی تصاویر کا رواج عہد اسلام میں پایا جاتا تھا۔ سیف الدولہ نے جو دینار سکوک کرائے تھے اس میں اس کا نام بھی تھا اور اس کی تصویر بھی سلطان ظاہر بیبرس نے شیر کی تصویر اپنے سکہ میں منقوش کرائی تھی۔ ترکی اور چرکسی بادشاہوں میں سے کسی نے شیر کی تصویر پسند کی، کسی نے عقاب کی اور کسی نے پھول کی۔ امراء کے لئے ان کے منصب کے لحاظ سے خاص خاص نشان ہوتے تھے، مثلاً افسر اسلحہ خانہ کا نشان تلوار اور آبدار خانہ کے افسر کا نشان پیالہ ہوا کرتا تھا۔ پتھر کی مہروں پر بھی تصویروں کے کندہ کرنے کا رواج تھا۔ چنانچہ دار الآثار میں دو نگینے ایسے ہیں جن پر شیر کی تصویر کندہ ہے اور دو تختیاں سنگ مرمر کی ایسی ہیں جن پر اڑتے ہوئے عقاب کی صورت منقوش ہے۔ ایک اور تختی ہے جس پر چار مچھلیاں بنی ہوئی ہیں، ایک ٹائل کا ٹکڑا ہے جس پر دو تلواریں ہیں اور ان پر ہلال منقوش ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد اسلام میں تمام امراء کا ایک مخصوص نشان ہوا کرتا تھا جس کو آج کل کوٹ آف آرمس (Coat of arms) کہتے ہیں اور مختلف حکومتوں نے اختیار کر رکھا ہے، اسی طرح ان کی مہریں بھی ہوتی ہیں اور ماٹو (motto) بھی ہوا کرتا ہے۔

کتابوں کے مصوّر کرنے کا رواج فارس میں بہت تھا لیکن عربوں میں بھی اس کا فقدان نہ تھا۔ چنانچہ احمد تیمور نے جن مصوّر کتابوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے بعض کا بیان دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اس نے علم قراۃ کی بعض ایسی کتابوں کو دیکھا ہے جن میں مخارج حروف بتانے کے لئے حلق، منہ اور زبان کی تصویریں بنائی گئی ہیں، اور بعض میں پورا چہرہ بھی دکھایا گیا ہے، اسی طرح بعض طب کی کتابیں ہیں جن میں آنکھ وغیرہ کی پوری تشریح تصویر کے ذریعہ سے بتائی گئی ہے۔ اور بحر العیون ایسی ہی ایک کتاب ہے جو ۱۲۷۶ھ میں مصر میں طبع ہوئی تھی۔ علم بیطرہ کی بھی بعض کتابیں ایسی نظر آئی ہیں جن میں گھوڑوں کی تصویریں ہیں اور ان کے امراض کا حال بھی تصاویر کے ذریعہ سے بتایا گیا ہے۔ علم نباتات کی بھی بعض کتابیں مصوّر تیار کی گئی تھیں، چنانچہ رشید الدین ابن الصوری کی نادر تصنیف کا ذکر عیون الانباء میں اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ کتاب اس طرح تیار کی گئی ہے کہ مولف خود ان مقامات پر جاتا تھا جہاں کوئی پودا یا دوا کا اگتا تھا، اور اس کے ساتھ ایک مصوّر ہوتا تھا جو پودے کے رنگ، پھول، پھل، کی صورت، پتیوں کی تعداد، شاخوں کی حالت کو اس وقت دیکھ دیکھ کر کاغذ پر کھینچ لیتا تھا۔ پھر یہ تصویر لیا

(اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ گلزار حوض حیدرآباد دکن میں ہے)

ایک ہی کی حالت کی نہ ہوتی تھیں، بلکہ نشو و نما کے مختلف زمانوں میں جا کر پودے اور پھول کی مختلف حالتوں کی تصویریں لی جاتی تھیں یہاں تک کہ ابتدائی نشو و نما سے لیکر اس کے مرجھانے کی حالت تک مختلف زمانوں کی کیفیت تصویر میں ضبط کرلی جاتی تھی۔

بعض ادبی کتابیں بھی (مثلاً مقامات حریری، کلیلہ دمنہ، مرزبان نامہ) رنگین و مصور تیار کی گئی تھیں۔ اسی طرح یاقوت کی معجم، تقویم ابی الفدار نخبۃ الدہر بھی مصور تیار ہوئی تھیں جن میں شہروں کے نقشے، آلات فلکی صورتیں رنگین تھیں۔

ملعبینی کی نیل الرائد، سیوطی کی کوکب الروضہ بھی رنگین تھیں جن میں دریائے نیل کا منبع اور اس کی شاخیں دکھائی گئی تھیں، اور تاریخ حجاز بھی مصور تھی، جس میں حرم اور کعبہ کا نقشہ رنگین تھا۔ مسعودی نے التنبیہ والاشراف میں ذکر کیا ہے کہ میں نے بھی بہت سی تصویریں دیکھی ہیں لیکن ہمدانیوں کے وہ نقشے عجیب و غریب ہیں جن میں تمام ممالک اور جملہ قوموں کا حال مع تمام نجوم، افلاک، دریاؤں، سمندروں، صحراؤں و شہروں کے رنگین تصویروں میں بتایا گیا ہے۔

مقدسی کی احسن التقاسیم اس طرح تیار ہوئی تھی کہ ہر ملک کے شہر اور قصبات مع ان کے حدود کے علیحدہ علیحدہ دکھائے گئے تھے، اور راستے سرخ لکیروں سے، ریگستان زرد رنگ سے، سمندر سبز رنگ سے، دریا نیلگوں رنگ سے اور پہاڑ سیاہ رنگ سے نمایاں کئے گئے تھے۔ ہیئت کی تو تقریباً تمام کتابیں تصویر دار ہوتی تھیں جن میں جملہ ثوابت و سیار کی صورتیں درج ہوتی تھیں، بعض میں آلات رصد کی صورتیں بھی منقوش کی گئی تھیں، اسی طرح ہندسہ کی کتابیں بھی نقشوں اور رسوم سے مزین ہوتی تھیں۔ اور موسیقی، علم الحیل، سپہ گری کی کتابیں بھی مصور تیار کی گئی تھیں، جن میں آلات موسیقی، آلات جر ثقیل، شمشیر زنی اور نیزہ بازی کی مختلف حالتوں کی تصویریں درج تھیں، اور علم جفر و سحر کی کتابوں میں بہت سے جانوروں، پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کی رنگین تصویریں بنائی جاتی تھیں چنانچہ ایسی کتابوں میں شیخ محمد العطار الدمشقی کی کتاب موسیقی میں، ابن رازی کی کتاب الحیل فی العلم والعمل، رضوان بن محمد کی کتاب علم الساعات، کتاب السئول والامنیۃ فی تعلیم اعمال الفروسیۃ، علم سحر میں عیون الحقائق، ابن طلحہ کی جفر صغیر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

چونکہ تصویر کی قسم میں مجسمہ سازی اور بت تراشی بھی شامل ہے اس لئے اہل عرب نے اس میں بھی کافی ترقی کی تھی۔ قبل اسلام عرب میں بت سازی کا رواج تو ان بتوں سے ظاہر ہے جو خود کعبہ کے اندر سیکڑوں کی تعداد میں پائے جاتے تھے اور بعد اسلام بھی اس فن کا رواج مختلف صورتوں سے پایا جاتا تھا۔ جن کے قصر غمدان میں شیروں کے بڑے بڑے مجسموں کا پایا جانا۔ شعراء کا عورتوں کو ہاتھی دانت کے ترشے ہوئے بتوں سے تشبیہ دینا اور بچوں کا سنگین گڑیوں سے کھیلنا اس امر کا ثبوت ہے کہ عرب میں تمثیل کا بھی رواج تھا۔

جب رسول اللہ صلعم غزوہ تبوک سے تشریف لائے اور طاق میں حضرت عائشہ کی گڑیاں رکھی ہوئی دیکھیں تو آپ نے دریافت کیا کہ "یہ کیا ہے" حضرت عائشہ نے جواب دیا "میری گڑیاں ہیں" انھیں میں ایک گھوڑا تھا جس کے دو پر تھے آپ نے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کیا آپ کو نہیں معلوم کہ سلیمان کے پاس ایک گھوڑا تھا جس کے پر تھے یہ سن کر رسول اللہ ہنس پڑے۔ اس سے نہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ بعد آغاز اسلام تماثیل کا رواج قائم رہا بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ محض لہو و لعب یا تفریح کے لئے تماثیل کا استعمال جائز ہے۔

بعض تماثیل آٹے کے بھی تیار کئے جاتے تھے، اور انھیں پکا کر تو ام میں ڈال دیتے تھے، اور کھاتے تھے، جس طرح یہاں بھی بچوں کے لئے آٹے کی چڑیاں وغیرہ بنا کر آگ میں سینک دیتے ہیں۔ بعض مٹھائیاں بھی اسی قسم کی بنائی جاتی تھیں چنانچہ ابن جبیر نے اپنے سفرنامہ میں بعض ایسی مٹھائیوں کا ذکر کیا ہے جو بالکل انسانی شکل کی بنی ہوئی تھیں اور عبید اللہ بن خلکان نے متنبی شاعر کو شکر اور لوز کی ایسی مٹھائی تحفتہً دی تھی جو بالکل مچھلی کی طرح تھی اور شہد میں ڈوبی ہوئی تھی چنانچہ اس نے اس ہدیہ کی تعریف میں متعدد شعر کہے۔ ان میں سے ایک شعر یہ ہے:۔

اقل ما فی اقلها سمک　　　بلعب فی برکتہ من العسل

کھیتوں میں بھی آدمیوں کی تماثیل قائم کی جاتی تھیں تاکہ جانور ڈر کر بھاگ جائیں۔

جب اسلام کا تمدن وسیع ہوا تو زینت قصور کے لئے تماثیل کا استعمال ہونے لگا اور سنگ مرمر، تانبہ، رانگ، اور چاندی وغیرہ کی مورتیں عجیب وغریب تفنن کے ساتھ بنائی جانے لگیں، چنانچہ متنبی نے مجلس ابن عمار کی ایک سنگین کنیز کا ذکر کیا ہے جس کے بال ایک طرف کو لٹکتے تھے، ہاتھ میں پھولوں کا ہار تھا، اور وہ ایک کمانی پر گردش کیا کرتی تھی۔

اسی طرح مہیار الدیلمی شاعر کے ایک رئیس دوست نے جو بہشت نہل حوض بنوایا تھا اور جس کی صنعت کی اس نے بہت تعریف کی ہے عجیب غریب چیز تھا۔ اس حوض کے چاروں طرف چار ستون قائم تھے جو کھوکھلے تھے۔ ان کے درمیان ایک عمود تھا اور مکان کی چھت پر ایک حوض تھا۔ اس سے یہاں پانی آتا تھا۔ کئی مجسمے تھے جو مختلف ناموں سے پکارے جاتے تھے اور عمود پر قائم کرنے سے عجیب وغریب حرکات ان سے سرزد ہوتی تھیں، ان میں سے ایک کا نام خرکاہ تھا یہ جس وقت قائم کر دیا جاتا تھا تو گردش کرنے لگتا تھا اور اس کے اوپر سے پانی بالکل اس طرح گزرتا تھا جیسے خیمہ قائم ہو گیا ہو اس کے چاروں طرف شمعیں بھی رکھدی جاتی تھیں جو ساتھ ساتھ گردش کرتی تھیں اور گل نہیں ہوتی تھیں۔ دوسرے مجسمے کا نام عروس تھا یہ عمود کے اوپر رقص کرتا تھا اور دوران رقص میں پانی اس کے سر سے پاؤں تک پہنچتا تھا، تیسرے مجسمے کا نام جمل (اونٹ) تھا اور چوتھے کو طنبلنب کہتے تھے اس کی صورت ایک تیر انداز کی تھی، اگر حاضرین میں سے اس پر کوئی شخص تیر چلاتا تو اس کے جواب میں ادھر سے پانی کی ایک دھار چلتی اور بھگو دیتی۔

سدید الدین شیبانی کے پاس ایک پیالہ تھا جس کے درمیان میں ایک چڑیا قائم تھی جب پانی اس پیالہ میں ڈالا جاتا تو وہ ناچنے لگتی اور بولنے لگتی۔ نعیمی نے تنبیہ الطالب والدارس میں دمشق کے جامع اموی کی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے جس میں مجسمے عجیب وغریب حرکتیں کرتے تھے اس نے بیان کیا ہے کہ اس گھڑی میں چند چڑیاں، ایک سانپ اور کوا تانبے کے بنے ہوئے موجود تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تو سانپ نکلتا، چڑیاں بولنے لگتیں، اور کوا چیخنے لگتا۔

ابن جبیر نے باب جیرون کی گھڑی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس میں تانبہ کے دو باز تھے جب گھنٹہ ختم ہوتا تھا تو ان کے منہ سے دو چھلے پیدا ہو کر بجنے لگتے تھے۔

سخاوی نے سنہ ۸۲۵ھ کے حوادث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اسکندریہ سے کچھ تیر انداز آئے ان کے ساتھ لکڑی کی بنی ہوئی ایک عمارت قلعہ کی صورت کی بھی تھی، بادشاہ کے سامنے آ کر انہوں نے اس پر تیر اندازی کی تو قلعہ کے اندر سے ایک آدمی نکلا جو تلوار اور ڈھال لئے ہوئے تھا۔

بادشاہ نے اُن کو بہت انعام دیا اور رخصت کر دیا۔

یمن کے بادشاہ نے سلطان الکامل ایوبی کے پاس ایک شمعدان تحفۃً بھیجا جو تانبہ کا بنا ہوا تھا، فجر کے وقت اُس کے اندر سے تانبے کی ایک مورت پیدا ہو کر سیٹی بجاتی تھی، کہا جاتا ہے کہ یہ شمعدان ناصر محمد بن قلاوون کے زمانہ تک خزانہ شاہی میں موجود تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف مورتیں ہی تیار نہ کرتے تھے، بلکہ پانی، کلیوں، اور ہوا کے ذریعہ سے وہ اُن میں عجیب و غریب نغمے بھی پیدا کرتے تھے۔

مقریزی نے ذکر کیا ہے کہ باب صلاۃ پر جہاں سے احمد بن طولون نکل کر مسجد میں جایا کرتا تھا دو بڑے بڑے عجیب شیروں کے تماثیل قائم تھے۔ عنبری مورتیں خزانہ شاہی میں ۲۲ ہزار کے قریب تھیں، جن میں چھوٹے سے چھوٹا مجسمہ ۱۲ سیر کا تھا۔ طاؤس کی تمثال کا حال لکھا ہے کہ خالص سونے کا تھا اور بسم میں قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے آنکھیں یاقوت کی تھیں، اسی طرح مرغ اور ہرن کی تمثالیں تھیں۔ ایک باغ کی بھی مصنوعی نقل تھی جس کی زمین عود کی تھی اور درختوں کے پھل عنبر کے یہ بھی بالکل سونے چاندی کے کام سے لدا ہوا تھا۔ کشتیوں کے اگلے حصہ کو بھی مختلف حیوانوں کی صورت پر بنانے کا کثرت سے رواج تھا۔

اندلس کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں تصاویر و تماثیل کا کثرت سے رواج تھا اور عجیب و غریب اختراع و تفنن سے کام لیا جاتا تھا، صاحب نفح الطیب نے سلطان تلمسان ابی حمو کی ایک گھڑی کا ذکر کیا ہے کہ اس میں چھوٹے چھوٹے دریچے تھے اور جب گھنٹہ بجتا تھا تو اس سے متعلق دریچہ کھلتا تھا اور ایک حسین کنیز نکلتی تھی جس کے ہاتھ میں ایک رقعہ ہوتا تھا اور اس پر وقت درج ہوتا تھا۔ کنیز اس رقعہ کو بادشاہ کے ہاتھ پر نہایت نزاکت سے رکھ دیتی تھی۔

یہ تھا مختصر بیان اہل عرب کی صرف مصوری و تمثیل سازی کا جس کا تعلق فنون لطیفہ کے دیگر اصناف سے نہیں ہے حالانکہ ان میں بھی اُن کی ترقی اسی قدر حیرت انگیز تھی۔ حدادی۔ نجاری، پارچہ بافی اور آلات سازی میں بھی اُن کے کارنامے نہایت عجیب و غریب ہیں اور فن تعمیر کو تو انہوں نے اس قدر مکمل طور پر اختیار کر لیا تھا کہ مشکل سے اس کی نظیر مل سکتی ہے۔
موسیقی دانی کے افسانے اُن کے مشہور ہی ہیں یہاں تک کہ بیس جلد کی ایک کتاب اغانی ساری کی ساری اس فن کی تاریخ سے بحث کرتی ہے۔

غزل

مانا کہ ہزار بے وفا ہے   آخر مرے دل کا مدعا ہے

اللہ رے نت نئی ادائیں   ہر ٹیس میں اک نیا مزا ہے

ہنگامۂ شوق کی نشانی   باقی بھی جانِ مبتلا ہے

لو ترک جفا کی اُن کو سوجھی   یعنی جفا بھی ناروا ہے

مجنوں اسے آج تک نہ سمجھے
بیگانہ نما وہ آشنا ہے

مجنوں گورکھپوری

سرگزشت اشرف خاں

(ڈراما)

اشخاصِ ڈرامہ

اشرف خاں	حاکم	میرزا اطرار خاں	متوفی
کریم آقا	خواہر زادہ	میرزا عبدالرحیم	محرر
قربان بیگ	ناظر	اللہ داد	فراش شخص اول
حسن بیگ	فراش خلوت	فراشانِ شاہی	
شخص اول		نائب کدخدا	

ایکٹ پہلا

(اشرف خاں ۱۲۲۳ھ کے اخیر میں پایۂ تخت آتا ہے، اور دربار ہمایونی سے مشرف ہوکر شخص اول کے پاس آتا ہے اور پھر قیام گاہ کو واپس ہوکر رات میں کریم آقا سے گفتگو کرتا ہے - - - - - - - -)

اشرف خاں — "آج کا دن شخص اول کی فرمایشوں اور اطرار خاں کے اشاروں سے محفوظ رہا"

کریم آقا — ہاں آج پہلا دن تھا تحفے تحائف اور پیشکش کا خیال باعث التفات ہوا۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

(قربان بیگ ناظر، کمرے میں آکر سلام کرتا ہے)

قربان بیگ — "سرکار یہ پایۂ تخت ہے اور یہاں بے انتہا گرانی ہے، کارخانہ، قہوہ خانہ، طویلہ وغیرہ کے اخراجات برآورد کرکے ایک مہینہ کا سامان خرید لینا چاہیے۔"

اشرف خاں — "حتیاطاً ایک مہینہ کی برآورد بناکر پیش کردیں، یہاں ایک مہینے سے زیادہ نہ ٹھیروں گا"

قربان بیگ — (دبی زبان سے گویا واپس بھی ہوگئے) "سرکار یہ پایۂ تخت ہے آپ یہ کیا فرماتے ہیں اگر چار مہینے میں بھی آپکو حساب کتاب سے ہو جائیں تو بھی غنیمت جانیے، ایک مہینہ کیا چیز ہے، ایک مہینے میں تو مراسلہ کا جواب بھی نہیں ملتا۔

کریم آقا — "ناظر! صحیح کہتے ہو، واقعی یہ بہت مشکل ہے۔"

اشرف خاں "جلد حساب سمجھا دینا چاہیے، اور قبل اس کے بے رخی کی جائے اُن کا منہ بند کردیا جائیگا"

کریم آقا — "صحیح ارشاد ہوا، ابھی حکم دیتے ہیں کہ کل صبح سب تیار ہو جائے۔

شخص اوّل — اچھا جلد حساب سمجھا دو اور معروضہ لکھکر لا دو۔

اشرف خاں — میری بھی یہی خواہش ہے کہ حساب سمجھا کر جلد واپس جاؤں ممکن ہے کہ میرے واپس ہونے تک سرحد پر کوئی فساد برپا ہو

شخص اوّل — (میرزا اطرار خاں سے) اطرار خاں! دو تین دن میں عربستان کا حساب دیکھ لو اور ہر طرح اطمینان کر لو، شہنشاہ کا حکم ہے کہ زیادہ دن نہ لگیں۔

اطرار خاں — بسر و چشم، میں پہلے اشرف خاں سے تفصیلی گفتگو کئے لیتا ہوں پھر تنقیح کرونگا۔

شخص اوّل — اچھا، مگر ضرور آنا۔

(اشرف خاں سلام کرکے باہر آتا ہے اور دو آدمی دوڑتے ہوئے آکر اس سے انعام مانگنے لگتے ہیں)

اشرف — ہاں۔۔۔ مگر۔۔۔ میں۔۔۔ تم کو۔۔۔

— — — سرکار ہم قہوہ چی ہیں کئی دفعہ آپ ہمارے ہاتھ کی چائے پی چکے ہیں۔

(اشرف خاں آگے بڑھتا ہے مگر فراشوں کا غول اسے گھیر لیتا ہے)

فراشان — خدا آپ کا سایہ ہمارے سر پر قائم رکھے ہمارا انعام لیتے آئے

اشرف خاں — اچھا تم بھی کل آجانا اور ساڑھے پانچ تومان لے لینا (جلدی گاڑی میں سوار ہوکر مکان پہنچ جاتا ہے) کریم آقا! ادھر آؤ تمھیں ایک دلچسپ قصہ سناؤں، آخر یہ کیا غضب ہے سمجھ میں نہیں آتا، وزیر سلطنت کا مکان اور رشوت کی اس قدر گرم بازاری، وزیر سے لیکر نوکر تک پیسے کے طالب، یہ تو کہا ہی نہیں کہ نہ جانے اللہ داد فراش حرامزادہ اور کیا کرتا ہے آج تو اس نے بہت ذلیل کیا، مجھے تو اس مکان پر جانے سے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ جیل خانہ چلا جاؤں۔

کریم — میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ عربستان نہیں ہے جو آپ حکومت کرسکیں یہ پایہ تخت ہے ایسے اتفاقات ہوتے ہی ہیں حوصلہ کرنا چاہئے تین تومان اللہ داد کو بھی بھیج دیجئے۔

(کریم آقا فراش کو بلا کر حکم دیتا ہے کہ تین تومان اللہ داد کو بھی دے آئے) (ایک فراش مٹھائی کی ٹوکری اور گلدستہ لاتا ہے)

اشرف — "یہ کیا ہے"

فراش — پیش خدمت باشی نے سرکار کی خدمت میں تحفہ بھجوایا ہے

اشرف — (غصہ سے) بہت بہتر وہیں کھڑے رہو (کریم آقا کو بلا کر کہتا ہے) اس پیش خدمت باشی سے مجھ سے کیا تعلق جو میرے پاس مٹھائی بھیج رہا ہے یہ طریقے مجھے پسند نہیں میں ایسی حکومت نہیں چاہتا!

کریم — ہاں آپ کو ان سے تعلق نہیں، مگر ان کو آپ سے تعلق ہے حوصلہ کیجئے تنگدل نہ ہونا چاہئے دس تومان انہیں بھی دلوا دیجئے۔ ([illegible] کرتا ہے)

ایکٹ دوسرا

(اشرف خاں اور کریم آقا شخص اول کے پاس جاتے ہیں، ابھی وہ سیڑھیاں بھی چڑھنے نہیں پاتے کہ اللہ داد فراش دوڑتا ہوا آتا ہے اور جھک کر سلام کرکے کہتا ہے، سرکار! معاف فرمایئے کل میں نے بیجا نہیں گستاخی ہوگئی خانہ زاد ہوں (اشرف خاں سر ہلاتا ہوا دروازہ پر پہنچ جاتا ہے اور شخص اول کو آداب بجا لاتا ہے)

شخص اول — کل رات حضور سے تمہارا تذکرہ رہا، ارشاد ہوا ہے کہ حساب لیکر جلد واپس کردو۔

اشرف خاں — میری بھی یہی آرزو ہے، مگر یہ اطرار خاں کے ہاتھ میں ہے جب چاہیں اجازت دیں۔

شخص اول — (اطرار خاں سے) یقین ہے کہ تم اب تک اشرف خاں سے

سے بھی نہ ہوں گے۔

اطرار ——— مجھے سرکار کی خدمت سے فرصت ہی نہیں ہوئی "

تحصیلدار ——— ابھی اشرف خاں سے مل کر حساب دیکھ لو اور حضور کی

فرمائشات سمجھا دو۔

اطرار ——— بہتر، (دونوں اٹھکر برآمدے میں آجاتے ہیں اور گفتگو

شروع ہوتے ہی یکایک شور وغوغا بلند ہوتا ہے۔)

اشرف ——— کوئی ہے؟ یہ کیا؟ آدمی ہیں یا جنات تو کرو،

فراش ——— حضور! فیل بان ہاتھی، اور شتربان اونٹ لائے ہیں۔

اشرف ——— کیوں؟

اطرار ——— یہ ایک رسم ہے ایسا ہی کیا جاتا ہے،

اشرف ——— (اطرار خاں کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکتا مگر دل ہی اندر خوب پیچ و تاب کھاتا ہے، اور پھر حسن سے کہتا ہے) حسن! انہیں تین تومان دیکر رخصت کردو،

اطرار ——— خان! انشاء اللہ حساب کل سمجھا جائیگا مگر فی الحال گیارہ ہزار تومان نقد اور دوسری پیشکش کی چیزیں مہیا کردو اور خلعت حکومت حاصل کرلو، ممکن ہے کہ کوئی اور مدعی پیدا ہوجائے، اور اس سے زیادہ پیش کش داخل کرے، اس لئے جلدی کرنی چاہئے

- - - - سرکار کا نذرانہ - - - - - - ہاں - - نگر - - - -

میں بھی توقع اور تمنا میں - - - - - - ہاں - - - - - - -

اشرف ——— آقاجان! آپ مہربانی کرکے حساب تو دیکھ لیجئے اور مجھے اس مخمصہ سے نجات دلوائیے، میں ہر طرح خدمت کے لئے حاضر ہوں

اطرار ——— آپ مطمئن رہیئے انشاء اللہ کل صبح حسب دلخواہ کام ہو جائیگا اور آپ کو اطمینان کے ساتھ واپس کردوں گا، مگر میرا بھی ایک کام ہے، یعنی آپ کا شریک حکومت جان محمد خاں قریۂ اشرف پر مظالم کر رہا ہے، اگر وہ قریہ میرے نام باضابطہ واگزاشت فرما دیجئے تو مہربانی،

اشرف ——— جی بہت خوب میری جان، مال آپکے لئے ہے اور بھی کچھ فرمایئے،

اطرار ——— (کھڑا ہوکر) علی الحساب لطف شما زیاد (مرزا اطرار کے جاتے ہی چندرہ نفر فراش اور ایک نائب داخل ہوتے ہیں)

- - - - سلام علیکم! سرکار کو تشریف لائے اتنے دن گزر گئے تا فراشوں کو انعام مرحمت نہ ہوا! آخر ہم بھی تو پایہ تخت ہی کے فراش ہیں۔

اشرف ——— (لا الہ الا اللہ خدا وندا! میں نے کیا غلطی کی۔ آواز دیتا ہے) کوئی ہے؟

(اشرف خاں رات بہت پریشانی سے بسر کرتا ہے، خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ گھر سے نکل رہا ہے اور سات آٹھ بڑے بڑے کالے ناگ اس کے پاؤں کے نیچے سے نکل کر حملہ کرتے ہیں، اشرف خاں خوف سے چیخ کر بیدار ہوتا ہے، صبح خواب ہی کے خیال میں خلوت سے باہر آتا ہے اور کریم آقا کو بلاکر خواب بیان کرتا ہے کہ یکایک اس کی نظر دیوان خانہ میں پہنچتی ہے جہاں پندرہ نفر شاہی جلاد قرمزی رنگ کی وردی پہنے چوڑے چوڑے تیغے تھامے میرغضب (افسر جلادان) کے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں۔ جلادوں کی پرہیبت شکل دیکھکر اس کے رہے سہے اوسان خطا ہوجاتے ہیں اعضا میں تشنج پیدا ہوتا ہے رگیں اکڑ جاتی ہیں آنتیں پیچ و تاب کھانے لگتی ہیں اور بالآخر بیہوش ہو کر گر جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد فراش بیت الخلا میں آفتابہ رکھکر خلوت کے دروازہ پر آکر آواز دیتا ہے کہ آفتابہ حاضر ہے)

اشرف ——— ح، ح، ح - - - حسن!

حسن ——— (باہر سے) حضور

اشرف ——— جلد ایک گھوڑا زین لگا کر لاؤ میں شہزادہ عبدالعظیم کے

پاس جاؤں گا، ایک پاجامہ تھا، وہ بھی خراب ہو گیا۔ آ ۔ ۔
(حسن گھوڑا تیار کر کے دروازے پر کھڑا ۔۔۔ اور خود آکر آواز دیتا ہے گھوڑا حاضر ہے) (اشرف خاں اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے کمزوری سے پاؤں تھراتے ہیں اور یہ گر کر بیہوش ہو جاتا ہے حسن اُن کے گرنے کی آواز سُن کر کریم آقا کے پاس جاتا ہے)

حسن — آقا آیئے آیئے آہ گھبرا گیا خان غش کر گئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کریم — آخر غش کس طرح آیا،

حسن — آپ کے جانے کے بعد اُن قرمساقوں کو دیکھ کر اندر چلے گئے پھر مجھے بلا کر گھوڑا تیار کرنے کہا خود ۔۔ نعیلم کے پاس جانے والے تھے اللہ ۔۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کریم — یقیناً وہ جلادوں کو دیکھ کر ڈر گئے آخر تمہیں کہو جلادوں کو کاہے کا انعام ملے گا۔

(کریم آقا آ کر اشرف خاں کے تلوے سہلاتا ہے، اشرف آنکھیں کھول کر اشارہ کرتا ہے کہ جلاد اس کمرے میں ہیں)

کریم — واللہ آپ کس قدر بزدل ہیں یہ بدسوختہ فراشوں کو انعام ملنے کی خبر سُنکر آئے تھے

اشرف — (لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے) آخ ۔ ۔ خواب ۔ ۔ ۔ سانپ ۔ ۔ ۔ ۔ خواب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ،

(کریم آقا اشرف خاں کو اٹھا کر بٹھاتا ہے اور اس کے ہوش بجا ہونے کے بعد باہر آکر جلادوں کو دس تومان دیکر روانہ کرتا ہے وہ ابھی دروازے سے باہر بھی نہیں ہوتے کہ دو جوان بلند و بالا نقرئی عصا ہاتھ میں لئے داخل ہوتے ہیں)

۔ ۔ ۔ سرکار سلام علیکم! کیا چوبدار جلادوں سے بھی گئے گزرے ہیں۔ انہیں تو انعام ملے اور ہم منہ تکا کریں، ہم اس نوکری سے تنگ آگئے یہ کیا طریقہ ہے، آخر آپ کل دربار میں ۔۔۔ آئیں گے

اشرف — ۔ ۔ ۔ نامیں کس کس کو دوں آخر میرے پاس خزانہ تو نہیں ہے جو تقسیم کرتا رہوں، جو کچھ میرے پاس تھا تم لوگوں نے لُٹ لیا، انعام بھی مانگتے ہو، ڈراتے بھی ہو، صلواتیں بھی سناتے ہو عجیب دل لگی ہے۔

چوبدار — سرکار آپکی جوتیوں کے صدقے ہزاروں کی پرورش ہوتی ہے۔

اشرف — (دل ہی دل میں، خدا انہیں غارت کرے دو جلاد بدتمام، دو تب یہ چھوٹے) اچھا انہیں پانچ تومان دیدو۔

چوبدار — (انعام لے کر جاتے ہیں اور اشرف خاں ناشتہ کرنے بیٹھتا ہے کہ چالیس نفر عجیب الہئیت لانبی لانبی لکڑیاں ہاتوں میں لئے بے ترتیب پگڑیاں باندھے ہوئے آتے ہیں)

۔ ۔ ۔ خدا سرکار کو سلامت رکھے ہم ہی تو سرکار کے نوکر ہیں دن رات گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں،

اشرف — (کریم آقا سے) واللہ ان کا مجھپر کیا حق ہے؟

کریم — واللہ اعلم انہیں "ریگا" کہتے ہیں یہ شہر کی گلیوں میں پھرتے ہیں،

اشرف — (ناشتہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے) کریم آقا! اب حوصلہ باقی نہیں رہا، مرشد کی قسم مجھے حکومت کی ضرورت نہیں، یہ حکومت نہیں بلکہ قرمساقی ہے، کچھ بھی کیوں نہ ہو کل تو میں نہ ٹھیرونگا اللہ اللہ کیا ملک ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(کریم آقا باہر آتا ہے اور تین تومان اُن وحشیوں کو دیکر ٹالتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ تیسرا

(ناظر خاں حساب دیکھکر دو ہزار تومان اشرف خاں کے ذمہ پاتا ہے

گہ اس پر بتیس ہزار تومان مد نکال کر اپنے آقا کے پاس لیجاتا ہے)

اطرار —— اشرف خاں کے دو ہزار تومان فاضل نکلتے ہیں مگر میں نے خیر خواہی سے بتیس ہزار تومان بد نکالے ہیں تاکہ وہ خاطر خواہ سرکار کی خدمت کر سکیے۔

شخص اول —— تیری نمک حلالی اور خیر خواہی سرکار پر روشن ہے کاش شہنشاہ تجھ جیسے اور دو چار نوکر رکھتا! (فراش سے کہتا ہے) اشرف خاں حاکم عربستان کو بلاؤ۔

فراش —— (دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوا اشرف خاں کے پاس جاکر کہتا ہے) آپ کو سرکار نے یاد فرمایا ہے،

اشرف —— آخر کیوں؟ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے،

فراش —— میں سرکار کے دل میں تو نہیں رہتا جو اُن کے جی کی بات بتلادوں،

اشرف —— تم بہت اچھے آدمی ہو، میں جب سے طہران آیا ہوں تمہیں پہچانتا ہوں انشاءاللہ جاتے وقت - - - - - - ہاں تو سرکار کے پاس کون کون تھے؟

فراش —— (بکمال ادب) صرف اطرار خاں بیٹھے تھے،

(اشرف خاں دل ہی دل میں فراش کو گالیاں دیتا ہوا اُس کے ساتھ ہو جاتا ہے)

فراش —— (راستہ چلتے ہوئے) سرکار نے مجھے آپ کے پاس بھیجا، اور ناشتہ کا وقت گزر گیا، اب تو ناشتہ بھی تقسیم ہو چکا ہوگا،

(اشرف خاں جیب سے ایک تومان نکال کر فراش کو دیتا ہے اور خود شخص اوّل کے کمرے میں جاتا ہے۔

شخص اول —— (غصہ کی مورت بنائے ہوئے فرد حساب سامنے رکھے بیٹھا ہے، اشرف خاں سلام کرتا ہے اور اطرار خاں شخص اول کی طرف مخاطب ہو کر کہتا ہے: "اشرف خاں حاضر ہیں" شخص اول سر اٹھا کر کہتا ہے) آہا! دیکھو یہ حساب ہے! معلوم نہیں یہ فرد کتنوں کا نقصان کرائیگی،

اشرف —— (پینتیس ہزار تومان بد دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے) ہاں مگر میں نہیں سمجھتا کہ اس قدر رقم کیونکر فاضل ہے - - - - - -،

شخص اول —— میرزا اطرار خاں حساب میں بے نظیر ہے اس نے بڑی محنت سے جانچا ہے۔

اشرف —— (لرزتا ہوا کان کے پاس ہاتھ لیجا کر) سرکار! خدا کے بعد آپ ہی کی ذات ہمایوں ہمارے واسطے باعث نجات ہے، حضرت نہ تو میرے پاس پینتیس ہزار تومان ہیں اور نہ میں یہاں سے جا سکتا ہوں - - - - - - - -،

شخص اول —— میرے خیال میں تنقیح بالکل صحیح ہے مگر احتیاطاً ایک مرتبہ اور دیکھو، (اطرار خاں سے) ذرا اشرف خاں کو بھی حساب سمجھا دو اور پھر آکر کہو - - - - - - - -،

(اشرف خاں اور اطرار خاں باہر آکر ایک دوسرے کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں)

اشرف —— آقا جان! یہ کیا ہو گیا دو ہزار میرے ہی فاضل تھے یہ پینتیس ہزار بد کیسے؟

اطرار —— بھئی یہ حساب ہے، تمہارے فاضل کیسے؟

اشرف —— (ہونٹ منہ خشک ہو جاتے ہیں) خان جان! میں حساب وغیرہ نہیں جانتا، میرا حساب تمہاری مہربانی ہے، جس طرح چاہو کر دو میں تمہاری خدمت - - - - - - -

اطرار —— آقائے من! جب تم بر سر حکومت رہتے ہو تو ہمیں بھلا دیتے ہو میں نے تم کو تین بار لکھا مگر تم نے جواب ہی نہ دیا آخر اتنی بھی بے اعتنائی! انشاءاللہ!!

اشرف —— قصور ہو گیا معذرت کے لئے بھی میرے پاس زبان نہیں، انشاءاللہ پھر کبھی ایسا نہ ہوگا، مگر اس وقت تو یہ بلا ٹال دیجئے،

اطرار — مہربانی کرکے آج ہی رات کو دو ہزار اشرفی سرکار کو بھیج دو اور قریۂ اشرف آباد جس کا میں نے کل تذکرہ کیا تھا میرے نام لکھدو جب تک تم عربستان پر حکومت کرتے رہوگے میں قابض رہونگا جب تم واپس آجاؤ تو لے لینا۔

اشرف — آہ! آقا جان! اشرف آباد لکھدیتا ہوں مگر دو ہزار بہت ہیں خدا کے واسطے کچھ کم کیجیے۔

اطرار — آجکل سرکار کا ہاتھ بہت تنگ ہے، روپیہ کی ضرورت ہے آخر وزارت کے اخراجات ہیں اچھا تمہاری خاطر پانسو کم کرتا ہوں ڈیڑھ ہزار بھجوا دو۔

اشرف — اچھا ڈیڑھ ہزار اور اشرف آباد حاضر ہیں بشرطیکہ تم میرا حساب اور فرمانِ حکومت تیار کرکے بھجوا دو۔

اطرار — اس سے مطمئن رہو۔

اشرف — میں جاتا ہوں مگر کہیں پھر بے مہربانی نہ کر بیٹھنا۔

اطرار — اطمینان سے جاؤ بخدا میں تمہارے خلاف نہیں ہوں۔

اشرف — (راستہ سے کہتا ہوا جاتا ہے) یا خدا! اگر یہ روپیہ میں خود رکھکر حکومت چھوڑ دیتا تو کیا بُرا تھا، کس قدر اطمینان سے زندگی بسر ہوتی (کریم آقا سے) کریم آقا آہ ان ظالموں نے کچھ نہ چھوڑا، اشرف آباد ہاتھ سے گیا۔ ظالم نے پینتیس ہزار تومان بدر نکالے ہزار طریقوں سے سمجھایا مگر ڈیڑھ ہزار اور اشرف آباد سے کم پر راضی نہوا معلوم نہیں ابھی کن بلاؤں سے دوچار ہونا ہے۔

کریم — ہاں کسی نے غلط نہیں کہا ہے ؎

یا مکن با فیل باناں دوستی
یا بنا کن خانۂ درخورد پیل

اشرف — اچھا یہ اشرف آباد کا کاغذ اور ڈیڑھ ہزار اشرفی لیجا کر دو اور کہو اب تم جانو اور تم سے خدا سمجھے۔

(کریم آقا کاغذ اور اشرفیاں اطرار خاں کو دے آتا ہے، اطرار خاں اشرفیاں لیکے آقا کے حوالے کرتا ہے اور فرمانِ حکومت پر مُہر کردیتا ہے اور خلعت بھی تیار کرتا ہے ------ اشرف خاں تین روز تک انتظار کرکے ایک رقعہ اطرار خاں کو لکھتا ہے)

فراش — (رقعہ لیکر اطرار خاں کے گھر پر آتا ہے اور ایک شاگرد پیشہ کو بلا کر کہتا ہے) آقا زادے! یہ رقعہ اطرار خاں کو دیکر اس کا جواب لادو۔

شاگرد پیشہ — بابا! مجھے کام بہت ہے خان خود ہی آتے ہیں تم ہی دیدو (فراش رقعہ پر ایک تومان رکھکر شاگرد پیشہ کی نذر کرتا ہے)

(شاگرد پیشہ رقعہ لیجا کر اطرار خاں کو دیتا ہے اور وہ جواب لکھتا ہے کہ عبدالرحیم کاغذات اور خلعت لے آئیگا ---------

(اشرف خاں ابھی جواب پڑھتا ہی رہتا ہے کہ عبدالرحیم آتا ہے)

عبدالرحیم — (کاغذات وغیرہ زور سے پٹک کر) سرکار خان! آخر اس کارگزاری کا کوئی صلہ بھی ہے، آپ کے سر کی قسم آج ایک ہفتہ ہوا سر جھکائے ہوئے برابر لکھ رہا ہوں، اب تو آنکھیں جواب دے چکیں۔

اشرف — ہر زحمت کے بعد نعمت ہے۔

عبدالرحیم — مگر میری زحمت کم از کم ایک صافہ شال اور اٹھارہ تومان تو ضرور دلائے گی۔

اشرف — میرزا جان! ذرا غور تو کیجیے کہ میں اس سفر میں کس قدر زیر بار ہوا ہوں، یہ پندرہ تومان آپ کی نذر ہیں، انشاء اللہ روانگی کے وقت اور گزرانوں گا۔

عبدالرحیم — خیر میں صرف دعاگو ہوں یہ کاغذات اور روپیہ جنود دیجیے (عبدالرحیم جاتا ہے)

اشرف — آقا میرزا عبدالرحیم! ادھر آئیے میں آپکو رنجیدہ کرنا نہیں

چاہتا یہ پانچ تومان اور حاضر ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

ایکٹ چوتھا

(اشرف خاں کاغذات لیکر خوش خوش بیٹھا ہے کہ اطوار خاں آتا ہے)

اطوار ——— مبارک باشد! آج سرکار سے بادشاہ سلامت نے تمہاری بہت تعریف کی اور فرمایا ہے کہ آئندہ ہفتہ تک اسے رخصت کر دو۔

اشرف ——— (آہستہ! ابھی مجھے یہاں رکھنا چاہتے ہو) سرکار اور آپ دونوں مجھپر نظر عنایت رکھتے ہیں مگر میں بہت جلد جانا چاہتا ہوں۔

اطوار ——— تو پھر کاغذات وغیرہ بھیجد یجیے تاکہ فرمان و خلعت ملجائے

اشرف ——— میں اس سفر میں آپکی مہربانیوں سے بہت خوش رہا اور کیا کیا چیزیں روانہ کی جائیں میں آپ ہی کو دیتا ہوں آپ خود ہی انتظام کر دیجیے۔

اطوار ——— نہیں نہیں جن جن کو دینا ہے آپ دیدیجیے میں تقدیم کو نکے نام لکھوا دیتا ہوں۔

اشرف ——— آپ جس طرح فرمائیے مگر کن کن کو دینا ہوگا۔؟

اطوار ——— چھ ہزار تومان داخل خزانہ ہونگے اور تین ہزار تومان ہمارے آقا کی نذر کیونکہ وہ آپ پر بے انتہا مہربان ہیں اور کیا کہوں خدا کی قسم مجھے آپ سے بے انتہا انس ہے۔

اشرف ——— (دل میں خدا تجھ سے سمجھے) بہت اچھا آج رات کو روانہ کرتا ہوں مگر فرمان!

اطوار ——— فرمان آسان چیز نہیں ہے میں خود پچاس تومان دیکر فرمان لے لوں گا، بہت ہی خوشخط لکھوا دونگا، ایک سو تومان رسوم فرمان اور بیس تومان خرچہ مہر۔ آپ اطمینان رکھیے میں سب کچھ کر لوں گا مجھ جیسا دوست جسکے پاس ہو اُسکو کیا فکر،

(اشرف خاں اطوار خاں کی طرف غصہ سے دیکھکر دل ہی دل میں کہتا ہے، دیکھیے تیرے پیچھے تو رہے انشاء اللہ تو عنقریب اس دہکتی ہوئی آگ میں گریگا، آہ، دو سو تومان، سو تومان، پچاس تومان، دس تومان، آہ وہ بھی پول نہیں تو اور، اسد اللہ کیا جلد جلد گن رہا ہے دو سو تومان! ایک سو تومان! اچھا اب جو چاہو وصول کر لو میں تمہارے ہاتھ میں ہوں)

اطوار ——— (اشرف خاں کے گلے میں ہاتھ ڈالکر) آہ مجھے تم سے اسقدر محبت کیوں ہوگئی، تمہاری رخصت کے نام سے مجھ پر ناگوار اثر ہوتا ہے، معلوم نہیں تمہاری جدائی میں میرا کیا حال ہوگا!

اشرف ——— (دل میں واللہ تو تو اشرفیوں کی جھنکار پر مرا ہوا ہے مجھ سے کیسی محبت) زندگی اور تندرستی چاہیے پھر ہم میں اور تم، (فراش آتا ہے اور سلام کرکے کہتا ہے خان! بسم اللہ خلعت شاہی کا استقبال کیجیے اشرف خاں اٹھکر نعمت والان تک خلعت کا استقبال کرتا ہے اور دونوں ہاتھوں سے کشتی لیکر سر پر رکھتا ہے)

اطوار ——— مبارک باشد، ابھی وقت پہن لو،

اشرف ——— (خلعت پہن کر) واہ، دامن تو گھٹنوں سے اونچا ہے الہ داد بیگ کے قد سے بھی چھوٹا، آستینوں کو کیا کہوں یہ تو وزیر کی ہمت سے بھی زیادہ پست ہیں، واہ واہ اشرف خاں پر یہ خلعت کس قدر زیب دیتی ہے۔ یہ جبہ شاہی "صندوق خانہ" سے نہیں بلکہ کسی تعزیہ خانہ سے لایا گیا ہے، کبھی نے ایسی خلعت نہیں دیکھی ہوگی،

اطوار ——— خان! یہ کیا کہتے ہو، کل رات میں نے خود جبہ کی قیمت اٹھارہ تومان لکھی ہے،

اشرف ——— حقیقت یہ ہے کہ یہ جبہ مجھے پسند نہیں بہتر تو یہ تھا کہ ایک پاجامہ دیدیا ہوتا،

اطوار ——— میں ابھی لکھتا ہوں کہ اسکے بدلے ایک عمدہ قبا روانہ کریں

(اطرار خاں جاتا ہے)

اشرف — (کریم آقا سے) تم نے وزارت کے تماشے دیکھے یہ ہیں وہ نمکحرام جو ہزاروں نذرانہ میں سیکڑوں رشوت میں کھا جاتے ہیں یہ اطرار پدرسوختہ میری طرفداری بھی کرتا ہے، آہ میں کہاں جاؤں کیا کروں،

کریم آقا — عربستان کو جاؤ اور حکومت کرو۔

اشرف — کریم آقا! تمہیں دل لگی سوجھی ہے،

کریم — دل لگی کیا؟ یہ لوگ ہمیں سبق دیتے ہیں کہ ہم بھی رعایا کو اسی طرح لوٹیں (ایک شخص دوڑتا ہوا آکر سلام کرکے کہتا ہے)

— — — مبارک باشد، آج آقا نے مکان میں لڑکا تولد ہوا،

اشرف — لاحول ولا قوت الا باللہ۔ بابا! اگر تیرے آقا کی بی بی جنی تو مجھے کیا، خدارا، اے مسلمانو، دنیا میں تو روپیہ لینے کے سوا تمہیں اور کوئی بات بھی آتی ہے؟

وہی فراش — خان آپ کو نہیں معلوم آج تو ایران کے امرا ہزاروں تومان لٹا دیں گے یہ تو یہاں کی رسم ہے۔

اشرف — تیری رسم کو غسال لیجائیں، (ایک تومان پھینکدیتا ہے)

فراش — سرکار! گھر سے یہاں تک دوڑتا ہوا آیا ہوں، کیا ایک ہی تومان؟

اشرف — خدا کرے تو یونہی دوڑتا پھرے،

فراش — سرکار! خدا کی قسم میری بیوی مختار کو مژدہ دینے گئی تھی اس نے پانچ تومان دیے،

(اطرار خاں فرمان اور خلعت لاتا ہے)

اطرار — اشرف خاں! یہ فرمان اور خلعت شہنشاہ نے اپنے ہاتھ سے عنایت فرمایا ہے اور اجازت دی ہے کہ کل چلے جاؤ۔

اشرف — اگر تم مجھ پر مہربانی کرو تو میں کل ضرور چلا جاؤں گا، مگر تم جانے بھی تو دو،

اطرار — سب لوگوں کا معمول دیدو اور جب چاہو چلے جاؤ،

اشرف — ان معمولات کا خانہ خراب ہو آخر یہ کبھی ختم بھی ہونگے،

اطرار — اجی کل عربستان جاؤ گے ایک اک کے دس، دس وصول کرلینا!

اشرف — اچھا جو چاہو لیلو، مگر میرا پیچھا چھوڑ دو،

اطرار — اچھا لکھو،

(اطرار خاں بتاتا ہے اور اشرف خاں لکھتا جاتا ہے)

ملازمین - - - - - - تیس تومان

فراشان خلوت - - - - - پچیس تومان

مرزا عبدالرحیم - - - - چالیس تومان

فراشان - - - - - - پندرہ تومان

ناظر - - - - - - - دس تومان

اہل طویلہ - - - - - دس تومان

شوہر مریم خانم - - - - دس تومان

پیش خدمتہائے آقا - - - پانچ تومان

قہوہ چی - - - - - - - "

درویش آقا - - - - - - "

رسوم کتابچہ دستور العمل - - - "

فرمان - - - - - "

داروغہ دفتر - - - - - - "

فراشان صندوقچہ - - - - - "

اشرف خاں — (غصہ سے) نقارخانہ کا عملہ تو باقی رہ گیا،

اطرار — ہاں یہ تو کل میری جان ہی کھا جاتے۔ اچھا یاد دلایا انہیں بھی کچھ دیدو،

اشرف ——— یہ حساب اپنے پاس ہی رکھو، ممکن ہے کچھ اور نام یاد آئیں

اطرار ——— نہیں میں اب گھر نہیں جاؤنگا، مجھے آقا سے ملنا ہے۔

اشرف ——— خدا حافظ، انشاء اللہ کل آخری ملاقات ہوگی۔

(اطرار خاں جاتا ہے اور مرزا حسین نائب کدخدا آتا ہے)

نائب ——— سلام علیک، سرکار خان!

اشرف ——— وعلیک السلام، میں نے آپ کو نہیں پہچانا،

نائب ——— میں نائب کدخدا ہوں، مجھے کدخدا نے سرکار کی خدمت میں بھیجا ہے۔

اشرف ——— ہر دم ازیں باغ برے میرسد۔

نائب ——— کچھ خلوت میں عرض کرنا چاہتا ہوں،

اشرف ——— خدا بچائے، فرمایئے خلوت ہی ہے؛

نائب ——— میرے محلے میں اکثر و بیشتر ایسی ایسی حسین عورتیں ہیں کہ سرکار کی نظر سے شاذ ہی گزری ہونگی۔

اشرف ——— میں آپکی مہربانی کا ممنون ہوں مگر آپ کا مطلب نہیں سمجھا،

نائب ——— شکر ہے کہ پرسوں رات خیر سے گزری، میں تو تمام رات دیوار کے نیچے ہی کھڑا رہا کہ کہیں کوئی فتنہ نہ بپا ہو،

اشرف ——— تمہید نظر انداز کر کے ماحصل مطلب فرمایئے تو مناسب ہو،

نائب ——— جس رات سکینہ کاشی سرکار کی خدمت میں حاضر تھی وزیر کے آدمیوں نے اُسے پکڑنا چاہا تھا، مگر مرزا کدخدا نے

جو آپکے غائبانہ مخلص ہیں یہ گوارا نہ کیا کہ وزیر کے لوگ اُسے لیجائیں اور آپ کی بدنامی ہو،

اشرف ——— آقا نائب! آپکے حواس کہاں ہیں کیا آپ نشہ میں ہیں؟

نائب ——— ہاں آقا خود نشہ میں ہیں،

اشرف ——— بابا آخر چاہتے کیا ہو؟

نائب ——— صرف انعام کی توقع ہے،

اشرف ——— اللہ ری توقع یہ شہر ہے یا ٹھگوں کی بستی، ایک سے ایک بڑھکر چور، وزیر، متوفی، کدخدا، نائب کدخدا، اللہ محفوظ رکھے

نائب ——— آج آقا خفا ہیں!

اشرف ——— ناظر اس پدر سوختہ کو دو تومان دیدو: (کریم آتا ہے)

تم نے دیکھا یہ نائب کدخدا کہتا ہے کہ پرسوں رات میں نے کبھی سکینہ کاشی - - - - - - - - - اور وہ دیوار کے نیچے کھڑا ہوا تھا، اب جرمانہ دو، دو تومان اس پدر سوختہ نے بھی لئے۔

کریم ——— خان! جس قدر جلد ہو سکے یہاں سے نکل چلو،

اشرف ——— ابتک ہزاروں تومان انعام میں گئے، مگر یہ دو تین (آقا کے بچہ ہونیکی خبر لانیوالے اور نائب کدخدا وغیرہ) نے مجھے جس قدر رنج پہنچایا اتنا کسی نے بھی رنجیدہ نہیں کیا۔ کل صبح سوار ہونا چاہئیے، صبح سب سامان تیار کرالو اگر کوئی پوچھے تو کہدینا اسکا حمل ہو گیا۔

(اس طریقہ سے اشرف خاں نے طہران سے پیچھا چھڑایا)

ڈراپ

تمکین کاظمی

غالب کی ذہنیت

اگر مغربی اصولِ تنقید کی روشنی میں اردو شاعری پر نظر ڈالی جائے تو سب سے پہلے جس چیز کا فقدان نظر آئیگا وہ خاص پیغام message ہے جو ایک شاعر اپنے کلام کے ذریعہ سے اپنے ہمزبانوں کے آگے پیش کرتا ہے، اس کی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے شاعر ہمیشہ خیال پر زبان کو ترجیح دیتے رہے، خیال خواہ کتنا ہی پامال اور مبتذل کیوں نہ ہو، لیکن جب اس کو کسی انوکھے اور خوبصورت اسلوب میں ادا کیا جاتا تو مشاعرے تحسین و آفرین سے گونج اٹھتے؛ بغیر طرزِ ادا کی خوبی کے کوئی شعر، شعر ہی نہیں کہلایا جا سکتا تھا اور جس قدر خوبی کسی شعر میں اسلوب کی ہوتی اتنا ہی وہ شعر بہتر سمجھا جاتا۔

یہی وہ مطمع نظر تھا جس کے باعث اردو شاعری کئی دبستانوں پر تقسیم ہوگئی اور یہ تمام دبستان برخلاف مغربی شاعری اور اس کے دبستانوں کے صرف زبان سے متعلق تھے۔

یورپ میں جب کسی شاعر کے کلام پر تنقید کی جاتی ہے تو اس کا ایک بڑا جزو یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ زیرِ بحث شاعر کی ذہنیت اور پیغامات کس دبستان سے تعلق رکھتے ہیں؟ کیا وہ ورڈسورتھ کی طرح کائنات اور انسان کی فطرت پر گہری نظر ڈالتا ہے، یا ٹینی سن کی طرح اپنے ہی زمانہ کے معتقدات اور اپنے ہی ملک و قوم کی توہمات کی ترجمانی کرتا ہے، یا براؤننگ کی طرح فلسفۂ حیات کے بنیادی اصولوں اور رجائیت کے عالمگیر پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کرتا ہے اور یا میتھیو آرنلڈ کی طرح اپنے ماحول کی بدعنوانیوں سے بیزار ہوکر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس جب اردو کے کسی شاعر پر تنقیدی نظر ڈالی جاتی ہے تو اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ آیا وہ ناسخ کے اسلوبِ بیان کی تقلید کرتا ہے یا آتش کی طرزِ ادا کی پیروی، اور آیا اس کے کلام میں غالب کی ترتیبِ الفاظ اور ترکیبوں کی ساخت کے اثرات نمودار ہیں یا مومن کے کلام کی روانی یا خوبیِ بیان کا رنگ جھلکتا ہے۔ غرض اردو کی تمام شاعری صرف اسلوب ہی پر منحصر رہتی ہے۔

اسلوبِ بیان، ادبیات کا جزوِ لاینفک ہے۔ مشہور فرانسیسی انشاپرداز وکٹر ہیوگو نے لکھا ہے کہ شاعری کے لئے کوئی مضمون اچھا اور کوئی مضمون برا نہیں ہوتا، بلکہ اچھے اور برے شاعر ہوتے ہیں۔ "دامنِ خیالِ یار" "خلشِ غمزہ خونریز" "غرور و وقار" "نبردِ عشق" "جانِ غمِ الفت" "رقیبِ روسیاہ" "پرسشِ طرزِ دلبری" "دلِ ناشاد" وغیرہ مضامین میں سے ہر ایک پر اردو کا شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہوگا جس نے کم از کم دو تین شعر نہ لکھے ہوں، لیکن افسوس ہے کہ ہر شاعر میر تقی یا مرزا غالب نہ ہو سکا۔

ملک الشعرا لارڈ ٹینی سن کا خیال ہے کہ "قابلِ توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں بلکہ یہ کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں" اور اسی لحاظ سے علامہ ابنِ خلدون نے الفاظ کو پیالہ اور معانی کو پانی قرار دیا ہے، آپ پانی کو چاہیں سونے کے پیالے میں بھریں چاہیں مٹی کے۔ پانی تو وہی ہے،

لیکن اگر آپ کا جی للچائیگا تو سونے کا پیالہ پینے کے لئے مٹی کے پیالے کی طرف آپ کبھی دست طلب دراز نہ کریں گے۔ یہی ہے ایک غالب، ایک مومن یا ایک داغ کے شعر کی وہ خوبی جو کسی دوسرے معمولی شاعر کے کلام پر ترجیح حاصل کرنیکا سبب بنتی ہے۔

ایک مشہور مصور فطرت شاعر ڈبلیو بی ائیٹس لکھتا ہے " لٹریچر میں زبان کو بہ حیثیت زبان نہیں ملحوظ رکھا جاتا بلکہ فن لطیف کی حیثیت سے اور وہ فن لطیف جس کا ذریعہ اظہار زبان ہو لٹریچر کہلاتا ہے" پس زبان اور طرز بیان وہ ضروری اجزا ہیں جن کے بغیر دنیا کی کسی زبان میں ادبی کارناموں کو اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہمارے شاعر صرف اسی میں اس قدر محو ہو گئے کہ خیال کی پروا ہی نہ کی، اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا وہ ہمارے ہاتھوں میں اور آنکھوں کے روبرو ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے جن کی خاطر ایشیا کے سیکڑوں شاعر اپنی خاص خاص ذہنیتوں اور اپج کو تباہ کر دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔

اس کے اسباب بہت ممکن ہے کئی ہوں لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس کا بڑا سبب غزل گوئی ہے، جو فارسی اور اردو شاعری کا جزو اعظم ہے اگر فارسی اور اردو زبانوں کی غزلوں کو علیحدہ کر لیا جائے تو پھر ان دونوں کی شاعری کی پونجی بہت کم مقدار میں رہجاتی ہے، ان زبانوں میں غزل گوئی کے بغیر کوئی شخص اپنی شاعری کی ابتدا کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اور ان دونو زبانوں کے وہی شاعر زبان زد مشہور و مقبول سمجھے جاتے ہیں جو غزل گو تھے۔ خواجہ حافظ، نظیری نیشاپوری، ظہیر فاریابی، میر تقی، شیخ ناسخ مرزا غالب، حکیم مومن خاں اور مرزا داغ وہ زبردست شعرا ہیں جن کی شاعری کی عظمت کا سارا دار و مدار صرف غزل گوئی پر ہے۔ اور غزل کے متعلق یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ یہ وہ صنف سخن ہے جس میں کم و بیش عشق و عاشقی ہی کی باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری شاعری کا دار و مدار صرف جذبہ محبت اور اس کے متعلقات کے اظہار پر ہے کائنات میں ہر جگہ ایک نیا منظر جلوہ گر رہتا ہے۔ اور انسانی ہستی ہر وقت ایک انوکھا پہلو نمودار کرتی ہے، اگر کوئی شاعری کرنا چاہتا ہے تو کائنات کا ایک اک ذرہ بھی اس کے لئے موضوع بن سکتا ہے اور انسان کی ایک اک حرکت بھی اس کے ذوق شعری پر تازیانہ لگا سکتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے بیان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کرنا جانتا ہو" عرفی نے بالکل راست کہا ہے ؎

هر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ　　　این ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

لیکن مغربی شاعروں اور انشا پردازوں نے اس راز کو پہچان لیا اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر شاعر کی نظر کائنات کے ایک نئے معمے پر پڑتی ہے، زندگی کے لاتعداد پہلوؤں میں سے ہر ایک پر وہاں کے شاعر اپنے اپنے طبعی رجحان کے مطابق روشنی ڈالتے ہیں، اس کے برخلاف اردو اور فارسی کے شاعروں کی بے کسی ملاحظہ ہو کہ انہیں صرف ایک ہی جذبہ یعنی محبت نے اظہار پر مجبور کر دیا گیا ہے، کائنات اور اس کے دلآویز مناظر پر پہلے تو ان کی نظر ہی نہیں پڑتی ہی نہیں، اور اگر پڑتی بھی ہیں تو وہ اس کے اظہار پر مستعد نہیں ہوتے مستعد ہوں تو کس لئے؟ اس کی خاطر نہ انکی تعریف ہو گی اور نہ انہیں کسی اور قسم کا فائدہ ہو گا۔ اگر کوئی آزاد رو شاعر ہے اور اسے اپنے ماحول کی پرواہ نہیں ہے یا کسی اور وجہ سے وہ کائنات کے مناظر کا اپنی شاعری میں ذکر کرنا چاہتا ہے تو چونکہ اس کے آگے اس قبیل کا کوئی مکمل اور اعلیٰ مثالیں موجود نہیں ہیں اس لئے وہ اپنے اس بیان میں معراج کمال حاصل کرنیکا خیال نہیں کر سکتا اور اگر خیال کرے بھی تو کمال حاصل نہیں کر سکتا۔

کائنات کے بعد انسان کی فطرت اور اس کے متفرق پہلو وہ زبردست موضوع ہیں جن پر بہترین شاعری کی جا سکتی ہے، لیکن اردو کا شاعر انسان کے

جذبۂ حب وطن، قومیت، فیاضی، ایثار اور رحم و انصاف کی طرف کبھی مائل نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اُس کو غزل لکھنی ہے، یہی وہ مجبوری تھی کہ فارسی اور اُردو کے بعض شاعر غزل میں تصوف کے مضامین بھی استعمال کرنے لگے تھے، اگر کوئی شاعر غالب کی ہمنوائی میں "بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل" کہتے ہوئے غزل کے حدود سے آزاد بھی ہو جاتا تو مثنوی اور قصیدہ لکھنے بیٹھتا لیکن اپنی اس عادت سے مجبور ہو کر جو اس کی طبیعت ثانی بن گئی تھی اُس میں بھی عشق و عاشقی ہی کی باتیں شروع کر دیتا چنانچہ اُردو اور فارسی کی اکثر مثنویاں عشقیہ قصوں اور مضامین ہی پر مبنی ہیں اور اکثر قصیدوں کی تشبیبیں اشعار عشق و محبت ہی سے متعلق ہیں۔

غرض اگر اُردو کا ہر شاعر اپنی مخصوص ذہنیت اور رجحان کے لحاظ سے انسانی فطرت پر نظر ڈالنے کے لئے آزاد رہتا تو ہر ایک کو ایک نیا جولانگہ عمل دستیاب ہوتا جس میں وہ اپنی ذاتی فطرت و مذاق کے مطابق قسم قسم کی جولانیاں دکھا سکتا۔

جب اردو اور فارسی کے تمام شاعروں نے ایک ہی میدان یعنی جذبہ محبت کو اپنے لئے مخصوص کر لیا تو اُس کے متعلق جملہ خیالات آخر کار اختتام کو پہنچ گئے۔ پھر کیا تھا۔ جب نئے نئے خیالات کا فقدان ہو گیا تو شاعر پرانے خیالات اور پامال مضامین ہی کو نئے نئے اسالیب میں ادا کرنے لگے۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف ایک ہی قسم کے خیالات کا نئے نئے طریقوں سے اعادہ ہونے لگا بلکہ خود خیالات بھی مسخ ہونے لگے اور آخر کار وہ اسقدر مضحکہ خیز بن گئے کہ اگر اُن کے مطابق ایک معشوق کا مجسمہ بنایا جائے تو وہ ایک عجیب ہی شے ہو گی، ایک ایسی شے ہو گی جس کا تعلق ہماری اس دنیا سے نہیں بلکہ کسی اور دنیا سے ہوگا، جس سے ہم محبت کرنے کی بجائے نفرت کرنے لگیں گے اور جس کو دیکھکر غالب

"میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک"

کہنے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لیگا۔

غرض اردو شاعری اگرچہ اسلوب کے لحاظ سے بدلتی اور ترقی کرتی رہی، لیکن مطالب و معانی کے لحاظ سے بگڑتی اور محدود ہوتی رہی، بایں ہمہ اگر اُردو کے تمام سرآوردہ شعراء کے کلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے تو ان میں سے ہر ایک میں کسی نہ کسی قسم کی انفرادیت ضرور پائی جائیگی، ہمیشہ کسی ادبی کارنامہ کے مطالب و معانی اپنے مصنف کی چغلی نہیں کھاتے لیکن اسلوب بیان پکار اٹھتا ہے کہ یہ لکھنے والا فلاں شخص ہے۔ انتخاب الفاظ ترتیب محاورات، خیال کا طریقہ اظہار وغیرہ لکھنے والے کی شخصیت کے وفادار ترجمان ہوتے ہیں۔

تصنیف مصنف کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے، ہر مصنف یا شاعر کی ہستی اُس کے کلام میں اسکی شخصیت کی خصوصیات کو جگہ جگہ نمودار کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پر عظمت زندگیوں کے حالات اکثر انکی سیرت یا سوانحعمری سے معلوم کئے جاتے ہیں لیکن خود مصنف کا قلم اُس کا جو کامل مرقع کھینچتا ہے وہ ہی حقیقی اور اصلی ہوتا ہے، دوسروں کا قلم صرف اس کے ظاہری خط و خال کا خاکہ کھینچ سکتے ہیں، لیکن قلب کی گہرائیوں میں جو رموز و اسرار مضمر ہیں ان کی تصویر کشی کے لئے جن رنگوں کی ضرورت ہے انکا دوسروں کو میسر آنا دشوار ہے۔

جب کسی کلام کا آپ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ نہ صرف مصنف کی شخصیت غیر مضمر طور پر اس میں اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہے بلکہ اس کی قلبی روحانی اور ذہنی ارتقا کا عکس بھی جا بجا اس میں نمودار ہوتا ہے، وہ آپ سے پکار پکار کر کہیگی کہ میرے اخلاق کی تعلیمی حالت اس درجہ کی ہے، اس کی فطرت بنانے اور تعین کرنے میں ان ان باثر اشخاص نے کام کیا، ان اساتذہ سخن کے آگے اُس نے اپنا زانوے ادب

تہ کیا تھا، جنھوں نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے کو کچھ قابل سمجھ سکے، ان کتابوں کی فضا میں اس نے اب تک زندگی بسر کی ہے وہ لوگوں کے ساتھ اس طرح گفتگو کر رہا ہے، اس کی تخیلات میں اس طرح سنجیدگی اور تخیلی آتی گئی، کائنات اور اس کے مضمون پر اس نے ان ان صرتقوں سے نظر ڈالی ہے، اس کی طبیعت میں اس طرح یہ خاصیت پیدا ہو گئی اور اس کی صنامی کی تکمیل ان ان حالتوں سے ہو کر گذری ہے۔

پس جس کسی میں جو بھی برائی یا بھلائی پائی جائیگی وہ اس کی ظاہری اور معنوی دونو قسم کی اولاد میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ میر تقی میر کا نشتر ان کے تقریباً ہر شعر سے مترشح ہوتا ہے، حالی کا قومی جذبہ ان کی تمام مصنفات میں جلوہ گر رہتا ہے، اقبال کا اسلامی درد کسی نہ کسی طرح اپنے ان کے شعروں میں اپنی جھلکیں دکھاتا ہے اور اکبر کی رجائیت، شگفتگی اور ظرافت مزاجی سے ان کا سارا کلام پرنور نظر آتا ہے، پس ضروری ہے کہ غالب کے کلام سے ان کی ذہنیت کا پتہ چلایا جائے، اور یہی ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔

غالب کا ایک سرسری مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ان کا کلام مطالب و معانی کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ ان اشعار پر مشتمل ہے جن میں غالب نے عام اور پامال خیالات اور مضامین کو اپنے اسلوب کے ذریعہ پیش کیا ہے، یہ وہ مضامین ہیں جن کو اردو کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شاعر باندھتا ہے، گویا یہ اردو شاعری کا ایک زبردست، اصولی اور مشترک جزو ہے، فراق کی مصیبتیں، وصل کی امیدیں، معشوق کا غرور و بے پروائی، عاشق کی عاجزی اور بیکسی، اغیار کے طعن و تشنیع، قاصدوں کی خوشامد، معشوق کے خد و خال کی تعریف، اپنے عشق کی زیادتی کا اظہار وغیرہ وہ موضوع ہیں جن میں سے ہر ایک پر اردو کے ہر شاعر کے کلام میں کئی کئی شعر نکلیں گے جیسا کہ ہم نے پہلے بھی ذکر کر دیا ہے، فرق صرف اس قدر ہو گا کہ ہر شاعر اس مضمون کو یا تو اپنے مخصوص انداز میں بیان کر لیگا، یہ ایک عجیب انوکھی طرز میں پیش کریگا۔

مرزا غالب اگرچہ ایک آزاد رو شاعر تھے اور اگرچہ انھوں نے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی وہ اردو کے شاعر تھے اس اردو کے جس کی شاعری میں مذکورہ بالا مضامین جزو لاینفک کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی خوددار طبیعت کبھی گوارا نہ کرتی کہ وہ شاعروں میں اپنے ہم فنوں سے کم رتبہ خیال کئے جائیں اور ان کی شاعری کم از کم ان کے دوست احباب کی مدح و ستائش بھی ان کے لئے حاصل نہ کر سکے پس انھوں نے بھی ان مضامین پر شعر لکھے اور اس میں شک نہیں کہ اپنی مخصوص طرز ادا کے ذریعہ سے ان میں چار چاند لگا دیئے۔ ان اشعار میں غالب اپنے دوسرے ہم فنوں سے کس طرح دامن بچا کر نکلے اور کس طرح ان پر تفوق حاصل کیا، اس کا ذکر کرنا اس مضمون کے موضوع سے باہر ہے یہاں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ یہی وہ صنف ہے جس کے اشعار کلام غالب میں کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خصوصاً اس کلام میں جو ان کے ابتدائی شاعری کے زمانہ کی پیداوار ہے، اور جس کا بہت کچھ حصہ انھوں نے "این دفتر پارینہ غرق مے ناب اولیٰ" کے مصداق اپنے دیوان کا انتخاب کرتے وقت نکال باہر کیا تھا۔

غالب کے دوسرے قسم کے اشعار وہ ہیں جن کو انھوں نے مرزا بیدل اور میر تقی کی شاعری کی تقلید اور ان کے خیالات کی تشریح کے طور پر لکھا تھا بیدل، میر، اور غالب تینوں کے کلام کا بالمقابلہ مطالعہ کیا جائے تو غالب کے متعدد اشعار میں دونوں اول الذکر شعرا کے نقوش تاثر نمودار نظر آئیں گے، دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا شاعر بھی اس قسم کی مدافعانہ عالیت سے نہیں بچ سکتا ہے، یہ بھی ادبی دنیا کا ایک کرشمہ ہے کہ جتنے عظیم الشان شاعر

یا انشا پردازمانے جاتے ہیں اُن میں سے البتہ وہی ہیں جنھوں نے پہلے متقدمین یا معاصرین میں سے کسی نہ کسی کی تقلید شروع کی تھی اور آخر کار خود اُن سے بھی بلند مرتبہ بن گئے۔ یہی حال غالب کا ہے بہت ممکن ہے کہ وہ بیدل اور میر کے علاوہ کسی اور فارسی یا اُردو شاعر سے بھی متاثر ہوئے ہوں اس امر کی تحقیق بھی غالب کی شاعری پر مضمون لکھتے وقت ایک دلچسپ اور مفید موضوع ہے، لیکن ہمارا اس موجودہ جولانگہِ عمل نے مدود اس قدر وسیع نہیں ہیں کہ ہم اس کو بھی اس کے اندر شامل کر سکیں۔

ان دونوں قسموں کے اشعار کو الگ کر دینے کے بعد غالب کے کلام کا جو حصہ باقی رہ جاتا ہے اس سے اُن کی ذہنیت پر خاص طور پر روشنی پڑتی ہے۔ میر تقی کے بعد غالباً مرزا غالب اُردو کے سب سے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنی مخصوص ذہنیت کے متعلق اپنے کلام میں علی الاعلان ذکر کر دیا ہے۔ اس قسم کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ غالب کی ذہنیت رشک کی طرف بہت زیادہ مائل تھی وہ رشک کو اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے، اور نہ صرف اپنا بلکہ اُن کا خیال تھا کہ ہر عاشق مزاج کے لئے رشک لازمی ہے وہ خود اپنے ہی دل و دیدہ کو ایک دوسرے سے رشک کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ ایک ہم سے بھی رشک کرتے ہیں، اُن سے یہ بھی نہیں دیکھا جاتا کہ خود اُن کا قاصد معشوق سے اُن کے متعلق گفتگو کرے۔ اگر معشوق اُن کی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لئے اُن کے قتل پر آمادہ ہو کر خنجر کھینچ لیتا ہے تو انہیں بجائے حصول مقصد کی خوشی ہونے کے اُلٹا رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ معشوق کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ مرتے دم تک رشک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب اس قدر ضعف ہو جاتا ہے کہ معشوق کا خیال بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں تو رشک کا خیال دور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی رشک اُن سے نہیں چھوٹ سکتا اور یہ رشک معمولی رقیبوں کے حلقہ تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اکثر وہ خود اپنے آپ ہی سے رشک کرنے لگتے ہیں اور اسی لئے اگرچہ معشوق کے فراق میں مرنے لگتے ہیں، لیکن رشک کی خاطر اس کی تمنا نہیں کر سکتے۔ یہاں تک نوبت پہنچتی ہے کہ وہ بعض دفعہ اپنے معشوق کو بھی بُرا بھلا کہہ جاتے ہیں اور آخر کار اُن کا یہ جذبہ اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ خدا سے بھی رشک کرنے لگتے ہیں۔ یہ ہے مرزا غالب کی وہ خاص ذہنیت جس کی طرف اُن کے اسی کلام کا بیشتر حصہ جس پر اُن کی ساری عظمت کا دار و مدار ہے رہبری کرتا ہے۔

(۲)

مرزا غالب کی ذہنیت میں رشک کو جو اس قدر اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس کے کئی اسباب قرار دئے جا سکتے ہیں اور اُن میں سے اصلی اسباب وہی ہیں جو اُن کی زندگی اور اُس کی نوعیت سے متعلق ہیں۔ شاعر کی زندگی اور اس کی شاعری میں چولی دامن کا ساتعلق ہوتا ہے اس کا ماحول اور بیرونی حالات جس قسم کے ہوتے ہیں اُس کی شاعری بھی اُس کے مطابق تشکیل حاصل کرتی ہے۔ میر تقی میر کا ماحول اور واقعات زندگی بہت کم انہیں اجازت دیتے تھے کہ ہستی کے رجائی پہلوؤں کا دل کھول کر مطالعہ کر سکیں، یہی وجہ ہے کہ اُن کا سارا کلام یاس و حرماں کی دلخراش صداؤں سے بھرا ہوا ہے۔ میر انشا کی جوانی کا کلام اور وہ کلام جو اُن کے عروج اور فارغ البالی کے زمانہ کا ہے اگر تحقیق سے دیکھا جائے کہ اس میں رعنائیاں اور شوخیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ اس کے برخلاف اُن کی وہ غزلیں جو اُن کی عمر کی آخر ایام کی پیداوار ہیں درد انگیز نظر آئیں گی۔ شیخ ابراہیم ذوق کے کلام کا مطالعہ کیجئے تو ہمارے حوریان کی طرز زندگی اور مخصوص ذہنیت کا پتہ چل جاتا ہے۔ زمانہ نے اُن کی قدر کی، بادشاہوں اور امرا کے دربار میں آسانی سے اُن کی رسائی اور بڑی قدر و منزلت ہوئی، خطاب، جاگیر اور خلعت انہوں نے

اکثر دفعہ ملتی ہیں، یہی اسباب ہیں کہ ان کے کلام میں انتشار اور بے لوثی ظاہر ہوتی ہے۔

اگرچہ بیرونی واقعات کا اثر کسی کی ذہنیت پر فوراً یا ہنگامی طور پر نہیں پڑتا۔ لیکن پڑتا ضرور ہے، اور ایسے مضبوط نقوش سے پڑتا ہے کہ سطحی نظریں اس کا اندازہ نہیں کرسکتیں۔

مرزا غالب کی ذہنیت پر سب سے پہلے جن خارجی حالات کا اثر پڑا وہ ان کے خاندانی واقعات تھے، وہ ایک ذی وجاہت اور عالی رتبہ خاندان کے چشم و چراغ تھے، ان کا جد ایک سلجوقی امیرزادہ ترسم خاں تھا، جو شاہ عالم کے زمانہ میں ہندوستان آئے، دہلی میں ان کی حیثیت کے موافق ان کی قدردانی کی گئی اور پہاسو کا پرگنہ بطور جاگیر کے عنایت ہوا۔ ان کے والد عبداللہ بیگ خاں اول لکھنؤ جا کر آصف الدولہ کے یہاں نوکر ہوئے، وہاں سے حیدرآباد آئے، یہاں تین سو سواروں کی جمعیت سے کئی سال تک ملازم رہے، حیدرآباد سے الور گئے اور یہیں مر گئے، راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گاؤں بسر حاصل جاگیر میں دیئے، اور تنخواہ مرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں (یعنی غالب اور ان کے بھائی مرزا یوسف) کے واسطے مقرر کر دی جو ایک مدت تک جاری رہا۔

مرزا غالب کے نانا خواجہ غلام حسین خاں کمیدان سرکار مرہٹہ کے ایک فوجی افسر اور خاندانی شہر آگرہ کے رہنے والے تھے ان کی آگرہ میں ایک خاص سرکار تھی، جس کی دولت ان کے ملازمین اور متوسلین دس دس بارہ بارہ ہزار کے جاگیردار بن گئے تھے۔ ان کے چچا نصراللہ بیگ خاں انگریزی فوج کے رسالدار تھے اور انگریزی سرکار سے انہیں دو پرگنے سونک اور سونسا ذات اور رسالہ کی تنخواہ کے طور پر ملے تھے، ان کی وفات کے بعد جب ان کے وارثوں کو پنشن ہوئی تو مرزا غالب کے لئے بھی سات سو روپیہ سالانہ مقرر ہوئے۔

ان کی بیوی مرزا الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی اور نواب فخرالدولہ، دلاورالملک، رستم جنگ کی بھتیجی تھیں، الٰہی بخش خاں کے متعلق صرف اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ وہ دہلی کے ایک باتمکنت اور فیاض نواب تھے، پروفیسر آزاد نے ذوق کے تذکرہ میں ان کی فیاضی، تقدس اور سلوک کو خاص طور پر ذکر کیا ہے، غرض مرزا ہر حیثیت سے ایک عالیشان خاندان سے متعلق تھے، ان کا بچپن اور عنفوان شباب اعلیٰ تنعم میں بسر ہوا تھا، لیکن والد، چچا، نانا اور خسر کی وفات کے بعد ان کی زندگی میں اتنا بڑا انقلاب ہوا کہ انہیں قوت لایموت کے لئے بھی پریشان ہونا پڑا، گھر میں جو کچھ اثاثہ تھا وہ چند روز میں سب خرچ ہو گیا، اور قرض خواہوں کے تقاضے سے ناک میں دم آگیا اور ادھر نوجوان چھوٹے بھائی مرزا یوسف دیوانہ ہوگیا، ان پریشانیوں کی کوئی حد ہی ہے، کیا صحیح مرقع پیش کیا ہے کہ؎

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایسی ہی حالت میں جب مرزا غالب دیکھتے ہونگے کہ بے ہنر اور کم رتبہ لوگ عیش و عشرت میں بسر کر رہے ہیں، اور نااہلوں کی قدر کی جاتی ہے تو ان کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، اور اگر کوئی شخص پہلے ہی سے آرام سے واقف نہ ہو اور اسکو بعد میں بھی آرام نہ ملے تو وہ یہ کہکر خاموش ہو رہیگا کہ؎

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

برخلاف اس کے ایک ایسے شخص کی ذہنیت کس قدر درد انگیز ہوگی جس کی زندگی کا ایک حصہ تو کبوتر اڑانے اور رنگ رلیاں منانے میں گزر گیا ہو اور دوسرا حصہ فاقہ کشی اور تنگ حالی میں بسر کرنا پڑا ہو اگر وہ اس وقت اس طرح نعرہائے رندانہ بلند کرنے لگے تو کوئی تعجب نہیں کہ ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے — جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے
مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے
چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے
اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

اس میں کوئی شک نہیں کہ مرزا غالب کی آمدنی ان کی آخر عمر تک اس زمانہ کے لحاظ سے کچھ کم نہ تھی لیکن ان کا طریقۂ زندگی بچپن ہی سے کچھ اس ڈھنگ کا ہو گیا تھا کہ انہیں اس آمدنی سے سیری نہیں ہوتی تھی، ان کی ہزاروں خواہشیں دل ہی کی دل ہی میں رہ گئیں، کس خوبی سے اس خاص حالت کو ایک عام انداز سے واضح کیا ہے! ؎

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور ایک جگہ وہ کس حسرت سے چیخ اٹھتے ہیں: ؎

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

اس موقع پر ایک اور شعر پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، خدائے تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غرض زمانہ نے ان کی بچپن کی آرزوؤں اور جوانی کے خوابوں کو پورا نہ ہونے دیا، وہ شخص جس کا بچپن ذی مرتبہ راجاؤں اور عالی خاندان نوابوں کے ساتھ کھیلنے کودنے اور پتنگ اڑانے میں گزر گیا ہو، وہ شخص جس کی جوانی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے گھرانے میں عیش و عشرت کے ساتھ شروع ہوئی ہو اور وہ شخص جس کے باپ، دادا، چچا، نانا اور خسر سب اعلیٰ عہدہ دار اور ذی مرتبہ شخصیتیں رکھتے ہوں اپنا غمخوار اور دمگسار نہ پائے تو اس کی ذہنیت کی کیا حالت ہوگی؟ غالب نے اپنی اس کس پرسی کے متعلق کئی جگہ اشارے کئے ہیں مثلاً ؎

بیگانگی خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھکر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

جب تک کوئی شخص اندر سے خوش رہتا ہے تو اس کو باہر کی ہر چیز نقصان وخندان نظر آتی ہے لیکن جب اس کے دل پر قنوط کے بادل چھا جاتے ہیں تو ماحول کی ایک ایک شے اسے دشمن نظر آتی ہے، یہی حال غالبؔ کا ہے اگر وہ کبھی تفریح کی خاطر باغ کی طرف نکلتے ہیں تو انہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پھول ان کی حالت پر ہنس رہے ہیں، پتے ان کا مضحکہ اڑانے کے لئے تالیاں بجا رہے ہیں اور ڈالیوں کے سائے سانپ بنکر کاٹنے دوڑ رہے ہیں۔

یہ ہے وہ زبردست رجحان جو غالبؔ کے خاندانی حالات کے باعث ان کی ذہنیت کو متاثر کر رہا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ہر جگہ شک شبہ اور ہر وقت رشک کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

دوسرا سبب جس نے ان کی ذہنیت کو رشک کی طرف متوجہ کر دیا، یہ ہے کہ ان کی شاعری کی (سہل الفہم اور سادہ ہونیکے باعث) ان کی زندگی میں اور بالخصوص ان کی عمر کے ابتدائی حصہ میں کماحقہ قدر نہیں کی گئی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ میری اصلی اسپرٹ کے سمجھنے سے قاصر ہیں تو بجائے اس کے کہ آسان تر اور زیادہ صاف زبان میں لکھنے کی کوشش کرتے انہوں نے دوسروں ہی پر کم فہمی کا الزام رکھا اور اس کو اس طرح نبھایا کہ ؎

آگہی دام شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

ان کو خود اپنے کلام کے مشکل ہونیکا اقرار تھا چنانچہ کہتے ہیں ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنوران کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

تاہم وہ سمجھتے تھے کہ اگرچہ سب مجھے برا بھلا کہتے ہیں لیکن مانتے ضرور ہیں کہ میں ایک اچھا شاعر ہوں ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

بایں ہمہ یہ سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، مشاعروں میں معمولی معمولی شاعروں کی تو تعریفیں کی جاتی تھیں، لیکن چونکہ ان کے اشعار عام فہم نہیں ہوتے تھے اس لئے ان پر تحسین و آفریں کے نعرے بہت کم بلند ہوسکتے تھے، تعریف ہوتا تو کجا، الٹا ان پر طعن و تشنیع کی جاتی تھی لوگ

اپنی غزلوں میں ایک دو شعر ان پر بھی لکھ لاتے تھے۔ احباب خانگی ملاقاتوں میں بھی اُن کے اشعار کا طرح طرح سے مضحکہ اڑاتے تھے آخر کار غالب مجبور ہو کر کہنے لگتے ہیں کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

تاہم وہ ایک انسان تھے، آئے دن کی ناقدردانیوں اور طعن و تشنیع سے متاثر نہ ہونا ان کی فطرت نوعی کے خلاف تھا وہ خود ایک دفعہ اپنے اپنے انسان ہونے کے متعلق کیسی خوبی سے ذکر کرتے ہیں ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

غرض اکثر جگہ وہ اپنے معصروں کا شکر گذار ہوتے نظر آتے ہیں اور یہی ابتدا ہے اس امر کی کہ ان کا ذہن رشک کی طرف مائل ہو چکا تھا، اب تک تو ان کی ذہنیت پر رشک کا پھیکا سا رنگ بیٹھا تھا لیکن جس واقعہ نے اس رنگ کو گہرا کر دیا وہ شیخ ابراہیم ذوق کی قدر و منزلت تھی، ذوق اور غالب دونوں کے متعلق اب تک متفرق انشاپردازوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اکثر حضرات نے ان دونوں کے صرف ایک ہی پہلو پر نظر ڈالی ہے، بالخصوص ذوق کے حق میں بڑی ناانصافی سے کام لیا گیا ہے۔ اگرچہ آزاد نے ذوق کی مدحت سرائی کا پورا حق ادا کر دیا لیکن ان کی طرز تحریر نے بعض حضرات کو بلکہ ذوق کی شخصیت کو بھی مضحکہ خیز بنا دیا۔ اور بجائے اس کے کہ ان کی مدحت سرائی کے ذریعہ سے اردو دانوں کی ذہنیتیں ذوق کی حقیقی عظمت سے متاثر ہوتیں وہ ان کو ایک معمولی شاعر سمجھنے میں بھی پس و پیش کرنے لگیں۔ یہ ایک صریحی ظلم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوق اپنے زبردست ہمعصر غالب کی طرح تخیل کی فضا میں بہت بلند نہیں اڑتے تھے اور نہ اس قسم کے دعوؤں کی جرأت کر سکتے تھے کہ ؎

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا — مری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا
عرض کیجیے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں — کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

لیکن وہ جانتے تھے کہ خیالات کو ادا کرنے کے بہترین اور سہل ترین ذریعے کون کون سے ہیں اور یہی وہ اصولی خوبی ہے، جس پر کسی شاعر کو شاعری یا نثر نگار کی نثر کی عظمت کا دارومدار ہے۔ ہم نے اس مضمون کے ابتدائی حصہ میں اسلوب بیان کے متعلق کچھ خیالات پیش کر دیئے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کا یہاں اعادہ کیا جائے، یہ بات مسلم الثبوت ہے کہ وہی انشاپرداز زبردست مانا جاتا ہے جو اپنے خیالات کے طریقۂ اظہار پر قابو رکھتا ہے اور انہیں ایسے ایسے رنگ نشاط انگیز سانچوں میں ڈھال کر ظاہر کرنا جانتا ہو کہ ان کے ذاتی حسن و خوبی میں بہت کچھ زیادتی ہو جائے۔

اگرچہ یہاں غالب کی مدافعت میں وہی عذر پیش کیا جا سکتا ہے جو محمد حسین آزاد نے اپنے مشہور معصر برآؤننگ کے لئے کیا تھا کہ "اس کے خیالات اسقدر وزنی ہوتے ہیں کہ الفاظ ان کو سنبھال نہیں سکتے" لیکن اس عذر کو مان لینے کے بعد بھی کوئی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ غالب پہلے اردو میں اپنے خیالات ظاہر کرتے وقت زبان پر کافی قابو نہیں رکھ سکتے تھے، برخلاف اس کے ذوق مشکل سے مشکل مطالب کو نہایت وضاحت کے ساتھ

صاف سیدھے الفاظ اور روزمرہ کی بول چال میں ادا کر جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کے کلام کی طرف زیادہ دقیق بینی کے ساتھ متوجہ نہیں ہوتے۔ غالباً گوئٹے نے ڈانٹے کے متعلق کہا تھا کہ لوگ اس کو اس لئے زیادہ شوق اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ اس کا بہت سا کلام دق بلکہ مہمل ہے، یہ ہمارا تجربہ ہے کہ امتحان دینے والے طلبہ اگرچہ جانتے ہیں کہ غالب کے دیوان اور کسی اور شاعر کے دیوان پر امتحان کے پرچوں میں مساوی نمبر کے سوالات آتے ہیں، لیکن باوجود اس کے وہ غالب کے دیوان پڑھنے میں بہت زیادہ وقت صرف کرتے ہیں، پس غالباً یہی بڑی وجہ ہے جس نے غالب کے لئے اردو میں ایک غیر معمولی وقعت پیدا کر دی۔

اگر غالب اور ذوق کا بالمقابلہ مطالعہ کیا جائے اور ذوق کے دیوان کا بھی اسی طرح انتخاب کیا جائے جیسا غالب کا کلام ہے تو ہم آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچ سکیں گے کہ ذوق نے فلسفہ فطرت اور دیگر امور پر غالب سے کچھ کم روشنی نہیں ڈالی لیکن چونکہ انہوں نے ان مسائل کو عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں پیش کیا ہے اس لئے ان کی اہمیت کی طرف مطالعہ کرنے والوں کا خیال بہت کم جا سکتا ہے۔ غالب اور ذوق پر بالمقابلہ نظر ڈالتے وقت اس قسم کی تحقیق یقیناً ایک ضروری اور دلچسپ بحث ہوگی مگر افسوس ہے کہ ہم اس مضمون میں اس طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔!

مشہور انگریزی شاعر براؤننگ کی طرح مرزا غالب بھی اپنے اشعار کو عام فہم بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جیسا براؤننگ سے اس کے اشعار کے متعلق سوال کیا تھا تو اس نے کہا تھا کہ "میں شاعری اس لئے نہیں کرتا کہ لوگ آرام کرسیوں پر لیٹ کر اس سے محظوظ ہوں، بلکہ میں اپنا کلام ان لوگوں کے لئے پیش کرتا ہوں جو اس کا بہ نظر امعان مطالعہ کرنا چاہتے ہیں"

یہی سوال مرزا غالب سے بھی بارہا کیا　چونکہ ان کی ذہنیت رشک کی طرف مائل تھی اس لئے انہوں نے مستفسرین کو اس انداز میں جواب دیا کہ "لوگ میرا کلام سمجھنے سے قاصر ہیں" اگرچہ وہ جانتے ہیں کہ میں ایک اچھا شاعر ہوں، لیکن حسد کی وجہ سے مجھے بدنام کرتے ہیں، اور اگرچہ اس وقت میری قدر نہیں کی جا رہی ہے لیکن آخر کار میرا کلام، شراب کی طرح جو جتنی پرانی ہوتی ہے، اسی قدر زیادہ قدر و منزلت حاصل کرتی ہے، بے حد مقبول اور مشہور ہو جائیگا"

ذوق دلی کے ٹھیٹ شاعر تھے، انہوں نے مشہور انگریز ملک الشعرا لارڈ ٹینی سن کی طرح اپنے ملک و قوم اور زمانے کے جذبات، حالات، اور زبان کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی یہی وہ بنیادیں ہیں جن پر وہ ملک الشعرا بنائے جانے کے مستحق تھے، جن کے اثرات سے ان کے کلام میں محاوروں کی بندش، زبان کی فصاحت و روانی اور نہج کی دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی اور جن کے طفیل میں بہت جلد مشاعروں کو اپنا شیفتہ بنا کر داد تحسین حاصل کر لیتے تھے۔

ان کے کلام کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ وہ علوم متداولہ سے کافی طور پر واقف تھے، طب، قانون، رمل، جفر، نجوم، ہیئت، ہندسہ، ریاضی، منطق، فلسفہ، تصوف، غرض متعدد علوم و فنون کی اصطلاحات، مسائل اور کلیے ان کے اشعار میں جابجا نظر آتے ہیں اور جہاں کہیں ان کا ذکر ہے اس قدر گہری معلومات کا اظہار کیا ہے کہ فوراً یہ خیال قائم ہو جاتا ہے کہ غالباً وہ اس فن کے مخصوص ماہر کامل ہیں لیکن بعد ہی کے شعر میں دوسرے فن کے متعلق بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ عمیق النظری کے ساتھ ذکر نظر آتا ہے۔ یہ ہے ذوق کی وہ غیر معمولی لیاقت اور اس لیاقت کا شاعری میں قادر الکلامی کے ساتھ استعمال، جس کی بنا پر ان کو "حکیم" اور "خاقانی ہند" کا خطاب

دیا گیا تو کوئی تعجب خیز بات نہ تھی، لیکن اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب کے لئے یہ ایک غیر معمولی بات ضرور تھی کہ وہ ذوق کو اس قدر مرتبہ حاصل کرتے ہوئے دیکھتے، اسی ذوق کو جو ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی ذوق کو جو ان کے خسر نواب الٰہی بخش خاں کے دست کرم کے ممنون منت تھے اور جن کی شاعری نے انہیں کی صحبت میں نشو و نما حاصل کی تھی۔

صرف یہی نہیں، مرزا غالب کا غرور خودداری مقتضی تھا کہ وہ ذوق کو اپنے سے کم لیاقت اور کم فہم سمجھتے، ان کو فخر تھا کہ میں میر کا معتقد اور مقلد ہوں اور برخلاف اس کے ذوق جب کہ ایک صحبت میں انہوں نے مرزا سے کہا تھا "سودائی" ہے۔ بہت ممکن ہے غالب نے طنزاً اور رشک کے سبب ناسخ کے اس خیال کو اپنا عقیدہ قرار دیا ہو کہ ؎

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

اور شاید اسی کا جواب ہے جو ذوق نے اس شعر کے ذریعہ کسی مشاعرے میں بلند ہوتا ہے ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا، میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

غرض مرزا غالب شیخ کو کم لیاقت ہی نہیں بلکہ سودا کا معتقد ہونے کی حیثیت سے بزعم خود بدمذاق بھی سمجھتے ہونگے، اس میں شک نہیں کہ مرزا شیخ سے فارسی زبان دانی میں فضیلت رکھتے تھے اور ان کا یہ دعویٰ صحیح ہے جو غالباً ذوق ہی سے مخاطب ہو کر کیا گیا ہے کہ "اردو کو چھوڑ دے کیونکہ وہ میری طبیعت کے موافق نہیں اس کے برخلاف میری فارسی دیکھ تاکہ تجھے رنگ برنگ کے نقش نظر آئیں اور تجھکو جس چیز پر ناز ہے وہ میرے لئے باعث ننگ" ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

اس قسم کے دعووں کے بعد مرزا کو چاہئیے تھا کہ رشک سے دست بردار ہو جاتے، لیکن اپنے ماحول اور خارجی حالات سے مجبور تھے، قلعۂ معلی میں ہر وقت ذوق کی مدح و ستائش کی جاتی تھی، بازاروں میں "استاد ذوق" "استاد ذوق" کا چرچا رہتا تھا، ارباب نشاط ذوق ہی کی غزلیں یاد کرتے اور جگہ جگہ سناتے پھرتے تھے، غالب کی مخالفین اور موافقین دونوں ہی ان کے روبرو ذوق کے خطاب، جاگیر، خلعت وغیرہ کا آئے دن ذکر کرتے رہتے تھے جس کی بنا پر غالب کا یہ شعر کہنا نامناسب نہ تھا کہ ؎

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہو

غرض اس قسم کے ماحول کے اندر اگر انکی ذہنیت میں رشک جڑ نہ پکڑ لیتا، خصوصاً اس وقت جبکہ پہلے ہی سے اس کی ابتدا ہو چکی تھی، تو سخت تعجب کا مقام تھا! ایک جگہ وہ اپنی اسی ناقدری اور زمانہ کی کمینہ پروری کے متعلق کس خوبی سے لکھتے ہیں ؎

برروئے شش جہت در آئینہ باز ہے
یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

(باقی) ——×——— سید محی الدین قادری زور بی۔اے

انتظار

ایک رات رہ گئی تھی آج وہ بھی کٹ گئی
تارے جھلملا گئے تیرگی سمٹ گئی

کن دعاؤں سے خدا نے وقت یہ دکھایا ہے
کتنی [illegible] کے بعد آج کا دن آیا ہے

ایک ایک پل مری جان پہ وبال تھا
ایک ایک دن مجھے ایک ایک سال تھا

آج تو سویرے ہی سے کچھ عجیب حال ہے
میکدہ بنا ہوا حجرۂ خیال ہے

سر میں کیف ہے بھرا جھومتی اٹھی ہوں میں
آستانِ یار کو چومتی اٹھی ہوں میں

ہوں جہاں سے بے خبر دل میں وہ امنگ ہے
یک بیک یہ کیا ہوا عقل میری دنگ ہے

چشمِ انتظار میں بہار ہی بہار ہے
کس کی شکل دیکھنے کا دل امیدوار ہے

دل میں اٹھ رہی ہے کیوں گدگدی کی سی لہر
لب پہ بے سبب آ رہی ہے بار بار کیوں ہنسی

کیف آ بنا ہے کیا جوششِ جمال میں
لڑکھڑا رہے ہیں قدم لغزشیں ہیں چال میں

دل ذرا بتا تو دے کون آج آئے گا
کس کو پاؤں گی بھلا کون مجھ کو پائے گا

ہاتھ منہ بھی دھو چکی کنگھی چوٹی کر چکی
صبح ہی سے پہن لی اور میں بن سنور چکی

ریل آتی ہے کہیں شب میں آٹھ نو بجے
جب تک اضطرابِ دل میرا حال پائے

میں کہاں ہوں آج یہ کچھ خبر نہیں مجھے
ہے زمین آسمان، آسمان زمیں مجھے

جب کبھی پہنچ گئی آئینہ کے سامنے
ہو گیا غرور و ناز اپنے حسن پر مجھے

دیکھتے ہی آئینہ بت سی بن کے رہ گئی
داستان تن کی اک نظر میں کہہ گئی

جذبۂ دل بڑھا دیا نازشِ جمال نے
ان کو لا کے روبرو کر دیا خیال نے

لے سکی نہ کام کچھ حسرتِ قرار سے
ہونٹھ ہل کے رہ گئے بوسۂ عذار سے

شرم سے میں کٹ گئی سر جھکا کے رہ گئی
ان سے وہ بھی بہت لب ہلا کے رہ گئی

جلد یارب آئے رات اور دن تمام ہو
دل [illegible] تعین تو ہے جس سے [illegible] ہو

ہیں جتن بہت مگر دل پہ کوئی بس نہیں
کام [illegible] بہت جو کہیں ہوں جی کہیں

سینے بیٹھتی ہوں کچھ گاہ اس امید سے
کاش وقت کاٹنے میں کچھ بھی مدد کرے

کپڑے پر ہیں انگلیاں اور سوئی پر نظر
بار بار انگلیوں میں سوئی چبھتی ہے مگر

ساس جب بلاتی ہیں تو آتی ہی نہیں خبر		کیا بتاؤں کان میں میرے کیا گیا ہے بجر
کتنے شرم کی ہے بات دل میں کہتی ہونگی کیا		کس خیال میں میرے گم کیا ہو کو ہو گیا،
بیٹھ جاتی ہوں سنبھل کے کانوں کو اُدھر لگا		پھر خیال دیتا ہی ہوش دل کے پر لگا
رات دور ہے ابھی دن پہاڑ ہو گیا		سورج آسمان پر شاید آج سو گیا
اچھا یاد آگیا وقت کاٹنے کا طور		اُن کے خط کو بار بار آج ہونگی میں بغور
اے خط حبیب تونے وہ سلوک ہے کیا		ہوں ابھی خیال میں تجھ کو دوں میں کیا بھلا
حرف ہیں جو دل نشیں راحت انس پاتی ہوں		بار بار چوم کر سینے سے لگاتی ہوں
آج چمکا ہے نصیب کیا بتاؤں کیا ہوں میں		اس کو سمجھیں گے وہی شان کبریا ہوں میں
تونے مجھکو کیا کہوں کیا سے کیا بنا دیا،		ایک خشک خار کو پھول سا کھلا دیا
پہلے تیرے آنے سے کیا بتاؤں کیا تھا حال		ضیق میں تھی جان بھی دل غضب کا تھا نڈھال
کاٹتے تھے بام و در دل میں غم کا جوش تھا		زندگی تھی اک مرض سر وبال دوش تھا
کون ہوں کہاں ہوں میں یہ بھی کچھ خبر نہ تھی		کہنے کو جہان میں تھی تو میں مگر نہ تھی،
وقت وہ گزر گیا ہو چکا وہ دور بس		آج تو جہان میں میں ہی میں ہوں اور بس
تونے زندگی بھی دی شادمانیاں بھی دیں		انبساط دل کے ساتھ بیقراریاں بھی دیں
دن تو کٹ گیا مگر اضطراب بڑھ چلا		ہونے کو ہوئی تو شام پیچ و تاب بڑھ چلا
مٹ رہا ہے شور و شر ہو چلا جہاں خموش		میرے دل میں پھر چلا سارا جوش اور خروش
اضطراب میں ہے شوق شوق میں ہے اضطراب		آگ ہے شراب پر اور آگ پر شراب
اضطراب ہے کہ یہ جوش انبساط ہے		دل کی آگ ہے کہ یہ شعلۂ نشاط ہے
پھولتا ہے اتنا کیوں لینے میں سما دل		اُن کے آتے آتے اُف ہائے پھٹ نہ جائے دل
کھنچنے لگتی ہیں رگیں شوق اگر دباتی ہوں		جان لب پہ آتی ہے آگ اگر بجھاتی ہوں
ضبط و یاس ایک ہیں کیونکر آہ ہائے ضبط		یوں ہی چاہے مر مٹوں پاس ہاں نہ آئے ضبط
اڑ رہی ہیں دمبدم ہوائیاں میری		باؤلی سی ہو رہی ہوں عقل ہے کہاں میری
صبح کو تو اس طرح در کو تکتی تھی نہ میں		بلکہ جسم کے ایک جا بیٹھ سکتی تھی نہ میں
سانس زندگی بھی شرم کا ہے بوجھ آنکھ پر		پھر بھی در کے پاس سے ہٹتی ہی نہیں نظر
کب کسی کی سنتے تھے اس سے پہلے میرے کان		اب سمایا جا رہا ہے میرے کان میں جہان

آہٹوں میں کان پڑی ہے تو میری جان ہے
دل کی دھڑکنوں پہ بھی انکا ہی گمان ہے

ساری کائنات میں کھٹکا گر ذرا ہوا
کان جا لگے وہیں دل دھڑکنے سے رکا

یک بیک جو یہ خبر جان کو ذرا لگی،
وہ نظر کے ساتھ ساتھ بڑھ کے در سے جا لگی

در کے پاس جا کے آہ کیا بتاؤں کیا ہوا
نبضیں چھوٹنے لگیں قلب ڈوبنے لگا

میں تڑپ کے رہ گئی تلملا کے رہ گئی
جان زار و مضطرب لب تک آ کے رہ گئی

کیا نہ آئیں گے وہ آج اف یہ پیش تک نہ آئے
رحم میرے کردگار جی کہیں نکل نہ جائے

آئیں گے ضرور وہ اس میں کوئی شک نہیں
جھوٹ تو کہا انہوں نے مجھکو آج تک نہیں

پھر مجھے کیا ہے کیوں بیقرار اس قدر
کیوں دکھاتے ہیں جگر انتظار اس قدر

شیام موہن لال بی۔ اے جگر بریلوی

سنہ ۳۱۰۵ء

(افسانہ)

"زمان بھی گویا مکان ہی کی ایک قسم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم یہ کہیں، فلاں واقعہ کو ایک ہزار سال کا زمانہ ہوگیا، یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فلاں واقعہ آفتاب کے گرد زمین کی فلاں گردش کے وقت فلاں فضا میں ظاہر ہوا۔ اگر آفتاب و زمین کی گردشوں کی تعیین مکان فضائی کے لحاظ سے ممکن ہو تو اس طرح بھی ہم وہی سمجھ سکتے ہیں جو وہ لکھ کر سمجھتے ہیں، بلکہ ایسا کہنا فہم و ادراک کے لئے زیادہ واضح و روشن ہوگا"

میں ان الفاظ کو اس طرح ادا کر رہا تھا کہ سُن سکوں، کیونکہ میری عادت ہے کہ جب کسی دقیق امر کو اپنے لئے قابل فہم بناؤں تو اپنے خیال کو الفاظ کی صورت میں زبان سے بھی ادا کروں، الغرض میں زمان و مکان کے اسی فرق پر غور کر رہا تھا کہ غنودگی طاری ہوئی جو نیند میں تبدیل معلوم ہوتی تھی، دفعتہً ظاہری حواس میں کچھ تعطل محسوس کرنے لگا: غفلت و بیداری کے درمیان ایک خاص کیفیت پیدا ہوئی اور پھر.......

اگر نیند بھی تھی تو صرف جسم ظاہری کی کیونکہ میرا دماغ اور اعصاب باطنی اپنا اپنا کام کر رہے تھے، خیالات آتے تھے اور منتشر ہوتے تھے، قیاس و تصور کا مرکز قائم ہوتا تھا اور مٹ مٹ جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد زمان و مکان کا شعور محو ہوگیا اور میں ایسا محسوس کرنے لگا کہ آہستہ آہستہ گم ہوتا جا رہا ہوں، جیسے رفتہ رفتہ تاریکی گھٹکر روشنی بڑھتی جاتی ہے...... ....

صبح ہوئی اور میں ہوا کو اس قدر بیتاب ہو کر تنفس کرنے لگا۔ گویا برسوں سے معات ہوا مجھ کو ملی ہی نہ تھی، بستر سے اُٹھا کیونکہ مجھے دیر ہوگئی تھی لیکن جب میں نے اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی تو پھر وہیں بیٹھ گیا، کیونکہ یہ کمرہ نہ میرا کمرہ تھا اور یہ بستر نہ میرا بستر، دیوار پر نگاہ گئی تو میں حیرت سے دم بخود ہوگیا، کیونکہ جو کلنڈر وہاں لٹکا ہوا تھا اُس میں یہ تاریخ نظر آئی: ۔ ۶ فروری ۱۳۱۰ء سنہ ۳۱۰۵ !!

اب جو میں نے غور سے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ فرش، تکیہ، بستر اور لحاف سب ہوا سے بھرے ہوئے ربڑ کے ہیں اور کمرہ صد درجہ صاف و پاکیزہ ہے۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ یقیناً میں بیمار ہوگیا تھا اور یہ شاید یہودیوں کا شفاخانہ ہے، کیونکہ کلنڈر سے جس سن کا پتہ چلتا ہے وہ غالباً یہودی سنہ ہے جو موسیٰؑ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے، اور موسیٰ مسیح سے تقریباً ۱۲۰۰ سال قبل ہوئے تھے، میں سوچ رہا تھا کہ یہ یہودی بھی کس درجہ مذہب پرست ہیں کہ اپنا سنہ بھی انھوں نے وہی موسوی رکھا۔ پھر خیال آیا کہ آخر مجھے شفاخانہ لانے ہی کا کیا سبب ہو سکتا تھا؛ میں بیمار تو پڑا نہ تھا۔ پھر میں نے اپنے جسم کو جابجا ٹٹولا کہ شاید کوئی علامت زخم کی یا ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کی نظر آجائے، لیکن یہ بھی نظر نہ آئی اس کے بعد میں نے اپنے حافظہ پر زور دیا کہ شاید کوئی حادثہ یاد آجائے لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی، آخر کار میں بستر سے اُٹھا اور کھڑکی کی طرف چلا، لیکن دو قدم بھی نہ چلا ہونگا کہ میرے کانوں میں زور سے ایک آواز آئی، پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک جوان عورت نظر آئی جو زور، زور کہہ رہی تھی کہ "اہا، نیند کا بیمار اچھا ہوگیا، نیند کا بیمار اچھا ہوگیا!

چند منٹ نہیں گزرے تھے کہ شفاخانہ کے گوشہ گوشہ سے یہی آواز آنے لگی، اور پندرہ منٹ کے اندر ساری سڑک پر یہی شور تھا، میں ہمت

کر کے دریچہ کی طرف گیا اور جھانک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ عجیب و غریب ہیئت کے لوگ پھر رہے ہیں اور یہی چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ "نیند کا بیمار اچھا ہو گیا، دیکھو وہ کھڑکی سے جھانک رہا ہے، مگر وہ ابھی بہت ضعیف ہے، اس کو پھر لیٹ جانا چاہیئے، کہاں ہیں ڈاکٹر و تیمار دار؟"

لوگ اپنے بچوں کو کندھوں پر اُٹھا اُٹھا کر مجھے دکھا رہے تھے، اور اتنی ہی دیر میں میری کھڑکی کے پاس کم از کم پچاس چھوٹے چھوٹے ہوائی جہاز گزرے جن کے اندر سے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔

میں اسی منظر میں مشغول تھا کہ پشت پر آکر کسی نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھا۔ یہ ایک دبلا پتلا لانبے چہرہ کا آدمی تھا، لیکن سر بہت بڑا تھا، خد و خال سے کچھ نسائیت ٹپکتی تھی اس نے نہایت شیریں آواز سے کہا "ابھی تم بہت ضعیف ہو، بستر پر لیٹ جاؤ"

اس کی آواز میں ایسی نرمی و شیرینی تھی کہ اس کا کہنا ماننے پر مجبور ہو گیا اور بستر پر جا کر لیٹ رہا۔ یہ میرے پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا، اور میری نبض و زبان دیکھ کر بولا کہ "میرے نزدیک تو اب تمہیں آرام ہو گیا ہے لیکن ضرورت ہے کہ ڈاکٹروں کی مجلس تمہیں دیکھ کر فیصلہ کرے"

میں نے کہا، "میں کیا بیمار تھا اور کب مجھے گھر جانے کی اجازت ملیگی؟"

وہ یہ سن کر ایک طویل ہنسی کے ساتھ ہنسا، جو قہقہہ سے کم تھی اور بولا "معلوم ہوتا ہے تم ابھی تک بالکل ناواقف ہو تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تم پر ۱۰۰ سال بیماری کے گزر چکے ہیں، سنہ ۱۹۲۵ء میں تمہارے دماغ پر فالج گرا اور تم بیہوش ہو گئے، لیکن تمہارے اور اعضاء جسم برابر کام کرتے رہے ہم لوگ غفلت ہی کے عالم میں تم کو غذا دیتے تھے، تمہارا علاج کرتے تھے یہاں تک کہ تم اب بالکل اچھے ہو گئے ہو۔ قصہ مختصر یہ کہ تم ۱۰۰ برس تک سوتے رہے اور اب جا کر بیدار ہوئے ہو"

اس کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس سے جھگڑنا بھی بیکار تھا، اس لئے میں نے یہ سننے کے بعد بھی ایک عزم و ثبات کے ساتھ یہ کہا کہ "میں اپنے اہل و عیال کو دیکھنا چاہتا ہوں"

وہ یہ سن کر ہنسا اور اس مرتبہ اس کی ہنسی میں کچھ تحقیر بھی شامل تھی، مجھے غصہ آگیا اور بولا کہ "اگر میں اپنے اہل و عیال کے پاس نہ پہنچا تو اس کھڑکی سے گر کر جان دیتا ہوں اور تم اس کے ذمہ دار ہوگے"

یہ سنکر اس کے چہرہ پر اضطراب کی سرخی نمودار ہوئی اور نہایت تسکین کے لہجہ میں بولا کہ "بہت جلد تم کو یہاں سے جانے کی اجازت دیدی جائیگی۔ کوئی اندیشہ نہ کرو، ہم سب تمہاری راحت و عافیت کے طالب ہیں دیکھو مجلس کے بعض ممبر وہ آرہے ہیں"

میں نے دروازہ کی طرف دیکھا تو پانچ یا چھ آدمی میرے کمرے کی طرف آتے ہوئے نظر آئے، جب یہ اندر داخل ہوئے اور میں نے غور سے انکا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے دو عورتیں تھیں، ان سب نے میری صحت کی جانچ کی اور اجازت دیدی کہ کھانے کے بعد میں باہر جا سکتا ہوں۔

اس کے بعد میرے سامنے ایک طباق لایا گیا جس میں مختلف پھل رکھے ہوئے تھے اور جن کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا، غلہ کی قسم کی پکی ہوئی کوئی چیز میرے سامنے نہ لائی گئی۔ میں نے کہا کہ "ان پھلوں سے کیا ہوتا ہے، تم تو مہربانی کر کے گوشت روٹی لاؤ، بھوک بہت لگی ہے۔"

ان میں سے ایک نے کہا کہ "جسم کی غذا انہیں پھلوں سے حاصل ہوگی اور انہیں میں تمہیں مختلف قسم کے میٹھے اور نمکین کھانوں کا مزہ حاصل ہوگا"

اور واقعی ان پھلوں میں، میں نے عجیب و غریب مزے پائے اور طبیعت خوب سیر ہو گئی۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی، اور پہلا شخص رہ گیا۔

اُس نے مجھ سے پوچھا "کیا اب تم شہر جانا چاہتے ہو" میں نے جواب دیا "ہاں جانا چاہتا ہوں" اُس نے کوٹ پتلون لاکر دیا اور پہنکر میں اس کے ساتھ باہر نکلا۔

جس وقت میں باہر آیا تو ایک مخلوق مجھے دیکھنے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ یہ سب کے سب لانبے قد کے دُبلے پتلے لوگ تھے، لیکن سر سب کے بہت بڑے مرد عورت میں سوائے اس کے کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا کہ مرد کے لبوں پر نہایت ہلکا سا نشان مونچھوں کا نظر آتا تھا، داڑھی نہ دار دتھی اور تھی بھی تو اس طرح کہ رخسار یا ٹھوڑی پر کہیں دو تین بال نظر آتے تھے۔ اُن کے دہانے بہت چھوٹے تھے۔ نیچے کے جبڑے میں دانت بالکل غائب تھے اور اوپر کے دانت بھی نہایت چھوٹے چھوٹے تھے۔ میرے ہمراہی نے مجھے بہت سی باتیں بتائیں منجملہ اُن کے ایک اطلاع یہ بھی تھی کہ اتنے عرصہ تک میں نے کس طرح نباتات کی سی زندگی بسر کی اور یہ کہ معیشت کی اسی صورت نے مجھے اتنا طویل العمر بنا دیا کیونکہ میری حالت گویا درخت کی سی تھی، جسکو جد حیات کے لئے بہت کم جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اُس شخص کے ذریعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ میں بڑا امیر ہو گیا ہوں، کیونکہ سنہ ۱۹۲۵ء میں جب میں بیمار ہوا ہوں، ۰۰ ۵ ایکڑ زمین میری ملکیت میں تھی، لیکن مجھ پر صرف دس ایکڑ کی آمدنی صرف ہوتی رہی اور باقی میرے نام سے جمع کی گئی، میری اولاد کو بھی یہ ورثہ نہ ملا کیونکہ وہ حکومت پر میری موت کو ثابت نہ کر سکے۔ اس کے بعد اس نے ملک کی تاریخ گزشتہ ایک ہزار سال کی بتائی کہ کیونکر اول اول اشتراکی اضطرابات پیدا ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ کس طرح موجودہ نظام قائم ہوا، اُس نے مجھکو سنما کے تمام وہ فلم دکھائے جن میں گزشتہ تاریخ ملک کی محفوظ تھی اور اس طرح میں سمجھنے کے قابل ہو گیا کہ صدی بعد صدی کس طرح ملک میں انقلابات پیدا ہوئے یہاں تک کہ وہ عہد حاضر تک پہنچا، اب میرے ذہن میں آیا کہ جو کچھ اس نے میری بیماری کے بابت کہا تھا صحیح ہوگا، کیونکہ میں اپنی گزشتہ زندگی میں بھی نظریہ ارتقاء کا قائل تھا اور یقیناً اتنے عرصہ میں دنیا کو ترقی کر کے اس مرتبہ پر پہنچنا چاہیے تھا، لیکن میں خود اپنی نظروں میں ذلیل معلوم ہوتا تھا، اور اُن لوگوں سے ۱۲۰۰ سال پیچھے تھا، گویا میں اس وقت کے لحاظ سے ایک متحجر ([illegible]) انسان تھا اور یہ لوگ مجھے اس طرح دیکھتے تھے جس طرح دیگر آثار قدیمہ کو یہ لوگ مجھے گھنٹوں دیکھا کرتے، میرے چہرہ اور دماغ پر غور کیا کرتے۔ بچے کبھی کبھی میری داڑھی کو چھوتے اور سخت بالوں پر تعجب کرتے، کبھی میرے چھوٹے سر کو دیکھتے اور ہنستے۔

شام کو میں پھر اپنے کمرے میں لوٹ کر آیا اور میری تیمار دار خاتون فواکہ لائی۔ کھانے کے بعد وہ مجھ سے باتوں میں مصروف ہو گئی، میں اپنے اور اسکے درمیان ایک خاص تعلق محسوس کرتا تھا، کیونکہ تیس سال سے یہ میری تیمار داری کر رہی تھی، اس نے میرے مرض کا حال بیان کیا جو زیادہ طویل نہ تھا اُس نے بیان کیا کہ میری حالت ایک محو خواب انسان کی سی تھی لیکن خون کا ہلکا سا دورہ جسم میں ضرور باقی تھا۔ جب ڈاکٹروں نے دیکھا کہ بغیر غذا کے میں مر جاؤنگا تو انہوں نے پچکاریوں کے ذریعہ سے ہفتہ میں ایک مرتبہ کیمیائی غذا پہنچانی شروع کی۔ یہ عمل برابر جاری رہا۔ میری حیات کے متعلق متعدد کتابیں لکھی گئیں اور ایک عجیب و غریب انسان کی حیثیت سے میرا معائنہ کیا جانے لگا، میری ترکیب کے متعلق ڈاکٹروں کو حیرت تھی کیونکہ مجھ میں بعض ایسے غدود پائے جاتے تھے جو اب لوگوں میں باقی نہیں رہے، سب کا خیال تھا کہ میرے مرنے کے بعد وہ میری تشریح کریں گے، لیکن میرے بیدار ہو جانے سے اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہوا۔

میری تیمار دار عورت نہایت شیریں کلام تھی، اُس کا قد بہت لانبا اور سر بڑا تھا، لیکن سینہ اُن نشانات سے بالکل عاری تھا جو کبھی وقت عورتوں

میں پائے جاتے تھے۔ لباس اس کا بہت ڈھیلا، اور ربڑ کی قسم کے کپڑے کا تھا، سر کے بال گھنے ہوئے تھے، جو اڑاڑ کر گردن و چہرہ پر آ آ جاتے تھے، ہتھیلیاں، بانہیں، سر بالکل عریاں تھے اور پاؤں میں جوتے بھی نہ تھے۔

میں خیال کرتا تھا کہ اس خاتون کو مجھ سے الفت ہے اور مجھے دوسرے لوگوں کی طرح حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی، میرا ارتباط اس سے بڑھتا جاتا تھا، اور وہ بھی نہایت خلوص سے حالات بیان کیا کرتی تھی۔ اس نے لوگوں کی غذا کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ پکانا نہیں جانتے، اور نہ جانور ذبح کرتے ہیں بلکہ پھل اس قسم کے پیدا کرتے ہیں کہ اُن سے دوا و غذا دونوں کا کام لیا جا سکے، شکر وغیرہ جمادات سے پیدا کرتے ہیں اور زراعت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو بڑے ماہر ہیں اور جو اپنی اپنی تجربہ گاہوں میں نئے نئے تخم پیدا کرتے رہتے ہیں، اور مختلف غذاؤں کی کیفیات ایک ہی پھل میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، پھلوں کے پیدا کرنے میں اس بات کا بھی خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ رنگ و بو کے لحاظ سے وہ باصرہ و شامہ کے لئے بھی غذا پہنچانے والے ہوں۔

اس زمانہ کے مکان بھی نہایت عجیب و غریب ہیں بعض تو اتنے بلند اور وسیع ہیں کہ دو دو سو آدمی اُن میں رہتے ہیں، لیکن وہ لوگ جو تنہائی پسند ہیں وہ علیحدہ مکانوں میں رہتے ہیں اور علمی تجربوں میں شب و روز صرف کیا کرتے ہیں، تاہم یہ اس تنہائی میں بھی اکیلے نہیں ہیں، کیونکہ ٹیلی فون لاسلکی کے ذریعہ سے جب اور جس سے چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں، جس دوست سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں اس کی صورت سامنے آ جاتی ہے، اور اُس کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے۔

شہر میں اب کہیں گرد و غبار کا نام نہیں ہے کیونکہ سڑکیں بالکل لکڑی یا ربڑ کی ہیں، اسی طرح کھیتوں کے راستے بھی گرد سے صاف ہیں جن کے دونوں طرف بجلی کی روشنی ہے۔ مکان کی صفائی، روشنی سب لاسلکی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اور ہر شخص کے پاس ایک موٹر اور ہوائی جہاز ہے جو لاسلکی سے چلتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ لوگوں کی زندگی عام طور پر انفرادی حیثیت سے بسر ہوتی ہے لیکن حقیقتاً وہ اجتماعی ہے، کیونکہ لاسلکی کے ذریعہ سے روزانہ دور دراز مقامات کے گانے سننا، ڈرامے دیکھنا، اپنے احباب سے خواہ وہ کسی ملک میں ہوں باتیں کرنا، اُن کی صورت دیکھنا معمولی باتیں ہیں۔ علاوہ اس کے ہوائی جہاز کے ذریعہ سے وہ جہاں چاہیں ہوا سے بھی زیادہ جلد پہنچ جاتے ہیں۔

لیکن تعجب انگیز امر یہ ہے کہ وہ متاہل زندگی کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ مجھے افسوس ہوا جب میں نے دیکھا کہ میری تیمار دار خاتون بھی اس جذبہ سے بالکل ناآشنا تھی حالانکہ میں آرزومند تھا کہ اس کے ساتھ ایک دائمی تعلق ازدواج کا پیدا کروں، بچے ہوں اور ہم متاہل زندگی کا لطف حاصل کریں، اس لحاظ سے یہ لوگ بالکل جامد ہیں، رات دن عقل و دماغ سے کام لیتے لیتے اُن کے رقیق جذبات بالکل محو ہو گئے ہیں، یہ لوگ نہ کسی خوشی کی بات پر ہنسنا جانتے ہیں، اور نہ رنج کی بات پر غصہ یا افسوس کا اظہار کرنا۔

ازدواج کا طریقہ اُن کے ہاں پایا جاتا ہے لیکن بربنائے عشق و محبت نہیں بلکہ معیشت و نسل کی حیثیت سے۔ جب کوئی مرد کسی عورت سے مشاغل علمی کے سلسلہ میں ملتا رہتا ہے اور علمی ذوق کے لحاظ سے دونوں میں ہم آہنگی ہوتی ہے تو وہ ایک ہی جگہ رہنے لگتے ہیں، لیکن سلسلہ تناسل کی اجازت ان کو نہیں ملتی جب تک حکومت اس امر کا فیصلہ نہ کر دے کہ یہ دونوں اچھی نسل پیدا کرنے کے اہل ہیں۔

ان کو یقین ہے کہ انسان پہلے بندر تھا اور اس نے رفتہ رفتہ ترقی کرکر کے یہ مرتبہ حاصل کیا ہے، چنانچہ سنیما کے فلم جو ہزاروں سال سے ان کے پاس محفوظ ہیں وہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ انسان اس سے قبل کیسا بھدا اور چھوٹے سر کا ہوتا تھا اور پھر آہستہ آہستہ اسکے دماغ نے کیسی ترقی کی، اس لئے وہ نسل کے مسئلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔

جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو علما رجمع ہوتے ہیں اور اس کے جسم کا معائنہ کرتے ہیں، اگر وہ ہر لحاظ سے صحیح و سالم ہوتا ہے تو خیر، ورنہ اسی وقت ہلاک کر ڈالتے ہیں اور ماں باپ بھی کوئی افسوس نہیں کرتے۔ مجھے معلوم ہوا کہ بہت سے بچے جو چھوٹے سر کے پیدا ہوئے تھے ہزاروں کی تعداد میں ہلاک کر دیے گئے۔ اس اندیشہ سے کہ موجودہ نسل پھر گزشتہ حالت کی طرف منتقل نہ ہو جائے:

تربیت کا طریقہ ان کے ہاں کا نہایت اچھا ہے چھ سال تک بچہ ماں باپ کے پاس رہتا ہے اس کے بعد مدرسہ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں اس کو علمی تعلیم دیجاتی ہے۔ جغرافیہ تاریخ اور طبیعیات کا درس سنیما کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے اور دس سال کی عمر میں اس کو اس قدر صحیح معلومات حاصل ہو جاتی ہیں کہ قدیم مدارس میں تیس سال کے بعد بھی ممکن تھیں۔ مدرسہ عبارت ہے صرف تجربہ گاہ اور کتب خانہ سے۔ طالب علم کو دو امتحان دینے پڑتے ہیں۔ ایک زراعت، کیمیا، ترکیب آلات وغیرہ کا، دوسرا تاریخ عالم اور فلسفہ کا۔ عموماً چالیس سال کے عمر سے پہلے تعلیم ختم نہیں ہوتی اور یہ مدت زیادہ نہیں ہے کیونکہ ان کی عمر طبیعی بھی ڈیڑھ سو سال کی ہوتی ہے۔ تعلیم کے سلسلہ میں صحراؤں، بڑے بڑے پہاڑوں، قطب کے برفستانی علاقوں کی بھی سیاحت کرنی پڑتی ہے، اور اس طرح جب کوئی طالب علم مدرسہ سے نکلتا ہے تو وہ ساری دنیا کی سیاحت کئے ہوئے ہوتا ہے۔

معاش کا نظام تقریباً وہی ہے جو اشتراکیین کبھی وقت چاہتے تھے، ملک قصبات میں اور قصبات قریوں میں منقسم ہیں، ہر قریہ ہزار ایکڑ کا ہے اور ایک تجربہ گاہ اس کے لئے مخصوص ہے، زراعت بہت کم ہوتی ہے اور زمین کا اکثر حصہ بڑے بڑے درختوں سے معمور ہے جن سے غذا، لباس، اور ایندھن حاصل کیا جاتا ہے۔ آبپاشی کا بھی رواج نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ دریا تقریباً خشک ہو گئے ہیں۔ جب پانی کی ضرورت ہوتی ہے تو لوگ ہوائی جہاز پر بیٹھکر اوپر جاتے ہیں اور خاص قسم کی گیس پیدا کر کے جہاں چاہتے ہیں پانی برسا لیتے ہیں۔ قریوں کے کارخانے ہر چیز تیار کرتے ہیں اس لئے تبادلۂ اشیاء کا رواج ملک میں تقریباً مفقود ہے۔ ہر شخص کو حصول معاش کے لئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے۔ باقی اوقات تحقیقات علمی میں صرف ہوتے ہیں۔

ملک کی حکومت پانچ مجلسوں میں مرکب ہے۔

(۱) مجلس تشریعی (۲) مجلس قضائی (۳) مجلس صحافی (۴) مجلس دینی اور (۵) مجلس تنقیدی

مجلس تشریعی کے افراد مختلف جماعتوں سے منتخب ہوتے ہیں مثلاً جماعت اطباء سے دس، علماء حیات کی جماعت سے دس، علماء زراعت کی جماعت سے دس، اسی طرح مختلف جماعتوں سے ۵۰۰ ممبروں کا انتخاب ہوتا ہے۔ مجلس قضا کا کام بہت کم ہے، کیونکہ جرائم مفقود ہیں تاہم اس مجلس کے ممبر علماء حیات کی جماعت سے منتخب ہوتے ہیں تاکہ وہ فیصلہ کر سکیں کہ کون قتل کا مستوجب ہے، اور کون منع تناسل کا کیونکہ صرف یہی دو سزائیں یہاں رائج ہیں۔

مجلس صحافت، متعدد جماعتوں کی نمائندہ ہے۔ جن میں سے بعض روزانہ لاسلکی اخبار جاری کرنے والی ہوتی ہیں، بعض ادبی اور بعض طبی اخبارات کی شاعت کرنے والی ہوتی ہیں۔ تمام اخبارات جماعتوں کے انتظام سے جاری ہوتے ہیں اور انفرادی طور پر کسی کا حق قائم نہیں ہے۔
مجلس دینی نے نبر صرف وہ فلاسفر ہیں جن کی عمر ۰ سے کم نہیں ہے۔ قوم کے ذوق کی تربیت اسی مجلس سے متعلق ہے اور موسیقی، رقص، تصویر اور تمثیل وغیرہ کا احتساب بھی اسی کے سپرد ہے، معبدوں میں لوگ انفرادی طور پر جاتے ہیں اجتماعی حیثیت سے نہیں۔ معبد عبارت ہے ایک بڑی مستطیل عمارت سے جس کی ایک دیوار پر تصویروں کے ذریعہ سے یہ دکھایا گیا ہے کہ اول جاندار کیونکر پیدا ہوا پھر ترقی کرکے وہ انسان کی حد تک کس طرح پہنچا اور آئندہ کیا توقع کی جاتی ہے۔ آئندہ کے انسان کا سر بہت بڑا، آنکھیں بہت کھلی ہوئی اور انگلیاں بہت باریک دکھائی گئی ہیں۔ دوسری دیوار میں عہد حجری سے لیکر موجودہ زمانہ تک کا ارتقاء صنعت تصاویر کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے۔ تیسری دیوار میں کرۂ ارض دکھایا گیا ہے اور اس کے اوپر ایک انسان کی تصویر بنائی گئی ہے جو اس وسیع فضا میں مرکز زمین پر غور کر رہا ہے۔ چوتھی دیوار میں بڑے بڑے فلاسفہ اور انبیاء کی صورتیں ہیں اور ان کے اوپر ایک انسان ان کے لبوں کے سامنے وہ نقرے درج ہیں جو تاریخ عالم میں اپنا اثر چھوڑ گئے ہیں۔ عبادت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ انسان معبد میں جاکر کائنات پر غور کرے اور اس کے ساتھ اپنے تعلق کی حقیقت کو سمجھے۔ مجلس تنقیدی کا کام احکام کا نافذ کرنا ہے۔
یہاں ایک شخص کی حیات کا خلاصہ یہ ہے کہ چھ سال تک ماں باپ کے پاس رہتا ہے، پھر مدرسہ میں چالیس سال کی عمر تک تعلیم پاتا ہے، اور اس کے بعد کسی کارخانہ میں عملی زندگی شروع کرتا ہے۔ اب اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ کسی جماعت کی طرف سے کسی مجلس کا ممبر بن سکے، اہل ملک کی کمائی ہر شخص پر اس کی محنت کے لحاظ سے تقسیم کی جاتی ہے، مال کی قیمت بہت گھٹ گئی ہے، لیکن پھر بھی جو لوگ چاہتے ہیں کہ زیادہ فراغت کی زندگی بسر کریں وہ زیادہ محنت کرتے ہیں۔ مکان، پانی، روشنی اور حرارت لوگوں کو مفت ملتی ہے، کھانا اور لباس نہایت ارزاں ملتا ہے، اس لئے بڑا خرچ موٹر اور ہوائی جہازوں کا ہے جو لاسلکی کے ذریعہ سے چلتے ہیں۔
انہیں کثرت نسل کا بھی خیال نہیں ہے، وہ چاہتے ہیں کہ جو نسل بڑھے وہ ذکی ہو اس لئے میرے ملک کی آبادی جو سنہ ۱۹۲۵ء میں کروڑوں تھی اب صرف چند لاکھ رہ گئی ہے، لیکن ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے جو فلسفہ و دیگر علوم سے ناآشنا ہو اور ساری دنیا کی سیاحت نہ کر چکا ہو، کیونکہ ان کے ہاں قابل لحاظ اشخاص کی تعداد نہیں ہے، بلکہ ان کی قابلیت ہے۔ وہ مقدار کو نہیں دیکھتے بلکہ کیفیت حالت کو دیکھتے ہیں۔

(اعلام الفلاسفہ)

پودے اور ماحول

حیاتی مادے کی ایک اساسی خاصیت یہ ہے کہ وہ بیرونی محرکات سے متاثر ہو کر انکے جواب میں خاص قسم کی حرکتیں کرتا ہے، جس قسم کے محرکات ہوتے ہیں حیاتی جوہر کی طرف سے اسی قسم کا جواب ملتا ہے۔ یعنی مادہ حیات میں اور ماحول میں ایک توافق قائم ہو جاتا ہے، اسی خاصیت کی بدولت پودے اور اُسکے ماحول کے درمیان ایک ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے، پودے کے اعضا، (جڑ، تنہ، پتے وغیرہ) اپنی شکل بدل کر ان خاص محرکات کے لئے موزوں ہو جاتے ہیں جو ان کی بود و باش کی جگہ میں عامل ہوتے ہیں اور اس طرح توافق قائم ہونے کے بعد وہ اس جگہ زیادہ کامیابی کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں، مختلف اوقات میں عمل کے اندر غیر مستقل تبدیلی سے بھی پودے کے اعضا میں مناسب اور غیر مستقل تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ اگرچہ پختہ اعضا بھی ان بیرونی علامات کے تبدیل ہونے سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ابھرتے ہوئے اور نو دمیدہ پودے بہت جلدی اثر قبول کر لیتے ہیں۔

محرکات کی فہرست میں وہ تمام بیرونی اثرات شامل ہیں جن سے متاثر ہو کر پودے کو اپنے اعمال میں اور اپنے افعال کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے اپنے اعضا کی شکل میں ضروری تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی سبز پودے کو اپنے نشو و نما کے لئے ایک خاص حرارت آکسیجن۔ پانی کی افراط اور روشنی درکار ہیں۔

غرض وہ اہم محرکات جو پودے کی حیات کے ساتھ وابستہ ہیں یہ ہیں۔

(۱) روشنی (۲) زمین کی کشش (۳) حرارت (۴) زمین کی یا جس چیز پر پودا لگا ہو اس کی حالت (۵) پانی۔ اب ہم ان کی علیحدہ علیحدہ تفصیل کرتے ہیں۔

روشنی:۔ فعلیات[۵۱] (Physiology) سے پتہ چلتا ہے کہ معمولی سبز پودے کے اندر استحالۂ کاربن (Assimilation) آکسیجن کو زیادہ مقدار میں پیدا کرتا ہے، جس پر انحصار ہے پودے کی نشو و نما کا اور یہ استحالہ بغیر روشنی کے نہیں ہو سکتا، اس لئے معلوم ہوا کہ ایک معمولی سبز پودے کے لئے روشنی لابدی ہے اور بغیر روشنی کے درخت سرسبز نہیں ہو سکتا۔

آفتاب کی روشنی کا کونسا حصہ پودے کے کارآمد ہوتا ہے؟ علم طبیعیات کا ایک معمولی تجربہ ہے کہ سورج کی شعاعوں کا مجموعہ جب ایک منشور[۵۲] (شیشہ کے ایک مثلثی ٹکڑے) کے بیچ سے ہو کر دوسری طرف کاغذ پر پڑتا ہے تو بجائے ایک رنگ کے پورے سات رنگ کی پٹی کاغذ پر آجاتی ہے۔ وہ سات رنگ بالترتیب یہ ہیں۔ بنفشی۔ نیلا۔ اودا۔ سبز۔ زرد، نارنجی۔ سرخ۔ اس پٹی کے دو طرفہ اور شعاعیں اپنا اثر ڈالتی ہیں جن کا

---

[۵۱] عضویات زیادہ مناسب ہے۔ (اڈیٹر)   [۵۲] موشور ہونا چاہیئے۔ (اڈیٹر)

رنگ صاف نظر نہیں آتا، اس لئے ایک جانب والے کو بالائے بنفشی اور دوسری جانب والے کو پائین سُرخ کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آفتاب کی تمام شعاعیں ایک رنگ کی نہیں ہوتیں بلکہ رنگ برنگ کی ہوتی ہیں۔ مندرجہ بالا رنگ کی شعاعیں سورج میں موجود ہیں۔ مختلف رنگ کی شعاعوں کی انعطافی قابلیت مختلف ہوتی ہے یعنی وہ شیشہ کے پار ہو کر مختلف زاویوں پر مڑتی ہیں۔ اور منشور کے بیچ میں سے گزرنے پر علیحدہ علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ تجربوں سے معلوم ہو گیا ہے کہ پودوں کو کاربن کے استحالہ کے لئے سُرخ شعاعوں کی خصوصیت کے ساتھ ضرورت ہے۔

(۱)
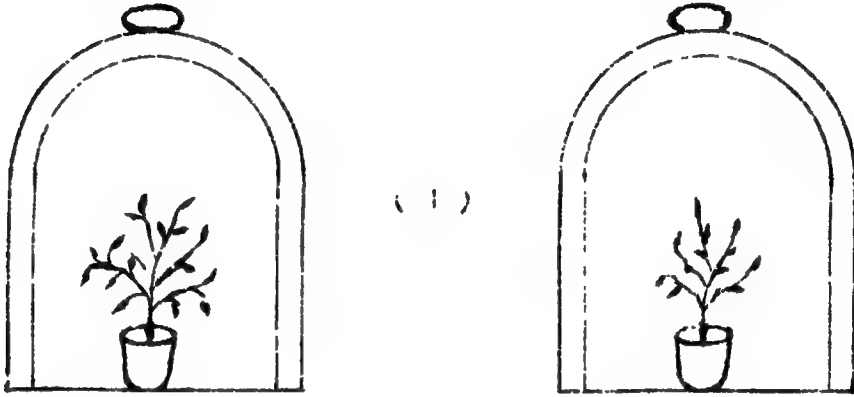
تجربہ ۱:- دوہری دیوار والے دو سرپوش شیشہ کے لیکر دو دیواروں کی بیچ کی جگہ میں ایک سرپوش میں نیلے تھوتھے کا محلول اور دوسرے میں پوٹیسم ڈائی کرومیٹ کا محلول بھر دیں (خاکہ نمبر ۱) دونوں کو دو پودوں پر اچھی طرح ڈھانک کر دونوں کو روشنی میں رکھیں۔ چونکہ پوٹیسم ڈائی کرومیٹ سُرخ شعاعوں کو جذب نہیں کرتا اس لئے دوسرے پودے تک سُرخ شعاعیں پہنچ سکتی ہیں۔ نیلا تھوتھا سُرخ شعاعوں کو جذب کر لیتا ہے اور اودی شعاعوں کو جذب نہیں کرتا اس لئے پہلے پودے میں صرف اودی شعاعیں پہنچتی ہیں دو روز کے بعد معلوم ہوگا کہ دوسرے پودے میں کثیر مقدار میں نشاستہ بنا ہے جو استحالہ کاربن کا نتیجہ ہے، اور پہلے پودے میں نشاستہ بالکل نہیں بنا یعنی استحالہ کاربن اچھی طرح نہیں ہوا۔

تجربہ ۲- اگر سنگھاڑے کے پودے کو پانی میں رکھیں تو ظاہر ہوگا کہ آکسیجن کا نکلنا بہت کم ہو گیا ہے۔ پھر اس پر نیلے شیشہ کا سرپوش رکھ دیا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوگا کہ آکسیجن اور آکسیجن کا نکلنا بہت کم ہو گیا ہے اس کو اٹھا کر اگر سُرخ شیشہ کا سرپوش رکھ دیا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد معلوم ہوگا کہ آکسیجن پھر اسی تیزی سے نکلتا ہے، کیونکہ اس حالت میں سُرخ شعاعیں پودے تک پہنچتی ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاربن کے استحالہ کے لئے سُرخ شعاعوں کی ضرورت ہے۔

روشنی کی حدت میں تغیر بھی پودے کے اعضاء پر محرک کا اثر رکھتا ہے اس کا اثر پتیوں کے اول تہ کے خانوں میں بہت اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے پتیوں کے خانوں میں خضر دانے ہوتے ہیں۔ جب پودا منتشر روشنی میں رکھا جاتا ہے تو یہ خضر دانے خانوں کی باہر کی دیوار کے برابر صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس طرح حتی الامکان روشنی سے قریب تر ہو جاتے ہیں۔ تیز روشنی میں پودوں کو رکھنے سے خضر دانے خانوں کی طرفین کی دیوار کے ساتھ ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تاکہ روشنی کی شدت سے جتنا ہو سکے دور رہیں۔ کیونکہ زیادہ تیز روشنی میں خضر یہ یعنی سبز مادہ اپنے اجزا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔ دن اور رات کے تبادلہ سے جو روشنی کی حدت میں فرق آ جاتا ہے۔ یہ بھی پودوں کو حرکت دیتا ہے، بہت سی پتیاں جو

دن میں آزادی سے پھیلتی رہتی ہیں، رات ہوتے ہی جھک جاتی ہیں، اور بجائے افقی وضع کے سمت عمودی اختیار کرلیتی ہیں، یعنی پتوں کے کنارے بجائے دو طرفہ ہونے کے اب اوپر نیچے کی طرف ہوجاتے ہیں۔ اگر پتے برگ مرکب ہیں تو برگچے آپس میں ایک دوسرے کو چمٹ رہتے ہیں یہ پودوں کی نیند کہلاتی ہے، اس کی مثال ہم کو لاجونتی اور کھٹی بوٹی میں ملتی ہے، پتیوں کی جھکنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ڈنٹھل کا زیرین حصہ جو پھولا ہوتا ہے اپنا کچھ پانی نکال دیتا ہے (چھوئی موئی کے پتیوں کو چھونے سے ڈنٹھل کے گدے نما زیرین حصہ سے پانی بہت جلد نکلتا ہے، اس وجہ سے پتیاں جھک جاتی ہیں) اس قسم کی حرکتیں بعض پودے دن میں بھی کرتے ہیں، زیادہ تیز روشنی میں سورج کی تپش سے بچنے کے لئے اور خضریہ کو تیز روشنی کے تحلیلی اثر سے بچانے کے لئے پتیاں یا تو جھک جاتی ہیں یا عمودی وضع اختیار کرلیتی ہیں، ان حرکات کو خواب نیم روز کہہ سکتے ہیں۔

روشنی کا معمولی اثر تنہ، جڑ اور پتیوں کو نما ہونے سے روکتا ہے، اگر پودہ صحیح سالم حالت میں ہے تو سایہ میں رکھنے سے اس کے پتے بڑے اور تنے لمبے ہوتے ہیں اور روشنی میں رکھنے سے چھوٹے اگر سبز پودوں کو کچھ عرصہ تک برابر اندھیرے میں رکھا جائے تو ان میں بیماری کی علامت پیدا ہوجاتی ہیں، جس میں تنہ غیر معمولی لمبا اور زرد رنگ کا ہوتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اندھیرے میں بجائے خضریہ کے ایک زرد رنگ کا مادہ پیدا ہوجاتا ہے جس کو اصفریہ ([illegible]) کہتے ہیں۔ ایسے پودوں کو رنگ باختہ کہیں گے۔ خضریہ کو پیدا ہونے کے لئے علاوہ ہوا، حرارت، اور لوہے کے کسی مرکب کے روشنی کی نہایت ضرورت ہے۔ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ خضریہ کے بنانے میں سرخ اودی اور بنفشی شعاعیں خاص کام کرتی ہیں، غرض رنگ باختہ پودوں کی علامت یہ ہے کہ تنہ کی پوریاں لمبی اور زرد رنگ کی ہوتی ہیں اور پتیاں چھوٹی اور ہوسی کی مانند ہوتی ہیں، ان کی ساخت میں ملائم گدگدا اسفنجیہ زیادہ اور چوبی نسیج (سخت حصہ) بہت کم پیدا ہوتا ہے تنہ کی پوریاں لمبی کرکے پودا گویا چاہتا ہے کہ اندھیرے سے روشنی تک پہنچے پتیاں چھوٹی ہوتی ہیں اس واسطے کہ اندھیرے میں اور خضریہ کی عدم موجودگی میں بڑی پتیاں کسی کام نہیں آتیں کیونکہ کاربن استحالہ کے لئے روشنی لازمی شرط ہے، اور وہ وہاں مفقود ہوتی ہے۔

سورج کی شعاعوں کے جواب میں بھی پودوں کو نقل و حرکت کرنی پڑتی ہے۔ اس میں پودا اپنے بڑھنے کی سمت کو شعاعوں کی سمت سے موافق کرتا ہے، بعض اعضا شعاعوں کی جانب بڑھتے ہیں اور بعض اس سے دور ہٹتے ہیں۔ ہم یہاں پہلی حرکت کو مثبت اور دوسری کو منفی کہیں گے اکثر تنے اور پتیاں متحرک مثبت ہوتے ہیں اور اکثر جڑیں متحرک منفی ہوتی ہیں، کیونکہ وہ برابر سورج سے دور زمین کے اندر اپنی ترقی جاری رکھتی ہیں۔ اس کا تجربہ اس طرح ہوسکتا ہے۔

تجربہ ۳ - ایسے کمرے میں جس میں صرف ایک کھڑکی ہو اگر پودے کو کھڑکی کے پاس رکھیں اور پودے کو برابر گھماتے نہ رہیں تو وہ پودا کھڑکی کی طرف بڑھے گا۔ اور رفتہ رفتہ اگر پودا زیادہ بڑھنے والا ہے تو کھڑکی کے باہر آکر کھلی روشنی میں آجائیگا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہ متحرک مثبت ہے، اگر پودے کو گھماتے رہیں تو وہ ٹھیک اسی سمت میں بڑھیگا جس میں وہ رکھا گیا ہے۔ کیونکہ گھمانے سے تنہ کی پوری گولائی باری باری سورج کے سامنے آتی ہے اور شعاعوں سے تنہ کے چاروں طرف یکساں اثر ہوتا ہے، اس لئے وہ بجائے ایک طرف کو بڑھنے کے سیدھا اوپر کی طرف بڑھتا ہے اس کا سبب یہ پایا جاتا ہے کہ تنہ کی وہ جانب جو اندھیرے کی طرف ہے زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے بہ نسبت

اس جانب سے جس کا رُخ کھڑکی کی طرف ہے اور جس پر روشنی پڑ رہی ہے (جیسا کہ ہم اوپر دیکھ آئے ہیں کہ اندھیرے میں رکھے ہوئے تنہ کی پوریاں بہ نسبت روشنی میں رکھے ہوئے تنہ کے زیادہ لمبی ہوتی ہیں) اگر کسی سلاخ کا ایک رُخ دوسرے رُخ کے مقابلہ میں زیادہ لمبا ہو جائے تو سلاخ اس طرف خمیدہ ہو جاتی ہے، جس طرف کہ وہ چھوٹی رہ گئی ہے۔ بالکل اسی طرح حرکت مثبت کی تاویل ہو سکتی ہے۔ مگر چونکہ یہ تاویل حرکت منفی کے بالکل خلاف پڑتی ہے اس لئے یہ بحث طلب ہے اور ہم موجودہ مضمون میں ایسا سبب دریافت نہیں کر سکتے جو دونوں حرکتوں کو یکساں حل کرنے کے لئے کافی ہو۔

تجربہ ۴۔ ایک بوتل پر سیاہ کاغذ چپکا دیں اور ایک طرف باریک شگاف رہنے دیں۔ بوتل میں تھوڑا پانی بھر دیں اور ایک سوئی کے ذریعہ سے مٹر کا دانہ اس طرح لٹکائیں کہ کونپل پھوٹنے کے وقت افقی وضع میں ہو۔ بوتل کو روشنی میں رکھیں۔ دو ایک روز کے بعد کونپل شگاف کی جانب بڑھیگی۔ اور اس کی ابتدائی جڑ اس سے دور ہٹتی جائیگی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنہ متحرک مثبت اور جڑ متحرک منفی ہے۔
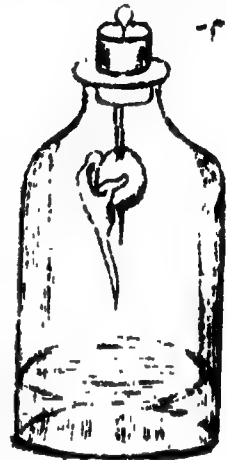
بعض پودے مثلاً کم گیاہی (Bryophyta) اور سرخسی پودے (Fern) سایہ میں رہنا پسند کرتے ہیں اور بعض مثلاً ناگ پھن اور سورج مکھی وغیرہ دھوپ میں عموماً جن کی پتیاں موٹی اور گداز ہوتی ہیں دھوپ پسند کرتے ہیں تاکہ پتوں کے اندرونی خانوں تک بھی کافی روشنی پہنچ سکے۔

زمین کی کشش بھی اُگتے ہوئے بیج اور پودے کو حرکت دیتی ہے اس کے اثر سے ابتدائی جڑ نیچے کی طرف اور ابتدائی تنہ کشش کے خلاف اوپر کی طرف بڑھتا ہے۔ لہذا ہم یہاں روشنی کے عمل کے خلاف جڑ کو مثبت بجذب الارض اور تنہ کو منفی بجذب الارض کہیں گے، اگر ایک بیج کو افقی وضع میں رکھا جائے اور روشنی سے بچایا جائے تو پھوٹتے ہوئے تنہ اور جڑ میں اس طرح خم واقع ہوتا ہے کہ اول الذکر اوپر کی طرف اور موخر الذکر نیچے کی طرف چلتا ہے۔ زمین کی کشش اُگتے ہوئے حصہ پر اثر کرتی ہے۔ اور اس حصہ کا حیاتی مادہ اسکے جواب میں اس کی طرف یا اس کے خلاف جنبش کرتا ہے۔ اس خمیدگی کی وجہ وہی ہے جو ہم روشنی کے بارے میں لکھ چکے ہیں، یعنی عضو کی ایک جانب دوسری جانب کے مقابلہ میں زیادہ بڑھتی ہے یا یوں کہنا چاہئیے کہ تنہ میں بمقابلہ اوپر کے نیچے کا رُخ اور جڑ میں بمقابلہ نیچے کے اوپر کا رُخ زیادہ بڑھتا ہے اس لئے جڑ نیچے کی طرف اور تنہ اوپر کی طرف حرکت کرتا ہے پتیوں اور درخت کی بالائی شاخوں پر اُن کی جائے وقوع کے لحاظ سے روشنی کا اثر بہ نسبت زمین کی کشش کے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہم اُن کے واسطے زمین کی کشش کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔
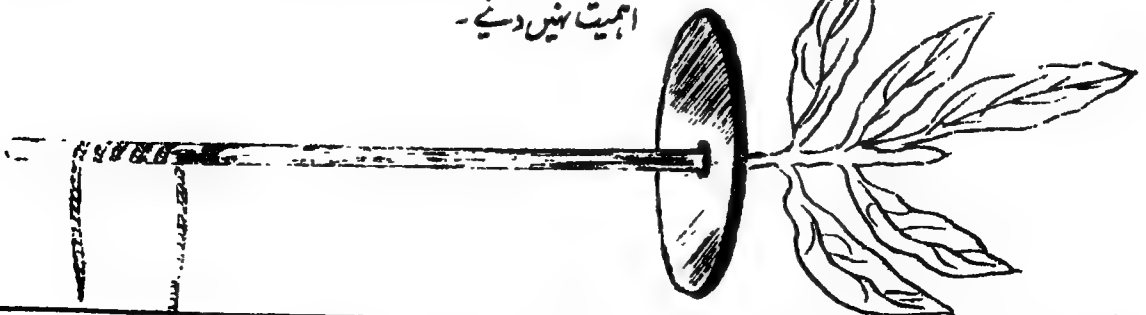
ہم تنہ اور جڑ پر زمین کی کشش کا اثر ایک مشین کے ذریعہ سے دکھا سکتے ہیں جس کو Clinostat کہتے ہیں۔ یہ اپنی سادہ شکل میں قرص ایک لکڑی سے جڑی ہوئی ہے، اس قرص کے سامنے افقی وضع میں ایک بڑھتی ہوئی کونپل لگاتے ہیں اور لکڑی کو آہستہ آہستہ گھماتے جاتے ہیں۔ باری باری کونپل کے ہر ایک حصہ کی سمت آنے سے زمین کی کشش کا اثر سب طرف برابر ہوتا ہے اور اس لئے زائل ہوجاتا ہے اور اس کونپل کا تنہ اور جڑ سیدھے اسی سمت میں بڑھتے ہیں جس میں کہ وہ ابتدا میں رکھے گئے تھے، کوئی خم مطلق واقع نہیں ہوتا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تنہ اور جڑ کے اوپر نیچے جنبش کرنے میں زمین کی کشش کو بڑا دخل ہے۔

وہ نازک تنے جو پیچ کھاتے ہوئے اوپر جاتے ہیں ان میں علاوہ دیگر اسباب لاحق ہونے کے زمین کی کشش "پیر دطرفی" اثر بھی کرتی ہے یعنی ان کی داہنی یا بائیں جانب زیادہ بڑھتی ہے۔ اگر تنہ کی داہنی طرف کی سطح زیادہ بڑھتی ہے تو تنہ بائیں جانب کو اور اگر بائیں سطح زیادہ تیزی سے بڑھتی ہے تو داہنی جانب کو پیچ کھاتا ہے۔

حرارت کا اثر روشنی کی مانند پودے کی صحت کے متعلق ہے۔ اگر پودا غیر موزوں حرارت میں رکھا جائے تو مادہ حیات کی اثر پذیری ضائع ہوجاتی ہے اور اس کے تمام افعال معطل ہوجاتے ہیں۔ پودے کے ہر فعل کے لئے ایک کم سے کم تپش مقرر ہے جس پر کہ وہ فعل شروع ہوتا ہے اسی طرح زیادہ سے زیادہ تپش جس پر وہ فعل بند ہوجاتا ہے، بشرطیکہ اس فعل کے لئے اور تمام شرائط پوری ہوں۔ عموماً معتدل ممالک میں کم سے کم تپش صفر درجہ سینٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ [illegible] درجہ سینٹی گریڈ ہے جن کے درمیان حیات قائم رہتی ہے۔ اس سے بہت زیادہ بڑھ جانے اور کم ہوجانے پر مادہ حیات بیکار ہوجاتا ہے۔ مادہ حیات کا زیادہ خشکی یا گرمی سے بیکار ہوجانا زیادہ تر پانی کی مقدار پر منحصر ہے۔

عام قاعدے کے موافق جتنا پانی زیادہ ہوگا اتنا ہی زیادہ مادہ حیات کو تپش کے بڑھ جانے یا کم ہوجانے سے نقصان پہنچے گا۔

تجربہ ۵۔ ایک خشک نلی میں چند خشک مٹر کے دانے رکھیں، چند اور مٹر کے دانے دو تین دن تک پانی میں بھیگے رہنے کے بعد ایک دوسری پانی سے بھری ہوئی نلی میں رکھیں۔ کاگ سے بند کرکے دونوں کو دو گھنٹے تک ۶۰ درجہ کی گرمی میں رکھیں پھر خشک نلی والے مٹروں کو دو دن تک پانی میں رکھنے کے بعد دونوں قسم کے مٹروں کو بو دیں۔ اس تجربہ کو بالکل اسی طرح سے دوہرائیں، لیکن بجائے ۶۰ درجہ کی گرمی میں رکھنے کے نلیوں کو برف اور نمک میں رکھیں جہاں کہ حرارت صفر سے کم ہو۔

اس تجربہ سے معلوم ہوگا کہ وہ بھری نلی والے مٹر جو کہ دو تین دن تک پانی میں رکھے جاچکے تھے، گرمی اور سردی پہنچانے کے بعد مردہ اور ناقابل روئیدگی ہوچکے ہیں اور جو مٹر خشک تھے اور گرمی یا سردی پہنچانے کے بعد تر کئے گئے تھے زندہ ہیں۔

حرارت میں دفعتاً تغیر متحرک کا کام کرتا ہے۔ بعض پھول حرارت کی زیادتی کی وجہ سے کھلتے ہیں اور جب حرارت کم ہوجاتی ہے پھر بند ہوجاتے ہیں اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ زیادہ حرارت سے پھول کی پتیوں کی اندرونی سطح بمقابلہ بیرونی سطح کے زیادہ بڑھتی ہے اور خنکی سے بیرونی سطح زیادہ بڑھتی ہے۔ غرض خنکی کے وقت بند ہوجانا پھول کے لئے مفید ہے کیونکہ وہ کہر اور پالے سے محفوظ رہتا ہے۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے حرارت کے اختلافات سے پودوں میں کوئی عضوی تغیر واقع نہیں ہوتا بلکہ مادہ حیات خود بلا کسی نمایاں عضوی تغیر کے مختلف حرارت کے ملکوں میں حرارت کے ساتھ توافق پیدا کر لیتا ہے۔

پودوں پر زمین کی حالت کا اثر دریافت کرنے کے لئے زمین کی طبعی اور کیمیاوی خواص کو دیکھنا چاہئے۔ زمین کی اہم طبعی خصوصیات اس کی مسامیت۔ استعداد ماہیت اور قوت شعری ہیں۔

پودوں کے بعض تغیرات کا سبب ان چیزوں کے کیمیاوی خواص ہیں جو زمین میں [illegible] ہیں۔ پودے جو کہ مرطوب اور چکنی مٹی والی زمین میں اُگتے ہیں بعض حالتوں میں اس زمین والوں سے مختلف ہوتے ہیں جس میں چکنی مٹی موجود نہیں ہوتی۔ تغیرات نہ صرف اسی صورت میں ہوتے ہیں بلکہ اس صورت میں بھی ہوتے ہیں جبکہ ایسی چیزیں یا ایسے محلول زمین کے اندر ہوتے ہیں جو پودے کی پانی کھینچنے کی قوت بدلتے ہیں اس طرح زمین کے اندر کیمیاوی محلول کی زیادہ مقدار میں موجودگی سے درخت تک پانی پہنچنا مشکل ہوجاتا ہے۔ جس کے سبب سے بعض اوقات درختوں میں دو صورتیں پیدا ہوجاتی ہیں یا تو ریگستانی پانی [illegible] ایسے ملکوں میں پائی جاتی ہیں یعنی درخت میں کچھ ایسا انقلاب ہوجاتا ہے جس سے اُن کی پیاس کم ہوجاتی ہے یا دوسری صورت میں ان کو بہت [illegible] پانی کھینچنا پڑتا ہے اور اس طرح وہ ایسی زمین میں رہ کر بھی نمک کے گاڑھے محلول کے مضرت رساں اثر سے بچ جاتے ہیں۔

جہاں تک عضوی تغیر کا تعلق ہے پانی یقیناً اپنا سب سے زیادہ اثر رکھتا ہے۔ پودے کی اندرونی اور بیرونی کل ساخت ان خاص حالات سے موافق ہوتی ہے۔ جن میں ہر پودے کو پانی جذب کرنا۔ تمام اعضا تک پہنچانا اور بعض صورتوں میں نہایت ہوشیاری سے خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ہم اس کا اور زمین کا اثر یکجائی طور پر پودوں کے اقسام کے ساتھ کریں گے۔

پانی کا اثر پودوں کی جغرافی تقسیم پر بہت زیادہ پڑتا ہے۔ ہم ذیل میں پودوں کی اس اعتبار سے تقسیم کرتے ہیں کہ یکساں حالات میں رہنے والے پودے ایک نوع میں اور دوسری یکساں صورتوں میں رہنے والے پودے دوسرے نوع میں [illegible] یہ نظام اس سکیم سے بالکل مختلف ہے جو اکثر "قدرتی تقسیم" کے نام سے مشہور ہے کیونکہ اس سکیم کے ایک ہی نوع میں "قدرتی تقسیم" کے [illegible] بالکل مختلف انواع کے پودے بھی شامل ہیں۔

پھولدار پودے تین جماعتوں میں تقسیم کئے گئے ہیں (۱) زمینی پودے (۲) سہارا طلب پودے (۳) آبی پودے (مینا جھاڑ) (۴) مفت خور پودے (Parasites) (۵) مردار خوار پودے (Saprophytes) جماعت نمبر ۴ اور ۵ باعتبار اپنی حصول خوراک کے قائم کی گئی ہیں۔

زمینی پودے - یہ وہ پودے ہیں جن کی جڑیں زمین میں وسعت کے ساتھ پھیل جاتی ہیں۔ ان کے درمیان بھی ہم کو کئی نمونے ملتے ہیں پہلا نمونہ ان پودوں کا ہے جو تری میں مثلاً دلدلوں میں اور دریاؤں کے کنارے اُگتے ہیں اور اس وجہ سے آبی پودوں سے نزدیک تر ہوتے ہیں یہ "نم پسند" پودے کہلاتے ہیں، یہ عموماً دراز قامت۔ بہت زیادہ بڑھنے والے اور کانٹوں سے صاف ہوتے ہیں۔ ان میں مساموں کی کثرت، اور پتے اوپر کی جھلی بہت باریک ہوتی ہے۔ جڑیں عموماً مضبوطی سے پھیلی ہوئی نہیں ہوتیں۔ پتیوں کا سر نوکدار ہوتا ہے۔ ایسے نم پسند درختوں کی مثالیں تاڑ، کیلا وغیرہ ہیں۔

زمینی پودوں کا دوسرا نمونہ ہم کو "خشکی پسند" ملتا ہے اور چونکہ یہ درخت خشک، گرم اور ریتیلے ملک میں پائے جاتے ہیں جہاں پانی بکثرت

مہیا نہیں ہو سکتا اور جہاں گرمی کی وجہ سے پانی اڑنے کا زیادہ امکان ہوتا ہے، اس لئے پودوں کو اپنے لئے پانی کفایت شعاری سے استعمال کرنے کا اور پانی جمع رکھنے کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے پودے صرف خشک ملکوں ہی میں پائے جائیں بلکہ ان تر حصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ جہاں اونچائی کی وجہ سے اور تیز ہواؤں کے چلنے سے عمل تبخیر (پودوں سے پانی کا اڑنا) زیادہ ہوتا ہے یا جہاں خنکی کی وجہ سے اور زمین میں گلے سڑے محلول کی مقدار زیادہ ہونے کے سبب سے پودے کو پانی کھینچنے میں دقت ہوتی ہے۔

پانی کفایت سے خرچ کرنے کے لئے پودے میں یہ انتظامات ہوتے ہیں (۱) رس دار تنے اور دبیز پتیاں (۲) تبخیر کو کم کرنے کے لئے پتیوں کا ایک جگہ جمع ہو جانا (۳) پتے کی سطح کا کم ہونا۔ (۴) حاشیہ کی طرف سے پتیوں کا مڑ جانا۔ (۵) سب سے باہر کی جھلی کا موٹا ہونا (۶) پتیوں اور تنوں کا بالوں سے ڈھکنا (۷) مساموں کا سطحی نہ ہونا بلکہ ذرا گہرائی میں ہو کر تبخیر میں کمی ہو جانا وغیرہ وغیرہ

خشکی پسند پودوں کی مثالیں ناگ پھن اور ببول ہیں۔

مذکورۂ بالا دونوں نمونوں کے درمیان ایک تیسرا نمونہ "درمیانی پودوں" کا ہے ان کی ترکیب خشکی پسند اور نم پسند کے درمیان ہے، بعض ان میں خشکی پسند سے اور بعض نم پسند سے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

درخت جو برگ ریز ہوتے ہیں موسم سرما میں "خشکی پسند" کے آثار ظاہر کرتے ہیں اور موسم گرما میں ان میں باریک پتیاں آتی ہیں جو ان کو نم پسند پودوں کی مشابہ بنا دیتی ہیں، ہم ایسے پودوں کو دورنگی کہیں گے، لیکن ایسا صرف ان چوبی درختوں میں ہوتا ہے جو برگ ریز ہوتے ہیں۔ سدا بہار پودے کم و بیش خشکی پسند ہوتے ہیں۔

اب ہم ابتدائی تقسیم کی دوسری جماعت یعنی سہارا طلب پودوں پر آتے ہیں، اس میں وہ پودے شامل ہیں جو دوسرے درختوں کے سہارے سے اوپر چڑھتے ہیں اور روشنی اور ہوا سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ دوسرے درختوں کی خوراک میں شامل نہیں ہوتے بلکہ صرف سہارا تلاش کرتے ہیں۔ ان میں اکثر تھوڑے بہت "خشکی پسند" پودے کے علامات نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ منطقہ حارہ کے جنگلوں میں بکثرت اگتے ہیں۔ منطقہ حارہ میں ان کا ہونا زیادہ تر ہوا کی دائمی تری پر منحصر ہے۔ اسی وجہ سے وہ سنگاپور، لنکا اور ہمالیہ کے مشرقی پہاڑوں میں بکثرت ہوتے ہیں، اور ہندوستان کے خشک میدانوں میں نہیں ہوتے۔ عموماً اس قسم کے پودے ان گھنے جنگلوں میں ہوتے ہیں جہاں اندھیرا رہتا ہے اور اس سہارے سے یہ روشنی تک پہنچنے کے قابل ہوتے ہیں، ان میں بھی دو نمونے ہیں ایک تو وہ جو سہارا دینے والے درخت کے تنے کے چاروں طرف حلقے ڈالکر اوپر پہنچتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح زمین کی کشش کا طبعی اثر اس میں مدد دیتا ہے۔ دوسرا نمونہ ان سہارا طلب پودوں کا ہے جو "سوتی اعضا" کے ذریعہ سے اوپر پہنچتے ہیں۔ یہ سوتی اعضا بعض پودوں میں بدلے ہوئے تنے ہوتے ہیں، اس کی مثال انگور کی بیل ہے، بعض میں گوشک ([illegible]) اپنی شکل بدل کر تاگے کی مانند ہو جاتے ہیں، اور پودا ان کے ذریعہ سے اوپر چڑھتا ہے اس کی مثال مٹر کا پودا ہے بعض میں پتیاں اور بعض میں جڑیں اس شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں (جس پودے میں جڑ سوتی اعضا میں تبدیل ہوتی ہے، اس میں زمین سے خوراک حاصل کرنے والی جڑیں اس کے علاوہ ہوتی ہیں)

آبی پودے۔ ان میں بعض تیرتے ہوئے اور بعض ڈوبے ہوئے (تہ آبی) ہوتے ہیں۔ چونکہ پانی کم و بیش روشنی کے اثر کو روکتا ہے

اس لئے آبی پودے سایہ میں رہنے والے پودوں کے مشابہ ہوتے ہیں، لمبی پوریاں ہوتی ہیں، اور خضر دانے حول جلد میں رہتے ہیں، چونکہ اُن میں پانی تمام ڈوبی ہوئی سطح سے جذب ہوتا ہے اس لئے سب سے باہر کی جھلی سخت نہیں ہوتی۔ چونکہ تبخیر کا موقع سوائے تیرتے ہوئے پتوں کے اور دن میں بہت کم ہے اس لئے مسامات (سوائے تیرتے ہوئے پتوں کے) تقریباً غائب ہوتے ہیں، جڑیں بھی عموماً غائب ہوتی ہیں۔ چوبی ریشہ آبی تنوں کے درمیان واقع ہوتا ہے، جہاں وہ پانی کے تیز تھپیڑوں سے محفوظ رہتا ہے۔ اگر پودا رواں پانی میں رہتا ہے تو پتیاں فیتہ کے مانند ہوتی ہیں جس سے بہتے ہوئے پانی کا مقابلہ بہتر ہو سکتا ہے۔ ٹھیرے ہوئے پانی کے پودوں میں پتیاں بہت اُبھرے دانے دار ہوتی ہیں۔ تنے میں بہت سے بڑے بڑے ہوائی خلئے ہونیکی وجہ سے سانس کے لئے ہوا پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ تیرنے کے لئے ہلکا ہو جاتا ہے۔

تیرتی پتیوں کے کف ([illegible]) عموماً بلاسی شکاف کے اور چوڑے چکلے ہوتے ہیں جیسا کہ ہم کنول کے پودے میں پاتے ہیں ان پتیوں کی ساخت زمین کی پتیوں کی مانند ہوتی ہے، لیکن اُن میں ہوائی خلئے بہت بڑے ہوتے ہیں اور ان ہوائی راستوں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں جو پتے کے ڈنٹھل میں ہوتے ہوئے تہ آبی تنے اور جڑ میں پہنچتے ہیں۔ یہ ہوائی خلئے نہ صرف پودے کو سیدھا تیرنے میں مدد دیتے ہیں بلکہ تہ آبی حصوں کو (جہاں سانس لینے کے لئے ہوا نا کافی ہوتی ہے) ہوا بھی مہیا کرتے ہیں۔

کاربن ڈائی اوکسائڈ پانی میں بہت جلد حل ہو جاتا ہے اس لئے پانی کے اندر اس گیس کا حصہ زیادہ رہتا ہے۔ چونکہ تہ آبی پودوں کو پانی کیمیاوی نمک، کاربن ڈائی اوکسائڈ اور آکسیجن اس قدر آسانی سے اور افراط کے ساتھ ملجاتے ہیں اس لئے یہ پودے بہت جلدی بڑھتے ہیں، اُن کی شاخیں بہت آزادی سے پھیلتی ہیں اور نباتی تولید (Vegetative Reproduction) بکثرت ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے زمینی پودوں کی بہ نسبت پھول کم آتے ہیں، اور جن تھوڑے پودوں میں پھول ہوتے ہیں اُن میں زیرگی (Pollination) پانی کے ذریعہ سے ہوتی ہے بہت سے تہ آبی پودے پھول آنے کے وقت سطح پر آجاتے ہیں اور تب پھولوں میں زیرگی ہوا اور بھنگوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

مفت خوار پودے :- یہ پودے کسی ترکیب سے دوسرے پودے (میزبان) سے بنی بنائی خوراک لیتے ہیں۔ ایسے پودوں کو خضرہ کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض تو اپنی کل خوراک کا بار دوسروں پر ڈالتے ہیں اور بعض تھوڑی خود آپ بنا لیتے ہیں اور باقی دوسروں سے حاصل کرتے ہیں اسکی مثال ہندوستان میں اکاش بیل بہت عام ہے اسکی کونپل پیچ کھاتی ہوئی اوپر کی جانب بڑھتی ہے اور ایک چھوٹی سی جڑ زمین میں جاتی ہے، اگر اس کونپل کو کوئی مناسب "میزبان" ملجاتا ہے تو یہ چھوٹے چھوٹے خارنما "خوراک چوسوں" کے ذریعہ سے میزبان کے کچھ حصہ پر قبضہ کر لیتی ہے تھوڑے عرصہ میں اسکی جڑ سوکھ جاتی ہے اور زمین سے اسکا کوئی تعلق نہیں رہتا اسطرح یہ مفت خور پودہ اپنے میزبان سے "خوراک چوسوں" کے ذریعہ سے کھانا حاصل کرتا ہے۔ اگر کوئی مناسب میزبان میسر نہیں آتا تو کونپل بالکل سوکھ جاتی ہے چونکہ اس پودے کو پتیوں کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی اسلئے وہ بالکل بھوسی کی مانند ہوتی ہیں۔

مردار خوار پودے :- یہ وہ پودے ہیں جو اپنی خوراک سادہ اجزا سے نہیں بنا سکتے بلکہ تیار کی ہوئی خوراک مردہ پودوں یا مردہ جانوروں سے حاصل کرتے ہیں

—— شمعون احمد (بی اس سی) ——

خط کا جو نسخہ اصل علامہ محمد علی تاج خط لکھنے کے علاوہ کسی دوسرے کو دستیاب نہ ہو سکا

عرضِ نیاز

بارگاہِ نبوی میں

تھا یہ ترے کمال کا، ایک نشانِ برتری
ورنہ عرب کے گلّہ بان، اور دماغِ قیصری

تیرا ظہور ملتِ حق کے لئے، پیامِ روح
تیری نمود، فردِ ختمِ جمود کافری

پھول ہنسے چمن کھلے، سازِ نشاط چھڑ گئے
جلوۂ رنگ بن گئی شبنمِ صبح کی تری

"ذرّے" ابھی ابھی جو تھے، دہر ہوا میں منتشر
علتِ نظمِ کائنات بن گئی اُن کی ابتری

"قطرے" جنھیں شعاعِ مہر سطح سے کر رہی تھی جذب
غایۂ قلزمِ حیات، ہو گئی اُن کی مضطری

گردِ تعب میں چھپ گیا، تیرا اوجِ خسروی
رعبِ اثر سے ہل گیا قصرِ شکوہِ قیصری

نغمۂ حق اِدھر ہوا تیرے رباب سے بلند
رک گئے دفعتاً اُدھر سازِ نوائے کافری

جبکہ مدارِ زیست تھا، عشرتِ فتنہ ساز پر
جبکہ، شعارِ قوم تھی، نفس کی طرزِ خود سری

تو نے بتا دیا کہ تھی عجز میں عظمتِ عروج
تو نے دکھا دیا کہ ہے فقر میں شانِ قیصری

تیرے نفس سے بجھ گئی کفر کی شمعِ صدق سوز
تیرے بیاں سے دب گئی نطق کی سحر پروری

تیرا پیام حاملِ رازِ حیاتِ سرمدی
تیرے غلام زینتِ مرتبۂ سکندری

تیرا نشانِ مکرمت، ذروں کی مہر طلعتی
تیری نگاہِ مرحمت مہر کی ذرّہ پروری !!

تیرے کرم کا مقتضی، فیصلۂ حدیبیہ
تیری نظر کا معجزہ صولتِ فتحِ خیبری

قلزمِ عظم الصفات! تیرے کرم کی ایک موج
عظمتِ صدقؓ نعمتِ علمؓ و کمالِ صفدریؓ

مہرِ فروغِ کائنات! تیری عطا کی اک شعاع
عزّ سیادتِ بلالؓ رتبۂ فقرِ بوذری

تیرے ثباتِ عزم سے ضبطِ شہیدِ کربلاؓ
تیرے شکوہِ رزم پر سطوتِ زورِ حیدری

جن کی بساطِ شوق تھا دامنِ ساحلِ خموش
تو نے انھیں عطا کیا حوصلۂ شناوری

ذات سے تیری منضبط حسنِ حصینِ کائنات
نام سے تیرے مفتخر، اوجِ صفا سروری

کیسے کہوں شہِ رسل، میں بھی ترا غلام ہوں
قبلۂ بندگی مرا، تیرا حریمِ سروری

نفس ذلیل و خود پرست عقل ضعیف و ہرزہ کار
سلسلۂ عمل نہیں لوثِ گناہ سے بری

بڑھتے گئے حجاب اور دیدۂ شب پرست پر
دیتی رہی بہ بام دید صبح کی جلوہ گستری

قابلِ عفو، گو نہیں میری سیاہ کاریاں
بندہ نواز ہے تری شانِ عطائے سروری

کون و مکاں کے رازِ خلق! تیری لطیف طبع پر
گردِ ملالِ ناگوار، دیدۂ غیر کی تری

امن و امان کے اذنِ عام! تیرے رحیم قلب میں
باعثِ کاوشِ گراں بزمِ عدو کی ابتری

تیری نظر حسین حسین مژدۂ دورِ انبساط
تیری جبیں کی ہر شکن مائلِ بندہ پروری

رحم! کہ اے شہِ امم زہر ہے زندگی کی سانس
ضبط کی حد سے بڑھ گئی دہر کی ستم گستری

ٹوٹ رہے ہیں دم بدم جانِ حزیں پہ سنگِ غم
پیہم ہی ہو رہی ہے گردشِ چرخِ چنبری

تیرا مطیع اور یوں صیدِ زبونِ روزگار
تیرا غلام اور یہ بارشِ تیرہ اختری

خاکِ رہِ نیاز ہوں رتبۂ اتقیا نہ دے
حوصلۂ بلند دے ہستیِ سرفراز دے

سیّد علی اختر اختر

غزل

دل کی حالت ہی عجب طرح کی ہو جاتی ہے
وسعتِ شوق میں تدبیر بھی کھو جاتی ہے

جلوہ کر دیتا ہے گم گشتۂ حیرت مجھکو
وہ جو ملتے ہیں تو ہستی مری کھو جاتی ہے

روبرو اُس کے بھلا ذکرِ تمنا کیسا
میں سمجھتا ہوں جو حالت مری ہو جاتی ہے

اب تری یاد کا وہ رنگِ نوازش ہی کہاں
اب تو اک تیر سا سینے میں چبھو جاتی ہے

مختصر حال یہی ہے شبِ تنہائی کا
میری تقدیر جگا کر مجھے سو جاتی ہے

کیا عجب مجھکو کسی سے جو سروکار نہیں
دل کی حالت ہی محبت میں یہ ہو جاتی ہے

دل پہ چھا جاتا ہے اک بیخبری کا عالم
اُس کے جلوؤں میں تمنا مری کھو جاتی ہے

جب شبِ وعدہ کی ہوتی ہے نمودارِ سحر
دامنِ یاس میں قسمت مری سو جاتی ہے

اور تو کوئی نہیں ہجر میں پرساں ہادی
بیکسی حال پہ اکثر مرے رو جاتی ہے

ہادی مچھلی شہری

سیّد حیدر بخش حیدری

اردو علم ادب کی تاریخ میں یہ امر کچھ کم قابل تعجب نہیں کہ انگریز جو ہندوستانیوں سے وضع قطع۔ صورت شکل۔ زبان و مذہب وغیرہ میں بالکل جدا ہوں اس کی نشر و اشاعت میں حصہ لیں۔ یہ اردو زبان کی خوبی اور ہندوستانیوں کی عام زبان ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کو چھوڑ کر انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کے لئے اردو کا جاننا ضروری سمجھا۔ یورپین اقوام کے کئی افراد نے اس زبان سے اس قدر اُنس پیدا کر لیا تھا کہ اس میں شعر کہہ سکتے تھے۔ چنانچہ کئی ایک انگریز ایسے دریافت ہوئے ہیں جو اردو کے شاعر تھے اور ان میں سے بعض تو مبسوط دیوان اپنی یادگار چھوڑ گئے اردو نثر نویسی کو رواج دینے اور اس کو منظر عام پر لانے کی خدمت بھی اہل یورپ ہی نے انجام دی اور اس زبان کے قواعد وغیرہ پر غالباً سب سے پہلے انہیں لوگوں نے کتابیں لکھیں۔ فورٹ ولیم کالج نے نثر نویسی کی اساسی تحریک کر کے اردو ادب پر وہ احسان کیا جس کو اردو داں پبلک اور آئندہ نسلیں کبھی نہیں بھلا سکتیں۔ اس کالج کے ادبی خدمات پر مولوی عبدالحق صاحب نے ایک بسیط مضمون انگریزی ماخذوں سے رسالہ اردو بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۲ء میں لکھا ہے اس میں موصوف نے فورٹ ولیم کالج کی تاریخ پر مفصل بحث کی ہے، اور کالج کے متعدد انگریز اور ہندوستانی مصنفین کی تالیفوں اور ترجموں کا بھی اجمالی طور پر ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر جان گل کرسٹ جو اس کالج کا افسر اعلیٰ اور ہندی ادبیات کا پروفیسر تھا، اردو کا بہت بڑا خیر خواہ و محسن ہے۔ یہ اس کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ اردو ادب کی ٹھیٹ کتابیں، مستند شعرائے اردو کے دیوان اور دیگر ایسے کارنامے جن پر زبان و ادب کی بنیاد ہے ملک میں شائع ہوئے اور ہر گوشے میں پھیل گئے۔ وہ خود بھی کثیر التصانیف مصنف گزرا ہے اور اس کی سرپرستی میں بعض ایسی بیش بہا کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں جن سے اردو علم ادب میں نہ صرف اضافہ ہوا بلکہ تصنیف و تالیف کا ایک نیا باب کھل گیا منجملہ اور مؤلفین کے جو فورٹ ولیم کالج سے متعلق ہیں مندرجہ ذیل دس کے نام بہت مشہور ہیں۔

(۱) سید حیدر بخش حیدری (۲) میر بہادر علی حسن (۳) میر امن دہلوی (۴) حفیظ الدین احمد (۵) میر شیر علی افسوس
(۶) نہال چند لاہوری (۷) کاظم علی جوان (۸) للو لال کوی (۹) مظہر علی ولا (۱۰) اکرام علی

انشاء اللہ کسی اور موقع پر ان سب کے حالات و تصانیف کی کیفیت ہدیۂ ناظرین کی جائیگی، فی الحال سید حیدر بخش حیدری کا مجمل تذکرہ پیش کیا جاتا ہے۔

سید حیدر بخش حیدری دہلی میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا۔ والد کا نام سید ابو الحسن دہلوی ہے، ان کے آبا و اجداد زمانۂ قدیم میں اپنے وطن نجف سے ہندوستان آئے اور دہلی میں بود و باش اختیار کی۔ فکر معاش اور گردش زمانہ سے ابو الحسن کو اپنا وطن دہلی ترک کر کے کسی اور جگہ سکونت اختیار کرنی پڑی۔ چنانچہ ابھی حیدر بخش بہت کم عمر تھے کہ ان کے والد نے لالہ سکھدیو رائے کی معیت میں دہلی کو خیرباد کہا اور بنارس

میں جا رہے۔

گو دہلی کے باغ ادب میں اس وقت پت جھڑ شروع ہو گئی تھی اور خال خال لوگ ایسے موجود تھے جن پر دہلی کو بجا ناز ہے، اس گئی گزری حالت میں بھی وہاں کے باکمال اور ارباب فن غنیمت تھے۔ حیدر بخش کے لئے دہلی کا ترک کرنا ظاہرا ایک بڑی بدقسمتی تھی کیونکہ کسی دوسرے شہر میں وہ عالمانہ صحبتیں اور علمی چرچے جو دہلی میں تھے، مل نہیں سکتے تھے۔ مگر خدا کی عنایت کچھ ایسی شامل حال تھی کہ بنارس میں بھی ان کو اعلیٰ ادبی تعلیم حاصل کرنے اور ارباب کمال کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔

اتفاق سے نواب علی ابراہیم خان خلیل[۱] لارڈ ہیسٹنگز کے عہد میں بنارس کے ناظم عدالت مقرر ہوئے تھے۔ پٹنہ کے باشندے تھے اور فارسی زبان کے کثیر التصانیف عالم تھے، شعر گوئی کا اعلیٰ مذاق پایا تھا، اور اپنے زمانہ کے عمدہ شعرا میں گنے جاتے تھے، ان کی متعدد تصانیف میں ایک تذکرہ شعرائے اردو جس کا نام گلزار ابراہیم ہے، اردو ادب کے لحاظ سے قابل قدر یادگار ہے اس کا سنہ تالیف سنہ ۱۱۹۸ھ م سنہ ۱۷۸۴ء ہے اور اس کو مصحفی و شیفتہ کے تذکروں پر تقدم کا فخر حاصل ہے۔ اس تذکرہ میں تقریباً تین سو شعرائے اردو کے مجمل حالات اور انتخابی اشعار درج ہیں[۲]۔

ابوالحسن کو اپنے لڑکے کی تعلیم کے لئے خوش نصیبی سے ایسا لائق شخص مل گیا چنانچہ حیدر بخش ان کے سپرد کئے گئے، اور علوم متعارفہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ادبیات کی بوقلمونیوں اور باریکیوں سے بھی واقف ہونے کا موقع مل گیا، خلیل نے ان کو قاضی عبدالرشید نام ایک عالم کے تحت کسی خدمت

---

[۱] مولوی عبدالحق صاحب نے مقدمۂ گلشن ہند مولفہ مرزا علی لطیف میں انکا تخلص علی لکھا ہے، ایک اور کتاب میں خلیل بھی ان کا تخلص لکھا ہے۔ علی اور خلیل کو ان کے نام کے ساتھ زیادہ مناسبت ہے اور بہت ممکن ہے کہ خلیل ہی ان کا تخلص ہو۔

---

[۲] ان کی دیگر تصنیفات کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) خلاصۃ الکلام
(۲) صحف ابراہیم
} یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔

(۳) وقائع جنگ مرہٹہ۔ یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس سنہ ۱۲۰۰ھ میں لکھی گئی، اس میں سنہ ۱۱۶۰ھ سے لیکر سنہ ۱۱۹۹ھ تک کے حالات درج ہیں۔ میجر فلر نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں۔ اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے لیکر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں سے یہ جنگ دیکھی تھی۔

(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کی بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے۔

(۵) خطوط جو برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں اور جن سے اس زمانہ کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

پر مامور کر دیا، جہاں حیدری نے ان دونوں کے فیض تربیت سے ادب میں مہارت پیدا کی، اس کے علاوہ مذہبی علوم مثلاً حدیث، فقہ، تفسیر وسیر وغیرہ کی تعلیم مولوی غلام حسین صاحب غازی پوری سے حاصل کی۔ مولوی صاحب موصوف نواب علی ابراہیم کی عدالت میں کسی خدمت پر مامور تھے۔

سترہویں صدی عیسوی کے اواخر ایام میں فورٹ ولیم کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے یورپین ملازموں کو اردو کی تعلیم دینے کا تصفیہ ہوا، اور ڈاکٹر گل کریسٹ اردو کی کتابیں حاصل کرنے اور ملک کے مختلف مقاموں سے علما کو مدعو کرکے ان سے تالیف و تراجم کرانے لگے، ہندوستان کے مختلف صوبوں سے اہل علم اس علم دوست انگریز کے پاس آنے لگے، اور گل کریسٹ نے ان کا امتحان لیکر اکثر کو شعبۂ تالیف و ترجمہ میں ملازم رکھ لیا۔ اسی زمانہ میں سنہ ۱۲۱۴ھ کے قریب حیدر بخش نے بھی جو تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے کلکتہ جانیکا ارادہ کیا اور تقریب سفر کے طور پر ایک کتاب قصہ مہر و ماہ کے نام سے مرتب کی جب یہ کتاب ڈاکٹر گل کریسٹ نے دیکھی تو اس کی طرز بیان کی سلاست اور خوبی مطالب سے اس قدر متاثر ہوا کہ فوراً ان کو منشیان کالج کے زمرہ میں ملازم رکھ لیا۔ یہاں سے ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، اس میں بائیس سال کے عرصہ میں انہوں نے مختلف کتابیں ترجمہ کرکے اردو ادب کی شاندار خدمات انجام دیں، اور کالج کے دیگر منشیوں کی طرح اردو ادیبوں میں شمار ہونے لگے۔

ان کی صحیح تاریخ ولادت و تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی۔ ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ کسی واقف حال شخص نے اس سے بیان کیا کہ حیدر بخش کی تاریخ وفات سنہ ۱۸۲۳ء ہے۔

حیدر بخش کثیر التصانیف مولف ہیں۔ ان کی اکثر کتابیں فارسی سے ترجمہ کی ہوئی ہیں۔ تالیفات کی تعداد دس گیارہ بتائی جاتی ہے۔ سب سے پہلی کتاب قصہ مہر و ماہ ہے۔ اس کے بعد سے مندرجہ ذیل کتب تالیف و ترجمہ ہو کر عالم ظہور میں آئیں۔

(۲) قصہ لیلیٰ مجنوں (۳) طوطا کہانی (۴) آرائش محفل (۵) ہفت پیکر (۶) تاریخ نادری
(۷) گل مغفرت (۸) گلزار دانش (۹) گلدستہ حیدری (۱۰) تذکرہ گلشن ہند

(۱) قصہ مہر و ماہ۔ اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۴ھ ہے، غالباً یہ ان کی سب سے پہلی ادبی کوشش ہے۔ اسی کتاب کو ڈاکٹر گل کریسٹ کے سامنے پیش کرکے انہوں نے اپنی قابلیت و اہلیت کا اظہار کیا تھا۔

(۲) قصہ لیلیٰ مجنوں۔ یہ حضرت امیر خسرو کی مشہور فارسی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ ہے اور سنہ ۱۲۱۴ھ ہی میں مرتب ہوا۔

(۳) توتا کہانی۔ سنسکرت میں سب سے پہلے شکا سپ تتی (یعنی طوطے کے ستر قصے) کے نام سے ایک کتاب تصنیف ہوئی تھی ضیاء الدین نخشبی نے سنہ ۷۳۰ھ (سنہ ۱۳۳۰ء) میں اس کتاب سے باون قصوں کو انتخاب کرکے فارسی میں طوطی نامہ کے نام سے ترجمہ کیا تھا۔ سنہ ھ میں ملا سید محمد قادری نے نخشبی کے ترجمۂ مختصر و آسان کرکے ایک اور نسخہ مرتب کیا اور بجائے باون قصوں کے پینتیس ۳۵ قصوں کو بحال رکھا۔ حیدر بخش نے سنہ ۱۲۱۵ھ میں ڈاکٹر گل کریسٹ کے حکم سے محمد قادری کے مرتبہ نسخے کا ترجمہ کیا۔ یہ کہانیاں ایک عرصہ تک ہندوستان میں مقبول خاص و عام رہیں۔ جس کا ثبوت اس امر سے بخوبی ملتا ہے کہ اس کے متعدد ترجمے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہوئے اور ایک ترجمہ انگریزی بھی، جی اسمال (G. Small) نام ایک شخص نے لندن سے شائع کیا۔

ڈاکٹر گل کریسٹ نے ایک کتاب ہندی مینول یا بیاض ہندی کے نام سے مرتب کی تھی، اس میں فورٹ ولیم کالج کے منشیوں کی عمدہ تالیفات کے

انتخابات صحیح ہیں۔ حیدر بخش کی طوطا کہانی کا ایک اقتباس سب سے پہلے اسی میں شریک کیا گیا: ایک مدت تک طوطا کہانی اردو تعلیم کے نصاب میں بھی داخل تھی۔ اس کا سب سے پہلا ایڈیشن کلکتہ سے سنہ ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا۔ جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے اس کے بعد کئی اور ایڈیشن ہندوستان کے مطبعوں اور لندن سے بھی شائع ہوئے۔

یہ کتاب اردو کی قدیم کتب نثر میں سے ہے۔ حیدر بخش کے ترجمے سے بہت عرصہ پہلے دو تین دکھنی شاعروں نے بھی اس کا ترجمہ کیا ہے۔ چنانچہ نخشی کے طوطی نامہ کے دو منظوم ترجمے دکھنی میں موجود ہیں۔ ایک ترجمہ غواصی نے سنہ ۱۰۴۹ھ میں اور دوسرا ابن نشاطی نے سنہ ۱۰۶۶ھ میں کیا تھا۔ غواصی اور ابن نشاطی گولکنڈہ کے ہمعصر شعرا ہیں۔ ایک اور نسخہ کتب خانہ کلیہ جامعہ عثمانیہ میں ہے، جو محمد قادری کے طوطی نامہ کا ترجمہ ہے۔ مترجم کا نام اور حالات معلوم نہیں البتہ سنہ ترجمہ ۱۱۴۲ھ معلوم ہوتا ہے۔ حیدری کی طوطا کہانی کا دیباچہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے جس سے اُن کا انداز بیان اور کچھ خود نوشتہ حالات بھی معلوم ہوتے ہیں۔

"احسان اس خدا کا کہ جس نے دریائے سخن کو اپنے ابر کرم سے گوہر معنی بخشا اور زبان کو واسطے اپنی حمد کے گویا کیا، اور پیغمبر آخر الزماں کو ہم گناہ گاروں کی شفاعت کے واسطے رحمت للعالمین پیدا کیا، کہ جس کے سبب سے ارض و سما نے قیام پایا۔ حسن۔ وہ الحق کہ ایسا ہی معبود ہے۔ قلم جو لکھے اس سے افزود ہے۔ پیمبر کو بھیجا ہمارے لئے۔ وصی اور امام اس نے پیدا کیا۔ سبھوں کا وہی دین و ایمان ہے۔ یہ دل دل تمام اور وہی جان ہے - - - - - - - - - - - - -

یہ سید حیدر بخش متخلص حیدری شاہ جہاں آبادی تعلیم یافتہ مجلس خاص نواب علی ابراہیم خاں بہادر مرحوم، شاگرد غلام حسین خاں غازی پوری، دست گرفتہ صاحب عالی جناب سخندان، آبرو بخش سخنوراں، معدن مروت، چشمہ فتوت، دریائے جود و کرم منبع علم و حلم صاحب والاشان، جان گل کرسٹ صاحب بہادر دام اقبالہ کا ہے، اگرچہ تھوڑا بہت ربط موافق اپنے حوصلے کے عبارت فارسی میں بھی رکھتا ہے، لیکن بموجب فرمائش صاحب موصوف کے سنہ ۱۲۱۵ھ م سنہ ۱۸۰۰ء کے عملداری میں سرگروہ ایران جہاں، حامی غریبان و بیکساں، - - - - - - مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان مارکوئس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام اقبالہ کی محمد قادری کے طوطی نامہ کا جس کا ماخذ طوطی نامہ ضیاء الدین نخشی ہے، زبان ہندی میں موافق محاورہ اردوئے معلی کے نثر میں موافق عبارت سلیس و خوب و الفاظ رنگین و مرغوب ترجمہ کیا، اور نام اس کا طوطا کہانی رکھا۔ تا صاحب نوآموزوں کی فہم میں جلد آوے۔ اور ہیچمدان ہر ایک اہل سخن سے امیدوار ہے کہ جو کوئی چشم غور سے اس ترجمہ کو ملاحظہ کرے اور غلطی معنی یا نامربوطی الفاظ اس کی نظر پڑے تو شمشیر قلم سے مانند سر دشمن اس صفحۂ ہستی سے اسے اڑا دے -"

(۴) آرائش محفل۔ یہ قصہ حاتم طائی کا ترجمہ ہے۔ جو کسی فارسی کتاب سے سنہ ۱۲۱۶ھ م سنہ ۱۸۰۱ء میں کیا گیا، اس کی پہلی اشاعت کلکتہ میں تاریخ ترجمہ کے دو سال بعد سنہ ۱۸۰۳ء میں ہوئی اسکے بعد دہلی، لکھنو، کان پور، بمبئی، اور مدراس کے مطابع سے کئی مرتبہ شائع ہوئی اس کا ترجمہ بنگالی، ہندی، گجراتی میں بھی ہوا۔ جس سے حیدر بخش کی آرائش محفل کی مقبولیت عامہ کا پتہ چلتا ہے۔

(۵) ہفت پیکر۔ یہ ایک مثنوی ہے جو حضرت نظامی گنجوی کی مشہور فارسی مثنوی ہفت پیکر کے طرز پر لکھی گئی ہے اس کا سن تصنیف ۱۲۲۰ھ م ۱۸۰۵ء ہے۔

(۶) تاریخ نادری۔ مرزا محمد مہدی نے فارسی میں نادر شاہ کے عہد کی ایک مبسوط تاریخ لکھی تھی۔ حیدر بخش نے ۱۲۲۴ھ میں اس کا یہ ترجمہ کیا۔

(۷) گل مغفرت۔ ملا حسین واعظ کاشفی نے جن کی انوار سہیلی اور اخلاق محسنی سے ہر شخص واقف ہے۔ روضۃ الشہدا کے نام سے ایک کتاب اسلامی شہدا کے حالات پر لکھی تھی حیدر بخش نے اس کا ترجمہ گلشن شہیدان کے نام سے نثر و نظم دونوں میں کیا تھا۔ گل مغفرت اسی ترجمہ کا اختصار ہے۔ اس میں مشہور شہدائے اسلام اور بزرگان دین کے حالات جو عام روایتوں سے ماخوذ ہیں درج ہیں، اس کتاب کا دوسرا نام دہ مجلس بھی ہے۔ ۱۲۲۷ھ م ۱۸۱۲ء میں ترجمہ ہوئی اور اسی سال کلکتہ سے شائع ہوئی، ایم برٹ اینڈ (M. Bertrand) نام ایک فرانسیسی نے فرنچ میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔

(۸) گلزار دانش۔ شیخ عنایت اللہ کی فارسی بہار دانش کے ایک قصہ کا ترجمہ ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ ترجمہ کس سن میں ہوا۔

(۹) گلدستۂ حیدری۔ یہ مختلف مضامین نثر و نظم کا مجموعہ ہے اس کا سن تصنیف ۱۲۱۸ھ "بنا تازہ گلدستہ حیدری" سے نکلتا ہے۔ اس کے پانچ حصے بہ تفصیل ذیل ہیں۔

(۱) مجموعہ مراثی۔ ان کی تاریخ تصنیف معلوم نہ ہو سکی۔ مرثیوں کا ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے۔

صلوٰۃ بھیجتا ہوں میں اب اس امام پر ‌ ‌ ‌ جس نے کہ سر کٹا دیا امت کے نام پر

(۲) مجموعہ حکایات۔ اس حصہ میں کچھ اپنی سوانح عمری اور سو سے زیادہ قصے درج ہیں۔

(۳) قصہ مہر و ماہ کا دیباچہ۔

(۴) قصہ لیلیٰ و مجنوں کا دیباچہ اور مقدمہ۔

(۵) دیوان غزلیات۔ جس میں علاوہ غزلوں کے قطعے، قصیدے۔ ہجویں۔ اور دیگر متفرق نظمیں بھی شریک ہیں۔

گلدستہ حیدری کے بعض نسخوں میں ان پانچ حصوں کے علاوہ ایک چھٹا حصہ بھی ہے جو اردو شعرا کا تذکرہ ہے۔ لیکن یہ خود مستقل تالیف کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کو علیحدہ تصنیف کی حیثیت سے دیکھنا مناسب ہے۔

(۱۰) گلشن ہند۔ اس نام کا ایک اور تذکرہ اردو میں موجود ہے۔ حسن اتفاق کہئے یا سوئے اتفاق دونوں تذکرہ ایک ہی زمانہ کے مولفہ ہیں۔ حیدر بخش کی یہ تالیف اب تک پردہ گمنامی میں ہے اور مرزا علی لطف کی تالیف خوش قسمتی سے نہایت اہتمام سے مولوی عبد اللہ مہتمم کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی نے علامہ شبلی نعمانی کی تصحیح و تشریح اور مولوی عبد الحق صاحب کے دلچسپ مقدمہ کے ساتھ ۱۹۰۶ء میں شائع کی بادی النظر میں دونوں تذکروں کا ایک ہی نام ہونے اور ایک ہی زمانے کی تالیفات ہونیکی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے، کہ شاید یہ حقیقت میں ایک ہی تذکرہ ہے، لیکن خود تذکروں کے دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باوجود دونوں ایک ہی زمانے کی تالیف شدہ ہیں، اور

دونوں کا نام بھی ایک ہی ہے لیکن دونوں علیحدہ علیحدہ دماغ کی پیداوار ہیں۔ وضاحت کی خاطر پہلے مرزا علی لطف کی تالیف کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ جیساکہ مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمے سے ظاہر ہے۔ علی ابراہیم خاں کا تذکرہ گلزار ابراہیم نام جو فارسی زبان میں لکھا ہوا تھا، ڈاکٹر گل کرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے مولف تذکرہ ہذا (یعنی مرزا علی لطف) سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو! انکا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں اور ان میں زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اردو میں لکھی گئی، لیکن نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے حالات میں بھی، اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہوگئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہوگئی ہے۔ لطف کے حالات جو خود ان کے تذکرے اور مقدمے سے ظاہر ہیں وہ یہی ہیں کہ ان کا نام مرزا علی، تخلص لطف تھا۔ والد کا نام کاظم بیگ خاں تھا اور استرآباد کے رہنے والے تھے اور ۱۱۵۲ھ میں نادر شاہ کے ساتھ شاہجہان آباد آئے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا۔ فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں مرزا علی اپنے والد ہی کے شاگرد تھے اور ان کے کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرصۂ دراز تک حیدرآباد میں سکونت پذیر تھے۔ خود لطف نے اپنے دیباچہ میں اس تذکرہ کی تاریخ تالیف کے متعلق یہ لکھا ہے ؎

"الحمد اللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ اور ۱۸۰۱ء کے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا اور نام اس کا بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے (جس سے شاید گل کرسٹ یا مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل ہند مراد ہو) گلشن ہند رکھا"

اور دیباچہ کے آخر میں مزید احتیاط کے لئے مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ بھی لکھا ہے۔

ہر ایک گل ہمیشہ بہار اس حدیقہ کا　　کہتا ہے یوں خزاں سے کہ "تو کیا پلشت ہے"

حیراں پھرے ہیں بے سر و پا بھن اور ے　　تاریخ اس کی جب سے کہ "رشک بہشت ہے"

"رشک بہشت" کے اعداد ۱۲۲۷ ہیں سے جب کے اعداد کا تخرجہ کیا جائے تو ۱۲۱۵ھ نکلتا ہے۔ گلزار ابراہیم میں، بیان کیا جاتا ہے کہ تقریباً تین سو شعرا کا ذکر ہے لیکن مرزا علی لطف کے تذکرہ میں صرف ستر شعرا کے حالات ہیں، لطف نے گلزار ابراہیم پر اپنی کتاب کی بنیاد رکھکر بہت کچھ اپنی ذاتی رائے اور قیاس کو دخل دیا ہے۔

حیدر بخش نے اپنے تذکرے کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ وہ ۱۲ رجب ۱۲۱۲ھ کو بنارس سے کشتی میں بیٹھکر مرشدآباد آئے یہ حقیقت میں کلکتہ کا سفر تھا غازی پور کے قریب ان کے ایک دوست مرزا محمد علی دہلوی سے ملاقات ہوئی دونوں اتفاق سے ایک راہ جا رہے تھے۔ مرزائے موصوف نے حیدر بخش کو ایک تذکرہ لکھنے کی رائے دی اور اس میں اس قدر دلچسپی لی کہ کئی شعرا کے دیوان جو اپنے ساتھ رکھتے تھے حیدر بخش کے حوالے کئے۔ تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے "زینت کلام کی اس آفریدگار کی حمد سے ہے کہ جس نے سخن روح افزا کو ہر ایک بشر کی زبان پر جاری کیا" اور لطف کا تذکرہ اس طرح شروع ہوتا ہے "رعنائی اور زیبائی دلبران سخن کو اس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس سے معشوقان زبان ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی ناز فروشان ناطقہ کو اس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے"

اس کی تاریخ تالیف ۱۲۱۴ھ ہے، جو ذیل کے قطعہ سے، جو تذکرہ کے آخر میں درج ہے نکلتی ہے۔

مرتب کر چکا جب تذکرہ میں زور دے حق پہ بوسے مشیخ او رزند
کہی تاریخ اس کی حیدری خوب اسے کہتا ہے ہر ایک گلشن ہند

دونوں تذکروں میں حروف تہجی کی ترتیب سے شعرائے حالات اور کلام کے انتخاب ہیں۔ چنانچہ دونوں میں سب سے پہلے شاہ عالم بادشاہ آفتاب کا ذکر ہے۔ لطف نے اس طرح لکھا ہے "آفتاب تخلص، زیب جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی، شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی، شاہزادگی میں گوہر صدف سلطنت کا نام عالی گوہر تھا" مگر حیدر بخش نے ان الفاظ سے ابتدا کی ہے "مہر سپہر جہاں بانی شاہ عالم بادشاہ عالمگیر ثانی" دیباچے کی ابتدا، قطعۂ تاریخ، اور شاہ عالم بادشاہ کے حالات کی عبارتوں سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علیحدہ علیحدہ مولفوں کی کتابیں ہیں، اور تذکروں کی طرح حیدری کے اس تذکرہ میں بھی شعرا کے حالات نامکمل اور مختصر ہیں، انتخاب کلام زیادہ ہے۔ جس سے تذکرہ گویا گلدستہ بنگیا ہے۔

اکسفورڈ انڈین انسٹی ٹیوٹ کے کتب خانے میں حیدر بخش کے اس تذکرہ کا ایک نسخہ محفوظ ہے۔ ڈاکٹر ڈنکن فوربس نے بھی جس کی اردو لغت بہت مشہور ہے اپنی مرتبہ فہرست کتب مشرق میں اس کا ذکر کیا ہے۔ نیز برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں گلدستۂ حیدری کے چھٹے حصے کی حیثیت سے بھی، ایک نامکمل نسخہ ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہندوستان کے بعض قدیم اور خانگی کتب خانوں میں حیدری کا یہ تذکرہ بھی دستیاب ہو جائے اور پھر اس کی اشاعت ہو جائے تو اردو داں پبلک کو نہ صرف لطف کے ایک ہمعصر مؤلف کے تذکرہ کو لطف کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے دیکھنے کا موقع ملے گا بلکہ جس طرح ہر دو شخصوں کے نقطہ ہائے نظر میں تھوڑا بہت فرق ضرور ہوتا ہے۔ دونوں کے انداز بیان کے ساتھ ساتھ شعرا کے حالات پر جو رائے دونوں نے دی ہے اس کا فرق بھی معلوم ہو جائیگا۔ نیز انتخاب اشعار کے مطالعہ سے، دونوں کے مذاق شعر اور پسندیدگی کلام کا معیار بھی صاف طور پر ذہن نشیں ہو سکے گا۔

سید محمد قادری
(حیدرآبادی)

غزل

قطرہ ہے ایک اشک کا دریا کہیں جسے ذرہ ہے دل کی خاک کا صحرا کہیں جسے
بالیں پہ سب ہیں جمع مری دیکھتی ہے کیا اے روح یوں نکل کہ تماشا کہیں جسے
سوز دروں سے دل میں ہمارے لہو کہاں ہو بھی تو وہ کہ خون تمنا کہیں جسے

کچھ بھی نہیں ہے ایک فریب نگاہ ہے
مہدی حریم ناز کا پردہ کہیں جسے

مہدی اجنالوی علیگ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی ایک شاخ نگار روڈ حیدرآباد دکن میں ہے

قاری نظام الدین عرف شاہ بھکاری قادری کاکوروی

اپریل سنہ ۲۶ء کے نگار میں جناب ناظر صاحب دہلوی نے "شاہ نظام الدین چشتی کاکوروی" کی سرخی سے جو مضمون لکھا ہے اُسکے متعلق خاکسار کا یہ خیال ہے کہ جناب ناظر صاحب دہلوی نے جن بزرگ کو کاکوروی لکھا ہے وہ کاکوروی نہیں بلکہ اورنگ آبادی ہیں، کیونکہ یہاں اورنگ آباد دکن میں اُن نظام الدین چشتی رح کا مزار موجود ہے جو کلیم اللہ جہان آبادی کے مرید اور خلیفہ تھے، جناب ناظر صاحب کو نام کی وجہ سے مغالطہ ہو گیا ہے ورنہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں تو قاری نظام الدین قادری عرف شاہ بھکاری گزرے ہیں جن سے اس ناچیز کا نسبی تعلق ہے، اور حسب ذیل کتابوں میں اُنکے حالات ملتے ہیں :- (۱) تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء مولفہ مولوی عبد الشکور (۲) بحر ذخار مولفہ ملا وجیہ الدین اشرف۔ (۳) بسط باعلی مولفہ مرزا عبد الباسط امیٹھوی (۴) زاد الآخرت، مولفہ ملا عبد الرشید ملتانی (۵) تاریخ اعظمی مولفہ محمد اعظم ابن شمس الدین خان کول) (۶) وفیات الاولیا مولفہ سیف الدین ابن ہاشم نوری (۷) منتخب التواریخ مولفہ ملا عبد القادر بدایونی (۸) بیاض حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (۹) کشف المتواری فی حال نظام الدین قاری مولفہ حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی (۱۰) نفحات النسیم مولفہ مولوی تقی علی (۱۱) نفحات العنبریہ مولفہ حضرت مولانا تقی حیدر کاظمی مدظلہ کاکوروی (۱۲) تاریخ قصبہ کاکوری مولفہ خادم حسن وکیل

جناب ناظر صاحب دہلوی نے خود ہی ایک جگہ شاہ نظام الدین چشتی کاکوروی کی بابت اورنگ آبادی ہونیکا شبہ ظاہر فرمایا ہے، کاکوری میں جو نظام الدین بزرگ گزرے ہیں اور جن کی اولاد وہاں پائی جاتی ہے اُنکے معلومات کی حد تک اُنکے حالات ارسالِ خدمت ہیں"

درد کاکوروی

نظام الدین نام، شاہ بھکاری لقب (پرانے زمانے کے شاہی فرمانوں میں مخدوم شیخ بھیکہ بھی لکھا ہے) سیف الدین والد کا نام تھا۔ والد کی طرف سے آپ حضرت علی کرم اللہ وجہ کی اولاد میں تھے اور والدہ کی طرف سے سید عبد الرزاق بغدادی (ابن سید عبد القادر جیلانی) سے آپ کا نسب ملتا ہے۔

قاری عبید اللہ نامی بزرگ کے وقت تک قصبہ منزام میں (جو خراسان اور بغداد کے درمیان واقع ہے) آپکے اجداد مقیم رہے گو اس عرصہ میں مدینہ طیبہ اور بغداد کے آپکے اجداد نے سلسلہ رشد و ارشاد کافی حصہ صرف کیا قاری محمد صدیق سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے ہندوستان کا سفر اختیار کیا، ہرات، ملتان ہوتے ہوئے لاہور پہنچے اور وہاں پانچ سال تک مقیم رہے، پھر پٹیالہ کی طرف رخ کر دیا، یہاں اپنے چھوٹے بیٹے نجم الدین کو (جنکی ایک سیدانی سے پٹیالہ میں شادی کر چکے تھے) چھوڑ کر مظفر خاں صوبہ دار اودہ اور حاجی محمد خاں تاجر کے اصرار سے اپنے بڑے بیٹے حافظ نصیر الدین نیز تمام متعلقین کو ہمراہ لیکر اودہ تشریف لائے چند روز تک مختلف مقامات پر قیام رہا، بالآخر امیر سیف الدین (شاہ نظام الدین کے والد) نے کاکوری میں مستقل طور پر سکونت اختیار کر لی۔

قاری نظام الدین نے قاری امیر سیف الدین، قاضی عبد اللطیف ہراتی، مولانا ضیا الدین مدنی، سید ابراہیم بن سید معین الدین ایرجی سے ظاہری علوم

کی تکمیل کی اور حافظ سید ابراہیم بغدادی، سید عبداللہ جیلانی اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے علوم باطنی اویسی طریقہ پر حاصل کئے۔ آپ سید ابراہیم ایرجی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ سید ابراہیم ایرجی کے ایک اور خلیفہ گذرے ہیں جن کا نام قطب الدین اور شیخ بھکاری لقب تھا بھکاری لقب ہونے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ یہ بھی سید ابراہیم ایرجی کے خلیفہ ہیں کاکوروی ہونیکا شبہ ہوجاتا ہے، لیکن یہ بزرگ شیخ تاجو کے بیٹے اور برہان پوری ہیں یہ ۹۹۶ھ میں پیدا ہوئے ان کا برہان پور میں مزار ہے۔ یہ شاہ بھکاری کاکوروی کے علاوہ ہیں (صفحہ ۹۔ الکشف المتواری)

اکبری عہد کے علما اور فقرا میں قاری نظام الدین عرف شاہ بھکاری کو نمایاں خصوصیت حاصل تھی۔ آپ کلام مجید کی سات قراتوں سے واقف اور بڑے خوش الحان تھے، تمام وقت عبادت الٰہی یا درس و تدریس میں گزرتا تھا، آپ کو فلسفہ، حکمت، فقہ، اصول فقہ، حدیث، تجوید، تفسیر پر کافی عبور تھا۔ دور دور سے لوگ شہرہ سنکر آتے اور آپ سے استفادہ کرتے۔ ملا عبدالرشید ملتانی (شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے استاد) کو آپ ہی کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تاریخ میں آپ کے پابند شریعت ہونیکا اس طرح ذکر فرمایا ہے کہ "در تقویٰ امام اعظم ثانی بود" (صفحہ ۴ کشف المتواری)

کاکوری میں ملا کمال الدین عرف شیخ سعدی چشتی ایک بزرگ آپ کے ہم عصر تھے آپ سے اور ان سے بہت اتحاد تھا، اُن کے یہاں روزانہ جو کچھ کھانا پکتا سب ایک ہی وقت میں ختم ہوجاتا وہ کہا کرتے کہ "نہ باسی بچے نہ کتا کھائے" شاہ نظام الدین بھکاری نے جب یہ مقولہ سنا تو فرمایا کہ نہیں "باسی بچے اور کتا کھائے"

اس واقعہ سے شاہ نظام الدین بھکاری کے ذوق ایثار پر کافی روشنی پڑتی ہے، بہت ممکن ہے کہ آپکے یہاں فقرا جمع ہوتے ہوں اور ان کو بھیک دینے کا خاص طور پر اہتمام کیا جاتا ہو، اور پھر اسی وجہ سے شیخ بھیکہ یا شاہ بھکاری آپ کا لقب پڑ گیا ہو۔

شاہ نصرت اللہ خلوتی (لکھنؤ گوگھاٹ پر جن کا تکیہ مشہور ہے) آپکے ہمعصر اور بڑے دبدبے کے بزرگ تھے اکبر کو اُن سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا لیکن چونکہ وہ تارک الدنیا تھے اس لئے اکبر کو ملاقات کا موقع نہ دیتے، آخر ایک بار اکبر مایوس ہوکر شاہ نظام الدین بھکاری کے پاس آیا اور عرض کی کہ آپ سے اور شاہ نصرت اللہ خلوتی سے کافی اتحاد ہے کاش آپکے ذریعہ سے وہاں تک میری رسائی ہوجاتی، شاہ نظام الدین بھکاری اکبر کو اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے اور نصرت اللہ خلوتی سے جاکر ملے تو یوں تمہیداً اٹھائی کہ بزرگوں کا قول ہے نعم الامیر علی باب الفقیر، کیا کسی امیر کو اس سعادت سے محروم رکھنا مناسب ہے؟ شاہ نصرت اللہ خلوتی سمجھ گئے اور یہ فقرہ سنکر مسکرائے پھر کہا خیر اگر آپ کی یہی رائے ہے تو بلا لیجئے حضرت نظام الدین عرف شاہ بھکاری نے اکبر کو شاہ صاحب کے سامنے بلا لیا اکبر نے وہیں تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ "درویش را دربان نہ باید" شاہ نصرت اللہ خلوتی نے فرمایا ع بباید تا سگ دنیا نیاید۔ اس گفتگو سے اکبر کچھ کبیدہ خاطر ہوگیا، اور تھوڑی دیر بیٹھکر چلا آیا (صفحہ ۱۰-۱۱ کشف المتواری)

افسوس آپکی تصانیف اس وقت تک بالکل تاریکی میں ہیں شاہ تراب علی قلندر کاکوروی کو بھی باوجود تلاش کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ ۴ کتابوں کے صرف نام معلوم ہیں (۱) ترجمہ لمعات قادری مصنفہ سید عبدالرزاق بغدادی (۲) منہج اصول حدیث میں (۳) معارف فن تصوف میں (۴) تحفۂ نظامیہ (یہ چند سوالات کے جواب ہیں)، خوش قسمتی سے اس کا قلمی نسخہ مولانا تقی حیدر صاحب کاظمی کاکوروی مدظلہ کو اپنے کتب خانہ میں مل گیا تھا جس کو مولانا صاحب موصوف نے چھپوا دیا ہے۔

قاضی حافظ شہاب الدینؒ آپکے صاحبزادے بڑے کامل بزرگ تھے لیکن وہ جوانی ہی میں آپکے سامنے انتقال کر گئے۔ اس لئے آپکو پوتے مخدوم عبدالکریم سے بیحد اُنس تھا۔ پوتے کی تمام تعلیم اپنے ذمہ لے لی اور تیرہ سال میں اُن کو کامل اور مکمل کر دیا۔ خلافت سے سرفراز فرما دیا۔

جب آپ کا آخری وقت آیا آپ نے مخدوم عبدالکریم سے فرمایا کہ دہلی جاؤ اور معافی کے پروانے اپنے نام کرا لو۔ مخدوم عبدالکریم حسب الحکم دہلی روانہ ہو گئے۔ تفرق سے شاہ بھکاریؒ کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہو گئی۔ مخدوم عبدالکریم ابھی دہلی نہ پہونچے تھے راستے ہی میں تھے دادا کی علالت کی خبر پاکر کاکوری واپس چلے گئے۔ شاہ بھکاریؒ بہت مسرور ہوئے مخدوم عبدالکریم آپ کی خدمت کرتے اور باطنی فیوض سے مستفید ہوتے رہے۔

جب شاہ بھکاریؒ کو صحت ہو گئی تو انہوں نے دہلی جانیکا پھر حکم دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر اب دلی راستے میں میری خبر سنو تو پریشان ہو کر واپس نہ چلے آنا حسب الحکم مطابق مخدوم عبدالکریم دہلی روانہ ہو گئے۔ ادھر حضرت شاہ بھکاریؒ نے ۹۰ سال کی عمر پاکر ۲ رمضان ۱۰۰۸ھ مطابق ۱۶۰۰ء میں وصال فرمایا۔

اس سفر میں آپ سے اور شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کے عزیز و قریب حافظ محمد حسن نامی بزرگ سے ملاقات اتحاد ہو گیا۔ دوسرے روز انہیں کے ساتھ آپ حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملنے گئے دوسرے دن وہیں حضرت مجدد الف ثانی سے بھی ملاقات ہوئی۔ مجدد الف ثانی نے خواجہ باقی باللہ سے کہا کہ دو روز سے آپکے حلقہ میں قادری نسبت کا اثر زیادہ پاتا ہوں۔ خواجہ باقی باللہ نے فرمایا ہاں اس نسبت کا غلبہ ان صاحب زادے کی وجہ سے ہے کیونکہ یہ شاہ نظام الدین قادری شاہ بھکاری کے پوتے اور جانشین ہیں پھر فرمایا کہ خواجہ الکنگیؒ سے میں نے ان کے والد کے بہت مناقب سنے ہیں۔ حضرت مجدد نے یہ سنکر حضرت مخدوم عبدالکریم سے معانقہ کیا اور کہا آپکے خاندان سے مجکو بلند کی نسبت حاصل ہے۔

کچھ دیر بعد مخدوم عبدالکریم نے حضرت خواجہ باقی باللہ سے رخصت ہونا چاہا لیکن خواجہ باقی باللہ نے نہ مانا اور آپ کو اپنے یہاں مہمان رکھا اور تیسرے دن نہایت اخلاق سے مصری کے پانچ کوزے دیکر آپ کو رخصت فرمایا (صفحہ ۳۲۲ نفحات العنبریہ)

مخدوم عبدالکریم مرزا غیاث کے یہاں مقیم تھے مرزا اس وقت معمولی حیثیت کا آدمی تھا مرزا کی لڑکی نوجوان تھی اس وقت علی قلی بیگ کے عقد میں تھی مرزا کو جب یہ معلوم ہوا کہ آپ پروانجات کی تبدیلی کے لئے تشریف لائے ہیں تو اس نے کہا افسوس بادشاہ تک میری رسائی نہیں ورنہ تمام پروانجات درست کرا دیتا۔ مخدوم عبدالکریم نے مرزا سے کہا میں تو جاتا ہوں یہ پروانے رکھ لو خدا جب تم کو وزیر کر دے تب درست کرا کے بھیجدینا۔ مرزا نے عرض کیا وزارت کیسی؟ آپ نے فرمایا خدا میں سب کچھ قدرت ہے اس سے نا امید نہ ہو۔ یہ کہکر واپس چلے گئے۔

خدا کی شان کچھ روز بعد مرزا غیاث کے داماد کے قتل کا واقعہ پیش آیا اور اس کی لڑکی نورجہاں، جہانگیر کے نکاح میں آئی۔ نورجہاں کے باپ کو وزارت اور اعتماد الدولہ کا خطاب ملا، نورجہاں کا بھائی جس کا ابوالحسن نام تھا۔ جہانگیر نے اس کو آصف خاں کا خطاب دیکر ہفت ہزاری منصب سے بھی سرفراز کیا اور بنگالہ کا صوبہ دار کر دیا۔

مرزا ابوالحسن جب دہلی سے بنگالہ جا رہا تھا تو اس کے باپ مرزا غیاث نے (جو وزیر ہو چکا تھا) کہا کہ پہلے کاکوری جاؤ وہاں حضرت مخدوم عبدالکریم کی خدمت میں حاضر ہو اور قدیم پروانے درست ہو گئے ہیں وہ اور پانچ ہزار بیگہ زمین کا جدید پروانہ بھی لیتے جاؤ۔

مرزا ابوالحسن قدیم اور جدید پروانے لیکر کاکوری آیا اور حضرت مخدوم عبدالکریمؒ کی خدمت میں باپ کی طرف سے پروانے پیش کئے مخدوم عبدالکریمؒ نے معافی کے پروانے لے لئے اور جدید معافی کا پروانہ واپس کر دیا۔ مرزا ابوالحسن نے لاکھ اصرار کیا لیکن قادری مخدوم نے کسی طرح نہ مانا۔

چلتے وقت مرزا نے یہ خواہش ظاہر کی کہ برکت کے لئے آپ اپنے کسی صاحبزادے کو میرے ساتھ کر دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ قادری مخدوم نے اپنے ایک صاحبزادے مُلّا عزیز اللہ کی طرف دیکھا اور کہا کہ "در حقیقت رغبت دنیا می بینیم ایں را ہمراہ خود ببر" یہ کہکر اُن کو مرزا ابوالحسن کے ساتھ کر دیا۔ مرزا ابوالحسن آصف خاں اُنکو اپنے ساتھ لے گیا۔ ملک بنگالہ میں اُن کی اولاد موجود ہو (صفحہ ۳۲ نفحات العنبریہ)

مخدوم عبدالکریم نے ۹۰ سال کی عمر پاکر ۲ ربیع الاول ۱۰۲۹ھ میں انتقال کیا۔ والد کے مزار کے قریب ہی دفن ہوئے۔ آپ کے والد حضرت شاہ بہکاری نظام الدینؒ کا ارشاد ہے کہ علانیہ توحید بیان کرنے والے پر رجعت ہو جاتی ہے اس لئے علانیہ توحید نہیں بیان کرنا چاہیئے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تعاریب میں میری اولاد اگر ممنوعات شرعی کو باز رکھی گئی تو خوشی رنج سے بدل جائے گی، آپ ہمیشہ دعا فرماتے کہ اے اللہ میری اولاد میں قیامت تک عالم علوم دین اور حافظ قران مبین موجود رہیں۔ یہ حضرات آپ کے خلیفہ گزرے ہیں:-

(۱) ملا عبدالکریم (آپکے پوتے) (۲) عبدالرشید ملتانی مجدد الف ثانی کے استاد (۳) میر شرف الدین شکار پوری (۴) شیخ محمد خورجوی (۵) شیخ بدیع الدین مانکپوری (۶) حضرت نصیر الدین سنبھلی (۷) حافظ محب اللہ خیر آبادی۔ (۸) مرزا شمس الدین خاں کوکا۔

حسب ذیل بزرگ آپکے ہمعصر تھے۔

(۱) مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ (۲) حضرت غوث گوالیاریؒ (۳) حضرت شیخ اذہن ظفر آبادی (۴) حضرت باقی باللہؒ (۵) حضرت مجدد الف ثانیؒ (۶) شاہ محمد قطب قلندرؒ (۷) شاہ عبدالسلام قلندرؒ

دردؔ کاکوروی

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا تذکرہ تیہ "جنا ،، ہے

عقل اور عشق

ایک دن حسن نے خدا سے کہا   "حسن مطلق! یہ کیا تماشہ ہے!
عقل کی دھوم دھام ہے جگ میں!   عشق بیچارہ ہے کہ رسوا ہے!
جس سے پوچھا یہی جواب ملا   اک مصیبت ہے عشق بپتا ہے
جی مرا جل گیا ہے سن سنکر   عشق دل کا مرض ہے سودا ہے

گر جنوں است عشق بیزارم
نسبتے با مرض چرا دارم؟"

حسن مطلق نے مسکرا کے کہا   "اس قدر جوش میں نہ آ اے حسن!
عقل جس شے کی ابتدا کا ہے نام   عشق اسی کی ہے انتہائے حسن!
حالتیں ہیں شعور کی دونوں   ہے یہ اعجاز ارتقائے حسن!
عقل کیا ہے؟ تلاش حسن زوال   عشق؟ تحصیل مدعائے حسن!

با جنوں نسبت تو موزوں است
زانکہ جائے تو در رگ خوں است"

امین حزین

بندی

کسی کے ماتھے پہ ابرو کے درمیاں اک بوند   ستم طراز بھی تھی با مرہ نواز بھی تھی
جمی تھی قبضۂ خنجر پہ خون دل کی طرح   وہ دلنواز بھی تھی اور جاں گداز بھی تھی
وہ رونق خم محراب ابروئے جاناں   جو سجدہ گاہ تمنائے بانیاز بھی تھی
طلوع مہر جہانتاب کی تھی اک تصویر   سحر میں رنگ جبیں کے افق طراز بھی تھی
وہ ایک نقطۂ تفسیر خوارہ جسیم جمال   کہ ایک عقدۂ زنجیر نیاز بھی تھی
رہی جبیں پہ سویدائے خونشدہ بن کر   فروغ طالع بیدار بخت ناز بھی تھی
اگر وہ خون گہر کی تھی خشک سی اک بوند   تو بہر مختصر افسانۂ دراز بھی تھی!

گوہر جائسی

غزل

دل اور یاس و حسرت کا یہ اجتماع — بس اب الے امید، الوداع الوداع
زہے تیری دلچسپ طرز کلام — جسے دیکھو محو ذوق سماع
جو تارے ترے جلوہ کی ایک کرن — تو سورج ترے نور کی اک شعاع
وہ سفاک اور مائل رحم ہو — نرالی خبر ہے، نئی اطلاع
ہزاروں ستم حوصلے سے سہے — مگر آہ، امید کا انقطاع
... ب متدر سمجھیے شکست — کہ ذکر تحفظ نہ فکر دفاع
ہم آزاد حسّاد سے کیوں ڈریں
نہ اہل وجاہت نہ اہل متاع

آزاد انصاری

غزل

دیکھکر تیری تڑپ جائے دل قاتل تڑپ — مقتل عالم میں اس انداز سے بسمل تڑپ
کارزار زندگی میں یہ سکوں اچھا نہیں — موج مضطر کی طرح تو بھی دکھا ساحل تڑپ
اضطراب انگیز کیونکر ہو نہ دل کی داستاں — یہ وہ حاصل ہے کہ جس حاصل میں ہے شامل تڑپ

یوسف گجراتی

شیطان کی جست

اونچی پہاڑی کی ایک ڈھالو چٹان پر ارل آلتیمیر کا قلعہ بنا ہوا ہے، جس کی دیواریں بہت عریض اور بڑے بڑے برج آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، یہ پہاڑی آس پاس کی دوسری پہاڑیوں سے ایک شان امتیاز رکھتی ہے، اور قلعہ کے دریچوں میں سے نہایت ہی شاندار منظر نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس پہاڑی پر صدیوں کے پرانے زان، اور سبز کاہی صنوبر کے درختوں کا گھنا جنگل کھڑا ہے

جس پہاڑی پر قلعہ ہے اس کے مشرقی پہلو کے نیچے ایک عمیق وادی ہے، اس میں ایک خوبصورت ندی بہتی ہے، جس پر بید مجنوں کی روپہلی پتیوں کا سایہ ہے۔ یہ ندی جو سانپ کی طرح پیچ و خم کھاتی ہوئی گئی ہے ایک جگہ جو قلعہ سے زیادہ دور نہیں ہے زمین میں غائب ہو جاتی ہے، یہاں ایک جوف ہے جس میں آبشار کا پانی گرتا ہے، اور اس غار کی شکل اس قسم کی ہے کہ پانی میں بہت شور ہوتا ہے، یہاں کے لوگ بیان کرتے ہیں کہ اس غار کی تھاہ ہی نہیں ہے، اور اس میں شک نہیں کہ گرد و نواح میں یہ ندی پھر نمودار نہیں ہوئی ہے۔

یہ آبشار بہت بدنام ہے، اور لوگ اس کے متعلق عجیب و غریب قصے بیان کرتے ہیں، ایک ان میں سے یہ ہے کہ جب میکائیل فرشتے نے شیطان کا تعاقب کیا اور قریب تھا کہ شیطان گرفتار کر لیا جائے وہ ندی میں گر پڑا جو فوراً شیطان کے ساتھ زمین میں دھنس گئی۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں کہ چند اندھیری راتوں میں شیطان کی آواز سنی جاتی ہے جو عید السبت منانے بوڑھی جادوگرنیوں کے ساتھ آ کر چلاتا ہے۔ اور ناچتا گاتا ہے، وہ بڑے وثوق سے کہتی ہیں کہ انہوں نے آبشار کے دہانے کے پاس شعلے کی طرح چمکتی ہوئی آنکھوں والا ایک زبردست بکرا دیکھا وہ جادوگریوں کا انتظار کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد جادوگرنیاں یکے بعد دیگرے جھاڑوں پر سوار ہو کر آئیں اور جب آخری جادوگرنی اس غار میں چلی گئی تو وہ بکرا بھی غائب ہو گیا۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ آبشار کے غار میں اکثر عجیب و غریب آوازیں ہوا کرتی ہیں، جو پانی گرنے کی آواز سے کسی طرح مشابہ نہیں ہیں، چند دیہاتی قسم کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ انہوں نے ایک روشنی دیکھی جس سے آبشار کا پانی روشن ہو گیا لیکن گمان غالب ہے کہ معمولی چیزوں کو لوگوں کے تخیل نے غیر معمولی شکل میں تبدیل کر دیا۔

دوسری کہانی یہ ہے کہ زمانہ سابق میں قلعہ کے مالک نے اپنی روح شیطان کے ہاتھ فروخت کر دی تھی، جب قرض ادا کرنے کا وقت آیا تو وہ شیطان سے بچنے کے لئے بھاگا، شیطان نے قلعہ کے شمال مغربی برج تک اس کا تعاقب کیا وہاں سے ندی میں کود پڑا

شیطان نے بھی اپنے مدیون کو پکڑنے کے لئے اُس کے پیچھے جست لگائی اور عین اُس وقت جب وہ ندی میں گرا شیطان نے اُسے پکڑ لیا ندی اُسی وقت شق ہوئی اور زمین میں غائب ہو گئی، اس وقت سے یہ عمیق غار اور آبشار پیدا ہو گیا۔

اس آبشار پر ہر طرف درختوں اور جھاڑیوں کا سایہ تھا جس سے ایک منطقہ بن گیا تھا وہاں بجز اُس حصے کے جہاں ندی غائب ہوئی ارل آلتیمیر نے پانی کی تہ میں زمین پر کھمبے لگا دئیے تھے کہ اگر اتفاق سے کوئی کشتی یا جانور ندی میں گر پڑے تو غار کا نوالہ نہ ہو جائے۔

اس جنگل کی ابتدا انہیں جھاڑیوں سے ہوئی ہے جو پہاڑیوں پر چھا گیا ہے، اس جنگل میں چند پگ ڈنڈیاں آدمیوں اور جانوروں کے پیروں سے بن گئی تھیں، جو ندی کا پانی پینے آیا کرتے ہیں، اکثر جانور ارل کی جاگیر ہی کے تھے۔ شکار کے چوروں کو سخت سزا دی جایا کرتی تھی، جب وہ دوبارہ گرفتار کئے جاتے تھے تو بلا سماعت عذر پھانسی پر لٹکا دیے جاتے تھے، اس لئے آلتیمیر نے بہت سے نگران مقرر کئے تھے جن کا افسر ہاتس دیلمیر تھا، یہ میر نگہبان، نہایت خلیق، نیک طبیعت، اور کارگزار تھا، وہ اکثر شکار کے چوروں کو یہ کہکر چھوڑ دیا کرتا تھا، کہ اگر ابکی دیکھا تو پھانسی دیدیے جاؤ گے، لیکن اُس نے کبھی یہ سخت سزا عمل میں نہیں لائی، بہت زمانہ ہوا ہاتس دیلمیر کی بیوی مر چکی تھی وہ اور اُس کی بیٹی ایدتھ ایک چھوٹے سے خوبصورت مکان میں رہا کرتے تھے جو ایک گنجان جگہ کے وسط میں تھا اور اس کے چاروں طرف مضبوط کٹہرا لگا ہوا تھا کہ اُس کے پائیں باغ میں جنگلی جانور نہ آسکیں فرصت کے وقت ہاتس پھل اور ترکاریاں بویا کرتا تھا اور ایدتھ پھولوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔

ایدتھ ۲۰ برس کی نوجوان حسین لڑکی تھی گیہوں کی بالیوں کی طرح گوری، اُس کی آنکھیں بڑی بڑی روشن، نیلی، اور چشم آہو کی طرح پیاری تھیں، وہ بلند بالا اور طرحدار تھی، گھر کا انتظام وہی کیا کرتی تھی، کئی نوجوان اُس سے شادی کی درخواست کر چکے تھے، لیکن اُس نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ میں شادی کرنا نہیں چاہتی، میں آزاد رہوں گی اور اپنے محبوب باپ سے جدا نہ ہونگی۔ جب وہ یہ بات کہتی تھی تو ہاتس کے چہرے پر ایک عجیب جذبہ کا اظہار ہوتا تھا لیکن وہ فوراً چھپا لیا کرتا تھا۔

(۲)

ارل آلتیمیر بھی اپنے میر نگہبان کی طرح رنڈوا تھا، دس برس ہوئے اُس کی چہیتی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا، وہ قلعہ میں رہا کرتا تھا اور اس کے دو لڑکے تھے ہنری، اور فریڈرک ان دونوں بھائیوں میں بڑا فرق تھا۔

ہنری اپنی والدہ کی طرح سنہری بالوں والا، بلند بالا، متناسب الاعضا اور خوش رو لڑکا تھا، وہ اپنے باپ سے بیحد محبت کرتا تھا اور اپنی ماں کو اکثر یاد کرکے رویا کرتا تھا، اُس کو مطالعہ کتب اور جنگل کی سیر کا بڑا شوق تھا، وہ سب کے ساتھ تہذیب و اخلاق سے پیش آتا تھا، اپنے ملازموں، گاؤں والوں، اور مزدوروں سے لطف و مہربانی سے بات کیا کرتا تھا، وہ ہر شخص کی جسے ضرورت ہو خدمت انجام دینے کو مستعد رہا کرتا تھا۔

اس کے خلاف فریڈرک سیاہ بال والا، بدصورت، پستہ قد، اور مغرور و متکبر تھا، وہ معمولی قصوروں پر نوکروں کو بیرحمی سے

مارا کرتا تھا۔ وہ کسی گاؤں والے اور مزدور سے کبھی بات نہیں کرتا تھا، ساتھ ہی اس کے لوگ اس سے خوف بھی کرتے تھے۔ کیونکہ وہ ظالم اور کینہ ور تھا، وہ بہت کم لکھتا پڑھتا تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ یہ صرف ارا ذل کے لئے مناسب ہے۔ وہ اپنا وقت اپنے ہی جیسے ناکارہ لوگوں اور آوارہ عورتوں کے ساتھ اوباشی میں گزارا کرتا تھا۔

فریڈرک کی انہیں خراب عادتوں کی وجہ سے اس کے باپ اور بھائی کو اس سے بہت کم محبت تھی، ارل آلتیمیر اکثر اس کی طرز زندگی پر ملامت و سرزنش کیا کرتا تھا، لیکن یہ نالائق لڑکا سنتا ہی نہ تھا اور منہ میں کچھ بڑبڑاتا ہوا پیٹھ پھیر کر چلا جاتا تھا۔ فریڈرک کو اپنے بھائی سے بہت نفرت تھی، اس وجہ سے کہ وہ حسین اور مولود اولیں ہونے کی وجہ سے ارل آلتیمیر کی جائداد کا تنہا وارث تھا یہ خیال فریڈرک کو غضب ناک بنا دیا کرتا تھا، اور وہ اکثر وحشیانہ طریقے سے ہنری کو دیکھا کرتا تھا۔ اس وقت قاتلانہ خیالات اُسکے دماغ میں گزرا کرتے تھے۔

ارل آلتیمیر کو کسی زمانہ میں شکار کا بہت شوق تھا لیکن اب وہ بہت کم اس تفریح سے دل بہلایا کرتا تھا۔ اسے گٹھیا کا مرض تھا، اسلئے وہ اکثر کمرے میں اپنے بستر پر پڑا رہتا تھا۔ کبھی اس مرض میں افاقہ ہوتا تھا تو وہ اپنے پیر نگہبان سے گفتگو کرنے کو پسند کرتا تھا، جس کا وہ ایمانداری کی وجہ سے بہت احترام کرتا تھا، ارل اکثر پیر نگہبان کے گھر جایا کرتا تھا، اور دونوں بیٹھ کر گزشتہ زمانہ کے شاندار پیر شکار کے تذکرے کیا کرتے تھے۔ اس اثنا میں ایدتھ میز پر سفید چادر بچھاتی اور کئی قسم کے کھانے چنا کرتی تھی۔ ارل آلتیمیر اس کی ضیافت خوشی سے قبول کرتا تھا لیکن اس شرط سے کہ ہانس اور اس کی بیٹی بھی ساتھ کھائیں، ہانس کو اپنے آقا سے بیحد محبت تھی اور وہ اپنی زندگی اس کے لئے وقف کر چکا تھا۔

ارل اکثر مسکرا کر ایدتھ سے کہا کرتا تھا کہ "تم کب شادی کرو گی؟" میں خیال کرتا ہوں کہ تم بن بیاہی نہیں رہنا چاہتیں؟ میں تمہارے پہلے بیٹے کا دینی باپ ہونگا" ایدتھ شرما کر آنکھیں نیچے کر لیا کرتی تھی۔

ہنری پیر نگہبان کے ہاں اکثر آیا کرتا تھا، اس کی ایدتھ سے بڑی دوستی تھی، وہ ایدتھ کو اس کے حسن و معصومیت کی وجہ سے بہت پسند کرتا تھا، وہ اکثر ایک جنگل میں شیطان کی جھت کے پاس ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے جو ہانس ڈیلمیر کے مکان کے قریب تھا وہ بڑی دیر تک میٹھی باتیں کیا کرتے تھے اور جب وہ دونوں مفارقت پر مجبور ہوتے تھے تو رنج و افسوس کا ایک ناقابل بیان احساس اُن کے دل کو ہوا کرتا تھا۔

اب کچھ عرصہ سے ہنری متفکر اور خاموش پسند ہو گیا تھا، وہ ہر وقت کسی خیال میں محو معلوم ہوتا تھا کئی مرتبہ اس کے متعلق دریافت کیا "میرے عزیز فرزند ہنری! تمہیں کیا ہو گیا، تمہارا مزاج بالکل بدل گیا، کیا تم بیمار ہو؟ تم تو بڑے ملنسار تھے، لیکن اب تم دن دن بھر خاموش رہتے ہو، اور جس وقت کئی بار آواز دیجاتی ہے جب تم بولتے ہو"

"اباجان! میرے مزاج میں کوئی تغیر نہیں ہوا، اور میں بیمار بھی نہیں ہوں"

لیکن ارل اندازہ تھا وہ خیال کرتا تھا کہ مخفی محبت ہنری کو تکلیف دے رہی ہے۔

— میرے فرزند! اچھا ہے کہ تم شادی کر لو، اس قلعہ میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ رہنا، ایک جوان کے لئے وجہ نشاط نہین ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ تمہاری خالہ زاد بہن ڈچیز آف نیم تمہارے واسطے مناسب ہے۔

— اباجان! میری التماس ہے کہ شادی کے متعلق کچھ نہ فرمائیے، میں شادی نہیں کرنا چاہتا، اس کے علاوہ مجھے اپنی خالہ زاد بہن سے محبت بھی نہیں ہے۔

— لیکن میرے فرزند! شاید تم کسی دوسری لڑکی سے محبت کرتے ہو۔ تم مجھ سے ظاہر کر دو اگر وہ مجھے پسند ہوگی تو میں تمہاری شادی کے لئے فوراً منظور کر لوں گا۔

— مجھے کسی لڑکی سے محبت نہیں ہے، میں اس کی آپ سے قسم کھاتا ہوں۔

ہنری کو یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔

کچھ عرصہ سے وہ اپنے دل میں ایک ناممکن الاظہار چیز محسوس کرتا تھا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں کچھ تغیر ہوا ہے، وہ ہشاش بشاش رہا کرتا تھا، لیکن اب وہ افسردہ و غمگین ہو گیا تھا۔

اپنے باپ کے پاس سے اُٹھ کر وہ جنگل کی سیر کو چلا گیا اور اُس آبشار کے پاس پہنچا جس کے کنارے پر بیٹھکر وہ سوچا کرتا تھا، چند منٹ کے بعد خشک پتوں پر ہلکے ہلکے قدموں کی آواز سنائی دی، ہنری ایدتھ کے قدم پہچان گیا، دفعتاً اُس کے سینے میں دل دھڑکنے لگا اس کے دماغ میں اپنے والد کی باتیں یاد آ گئیں، وہ اپنے تغیر کا سبب سمجھا ہے، وہ ایدتھ سے محبت کرتا ہے، اُسے یہ خیال نہیں ہے کہ وہ بڑے گھرانے کی نہیں ہے، اور میر نگہبان کی بیٹی ہے، اُس کا دل استدلال نہیں کرتا۔ اُس کو ایدتھ سے محبت ہے اب تک اُسے یہ خیال نہ تھا کہ خوشی کا یہ سبب ہے جو وہ ایدتھ کو دیکھکر محسوس کرتا تھا۔ وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا، ایدتھ سے ملنے کو آگے بڑھا اور ہاتھ بڑھا کر اس سے کہا۔

ایدتھ میری پیاری میری پیاری تمہیں دیکھکر مجھے کس قدر خوشی ہوتی ہے۔

یہ کہکر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں، اور اُس کے چہرے پر انتہائی خوشی کی علامتیں نمودار ہو گئیں۔

— جناب ہنری! اسی طرح میں بھی۔ ایدتھ نے شرما کر جواب دیا۔ کیونکہ اُس نے ہنری کی پرجوش نگاہ کو دیکھ لیا۔

— ایدتھ! مجھے تم سے کس قدر محبت ہے۔

— اے ہے یہ نہ کہیے ہنری صاحب، آپ کے والد کیا کہیں گے، آپ کو معلوم ہے کہ آپ میرے ساتھ شادی نہین کر سکتے، اور آپ میری اور میرے باپ کی آبرو ریزی کرنا نہیں چاہتے۔ ہم مثل سابق دوست رہیں اور شاید آپ کو کسی بڑے گھرانے کی لڑکی مل جائے گی جس سے آپ شادی کر کے مسرت اندوز ہو سکیں گے۔

— آہ، ایدتھ چپ رہو! میں منت کرتا ہوں۔ تم میرا دل پاش پاش کئے دیتی ہو، میں تم سے یہاں اپنی مرحوم والدہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں صرف تم سے شادی کرونگا۔ ورنہ میں رنج و غم سے ہلاک ہو جاؤنگا۔

——— قسم نہ کھائیے، میرے دوست قسم نہ کھائیے۔ آپ خوب جانتے ہیں کہ آپکے والد یہ شادی ہرگز منظور نہ کریں گے کیا آپ کو یہ واقعہ یاد ہوگا کہ ان کے خاندان اور خود انھوں نے آپ کے چچا رابرٹ کو محض اس بنا پر نکال دیا تھا کہ انھوں نے ایک معمولی خاندان کی لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ اور انھوں نے یہ قصور کبھی معاف نہ کیا۔ جس کو وہ "بد ازدواج" کہتے ہیں۔

ہنری رونے لگا، کیونکہ اس کو یقین تھا کہ اس کا باپ یہ شادی منظور نہ کریگا۔ یکایک ایک قہقہے کی آواز آئی، اور فریڈرک اُن کی حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

——— اچھا! عاشق و معشوق کا جوڑا۔ گھبراؤ نا! جنگل مخفی پیار و محبت کے لئے، موزوں جگہ ہے...... گھبراؤ نا....... لیکن ہنری! تم بڑا ذائقہ حاصل نہیں کرتے، یہ خوبصورت دوشیزہ ہے۔

یہ کہکر وہ قہقہہ لگاتا ہوا چلا گیا۔

ہنری کے ذہن میں ایک ناقابل بیان خطرہ گزرا۔ اس کے کانوں میں وہ نبیثانہ قہقہہ گونج رہا تھا۔ اس کو اپنے ہی لئے خوف نہ تھا۔ بلکہ اپنی محبوبہ ایدتھ کے لئے اندیشہ ہوگیا۔ کیونکہ اس نے ایدتھ کی طرف اپنے بھائی کی حریصانہ نگاہیں محسوس کر لی تھیں، اس لئے اس کو کوئی شبہ نہ تھا کہ یہ نگاہیں کسی جرم کے ارادے کو ظاہر کر رہی تھیں۔

ایدتھ نے کہا: جناب ہنری! بہت اچھا ہوتا کہ آپ مجھے فراموش کر دیتے، آپ اپنے والد کا خیال کیجئے وہ آپ کو بد دعائیں دیں گے۔

یہ کہکر وہ اٹھکر بھاگ گئی، اس کے دل پر صدمہ تھا، لیکن وہ اس کا اعتراف کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ محبت اس کی روح میں نفوذ کر چکی تھی۔

——— اے ایدتھ مجھے نہ چھوڑو، مجھے نہ چھوڑو۔

لیکن وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

ہنری کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور اس کے سینے پر ایک وزنی بوجھ رکھدیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے ہاتوں میں تشنج پیدا ہوگیا ہے۔

——— میں کس قدر بدنصیب ہوں، اس طرح شدائد برداشت کرنے سے مر جانا اچھا ہے۔

گرم آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے۔

...... اچھا! وہ کبوتری اُڑ گئی؟ کیا میں نے اسے اڑا دیا۔

یہ بھی فریڈرک کی آواز تھی۔ اس طنز و استہزا نے ہنری کو چونکا دیا۔ وہ اٹھا اور اپنے بھائی کو بلا جواب دئے قلعے چلا گیا۔ اس نے اس مہلک غم کو چھپانے کی کوشش کی جو اس کی جان گھلائے ڈالتا تھا، لیکن وہ اپنے باپ کو دھوکا نہ دے سکا۔

ارل کو اس بات کا بیحد افسوس تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی حالت کا سبب نہیں جانتا۔
ہنری اس امید میں روزانہ آبشار کے پاس آ کر بیٹھا کرتا تھا کہ دیوتہ آئے گی، لیکن وہ نہیں آئی، تاہم وہ برابر اُس جگہ بیٹھنے آیا کرتا تھا جہاں اُس کی سب سے زیادہ محبوبہ بیٹھا کرتی تھی، اور گزشتہ لطف و محبت اور مسرت کے دن یاد کیا کرتا تھا، اور گھنٹوں یہیں بیٹھا رہتا تھا۔
فرنڈرک بھی روزانہ دور سے تاک لگائے رہتا تھا۔ اس کا یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا تھا، کہ اپنے بھائی کو ہلاک کر دینا بہت آسان ہے اور کسی کو خبر بھی نہیں ہو سکتی، اس وقت وہ اپنے باپ کا تنہا وارث ہو جائیگا۔ جو اپنے محبوب بیٹے کے باقی نہ رہنے سے تھوڑے دن کے بعد زندہ نہ رہے گا۔ اس طرح وہ تنہا ہر چیز کا مالک ہو جائیگا۔
پس ایک دن جب اس کا بھائی حسب عادت غار کے دہانے کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ فرنڈرک اس طرح چپ چاپ اس کے پیچھے گیا کہ ہنری کو جو اپنے خیالات میں محو تھا مطلق نہ معلوم ہوا۔ اس وقت اس نے اپنی کل مجرمانہ نیتوں کی متابعت کر کے اپنے بھائی کو غار میں ڈھکیل دیا، یہ کام اس قدر تیزی سے کیا کہ ہنری کو چیخ مارنے کا بھی موقع نہ ملا، اور وہ غار میں غائب ہو گیا۔
لیکن فرنڈرک کے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے ایک چیخ کی آواز سُنی۔ یہ کس کی آواز تھی؟ ....
تاہم چند منٹ کے بعد یہ خیال کر کے اُسے اطمینان ہو گیا کہ یہ آواز نیل کنٹھ کی تھی، اس کے علاوہ یہ غار اپنا شکار واپس نہیں دیتا۔
خاموشی کے ساتھ وہ قلعے کو واپس آ گیا، اُس کے چہرے پر ملامت نفس کی کوئی علامت نہیں تھی، اس کی بہیمی روح اس قسم کے احساسات رکھنے کے قابل نہ تھی۔
بہت دیر ہوئی شام کے کھانے کا وقت گزر گیا۔ ہنری قلعے میں نہیں آیا۔ ارل آلتیمیر بہت بے چین تھا اور اس نے کھانا نہیں کھایا، وہ خیال کرتا تھا کہ "ہنری کیوں واپس نہیں آیا، وہ تو بہت ٹھیک وقت پر آ جاتا ہے، اور وہ جب کہیں جاتا ہے تو اطلاع ... کر دیا کرتا ہے۔ آخر آج کیا ہوا!" ایک تکلیف وہ اندیشہ اُسے ستانے لگا، لیکن فرنڈرک نے گویا کچھ دیکھا ہی نہیں۔ اس نے حسب معمول کھانا کھایا اور خوب پی کر سرشار ہو گیا۔
—— کیا تم نے آج اپنے بھائی کو نہیں دیکھا فرنڈرک؟
—— نہیں! میں نے اُسے نہیں دیکھا، لیکن وہ کہیں کھو یا نہیں گیا ہے، اُسے قلعہ کا راستہ مل جائیگا، شاید وہ کسی چرواہن سے عشق و محبت کی باتیں کر رہا ہو گا، اسی لئے اُسے وقت کا خیال نہیں رہا، اس کے علاوہ میں اس کی نگرانی پر نہیں مقرر کیا گیا۔
فرنڈرک کی آواز میں صداقت نہ تھی، اور ارل نے محسوس کیا کہ "جرم کا قیاس قوی ہوتا جاتا ہے۔" اس نے نظریں گاڑ کر اپنے بیٹے کو دیکھا اور کچھ نہ کہا۔

(۳)

ارل آلتی میراویر اپنے کمرے میں چلا گیا اور خدمت گاروں کو رخصت کرکے قفل لگا دیا اور آرام کرسی پر بیٹھ کر گہرے سوچ میں پڑ گیا۔ اُس کو یقین تھا کہ فریڈریک نے اپنے بھائی کو مار ڈالا۔ لیکن اُس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ ہزاروں پریشان خیالات اُس کے دماغ میں آرہے تھے، یکایک اس کو معلوم ہوا کہ کوئی دروازہ کھٹ کھٹاتا ہے، یہ آواز خاندان آلتی میرے ایک مورث کی بڑی تصویر کے پیچھے سے آرہی تھی جو دیوار میں جڑی ہوئی تھی۔ آلتی میرے نے خیال کیا کہ چوکھٹے اور دیوار کے درمیان چوہا کتر رہا ہے، لیکن فوراً ہی اُس نے کمانی کے کھلنے کی آواز سنی، اور اُسی کے ساتھ آہستہ آواز آئی۔

—— "ابا جان! آپ پریشان نہ ہوں، میں آپ کا فرزند ہنری زندہ ہوں"

اس آواز کے بعد دروازہ کے پٹ کی طرح چوکھٹا گھوما اور ہنری اپنے حیرت زدہ باپ کے سامنے آگیا۔ وہ کلمے کی انگلی منہ پر رکھ کر اشارہ کر رہا تھا کہ آپ خاموش رہیے! اور پُراسرار دروازہ بند کرکے اپنے باپ سے لپٹ گیا۔ جس کی آنکھوں میں فرط مسرت سے آنسو آگئے تھے۔

—— اچھا! میرے فرزند، تمہیں کیا اتفاق پیش آیا تھا؟ تم شام کے کھانے پر کیوں نہیں آئے؟ اور کیوں اس طرح چھپ کر پُراسرار راستے سے آئے جسے میں نہیں جانتا؟

—— ابا جان معمولی واقعہ پیش آگیا، شیطان کی جست کے پاس میں سو گیا اور لڑھک کر غار میں گر پڑا۔

—— لیکن تم یہاں کس طرح واپس آسکے یہ خونی آبشار جس کو نگلتی ہے اسے کبھی واپس نہیں دیتی، اور تم بجائے معمولی راستے کے قلعہ کو مخفی راستے سے کیوں آئے۔

—— سُنیئے ابا جان، آپ جانتے ہیں کہ میں نے اپنے یہاں کے پرانے کاغذات تمام وکمال پڑھے ہیں مجھے اُن کاغذات سے عجیب و غریب انکشافات ہوئے خصوصاً آبشار کے متعلق اس لئے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ یہ آبشار بلکہ اُس کے غار سے قلعہ تک ایک زیر زمیں راستہ ہے، جو شمالی مشرقی برج کے نیچے ایک کوٹھری میں ختم ہوا ہے اس کوٹھری سے ایک زینہ شروع ہوتا ہے جس کے ذریعہ قلعہ کے ہر منزل میں جا سکتے ہیں، اور ہر منزل میں ایک غلام گردش ہے جس کی عریض دیواروں میں موکھے ہیں جن میں سے ہر کمرے کے حالات دیکھے جا سکتے ہیں اور باتیں سنی جا سکتی ہیں۔ یہ بالکل غیر ممکن تھا کہ میں دوسرے راستے سے آتا، کیونکہ غار کے دہانے تک آنے کے واسطے میرے پاس رسیوں کا زینہ نہ تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جیسا میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ میں آبشار کے دہانے کے قریب سو گیا تھا! جب میں آبشار میں گرا تو مجھے کوئی خوف نہیں ہوا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں ہلاک نہ ہونگا۔ پانی کے اوپر آکر میں نے غار کے کنارے کی طرف رُخ کیا، جہاں ایک قدرتی چبوترہ ہے جو آبشار کے نیچے غار کے کنارے تک چلا گیا ہے، یہاں زیر زمیں راستہ کا دریچہ ہے، جس میں سے ایک وسیع گول کمرے میں پہنچ جاتے ہیں اس جگہ ہمارے مورث سازشیوں کے ساتھ جلسے کیا کرتے تھے، یہ سب یہاں اس کمرے میں رسی کے زینے کے ذریعہ غار

ئے موکھے میں سے آیا کرتے تھے۔ اس کمرے میں غلام گردش کا ایک مخفی دروازہ ہے جو یہ کے نیچے کوٹھری تک چلی آئی ہے میں نے پہلے ہی ان سب کی کافی طور پر تحقیق کر لی تھی۔ اس کے علاوہ میں ان راستوں کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے مختلف جگہ لالٹین رکھدیا کرتا تھا، اور اگر گاؤں والے یقین دلاتے ہیں کہ انہوں نے آبشار پر روشنی دیکھی تو وہ غلطی نہیں کرتے، کیونکہ میں اکثر اس غار کو تحقیق کے لئے روشن کر دیا کرتا تھا۔ اس لئے میں اس کے خطرناک پہلو سے واقف تھا۔ میں نہیں خیال کرتا تھا کہ مجھے ان سب جزوی سے جزوی معلومات کی اپنی جان بچانے کے لئے ضرورت ہوگی کیونکہ جو اس گہرائی میں گر پڑے اور اسے یہ معلومات نہوں تو لازمی طور پر اس دہشت ناک غار کا لقمہ ہو جائے۔ کیونکہ بغیر رسی کے زینہ کے اوپر آنا غیر ممکن ہے۔ اسی وجہ سے کہ غار کی شکل بالکل اوندھی قیف کی طرح ہے۔ اس بیان کے اثنا میں ارل آلتیمیر ایک گہرے خیال میں مستغرق تھا۔ یکایک اس نے کہا

"کیا تم نے دن میں اپنے بھائی کو دیکھا تھا؟

جی ہاں، میں نے اسے دیکھا تھا۔

عجیب بات ہے! اس نے مجھ سے کہا کہ اس نے تمہیں نہیں دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ہنری تم مجھے دھوکہ دیتے ہو، تم آبشار میں اتفاقی طور پر نہیں گرے۔ کسی نے تم کو گرا دیا، اور میں مجرم سے واقف ہوں وہ تمہارا بھائی ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

نہیں ابا جان میں قسم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جھوٹ نہ بولو میرے فرزند مجھے مخفی غلام گردش سے فریڈرک کے کمرے کی طرف لیچلو۔

ہنری نے چٹخنے کو گھمایا اور لیمپ لے کر اپنے باپ کو اس موکھے کے پاس لے گیا۔ جس میں سے فریڈرک کے کمرے کا اندرونی حصہ نظر آسکتا تھا۔

ارل آلتیمیر کا چہرہ غضب ناک ہو گیا اس نے دیکھا اور فریڈرک کی آواز سنی جو نشے میں مست کمرے میں ناچ رہا تھا اور کہتا جاتا تھا:

میں نے تجھے غار میں ڈھکیل دیا۔ ہنری تو مر چکا! اب تو لوٹ کر نہ آئیگا؟ ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں بڈھے کا تنہا وارث ہوں جو زیادہ نہ جیئے گا! ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایڈتھ تیری سنہری بالوں والی میری عاشق ہو گی! ہا ہا ہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ !

ہنری نے بھی یہ باتیں سنیں اور اسے سکتہ سا ہو گیا۔

بھاگو! ہنری بھاگو۔

گرتے پڑتے وہ اپنے کمرے میں چلے آئے۔

او! ملعون مجرم! اندرید وحشی جانور میرا ہی خون ہے! اے فریڈرک میں تجھے سزا دوں گا! جس نے قتل کیا وہ قتل کیا جائیگا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن میرے فرزند! تمہارا بھائی ایڈتھ کے متعلق کیا کہہ رہا تھا "تمہاری سنہری بال والی"

———"اباجان! مجھ پر رحم فرمائیے میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، لیکن جرأت نہیں کر سکتا۔"

———"کہو میرے فرزند میں تمہاری بات سنوں گا۔"

———"اچھا اباجان، مجھے ایڈتھ سے محبت ہے اور میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" - - - - - - - -

———"خاموش رہو، بدجسم لڑکے، تم بھی میرا مرنا چاہتے ہو، میں یہ ازدواج کبھی منظور نہیں کروں گا، ہرگز نہیں! کیا تم اپنے چچا رابرٹ کو بھول گئے!! - - - - - - -

ہنری غلام گردش میں سے اپنے کمرے میں چلا گیا، لیکن وہ ایسا افسردہ و غمگین تھا کہ اُسے نیند نہ آسکی، ارل کی بھی ان تکلیف دہ خیالات کی وجہ سے جو اس کے دماغ میں آ رہے تھے آنکھ نہ لگ سکی! - - - - - - -

- - - - - - - - = * = (۴) = * = - - - - - - -

———"اچھا! اباجان کیا میرا بھائی آیا یا نہیں؟" فریڈرک نے اپنے باپ سے سوال کیا۔

———"نہیں! شاید تم جانتے ہو کہ وہ واپس نہ آئیگا"

———"میں نہیں سمجھا، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں"، فریڈرک نے بڑبڑا کر جواب دیا۔

لیکن عین اسی وقت خدمت گار آیا، اس نے اس سے کہا کہ میر نگہبان آپ سے کچھ خلوت میں کہنا چاہتا ہے اور اسے بہت جلدی ہے۔

ارل اپنے کمرے میں آیا، ذرا دیر میں میر نگہبان بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فولادی صندوقچی تھی، اس نے وہ صندوقچی میز پر رکھدی اور لفافہ جس پر چہرے کی مہریں لگی تھیں، ارل کو پیش کیا۔ لفافہ پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"جب ایڈتھ اٹھ سال کی ہو جائے اس وقت ارل ابتھیر کو دیا جائے"

ارل نے ہانس ویلیر کو بٹھایا اور لفافہ کھولا۔

خط پڑھنے میں ارل کے چہرے پر خوشی کی علامتیں درجہ بدرجہ بڑھتی جاتی تھیں، اور اس نے آہستہ سے کہا۔

———"تو میرا ہنری بڑا خوش قسمت ہے"

(خط یہ ہے)

میرے برادر مکرم!

"رسم ہے کہ جن کا انتقال ہو جاتا ہے معاف کر دیے جاتے ہیں، جب آپ کو یہ خط پہنچے گا میں"

"وفات پا چکا ہوں گا، اس لئے خیال کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرما دیں گے۔ میں اس خدمت"

"کے لئے ہانس ویلیر کو مقرر کرتا ہوں جس کی دیانت داری اور وفاداری سے میں واقف ہوں"

"وہ آپ کو یہ خط معینہ وقت پر دیدے گا۔ میں آپ کو اپنی شادی کی یاد نہ دلاؤں گا۔ جس کو"

آپ بوازدواج سے موسوم کرتے ہیں، وہ آپ کے اس طرز عمل کی جواب نے میرے اور میری بیوی کے
ساتھ جائز رکھا، معصیت سے بیزار تعاقب لیا۔ میری بیوی ایک لڑکی ایدتھ کو چھوڑ کر مرگئی، میں اس کی
پرورش اور نگہداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے میں نے ایدتھ کو ہانس ولمیر کے سپرد کر دیا، اس نے
اور اس کی بیوی نے مجھ سے حلف لیا کہ ہم یہ راز کسی پر ظاہر نہ کریں گے، اور یہی کہیں گے کہ ہماری بیٹی
ہے، آپ کو اس بات کا یقین دلانا بہت آسان تھا کیونکہ آپ کئی مہینے سے گھر پر موجود نہ تھے میں نے
اپنا تمام روپیہ جس قدر میرے پاس تھا اپنی بیٹی کے لئے ہانس کے حوالے کر دیا، وہ قبول کرنا نہیں
چاہتا تھا لیکن میں نے اسے مجبور کیا۔ ایدتھ کو آخری بوسہ دیکر اور دونوں میاں بیوی سے مصافحہ
کرکے میں چلا گیا۔ میں جہاز پر سوار ہوکر امریکہ چلا آیا، یہاں مجھے امید تھی کہ میں دولتمند ہو جاؤنگا
لیکن مجھ پر رنج و صدمات کا [illegible] اثر ہوا تھا کہ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہوگیا کہ میری قوتوں نے
مجھے جواب دیدیا۔

میری تمنا تھی کہ میں اپنی پیاری بیٹی کو آخری بوسہ دوں لیکن افسوس! یہ ناممکن ہے میں محسوس کرتا
ہوں کہ موت قریب آرہی ہے میں امریکہ سے یہ خط ایک لفافہ میں ہانس ولمیر کے نام روانہ کرتا ہوں
ایدتھ پر رحم کیجئے میرا قصور معاف فرمائیے۔　　خدا حافظ

آپ کا چچازاد بھائی
ارل رابرٹ

—— سب کچھ بھلا دیا گیا! سب کچھ معاف کر دیا گیا! —— ارل نے چلا کر کہا "ہانس ہم کو اپنی بیٹی کے پاس جلد جانا چاہئے۔ اب وہ ہم دونوں کی بیٹی ہے۔"

اور وہ دونوں بھاگتے نہیں بلکہ اڑتے ہوئے میر نگہبان کے گھر کی طرف گئے، جب وہ قریب پہنچے تو انہوں نے زور کی چیخ سنی، انہوں نے ایدتھ کی آواز پہچان لی!

—— تم مجھ کو مار ڈالنا چاہتے ہو، جس طرح تم نے اپنے بھائی کو مار ڈالا! میں نے تم کو دیکھ لیا تھا۔ قاتل!

انہوں نے ایک ساتھ کواڑ کو دھکا دیا، فریڈرک کو دیکھا کہ وہ ایدتھ کو پکڑنا چاہتا ہے، اور ایدتھ بڑی جرأت سے مدافعت کر رہی ہے، فریڈرک کے چہرہ پر خونخوارانہ علامتیں نمایاں تھیں۔

دروازہ کھلنے کی آواز سنکر فریڈرک نے مڑ کر دیکھا ارل و ہانس اور ان کے غضبناک چہروں کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اس کے آخری لمحے آگئے، لیکن مرنے سے پہلے اس نے ایک جان اور لینی چاہی۔ اپنے کمربند سے پستول نکال کر ہانس کی طرف سیدھا کیا، لیکن ارل نے ہاتھ مار دیا جس سے گولی چھت میں جا لگی۔ ارل نے فریڈرک سے کہا۔

آج سے تم میرے بیٹے نہیں ہو میں تم پر لعنت کرتا ہوں۔ اگر مجھے اپنے خاندان کی بے عزتی کا خیال نہ ہوتا تو میں تمہیں جلاد کے حوالے کر دیتا۔ تم نے اپنے بھائی کو مارا۔ تم نے ہانس کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ میں تمہارے لئے قتل کا فیصلہ کرتا ہوں، میں تم کو خدا سے دعا کرنے کے لئے پانچ منٹ کی مہلت دیتا ہوں۔

اسی وقت میں ہنری کمرے میں داخل ہوا، وہ مردے کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ اس نے دیوار میں سے ہانس کے ساتھ اپنے باپ کو گفتگو کرتے سُنا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ایڈتھ سے شادی کر سکے گا۔ اس لئے وہ میر نگہبان کے گھر آیا، دروازہ پر اس نے اپنے باپ کا فیصلہ سُنا، باوجود ان سب باتوں کے وہ اپنے باپ سے عرض کرنا چاہتا تھا کہ بھائی کا قصور معاف کر دیا جائے۔۔۔۔

لیکن فریڈرک کی نظر جو اپنے بھائی پر پڑی جس کو وہ مُردہ تصور کرتا تھا تو اس نے خیال کیا کہ یہ میرے بھائی کی روح ہے جو مجھ سے قتل پر ملامت کرنے آئی ہے، وہ فوراً دیوانہ ہو گیا اور میان سے خنجر نکال کر اپنے سینے میں مار لیا۔

ایڈتھ دوڑ کر ہانس سے لپٹ گئی۔ چند منٹ تک سناٹا رہا آخر ... نے کہا۔

خدا کا شکر ہے۔ میں اپنے بیٹے کو قتل کرنے پر مجبور نہ ہوا۔ ہانس تم اس مجرم کی لاش شیطان کی جست میں پھینک دو۔ بس یہ جگہ اس کے لئے موزوں ہے۔ یہ کام تم رات کو انجام دینا۔ اب ہم سب قلعہ کو چلیں! ایڈتھ میرا بازو تھام لو۔ میں تم پر بھروسا دونگا۔ ہانس تم میرے ساتھ آؤ۔ تم میرے قلعہ میں رہنا۔ میں ... کا عہدہ ... دونگا۔

(۵)

اس تمثیل کے خاتمہ کی جزئیات بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، شادمانی ... نے ... کی جگہ لی۔ ہانس نے اُن روپوں کی حفاظت نہیں کی جو اسے دلائے گئے تھے۔ اس نے سب محتاجوں کو تقسیم کر دئیے۔

... قلعے میں رہتا تھا، وہ اپنی بیٹی سے جدا نہ ہوا، اب وہ میر نگہبان نہیں ... آلتی ہیر کا دوست ہے، اور ایڈتھ کا محبوب باپ۔

تین مہینے کے بعد ہنری اور ایڈتھ کی شادی ہو گئی ... اور جب ایڈتھ کا پہلا بیٹا ہوا تو ... نے ... سے مسکرا کر کہا۔

میری پیاری بیٹی! کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں ... پہلے بیٹے کا دینی باپ ہونگا؟

"سماک رامچ" (ڈاکٹر پی نیمہ)

ہندوستان کی صنعتی پستی کے اسباب

ہم جس چیز سے اس مضمون میں بحث کرنا چاہتے ہیں وہ اس قدر عبرت آموز اور درد انگیز ہے کہ بیان کرتے طبیعت لرزتی ہے، اس مسئلہ میں ہمیشہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ اصل واقعات پبلک کے سامنے نہ آئیں، اور جو سامنے آئے بھی ان کو بعد میں ان کی توجیہ کرکے دوسرے رنگ میں پیش کیا گیا، عام مورخوں کے بیان کے علاوہ خود ہندوستان کے اعلیٰ انگریز عہدہ داروں کی تحریرات، انگلستان کی پارلیامنٹ، اور مختلف کمیشنوں کی رپورٹیں موجود ہیں، جن سے اصلی حالات کا پتہ چلتا ہے۔

حکومت کی حکمت عملی

صنعتی پستی کے اسباب تو چند در چند ہیں مگر سب سے بڑی وجہ غیر حکومت اور اس کی حکمت عملی ہے، باقی اسباب اسی کے زیر اثر ہیں مثلاً انقلاب صنائع۔ ریلوے ترقی اور تجارت آزاد، ہندوستان کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ انگریزوں کے آنے سے قبل ہندوستان کی صنعت و حرفت کو بہت فروغ تھا۔ ہندوستانی مصنوعات یورپ کے مختلف ممالک میں استعمال ہوتی تھیں اور ان کی تجارت بعید ترین ممالک میں بھی جاری تھی۔ (ہندوستان کی مصنوعات کے متعلق ہم ایک گزشتہ مضمون "کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے" میں مفصل بحث کر چکے ہیں) ہندوستان کی مصنوعات سے فائدہ اٹھانے کے لئے انگلستان میں بہت سی کمپنیاں ہندوستان سے تجارت کے لئے قائم ہوئیں۔ یہ کمپنیاں ہندوستانی مال لیجاکر انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں فروخت کرتیں، اور بیحد منافع اٹھاتیں، جب ہندوستانی مال کی تجارت میں اسقدر نفع نظر آنے لگا تو سنہ ۱۶۰۰ء میں لندن کے سوداگروں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کا خیال قائم کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد جب ہندوستانی مال انگلستان میں بکثرت فروخت ہونے لگا تو وہاں کے باشندوں میں تشویش کے آثار نمایاں ہونے لگے اور خیال ہوا کہ اگر اس وقت ہندوستانی مال کی درآمد کو نہ روکا گیا تو آئندہ سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑیگا (یہاں پر یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے وقت اس کی نوعیت وہ نہ تھی جو آجکل غلطی سے سمجھی جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ کمپنی کا مقصد انگریزی مصنوعات کو ہندوستان میں فروغ دینا نہیں تھا بلکہ اس کی غرض وغایت بھی وہی تھی، جو اور کمپنیوں کی تھی، یعنی ہندوستانی مصنوعات کو یورپ لیجاکر فروخت کرنا اور اس سے منافع حاصل کرنا مگر جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار بڑھتا گیا، ویسے ویسے اس کی نوعیت میں بھی فرق آنے لگا۔) لہٰذا ہندوستانی مال کے ساتھ انگریزوں کا طرز عمل بدلنے لگا اور کمپنی کو جیسے جیسے یہاں سیاسی اقتدار حاصل ہوتا گیا ویسے ویسے یہاں کی صنعت کو دبایا گیا۔ چنانچہ سترہویں صدی عیسوی میں اہل یورپ کے تجارتی جہازوں کی آمد ہندوستانی ساحلوں پر شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ

یہاں کی صنعت میں بھی زوال آنے لگا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد جب اس کا اقتدار بڑھ گیا تو یہاں کی مصنوعات کو جا و بیجا طریقوں سے کچلنے کی کوشش کی گئی، تجارت تا مینی کے پردے میں انہوں نے ہندوستان کی صنعت پر کیا کیا ستم نہیں ڈہائے، چنانچہ ڈہاکے کی ململ جس کے استعمال کو یورپ کے امرا فخر سمجھتے تھے اس کو جس بری طرح تباہ کیا گیا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں جب جب انگلستان ہندوستانی مصنوعات کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا تو اس نے بہت سے مصنوعات کی درآمد بالجبر روک دی، اور بعضوں پر اتنے زبردست محصول لگائے کہ ہندوستانی مال کسی طرح فروخت نہ ہو سکے چنانچہ انگلستان کی سنہ ۱۸۱۲ء والی تحقیقاتی کمیٹی نے جو رپورٹ شائع کی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ہندوستانی مصنوعات پر انگلستان میں حسب ذیل محصول درآمد لیا جاتا تھا۔

مصنوعات	محصول بحساب قیمت
ریشمی پارچہ وغیرہ	درآمد ممنوع
زربفت و تافتہ وغیرہ	درآمد ممنوع
چھینٹ	۷۲ فی صدی
آرائشی سامان	۸۰ ″
دری اور قالین	۶۸ ″
ململ و دیگر سوتی پارچہ	۲۷ ″
شکر	تخمیناً ۱۰ روپیہ فی من

اس کے برخلاف انگریزی مصنوعات بعض تو محصول درآمد سے بالکل آزاد تھیں اور بعض پر ہندوستان میں صرف ڈہائی فی صدی محصول لگایا جاتا تھا اور یہ اس وقت جبکہ ہندوستانی مصنوعات یورپ کے ساحلوں پر ستر اور اسی فی صدی محصول ادا کرتی تھیں، ذیل میں ہم اس قسم کی چند مثالیں پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب کی تصنیف "علم المعیشت" سے، جس کا ماخذ انگریزوں کی تحقیقات و تحریرات ہیں پیش کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ ہندوستانی صنعت کو تباہ کرنے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی گئیں۔

ڈاکٹر بوچانن جو ہندوستان کی معاشی تحقیقات کے لئے مقرر ہوئے تھے اور جن کی تحقیقات چھ جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہیں ان کا قول ہے کہ "پارچہ بافی کی صنعت کا ہندوستان میں اس قدر عروج ہے کہ زراعت کی مانند اس کو بھی عام ملکی پیشہ قرار دینا بیجا نہ ہوگا، چونکہ ہندوستان پارچہ بافی میں اس قدر ترقی کر چکا تھا، اس کے علاوہ خود انگلستان میں ہندوستانی کپڑے کی مانگ بڑھ رہی تھی اور وہاں کے امرا ہندوستانی کپڑوں کا استعمال باعث فخر سمجھتے تھے، اس لئے ہندوستان کی یہ ترقی انگلستان سے دیکھی نہ گئی، اور پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرنے کا خیال ہوا۔ وہاں کے صناعوں نے خوب چیخ پکار مچائی، چونکہ حکومت قومی تھی اسلئے فوراً ان کی بھبود کا خیال کیا گیا۔"

"۱۷ مارچ سنہ ۱۷۶۹ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولایت سے اپنے اعلیٰ عہدہ داروں کے نام بنگال کو ایک عام خط بھیجا۔

جس میں تاکید تحریر تھا کہ ہر طرح سے بنگال میں ریشم خام کی پیداوار بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئیے اور ساتھ ہی ساتھ ریشمی کپڑوں کی تیاری گھٹانی بلکہ روکنی چاہئیے، اس غرض کو پورا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی بتایا گیا کہ کپڑہ بننے والوں کو کسی نہ کسی طرح خود کمپنی کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کیا جائے اور بطور خود ان کو کام کرنے سے روکا جائے تاکہ کل کاروبار کمپنی کے ہاتھ میں آجائے اور وہ اس میں جیسی ردوبدل مناسب سمجھے کرے۔

اٹھارویں صدی میں جب نپولین نے تمام یورپ میں انگلستان کی مصنوعات کی درآمد بند کر رکھی تھی اس وقت انگلستان کی صنعت بھی سخت خطرہ میں تھی چنانچہ ان مصنوعات کا بازار ہندوستان تجویز کیا گیا اور ۱۸۱۳ء میں پارلیامنٹ نے اس بات کی تحقیق کی انگلستانی مال ہندوستان میں کس طرح فروغ پاسکتا ہے۔ اس کے لئے ہندوستان میں نمائشیں قائم کی گئیں اور ہندوستانی مصنوعات پر گرانبار محصول عائد کئے گئے، چنانچہ ہندوستان کا ہمعصر مورخ ولسن جس کا پاکیزہ دل ہندوستان کی ہمدردی سے لبریز معلوم ہوتا ہے ہندوستان و انگلستان کے تجارتی تعلقات پر رقمطراز ہے کہ "موجودہ طریق تجارت اس بے اتفاقی کی ایک افسوسناک مثال ہے جو ہندوستان کے ساتھ وہ ملک برت رہا ہے جس کی اطاعت ہندوستان نے قبول کرلی ہے" بنگال کے ریشمی پارچہ بافوں کے ساتھ جو ظلم کیا گیا وہ طامس منرو صاحب کے بیان سے بخوبی واضح ہوتا ہے جو ۱۸۱۳ء کی تحقیقات میں انھوں نے پارلیامنٹ کی منتخب کمیٹی کے روبرو پیش کیا وہ فرماتے ہیں "کہ ملازمان کمپنی نے خاص خاص نوربافوں کو ایک عمارت بارہ محل میں جمع کرکے ان پر پہرہ بٹھادیا اور اس وقت تک رہا نہ کیا جب تک انھوں نے یہ معاہدہ نہ کرلیا کہ سوائے کمپنی کے وہ اپنا مال کسی کے ہاتھ فروخت نہ کریں گے۔ جب نرخ پر نوربافوں کی طرف سے اعتراض ہوتا تو کمپنی کی ایک کمیٹی اپنی رائے کے موافق نرخ قرار دیتی اور نوربافوں کو قبول کرنا پڑتا۔ ان کو کچھ رقم پیشگی دیدی جاتی ہے جس کی ادائگی سے ان کو عمر بھر سبکدوش ہونا محال ہے اگر کوئی نورباف معاہدہ کی پوری پابندی نہ کرے تو اس پر نگرانی کے لئے ایک شحنہ تعینات کردیا جاتا ہے، جس کا طلبانہ ایک آنہ روز اسی نوربافت سے وصول کیا جاتا ہے شحنہ کے پاس ایک سونٹا بھی ہوتا تھا جس سے وہ بلاتکلف زدوکوب کا کام لے سکتا اور لیتا تھا"

"کمپنی کے ایک معزز افسر ہنری سٹ جارج ٹکر جو بعد واپسی انگلستان کمپنی کے ڈائرکٹروں میں داخل کرلئے گئے بیان فرماتے ہیں" ہم نے ہندوستان کے ساتھ کیسے تعلقات قائم کر رکھے ہیں؟ اس کے ریشمی اور نیز وہ کپڑے جو سوت اور ریشم سے مل کر بنتے ہیں کچھ روز سے ہمارے بازاروں سے خارج کردئیے گئے ہیں اور حال میں کچھ تو ۶۰ فی صدی محصول درآمد کی بدولت اور کچھ کلوں کی ایجاد کی بدولت سوتی کپڑے جو کہ ہندوستان میں بکثرت تیار ہوتے ہیں نہ صرف اس ملک میں آنے بند ہوگئے، بلکہ ہم اپنے قوم انگلستان کے بنے سوتی کپڑے اپنے ایشیائی مقبوضات میں بھیجنے لگے ہیں اور اس طرح ہندوستان صنعتی ملک سے تنزل کرکے اب محض زراعتی ملک رہگیا"

اب یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر انگلستان نے ہندوستانی مصنوعات خریدنا چھوڑ دیا تو کیا ہوا ان کا سامان دوسری جگہ فروخت ہوسکتا تھا اس کے علاوہ جس طرح دیگر ممالک نے اپنی مصنوعات کو فروغ دیا، اسی طرح یہ بھی دے سکتا تھا مگر یہ باتیں ناممکن تھیں اس لئے

کہ انگلستان کی دیکھا دیکھی دوسرے ممالک نے بھی اپنی صنعت کو ترقی دینے کے لئے ہندستانی مصنوعات کی برآمد و درآمد اپنے ملک میں روک دی، نئی نئی مشینیں ایجاد ہونے لگیں "پیدائش بر پیمانۂ کبیر" پر عمل کیا جانے لگا، اور سستی سستی مصنوعات تیار کرکے اُلٹے ہندوستان بھیجی جانے لگیں، اگر اس وقت ہندوستان میں بھی مشینوں سے کام لیا جاتا اور یہاں کی تجارت کو امن.... Protection عطا کیا جاتا تو پھر یورپ کسی طرح نہیں بڑھ سکتا تھا مگر نہ ہندوستان میں قومی حکومت تھی نہ طاقت نہ علم غرض ان تمام وجوہ سے یہاں کی مصنوعات کو تباہ ہونا پڑا۔

جو مصیبت مصنوعات کی بربادی کی بدولت ہندوستان میں پھیلی اس کی نسبت لارڈ ولیم بنٹنک ایک تحریر مورخہ ۳۰ مئی سنہ ۱۸۲۹ء میں ڈائرکٹران کمپنی کا ہمدردی آمیز نوٹ درج کرتے ہیں کہ "تجارت کے وجود انقلاب سے ہندوستان کے بیشمار صناع طبقوں میں جو سخت تکلیف و مصیبت پھیلی ہوئی ہے اور جس کی مثال تاریخ تجارت میں کہیں نظر آنی دشوار ہے اس کی بھیانک تصویر جو تجارتی بورڈ نے اپنی رپورٹ میں پیش کی ہے اس کو دیکھکر ڈائرکٹروں کے دلوں میں بیحد ہمدردی موج زن ہے"

درآمد و برآمد حکومت برطانیہ کی ہندوستان میں ایک حکمت عملی یہ بھی رہی ہے کہ یہاں سے پیداوار خام اور اپنے یہاں سے مصنوعات کی برآمد کو بڑھائے۔ چنانچہ ۱۹۲۴-۲۵ء کی رپورٹ سے درآمد و برآمد کی مدات اور ان کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں کی صنعتی پستی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تمام صنعتی پیداوار خام برآمد کی جاتی ہے اور مصنوعات درآمد کی جاتی ہیں۔ پہلے ہم یہاں کی درآمد کو دیکھتے ہیں۔

کپڑا سنہ ۱۹۲۳ء میں ۵۰ کروڑ کا کپڑا ہندوستان آیا اور سنہ ۱۹۲۴ء میں ۶۷ کروڑ کا۔ یہاں کی کل درآمد کا تیس فی صدی کپڑا ہے۔

مشنری ہندوستان میں جتنے کارخانے ہیں ان کے لئے مشینری باہر سے آتی ہے یہ دوسروں کا محتاج ہے سنہ ۱۹۲۳ء میں ۲۰ کروڑ اور سنہ ۱۹۲۴ء میں ۱۶ کروڑ کا سامان آیا۔

لوہا سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۷ کروڑ کا مال درآمد ہوا۔

شکر سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۵ کروڑ کی آئی

ریلوے ضروریات سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۴ کروڑ کی آئیں

معدنی تیل سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۳۳ سے اضافہ ۱۶۹ میلن گیلن ہوگیا۔

ریشم سنہ ۱۹۲۳ء میں خام و تیارشدہ دو دو کروڑ کا آیا۔

اب برآمد کو ملاحظہ فرمائیے:۔

کپاس سنہ ۱۹۲۳ء میں ۱۰۹ اور سنہ ۱۹۲۴ء میں ۴۰ کروڑ کی برآمد کی گئی۔

جوٹ یہ سوائے ہندوستان کے کہیں نہیں ہوتا اس پر لطف یہ کہ تمام متمدن اقوام کو اس کی ضرورت مگر سخت

افسوس یہ ہے کہ قریب قریب کل کا کل برآمد کر دیا جاتا ہے ۱۹۲۶ء میں ۶۲ کروڑ کا برآمد ہوا۔

اشیائے خوراک — ۱۹۲۳ء میں ۱۵ کروڑ برآمد کی گئیں۔

چاء — اس کی حالت بھی جوٹ ہی کی سی ہے یعنی یہ بھی دنیا میں سب سے زیادہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوتی ہے مگر یہ بھی ہندوستانیوں کے لیے زیادہ فائدہ مند نہیں اس لئے کہ چاء کے تمام باغات انگریزوں کے ہیں ہندوستانیوں کو اتنا فائدہ ہے کہ یہاں کے مزدور ان میں کام کرتے ہیں ۱۹۲۳ء میں یہ ۳۱ کروڑ کی برآمد کی گئی۔

روغن دار تخم — ۱۹۲۳ء میں ۲۹ کروڑ کا برآمد کیا گیا۔

چمڑہ — ۱۹۲۳ء میں ۱۲ کروڑ کا برآمد کیا گیا۔

ان مدات درآمد و برآمد کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہاں سے جو پیداوار خام جاتی ہے وہی مصنوعات میں اپنی صورت بدل کر پھر واپس آتی ہے۔ اگر یہیں ان سے مصنوعات تیار کی جائیں تو ان کے لئے پیداوار خام کافی ہے مثلاً ۱۹۲۳ء میں ۶۷ کروڑ کا کپڑہ ہندوستان آیا اور ۴۸ کروڑ کی کپاس ہندوستان سے گئی۔ شکر پندرہ کروڑ کی آئی مگر اس سے کہیں زیادہ خود یہاں کے گنوں سے تیار ہو سکتی ہے۔

انقلاب صنائع صنعتی پستی کی دوسری بڑی وجہ انقلاب صنائع ہے۔ انقلاب صنائع سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بھی مثل انقلاب فرانس یا روس کے کوئی انقلاب تھا، بلکہ انقلاب صنائع سے وہ معاشی تبدیلیاں مراد ہیں جن کا اثر پیدائش دولت پر بہت زبردست پڑا۔

۱۷۶۰ء اور ۱۸۳۰ء کے درمیان ستر برس میں انگلستان کے اندر وہ عظیم الشان انقلاب پیدا ہوا جسے انقلاب صنائع کہتے ہیں۔ اس انقلاب کا خلاصہ یہ تھا کہ جو چیزیں ہاتھ سے بڑی محنت اور دقت کے بعد تیار ہوتی ہیں وہ مشینوں کے ذریعہ سے تھوڑی محنت اور کم وقت میں تیار ہونے لگیں جسکے معنی یہ تھے کہ مشین کی بنی ہوئی اشیاء ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں سے بہت سستی ہوتی تھیں جن ملکوں میں مشینوں کا استعمال کیا جاتا تھا وہ بہت سستی اشیاء بنا کر دوسرے ملکوں میں جہاں مشینوں کا رواج نہیں ہوا تھا بھیجنے لگے اور ان ممالک کے دستکاروں نے جب دیکھا کہ تمام لوگ مشین کی بنی ہوئی سستی چیزیں خریدتے ہیں اور ان کی گراں مصنوعات کا کوئی خریدار نہیں تو مجبور ہو کر انھوں نے اپنا پیشہ ترک کر دیا اور دوسرا کوئی کام اختیار کر لیا اس طرح آئندہ نسل کو شروع ہی سے ان پیشوں کو سیکھنے کے لئے کوئی ترغیب نہ رہی اور ایسے ملکوں کی دستکاریاں بہت کم رہگئیں، اور صرف وہی رہگئیں جو مشینوں کے مقابل سستا مال بنا سکتی تھیں۔

غرض انقلاب صنائع سے یہ مراد نہیں کہ آناً فاناً پیدائش دولت کے طریقوں میں کوئی بڑی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ مطلب در اصل یہ ہے کہ چالیس پچاس سال کی مدت میں متعدد ایجادات یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوئی اور ان سب کا مجموعی نتیجہ

یہ ہوا کہ اس قلیل مدت کے اندر پیدائش دولت کے طریقوں میں ایسی حیرت انگیز تبدیلیاں نمودار ہوئیں کہ اگر ان کو انقلاب سے تعبیر کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

انقلاب صنائع کے چند کرشموں پر غور کیجئے۔ پہلے پن جو دن بھر میں ایک آدمی بمشکل ایک سو بنا سکتا تھا اب ایک مشین ایک گھنٹے کے اندر لاکھوں بنا دیتی ہے۔ یہی دیا سلائیاں اگر ہاتھ سے بنائی جائیں تو دن بھر میں ایک آدمی شاید ایک ڈبیہ بنا سکے، اور اس کی قیمت بھی پانچ چھ آنہ ڈبیہ سے کم نہ ہوتی، مگر اب ایک مشین کی بدولت ایک گھنٹہ میں لاکھوں دیا سلائی تیار ہو سکتی ہیں اور آج کل باوجود گرانی کے دو اور تین پیسہ میں ایک ڈبیہ ملتی ہے۔ ایک نورباف جو تمام دن میں زیادہ سے زیادہ چار پانچ گز کپڑا تیار کر سکتا تھا وہی کپڑا اب مشین کے ذریعہ سے ہزاروں گز تیار ہوتا ہے، فولاد اس سہولت اور سرعت سے کاٹا جاتا ہے جیسے معمولی لکڑی آرے سے، ان ایجادوں کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ تمام پرانے طرز پر کام کرنے والے اپنے کاموں کو طوعاً و کرہاً چھوڑ دیں کیونکہ جس قدر ارزاں چیزیں مشین سے تیار ہو سکتی ہیں ہاتھ سے نہیں ہو سکتیں۔

غرض یہ امر مسلم ہے کہ دستکار کسی طرح مشین کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جب مشینوں نے رواج پایا تو مجبوراً دستکاروں کو اپنا کاروبار ترک کرنا پڑا۔ چونکہ انگلستان اور دیگر ممالک کے باشندے سمجھدار اور تعلیم یافتہ تھے انھوں نے بہت جلد اپنے کو اس نئے طریق محنت پر ڈھال لیا مگر اس کے خلاف ہندوستان میں یہ حالت رہی کہ پرانے طریقوں پر قائم رہنے کی کوشش کی گئی۔ اگر اس وقت ہندوستان میں بھی مشینوں کا استعمال شروع ہوتا اور باہر کا مال ملک میں آنے سے روک دیا جاتا تو پھر یہاں کی صنعت محفوظ رہتی، مگر مال بھی بلا روک ٹوک آنے لگا اور مشین کا رواج بھی نہیں ہوا، کیونکہ جس وقت انگلستان میں نئی نئی مشینیں ایجاد ہو رہی تھیں، بڑی بڑی قومیں ڈھالی جا رہی تھیں اس وقت ہندوستان ناچ اور گانے میں ترقی کر رہا تھا، ناچ کی انتہائی تعریف یہ تھی کہ بتاشے پر ناچا جائے اور بتاشہ نہ ٹوٹے، یہاں کے امرا عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے ان کو یہ خبر نہیں تھی کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ بہت سے نواب اور رئیس تو ایسے تھے جنھوں نے شہر کا تو کیا ذکر تمام عمر اپنے محل سے باہر قدم نہیں رکھا تھا، عام لوگوں پر جہالت، پستی اور جمود کی گھٹا طاری تھی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی صنعت ہمیشہ کے لئے مردہ ہو گئی۔ انقلاب صنائع بری شے نہیں کیونکہ انگلستان اور امریکہ نے اسی کی بدولت اس قدر ترقی کی مگر ہندوستان میں یہ ہوا کہ ایک طرف تو اس کی برکات سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اور دوسری طرف اس کے مضر اثرات سے بچنے کی کوشش نہیں کی گئی اور کوشش کی بھی جاتی تو کس طرح نہ لوگوں میں اتفاق اور نہ اپنی حکومت۔

ریلوے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان میں ریلوے نے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچایا تو اس سے یہ مراد نہیں کہ ریلوے بذاتہ کوئی بری چیز یا بلائے ناگہانی ہے اور جس طرح بنے، ہندوستان سے اس کی پٹریوں تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا جائے، اگر کسی کا یہ خیال ہو تو اس سے بڑھکر کوئی احمق نہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ریلوے کی بدولت آمد و رفت میں بے انتہا سہولت ہو گئی۔ آج کل ہندوستان میں جو کچھ عملی ترقی نظر آ رہی ہے وہ اسی کا ایک نتیجہ ہے۔ کاروبار میں

ترقی ہوئی ملک میں چہل پہل بڑہی مگر ہم کو یہاں ریلوے کے اس کاروبار سے بحث ہے جو مال لانے اور لیجانے سے متعلق ہے۔

ریلوے کمپنی نے مال لانے اور لیجانے کے دو شعبے قرار دئیے ہیں ایک پورٹ ٹریفک Port Traffic دوسرا انٹرنل ٹریفک Internal traffic پورٹ ٹریفک سے مراد مال کا ملک کے ایسے حصے سے دوسرے حصے میں لا لیجانا ہے جس میں کم سے کم ایک جگہ بندرگاہ ہو۔ خواہ مال بندرگاہ سے دوسرے شہروں کو جائے۔ جو بندرگاہ نہیں ہیں یا دوسرے شہروں سے کسی بندرگاہ جائے یہ ہردو پورٹ ٹریفک کہلائیں گے۔ انٹرنل ٹریفک مراد یہ ہے کہ جس جگہ بھیجا جائے ان میں سے کوئی بھی بندرگاہ نہ ہو۔ ریلوے کمپنیوں نے پورٹ ٹریفک کا کرایہ کم رکھا ہے اور انٹرنل ٹریفک کا زیادہ۔ اب پورٹ ٹریفک سے وہی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کا کاروبار بندر پر ہو یا جو کسی بندر پر مال روانہ کریں۔ دیکھنا یہ چاہئیے کہ کس قسم کے لوگوں کا کاروبار بندر سے تعلق رکھتا ہے اسمیں بڑا حصہ ان لوگوں کا ہے جو دیگر ممالک سے مال درآمد یا دیگر ممالک کو برآمد کرتے ہیں یا جن کے کارخانے بندروں پر قائم ہیں۔ اب ان لوگوں اور اُن کارخانوں کو جو بندر پر ہیں مصارف نقل وحمل کی کمی کی وجہ سے مال کفایت سے پڑیگا۔ اور وہ دوسروں کے مقابل مال سستا فروخت کرسکتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان کے تمام کارخانے بندروں پر قائم ہوں۔ اس فرق مصارف کی وجہ سے لوگوں کا رجحان یہ ہے کہ کارخانے بندر پر قائم کریں۔ کیونکہ جو کارخانے بندر پر قائم ہوتے ہیں ان کو مصارف نقل وحمل میں دوہری کفایت ہوتی ہے یہ اس طرح کہ بیرونی ممالک سے جو مال آئیگا وہ پہلے کسی نہ کسی بندرگاہ پر آئیگا، دوسرے بیرونی ممالک کو پیداوار خام بھیجنے کے لئے بھی پیداوار کا پہلے کسی نہ کسی بندرگاہ پہنچنا ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو کارخانے ملک کے اندر (جو کسی بندرگاہ پر نہیں ہیں) قائم ہیں وہ اس رعایت سے کسی طرح فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لئے ایسے کارخانوں کا تیار کردہ مال یقیناً اول الذکر سے گراں رہیگا۔ جب اس طرح ایک کو مال ارزاں اور دوسرے کو گراں پڑے تو مسابقت باقی نہیں رہتی اور اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو پہلے سے طاقتور ہیں اُن کو اور قوت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ غرض ریلوے کے اس قانون کی وجہ سے ملکی مصنوعات بیرونی مصنوعات سے گراں پڑتی ہیں، اور اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ریلوے بھی یہاں کی مصنوعات کی تباہی کی ایک بڑی حد تک معاون ہوئی۔ یہ خرابی ایسی نہیں کہ رفع نہ ہوسکے۔ اور یہ موجودہ نظام حکومت کی بے توجہی کی بدولت ہے۔

تجارت آزاد | ہندوستان میں تجارت آزاد کی حکمت عملی کی وجہ سے یہاں کی مصنوعات کو جو نقصان پہنچا وہ بہت کچھ پہلے بیان ہوچکی ہیں۔

تجارت آزاد کی بدولت ساری دنیا کی مصنوعات مشین سے سستی بن بن کر ہندوستان آنے لگیں جن کا مقابلہ یہاں کے دستکار کسی طرح نہیں کرسکتے تھے اگر یہاں تجارت آزاد نہ ہوتی تو بیرونی ممالک کی مصنوعات پر گرانبار محصول درآمد لگا کر ہندوستان آنے سے روکا جاسکتا تھا جس طرح انگلستان نے ہندوستان کی مصنوعات کے ساتھ کیا۔ چونکہ اس تجارت آزاد اور دیگر ممالک کی سستی مصنوعات سے بچنے کے لئے ہندوستان کے پاس کوئی آلہ نہیں تھا اس لئے رفتہ رفتہ یہاں کی صنعت تباہ ہوتی گئی۔

صنعت وحرفت کی ترقی کی صورتیں | یہاں کی صنعت وحرفت کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہوچکا، اس کا رونا رونے

سے کیا فائدہ اب اس کی ترقی کی فکر کرنی چاہیئے۔ اس کی ترقی کی یہی صورتیں ہیں کہ پیداوار خام کو ترقی دیجائے جو ہندوستان میں کافی دوانی ہے۔ دوسرے اصل فراہم کرنیکا معقول انتظام کیا جائے۔ اصل کی فراہمی کی جو صورتیں ہیں وہ قبل کے مضمون میں بیان ہو چکی ہیں۔ تیسرے محنت کی کارکردگی کو بڑھایا جائے اور اس میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ چوتھے تجارت ماموں کا طریقہ رائج ہو۔ ریلوے قانون میں (جس کا بیان اوپر ہوا ہے) اصلاح کی جائے، اور حکومت اپنی حکمت عملی بدل دے، جیسا کہ بار بار بیان ہو چکا ہے، یہ تمام خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں، کیونکہ یہ سب خارجی اسباب کا نتیجہ ہیں اس کے علاوہ انجمن اتحاد مزدوران Trade union اور انجمن اتحاد باہمی Co-operative Societies کثرت سے قائم ہوں تاکہ عوام افلاس دور ہو، صنعتی بنکس Industrial Banks قائم ہوں اور جب تک یہ صورت حال رفع نہ ہو حکومت اپنی ذمہ داری پر اصل Capital دلائے حکومت کی ضمانت اور ذمہ داری کا یہ فائدہ ہوگا کہ حکومت اُن ہی کارخانوں کی ذمہ دار ہوگی جن کے فروغ کی امید ہوگی ایسی حالت میں کارخانے ترقی کریں گے

درآمد برآمد میں ایسی صورت اختیار کی جائے کہ جس سے ملکی ترقی ہو اور حکومت خاص خاص صنعتوں میں موڈل فیکٹریز Model Factories قائم کرے جس طرح سے کاشتکاری میں پیداوار خام کے لئے حکومت عموماً کرتی ہے۔ تیسرے نئی نئی مشینوں کی ایجادات کے متعلق یہاں کے لوگوں کو دفعتاً فوقتاً آگاہ کیا جائے، ان مشینوں کے متعلق حکومت نے کچھ توجہ کی مگر اس وجہ سے نہیں کہ یہاں کی مصنوعات کو فروغ ہو۔ بلکہ اس لئے کہ یہاں کی پیداوار خام بڑھے اور بیرونی لوگوں کو یہاں سے پیداوار خام لینے میں آسانی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ حکومت یہاں کی مصنوعات کی ترقی کے لئے کچھ کوشش کر رہی ہے کیونکہ اس نے ایک ٹیرف بورڈ Tarrif Board اور انگلستان میں اعلیٰ کمشنر ہند High Commissioner for India کا عہدہ قائم کیا ہے، لیکن نتیجہ معلوم۔ جب تک خود ملک میں عام تعلیم کے ذریعہ سے اس احساس کو نہ پیدا کر لیا جائے کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

ابوالمنصور حمید

استفسارات

مسلمانوں میں بہترین صحافی

(جناب محمد اشتیاق حسین صاحب اکبرآبادی)

"مسلمانوں میں اس وقت بہترین صحافت داں کون شخص ہے اور مہارت صحافت"
"کے لئے کن خصوصیات کی ضرورت ہے؛ اور یورپ میں جہاں اس کی تعلیم ہوتی ہے"
"وہاں کیا سکھایا جاتا ہے۔"

(نگار) آپ کو اپنے سوال کا پہلا حصہ حذف کر دینا چاہئیے، کیونکہ اگر آپ یہ معلوم ہو جائے کہ مہارت صحافت کے لئے کن خصوصیات کی ضرورت ہے تو بغیر دریافت کئے ہوئے، یہ امر بھی محقق ہو سکتا ہے کہ اس وقت بہترین صحافت داں کون ہے، علاوہ اس کے آپنے اپنے استفسارات میں ملک کی بھی قید نہیں کی ہے، اس لئے تمام عالم اسلامی میں سے کسی ایک ہستی کو منتخب کرنا یوں بھی آسان کام نہیں ہے، اور اگر مقصد صرف سرزمین ہند ہے تو اس کا فیصلہ آپ کو خود ہی کرنا چاہئیے، میں تو صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ خصوصیات صحافت کیا ہیں، اور اس فن کی تعلیم کس قدر اہم ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک اچھا تعلیم یافتہ انسان جو اپنے خیالات کے اظہار پر پوری قدرت رکھتا ہے، صحافت کے کام کو بخوبی انجام دیسکتا ہے، اور اس لئے یورپ وہند کے تمام گریجوئٹ اس کے اہل ہیں کہ وہ صحافی بن سکیں، لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے، اول تو جس طرح ہر فن کے لئے ایک مخصوص ترکیب دماغ کی ضرورت ہے؛ اسی طرح اس فن کے لئے بھی خاص دماغ ہونا چاہیئے، دوسرے یہ کہ کالجوں کا نصاب اس قدر معلومات بہم نہیں پہنچاتا، جتنی ایک صحافی کو ضرورت ہوتی ہے۔

موجودہ طریق تعلیم یہ ہے کہ ہر فن کے لئے اختصاصی تعلیم دیجائے، اور ایک طالب علم کسی ایک فن کا ماہر اختصاصی ہو کر نکلے، اس میں شک نہیں کہ یہ نہایت مفید طریق تعلیم ہے، لیکن بقول لائڈ جارج کے "عملی دنیا میں ایک اختصاصی عالم بالکل بیکار چیز ہے اور وہ شخص جس نے مختلف علوم وفنون کے متعلق آگاہی حاصل کرلی ہے، خواہ وہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے" اس لئے ان کی رائے میں اختصاصی بنانے سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ دماغ کو وسیع معلومات کا مخزن بنایا جائے، اور ہر فن سے اس کو بہرہ یاب کیا جائے۔

بہرحال چونکہ موجودہ طریق تعلیم "اختصاصی" ہے اور صحافت کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کی معلومات نہایت وسیع ہوں اس لئے کالجوں کے فارغ التحصیل طلبہ یقیناً اس فن کو اختیار نہیں کر سکتے، جب تک مخصوص طور پر اس کی تعلیم نہ دیجائے، اور تمام ان علوم سے انہیں آگاہ نہ کیا جائے جن کا درک ضروری ہے۔

سب سے پہلے ضروری چیز جس کا علم ایک صحافی کو ہونا چاہیئے "تاریخ عالم" ہے کیونکہ جب تک اس پر اس کو عبور حاصل نہ ہوگا، وہ انقلابات وحوادث پر کامیاب رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ "مذاہب عالم" کی تاریخ پر بھی اس کی کافی نگاہ ہونی چاہیئے کہ یہ بھی اسکا ضروری جز ہے۔ پھر سیاسیات، سیاست مدن، معاہدات، علم اسماء رجال، جغرافیہ۔ فن تنقید کی مہارت بھی لابدی ہے اعداد وشمار کے ساتھ بھی اسے دلچسپی ہونی چاہیئے، اور دیگر فنون وعلوم مروجہ میں سے ہیئت، طبیعیات، ریاضیات، طب، فنون لطیفہ، کیمیا، عضویات کا بھی اسے کچھ نہ کچھ ضرور علم ہونا چاہیئے۔ لیکن ان علوم پر اگر کافی دسترس ہو اور وہ اچھا انشاپرداز نہ ہو تو بیکار ہے، ضرورت ہے کہ جب وہ کسی فن یا کسی مسئلہ پر گفتگو کرے تو اس کے مطابق اپنے انداز تحریر میں ایسی تبدیلی پیدا کر سکے کہ پڑھنے والے ایک ہی شخص سے انہیں منسوب نہ کر سکیں۔ اس کو سمجھنا چاہیئے کہ ہر موضوع کے ساتھ زبان، طرز تحریر، اور طریق ادا بدلجاتا ہے، اور اس پر اسے کاربند ہونا چاہیئے، ہلکی سی شوخی یا ظرافت بھی صحافت کی کامیابی کا ضروری جزو ہے، اور متعدد زبانوں کا جاننا بھی اس کی اہم ترین شرط۔

یورپ میں جو تعلیم ہوتی ہے وہ تقریباً انہیں علوم کی ہوتی ہے، لیکن زیادہ تر مشق اس امر کی کرائی جاتی ہے کہ وہ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے موضوع کی نوعیت کے لحاظ سے کن الفاظ کا استعمال کرے اور کس طرح اپنے بیان کو موثر بنا سکے، یہ بالکل یقینی ہے کہ جب تک قدرت کی طرف سے کوئی دماغ اس کے لئے وضع نہ ہوا ہو وہ کبھی کامیاب صحافی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کوئی شخص اگر تمام علوم کا ماہر ہوجائے اور پھر بھی اس میں حسن استدلال، استخراج نتائج، پیش بینی اور دو واقعات کو دیکھکر تیسرے واقعہ کے متعلق مدبرانہ اور عالمانہ طور پر حکم لگانے کی قابلیت نہ ہو، وہ کبھی کامیاب صحافی نہیں ہو سکتا۔

یورپ میں چونکہ اکثر دماغ "عملی" پیدا ہوتے ہیں اس لئے وہاں کی صحافت بھی زیادہ ترعملی ہے اور اس کا انحصار صرف سنی ہوئی خبروں کو شیرازہ بند کر دینے پر نہیں ہوتا۔ وہاں ہر صحافی چاہتا ہے کہ حوادث عالم کی خبر سب سے پہلے اسی کو ملے اور موثق ترین ذرائع سے ان کی حقیقت کا علم حاصل کیا جائے، اور اسی امر میں وہاں باہم گر مسابقت ہوا کرتی ہے پھر چونکہ یہ سارا کام ایڈیٹر نہیں کر سکتا اس لئے مخبروں اور نمائندوں کی جماعت ایسی تیار کی جاتی ہے جو کم از کم تفحص واقعات واستخراج نتائج میں ایڈیٹر کے منشاد کو ضرور پوری کرنے والی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں ایک اخبار کا سارا اسٹاف کم وبیش ایک ہی اہلیت رکھتا ہے اور وہاں کوئی معمولی خبر رساں بھی جس اعتماد وعزم کے ساتھ کام کرتا ہے وہ یہاں کے بڑے بڑے اڈیٹروں کو حاصل نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں مجھے ایک نہایت دلچسپ واقعہ یاد آگیا ہے، جس سے معلوم ہوگا کہ یورپ کی صحافت کس قدر ترقی یافتہ ہے، اور

وہاں کے مخبر کیسا کیسا کام کرتے ہیں۔

ایک شخص ڈاکٹر کوک تھا اُس نے اعلان کیا کہ میں قطب شمالی تک ہو آیا ہوں، اس اعلان کے ہوتے ہی تمام اخباروں کے نمائندے کوپن ہگن کی طرف دوڑ پڑے، جہاں کے ساحل پر اس کا جہاز آنے والا تھا تاکہ اس سے ملکر قطب شمالی کے حالات دریافت کریں اور اپنے اپنے اخباروں کو اطلاع دیں۔ ڈیلی کرانکل نے بھی سر فلپ گبس کو اس خدمت کے لئے متعین کیا، اب ہم خود سر فلپ گبس کے الفاظ میں اس کا تذکرہ بیان کرتے ہیں، وہ لکھتا ہے کہ:-

"جس وقت مجھے اس خدمت پر مامور کیا گیا تو میں نے حسب عادت ایک ٹھنڈی سانس لی اور نہایت کافی مقدار روپیہ کی حاصل کر کے بحر شمالی کے راستہ سے کوپن ہگن روانہ ہو گیا۔ مجھ سے پہلے چالیس اخباروں کے نمائندے پہنچ چکے تھے جب شام کو وہاں پہنچا تو بہت تھکا ہوا تھا، اس لئے ارادہ ہوا کہ سب سے پہلے قہوہ کی ایک پیالی پینی چاہیئے۔ چونکہ جرمنی زبان سے واقف تھا اس لئے ایک گاڑی والے کو بلا کر حکم دیا کہ کسی قہوہ خانے لے چلے، وہ مجھے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں لے گیا، جو آدمیوں سے بھرا ہوا تھا میں ایک میز پر بیٹھ گیا اور ڈنمارک کی زبان کا ایک اخبار پڑا ہوا تھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ میں یہ زبان نہیں جانتا، لیکن کوک کا نام ایک جگہ جلی قلم سے لکھا ہوا دیکھکر پہچان گیا کہ اس میں انہیں حضرات کا ذکر ہے، خادم سے جو انگریزی زبان جانتا تھا میں نے پوچھا کہ کیا کوک کوپن ہگن آ گئے ہیں، اُس نے کہا کہ کوہر کے وجہ سے آج نہیں اس کے کل صبح کو پہنچیں گے، اور سارا ڈنمارک اُن کی آمد کا منتظر ہے یہ سنکر مجھے کچھ اطمینان ہوا اور ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی کہ دیکھوں کسی اور اخبار کا نمائندہ بھی موجود ہے یا نہیں، لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی، میں نے نگاہ اٹھائی تو معلوم ہوا کہ ایک حسین عورت سفید سمور کی ٹوپی اور سفید سمور گلے میں لپیٹے ہوئے ایک دوسری عورت اور طویل قامت مرد کے ساتھ اندر داخل ہوئی ملازم نے مجھ سے کہا کہ یہی میڈم راسموسن ہے جس کا شوہر، ڈاکٹر کوک کا نہایت عزیز دوست ہے اور جو اُس کے سفر شمال کے لئے کتے لایا تھا، (کیونکہ برفیلی زمینوں کا سفر اُن گاڑیوں کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے جنھیں کتے کھینچتے ہیں) یہ سنکر میں اور خوش ہوا اور بہ نسبت دوسرے نمائندوں کے اپنے کو خوش قسمت سمجھنے لگا، کہ اتفاق سے اس عورت سے ملاقات ہو گئی، میں جرأت کر کے آگے بڑھا اور نہایت ادب سے جھک کر بولا کہ "میں لندن کے ایک اخبار کا نمائندہ ہوں اور ڈاکٹر کوک سے ملنے آیا ہوں۔ چونکہ ڈاکٹر آپ کے شوہر کا دوست ہے اس لئے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اب ڈاکٹر کوک کہاں ہیں؟"

اس نے جواب دیا کہ "بیشک میرا شوہر ڈاکٹر کوک کا نہایت عزیز دوست ہے اور میں اپنی کشتی میں اس کے استقبال کے لئے جانا چاہتی تھی لیکن کوہر نے راستہ مسدود کر رکھا ہے اور اب صبح سے پہلے سفر ناممکن ہے" میں نے کہا "اگر واقعی وہاں جانا مقصود ہے تو کیوں نہ اس وقت السنور چلئے۔ رات وہاں بسر کیجئے اور صبح کو اسٹیم لانچ میں بیٹھکر ڈاکٹر کوک کے جہاز تک پہنچئے۔ اگر آپ اجازت دیں گی تو میں بھی ہمرکاب ہو جاؤنگا"

وہ یہ سنکر ہنسی اور بولی کہ "سب سے آخری گاڑی السنور جانیوالی تو روانہ ہو گئی" ———— میں نے کہا

کہ "موٹر سے چلیئے" ...... اُس نے جواب دیا کہ عورات کو موٹر پر اتنا طویل سفر ممنوع ہے، اور موٹر چلانے والے پر جرمانہ ہو جائے گا .... میں نے یہ سُن کر فوراً خادم کو بلایا اور کہا کہ فوراً کسی موٹر کو بلائے۔ ایک منٹ کے بعد ہی موٹر والا سامنے تھا اور ٹوپی اُس کے ہاتھ میں تھی، میں نے اُس سے کہا کہ ہم چار آدمی آج کی رات السنور پہنچنا چاہتے ہیں .... اُس نے کہا کہ ممکن نہیں کیونکہ مجھے بڑا جرمانہ ادا کرنا پڑے گا، میں نے اُس سے پوچھا جرمانہ کی مقدار کیا ہوگی اور دل میں کہا کہ اگر پچاس گنی بھی جرمانہ ہوا تو میں ادا کر دونگا .... اُس نے کہا "اُجرت و جرمانہ سب ملاکر پانچ گنی ادا کرنا پڑیگا"۔

میں نے یہ سُن کر میڈم راسموسن اور اُس کے ساتھیوں کو چلنے کی دعوت دیدی۔ اور رات کو دس بجے نہایت سخت سردی میں چلکر السنور پہنچ گئے۔ اسی وقت میڈم راسموسن نے اُس کشتی کے مالک سے گفتگو کی جو ڈاکٹر کوک کے استقبال کے لئے جانے والی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد منستی ہوئی آئی اور بولی کہ وہ ہم سب کو لیجانے سے انکار کرتا ہے کیونکہ کشتی پر ہو گئی ہے لیکن آپکو لیجائے گا کیونکہ آپ اخبار کے نمائندے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ میں صبح کو اس کشتی پر روانہ ہوا اور تھوڑی دیر میں ڈاکٹر کوک کا جہاز نظر آنے لگا جب کشتی قریب پہنچی تو میں اُس سے اُتر کر جہاز پر گیا اور وہاں دیکھا کہ ایک شخص کو لوگ چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں، میں سمجھ گیا کہ یہی ڈاکٹر کوک ہے، میری کشتی میں ڈنمارک کے دو اخباروں کے نمائندے بھی تھے، میں نے آگے بڑھکر ہاتھ ملایا اور کہا کہ میں فلاں اخبار کا نمائندہ ہوں۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ آؤ میرے ساتھ ناشتہ کرو، اُس نے اپنے پاس مجھے میز پر بٹھا لیا جہاں اور بھی بہت سے مرد عورت موجود تھے، میں نے اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا تو محسوس کیا کہ اُس میں انفعالی کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے اور آنکھ سے آنکھ ملاکر بات کرنا پسند نہیں کرتا اسی کے ساتھ جب میں اُس کے سفر کے متعلق کوئی سوال کرتا تھا تو کوئی صریح جواب نہیں دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور وہاں ایک گھنٹہ تک گفتگو رہی جس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ڈاکٹر کوک بالکل جھوٹا ہے اور اُس کو قطب شمالی کی ہوا بھی نہیں لگی، میں نے اُس سے بہت سی باتیں دریافت کیں تاکہ کچھ تو نمائندگی کی لاج رہجائے اور اپنے اخبار کو اطلاع دیسکوں، لیکن کامیابی نہ ہوئی آخرکار میں نے اُس سے کہا کہ کم ازکم اپنی ڈائری مجھے دکھا دیجئے یہ سُنکر اُس نے مجھے غصہ کی نگاہ سے دیکھا اور بولا کہ " وہ ایک شخص ہوٹنی کی کشتی میں ہے جو اُسے نیویارک لیجائیگا " میں نے پوچھا وہ یہاں کب تک پہنچے گا تو جواب ملا کہ سال آئندہ تک۔ میں نے کہا "تاہم آپ کے پاس مسودہ کے اوراق تو ضرور ہوں گے، اس سے بھی اُس نے غصہ کے ساتھ انکار کر دیا، پھر میں نے کہا کہ کوئی ارصاد فلکی (ستاروں کا نقشہ) تو آپنے ضرور ہی تیار کیا ہوگا اس پر وہ بولا کہ "تم سے کہہ چکا ہوں کہ میرے پاس کچھ نہیں ہے" میں نے کہا کہ "حیرت ہے آپ ایسا دعوی لیکر آتے ہیں جو اس سے قبل کسی نے نہیں کیا، اور پھر آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے"، لیکن اس کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولا، اور میں نے بھی یہ دیکھکر کہ اس قسم کا مزید سوال بیکار ہے اور کچھ نہ کچھ اس سے معلوم کرنا ضروری ہے تاکہ اخبار کو اطلاع دوں، اس لئے میں نے راستے کے حالات سفر کی تکالیف وغیرہ کا حال دریافت کیا۔ اسکے قصے اس نے بہت سے بیان کئے، لیکن اکثر متضاد۔

جب جہاز کوپن ہگن پہنچا تو ساحل پر اس قدر ہجوم تھا کہ تل رکھنے کو جگہ باقی نہ رہ گئی تھی، جہاز کے پہنچتے ہی مسرتوں کے نعرے بلند ہوئے اور تختے سے اترتے ہی ڈنمارک کے ولی عہد نے مبارکباد پیش کی۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کے چہرے سے کیسا مجرمانہ انفعال ٹپک رہا تھا۔ اس کے بعد اخباروں کے نمائندوں نے اسے گھیر لیا۔ اُن میں سے میرا ایک جاننے والا بھی تھا، اور جب اس کو معلوم ہوا کہ میں دو گھنٹہ تک ڈاکٹر کوک کے ساتھ اس کے جہاز پر رہ چکا ہوں تو میرے پیچھے پڑ گیا کہ کچھ حالات بیان کرو، لیکن کسی نہ کسی طرح اس کو میں نے ٹالا اور موٹر پر سوار ہو کر ایک غیر آباد سے ہوٹل میں پہنچا۔ یہاں میں نے بیٹھ کر ڈیلی کرانکل کے سات کالم کے برابر ایک طویل مضمون لکھکر ثابت کیا کہ ڈاکٹر کوک جھوٹا ہے، اور جس وقت میں نے یہ مراسلہ تار گھر میں دیا تو مجھے یقین تھا کہ میں نے ایسا قدم اُٹھایا ہے جو یا تو مجھے قعر ذلت میں ڈھکیل دیگا یا کامیابی کے انتہائی نقطۂ عروج تک پہنچا دیگا۔

لطف یہ کہ سوائے میرے اور سب کو ڈاکٹر کوک کے بیان پر اعتماد تھا، اور میں ہر وقت اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح اس مسئلہ کو واضح کر دوں اور سوچا رہتا، دوسرے دن مجھے معلوم ہوا کہ میرا سارا مراسلہ شائع ہو گیا ہے، کیونکہ ڈنمارک کے جرائد میں جو تار شائع ہوئے اُن میں میرے فقرات موجود تھے۔ اس سے سارے ڈنمارک میں سخت ہیجان میرے خلاف پیدا ہو گیا۔ کارٹون نکالے گئے، اور مجھے جھوٹا بتایا گیا۔ میں نے جو دلائل ڈاکٹر کوک کی تکذیب میں پیش کئے تھے، ان کی تفصیل تو بہت ہے، لیکن ان میں سے بعض یہ تھے کہ "اس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ قطب شمالی تک پہنچنے تک کے تمام تفصیلی خبریں اس نے سورورپ ڈنمارک کے مشہور سیاح قطب شمالی کو دی ہیں اور جن کی بنا پر سورورپ نے تصدیق کی ہے کہ ڈاکٹر کوک واقعی قطب شمالی تک پہنچا لیکن جب میں نے سورورپ سے جا کر دریافت کیا تو اس نے انکار کیا اور کہا کہ مجھے ڈاکٹر کوک نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ دوسری بات یہ کہ ڈاکٹر کوک نے کہا تھا کہ اس نے ارصاد فلکی کوپن ہگن یونیورسٹی کے سامنے پیش کیا اور وہاں کے پروفیسروں نے اس کی تصدیق کی، لیکن جب میں نے رئیس جامعہ سے دریافت کیا تو اس نے بھی انکار کیا۔ میں نے ڈاکٹر کوک کے بیان کردہ حالات کو ان لوگوں کے سامنے بھی پیش کیا جو اس سے قبل قطب شمالی کی طرف سفر کر چکے تھے اور ان سب نے کہا کہ جو صورتیں کوک نے بیان کی ہیں وہ غلط ہیں، اسی طرح اور بھی بہت سی متناقض باتیں میں نے ظاہر کی تھیں، لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب جرائد ڈنمارک نے رئیس جامعہ کا یہ بیان شائع کیا کہ اس نے مجھ سے کوئی گفتگو اس مسئلہ میں نہیں کی تھی۔ اُدھر سے ڈیلی کرانکل کا تار آیا کہ یہ کیا بات ہے۔ مسٹر اسٹڈ ریویو آف ریویوز کا مالک میرے پاس آیا اور بولا کہ خیر تم نے تو اپنے آپ کو بدنام کیا ہی تھا ڈیلی کرانکل کو بھی دھبہ لگایا بڑے افسوس کی بات ہے" میں نے اس سے کہا کہ میرے ساتھ رئیس جامعہ کے پاس چلئے اور خود گفتگو کیجیے، چنانچہ دو اور گواہ ساتھ لیکر اس کے پاس پہنچے، اول اول تو اس نے انکار کیا کہ کوک کے باب میں کوئی گفتگو نہ کریگا لیکن بعد کو جب مسٹر اسٹڈ نے کہا کہ اسی پر سارے امر کا انحصار ہے تو وہ آمادہ ہوا، لیکن ہمارے ساتھیوں میں سے ایک شخص ٹیلی گراف کمپنی کا نمائندہ بھی تھا۔ اس نے جلدی جلدی جرمن زبان میں اس سے گفتگو کی، جس کا منشا یہ تھا کہ وہ انکار کر دے یا یہ کہ کوک کے بیان کی تصدیق، کیونکہ اس نے پہلے میرے خلاف رئیس جامعہ کا انکار شائع کیا تھا۔ لیکن مسٹر اسٹڈ نے اس کو جرمنی

زبان میں گفتگو کرنے سے رد کردیا اور کہا کہ گفتگو اس زبان میں ہونی چاہئیے جسے سب سمجھ سکیں آخر کار بڑی زحمت کے بعد رئیس جامعہ نے کہا کہ کوک نے نہ کوئی ارصاد فلکی پیش کی اور نہ کوئی اور ثبوت ایسا پیش کیا جس سے اس کے بیان کی تصدیق ہوسکے میں نے متعدد سوالات لکھکر اس کے جواب مقابلہ میں لکھ لئے اور پھر رئیس جامعہ سے درخواست کی کہ اس پر دستخط کردے، اوّل اوّل تو اُس نے انکار کیا، لیکن پھر دستخط کردیے۔ اس کے بعد ہی ایک دن میں مسٹر راسموسن کے ساتھ کھانا کھارہا تھا کہ اس نے مجھے اپنے شوہر کی ایک تحریر دکھائی جو کوک کا بڑا دوست تھا، جس میں ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ کوک بڑا مکار ہے، چونکہ خط ڈنمارک کی زبان میں تھا اور میں اس سے واقف نہ تھا اس لئے میں نے اس کے نقل اسی کے ایک ساتھی کے ہاتھ کرا کے ترجمہ کرایا اور رکھ لیا لیکن بعد کو جب اس کی اشاعت ہوئی تو مسٹر راسموسن نے انکار کردیا کہ میں نے کوئی تحریر اپنے شوہر کی نہیں دکھائی، اور اُس نے ایسا لکھا تھا، میں نے مسٹر راسموسن کو بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملی، میں نے اسی کے ساتھی کی اصل تحریر پیش کی، اور بڑی مشکل سے اہل ڈنمارک کو یقین دلا سکا، کہ واقعی مسٹر راسموسن نے ایسی تحریر مجھے دکھائی تھی، اور اس کے شوہر نے ایسا لکھا تھا"

اس واقعہ سے آپ کو ایک اجمالی علم اس امر کا ہوگیا ہوگا کہ یورپ کی صحافت کتنی پیچیدہ ہے اور وہاں ایک واقعہ کی تحقیق کے لئے بعض اوقات کس قدر کاوشیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، برخلاف ہندوستان کے، کہ یہاں کے اخبار کا ایڈیٹر ملکی و مقامی حالات سے بھی آگاہ نہیں ہوتا اور بیٹھا ہوا "رجم بالغیب" کیا کرتا ہے

ہندوستان کے مسلمان صحافیوں میں جن کا مجھے علم ہے مولٰنا ابوالکلام، مولٰنا محمد علی، اور مولوی ظفر علیخاں یقیناً بڑی حد تک کامیاب صحافت داں کہلائے جاسکتے ہیں، اگر وہ سارے کام چھوڑ کر اسی کو اختیار کریں۔

توت عنخ امون

(جناب محمد انصار صاحب بریلی)

" براہ کرم مطلع فرمایے، کہ طوطا نخمون جس کی قبر حال ہی میں مصر میں "
" دریافت ہوئی ہے، کس زمانہ میں پایا جاتا تھا اور اسکے مختصر تاریخی حالات کیا ہیں "

(نگار) آپ نے اس کا نام صحیح درج نہیں کیا، اور میں دیکھتا ہوں کہ ہندوستان کے اکثر جرائد و رسائل نے اس نام کے لکھنے میں عجیب و غریب ذہانت سے کام لیا ہے، اس کا اصل نام " توت عنخ امون " ہے، جسے قدیم مصری خط میں اس طرح لکھتے ہیں :-

لفظ توت، ہر اغلفی و قبطی زبان میں صورت کو کہتے ہیں، عنخ بہ معنی حیات یا صاحب حیات اور اٰتون دیوتا کا نام ہے، پورے لفظ کے معنی ہوئے "امون صاحب حیات کی صورت"۔
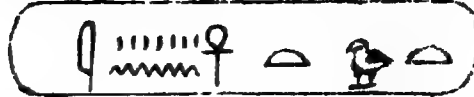
قبل مسیح قدیم مصر میں جتنے خاندان حکمراں ہوئے ہیں اُن میں سے اٹھارویں خاندان سے اس بادشاہ کا تعلق تھا، یہ خاندان نہایت مشہور حکمراں خاندان تھا اور قدیم تاریخوں میں اس کے مفصل حالات بھی درج ہیں، اس خاندان کی حکومت باختلاف آرار مسیح سے تقریباً دو ہزار سال قبل پائی جاتی تھی، لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ توت عنخ امون اس خاندان کا کونسا فرمانروا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ امنحوتپ ثالث کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا بعض کا خیال ہے کہ اس کی ماں شرعی بیوی تھی اور بعض کہتے ہیں لونڈی تھی اور اسی طرف زیادہ میلان مورخین کا ہے۔

قدیم مصر میں قاعدہ تھا کہ شرعی بیوی کی اولاد وارث تاج و تخت ہوا کرتی تھی اس لئے اس کو بادشاہ نہ ہونا چاہئیے تھا لیکن چونکہ اس کی شادی بادشاہ خون اٰتون کی بیٹی سے ہو گئی تھی اس لئے اس کو حکومت مل گئی،

جب تک یہ اپنی سلطنت مصر کے دارالحکومت "تل العمارنہ" میں رہا وہاں کے مذہب کے مطابق دیوتا اٰتون کی پرستش کرتا رہا اور اس لئے اُس کا نام توت عنخ اتون رہا اور اُس کی بیوی عنخ نسن اٰتون کہلائی، بعد کو جب یہ طیبہ گیا اور اپنا آبائی دین اختیار کیا تو اس نے اپنا نام توت عنخ امون رکھ لیا اور بیوی کا نام عنخ سن امون (جس کی زندگی امون سے ہے) ہو گیا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ جس وقت یہ بادشاہ تخت نشین ہوا، مصری ریاستوں کے معابد نہایت خراب حالت میں تھے، لیکن اس نے ان سب پر بڑی بڑی عمارتیں تیار کرائیں، شہروں کو ترقی دی۔ اس کو اپنی رعایا کا بڑا خیال تھا، رات رات بھر پہرا کرتا تھا اور ملک کے حالات دریافت کیا کرتا تھا اور عدل و انصاف میں کسی کی رعایت نہ کرتا تھا،

بعض الفاظ کا ترجمہ

(جناب شوکت علی صاحب کلکتہ)

بہ سلسلہ ماہ جون ۱۹۲۶ء

(نگار) Dactylology انگلیوں کے اشارہ سے گفتگو کرنا۔ تکلم بالید۔ اشارات اصابع،

Decomposition. انحلال (اجزار ترکیبی کا علیحدہ علیحدہ ہوجانا)

Deduction	استنتاج
Deflexure	انحراف
Degeneration	انحطاط
Deism	اللہ کا معتقد ہونا اور وحی سے انکار کرنا۔ عقلیت
Demonology	جنیات
Dermatology	علم البشرۃ
Determanism	مذہب الجبر
Diacoustics	فلسفۂ طبیعیات ہیں، فن انکسار اصوات کو کہتے ہیں۔
Dialectology	اصطلاحیات
Didactics	فن تعلیم وتدریس
Dilettante	عاشق جمالیات
Dioptrics	فن انعکاس نور
Dogmatism	مذہب الیقین
Dressing gown	جلباب
Egoism	انانیت، نفسانیت
Egregious	مافوق العادت، خارق عادت
Electricution	قصاص کہربائی۔
Empiricism	تجربیۃ
Entomology	علم الحشرات
Epicurean	ابیقوری۔ شہوانی
Epistemology	نظریۂ معرفت
Equiponderancy	توازن ثقل
Eudaemonism	مذہب السعادۃ
Factotum	وہ خادم جو ہر کام کو انجام دے، اس لئے میرے نزدیک لفظ "ہرکارہ" مناسب ہے۔

Fanaticism	تعصب دینی
Feudal System	نظام اقطاعی
Gnomonics	دہوپ گھڑی بنانیکا فن
Harmonics	الحانیات۔ قواعد نغمہ و موسیقی
Heathendom	وثنیہ، بت پرستی
Hebdomadal	ہفتہ وار، اسبوعی
Heliograph	تلغراف شمسی
Heterogeneous	مختلف الاجناس
Homology	تشابہ، تجانس
Humanism	مذہب انسانیت
Ichnology	حفریات
Indeterminism	مذہب اختیار
Lithogenesy	معدنیات
Logarithm	علم الانساب
Lyceum	مجمع علمی۔ ندوۂ علمیہ، دارالفنون
Metempsychosis	تناسخ ارواح
Monalicism	وحدانیت، توحید
Motorpathy	علاج بالحرکت
Mythology	علم الاساطیر

اقتباسات و معلومات

وقت کا اندازہ

فرانس میں اکثر کتابیں اس طرح شائع ہوتی ہیں کہ ان کے ورق کٹے ہوئے نہیں ہوتے، چنانچہ ایک شخص نے اندازہ کیا ہے کہ ... ۳ صفحہ کی کتاب کے اوراق کاٹنے میں کم از کم دس منٹ صرف ہوتے ہیں، گویا ہر لاکھ کتابوں پر اہل فرانس مجبور کئے جاتے ہیں کہ وہ ۱۳۰۰۰ دن یا چار سال اپنی زندگی کے خراب کریں۔ اہل مطابع کو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ قوم کا وقت ضائع کرنے سے باز رہیں اور آئندہ ایسی کتابیں ملک کے سامنے پیش نہ کریں جن کے ورق کٹے ہوئے نہوں۔

یورپ اور عورت

جرمنی کے ایک ڈاکٹر ہیتیل نے بیان کیا ہے کہ اگر ملاحین وغیرہ کو اجازت نہ دی گئی کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کریں تو جرمنی میں ۳۰ فی صدی عورتیں بن بیاہی رہجائیں گی۔ اس نے حساب لگایا ہے کہ اس وقت عورتوں کی تعداد مردوں سے ۱۵ ملین زائد ہے سنہ ۱۹۱۴ء میں یہ زیادتی صرف ۵ یا ۶ ملین اس حساب سے تھی:-

انگلستان	۱۳۳۳۰۰	جرمنی	۸۵۰۰۰۰
روس	۷۰۰۰۰۰	فرانس وغیرہ	۵۰۰۰۰۰

لیکن سنہ ۱۹۱۸ء میں اس میں بہت اضافہ ہوگیا ہے اور روس و جرمنی میں کم از کم ۲۵۰۰۰۰۰ عورتیں زیادہ ہیں۔ انگلستان میں ۲۰۰۰۰۰۰ اور اٹلی میں ۲½ ملین۔

کاسۂ نبوی

طلوان کے موسیو جورج لوریا کے پاس ایک کاسۂ چوبین ہے جس پر خط کوفی میں یہ عبارت کندہ ہے:-

ہذا الاناء شعر طہ تشرفا یا فوز عائشہ بسؤر مصطفےٰ

اس کاسہ کا مالک کہتا ہے کہ رسول اللہ اس میں پانی پیا کرتے تھے اور بعد کو یہ کاسہ جناب عائشہ صدیقہ کو مرحمت فرما دیا تھا۔ بعض مستشرق مثلاً مرحوم علی بک بہجت اور احمد زکی بادشاہ وغیرہ بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

روس کا ایک عجیب رواج

روس میں ایک عجیب رواج ہے کہ جب کوئی لڑکی زیادہ عمر کی ہو جاتی ہے اور اس کی شادی نہیں ہوتی، تو وہ کسی دوسرے شہر میں چلی جاتی ہے اور کچھ دن وہاں قیام کرنے کے بعد جب واپس آتی ہے تو اپنے آپ کو بیوہ مشہور کر دیتی ہے، بیوہ مشہور ہو جانے سے اس کا اعتبار قوم میں بڑھجاتا ہے، کوئی شخص اس سے اس کے مرنے والے شوہر کا ذکر بھی نہیں کر سکتا کیونکہ یہ وہاں سخت تہذیب کے خلاف ہے۔

ترک خمر کی ترکیب

سوڈن ناروے میں جب کسی میخوار کو اس کی بادہ خواری کے پاداش میں قید کرتے ہیں تو جو روٹی اس کے سامنے لائی جاتی ہے اس کا آٹا شراب میں گندھا ہوا ہوتا ہے، پہلے دن تو خیر وہ کھا لیتا ہے لیکن دوسرے اور تیسرے دن سے اس کی نفرت بڑھنے لگتی ہے، یہاں تک کہ آٹھویں دسویں دن تو وہ مر جانا آسان سمجھتا ہے۔

بجائے اس کے کہ وہ یہ روٹی کھائے۔ آخر کار جب وہ قید سے باہر آتا ہے تو اُسے شراب سے نفرت کلی ہو جاتی ہے، اور ہمیشہ کے لئے اس سے تائب ہو جاتا ہے۔

ٹیلی ٹوگراف

دنیا کے ریلوے اسٹیشنوں پر حال ہی میں ایک جدید آلہ کا استعمال جاری ہوا ہے جسے ٹیلی ٹوگراف کہتے ہیں۔ اس کے ذریعہ سے مسافروں کو اطلاع ہو جاتی ہے کہ ریل کن کن اسٹیشنوں سے گزر جائیگی، اور کہاں کہاں ٹھیریگی۔ یہ آلہ عبارت ہے ایک بڑی تختی سے جس پر اسٹیشنوں کے نام درج ہیں اور اس سے متصل ایک ایک بٹن ہے۔ جب گاڑی اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو یہ بٹن دبا دیا جاتا ہے، اور یہ آلہ نہایت بلند آواز سے اسٹیشن کا نام پکارتا ہے جس کو ہر مسافر خواہ کتنا ہی شور ہو آسانی سے سن سکتا ہے۔

دنیا کے مرد و عورت

جدید ترین شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں عورتوں کا اوسط بہ نسبت مرد ۲۴ ہزار زیادہ ہے، لیکن مختلف ممالک کے لحاظ سے اس تعداد میں کمی بیشی ہے مثلاً انگلستان میں ۵۹ فی ہزار زیادہ ہیں، سوئٹزرلینڈ میں ۵۶ فی ہزار، اسپین میں پچیس فی ہزار، جرمنی ۵۳ فی ہزار اور فرانس میں ۸۰ فی ہزار زیادہ ہیں۔
اطالیہ میں گیارہ فی ہزار کم ہیں، اسی طرح بلجیم اور بلقان میں ۱۴ اور ۵۰ فی ہزار کم پائی جاتی ہیں۔ شمالی امریکہ میں ۲۲ فی ہزار، کناڈا میں ۲۴ فی ہزار کم ہیں۔ جنوبی امریکہ میں ۲۰ فی ہزار، آسٹریلیا میں ۵۰ فی ہزار زیادہ ہیں، اور چین میں ۵۰ فی ہزار کم ہیں۔
جاپان میں بہ نسبت ہزار اور ۹۰۰ کی ہے، اور افریقہ میں تقریباً برابر ہیں۔

سنیما بغیر فلم کے

فرانس کے ایک ماہر طبیعیات موسیو اڈور بلان نے اپنے تیس سال کے تجربہ کے بعد ایک ایسی اختراع پیش کی ہے، جو سنیما کی دنیا میں سخت انقلاب پیدا کر دینے والی ہو گی ہو گی۔ اس اختراع کا مقصود یہ ہے کہ بغیر فلم کی مدد کے سنیما دکھایا جائے۔ یعنی ہر شخص اپنے گھر میں ایک مختصر آلہ کے ذریعہ سے ان صورتوں کو دیکھ سکے گا، جو فضا کے ذریعہ سے منتقل کی جائیں گی، یعنی جس طرح اب ہر شخص گھر بیٹھے دور دراز مقامات کی موسیقی سن سکتا ہے اس طرح آئندہ وہ صور متحرکہ کا بھی تماشہ دیکھ سکے گا۔

تاجوں کی قیمت

دنیا کے تمام تاجوں میں سب سے زیادہ قیمتی تاج مہاراجہ بڑودہ کا ہے جس میں ۵۰۰ بڑے بڑے الماس جڑے ہوئے ہیں اور جن کی قیمت کا اندازہ ۱۹۶۰۰۰ گنی کیا جاتا ہے، اس کے بعد شاہ پرتگال کا تاج ہے، جس کی قیمت ۱۵۶۰۰۰ گنی ہے پھر نمبر انگلستان کا ہے جس کی قیمت ۱۱۶۰۰۰ گنی ہے۔ روس کا تاج اسکے بعد ہے۔

بندروں کی شادی

اہل امریکہ لطف و تفریح میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتے، حال ہی میں وہاں ایک بندر کی شادی بالکل اسی طریق سے کی گئی ہے، جس طرح کسی بڑے دولتمند آدمی کی کی جاتی ہے بندر کا نام پرنس بسمارک رکھا گیا اور بندریا کا اولیوشن ڈنشو وارنفا، ایک بڑے ہوٹل میں اس کا انتظام کیا گیا، تمام مہمان مدعو ہوئے دولھن

کے لئے ایک کمرہ علیحدہ کیا گیا، اور اس میں حد درجہ آرائش و زیبائش صرف کی گئی، پھر اُسے نہایت قیمتی لباس عروسی پہنا کر باہر لایا گیا، اور پھر بڑے جس کی بارات دوسرے مقام سے آئی تھی بہت تزک و احتشام کے ساتھ شادی کر دی گئی، اس کے بعد دعوتیں ہوئیں، جلسے ہوئے، اور اخباروں میں اعلان کیا گیا کہ "دولہا دولہن مبارکباد پیش کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔"

دنیا کے مسلمان اس وقت ساری دنیا کے مسلمانوں کی تعداد ۲۴ کروڑ کی ہے جن میں اکثر حصہ ایشیا میں ہے کیونکہ یہاں ان کی تعداد تقریباً ۲۱ کروڑ ہے افریقیہ میں دس کروڑ سے کچھ زائد ہے۔ اوقیانیا میں ۴ کروڑ، یورپ میں ستر لاکھ، اور امریکہ میں تقریباً دس لاکھ ہے۔

اشتراکیت کی ترقی یہ امر مخفی نہیں کہ اشتراکیت کا خیال اب روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اور یقیناً ایک زمانہ آئیگا جب دنیا کی تمام حکومتیں اصول اشتراکیت اختیار کرنے پر مجبور ہوں گی۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ اس وقت ساری دنیا کی پارلیمنٹوں میں اشتراکی شیوعی اور عمال ممبروں کی تعداد کتنی ہے۔

نام ملک	تعداد کل ممبران	اشتراکی	عمال	شیوعی
ارجنٹین	۱۵۸	۱۰	۰	۰
آئرلینڈ	۱۵۴	۰	۱۴	۰
اسپین	۴۰۸	۶	۰	۰
آسٹریلیا	۷۵	۰	۲۴	۰
استھونیا	۱۰۰	۲۲	۰	۴
سویڈن	۲۳۰	۱۰۴	۰	۶
[illegible]	۴۹۳	۱۳۱	۰	۴۵
اٹلی	۵۳۵	۲۵	۰	۳۶
برطانیہ	۶۱۵	۰	۱۵۱	۱
بلجیم	۱۰۰	۰۹	۰	۳
[illegible]	۲۸۰	۲۹	۰	۰
[illegible]	۴۴۴	۴۱	۰	۲
چیکوسلوواکیا	۳۰۰	۴۶	۰	۴۲
جنوبی افریقہ	۱۳۴	۰	۲۴	۰
[illegible]	۱۴۹	۵۵	۰	۰

نام ملک	تعداد کل ممبران	اشتراکی	عمال	شیوعی
روس	۱۳۴۱	۰	۰	۱۴۴۱
رومانیا	۳۶۹	۱	-	۰
نیوزیلینڈ	۸۰	۰	۱۳	۰
سوئٹزرلینڈ	۱۹۸	۴۹	۰	۳
چیلی	۱۱۸	۰	۹	۰
فرانس	۵۴۸	۱۰۲	۰	۲۹
فنلینڈ	۲۰۰	۶۰	۰	۱۸
کنڈا	۱۴۴	۰	۲	۰
لاٹویا	۱۰۰	۲۳	۰	۰
لتھوانیا	۷۸	۸	۰	۰
لکسمبرگ	۴۸	۰	۹	۰
ہنگری	۲۴۵	۲۴	۰	۰
ناروے	۱۵۰	۸	۰	۶
آسٹریا	۱۶۵	۶۸	۰	۰
ہالینڈ	۱۰۰	۲۴	۰	۱
امریکہ	۴۳۵	۱	۰	۰
یونان	۳۶۹	۶	۰	۰

کیا آپ کو معلوم ہے کہ

گھوڑے کا گوشت اور تمام جانوروں کے گوشت سے زیادہ مفید صحت ہے۔

ایک صحیح و تندرست انسان کی قوت گھوڑے کی قوت کا ⅒ ہوتی ہے۔

انگریزی زبان میں ۲۰ ہزار الفاظ فرانسیسی الاصل ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰۰ — جلد ۱۰، شمارہ ۳

بھوپال سے ہر ماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ، ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۶ء

خط وکتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور لکھدیا کیجئے "منیجر"

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

جلد (۱۰) | ستمبر ۱۹۳۶ء | شمار (۳)

ملاحظات

نگار اور ناظرین نگار کے مابین جو ادبی رشتہ قائم ہے، اس کا تقاضہ تو یہی ہے کہ "شکوہ و شکایت" کی راہ و رسم مسدود نہ کی جائے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں کہ اگر اسے جاری رکھا جائے تو بھی کیا فائدہ۔ جبکہ نتیجہ کے لحاظ سے اپنی ناکامی کی بہتر سے بہتر تاویل اگر کوئی ہو سکتی ہے تو صرف یہ کہ:۔

ایں راہ و رسم تازہ زحرمان عہد ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نبود

پھر نہ میں ایسا شاعر ہوں جو صرف اس خیال سے کسب لذت کرتا رہوں کہ "یاد آں جور و جفائی کہ نمودی گریم" اور نہ کوئی صوفی ہوں کہ 'صبر و شکر' کی ویران وادی کو کسی نہ کسی طرح "آبلہ پائی" کی صعوبتیں برداشت کر کے بغیر کسی شکایت کے گزر جاؤں، میں اگر اپنے دل کا خون کروں گا، تو آپ سے یہ مطالبہ بھی ضرور ہوگا کہ "از مژہ وا آستیں بشناس" اور اگر آپ توجہ نہ کریں گے تو یقیناً یہ تلخ شکایت بھی ہوگی کہ

گوش سخن شنو کجا، دیدۂ اعتبار کو ؟

پھر اگر فرصت ہو تو کسی وقت اس حقیقت پر بھی غور کیجئے کہ آپ نے اس وقت تک نگار کی کیا خدمت کی ہے، اور اس حال میں کہ آپ اس سے خدا جانے کیا کیا توقع رکھتے ہیں۔ ان توقعات کی تکمیل کے لئے آپ نے کیا اسباب فراہم کئے ہیں، میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں کہنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ

اسرارِ عشق انچہ تواں گفت، گفتہ ایم

اور نہ کوئی عالمانہ لب و لہجہ اختیار کرونگا کیونکہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مطالبہ ہے، نہ کہ کوئی گدایانہ التجا۔ اگر آپ چاہیں تو اونی توجہ سے توسیع اشاعت کے فرض کو بخوبی ادا کر سکتے ہیں ورنہ یوں تو

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

جدید رسائل کا اجرا یقیناً قابلِ مسرت امر ہے، لیکن نہ یوں کہ ان کا وجود صرف کشکول گدائی پر منحصر ہو۔ اگر کوئی صاحب تجارتی نقطۂ نظر سے یہ شغلہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تو میں انہیں مشورہ دونگا کہ

این جرعہ راز ساغرِ دیگر فرو بریز

اور اگر مقصود صرف نمود و نمایش ہے تو پہلے اپنی اہمیت کا اندازہ کر لیں کہ وہ بغیر وقار و خودداری کو صدمہ پہنچائے اسمیں کامیاب ہو سکتے ہیں یا نہیں اب رہی تیسری جماعت جس کا نام "خدمتِ ملک و زبان" رکھا جاتا ہے سو اب اس کا وزن یہ ہے کہ

در کشورِ ما ہوس نام کردہ اند

مجھے روزانہ دو چار خط ایسے ملتے ہیں، جن میں مضامین کا تقاضہ ہوتا ہے، اور ہر ہفتہ نہیں گزرتا کہ یاد دہانی بھی آجاتی ہے۔ میں ان احباب کا ممنون ہوں جو مجھے اس قابل سمجھتے ہیں، لیکن شاید انہیں علم نہیں کہ میں کس قدر مصروف و منہمک اور اسی کے ساتھ کس درجہ حزین و ملول زندگی بسر کر رہا ہوں۔ نگار کا معاملہ تو بالکل ایسا ہے جیسے غالب کے اس مقطع کی "سخن گسترانہ بات" بات کی پیچ، طبیعت کی ضد، کہنے کی شرم۔ جگ ہنسائی کا اندیشہ، ان سب نے مجھے پا بزنجیر کر دیا ہے، ورنہ حقیقتاً زمانہ نے تو میرے دل و دماغ کو بیکار بنانے اور میری ہمت کو پارہ پارہ کر دینے میں اپنے ترکش کا کوئی تیر ایسا نہیں ہے جو صرف نہ کر دیا ہو۔

پس جب حالات یہ ہوں تو میں کیا اور کیونکر دیگر رسائل کی قلمی اعانت کر سکتا ہوں۔

وہ حضرات جو جناب خضر کے متعلق میری گفتگو سے برہم ہوئے ہیں، وہ اس اشاعت میں اور زیادہ سامان دلچسپی پائیں گے، حضرت عیسیٰؑ کی نسبت گزشتہ اشاعت میں میں نے بہ سلسلۂ ملاحظات ضمناً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس کو ایک کرمفرما نے دیکھا، اور سنجیدہ برہمی کے ساتھ مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں اپنی اس "بلیغ" گمراہی (کوتاہ اندیش حضرات کے نقطۂ نظر سے) اس کے آخری حدود تک پہنچا دوں، اگر اب بھی کوئی کا نہ سمجھے تو میں اس کے ایمان کا ذمہ دار نہیں ہوں، بہرحال میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود

رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

گزشتہ تیرہ سو سال سے مسلمانوں کی ذہنیت میں جو انحطاط رفتہ رفتہ پیدا ہو رہا ہے اس کی روشن مثال اس سے زیادہ کیا ہو سکتی ہے کہ جس مذہب کے قائل ان کو فطری ہونیکا دعویٰ ہے اسی کے متعلق وہ کوئی بات ایسی نہیں سن سکتے جو واقعی "فطرت آہنگ" اور قانونِ قدرت کے مطابق ہو۔

پھر گر مذہب نام ہے صرف اعجوبہ پرستی اور دشمنی عقل و ہوش کا، اگر اسلام کوئی ایسی چیز ہے جو صرف متقدمین ہی کے عہد میں پایا جاتا تھا، اور اب اس کا وجود بالکل ایک (fossils) کا سا وجود ہے اور اگر ہمارے مذہبی رہنما، دماغوں میں اتنی روشنی ہی پیدا نہیں کر سکتے کہ ہم اسلام کو ہر قوم و زمانہ کا مذہب سمجھنے کی اہلیت رکھیں تو میں یوں کہوں گا کہ

یارب ز سیل حادثہ طوفاں رسیدہ باد
بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

اس ماہ کی اشاعت میں جناب ز۔ر۔ بی۔ اے کا مضمون "غالب کی ذہنیت" ختم ہوگیا ہے۔ یقین ہے کہ میری طرح تمام ناظرین نگار نے اسے پسند کیا ہوگا۔ "حسینن کا انجام" جناب مجنوں کا فسانہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ پبلک کی رعایت نہ کرکے نفس انسانی کے تاریک پہلو کو اور زیادہ عریاں الفاظ میں واضح کردیتے تو میں اور زیادہ خوش ہوتا اور فن کے نقطۂ نظر سے تکمیل ہوجاتی، تاہم انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی خوب ہے، اور ہمارے بعض احباب کے لئے اس میں کافی سامان عبرت موجود ہے اگر وہ سمجھیں۔

تعلیم تمدن، انگریزی سے لیا گیا ہے، اور ہم محمد عبدالقادر صاحب سروری کے انتخاب کی داد دیتے ہیں کہ انہوں نے بہترین موضوع پر بہترین شخص کے خیالات اردو میں منتقل کئے۔

میر بیابانی دوسرا فسانہ ہے جسے نیم ڈکا ہی سمجھنا چاہیئے۔

مسٹر ملنبٹ کی کتاب [illegible] Zenana [illegible] نہایت مشہور و اہم کتاب ہے ہم جناب ق۔ ا۔ ب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کا ترجمہ نگار کو مرحمت فرمایا، گزشتہ دو تین ماہ سے اس کا سلسلہ بند ہوگیا تھا، لیکن چونکہ اس کا ہر باب ایک مستقل چیز ہے، اس لئے ناظرین کو یہ التوا ناگوار نہ ہوا ہوگا۔ آئندہ بالالتزام اس کا ایک باب شائع ہوتا رہیگا۔ اس کو اگر آپ غور سے پڑھیں گے تو بہت مفید و عجیب معلومات آپ کو حاصل ہونگی، اس مہینے کی قسط میں حیدرآباد اور گولکنڈہ کی بعض نہایت مشہور ہستیوں کا ذکر ہے اور نہایت پُرلطف ہے، میں ناظرین نگار سے استدعا کرونگا کہ وہ اس سلسلہ کو غور سے پڑھیں اور بغیر دیکھے یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ اس میں کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔

مجھے مارچ ۱۹۲۶ء کے رسالوں کی سخت ضرورت ہے وہ حضرات جو فائل نہیں رکھتے اگر لطفاً یا قیمتاً مرحمت فرمادیں گے تو میں بہت ممنون ہوگا۔ مجھے اُنکی تصویر کی ضرورت نہیں ہے، اس لئے اسے نکال کر صرف رسالہ میرے منیجر نگار کے نام وی۔ پی کر دیجئے۔

نیاز فتحپوری

غالب کی ذہنیت

(بہ سلسلۂ سبق)

چوتھا اور سب سے بڑا سبب جس کے باعث غالب میں رشک کو مستقل حیثیت حاصل ہو گئی تھی، ان کی خودداری، عالی ہمتی، اور آزادہ روی ہے، یہ تینوں رشک کی طرف فطرتاً رہبری کرتے ہیں۔ ان کی خودداری کے متعلق ان کی طرزِ حیات سے کئی شہادتیں حاصل ہو سکتی ہیں، لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان سب کو نظر انداز کر کے صرف ان کے کلام سے اس کے ثبوت اخذ کریں گے۔

جب وہ کسی دیوار میں خم دیکھتے ہیں تو ان کی طبیعت کے اقتضائے موافق ان کا خیال فوراً اس طرف جاتا ہے کہ یہ مزدور کے احسان کا بوجھ سنبھال نہ سکنے کے باعث جھک گئی ہے کس خوبی سے خودداری کا ثبوت دیتے ہیں، کہ

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

وہ بہت تشنہ ہے ہیں، بزم میں شراب کے دور چل رہے ہیں، اور اس مصرع کے مصداق کہ "مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام" شراب ختم ہو جاتی ہے اور ان کی شدتِ خواہش چاہتی ہے، کہ "تلچھٹ ہی بس کافی ساقی" کا نعرہ بلند کریں لیکن ان کی خودداری مانع آتی ہے، کس خوبی سے اس کا اظہار کیا ہے ؎

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

اس خودداری کے سبب سے غالب اپنی زندگی میں کئی نقصان اٹھاتے ہیں اور اسی کے باعث وہ عشق عاشقی کے عام اور ضروری اصول سے بھی ہٹ جاتے ہیں، حالانکہ یہ ایک عاشق کی بڑی کمزوری ہے۔ عاشق کا تو یہ فرض ہے کہ وہ جیسے بنے معشوق کے حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ خواہ اس کوشش میں اس کی جان و مال اور عزت و آبرو وغیرہ کا نقصان کیوں نہ ہوتا ہو۔ لیکن غالب کی خودداری اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ وہ راستے میں جس طرح عام لوگوں سے بات کرنا خلافِ شان سمجھتے ہیں، اگر معشوق بھی مل جائے تو اس سے بھی بات نہیں کرتے، کہتے ہیں ؎

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے کیا کہیے

یہی خودداری ہے، جو اور زیادہ تند ہو کر انھیں معشوق سے بھی بے پروا کر دیتی ہے، اس بارے میں ایک دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا بے کسی میری شریک آئینہ تیرا آشنا

بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہیں یار تیرا جامِ مے خمیازہ میرا آشنا

آخر اس خودداری کی کوئی حد بھی ہے؟ کس شان اور فخر سے کہتے ہیں! ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ایک جگہ کہتے ہیں اگر میرا درد دور نہ ہوا تو اچھا ہی ہوا، کیونکہ اچھا ہوتا تو دوا کا احسان ہوتا ؎

دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

دوسروں کے احسان سے وہ اس قدر بھاگتے ہیں کہ ان کی بیماری میں لوگ اُن کی عیادت کے لئے آتے ہیں تو اُن کو رنج ہوتا ہے، اور اس رنج کے باعث وہ اور بھی بیمار ہوجاتے ہیں ؎

عیادت سے اسدؔ میں بیشتر بیمار رہتا ہوں　　سبب ہے ناخنِ دخل عزیزاں سینہ خستن کا

- - - - - - - - - - - -

ناخنِ دخلِ عزیزاں یکقلم ہر نقب زن　　پاسبانی طلسم گنج تنہائی عبث

اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ سب سے علیحدہ رہوں تاکہ نہ کوئی میرے معاملات میں دخل دے سکے اور نہ میں کسی کو دیکھکر رنج کرسکوں کہتے ہیں ؎

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں　　گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

- - - - - - - - - - - -

رہیئے اب ایسی جگہ چلکر جہاں کوئی نہ ہو　　ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے　　کوئی ہمسایہ نہو اور پاسباں کوئی نہو

غالب کی زندگی اور شاعری دونوں سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ وہ صد درجہ عالی ہمت اور آزاد رو تھے، وہ ہر معاملہ میں قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلنا چاہتے ہیں اس خیال سے کہ عام لوگ اُن کی برابری نہ کرسکیں وہ ہر چیز میں حد سے متجاوز ہوجاتے ہیں اور یہی وہ رجحان ہے جو ترقی کے بعد اُن کے پاس رشک کی صورت میں تبدیل ہوجاتا ہے، وہ نہ صرف جنسی خوشی اور مسرت و اطمینان کے معاملات میں دوسروں سے بڑھا ہوا رہنا چاہتے ہیں، اور اُن کی کسی قسم کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے، بلکہ رنج و غم اور درد و مصیبت میں بھی ان سے تفوق حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ یہی وہ مد ہے جہاں غالبؔ کی ذہنیت عام ذہنیتوں سے جدا ہوکر ایک خاص امتیاز حاصل کرلیتی ہے۔

غالبؔ کبھی گوارا نہیں کرتے کہ ایسے زمانہ میں مریں جب کہ عام لوگ مر رہے ہوں، وہ جن مصیبتوں اور پریشانیوں میں گرفتار رہتے ہیں ان کو خواہ وہ کتنی ہی سخت کیوں نہوں اپنی شان کے شایاں نہیں سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ؎

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ　　وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

اور ایک جگہ اس طرح آواز بلند کرتے ہیں کہ ؎

نہ کہہ کہ گریہ بمقدار حسرت دل ہے　　مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

وہ جب دیکھتے ہیں کہ میرے احباب میرا درد دل سن لیا کرتے ہیں تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ میرا درد دل اس قدر تیز ہوتا کہ کوئی اس کے سننے کی تاب ہی نہیں لا سکتا، اور چونکہ میرے دوست "دردِ دل" سے واقف نہیں ہیں اس لئے وہ میرے حال سے متاثر نہیں ہوسکتے اس نفسی کیفیت کو اس طرح واضح کیا ہے ؎

آشنا غالبؔ نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا　　ورنہ کس کو میرے افسانہ کی تاب استماع

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا　　نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا

اس کے اسباب میں ان کے طرف سے ایک شعر یہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ ؎

آتش کدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا　　جاری تھی اسدؔ خونِ جگر سے مری تحصیل

یہ تو ابتدا تھی لیکن بعد میں وہ اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ درد و غم سے ان کی سیری بہت کم ہوتی تھی، وہ کہتے ہیں کہ میرا ذوقِ وحشت اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ میں کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا، اگرچہ میں بے حد تھک کیوں نہ جاؤں۔ ان کو اپنی اس وحشت پر (وہ قدم ڈگر سے ہٹ کر چلنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں) فخر بھی تھا۔ ان کا خیال ہے کہ قدیم رسم و رواج سے آزاد ہونے اور لکیر کا فقیر نہ بنا چھوڑنے سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ انسان کی نظریں وسیع ہو جاتی ہیں، اور دونوں عالم کے اسرار اس کی نگاہوں کے آگے خود کو بے حجاب کر دیتے ہیں۔

ان کا اضطراب اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ قید ہونے پر بھی عام قیدیوں کی طرح وہ خاموش نہیں بیٹھتے۔ بلکہ اس قدر آتش زیر پا ہو جاتے ہیں کہ ان کی زنجیر موئے آتش دیدہ کی طرح کمزور ہو کر ٹوٹ پڑتی ہے، وہ ناصح سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ اگر تو مجھے قید بھی کر دے تو میرے جنونِ عشق کے انداز ایسے نہیں ہیں کہ میں عام عاشقوں کی طرح ان کو چھوڑ بیٹھوں وہ ایک جگہ پکار اٹھتے ہیں کہ اگر خلق مجھے کافر کہنے لگے تو کوئی پروا نہیں میں نہایت آزاد منش ہوں، اگر کسی وقت میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، تو سر جانے کی بھی پروا نہیں کرتا اور کہہ دیتا ہوں، وہ خود کو ایسا بڑا نواگر سمجھتے ہیں کہ برخلاف عشق عاشق کے عام دستور کے معشوق کے روبرو ہونے پر بھی خاموش نہیں ہوتے بلکہ ان کے نالوں میں اور زیادتی ہو جاتی ہے، وہ اپنی وحشت و جنون کی کثرت یہاں تک پہونچا دیتے ہیں کہ جب وہ جنگل میں نکلتے ہیں تو ان کا خیال ہے کہ وحشی آہوانِ صحرا مجھکو بھی اپنا جیسا ایک وحشی سمجھ کر اپنی پلکوں سے میری پیٹھ کھجانے لگتے ہیں وہ اپنے داغہائے دل کی کثرت اور ان کی شدت کے متعلق بڑے فخر سے دعویٰ کرتے ہیں اور اپنی سخت کوشی اور شدتِ عشق پر اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں اس قسم کے مضامین کے متعلق بعض شعر ملاحظہ ہوں ؎

حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا　　نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا

جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا　　یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا　　بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا

یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا　　گر کیا ناصح نے ہمکو قید اچھا یوں سہی

چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر　　چھوڑوں گا میں نہ اس بتِ کافر کا پوجنا

سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر　　جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو　　لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

- - - - - - - - - - - -

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں　　کہ ہے سرپنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

- - - - - - - - - - - -

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکہ　　ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

- - - - - - - - - - - -

دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانہ نے　　مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

- - - - - - - - - - - -

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ　　مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

- - - - - - - - - - - -

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ تن کی ہے　　حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

غالبؔ کی عالی ہمتی اور آزادہ روی کے متعلق ان اشعار سے کچھ دھندلی سی روشنی پڑتی ہے، اب ہم ان کے ایسے اشعار کا ذکر کریں گے جو ان کی سیرت کے اس پہلو کو اور بھی وضاحت کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں۔ ان اشعار میں وہ طرح طرح سے دوسروں پر اپنی برتری کا سکہ بٹھاتے نظر آتے ہیں، یہی وہ آخری سیڑھی ہے جس پر گزر جانے کے بعد غالب کی ذہنیت کا رنگ کامل طور پر جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ میرا معشوق مجھے اس قدر عاشق صادق سمجھتا ہے کہ اگر غیر کی آہ و زاری سن پاتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ غالبؔ آہ و زاری کر رہا ہے اور اس لئے وہ مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ اور ایک جگہ وہ اسی مطلب کو اس پیرایہ میں پیش کرتے ہیں کہ غالبؔ تمہارا بہترین عاشق ہے جب تم اس کو بھی برا کہو گے تو اہل ہوس کے دل کھٹے ہو جائیں گے۔ وہ سمجھیں گے کہ جب ایک عاشق صادق کے ساتھ اس طرح برتاؤ کیا جاتا ہے تو پھر ہم کس شمار میں ہیں، اور وہ اپنے استقلال کا اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ میرے جگر پر سیکڑوں زخم ہو گئے لیکن میں نے اُف تک نہ کی، برخلاف اس کے پھول کے سینے پر ابھی ایک ہی زخم لگا تھا کہ وہ دادخواہی کے لئے پھوٹ پڑا،

ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس کے اثر سے سیکڑوں آدمی عشق کرنا سیکھے، وہ فرہاد کو اس لئے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ وہ تنگ نظری کے باعث رسوم و قیود کے خمار کا سرگشتہ تھا اور اسی لئے تیشہ بغیر مر نہ سکا، نیز وہ اس قدر پست ہمت تھا کہ شیریں کی صرف تصویر ہی کے نقش میں محو تھا، جنت جس کی زاہد و واعظ بے حد تعریف کرتے ہیں اُن کی نظروں میں ایک معمولی سی چیز ہے، ایک ایسی بیکار چیز جس کو وہ کسی طاق میں کسی خوشنمائی کی خاطر رکھکر بھول گئے ہیں۔ حسب ذیل اشعار انہی مطالب پر حاوی ہیں ؎

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا　　غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

- - - - - - - - - - - -

یہ باعثِ نومیدیِ اربابِ ہوس ہے غالب کو برا کیوں کہو، اچھا مرے آگے!

- - - - - - - - - - - -

ہم نے سوزخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد

- - - - - - - - - - - -

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

- - - - - - - - - - - -

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

- - - - - - - - - - - -

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسد سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

- - - - - - - - - - - -

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

- - - - - - - - - - - -

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا!

غالب اپنی افضلیت کی دلیل اس طرح نکالتے ہیں کہ مجھ سا عاشق اور قہر و غضب کا برداشت کرنے والا چونکہ آج تک نہ مل سکا اسلئے یہ صحیح ہے کہ مجھ سا کوئی پیدا ہی نہیں۔ یہ سمجھ لینے کے بعد جب وہ اپنے مرجانے کا تصور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ میرے بعد مجھ سا کوئی عاشق ہی نہیں تو عشق و معشوق کی جو حالت ہوگی اس کا کس قدر قابلِ تعریف مرقع پیش کرتے ہیں! ان اشعار میں کس خوبی سے ایک خاص حالت کے کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے!!

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد
منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ ہوا! ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی ان کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع چاک کرتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

غالب کی عالی ہمتی، بلند نظری اور دوسروں پر خود کو ترجیح دینا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ وہ سوائے اپنے اور خدا کے کسی اور ہستی کے قائل ہونا ہی

نہیں چاہتے، اور نہ صرف یہی بلکہ آگے چلکر خود اپنی ہستی کو بھی نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں، کہتے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا اور نہ ہوتا تو خدا ہوتا　　ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ساتھ ہی انہیں ڈر بھی ہے کہ عوام اس بلند پروازی سے میرے متعلق کچھ اور نہ سمجھ لیں اس لئے ذرا ضبط سے کام لیتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کی قلبی کیفیت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اور وہ اس کو اس اسلوب میں چھپانا چاہتے ہیں کہ ؎

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن　　ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

متذکرہ بالا تمام مرحلوں سے گزر جانے کے بعد غالب کی ذہنیت کا منزل رشک میں داخل ہونا ایک یقینی امر تھا۔ چنانچہ اب ان کے دماغ پر رشک کے گھٹا ٹوپ بادل چھا جاتے ہیں اور پھر وہ جس طرف نگاہیں ڈالتے ہیں اُن کی نظریں رشک کی عینک سے نکل کر جاتی ہیں، اُن کے وہ کثیر التعداد اشعار جن میں رشک چھپائے نہیں چھپتا ظاہر کرتے ہیں کہ اُن کے رشک نے ایک خاص طور پر تدریجی ترقی حاصل کی ہے۔

سب سے پہلے ہم غالب کو اردو کے عام شعرا کی طرح رشک کی طرف اس غرض سے راغب پاتے ہیں کہ ان کی ذاتی مسرت میں کوئی خلل انداز نہ ہو، اس رغبت کو ظاہر کرنے والے اشعار ان کے کلام میں کثرت سے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں اور عام شعرا کے اسی قسم کے اشعار میں یہ فرق ہے کہ عام شاعر رشک کے مضامین صرف اس لئے لاتے ہیں کہ وہ عشقیہ شاعری کا (جس پر ان کے سارے کلام کا انحصار ہوتا ہے) ایک لازمی عنصر ہے۔ اور غالب کے کلام میں رشک اس لئے نہیں جھلک پڑتا کہ وہ عام شعرا کی تقلید کرنا چاہتے ہیں جو اُن کی فطرت کے قطعی خلاف تھا بلکہ اس لئے کہ ان کا ماحول، اُن کے حالات زندگی، اُن کی خودداری، عالی ہمتی، اور آزادروی کا اقتضا تھا کہ وہ رشک کے متعلق مضامین باندھنے پر مجبور ہو جاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ غالب کے وہ اشعار بھی جن میں انہوں نے رشک کے متعلق عام خیالات کا اظہار کیا ہے نسبتاً زیادہ پرجوش اور باکیفیت نظر آتے ہیں۔

اُن کا یہ رشک شاعروں کے عام رقیب روسیاہ کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس رقیب کے ساتھ جو اُن کے معشوق کو اُن سے چھین لینے کے لئے انکی اذیت میں سرگرم ہے، وہ ایک کامل عاشق بن کر اُس شخص کی نیند، دماغ اور راتوں پر رشک کرتے ہیں جس کے بازو پر معشوق کی زلفیں پریشان ہوگئی ہوں وہ اس حریف سیہ مست کو خوشحال سمجھتے ہیں جو سایۂ گل کی طرح پائے گل پہ سر رکھے ہوئے ہو، اور وہ بدحال جو سایہ دیوار یار میں بیٹھا ہوا انہیں فرمانروائے کشور ہندوستان نظر آتا ہے۔ معشوق کی گردن میں موتیوں کی لڑی دیکھکر وہ ستارۂ گوہر فروش کے اوج پر رشک کرتے ہیں، اُن کو اپنے رازداں پر بھی رشک ہوتا ہے کیونکہ وہ ان کے پری وش معشوق کا ذکر سن کر اُن کا رقیب بنجاتا ہے، وہ اپنے قاصد کو اپنے معشوق کے پاس بھیجنے میں پس و پیش کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی اس پر عاشق ہو جاتا ہے اور اگر عاشق نہ بھی ہو تو غالب کو معشوق کے ساتھ قاصد کے سوال و جواب کرنے پر رشک آتا ہے۔ اگر معشوق کسی وجہ سے خفا ہو کر قاصد کی گردن مارنے پر اتر آتا ہے تو اُن کو برا معلوم ہوتا ہے، اس لئے نہیں کہ قاصد مارا جاتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ معشوق کے ہاتھ سے قتل کیا جا رہا ہے اور اُس کی یہ خوش قسمتی اُن کے لئے باعث رشک ہے۔ وہ معشوق کے اس ملازم سے بھی رشک کرتے ہیں جو اُس کے بناؤ سنگھار کے وقت اُس کے روبرو آئینہ لئے کھڑا رہتا ہے۔ معشوق اُن کو پیغام کا تشنہ لب رکھتا ہے تو وہ اس کا رنج نہیں کرتے اگر اُن کو رنج ہوتا ہے تو اس امر کا کہ اُس کی محفل میں اغیار جام مے کے پے در پے بوسے لے رہے ہیں۔ معشوق کی بزم آرائیاں سن کر اُن کا دل رنجور اسلئے نہیں بیٹھا جاتا کہ وہ اس کی بزم میں نہیں ہیں، بلکہ اس لئے کہ وہاں رقیب کے مدعا کا نقش بیٹھ رہا ہے۔

وہ رقیب کو آہ وزاری میں تاثیر کی دعا مانگتے ہوئے سنتے ہیں تو اُن کے رشک کو ایک گونہ تسلی ہوتی ہے، وہ رقیب کو دیکھتے ہیں کہ معشوق کی گالیاں سنتا ہے اور بے مزہ نہیں ہوتا تو اُس کی وفاداری اور جفاکشی پر انہیں رشک ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس رشک کو معشوق کی تعریف کے پردوں میں چھپا دیتے ہیں۔ اگر معشوق ان کے رقیب کی طرف غصہ میں تیز تیز نظروں سے دیکھتا ہے تو انہیں بجائے خوشی کے رنج ہوتا ہے، وہ رشک کے سبب یہ بھی نہیں چاہتے کہ ان کا معشوق کسی پر غصہ ہوکر آنکھیں نکالے جو اُن کی طرف پلک اٹھاکر بھی نہیں دیکھتا، وہ معشوق کی نگاہ خاص چاہتے ہیں، وہ اُنسے تغافل کرتا ہے تو غالب اس کے اس تغافل کو اس امر پر ترجیح دیتے ہیں کہ وہ لطف عام پر اتر آئے، وہ چاہتے ہیں کہ اگر اُس کی نظر عنایت ہو تو صرف مجھی پر ہو۔ ورنہ کسی پر بھی نہ ہو، وہ جانتے ہیں کہ میرے نالے بے اثر ہیں۔ لیکن اُن کا رشک اس کا ایک عجیب طرح سے اظہار کرتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ رات میرے نالوں کا اثر عجیب ہی تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ میرے لئے مفید ثابت ہوتے میرے رقیب کی بزم میں جاکر سپند کا کام کرنے لگے تاکہ اُس کی سرگرمی کو نظر نہ لگے، بعض شعر ملاحظہ ہوں ؎

نینداُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُسکی ہیں　　　تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

- - - - - - - - - - - - -

خوش حال اس حریف سیہ مست کا کہ جو　　　رکھتا ہے مثل سایۂ گل سر بپائے گل

- - - - - - - - - - - - -

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوار یار میں　　　فرمانروائے کشور ہندوستان ہے

- - - - - - - - - - - - -

گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا　　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

- - - - - - - - - - - - -

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ مارئے　　　اُس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

- - - - - - - - - - - - -

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے　　　نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

- - - - - - - - - - - - -

بہ امید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت　　　مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اُس کا

معشوق کے ہجر میں رقیب کی مزاج پرسی غالب کا رشک جو گلفشانیاں کرتا ہے اس کا ایک پر کیف مرقع حسب ذیل اشعار میں پیش کیا گیا ہے ؎

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں　　　بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوار دوست
تاکہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک　　　مجھکو دیتا ہے پیام وعدۂ دیدار دوست
جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعف دماغ　　　سر کرے ہے وہ حدیث زلف عنبر بار دوست

چپکے چپکے مجھکو روتے دیکھ پاتا ہے اگر   ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست
مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے   یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

آخر کار ان تمام مطالب کو نتیجہ کے طور پر ایک ہی شعر میں اس طرح پیش کر دیتے ہیں کہ ؎

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے   کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

صرف رقیب کی پرسش ہی نہیں، دوست احباب کی مزاج پرسی بھی انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ جس **طرح** میرا رازدان میرے منہ سے میرے **معشوق کا ذکر** سن کر رقیب بن گیا، کہیں ایسا نہو کہ لوگ میرا زخم جگر دیکھکر میرے معشوق کی طرف مائل ہو جائیں، وہ اپنا زخم جگر لوگوں کو اس لئے نہیں دکھانا چاہتے کہ اس کی وجہ سے ان کو رنج پہنچے گا، وہ اپنے ترس کھائیں گے اور معشوق کو برا بھلا کہیں گے، بلکہ رشک مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنا زخم **لوگوں سے چھپائے** رکھیں ؎

کہیں نظر نہ لگے اُن کے دست و بازو کو   یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

اب تک غالب کے وہی رشکیہ مضامین پیش کئے گئے ہیں جن میں کسی انسان کے ساتھ رشک کیا گیا ہے، اس کے بعد غالب کا رشک اور ترقی کر جاتا ہے، وہ بے جان چیزوں سے بھی رشک کرنے لگتے ہیں۔ جب وہ معشوق کو زنار باندھے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں رشک ہوتا ہے، اگر اس کے نقاب میں ایک تار **ابھرا ہوا نظر** آتا ہے تو انہیں رشک ہوتا ہے، اگر اس کی ٹوپی کے گوشہ میں موتی ٹکے ہوئے ہوں تو انہیں رشک ہوتا ہے۔ غرضکہ گلوں کی خوشبو **اُن کا کھلنا**، نرگس کے پھول، محفل کی شمع، کوہ طور، راستہ کا پتھر، مہر و ماہ اور آسمان وغیرہ ان سب سے وہ رشک کرتے ہیں یہ ہے غالب کا وہ خاص **نقطۂ نظر جو** اُن کی ذہنیت کے عام میلان کی پیداوار ہے، کہتے ہیں ؎

مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک   آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آئے

- - - - - - - - - - - - - -

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں   ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

- - - - - - - - - - - - - -

ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار   مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

- - - - - - - - - - - - - -

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار   میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

- - - - - - - - - - - - - -

گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچہ کی ہوس   کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

- - - - - - - - - - - - - -

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو   مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

تری فرصت ہے یہ حسرتِ نظارۂ نرگس　　ہر کوئی دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

- - - - - - - - - - - -

پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوائے رشک　　محفل سے مگر شمع کو دلِ تنگ نکالوں

- - - - - - - - - - - -

جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھکو　　نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیٔ شمع

- - - - - - - - - - - -

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

- - - - - - - - - - - -

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں　　خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ　　رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں
کرتے ہو مجھکو منعِ قدمبوس کس لئے　　کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

- - - - - - - - - - - -

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے　　اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

غالب کے کلام میں ایسے شعر بھی ملتے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رشک کو اپنا فرضِ منصبی سمجھتے تھے، اور اگر کبھی غیر ارادی طور پر رشک نہیں پیدا ہوتا تو وہ اس کو کسی نہ کسی طرح پیدا کرنا چاہتے ہیں، اور اس کی تعلیم بھی دیتے ہیں، مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر معشوق کی کسی ادا پر میرا دیدہ اور دل بجائے رقابت اور ایک دوسرے پر رشک کرنے کے باہم صلح کرلیں تو یہ ان کی غلطی ہے غیرتِ الفت یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ رشک کرنے لگیں چنانچہ دوسرے شعر میں اسی تعلیم کا نتیجہ پیش کرتے ہیں کہ معشوق کے نظارہ و خیال کے سامان ان کا دل و دیدہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رشک کرنے لگے ہیں۔ ہوسِ یار کے ساتھ عداوتِ اغیار کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک شعر میں کہتے ہیں چونکہ میرے دل میں اب ہوسِ یار باقی نہیں اس لئے میں رشکِ اغیار کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔

غالب کا عقیدہ ہے کہ ہر عاشق کو رقیب سے ناخوش ہونا چاہئے یعنی اس کے لئے رشک لازمی ہے، لیکن وہ اس کلیہ سے زلیخا کو مستثنیٰ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس نے رشک سے کام نہ لینے کی بنا پر بہت بڑا فائدہ حاصل کیا تھا، ان کی حالت نہایت خستہ ہوجاتی ہے لیکن وہ سنبھلے رہنا چاہتے ہیں کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ رقیب کو میری خستہ حالی کی خبر نہ ہوجائے، لوگ ان کے سامنے ان کے معشوق کا نام لیتے ہیں لیکن وہ رشک کے سبب دوسروں کی زبان سے اس کا نام سننا گوارا نہیں کرتے، لیکن منع کرنا بھی نہیں چاہتے، کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اس طرح معشوق سے نفرت ظاہر ہوگی، لہٰذا وہ رشک کو "جو ان کا فرض تھا" نفرت کے خوف سے مجبوراً چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ کیا حسب ذیل اشعار سے اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ غالب کی ذہنیت میں رشک کو بیحد اہمیت حاصل ہوگئی تھی ؎

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

- - - - - - - - - - - - - -

ہے غیرتِ الفت کہ اسد اس کی ادا پر گر دیدہ و دل صلح کریں جنگ نکالوں

- - - - - - - - - - - - - -

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف یاں دل میں ضعف سے خلشِ خار بھی نہیں

- - - - - - - - - - - - - -

سب رقیبوں سے ہے ناخوش پر زنانِ مصر سے ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

- - - - - - - - - - - - - -

بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش مجبوریاں تلک ہوئے اے اختیار حیف

- - - - - - - - - - - - - -

نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

غالب کے کلام میں اس قسم کے بہی بہت سے شعر نظر آتے ہیں جن میں اگرچہ وضاحت کے ساتھ رشک کے کسی خاص پہلو پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے لیکن ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غالب کی اسی مخصوص ذہنیت کی پیداوار ہیں جس کی نشوونما رشک کی آبیاریوں کی مرہونِ منت تھی۔ عام طور پر شاعر اپنے رشک کو صرف رقیب ہی تک محدود رکھتے ہیں لیکن غالب رقیب سے گزر کر معشوق تک پہنچ جاتے ہیں اور اسپر بہی اپنے رشک کا طرح طرح سے نقش بٹھانا چاہتے ہیں، یہاں صرف انہی اشعار کا ذکر کیا جاتا ہے جن میں انہوں نے معشوق کی ہر ایک حرکت کا رشک کی نگاہوں سے مطالعہ کیا ہے۔

وہ ایک دفعہ معشوق سے اس کے تبسم پنہاں کا گلہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس سے میرے زخمِ رشک کی رسوائی ہوگی، معشوق ان کے آگے غیر کی شکایت کرتا ہے تو وہ بجائے خوش ہونے کے اس کو منع کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ معشوق وادیٔ مجنوں کی طرف بے پردہ گزر کرے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہاں مجنوں کا دل ذروں کی شکل میں منتقل ہوگیا ہے، معشوق کو ان کے پاس آنے میں کچھ دیر ہوتی ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ کسی رقیب نے انہیں روک لیا تھا، وہ معشوق سے غیر کے ملنے کی رسوائی کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اس کے جواب کو ایک عجیب انداز سے دہراتے ہیں، معشوق کو غیر سے اختلاط کرتے ہوئے دیکھکر ان کا رشک اس کا ایک عجیب سبب بنالیتا ہے یعنی یہ کہ وہ ٹھنڈا مکان ہے (جس میں حقیقی عشق و الفت کی گرمی نہیں) اس لئے معشوق کو پسند آگیا ہے۔ رقیب ان کے معشوق کے ساتھ گستاخی کرتا ہے اور وہ حیا کے سبب سے اس کو منع نہیں کرتا تو غالب کے جذبۂ رشک کو صدمہ پہنچتا ہے۔

جب وہ دیکھتے ہیں کہ معشوق کو اپنے آپ پر اعتماد ہے تو انہیں رنج ہوتا ہے کیونکہ وہ اس کی وجہ سے غیر کی نسبت حسن ظن رکھتا ہے اور اسکے آزمانے پر مستعد نہیں ہوتا، اس طرح بوالہوس کی شرم رہجاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر معشوق رات کے وقت سے بچے ہوئے ان کے پاس آئے

لیکن ساتھ ہی اُن کا رشک ایک شرط لگا دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ رقیب کو ساتھ لیکر نہ آئے معشوق بزمِ غیر میں زیادہ شراب پی لیتا ہے تاکہ اپنی بادہ آشامی کا اندازہ کرے تو غالب کو رشک ہوتا ہے حسب ذیل بعض اشعار اسی قسم کے مطالب کے حامل ہیں ؎

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے　　　یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

- - - - - - - - - - - - - -

ہے مجھکو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ　　　ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہو

- - - - - - - - - - - - - -

بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر　　　ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے

- - - - - - - - - - - - - -

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا　　　آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

- - - - - - - - - - - - - -

غیر کو یا رب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے　　　گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

- - - - - - - - - - - - - -

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب　　　آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

- - - - - - - - - - - - - -

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف　　　عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

جب کسی کو کسی قسم کے فائدہ کی خواہش ہوتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ ایک دوسرا بھی اسی کی خواہش میں محو ہے اور صرف خواہش ہی نہیں بلکہ اُس کے حصول کے لئے سرگرم بھی ہے تو پہلے شخص میں اپنے فائدے کے چھن جانے کے خوف سے رشک پیدا ہو جاتا ہے یہی حال ایشیائی عاشق کا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ میں جس کو حاصل کرنا چاہتا ہوں اُسی کے لئے دوسرے قدم بھی تیزی کے ساتھ بڑھ رہے ہیں تو اُس کو فطرتاً رشک کی طرف مائل ہونا پڑتا ہے یہی وہ مضمون ہے جس کو طرح طرح سے ایشیا کے شاعر اپنے کلام میں پیش کرتے ہیں، لیکن غالب اس بارے میں عام شعرا سے بالکل ممتاز حیثیت رکھتے ہیں وہ نہ صرف مسرت کے چھن جانے کے خوف سے رشک پر مجبور ہوتے ہیں بلکہ رنج والم میں بھی دوسروں کو اپنی برابری یا اپنے پر ترجیح حاصل کرتے ہوئے دیکھنا انہیں رشک کی طرف متوجہ کر دیتا ہے، وہ رشک کو جذبات کے تحت ہی نہیں رکھنا چاہتے بلکہ عقل سے بھی اس کا فرض ہونا ثابت کر دکھاتے ہیں، جس طرح پہلے پہلے کوئی شخص دولت اس خیال سے جمع کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اس کو آرام ملے گا لیکن جب دولت جمع ہوتی ہے تو رفتہ رفتہ اس کا مطمح نظر بدلجاتا ہے اور بجائے آرام و مسرت کے خود دولت اس کا مطمح نظر بنجاتی ہے غالب کے رشک کی بھی یہی حالت ہے اوّل اوّل تو اُن کے خانگی حالات، ماحول کے واقعات طبیعت کی خاص افتاد اور پھر شاعری کی عام روشنی کی بنا پر وہ رشک کی طرف مائل ہوگئے لیکن جوں جوں رشک کے مضامین تخلیق پاتے گئے اُن کی ذہنیت ایک خاص شکل میں منتقل ہوتی گئی، جو فی الجملہ رشک کا مجسمہ تھی۔

عاشق کی اہم ترین خواہش یہ ہوتی ہے کہ معشوق کے دیدار سے مشرف ہو۔ غالب ایک عاشق کی حیثیت سے اس سے محروم نہیں ہو سکتے تھے بلکہ انکی عالی ہمتی کا اقتضا تو تھا کہ ..... اُن کی یہ خواہش عام عاشقوں سے بھی زیادہ ہو، لیکن جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ معشوق اُن کی خاطر اپنے چہرہ کا نقاب اُٹھائے گا تو اور لوگ بھی اسے دیکھ لیں گے جس کو اُن کا رشک ہرگز گوارا نہیں کر سکتا، اس لئے وہ نہیں چاہتے کہ خود بھی معشوق کے دیدار سے مشرف ہوں کہتے ہیں ؎

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

کیا کوئی ایسا عاشق ہوگا جو اپنے معشوق کو اپنے پاس آنے سے روکے! لیکن غالب کی ذہنیت ملاحظہ ہو کہ جب معشوق اُن کے پاس آنے کی تکلیف کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے معشوق کو آئندہ سے آنے کیلئے منع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ جب چلنے کی وجہ سے اُس کے چہرہ پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوئے تو غالب کے رشک نے انہیں اس خیال پر مائل کیا کہ یہ قطرے راستہ والوں کی نظریں ہیں جو حیرت کی وجہ سے معشوق کے چہرہ پر جم گئی ہیں، کہتے ہیں ؎

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرم خرام رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

معشوق کی گلیوں میں چکر لگانا عاشق کے لئے باعث فخر ہوتا ہے، وہ خواہ کہیں کیوں نہ ہو عاشق کی جملہ کوششوں کا مرکز ہے۔ غالب کا معشوق ..... رقیب کے در پر سے گزرتا ہے اس کے دیکھنے کی خواہش اور کوشش عام عاشقوں کی طرح اُن کا بھی فرض ہے، چنانچہ وہ اس کو انجام دینے کے لئے ..... نکلتے ہیں اور انہیں مجبوراً رقیب کے در پر جانا پڑتا ہے کیونکہ معشوق وہیں نظر آتا ہے۔ یہ حرکت اُن کے رشک کو ناگوار گزرتی ہے، اور وہ افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ؎

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں

وہ ایک دفعہ معشوق کے گھر کی طرف نکل پڑتے ہیں، انہیں پتہ تو معلوم ہے لیکن گھر نہیں معلوم۔ لہٰذا وہ وہاں ہر ایک سے دیوانوں کی طرح یہ پوچھتے پھرتے ہیں کہ اب میں کدھر جاؤں لیکن رشک کی وجہ سے معشوق کے گھر کا نام نہیں لیتے ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

ہر عاشق اپنے قاصد کی قدر اور خاطر تواضع کرتا ہے کیونکہ صرف اسی پر اُن کی اور اُن کے معشوق کی گفتگو اور پیغام کا انحصار ہوتا ہے، گویا قاصد کے بغیر معشوق تک عاشق کی رسائی دشوار ہے۔ غالب کو اس کی پروا نہیں، وہ اس پر بھی رشک کرتے ہیں، اگرچہ قاصد خود انہی کے لئے گفتگو کرنے معشوق کے پاس جاتا ہے لیکن اُس کے سوال و جواب پر غالب کو رشک ہوتا ہے کہتے ہیں ؎

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

ہر ایک عاشق کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اس کا معشوق اُسے قتل کر دے جس کے بعد اُسے حیاتِ جاودانی اور اطمینان ابدی نصیب ہونے کی امید رہتی ہے۔ غالب کا معشوق یہ شرف بخشنے کے لئے اُن کی طرف آتا ہے، لیکن وہ بجائے خوشی منانے کے اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر جوشِ رشک سے مرنے لگتے ہیں ؎

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے مرتا ہوں اُس کے ہات میں تلوار دیکھ کر

کسی عاشق کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ جیتے جی اپنے معشوق کے روبرو رہے، اُس کی موت بھی معشوق ہی کے ہات سے ہو اور مرنے کے بعد دفن بھی معشوق ہی کے سامنے ہو، گویا ہر طرح سے اس کو معشوق کی قربت اور اُس کی ذات میں محویت نصیب ہو، لیکن غالب اس رشک کی خاطر اس نعمت عظمیٰ سے بھی ہمیشہ کے لئے محروم ہوجانا چاہتے ہیں، انہیں ڈر ہے کہ اگر معشوق کی گلی میں دفن کیا جاؤں گا تو میری قبر کے پتہ سے لوگوں کو معشوق کا گھر مل جائیگا، کہتے ہیں ؎

اپنی گلی میں مجکو نہ کر دفن بعد قتل　　میرے پتہ سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

غالب کی عقل انہیں یقین دلاتی ہے کہ "وہ بے مہر کس کا آشنا" اور "بلائے جاں ہے ادا اس کی اک جہاں کے لئے" لیکن وہ کہتے ہیں کہ یہ بلائیں بھی میرے ہی لئے مخصوص ہونی چاہئیں۔ اگر دوسرے بھی اس میں مبتلا ہو جائیں تو انہیں رشک ہوتا ہے وہ کہتے ہیں ؎

ہا بلا میں بھی ہیں مبتلائے آفت رشک　　بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

اور اس لئے ایک دوسرے شعر میں کہتے ہیں ؎

فتنہ ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو　　کاشکے تم مرے لئے ہوتے !!

غالب کا رشک صرف ان مدارج ہی پر ختم نہیں ہوجاتا، وہ آگے بڑھ کر خود اپنے آپ سے رشک کرنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ بھی برا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے معشوق کے عاشق ہیں۔ وہ مرنے لگتے ہیں لیکن اسی رشک کی خاطر اس کی تمنا نہیں کرنا چاہتے۔ ایک اور جگہ وہ ظاہر کرتے ہیں کہ میں اسے نہیں دیکھ سکتا، اس لئے نہیں کہ اس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے کہ مجھے اپنے آپ پر رشک آجاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ اپنے معشوق کو دیکھ چکنے کے بعد اپنی طاقت دیدار پر رشک کرنے لگتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ میں بھی اس قابل نہیں کہ اس کا عاشق بن سکوں، اس لئے اپنی صورت پر لعن کرتے ہیں۔ ان شعروں میں انہوں نے یہی خیالات ادا کئے ہیں ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں ولے اُن کی تمنا نہیں کرتے

- - - - - - - - - - - - - - - -

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے　　میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

- - - - - - - - - - - - - - - -

کیوں جل گیا نہ تاب رخ یار دیکھکر　　جلتا ہوں اپنی طاقت دیدار دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - -

غافل ان مہ طلعتوں کیواسطے　　چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد　　آپکی صورت تو دیکھا چاہیئے

اس منزل پر پہنچنے کے بعد اگر غالب کے ان اشعار کا مطالعہ کیا جائے جن میں انہوں نے اپنے مذہب کے متعلق اشارے کئے ہیں تو ان کی اس ذہنیت کے متعلق خاص خاص انکشافات حاصل ہوتے ہیں۔ کیا حسب ذیل اشعار ان کی اس مخصوص ذہنیت سے ایک زبردست تعلق نہیں رکھتے؟ ؎

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا　　جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نورد وہم وجود   ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں

ہے تجلی تری سامان وجود   ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بعد ہے   جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اس بارے میں یہاں صرف اس امر کا اظہار کافی ہے کہ غالب کے عقیدہ وحدت الوجود کا استحکام غالباً ان کی اسی ذہنیت کی زبردست امداد کا نتیجہ ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ غالب کی ذہنیت کو خود غالب سے رشک کرنے کے بعد سیری ہو جائیگی لیکن شدت تشنگی کی کوئی حد بھی ہے کہ وہ اس سلسلہ کو وہیں ختم کر دینا نہیں چاہتی بلکہ غالب کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ خدا سے بھی رشک کرنے لگیں چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب   وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھسے

سید محی الدین قادری زور

غزل

تو ذرہ نورد دشت طلب ہو کے دیکھ لے   ہے ذرہ ذرہ وسعت صحرا لئے ہوئے
کس لطف و شوق سے رگ جاں کو تمام عمر   چھیڑا کیا ہیں خار تمنا لئے ہوئے
پھرتا ہوں اس کے فیض تجلی حسن سے   سینے میں ایک وادی سینا لئے ہوئے
ہر جزو کائنات سے محو نظارہ ہوں   آئینۂ خیال کسی کا لئے ہوئے
دل اور جلوہ گاہ کسی برق حسن کا   یعنی ہوں اس حباب میں دریا لئے ہوئے

بیٹھا ہے آرزو شب حزن و ملال میں
بس اک چراغ داغ تمنا لئے ہوئے

شبیر حیدر آرزو غازی پوری

حسنین کا انجام

(۱)

یوں تو ہر آدمی میں انسانیت اور الوہیت کے ساتھ ساتھ بہیمیت کا بھی ایک شائبہ ہوتا ہے لیکن حسنین پر بہیمیت اس طرح مستولی تھی کہ الوہیت اور انسانیت دونوں اس کے اندر مردہ ہو گئی تھیں۔ لاہور اور اکثر دوسرے شہروں میں اس کی طرزِ معاشرت کافی بدنام ہو چکی تھی، جہاں کہیں شباب کی گمراہیوں اور عقل کی بے اعتدالیوں پر گفتگو ہوتی اس کی زندگی کا حوالہ ضرور دیا جاتا۔ حیوانی جذبات کی کورانہ متابعت اس کے خیال میں عین مقصدِ حیات تھی۔ اگر کوئی دوست اس کی اس دل آزار نفسانیت کے خلاف ایک حرف منہ سے نکالتا تو وہ قہقہہ لگا کر کہتا "تم میں حرارتِ غریزی کی کمی ہے" اگر کوئی اس کی زندگی کو معصیت بتاتا تو وہ میوۂ فردوس کی یاد دلا کر کہتا "معصیت تو بنی آدم کا ترکہ ہے اور انسانی ترقی کا لازمی عنصر۔ اگر معصیت نہ ہوتی تو کائنات میں تعطل پیدا ہونے لگتا"۔ زندگی کو ایک اجازت نامہ سمجھتا تھا تمام منہیات کا۔ یہ تھے حسنین کے معتقدات جن پر وہ عمل بھی کر رہا تھا، چونکہ وہ ادیب تھا اس نے اس نے معتقدات پر بھی ادب و فلسفہ کا رنگ چڑھا لیا تھا۔ وہ اپنے خیالات کو کچھ اس پیرایہ میں پیش کرتا تھا کہ سننے والے کوئی کمزور بات بھی اس کے خلاف آسانی سے نہ کہہ سکتے تھے، حالانکہ سب جانتے تھے کہ حسنین حقیقت سے کتنا دور ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں حسنین انٹرنس میں پڑھتا تھا اس کو کسی سے شدید محبت تھی لیکن اس کی محبت کی تحقیر کی گئی اور اس کو سخت مایوسی ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے انتہائے ضد اور جوشِ انتقام میں یہ روش اختیار کر لی مگر یہ محض ایک دور از کار تاویل ہے۔ وہ شروع سے آوارہ مزاج اور عیاش واقع ہوا تھا۔ وہ فطرتاً موسمی تاثراتِ عصبی کا غلام تھا۔ محبت کے احساس سے وہ طبعاً بیگانہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ اگر اس دنیا میں واقعی کسی کو محبت کی تلاش ہے تو اس کو قمری یا بلبل کے آشیانوں میں جا کر ڈھونڈھنا چاہیئے۔ اس کے خیال میں عورت مرد کے لئے صرف حصولِ لذت کا ایک ذریعہ تھی، وہ سمجھتا تھا کہ حسن فی الحقیقت ایک حیلہ ہے جس کو انسان کی اشتہائے نفس نے محض اپنی آسودگی کے لئے پیدا کر رکھا ہے۔ حالانکہ اگر حسنین نے خود اس قدر دلکش صورت نہ پائی ہوتی۔ اگر خود اس میں وہ کشش نہ ہوتی جو ٹھوس سے ٹھوس طبیعت کو ایک دفعہ اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے تو وہ اپنی غارتگریوں میں اتنا کامیاب نہ ہو سکتا۔ انگلینڈ جانے سے پہلے بھی نہ جانے کتنی عورتوں کو فریب دے کر وہ تباہ و برباد کر چکا تھا، اور اب جبکہ انگلینڈ سے واپس ہوا اور لاہور میں بیرسٹری کرنے لگا تو اس کی طبیعت کا یہ رنگ اور بھی پختہ ہو گیا تھا وہ اب ایک "مہذب اوباش" تھا۔ مختصر یہ کہ حسنین ابلیس کی نیابت کرنے اور "حوا کی بیٹیوں" کو ان کی "خود ساختہ بہشت" سے بھی محروم کرنے آیا تھا۔

کچھ دنوں کے لئے حسنین کی جولانیوں میں کسی حد تک کمزوری پیدا ہو گئی تھی جبکہ اس نے لکھنؤ کی ایک مایہ ناز لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ احباب کو یقین ہو چلا تھا کہ اب اس کی آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا ہے اور اب وہ سیدھی راہ چلے گا کیونکہ حسنین نے بڑی تمناؤں اور کوششوں سے صوفیہ کے ساتھ شادی

کی تھی اور اس میں شک نہیں کہ پانچ چھ مہینے اس کو بیوی کے ساتھ شدید انہماک رہا۔ لیکن آخر کار اُس کو صوفیہ سے بھی سیری ہو گئی، رفتہ رفتہ اُس کی تمام بدمستیاں عود کر آئیں نفسانیت کے بھوت نے اس پر پھر غلبہ کیا اور اُس کو اندھا کر دیا اُس نے اپنی گزشتہ زندگی پھر اختیار کر لی۔ تقدیر کی خوبی دیکھیے کہ صوفیہ دو سال کے اندر ہی حسنین کو بہ تصور آزاد مطلق العنان چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

(۲)

صبح شام ہوتی رہی اور شام صبح۔ بہار خزاں میں تبدیل ہوتی رہی، خزاں بہار میں لیکن حسنین زمین و آسماں کی گردشوں سے بے خبر بے کیفیوں کی لذت سے نا آشنا، اپنی زندگی کو ایک پیالۂ لبریز سرور بنائے ہوئے تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "جب تک میرے جسم میں ایک قطرۂ خون باقی رہیگا میں اپنے خروش نفس کو آسودہ کرتا رہوں گا، جینے کا لطف یہی ہے" لاہور سے وہ اکتا جاتا تو لکھنو بنارس اور کلکتہ جا کر اپنے لئے سامان لذت فراہم کرتا۔ اگر اس کی سیہ کاریاں ترتیب وار بیان کی جائیں تو ایک طویل "فردِ حیات" تیار ہو سکتی ہے جہاں کہیں حسین و جمیل عورت ہوتی، حسنین کسی نہ کسی تدبیر سے اس تک رسائی حاصل کرتا، اور اس کو پامال کر کے اس طرح آنکھیں پھیر لیتا کہ گویا کبھی کی ملاقات نہ تھی، جہاں اُس کی دولت اُس کی مدد نہ کر سکتی وہ اپنی دلفریب صورت سے کام لیتا، یا پھر جھوٹے جذبات محبت پیش کرتا جس میں اُس کو خاص مہارت حاصل تھی۔ بہر حال وہ اپنے کو کامیاب بنانیکی ہر ممکن کوشش کرتا۔
حسنین کی سفاکیوں کی آخری آماجگاہ ثریا تھی جس نے اُس کے "داعیات محبت" پر اعتماد کر کے اپنی ہستی کو مٹا ڈالا، اور جس نے حسنین کی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا، حسنین کو ابھی تک اپنے سے قوی تر کوئی ہستی نہیں ملی۔ اب اُس کو معلوم ہوا کہ ثریا کوئی معمولی عورت نہ تھی، ثریا بمبئی کی ایک متمول تعلیمیافتہ لڑکی تھی اور حسنین کے خالہ زاد بھائی غلام نبی کے ساتھ بیاہی تھی۔ غلام نبی بمبئی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اُن کی طبیعت خشک اور ٹھوس تھی معلوم نہیں کس وقتی جذبہ سے متاثر ہو کر انھوں نے شادی کر لی تھی۔ کیونکہ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو تاہل کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں، اُن کو سقراط و افلاطون کانٹ اور ہیگل۔ لاک اور ہیوم سے اتنی مہلت نہیں ملتی تھی کہ ثریا سے کبھی پیار کی دو باتیں کر سکتے۔ وہ "نفسیات" کے ماہر ہونیکے باوجود یہ نہیں جانتے تھے کہ عورت اپنی تشفی کے لئے کیا چاہتی ہے۔
برخلاف اس کے ثریا بے انتہا حساس دل رکھتی تھی، وہ مغلوب الجذبات تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی اُس کے لئے دیوانہ رہے، اور وہ اُس دیوانگی کا جواب دیوانگی سے دے۔
غلام نبی کی بے حسی پر ثریا نے اپنا جی کڑھانا شروع کیا۔ وہ افسردہ رہنے لگی۔ غلام نبی نے پہلے تو اُس کو بہت سمجھایا مگر جب دیکھا کہ اُس کی تسکین نہیں ہوتی تو اس باب میں سکوت ہی کو بہتر سمجھا۔
حسنین بمبئی میں بھی کئی مرتبہ ثریا کو دیکھ چکا تھا اور اُس کے لئے اپنی رگوں میں چنگاریاں محسوس کر رہا تھا۔ لیکن اُس کو اتنا موقع نہ ملا کہ ثریا سے بے تکلفی پیدا کر سکتا۔ چنانچہ اُس کی چنگاریاں بھڑکنے نہ پائیں۔
شادی سے دو سال بعد کثرت شراب نوشی نے غلام نبی کی صحت کو کچھ اس طرح خراب کیا کہ اُن کو مجبوراً ملازمت ترک کر کے لاہور چلا آنا پڑا۔
حسنین کی تمنا پوری ہو گئی، اُس نے ثریا سے بے تکلفی کے ساتھ ملنا شروع کر دیا، محبت کی آرزو کرنا اور اُس کو نہ پانا ایک جانکاہ دکھ ہے۔ ثریا نے حسنین کی ہمدردی کو غنیمت سمجھا۔ غلام نبی اپنے کمرے میں بڑے بڑے فلسفہ کی گتھیاں سلجھایا کرتے اور حسنین مختلف دلچسپ باتوں سے ثریا کا دل بہلایا کرتا۔

اُس نے ان دنوں اپنی سیر و تفریح کو بھی ترک کر رکھا تھا، اُس کا مکان غلام نبی کے مکان سے ملحق تھا۔ ثریا اس کی چالوں سے بے خبر تھی، اس کو رفتہ رفتہ یہ خیال ہونے لگا کہ حسین اُس کو چاہتا ہے۔ وہ محبت کی بھوکی تھی اس لئے اس کو اس خیال سے راحت ملی۔ اُس کو حسین کی نگاہیں محبت برساتی ہوئی معلوم ہوئیں۔

حسین کو جب یقین ہو گیا کہ ثریا اُس کی سحر آفرینیوں سے مغلوب ہو چکی ہے تو اُس نے ایک دن اُس کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا۔ اُس نے غلام نبی کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا "ثریا یہ دیکھ دیکھ کر میرا دل دکھتا ہے کہ غلام نبی تمہاری قدر نہیں کرتے اگرچہ ان کی جانبداری میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جذبات سے یکسر عاری ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ کوئی قابل تحسین بات نہیں، ہر شخص کو کم از کم ان جذبات کا لحاظ رکھنا چاہیئے، جو انسانیت کی دلیل ہوا کرتے ہیں، میں تو ایسے آدمی کا احترام کر ہی نہیں سکتا، جو حسن کے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا" حسین عورتوں کا مزاج شناس تھا۔ وہ ہر عورت سے اُس کے مذاق کے مطابق ہمکلام ہونے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ آج اُس نے ثریا سے جس لہجہ میں گفتگو کی اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہی حسین ہے جو آج سے چھ ماہ قبل ایک گرکوٹ دوشیزہ کو جس کا نام نازو تھا تاراج و برباد کر چکا تھا اور اب ثریا کو بھی خراب کرنا چاہتا ہے۔

ثریا نے حسین کے ایک ایک لفظ میں بڑا خلوص پایا، اُس کو از سر نو اپنے درد کا احساس تیز ہوتا ہوا معلوم ہوا، اُس کے اعصاب میں تشنج پیدا ہوا، اُس نے حسرت بھری آواز میں کہا "میرا دل پھوڑا ہو رہا ہے اب اس تذکرے سے اُس کو ٹھیس نہ لگایئے۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اب اس کی تلافی کیونکر ہو سکتی ہے" اُس کی آنکھیں تر ہو رہی تھیں چند لمحوں کے لئے وہ خاموش ہو گئی۔ حسین خوب جانتا تھا کہ وہ کونسی آگ دبائے بیٹھی ہے، وہ کچھ دیر تک تو ثریا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر ایک دھیمی آہ کر کے کہنے لگا "ثریا تم میں وہ خوبیاں موجود ہیں جو تم کو ساوتری بنا سکتی ہیں فطرت نے تم کو اسلئے پیدا کیا تھا کہ کوئی تمہاری پوجا کرتا، اور تمہاری جاں نثاریوں کا مستحق بنتا .... کاش میں ایسا خوش نصیب ہوتا ——!"

حسین کی آواز رک گئی۔ وہ اس وقت ایک خاص ہیجان سے مغلوب تھا اس لئے جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر صداقت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں بڑی سے بڑی برگزیدہ ہستی بھی دھوکا کھا سکتی ہے۔

ثریا کے چہرے پر خون دوڑ گیا وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی، اس لئے نہیں کہ امید کے خلاف اس کو کوئی دھکا لگا تھا۔ اُس کو مہینوں سے حسین کے حرکات و سکنات میں محبت کی علامتیں نظر آ رہی تھیں۔ آج اُس کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا وہ حسین سے حتی المقدور اپنی کیفیت چھپانا چاہتی تھی

حسین کی امیدیں منقطع ہونے لگیں، اُس نے ایسی نگاہ سے ثریا کو دیکھا جس سے دیوانگی ٹپک رہی تھی اور جو تڑپا دینے والی تھی۔ ثریا بے حرکت کھڑی رہ گئی، حسین نے ہاتھ جوڑ کر کہا "تم کو اگر کوئی صدمہ پہنچا ہو تو للہ معاف کر دو میں ابھی چلا جاتا ہوں اور پھر کبھی اپنا منہ تم کو نہیں دکھاؤں گا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ تم اصلیت سے آگاہ ہو جاؤ۔ جو کچھ میں کہوں اُس کو سن لو۔ یہ ضروری نہیں کہ تم بھی اس کا کچھ جواب دو، اگر بیٹھ جاؤ تو کہوں!"

اس کی آواز میں درد بھرا تھا۔ ثریا بلا ارادہ بیٹھ گئی۔ حسین کا حوصلہ بڑھا۔ اُس نے پھر اپنی افسوں گری شروع کی۔ "ثریا تم کو معلوم نہیں کہ میری زندگی کیسی آلودہ رہی ہے۔ میرے دامن حیات پر نہ جانے کتنے سیاہ دھبے ہیں، اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ آج تک میرے مذاق کی کوئی عورت نہیں ملی، جو میری زندگی کو دائرہ اعتدال میں رکھتی اور مجھکو بے عنوانیوں سے روکتی۔ کہہ نہیں سکتا کہ میں اپنی بداعمالیوں پر کس قدر ...... کے آنسو بہا رہا ہوں۔ میری حالت انگلستان کے مشہور شاعر بائرن کی سی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ حیوانیت یہ درندگی ان لطیف عناصر

کو مٹا دیگی جو میرے اندر موجود ہیں۔ مگر پھر بھی اُسی حیوانیت میں سرگشتہ رہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھکو بچا سکتی ہو، مجھکو قعر مذلت سے نکال سکتی ہو میری تاریکیوں کو سپیدۂ سحر سے معمور کر سکتی ہو۔ میں نے جب سے تم کو دیکھا ہے تمہاری پرستش کرتا ہوں۔ جب سے تم یہاں آئی ہو میں نے اپنے گزشتہ مشاغل ترک کر دیے ہیں۔ تم میں کیا بتاؤں کیا چیز ہے جو کسی دوسری عورت میں نہیں اور جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ سیر و تماشے میں اب میرا جی نہیں لگتا۔ آؤ ہم ایک دوسرے کے رفیق بن جائیں۔ تم محبت کی محتاج ہو، میں سکون کا" کون کہہ سکتا تھا حسنین نے اپنی نفسانیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یہ طومار تیار کیا تھا۔ تا وقتیکہ کسی کو الہام نہ ہو ایسے بیانات کو فریب سمجھنا، ایسے جذبات کو موہمی اور بیگانۂ اصلیت کہنا خدا کی خدائی سے انکار کر دینا ہے۔

حسنین کا منتر کارگر ہو گیا۔ ثریا محبت کی ترسی ہوئی تھی۔ اُس نے جو دیکھا کہ اس کو نوید محبت دی جا رہی ہے تو "زما عقل و زما جان و زما دل" کہکر اپنے کو کھلی ہوئی آغوش کے سپرد کر دیا۔ پیاسے نے ریت کی دعوت قبول کر لی، جب حسنین خاموش ہو گیا، تو ثریا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، یہاں تک کہ اُسکی آنکھوں میں خون جم گیا، اور گرد و پیش کی چیزیں اُس کو دھندلی نظر آنے لگیں۔ اس پر خواب کا عالم طاری ہو گیا۔ وہ دفعتاً اپنے پہلے وجود کو بھول گئی۔ حسنین جانتا تھا کہ جو عورت کسی کے لئے آنسو بہا سکتی ہے وہ اپنا خون بھی بہا دینے کو تیار ہو جائیگی، اُس نے ثریا کی کمزوریوں سے پورا فائدہ اُٹھایا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ انسان آلائشوں سے کب تک پاک رہ سکتا ہے اور کہاں تک آزمائشوں کا مقابلہ کر سکتا ہے، ثریا نے نہایت اعلیٰ تعلیم و تربیت پائی تھی اور اگرچہ وہ ایک عصبی عورت تھی تاہم اُس سے ایسی لغزش کی امید نہ تھی، حسنین اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گیا اس نے دل کھولکر اپنی حسرتوں کو سیراب کیا۔ ثریا نے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر اپنے کو حسنین کی خوشنودی کے لئے وقف کر دیا۔

―――― (۳) ――――

مذہب یا اخلاقیات کی پابندیاں ایک وارفتۂ محبت کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ زندگی کی بھول بھلیوں میں صرف جذبات کی رہنمائی کس قدر خطرناک ہے، ثریا اپنے خواب کے عالم میں اس طرح محو ہوئی کہ واقعات کی دنیا کا تصور بھی اُس کے ذہن سے مفقود ہو گیا۔ حسنین کی ہر تحریک پر لبیک کہنا اُس نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا، وہ اس خواب کو پائدار سمجھ رہی تھی۔

حسنین کی شیفتگی میں کمی ہو رہی تھی، وہ مطمئن تھا کہ جب چاہیگا ثریا پر ایک غلط انداز نگاہ ڈالکر اس سے منہ پھیر لے گا۔ وہ نہ جانے اس قسم کے کتنے کھیل کھیل چکا تھا، مگر اُس کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ثریا کے مقابلہ میں وہ کس قدر کمزور ہے۔

آخر کار ثریا کو پتہ چلا کہ اس کو اپنی آلودگیوں کا پھل "گوشت و پوست" کی صورت میں ملنے والا ہے، اور عمر بھر کے لئے اُس کے گناہوں کی ایک جیتی جاگتی یادگار قائم ہونیوالی ہے، وہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی تھی، لیکن حسنین سے ابھی اُس کی امیدیں منقطع نہیں ہوئی تھیں۔

جاڑوں کا موسم تھا رات کی تاریکی کائنات پر اپنا تسلط جما چکی تھی، ہر طرف خوفناک سکوت چھایا ہوا تھا، ثریا بارہ گھنٹے زندگی اور موت کی کشاکش میں مبتلا رہنے کے بعد ماندہ و خستہ غفلت کی حالت میں پڑی تھی، دفعتاً اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے نرس سے پوچھا "کیوں؟ بچہ ابھی رو رہا تھا؟"

نرس نے جواب دیا "نہیں۔ مگر بھوک ضرور ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے آپ اس کو اپنے پاس لے لیجئے تو اچھا ہوگا" ثریا نے بغیر بچہ کی طرف دیکھے ہوئے منہ پھیر لیا۔ اس نے کراہ کر کہا "کم بخت میرے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے ابھی زندہ ہے!" نرس خاموش ہوگئی۔ وہ حقیقت حال سے خوب واقف تھی، اور اس کو ثریا کے ساتھ پوری ہمدردی تھی۔ ثریا کی دماغی حالت واقعی عبرتناک اور قابل رحم تھی۔ وہ اگر ایک لمحہ میں اس "زائیدۂ معصیت" کو اپنے جگر کا ٹکڑا سمجھتی تو دوسرے لمحہ میں رکشش سمجھ کر اس سے ڈرنے لگتی۔ وہ کبھی تو اپنے بچہ کو پیار کی نیم وا نگاہوں سے دیکھتی اور کبھی اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیتی۔

حسنین اور ثریا کے باہمی تعلقات کا چرچا سارے شہر میں تھا۔ ہر جگہ غیر ذمہ دارانہ تنقیدیں ہو رہی تھیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ غلام نبی کی کمزوری ہے کوئی ثریا پر ملامتوں کی بوچھار کر رہا تھا۔ کچھ لوگ حسنین کو کوس رہے تھے لیکن بہت کم ایسے تھے جو کسی اصولی نقطۂ نظر سے اس واقعہ پر غور کرتے۔ غلام نبی سکتہ میں تھے۔ اُن کی زبان سے ایک حرف نہ نکلتا تھا، اُن کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ثریا کو ہلاکت سے کیونکر بچایا جائے۔ ثریا پر ان کا دل رو رہا تھا، اور وہ اپنے کو مورد الزام خیال کر رہے تھے۔

حسنین کے برتاؤ سے مہینوں پہلے سرد مہری اور بے التفاتی کا اظہار ہونے لگا، اور تقریباً ایک ماہ سے تو ثریا کو اس نے دیکھا ہی نہ تھا، عام طور پر مظلوم کو یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ بیگناہ ہے مگر ثریا تنہا اپنے کو گنہگار قرار دیئے ہوئے تھی۔ اگر کبھی اس کو خیال ہوتا کہ حسنین بھی اس گناہ میں شریک تھا تو وہ اس خیال کو خود غرضی سمجھ کر اپنے دل سے نکال دیتی، بعض اوقات تو اس کو ایسا محسوس ہوتا کہ تخلیق کائنات سے لیکر اب تک جتنے گناہ ہوئے ہیں؟ سب اسی سے سرزد ہوئے ہیں اور اس کو ان سب کا کفارہ دینا ہے۔ جب تخیلہ کا یہ عالم ہو تو ہم آپ صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ انسان کی زندگی کیسی تلخ ہوگی۔

ثریا نے رات بھر غفلت و بیداری کی کشمکش میں بسر کی تھی، اس لئے صبح کو نو بجے تک سوتی رہی، بچہ کو پیدا ہوئے بارہ گھنٹہ سے زیادہ گزر چکے تھے اور اس نے ماں کا دودھ نہیں پایا تھا، نرس سے نہ رہا گیا تو اس نے چائے منگوائی اور ثریا کو جگایا۔ ثریا نے ساری رات طرح طرح کے ڈراونے خواب دیکھے تھے، وہ آنکھوں سے مخبوط معلوم ہوتی تھی، اس نے نرس سے پوچھا "کیا ہے؟" نرس نے کہا "آٹھ گھنٹے سے زیادہ گزر چکا۔ [illegible] چائے پی لیجئے" یہ کہکر اس نے چارپائی کے پاس میز پر چائے وغیرہ رکھدی، ثریا کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ اس کو تپ چڑھی ہوئی ہے۔ تھرمامیٹر لگا کر دیکھا گیا تو حرارت سو ڈگری تھی بڑی بڑی مشکل سے جب وہ چائے پی چکی تو نرس نے کہا "آپ دوچانوں کو ہلاک کیوں کرنا چاہتی ہیں، اپنے دل کو قابو میں رکھیئے اور خدا کے لئے بچے کو دودھ پلا دیجیئے آخر اس معصوم نے کیا خطا کی ہے؟" اس نے چاہا کہ بچہ کو لاکر گود میں دیدے، مگر ثریا نے سخت لہجہ میں منع کر دیا "اس مجسم لعنت کو میرے سامنے نہ لانا" نرس کو یقین ہوگیا کہ مریضہ پر ہذیان طاری ہے جس کا علاج آسان نہیں۔ وہ چپ ہوگئی۔ دیر تک سوچنے کے بعد ثریا نے کہا "نرس تم سب کچھ چھوڑ کر میرا ایک کام کر دو میں بہت ممنون ہوں گی" نرس نے پوچھا "وہ کونسا کام؟" ثریا نے جواب دیا "حسنین صاحب پاس کسی صورت سے میری ایک تحریر پہنچا دو" نرس سنے ماہر کیا۔ ثریا نے پھر کہا "سوچتی کیا ہو؟ کار خیر کر دو۔ اس کے عوض میں جو کچھ مانگو میں دینے کو تیار ہوں" اس کا ہر لفظ دکھے ہوئے دل کی صدا معلوم ہوتا، نرس کو ثریا اور اس کے بچے دونوں کی زندگی سے مایوسی تھی اس کا دل بھر آیا اس نے کہا "ضرور آپ کا کام کر دوں گی مگر اس شرط پر کہ آپ بچے کو دودھ پلا لیں۔ زیادہ

دن اس کے جینے کی امید نہیں آپ دوسرے گناہ کی مرتکب کیوں ہو رہی ہیں؟" ثریا با دلِ ناخواستہ راضی ہو گئی۔ اس نے اپنے جذبات کے ہنگامہ کو روک کر کہا۔ "اچھا لے آؤ"۔ بچہ اس کی گود میں آیا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھنے لگا۔ ثریا نے بہت کوشش کی مگر اس نے دودھ نہیں پیا۔ آخر کار نرس نے اسکو لے لیا، اور ثریا کانپتے ہوئے ہاتھ سے خط لکھنے میں مشغول ہو گئی۔

"میرے محسن!

آپ امید کر رہے ہونگے کہ میں آپکے سامنے شکایتوں کا ایک دفتر کھولکر رکھ دونگی اور اپنے دکھ کی داستان سنا کر آپ کو سکون سے محروم کرنے کی کوشش کرونگی۔ مگر مطمئن رہیئے میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ آپ کو بے کیف کروں۔ میں نے دل و دنیا دونوں آپ کے حوالہ کر دیا لیکن اس میں آپکی کوئی خطا نہ تھی، میں نے سب کچھ آپ کو بھیک سمجھکر دیا اور مجھکو بالکل افسوس نہیں۔ "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"۔ آپ شوق سے دوسری جگہ اپنی دلچسپیاں پیدا کیجئے، میں منع نہیں کرتی کہنا صرف اس قدر ہے کہ ابھی میرے دل میں چند قطرے لہو کے باقی ہیں جو کبھی کبھی میری قوت حاسہ کو تیز کر کے رگوں میں ٹیس پیدا کر دیتے ہیں۔ آئیے اور للہ مجھ میں جو کچھ لہو باقی ہے اسکو بھی پی لیجئے "مرا بگیر چو منے کہ در دل افتاد است" پھر اس کے بعد مجھے سکون ہو جائیگا۔ میں اپنی حالت کے متعلق ایک حرف کہنا نہیں چاہتی اور نہ مجھکو کچھ کہنا ہے آج آٹھ بجے رات کو آکر مجھ سے مل لیجئے ورنہ یقین مانیئے آپ جہاں کہیں ہونگے میں خود آکر ملونگی۔ میں اس قدر بیگانۂ احساس ہو چکی ہوں کہ مجھکو دنیا میں کسی کا لحاظ نہیں ہو سکتا اور اب میرا جو جی چاہیگا کر بیٹھونگی۔

آپ کی ثریا"

ثریا واقعی یاس و حرماں کی اس حد تک پہنچ گئی تھی جہاں سارا اضطراب مبدل بہ سکون ہو جاتا ہے۔ وہ اس قدر حزیں ہو گئی تھی کہ اب اس کا دل رونے کے لئے بھی نہیں ابھرتا تھا، گزشتہ آٹھ دس مہینے اس نے رونے میں گزارے تھے اور اب اس کو وہ سکون نصیب ہو گیا تھا جو انتہائے بے دلی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

حسین کو ثریا کی تحریر ملی تو اس کا چہرہ دھندلا ہو گیا۔ کچہری جانے کا وقت ہو گیا تھا اور وہ اپنے چند دوستوں سے تھیٹر جانے کی صلاح کر رہا تھا۔ لاہور میں کچھ دنوں سے ایک مشہور تھیٹریکل کمپنی مقیم تھی جو سارے شہر کو مبہوت کئے ہوئے تھی اس لئے کہ اس میں ایک پارسی ایکٹرس موجود تھی جس کا نام مس زہرہ تھا اور جو بے انتہا حسین و جمیل ہونے کے علاوہ اپنے فن کی ماہر تھی، ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں وہ خراج تحسین حاصل کر چکی تھی۔ حسین نے مس زہرہ سے بھی مراسم پیدا کر لئے اور اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اب وہ اپنی فرصت کا زیادہ حصہ اسی کے قرب میں صرف کرتا۔ وہ قریب قریب ہر روز تماشہ دیکھنے جاتا تھا۔ آج کمپنی اپنے اسٹیج پر شیکسپیر کا مشہور ڈرامہ "انطانی اور قلوپطرہ" پیش کرنیوالی تھی۔ ہر شخص مس زہرہ کو قلوپطرہ کے پیکر میں دیکھنے کا مشتاق تھا۔ حسین مس زہرہ سے بے تکلف تھا۔ اکثر اس کی اپنے گھر پر دعوت کرتا رہتا۔ دوسرے دن چونکہ اتوار تھا اس لئے چاہتا تھا کہ تمام دن مس زہرہ کیساتھ بسر کرے مگر ثریا نے اس کو خواب مسرت سے جگا دیا۔ وہ ثریا سے ڈرتا تھا، اس کو یقین تھا کہ ثریا کی علانیہ مخالفت کرنا خطرات سے خالی نہیں اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سے جا کر مل آئے۔

رات کو آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ حسین اپنے کمرے سے اٹھا اور چور کی طرح ثریا کے کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا جہاں نرس کے سوا کوئی اجنبی

آدمی نہ تھا۔ ثریا نے حسنین کو ایسے مجنونانہ انداز سے دیکھا کہ وہ لرز گیا۔ ابھی تک ثریا کا بخار نہیں اترا تھا، اس نے اٹھکر بیٹھنے کی کوشش کی مگر اپنے جسم میں اتنی تاب نہ پائی۔ حسنین نے اس کو سہارا دینا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا "آپ کرسی پر بیٹھ جائیے مجھکو سہارے کی ضرورت نہیں" یہ کہکر وہ ایک کراہ کے ساتھ اٹھ بیٹھی۔ پھر نرس سے کہا "بچے کو مجھے دیدو" نرس بچہ اس کی گود میں دیکر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ثریا نے کہا۔ "میں نے آپ کو محض اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس کو میرے پاس سے لیجائیے ورنہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گی میری زندگی کے بہت کم دن باقی رہگئے ہیں جن کو میں سکون کے ساتھ گذارنا چاہتی ہوں، اور اس کی زندگی کا ایک اک لمحہ میرے قلب میں نشتر چبھو رہا ہے۔" ثریا اس وقت ایک خونخوار مجرم معلوم ہو رہی تھی، حسنین پر ہیبت طاری ہوگئی مگر وہ ثریا کے ہیجان کو فرو کرنے کی تدبیر پہلے سے سوچ چکا تھا۔ وہ اس کے بستر پر جا کر بیٹھ گیا اور گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگا "خدا کے لئے ہوش سے باتیں کرو تو بتاؤں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں مصلحت کا تقاضہ یہی تھا۔ ورنہ یقین مانو میں تم کو اپنا بنانا چاہتا ہوں اور منتظر ہوں کہ موقع ملے تو غلام نبی سے اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ان کی بڑھی ہوئی ثقاہت و سنجیدگی سے امید ہے کہ وہ میرے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا کریں گے، اس کے علاوہ خوب جانتے ہیں کہ اب ان کا سل اچھا ہونیوالا نہیں، پھر کیا وجہ کہ وہ تم کو آزاد نہ کر دیں؟" یہ کہکر اس نے اپنے فریب کو زیادہ قابل اعتبار بنانے کیلئے انگریزی کے مشہور ادیب رابرٹ لوئی اسٹونسن اور مسز آسبورن کی داستانِ معاشقہ کا حوالہ دیا حالانکہ اسٹونسن کے پاک جذبۂ محبت کو حسنین کی نفسانیت سے کوئی نسبت نہیں تھی۔ یہ تو کہنا بیکار ہے کہ ثریا نے حسنین کی باتوں پر اعتبار بھی کر لیا تاہم اس کو امید کی ایک جھلک پھر نظر آگئی واقعہ تو یہ ہے کہ وہ حسنین کو اس طرح چاہتی تھی کہ محض اس کا سامنے ہونا اس میں کافی آسودگی اور طمانیت پیدا کر سکتا تھا۔ ثریا کی قوت احساس عود کر آئی۔ حسنین کا قرب اس کے ریشہ ریشہ میں محشر بپا کئے ہوئے تھا دبے ہوئے بخارات ابھر آئے اور اس کی آنکھوں سے طوفانِ اشک جاری ہوگیا۔

اس طرح کچھ طبیعت کا بار ہلکا ہوا تو ثریا نے بچے کی طرف دیکھا اور پہلی دفعہ مامتا محسوس کی وہ اپنی بدنصیبی بھول گئی۔ بچہ کی طرف اشارہ کرکے حسنین سے بولی "دیکھئے کتنا بھولا ہے اور میں اس کو کھانا چاہتی ہوں! نہیں نہیں میں اپنا گلا گھونٹوں گی!" وہ پھر بے اختیار رونے لگی۔ حسنین نے کہا "تم اس کا گلا گھونٹو گی اور نہ اپنا۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئیگی" ثریا نے کچھ جواب نہ دیا۔ حسنین نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر اس نے ذرا جنبش نہ کی اس کی نگاہیں سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں جہاں اس کی ماں کا سایہ اپنے تباہ کرنے والے کے سایہ سے بغلگیر تھا۔

حسنین جب رخصت ہونے لگا تو ثریا نے ہاتھ جوڑ کر کہا "آپ مجھ سے قریب رہئے تو شاید میں چین سے رہ سکوں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ آپ میرے لئے اپنے کو پابند کیجئے اور اپنی لذتوں کو بھول جائیے، لیکن مجھ سے اس طرح منہ نہ پھیرئیے میں نے اگر آپ کا کچھ بھلا نہیں کیا ہے تو آپ کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچایا ہے۔"

حسنین نے جواب دیا "تم اطمینان رکھو اور ڈیڑھ ماہ صبر کے ساتھ انتظار کرو۔ اگر اس درمیان میں تم سے نہ ملوں تو یہ نہ سمجھنا کہ میں اپنی غرض پوری کرکے تمہیں بھول گیا۔ میں آخری سانس تک اپنی کوشش کرتا رہوں گا" یہ کہکر وہ رخصت ہوا اور سیدھا مس زہرہ کے پاس پہنچا، وہ چلتے چلتے فریب دے گیا اور اس پیرایہ میں کہ ثریا کی کلفتوں میں ایک حد تک کمی بھی ہوگئی۔ نرس نے سچ کہا تھا کہ بچہ کے زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی امید نہیں اسکی جسمانی ساخت بیحد کمزور تھی۔ اس کو دنیا میں قدم رکھے ہوئے دس روز بھی نہیں ہوئے کہ ام الصبیان کی نذر ہوگیا۔

(۴)

حسین تقریباً مہینہ بھر اور لاہور میں رہا۔ اس نے دیکھا کہ اگر کچھ دنوں کے لئے وہ کہیں باہر نہ چلا گیا تو ممکن ہے ثریا کی ذات سے ایسے فساد اٹھیں جن کے نتائج اس کے لئے خطرناک ثابت ہوں۔ ثریا سے ہر وقت اس کو اندیشہ رہتا تھا۔ اس کا خیال آتے ہی وہ اپنی قوتوں کو سلب ہوتے ہوئے محسوس کرتا تھا۔ وہ پریشان رہنے لگا۔ مگر اپنی عادتوں سے مجبور تھا۔ یہ دشوار تھا کہ وہ اپنی اس زندگی کو جو یکسر کیف و سرور تھی بھول جائے۔

حسین کے دماغی انتشار کا ایک سبب اور بھی تھا۔ ثریا کی حالت روز بروز بدتر ہوتی جاتی تھی وہ ایک ایسے مہلک مرض میں مبتلا تھی جو آہستہ آہستہ اس کا خون چوس رہا تھا۔ وہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچ ہو کر رہ گئی تھی جس کو کبھی حسین "فلورا" کہا کرتا تھا وہ اب بالکل بے رنگ و بو تھی۔ اور ثریا کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ جینے سے تنگ تھی اور جلد سے جلد خاک میں یکسوئی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ حسین اپنے کو ثریا کی ہلاکت کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔ اس کا ضمیر بیدار ہو چلا تھا۔ عورت کے عزم و استقلال میں نہ جانے کیسی کیسی قوتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ثریا کی قربانی نے کم از کم حسین کو احساسِ گناہ کی نیش زنی سے تو لذت آشنا کر ہی دیا۔

لیکن حسین حتی المقدور یہی کوشش کرتا رہا کہ اس کی زندگی بے کیف نہ ہو جائے۔ اس غرض سے اس نے ساغر و پیمانہ کا شغل بھی شروع کر دیا اور ہر طرح سے اپنے کو دھوکہ دینے لگا۔

مس زہرہ اپنی کمپنی کے ساتھ بمبئی جا رہی تھی۔ وہ حسین کی دلدادہ ہو چکی تھی۔ اس نے ایک دن کہا "حسین صاحب آپ بھی بمبئی چلتے تو کیا اچھا ہوتا"۔
حسین نے سوچا کہ اس سے بہتر نجات کی صورت نہیں ہو سکتی چنانچہ کچھ دنوں کے لئے کچہری کے مشاغل چھوڑ کر مس زہرہ کے ہمراہ بمبئی چلا گیا۔

ثریا کو معلوم ہوا کہ حسین لاہور چھوڑ کر چلا گیا ہے تو کچھ دن واپسی کا انتظار کر کے اس نے اس کو ایک خط لکھا جس کے جواب میں حسین نے اطمینان دلاتے ہوئے لکھا "گھبراؤ نہیں میں غافل نہیں ہوں"۔ حسین اچھی طرح جانتا تھا کہ ثریا چند دنوں کی مہمان ہے۔ وہ بمبئی میں مس زہرہ کے ساتھ آنے والی گھڑیوں سے بے خبر ایک ایک گھنٹہ ابتہاج و مسرت میں گذار رہا تھا۔ جب کبھی ثریا کا خیال اس کے دل میں کوئی کھٹک پیدا کرتا تو وہ اس "زہرۂ ارضی" کے پہلو میں جام پر جام خالی کرنے لگتا۔

ثریا کی بیزاری اور افسردگی بڑھتی جاتی تھی۔ وہ نہ دوا کرتی تھی نہ کسی قسم کی احتیاط اور نہ کسی سے اپنی حالت بیان کرتی۔ دوائیں آتی جاتی تھیں اور وہ ان کو پھینکتی جاتی تھی۔ وہ دن رات اپنے کمرہ میں رہتی تھی نہ کوئی اس کے پاس آتا نہ وہ کسی کے پاس جاتی۔ دو دو وقت کھانے پینے کا نام نہیں لیتی تھی۔ مختصر یہ کہ ہر طرح سے وہ یہی کوشش کر رہی تھی کہ اس کو پر آشوب زندگی سے نجات مل جائے۔

غلام نبی کی صحت بھی روبہ انحطاط تھی۔ ان کو سل ہو گیا تھا اور وہ جینے سے مایوس تھے۔ مگر ثریا کو واقعی تباہی سے بچانا چاہتے تھے۔ گذشتہ چند ماہ میں ثریا کی خود انکاری نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ بشریت کو بشریت کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور انسان میں خواہ مخواہ وہ خوبیاں نہیں چاہتے تھے جو فرشتوں اور دیوتاؤں میں بتائی جاتی ہیں۔ ثریا کی کمزوریوں میں انکو ایسی زبردست قوت نظر آئی جس کے سامنے انسان اپنی تاب مقاومت مشکل سے قائم رکھ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو اپنی غلطی کا پورا احساس تھا۔ وہ ثریا کی طبیعت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے۔ اگر وہ اس کو اس طرح غیر محفوظ نہ چھوڑ دیتے تو وہ آتش کدہ کو گلزار سمجھ کر اس میں نہ کود پڑتی۔ اب غلام نبی تلافی مافات کرنا چاہتے تھے۔

ثریا کے ساتھ دنیا والوں کا جو برتاؤ تھا غلام نبی دیکھ رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے مرتے ہی کوئی اس کی بات نہیں پوچھے گا۔ وہ جانتے تھے کہ حسنین ثریا کو اب اپنا منہ نہیں دکھائیگا اس لئے وہ ایسا انتظام کرنا چاہتے تھے کہ ثریا کسی کی محتاج نہ رہے، ہرچند کہ ان کو یہ بھی یقین تھا کہ ثریا زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے والی نہیں ہے۔ غلام نبی کے پاس کچھ جائداد کے علاوہ چالیس ہزار نقد تھا۔ وہ یہ سب ثریا کے نام منتقل کر دینا چاہتے تھے لہذا ایک دن اسی مضمون کا ایک وصیت نامہ تیار کرکے وہ ثریا کے پاس گئے۔

غلام نبی اور ثریا کو باہم گفتگو کرنیکا مدت سے کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آج وہ اپنے دل میں ایک تلاطم لئے ہوئے اس کے کمرہ میں گئے تو اس کو عجیب ہیئت میں پایا۔ ثریا نے ایک بےمعنی نگاہ سے دیکھا۔ غلام نبی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گفتگو کا سلسلہ کس طرح شروع کریں وہ کچھ کھوئے سے تھے، آخرکار انہوں نے بغیر ثریا کی لغزشوں کی طرف اشارہ کئے ہوئے کہا "میری زندگی کے دن بہت تھوڑے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جیتے جی تمہارے لئے معقول انتظام کر جاؤں، اس لئے میں نے اپنی کل جائداد تمہارے نام لکھدی ہے"۔ ثریا وحشیانہ نگاہوں سے اُن کو دیکھنے لگی۔ غلام نبی نے وصیت نامہ کا کاغذ اس کے ہاتھ میں دیا تو اس نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا اور پھر دیوانہ وار دوسرے کمرہ میں بھاگ گئی۔ غلام نبی گھبرا گئے۔

عورت جب ایک بار محبت میں خراب ہو چکتی ہے تو پھر اپنی اصلاح گوارا نہیں کرسکتی ڈوب کر ابھرنا اور مرجھا کر پنپنا اس کے لئے رسوائی سے بدتر ہوتا ہے۔ صرف موت اس کو بچا سکتی ہے۔ ثریا نے دیکھا کہ اب غلام نبی کی چھت کے نیچے رہنا اپنے نفس کو ذلیل کرنا ہے اس نے ارادہ کر لیا کہ اب یا تو وہ حسنین کی دست نگر ہو کر رہیگی یا دنیا کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیگی۔ اسی رات کو ۲ بجے کچھ مختصر سا سامان اور سو روپیہ جو اس کے پاس موجود تھے لیکر وہ غلام نبی کے مکان سے چلی گئی۔ صبح کو غل مچ گیا کہ ثریا بھاگ گئی۔ رسوائی کی تکمیل ہو گئی۔

شام کے وقت بمبئی کے اسٹیشن پر ایک نحیف و زار عورت اتری جو حرکات و سکنات سے فاتر العقل معلوم ہوتی تھی وہ ہر طرف اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو یا یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی کہ اب اس کو کیا کرنا ہے۔

ثریا لاہور چھوڑ کر حسنین سے ملنے بمبئی چلی آئی تھی۔ زہرہ کے ساتھ حسنین کی مصروفیتوں کا حال بہت کچھ اس کو معلوم ہو چکا تھا وہ قسم کھا کر چلی تھی کہ آج حسنین سے اپنی زندگی کا فیصلہ کرے گی۔ اسٹیشن پر گاڑی سے اتر کر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کدھر جائے اتنے میں اس کی نگاہ ایک سمت کو جا پڑی اور وہیں رکگئی۔ حسنین مس زہرہ کے ساتھ پلیٹ فارم کے اس گوشہ میں تفریح کر رہا تھا جہاں آدمیوں کی آمد و رفت نسبتاً کم تھی۔ وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا ثریا نے اپنی اور اس کی حالتوں کا موازنہ کیا اور بھیڑ میں غائب ہو گئی۔

عورت میں حس کا عنصر تمام عناصر سے زیادہ ہوتا ہے اسی لئے اس کو فیصلہ کرنے میں بہت کم دیر ہوتی ہے۔ مشکل سے پانچ منٹ گذرے ہونگے کہ دوسری طرف سے ایک ٹرین آتی ہوئی دکھائی دی اور جیسے ہی پلیٹ فارم پر پہنچی ثریا نے اپنے کو دیو صورت انجن کے سامنے پھینک دیا۔ اسٹیشن پر ایک ہلچل مچگئی۔ حسنین اور مس زہرہ بھی شور سنکر پہنچے۔ حسنین نے ثریا کی بگڑی ہوئی صورت پہچان لی۔ اس کو چکر آرہا تھا۔ ہر چیز اسکو گھومتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ مس زہرہ اگر اس کو سنبھالے نہ ہوتی تو یقیناً وہ گر پڑتا۔

(۵)

انسان کی گمراہیوں کا دور جب دفعتاً ختم ہوتا ہے تو اس کی قوتِ حاسہ اس قدر تیز ہو جاتی ہے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا راستہ اختیار کرے حسینن کی آنکھوں سے پردے ہٹ گئے تو اندھوں کی طرح کائنات اُس کی نگاہ میں ایک سیاہ داغ ہو کر رہ گئی۔

ثریا کی وحشت انگیز موت کے بعد حسینن بمبئی میں جس طرح ایک دن اور ایک رات کاٹے اس کی تفصیل نہیں کی جا سکتی۔ مس زہرہ نے سمجھا کہ اس جانکاہ حادثہ نے اُس کے نظامِ عصبی میں خلل پیدا کر دیا ہے۔ وہ واقعات سے ناواقف تھی۔ اُس نے بہت چاہا کہ حسینن کا دل بمبئی کی مختلف رنگینیوں میں بہل جائے مگر حسینن ثریا کی آخری صورت نہ بھول سکا، اُس نے بمبئی میں زیادہ قیام نہیں کیا، اور سکون کی امید میں لاہور روانہ ہوا۔

جن لوگوں نے حسینن کو اُس کے بعد دیکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ وہ بالکل ایک نیا شخص معلوم ہوتا تھا، وہ ہنسنا بھول گیا تھا اور ہر وقت کسی چیز سے خائف معلوم ہوتا تھا۔ اب اُس کا چہرہ مظلومون کا سا تھا۔

حسینن کی آنکھوں کے سامنے ہر وقت ثریا کی صورت رہنے لگی۔ وہ ایسا محسوس کرتا کہ اُس سے خونبہا طلب کیا جا رہا ہے اُس کی یہ کیفیت ہر لمحہ بڑھ رہی تھی وہ ہر وقت زیرِ لب کچھ بکتا رہتا تھا۔ اپنے معمولات کی پابندیوں سے وہ آزاد ہو گیا تھا، ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اکثر سوتے ہوئے وہ ثریا سے اِن الفاظ میں باتیں کرتے سُنا گیا ہے "ثریا مجھے معاف کر دو اور جو کہو کرنے کو تیار ہوں، میرے حواس اب بجا ہوئے ہیں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے تم کو برباد کیا، مگر للہ صرف ایک بار موقع دو کہ اس کی تلافی کروں"۔

حسینن آئینہ کے پاس جاتے ڈرتا تھا اس میں اس کو اپنے عکس کے بجائے ثریا نظر آتی تھی اس حالت میں کہ اُس کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود تبسم ہوتا اُس کے ایک ہاتھ میں اُس کا مردہ بچہ ہوتا، اور دوسرا ہاتھ حسینن کی جانب بڑھا ہوتا۔

یہی نہیں حسینن کو ایک ایسی بیماری لاحق ہو گئی تھی جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ خواب میں چلنے لگا تھا، بارہا دیکھا گیا کہ رات کے وقت وہ یکایک سوتے سوتے بستر سے اُٹھ بیٹھا ہے اور غلام نبی کے مکان پر جا کر دستک دی ہے۔ دروازہ کھلنے پر وہ سیدھا ثریا کے کمرے پر پہنچ جاتا اور اس طرح "ثریا! ثریا!!" پکارنے لگتا کہ سننے والوں کے دل ہل جاتے۔ جب لوگ اس کو مجبور کر کے اس کے بستر پر پہنچا دیتے تو وہ ہوش میں آجاتا اس عالم میں اس سے جو حرکتیں سرزد ہوتی تھیں اُس کو مطلق یاد نہیں رہتی تھیں۔ ثریا کو مرے ہوئے تین ماہ گذر گئے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ صبح کے چار بجے ہوں گے۔ ہر شخص اپنے اپنے بستر پر سو رہا تھا۔ یکایک حسینن کے سونے کے کمرے سے چلانے کی آواز آئی "دیکھو! دیکھو!! ثریا مجھے قتل کر رہی ہے" معاً پستول کی آواز سنائی دی لوگ جلدی سے کمرے میں پہنچے تو دیکھا کہ حسینن زمین پر پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ نکل رہا ہے اور اُس کے داہنے ہاتھ کے پاس اس کا پستول پڑا ہے۔

مجنوں گورکھپوری

نگار کی توسیع اشاعت

میں حصہ لینا اگر ثواب نہیں تو گناہ بھی نہیں ہے اسلئے اگر آپ کوئی گناہ کر سکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ کام کبھی نہ کریں جو گناہ نہیں ہے۔

تنظیمِ تمدّن

جب ہم ان سالہاسال سے، جن میں حضرت انسان کی بود و باش اس کرۂ ارض پر یقین کی جاتی ہے، اور اس غیر معین زمانے سے، جس کو "پتھر یگ" کہتے ہیں گذر کر آتے ہیں تو پہلے ہی پہل ہم کو کچھ قومیں بستی نظر آتی ہیں۔ اور تاریخی مواد کسی نہ کسی شکل میں محفوظ مل سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے، جس میں آب و ہوا، جغرافی حالت اور قومی اختلافات کی مستثنیٰ مثالوں کو چھوڑ کر ساری دنیا کی طرزِ معاشرت میں یکسانیت نظر آتی ہے۔ مستثنیات نہ صرف تاریخ سے پہلے، بلکہ تاریخی زمانے میں بھی نمایاں ہیں لیکن یہ ہمارا بحث نہیں ان سے قطع نظر کر کے، یکسانیت معاشرت پر غور کرنا یہاں ہمارے مقصد کے موافق ہے، چین سے لیکر پیرِ ذنک[٭] جہاں جہاں نظری حالات نے دستیاری کی۔ اسی وقت بڑی بڑی قومیں تیار ہوئیں اور یہ سب کی سب ایک ہی قسم کے اصول اور عقاید پر چلتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان جغرافی حالتوں کو ذہن نشین کر لینا نہایت آسان کام ہے، جو ان قوموں کے قیام کا باعث ہوئیں۔ کسی مقام پر، اقوام کے قیام کے لئے یہ ضروری ہے، کہ چند ایسے اندرونی ذرائع موجود ہوں، جو باہم تبادلۂ خیالات میں مددگار اور ایک مشترکہ حکومت کے انعقاد کے لئے معاون ثابت ہوں ۔۔۔ دوسری اہم چیز زمین کی زرخیزی ہے، جو قوم کو، خانہ بدوشانہ زندگی کو ترک کر کے ایک جگہ جم جانے اور کچھ دولت جمع کر لینے کے قابل بنا دے۔ اس کے علاوہ، وہ مقام ایسا ہو، جو دوسری قوموں سے دور اور بیرونی خلل انداز حوادث سے محفوظ ہو۔ تاکہ اندرونی تمدن کو بنانیوالی قابلیتوں کی نشو و نما، کما حقہ ہو سکے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اس انسانی خدمت کا انجام دینا سر بفلک سلاسل کوہ، ناپیدا کنار ریگستان، بحر مواج اور دریا کی طاسین، قدرتی طور پر ایک دوسرے سے متحد ہو کر اپنے سر لیتے ہیں۔ اس کے بہترین نمونے ہندوستان، چین، مسوپٹامیا اور مصر کی مثالوں میں مل سکتے ہیں۔ جہاں طولانی دریا میدانوں میں آبیاری کرتے اور زمین کو دوامی زرخیز بنانے میں حصہ لیتے ہیں۔ اور جہاں اونچے اونچے پہاڑ اور عمیق سمندر ملک کی حد بندی کر کے، محافظت کا کام انجام دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو بہترین درے اور راستے بہم پہنچ جائیں۔ مذکورہ بالا واقعات کو پیش نظر رکھکر، جب ہم بحرِ روم کے ممالک پر تخصیصی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی ایک اسباب (جن میں جغرافی حصہ زیادہ ہے) آپس میں متحد ہو کر، بحیرۂ روم کے ممالک کو اولین موقع پر تہذیب و ترقیوں کا گہوارہ بنا دیتے ہیں۔ ترقی تہذیب کے اس مخصوص زمانے پر نظر غایر ڈالنے سے بحیرۂ روم کے مشرق میں مصر اور مسوپٹامیا جادۂ ترقی میں گامزن نظر آتے ہیں انہیں سے اور انہیں کے مماثل تہذیب جو بحیرۂ ایجین میں رائج تھی، اور جس کا مرکز و مخزن جزیرہ اقریطیس تھا اتصال پاکر وہ مشہور آفاق تمدن پیدا ہوا، جو آج "تمدن قدیم" کے نام سے موسوم ہے، گو موجودہ مقصد کے لئے مذکورۂ بالا دو ممالک ہی ہمارے پیش نظر ہیں، تاہم ان کے ہمعصر دوسری اقوام کے کارناموں کی تحقیر ہمیں منظور نہیں۔ کیونکہ بحیرۂ روم کی تہذیب میں مشرق بعید نے کسی نہ کسی

[٭] جنوبی افریقہ کے مغربی گوشہ میں ایک شہر ہے۔

طرح اضافہ کیا۔ جن کا معلوم کرنا اور سیکھنا ہمارا فرض ہے، لیکن چونکہ بحیرۂ روم سے اٹھنے والی تہذیبی رَو نے ساری دنیا پر اپنا تسلط جمالیا اور اپنے عنصر کو بعید نمایاں کر دیا، اسی لئے وہ لوگ جو اس کی ترقی کا راز معلوم کرنے کے درپے ہوں، ان کو چاہئے کہ انہیں دو اصولی سوتوں پر نظر جمائے رہیں اور باقی دوسروں کو فروعی سمجھیں۔

اس وقت، اور اس کے بعد یونان کے سطحِ تمدنی پر ابھر آنے تک، جو چیز ہم کو متاثر کرتی ہے وہ انسانی ترقی کی یکسانیت ہے۔ جب تک یونان اسٹیج پر نہ آچکا اور بحیرۂ روم کی فضا میں روحِ رواں نہ بن گیا، ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دنیا میں کوئی حدِ فاصل نہیں تھی۔ کوئی مہذب تھا اور نہ کوئی وحشی لیکن یونانیوں کے وقت سے یہ تفریق قائم ہوگئی۔ زیرِ بحث زمانہ میں، جبکہ مشرق اور مغرب کی تہذیب دوش بدوش چل رہی تھی، جو چیز ہماری توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیتی ہے وہ بحیرۂ روم کے اطراف کے ممالک کا سطحِ ارض پر ابھرنا ہے جس نے آئندہ عظیم الشان کارناموں کا بنیادی پتھر رکھا دریائے نیل اور دریائے فرات کی وادیوں کی ان دونوں عظیم الشان تہذیبوں میں اشتراک اس قدر نمایاں ہے کہ بعض غائر بین نظریں ان کو "بہن تہذیبوں" کے نام سے یاد کرتی ہیں۔ اور ان کو ایک ہی جدِ اعلیٰ کی اولاد تسلیم کر لینے میں انہیں کچھ پس و پیش نہیں ہوتا۔ یا اگر، بالفرض، ہم اس اشتراک کو محض اتفاقی سمجھ کر اس سے قطع نظر کر لیں اور ان کو دو مختلف اجداد کی بیٹیاں تصور کریں، تو بھی کم از کم اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان میں زمانہ قدیم سے، ہمیشہ تبادلۂ خیالات اور آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا۔

ان کی تاریخ میں انطباقِ واقعات کا مسئلہ نہایت پر معنی ہے اس کی جستجو ہم کو پانچویں ہزاری[۵۱] قبل مسیح سے، جس میں مدون تاریخ کا سب سے پہلا واقعہ جنم لیتا ہے۔ اور یہ "مصری تقویم" کی ترتیب ہے، دوسری ہزاری قبل مسیح کی ہلانی[۵۲] اور یہودی قبائل کی کش مکش تک لی جاتی ہے۔ جس وقت بڑی بڑی فتوحات ہوئیں اور مرکزی قوت قائم ہوگئی، مدون تاریخ کا سب سے پہلا واقعہ نہایت ہی دلچسپ ہے، کسی زمانہ میں "دنیا کی تخلیق" دو ہزار سال قبل سمجھی جاتی تھی۔ لیکن حقیقت میں "مصری تقویم" کا آغاز اس سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اولین موقع ہے، جس میں یقیناً، وہ لوگ جو اب سمیرئین[۵۳] کہلاتے ہیں، دریائے فرات کی نشیبی وادیوں میں بس چکے تھے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ایک اعلیٰ تہذیب کے تخم لیتے آئے تھے۔ اور سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کے پاس خطِ مثلث بھی موجود تھا۔

اپنے مواد کے لحاظ سے بھی ان دونوں تہذیبوں کی ارتقا بعید مماثل ہے، دونو جگہ، چھوٹے چھوٹے قبائل جو مختلف اجداد سے تھے، کسی فاتح سپہ سالار کی ماتحتی میں متحد کر دیے گئے تھے۔ جس کی قوت کے معاون چند ایسے مذہبی اعتقادات تھے، جن کی ترقی اور توسیع نے بعد میں انسان اور دیوتا (یا خدا) میں اس قدر قرب پیدا کر دیا کہ عملی طور پر ایک کو دوسرے کا مترادف سمجھا جاتا۔ فرمانروا عموماً اعلیٰ ترین دیوتا میں مدغم کر دیا جاتا۔ دونو جگہ ایک بڑی اور ایک چھوٹی سلطنت کا اجتماع اور اتحاد ایک مرکزی شہر کے اطراف میں ہوگیا تھا۔ جو ایک جگہ بابل اور دوسری جگہ ممفس کے نام سے موسوم ہوا۔ دونو سے ہر ایک شہر کا محلِ وقوع ندی کے دہانے سے کسی قدر دور ہٹ کر تھا۔ دونوں مقامات میں مذہبی پیشواؤں نے حکومت سے متحد ہو کر، دولت اور فرصت کے استعمال سے اپنے آپ کو سماوات کے مطالعے اور مذہب کے حلقۂ اثر کی توسیع اور ترقی میں منہمک کر دیا۔ دونو

۵۱ Mellenaium ۵۲ Hellenic جو بعد میں "یونانی" کہلانے لگے ۵۳ Sumarian

حالتوں میں ان مساوات کے مشاہدے اور مطالعہ نے آئندہ حکمت (Science) اور اس کی ترقی کے لئے بیش قیمت مواد فراہم کر دیا خصوصاً اس جہان بین کی دو فضاؤں میں جو نتائج اخذ کئے گئے وہ نسل انسانی کے لئے اہم ترین اور غیر فانی خدمات انجام دیتے ہیں موجودہ سائنس میں ترقی انہیں کے نیک آغاز کا انجام ہے۔ ان کی ایجاد تحریر کی ہماری تحریر ممنون۔ ان کے یہ مکتوبات ہیں جو اُن کے حالات کو ہم تک پہنچاتے اور خود اُن کی مختلف نسلوں میں جوڑنے والی کڑیوں کا کام دیتے ہیں، دونو۔۔۔۔ ہم کو اُن کی پچھلی زندگی میں ایسے فنی (Artistic) کارنامے بدست ہوتے ہیں جو غیر معمولی تازگی بخش اور لطیف ہیں اور جو بعد میں شہنشاہی بے اعتدالیوں اور ظاہر پرستی کی سخت پابندیوں کی وجہ سے ضائع کر دیے گئے۔

ایک دوسری قسم کی تطبیق ان دو عظیم الشان دریاؤں والی سلطنتوں میں یہ دیکھی جاتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے حدود پر ایک اور تہذیب تھی جو ان سے متاثر رہتی اور آئندہ یونانی تہذیب کے لئے بڑی مددگار ثابت ہوئی مصر کے سمندری رُخ پر فنیقیوں (Phoenicians) یا ایجین (Aegeans) سلطنت تھی اور بابل سے ملحق ایشیائے کوچک کی سطح مرتفع پر ہٹ ٹائیس آباد تھے۔ لیکن اُن کا حصہ اشاعتِ تہذیب میں ثانوی تھا، اور دونوں میں سے کسی کا حال بھی ایسی عمدگی سے نہیں معلوم ہو سکا جیسے رودِ نیل یا مسوپوٹامیا کی تہذیب کا۔ اور نہ یہ ایسی مکمل ہیں کہ گذشتہ ترقیوں کا لب لباب ان میں موجود ہو۔

انسانی ترقی کا یہ تیسرا عظیم الشان دَور ہے جس کے پہلے دو، قدیم اور جدید پتھر چکے ہیں۔ لیکن اس تیسرے دور کے متعلق ہمارے معلومات بہ نسبت پہلے دو کے بہت زیادہ وسیع، تفصیلی اور پُر معنی ہیں۔ جن لوگوں نے صبر اور استقلال کے ساتھ ساتھ تحقیق و تدقیق کر کے آثارِ قدیمہ کو روشنی میں لانے کی محنت گوارا کی ہے ان کے دو میش بہا صلے مصریات اور کلدانیات　　　　ہیں ان کی جد و جہد نے ایک طلسمات کو توڑا۔ راز ہائے سربستہ کو فاش کیا۔ قدیم مقبروں اور شہروں کے کھنڈروں نے اپنے مخفی خزانہ اگل دیے، اور بعض وقت لطیف اشیاء مثلاً مجسمے نفیس برتن، زیورات اور دیگر دھات کے اشیاء نے زبان حال سے اپنی سرگذشت بیان کی۔ کندہ کتبے اور پتھر، مٹی یا کاغذ[1] کے مکتوبات پڑھے اور سمجھے گئے۔ ان کے تاریخی بیانات کا مقابلہ دوسری شہادتوں سے کیا گیا خصوصاً وہ جو یونانی مصنفین کے ذریعے ہم تک پہنچتی ہیں اور جس میں انھوں نے کسی قبیلے، مقام یا کسی شخص کی طرف ذرا سا بھی اشارہ کیا ہو یہ طریقہ تدوین تاریخ کا نہایت علمی ہے اور بالکل وہی ہے جس کے ذریعہ سے متحجر اشیاء اور غاروں کے حالات جمع کئے گئے ہیں۔ اور ان نتائج کو زندہ جانوروں کے پہلو بہ پہلو رکھکر تاریخ کے مدون کرنے میں مدد لی گئی ہے، آثار قدیمہ میں جو کام کتبے انجام دیتے ہیں۔ وہی کام زندہ جانوروں کے ڈھانچے انجام دیتے۔۔۔۔۔۔ ہیں۔ جس طرح قلمبند واقعات سے اس وقت کے لوگوں کے خیالات اور ان چیزوں کے حالات کا ہم کو بخوبی پتہ مل سکتا ہے جن میں وہ دلچسپی لیتے تھے۔ اسی طرح جانوروں کے ڈھانچوں کے مطالعہ سے ہم کو ارتقائے تمدن کا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ دونوں صورتوں ہم ان بولتی ہوئی یادگاروں سے، خواہ وہ گذشتہ زندگی سے متعلق ہوں یا خیالات سے، منتشر مواد کو جمع کر کے اُن کی ترجمانی سے تاریخ مدون کر سکتے ہیں۔

---

[1] اس سے مراد خاص مصری "کاغذ" Papyrus ہے۔

مصر کا خطِ تصویری اور بابل کا خطِ مثلث دونوں گذشتہ چند ہی سالوں کی تحقیقات کا نتیجہ ہیں۔ لیکن انہیں تحقیقات کی بدولت مشہور آفاق ماہران آثار قدیمہ چیمپولین، اور گروٹ فنڈ نے، گویا طلسمایں کینیچکر ہم کو قدیم مصریوں اور بابلیوں سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ ہیرودوٹس اور دوسرے دو ہزار سال پہلے کے مصنفین سے بھی جنھوں نے ان کے حالات کا بخوبی مطالعہ کیا اور ان کو قلمبند کیا ہے یہ کام ناممکن تھا۔ لیکن ایک نکتہ اہم کے متعلق بھی مصریات قدیم کے یونانی ماہرین نے غلطی نہیں کی انہوں نے قدیم مصریوں اور ان کے ہمعصر اقوام کی تاریخ اور تہذیب کی ترقی کے سربستہ رازوں کو آشکارا کر دیا۔ اس قدیم خط میں جو کتبے انہوں نے مقبروں اور مندروں کی دیواروں پر کندہ پائے اور جن کا سمجھنا اُن کی قوت امکان سے باہر تھا اُن کو انھوں نے "مقدس تحریر" کہدیا درحقیقت اس خط کو مذہبی پیشواؤں نے پیدا کیا، اور مذہبی مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے، ان ماہرین نے مصریوں کے اتحاد کے اصلی راز کی طرف بھی بآئین شائستہ اشارہ کیا ہے جو مذہبی حکومت (Theocracy) کی اساسی قوت تھی۔

ہیرودوٹس، مصر کی تاریخ کے آغاز کرنے سے قبل ہی رقمطراز ہے کہ "مصری بیحد مذہب پرست لوگ ہیں، اور خداترس بھی سب سے زیادہ" صرف یہی ایک ایسی قوم تھی جس کے متعلق ہیرودوٹس نے خود تحقیقات کی تھیں۔ اس کی تحقیقات ہمارے سامنے ابتدائی مذہبی حکومت کا مکمل نمونہ پیش کرتی ہیں جو اپنے ابتدائی مراحل میں بیرونی اثرات سے قطعی منزہ ہے۔

جب ہم اس وقت کی سوسائٹی کو گذشتہ، غار یا جھیل میں بسنے والی خانہ بدوش سوسائٹی سے مقابلہ کرتے ہیں تو ہیرودوٹس کے خیال کی لفظاً تائید ہوتی ہے ان لوگوں میں مذہبی احساس اور اثرات نمایاں نظر آتے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے مادیات کے دامن کو بھی بالکل چھوڑ نہیں دیا چنانچہ اُن کی ساختہ لطیف اشیاء کی نزاکت اُن کے مضبوط اور رفیع الشان عمارات اور اُن کے وسیع قوانین معاشرت اس کا ثبوت ہیں مگر ان تمام کی مرکزی، اور محیط قوت صرف مذہب ہے۔ جو اُن کو اکساتی اور متحد رکھتی رہی۔ اس زمانہ میں مشرق سے لیکر مغرب تک ہر چیز اسی رنگ میں ڈوبی نظر آتی ہے اسی لئے اس عہد کو "مذہبی حکومت" (Theocracy) کا زمانہ کہتے ہیں۔ اس کے معنی دنیاوی حاکم کا آسمانی دیوتا کے ساتھ مدغم ہو جانا ہے۔ اس عقیدے کو یہ لوگ اپنے ایمان کا ایک ویسا ہی جزو لاینفک خیال کرتے تھے جیسے آج ہم کسی عقیدے کو۔

تاریخ کے کسی مرحلہ میں ہم کو انسانی استبداد پسندی کے جوش کی ایسی نمایاں مثال نہیں ملتی۔ مذہبی حکومت میں سوسائٹی کی ساری عمارت ان خیالات پر ٹکی ہوئی نظر آتی ہے، جن کا جزو اعظم خود ساختہ معبودوں اور بھوتوں وغیرہ پر ایمان لاتا تھا۔ چنانچہ اس کا پتہ سب سے پہلی مہذب قوم (یونانی) کے معتقدات سے بھی چل سکتا ہے۔ اسلاف کے رسم و رواج جو محفوظ کرکے جمع کر لئے گئے تھے اُن کے تغیر و تبدل سے جو شکل بنگئی وہ بمنزلہ ایک زرخیز قطعہ زمین تھی جس میں یونانی عقاید کی تخم کاریوں اور آبیاروں نے وہ ثمر پیدا کئے جو ایک مدت تک علمی دنیا پر مسلط رہے اور جن کو آج علمی دنیا (Greek Mythology) کے نام سے موسوم کرتی ہے۔ ان قدیم مصریوں، بابلیوں اور دوسری جن مشرقی اقوام نے آئندہ یونانی کی ترقی کے لئے راستہ بنایا اور صاف کیا، انہوں نے حقیقت میں انسانی تہذیب کا بنیادی پتھر رکھا جس پر آئندہ سربفلک کشیدہ عمارتیں تیار ہونے والی تھیں، جو مہتم بالشان خدمات اس وقت مشرقی اقوام نے انجام دیں اُس کے لئے کوئی دوسری قوم اپنی مخصوص اور محدود قابلیتوں کے لحاظ سے قطعی ناموزوں تھی، انسانی تنظیم کے اعتبار سے بھی اُن کی خدمات پسندیدہ ہیں۔

اجتماع اور اتحاد انسانی کے بعد جو سوسائٹی انہوں نے بنائی وہ وسعت میں ان تمام سوسائٹیوں سے زیادہ تھی جو آج تک سطح ارض پر نمودار ہوئی تھیں۔ اور جس کا محض خیال ہی ہم کو ان کے بار احسان سے سر اٹھانے کی مجال نہیں دیتا۔ اس خاص کام کا یونانیوں سے انجام پانا، خواہ وہ کتنے ہی ہوشیار کیوں نہ ہوں قطعی ناممکن تھا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ مصریوں سے تحریر کی ایجاد نہ ہوتی، تو اس کا بہت امکان تھا کہ یونانی اسکو پیدا کر لیتے چنانچہ قیام اقریطیس کے زمانے میں انہوں نے یقیناً یہ کام کیا اور یہ بھی ناممکن ہے کہ کلدانیوں کی مدد کے بغیر یونانی دائرے کو ۳۶۰ حصوں میں اور سال کو مہینوں وغیرہ میں تقسیم کرنا سیکھ لیتے ہیں، لیکن ایسا مرکزی حکومت کے اطراف میں وسیع انسانی سوسائٹی کا قائم کرنا جو علمی (Scientific mind) قابلیت کے منافی ہے مذہبی بنیادوں پر سوسائٹی کو ترقی دیتے ہوئے قدیم مصریوں اور بابلیوں نے انسانی تنظیم کا کام انجام دیا۔ اور اسکندر، فارسیوں اور روسیوں کی علمی خواہشات کے لئے ایک سطح نظر قائم کر دیا۔

بہرحال اس موقع پر انسانی تنظیم کے آغاز کا سراغ لگاتے ہوئے ہم اس بات پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ لوگوں کے مذہبی معتقدات کو بلند ترین جگہ دیں۔

خود ساختہ معبودوں کی پرستش کے خیال اور قدیم لوگوں کی خوش اعتقادیوں کی بنیادوں پر نہایت مخلوط اور باضابطہ مذہبی طریقے اٹھائے گئے جو ان قبائل اور ان حکمرانوں کی قسمتوں پر مسلط ہو گئے، جنھوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کو اختیار کر لیا۔ ان مذہبی معتقدات کے معرض وجود میں آنیکے کئی اسباب ہیں، جو غیر محدود زمانے سے متعلق ہیں نہ کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے بعض فلسفیوں کے خیال کے موافق کہ یہ مذہبی طریقے پیشوایان مذہب نے اپنے ذاتی مفاد کی تکمیل کے لئے پیدا اور شائع کئے تھے۔ حقیقت میں یہ مذہبی طریقے جو مذہبی حکومت کے زمانے کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو ہم یونان اور روما کے لاتعداد معبودوں کی پرستش میں ملاحظہ کر سکتے ہیں بے معنی نہیں، یہ وہی طریقہ ہے جس میں سورج اور سیارے دنیاوی دیوتاؤں میں بلند رتبہ سمجھے جاتے ہیں۔ اور روزانہ زندگی انہیں کے قبضۂ قدرت میں مانی جاتی ہے اگلے فلسفیوں کے لئے درخت، ندیاں، اور آباد زمین، طاقتور دیوتاؤں کی اہمیت رکھتے تھے اجرام سماوی میں سب سے پہلی چیز جس نے ان کے دلوں پر سکہ جمایا اور تخیلات کا مرکز بن گئی چاند ہے۔ اس کی حرکات آسانی سے معلوم ہو سکتی تھیں، اس کی حکومت تاریک راتوں میں دوسرے چھوٹے چھوٹے اجرام سماوی پر ظاہر تھی، لیکن مسلسل غور و فکر اور عقل کی پختہ کاری نے آخر کار اس برتری کو محسوس کیا جو آفتاب کو دوسرے اجرام پر حاصل تھی مصریوں اور بابلیوں نے اپنی ہمعصر اقوام کے ساتھ اس مرحلے کو طے کر لیا تھا۔ ان لاتعداد مقامی اور قبائلی دیوتاؤں میں جنھوں نے اپنے پرستش کرنیوالوں کی قسمتوں پر تسلط جما لیا تھا "سورج دیوتا" (Sun - God) کا رتبہ کسی کو نصیب نہ ہو سکا۔ مصری شہنشاہ، فرعون کو اسی دیوتا کے ساتھ مدغم کر دیا گیا تھا۔ انسان کو دیوتا کے رتبہ (Deification) تک پہنچانیکا آغاز، سب سے پہلے فرعون کی موت کے بعد ہوا، اور اس خیال کی ابتدا ہوئی جس کی بنا پر مردوں کے لئے بہترین ضروریات زندگی کے بہم پہنچانے اور ساتھ دفن کرنیکا رواج شروع ہوتا ہے، جو دنیا کی عجائبات میں سے ہے۔ اور جس کی وجہ سے مصریوں کی قدیم تاریخ محفوظ ہو گئی اس میں شبہ نہیں کہ پیشوایان مذہب نے اس کو ترقی دینے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک زمانہ میں مصر کی ساری زمین کا ایک تہائی حصہ ان کے قبضۂ اقتدار میں تھا۔ یہ زمینیں ان دیوتاؤں کے نام پر وقف تھیں جنکے یہ پوجاری کہلاتے تھے۔ معتقدات کی مضبوط اور معاشرتی یکجہتی جو اس طریقۂ مذہبی کا اہم جزو ہیں، اگر ان پر غور کیا جائے

تو معلوم ہوگا کہ ان کے مقابلہ میں پیشوایان مذہب کی خود غرضانہ کارروائیاں اور مکاریاں جن کا اظہار وقتاً فوقتاً ان سے ہوتا رہا ہے، بہت پیش پا افتادہ ہیں، یہ بات قابل توجہ ہے کہ مصر میں، جہاں مذہبی اقتدار کو عمدگی سے محسوس کیا گیا تھا معاشرتی تنظیم ایک عرصہ تک قائم رہی، اور چونکہ مصری اپنے مذہبی اصول کے سختی سے پابند تھے۔ اسی لئے ان کو یہ معاوضہ عطا ہوا کہ ان کی سوسائٹی مدت مدید تک متحد رہی۔

تنظیم تمدن اور اجتماعی اقوام دونوں جو مذہبی احساس پر مبنی تھے یہی دو چیزیں اس دور ترقی کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ لیکن احوال کے تغیر کی وجہ سے مختلف مقامات میں ان کی نمائش مختلف طور سے ہوئی اسی وجہ سے خاص خاص مقامات کے تمدن میں خاص خاص خصوصیات نمایاں ہیں، مشرق میں اس کے اثرات "ذات" کی شکل میں رونما ہوئے۔ جو یہاں کی معاشرتی استبدادیت کو برقرار رکھتی ہیں مگر ذات کا طریقہ مصر میں مفقود تھا گو مذہبی پیشواؤں کے خاندان میں توارث کی رسم مروج کمال پر تھی اور عام طور سے پیشے موروثی ہوا کرتے تھے مثلاً کسان کا لڑکا کسان اور مرشد کا بیٹا مرشد ہوتا، تمدن انسانی کا یہ سادہ طریقہ اسلاف پرستی کے دوش بدوش چلتا ہے حقیقت میں یہ دونوں چیزیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ نسل انسانی میں یہ احساس ترقی پذیر ہے کہ "ماضی ہمارے ساتھ زندہ ہے" اور یہ کہ "ہم غیر فانی روح کی ایک وقتی نمود ہیں، اور جو کچھ ہم میں ہے یا ہمارے پاس موجود ہے سب کچھ اسی کا ہے" اس احساس میں مصر بہت دور نکل گیا تھا۔ چین میں اسلاف پرستی ایک واعظانہ مقصد کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ لیکن دنیا کی کسی قوم نے بھی کبھی ایسی مستعدانہ اور عظیم الشان سعی اپنے عظمت مآب بزرگوں کے محفوظ کرنے اور ان کی یادگاروں اور باقیات الصالحات کو دوامی بنانے کی نہیں کی ہوگی۔ جیسی مصریوں نے اہرام مصری، چٹانی مقبروں اور ممیوں کی شکل میں کی۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے اپنے آپ کو فنا کر دیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہ آج تک باقی ہیں۔ ہم ان کے تفصیلی حالات کو بھی ان کی ہر معاصر قوم سے زیادہ عمدگی سے جانتے ہیں۔ ان کے مقبرے اس زمانے کی فنی ارتقاء و ادبیات کے بیش بہا خزانے ہیں۔ زیورات، کانچ کے ظروف، اسباب معاشرت (فرنیچر) اور اسی قسم کی بہت سی اشیاء جو مردہ کی زندگی میں کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں سب ان میں موجود ہیں ان کے ساتھ ایک خاص قسم کا کاغذ بھی رکھا ہوا ہوتا ہے، جس میں مردے کا نام اور اس کے کارنامے درج رہتے ہیں، وہ غیر مسطح پہاڑیاں جو ریگستان کی طاس کی حدبندی کرتی ہیں ایسے بیشمار مقبروں سے بھری پڑی ہیں اور میدان اہرام مصری سے جن کی تعمیر مذکورہ بالا نکتہ نظر سے کی گئی تھی یہ تعمیرات اور خاصکر وہ رفیع الشان اہرام جو (.... ق م) قبل مسیح کی تعمیر ہیں، مصریوں کے اس سیاسی اور معاشرتی طریقوں کے معراج کمال پر پہنچ جانے کی دلیل ہیں جو مذہب پر مبنی تھا، اور جس کی بدولت ایک قدیم ترین سلطنت دور تہذیب کی ترقی ہوئی، یہ عمارتیں مادی شکل میں اس جوش کی ترجمانی کرتی ہیں جو ان لوگوں کو ماضیات کے محفوظ رکھنے اور اس کی عظمت میں چار چاند لگانے پر ابھار رہا تھا۔ ان میں کسی مقصد جمہوری کے لئے شخصی غلامی اور انقیاد کی پوری جھلک موجود ہے ہمارے پاس ان کی عظمت خصوصاً اور زیادہ تر اس وجہ سے ہے کہ وہ کسی ضخیم کتاب سے بھی زیادہ، اس دور کے لوگوں کی دماغی وسعت اور عملی قابلیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

اہرام اپنی شاندار عمارات، صاف بناوٹ، سادہ طرز، پتھروں کے عمدہ اتصال، تناسب، مضبوطی اور استقامت میں اس سوسائٹی کی ناموزوں تصویریں نہیں جس نے ان کو تعمیر کیا تھا۔ یقیناً وہ اس ملک کی فطری خصوصیات کی قوی ترین مثالیں ہیں، جس کو متفقہ روایات نے فن صناعت کا گہوارہ تسلیم کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حکمت (Science) اپنے حقیقی معنوں میں یونانیوں کا پیدا کردہ فن ہے۔ لیکن نسل انسانی نے ازمنہ قدیم ہی سے گرد و پیش کی اشیاء کی علمی تحقیق و تدقیق شروع کر دی تھی، اس لئے یہ بجا طور پر حکمت کے پیش رو کہلا سکتے ہیں۔ مصریوں نے انہیں نقش قدم پر گامزنی کی جو اُن کے اسلاف چھوڑ گئے تھے اور دوسری قومیں بھی انفرادی طور اسی راستہ پر چلتی رہیں، لیکن مصریوں کا ماحول اس خاص فضا میں اُن کی ترقی کا معاون ہوا۔ رود نیل کی پے در پے طغیانیوں نے عجیب طوفان برپا کر رکھا تھا، ہر طغیانی کے بعد پیمائش آراضیات کی ضرورت ہوتی۔ دوسرے اُن میں پیشوایان مذہب یا مرشدوں کے ایک زبردست گروہ کو ترقی ہو رہی تھی یہ گروہ حکمت کے باضابطہ فن تک پہونچنے کے قبل مصر میں اور ہر جگہ مشاہدات سماوی اور مساحت و پیمائش کے نتائج کو جمع کرنے میں کوشاں رہے یہی تاریخ تھے جن پر آئندہ سائنس کی داغ بیل پڑی۔ اقلیدس میں مصریوں کی قابلیت کو نظریاتی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ "عملی" حیثیت سے جانچنا چاہئے۔ اصول اور نظریوں کے لحاظ سے وہ بہت پیچھے ہوں لیکن عظیم الشان اہرام کے عمارات کی تعمیر میں، پتھروں کا ایک دوسرے کے ساتھ اتصال، اُن کی صفائی، آلات جرثقیل کا فراہم کرنا جن کے بغیر پتھروں کا اس بلندی تک پہنچانا قطعی ناممکن تھا۔ ایسے کارنامے ہیں جو اُن کی اعلیٰ ترین عملی قابلیت کا ثبوت ہیں۔ اس امر کا یقینی ثبوت نہیں ملتا کہ ان کی یہ عملی قابلیت کس پایہ تک ترقی کر چکی تھی لیکن ہم یقینی طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کی کوئی اثباتی شہادت نہیں دستیاب ہو سکتی کہ اہرام کے بنانیوالے معماروں اور انجنیروں میں اصولوں اور نظریوں کا تصور پایا جاتا ہو، زاوئے کو انہوں نے "ڈھلوان" کہا ہوگا۔ اور مسافت زاویائی کو دریافت کرنا ان کے حد امکان سے باہر تھا۔ مساحت اور پیمائش کے اصول کو یونانیوں نے دریافت کیا۔ جس کا سہرا حسب روایات تھیلیس (Thales) کے سر سمجھا جاتا ہے۔ وہ کہانیاں جن سے مصریوں کے "ہیئتی مساحت" (Astronomical measurement) کے حالات معلوم ہوسکتے ہیں کہ رات اور دن کی مختلف ساعتوں کا پتہ چوکیدار کے جسم کے مختلف حصوں پر سے چند معین ستاروں کے گذرنے سے لگایا جاتا یہ شخص زمین پر بٹھا دیا اور اس کے روبرو سایہ نما (Gnomon) رکھدیا جاتا۔ پھر ستاروں کے مقامات کا پتہ اس طرح اظہار کیا جاتا۔

"بیچ میں" "بائیں آنکھ پر" یا "سیدھے کندھے پر" اور علی ہذا

اگر مصری فن اقلیدس یعنی زمین اور زمین سے متعلق اشیاء کی پیمائش اور مساحت میں پیش رو خیال لئے جاتے ہیں تو بابلیوں کی اہمیت سماوات اجرام سماوی کی پیمائش اور اُن کے مسافتوں کو معلوم کرنے میں بہت بڑھی ہوئی ہے جس خطۂ ارض میں اُن کی نشو و نما ہوئی تھی اس کے وسیع میدان ستاروں کے مشاہدے اور مطالعہ کے لئے نہایت موزوں تھے۔ علاوہ ازیں یہ لوگ اس خانہ بدوش گروہ کے ساتھ میل جول رکھتے تھے جن کے لئے ستارہ بینی ایک قدیم اور دلچسپ مشغلہ تھی۔ قدیم ترین ازمنہ ہی سے بابلیوں کے پاس وہ سات منزلہ مندری مینار موجود تھے جو رصدگاہوں کی خدمت انجام اور اُن کی تعظیم سبعہ سیارہ کی گواہی دیتے تھے۔ ہفتے کو سات دنوں میں منقسم کر کے انہوں نے ساری دنیا کو ممنون کرلیا۔

لیکن مصریوں کی طرح خالدیہ میں بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنے مشاہدات کو کسی حکمتی تجربہ کی صورت میں مدون کرنے کی کوشش کی ہو۔ یا انہیں اجرام سماوی کے خواص اور واقعات کے اسباب و علل کے متعلق کوئی فلسفیانہ معلومات حاصل تھے۔ بلکہ دونوں جگہ اجرام سماوی کا مطالعہ خوش عقیدگی اور ان سیاروں کے فرضی اثرات کی وجہ سے تھا۔ ستاروں کا مطالعہ اس غرض سے نہیں ہوتا

تھا کہ اس سے کسی فن کے متعلق معلومات حاصل کئے جاسکتے تھے، بلکہ اس وجہ سے کہ حیاتِ انسانی پر اُن کے فرضی اثرات تسلیم کئے جاتے تھے اسی
لئے خالدیہ کے پیرانِ طریقت نجوم کے پیش رو کہلائے جاسکتے ہیں، نہ کہ ہیئت کے۔ لیکن جیسا کہ عام طور سے فنون کی تاریخ میں ہوتا آیا ہے، مقصد
معینہ کی بہ نسبت اُس کے ضمنی اثرات زیادہ مفید ثابت ہوئے۔ جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ہے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ تنظیم اور اجتماعیت کا اضافہ
اُن تہذیبوں نے اپنے حصہ کے طور پر ترقی عامہ کے مشترک انبار میں کیا ہے تو اس امر کا معلوم کرنا نہایت آسان ہو جائیگا کہ مساحت نجوم اور ایجاد
تحریر نے اس میں کہاں تک امداد دی۔ جس مقام پر بہت سے ایسے افرادِ انسانی کا باضابطہ اجتماع ہو جائے، جن کا مشغلہ کاشتکاری ہو تو وہاں
پیمائش اراضی ضروری ہے، اسی طرح عام مشترکہ خصوصاً مذہبی رسومات کے لئے وقت اور ساعت کا تقرر اور تقسیم لازمی چیز ہوگی، چنانچہ مصری
تقویم کی ابتدا اسی غرض کی تکمیل کے لئے کی گئی تھی، ہفتے کو سات دنوں میں تقسیم کرنے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ سات سیارے جو آسمانی دیوتا ولسا
میں بلند ترین پایہ رکھتے تھے اُن میں سے ہر ایک کے لئے ایک دن مخصوص کر دیا گیا تھا جس پر اس کی حکومت تسلیم کی جاتی تھی۔ مصر میں مہینوں
کے نام اُن بڑے تہواروں کے نام پر رکھے تھے جو اُن میں منعقد کئے جاتے جوں جوں زمانہ گزرتا گیا، حکمراں نہایت اہم اور آسمانی ہستی سمجھا
جانے لگا۔ اس کی حکومت اُس کے کارناموں اور خود اُس کی زندگی کے واقعات کو بالتفصیل مدون کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی اُس کے
رسومات نجومی تقویم کی رو سے منعقد کئے جاتے۔ چونکہ یہ تمام چیزیں جسم قومی کے اعضا بن گئے تھے لہٰذا اُن کے پورا کرنے کے لئے اجرامِ سماوی
کے ٹھیک اور مسلسل مشاہدے کی سخت ضرورت تھی اور اسی مقصد کی تکمیل کی غرض سے سایہ وغیرہ کو ناپنے کے لئے چند ساختہ معاونین کی ایجاد
کی گئی۔ یہی میدان بابلیوں کی عملی قابلیتوں کا جولانگاہ بن گیا۔ اور یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے (Circle of Heaven) کو (۳۶۰)
حصوں، اور وقت کو سال، ہفتوں، دنوں اور ساعتوں کے انہیں حصوں میں تقسیم کیا۔ جن کو ہم ابھی تک استعمال کرتے ہیں۔

قدیم مذہبی دورِ حکومت کے یہ کارنامے یعنی نجوم اور مساحت، جس قدر مہتم بالشان ہیں، اُن سے زیادہ ایجادِ تحریر ہے۔ جس کے بارِ احسان سے
جنسِ انسانی کی سبکدوشی ناممکن ہے یہ تحریر پریشان کن اور غیر مفہوم اشکال اور اشاروں کے مراحل طے کرتی ہوئی، آخری ہزاری قبل مسیح کے
شروع میں سادہ، آسان اور پڑھنے کے قابل شکلیں اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ وہی زمانہ ہے جبکہ یونانیوں نے پرانے رسومات، عادات اور خرافات کے
قیود کو توڑنا پھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات قابلِ یادداشت ہے کہ پرسی پولس[1] کی چٹانوں کے کندہ کتبے جو صرف ایک صدی قبل ماہرینِ آثارِ قدیمہ
کے اکسانے اور خطِ مثلث کے رازوں کو طشت از بام کرنیکا باعث ہوئے، اس وسیع ترین مگر کم ترین تنظیم یافتہ مذہبی سلطنت کے شہنشاہوں کی
یادگاریں ہیں جن پر یونانیوں نے حیاتِ قومی کی کشمکش میں حملہ کیا تھا۔ خطِ مثلث کی یہ تحقیق جو خطِ تصویری ہی کے اصول پر ہوئی اپنے معنوں کے
افشائے راز کے علاوہ اور کئی پریشان گتھیوں کے سلجھانے میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ ان محنت شاقہ اُٹھانے اور خداداد قابلیتوں سے کام لینے
والوں کی اَن تھک کوششوں کا یہ صلہ ملا کہ قدیم واقعات کی توثیق اور جدید واقعات کے انکشاف سے گویا، ایک "جہانِ دیگر" وجود پذیر
ہو گیا۔ جو آج عجائب خانہ لوور[2] میں قوانین شاہ ہامورابی[3] کی شکل میں محفوظ ہے۔ یہ دونوں خط اپنی تخلیق کے وقت بہ لحاظ حالت ایک جیسے تھے۔ مگر

---

[1] Persepolis خالدیہ کا مشہور شہر جو اُسکا پایہ تخت بھی تھا　[2] Louvre فرانس کا ایک عجائب خانہ

[3] King Hamurabi خالدیہ کا حکمراں جس کے عہد میں بہت سی تنظیمات ہوئی تھیں۔

رفتہ رفتہ تاریخی اختلافات کی وجہ سے جس تہذیب کے ماحول میں انہوں نے پرورش پائی اُس کی مجسم مثال بن گئے۔ مصری تحریر نے اپنی بہت سی پیدائشی خصوصیات کو محفوظ رکھا اور مصریوں کی طرح اپنے پیدائشی وطن سے قدم باہر نکالنا گوارا نہیں کیا، لیکن خط مثلث وسیع ممالک میں منتشر ہو گیا۔ جن جن قوموں نے اُس کو اپنی گود میں لیا۔ اُس کو اپنی طور پر پال پوس کر بڑا کیا اور یوں اس نوجوان نے اپنی ساری جبلی عادتیں عادتیں کھو دیں۔ حتیٰ کہ دو ہزار قبل مسیح ہی میں جس وقت شاہ بابو رابی کی معاشرتی تنظیمات قلمبند کی جا رہی تھیں، یہ کوہ آرمینا۔ ایشیائے کوچک اور خود مصر کے شمالی حدود تک پہنچ گئی تھی۔ مصر کے خط تصویری کی ایجاد اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ مصریوں میں نقشہ کشی کس حد تک ترقی کر چکی تھی؟ مصری خط، ارتقا کے مختلف مدارج میں مختلف شکلوں میں نمودار ہونے کی وجہ سے متاخرین کے لئے کسی قدر پریشان کن بن گیا ہے۔ پہلے تو مصری جس شئے کے متعلق کچھ کہنا چاہتے اُس کی تصویر کھینچ دیتے بعد میں یہ تغیر ہوا کہ مطلوبہ شئے کا اظہار اُس کی فرضی تصویر کے ذریعہ کیا جانے لگا۔ آخر کار خاص خاص چیزوں کے لئے خاص خاص علامات مقرر کر لی گئیں اور یہی حروف کا کام دینے لگیں۔

ان دونوں عظیم الشان سلطنتوں کی تہذیب اور تنظیم پانچویں ہزار قبل مسیح میں عروج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ لیکن ؏

"محفلیں بنتی ہیں بے شبہ بگڑنے کے لئے"

دوسری ہزار قبل مسیح سے ان کی اہمیت ایک دوسری قوم کے حصہ میں آجاتی ہے اور ہماری دلچسپی بجائے مشرق کے، مغرب کے اس خطہ ارض میں منتقل ہو جاتی ہے جو بعد میں "یونان" کے نام سے مشہور ہوا۔ اور ایک ہزار سال تک اپنی ہیبت کا سکہ ملکی دنیا پر جمائے رہنے کے بعد روما کو جائزہ دیکر خود گوشہ نشین ہو گیا۔

(ماخوذ)　　　　محمد عبدالقادر سرور بی۔ اے

غزل

میری بینائی میں شامل ہے جمالِ روئے دوست　　　آنکھ کا اک جزو ہے گویا خیالِ روئے دوست

پتے پتے پر ہے درسِ معرفت لکھا ہوا　　　ذرے ذرے میں چمکتا ہے جمالِ روئے دوست

پرتوِ نورِ ازل سے آب و گل کے گل کھلے　　　جوششِ نشو و نما ہے پائمالِ روئے دوست

کتنا مستحکم ہے رشتہ خالق و مخلوق میں　　　دوست کی صورت سے ظاہر ہے جمالِ روئے دوست

بند ہو جائیں گی آنکھیں تابشِ نظارہ سے　　　پھر سمجھ جائیگا تو کیا ہے جمالِ روئے دوست

بند کر لے آنکھ اکبر اور پھر نظارہ کر
دوست کے دل میں نہاں ہوگا جمالِ روئے دوست

اکبر حیدری

میر بیدانہ

سیّد لطافت حسین پُرانی وضع و قطع کے بزرگ تھے، لیکن تھے نہایت وسیع معلومات کے انسان اور قدیم و جدید علوم دونوں سے باخبر۔ اخلاق کے لحاظ سے جو اوصاف ایک سید میں ہونے چاہئیں وہ سب اُن میں پائے جاتے تھے، متین اور سنجیدہ روش کے ساتھ ہر شخص سے گھُل کر ملنا ہم عمر لوگوں کے ساتھ تلطف، چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام، یہ اُن کی وہ خصوصیات تھیں جن سے ہر شخص واقف تھا، جس سے جو رسم ایک مرتبہ قائم ہوگئی، اُس میں کبھی فرق نہ آنے دیتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ اپنی غرض کسی کے سامنے نہ لیجائیں، ہمیشہ روپیہ پنشن کے ملتے تھے، اور اس میں کسی نہ کسی طرح سیدانی پورا کرتی تھی، میر صاحب کے مزاج میں شگفتگی بھی بہت تھی، اور بعض لوگ اُن سے مذاق بھی کر لیتے تھے چنانچہ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اُن کے دانت گر گئے تو اُن کے کسی دوست نے اُن پر "میر بیدانہ" کی پھبتی کہی اور یہ اس قدر مشہور ہوئی کہ قصبہ کا ہر شخص اُنھیں میر بیدانہ کہنے لگا، لوگ اُن کے سامنے بھی کہتے تھے، اور وہ ہنسکر ٹال جاتے تھے، لیکن باوجود ان تمام صفات کے ہر شخص اُن سے ملتے ہوئے گھبراتا تھا اور اگر دور سے بھی اُن کی صورت دیکھ لی تو راستہ کترا کر نکل جاتا۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ بات شروع کرنے کے بعد وہ ختم کرنا جانتے ہی نہ تھے اور سلسلۂ گفتگو میں وہ ایسی پیچ در پیچ کڑیاں پیدا کرتے ہوئے چلے جاتے تھے کہ ایک شخص گھبرا جاتا تھا اور آئندہ کے لئے توبہ کر لیتا تھا کہ ان کو کبھی اپنی صورت نہ دکھائیگا۔ بڑی بی سیدانی کا بھی ناک میں دم تھا اور روز وہ انھیں سمجھاتی تھی کہ خدا کے لئے یہ عادت چھوڑ دو، میں تو خیر کسی نہ کسی طرح گوارا کر لیتی ہوں، لیکن دنیا کیونکر اسے برداشت کر سکتی ہے۔ تم زمانہ کی تو شکایت کیا کرتے ہو کہ جسے دیکھئے مُنہ چراتا ہے، لیکن تم اپنی زبان کو تو دیکھو کہ وہ لوگوں کے لئے ایک مستقل مصیبت ہو کر رہ گئی ہے، مگر میر صاحب کی سمجھ میں کبھی یہ بات نہ آئی کہ اُن پر کیوں الزام قائم کیا جاتا ہے۔

بارش کا زمانہ تھا، ایک دن صبح کو اُٹھے تو کسلمند تھے اور کچھ آثار نزلہ کے پائے جاتے تھے۔ سیدانی نے مضمحل دیکھکر دریافت کیا کہ "کیوں کیسی طبیعت ہے"، یہ سُنکر میر صاحب نے فرمایا کہ:-

"کل شام کو جو میں گھر سے نکلا تو بارش دفعتہً آگئی، یہ ساون کا مہینا، اور کنوار کے سے جھالے! ہماری جوانی میں ساون ایسا نہ ہوتا تھا، کالی کالی گھٹائیں گھنٹوں پہلے سے امنڈ امنڈ کر آنا شروع ہوتی تھیں، لوگ دیکھکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جاتے تھے یا کہیں ایک جگہ جمع ہو کر جھولے ڈالتے تھے کھانے پکتے تھے۔ ناندیں آموں سے بھر دی جاتی تھیں۔ خدا بخشے آباد خاں مرحوم کو عجیب سیر چشم رئیس تھے انہیں کے ہاں اکثر ہجوم ہوا کرتا تھا اور بغیر ہمارے تو نوالہ نہ توڑتے تھے۔ اب نہ ویسے رئیس ہیں اور نہ وہ سیر چشمیاں، ہائے یہ زمین بھی کیسے کیسے آسمان کھائے بیٹھی ہے مجھے خوب یاد ہے جیسے کل کی بات ہو کہ برابر ایک ہفتہ سے ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ احباب کا مجمع تھا چُہلیں ہو رہی تھیں باغ میں ایک طرف خورشید، جدن ننھی اور چھٹن پکوان کی تیاریوں میں مصروف تھیں، دوسری طرف مشتری اور ہرمزی جھولوں پر ملار کی تانیں اڑا رہی تھیں، جس وقت انہوں نے

"کوئلیا کوک سنا دے" شروع کیا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادل امنڈ امنڈ کر آ رہا ہے، کیا آواز تھی، کیا خداداد مُرکیاں گلے میں پڑی ہوئی تھیں، اب یہ فن بھی بالکل معدوم ہوتا جاتا ہے، غضب خدا کا لکھنؤ جہاں سے واجد علی شاہ کے زمانہ میں ٹھمریوں کی ابتدا ہوئی، وہاں بھی اب سوائے غزلوں اور قوالیوں کے اور کچھ نہیں سنائی دیتا، گانا کیا ہوتا ہے عرس ہوتا ہے، ہائے کیا مُردنی لوگوں کے ذوق پر چھا گئی۔ میں نے خود وہ زمانہ دیکھا ہے زیادہ دنوں کی بات نہیں کہ ابھی شاہ مینا کے مزار پر سوائے خیال اور ٹھمری کے اور کوئی چیز گائی نہ جاتی تھی، یا آج یہ حالت ہو گئی ہے کہ لکھنؤ کی اچھی سی اچھی گانے والی عورت بھی وہاں ہیجڑوں زنخوں کی طرح تان بجا بجا کر "اللہ دا" "اللہ رے وا" کرنے لگتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان صوفیوں نے لوگوں کے اخلاق درست کئے ہوں یا خراب، لیکن موسیقی کے گلے پر تو انہوں نے یقیناً چھری پھیر دی ہے۔ کوئی پوچھے کہ جب تمہیں کسی بات کا سلیقہ نہیں تو کیوں اُسے اختیار کرتے ہو، لیکن وہ تو مقصود عوام کو اپنی طرف کھینچنا ہے، کہ اسی طرح لوگوں کا میلان ہماری طرف ہو جائے گا۔ جیسے تھیٹر کا اشتہار تقسیم کرنے والی گاڑی پر باجہ بجتا ہے اسی طرح گویا صوفیوں کی بزم تصوف کا گانا ہے، جب نٹ تماشہ کرتے ہیں تو پہلے ایک جگہ بیٹھ کر زور زور سے ڈھول پیٹنے لگتے ہیں اور جس وقت لوگ اس کی آواز سن کر جمع ہو جاتے ہیں تو پھر وہ اپنی بازی گری شروع کر دیتے ہیں، یہی حال صوفیہ کی ڈھولک کا ہے کہ جب اس کے لالچ سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں تو پیر صاحب پر حال طاری ہوتا ہے اور سو میں دس ایسے بیوقوف ضرور ہی نکل آتے ہیں جو اُن کو اللہ والا سمجھ کر دست ارادت پھیلا دیتے ہیں۔ سال میں پندرہ بیس جلسے ہوئے اور کم از کم ۳۶۵ مرید ایک ایک روپیہ سالانہ دینے والے پیدا ہو گئے۔ چلیے محنت ٹھکانے لگی، تیس روپیہ ماہوار کا سہارا ہو گیا۔ اس سے بہتر کیا تجارت ہو سکتی ہے . . . . . . "

سیدانی بات کاٹ کر بولیں "لاحول ولا، میں کہتی ہوں کہ یہ تم کو ہو کیا گیا ہے میں نے تو پوچھا تھا کہ تمہاری طبیعت کیسی ہے، اور تم نے یہ آلہا شروع کر دیا، میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ تم میرا سر شام تک کھاتے رہو، گھر کا سارا کام پڑا ہے، جلدی بولو چا پیو گے، یا جوشاندہ، اگر کل شام کو بھیگ گئے تھے اور اس سے نزلہ ہو گیا ہے تو جوشاندہ بہتر ہو گا"

میر صاحب "ہاں جوشاندہ بہتر ہو گا لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ اب مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، حکیم مہدی حسن مرحوم جب تک زندہ رہے جوشاندہ کا بھی اثر رہا۔ اب وہ نہیں تو یہ بھی بیکار ہو گیا۔ معلوم نہیں کہ آجکل کے طبیب نسخہ لکھنا نہیں جانتے یا دوائیں خراب پیدا ہونے لگیں ہیں۔ کہ کسی چیز میں اثر ہی نہیں رہا۔ جب کبھی کھانسی ہوئی ملٹھی کا ٹکڑا منہ میں رکھ لیا اور غائب ہو گئی، اب سیروں کھا جاؤں تو بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میاں ہادی (حکیم مہدی حسن کے بیٹے) کے پاس جاؤں گا اور ان سے پوچھوں گا کہ اس صورت میں جبکہ نزلہ کے آثار ہوں اس موسم میں جوشاندہ کے اجزا کیا ہونے چاہئیں، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں، لیکن کہیں گے کیا مجھے معلوم ہے کہ یہی بنفشہ گاؤزبان بتائیں گے۔ میرا تو ان دواؤں سے اب جی گھبرا گیا، یہ اطبا بھی بالکل لکیر کے فقیر ہیں، چند دواؤں کے نام انہوں نے رٹ لئے ہیں بس انہیں کو الٹ پھیر کر لکھ دیتے ہیں، نہ یہ دیکھتے ہیں کہ موسم کا کیا اقتضا ہے، بیمار کس طبقہ کا ہے اس کا مزاج کیسا ہے، کتنی مقدار میں اور کیا دوا اس کو دینی چاہئے یہ بات تو حکیم مہدی حسن میں عجیب تھی میرے سامنے ہی دو آدمی آئے تھے جن کو قبض کی شکایت تھی، ایک صرف گلقند اور منقہ لکھا اور دوسرے کو جمالگوٹے کی گولی دی، میں نے سبب پوچھا تو ہنس کر بولے کہ جس کو میں نے جمالگوٹہ دیا ہے وہ گاؤں کا محنتی کسان ہے اور سخت معدہ رکھتا ہے اس پر معمولی مسہل دواؤں کا کیا اثر ہو سکتا ہے، دوسرے صاحب شہر کے نازک مزاج بے احتیاط نوجوان ہیں معدہ یونہی ضعیف ہے

زرا دیر دھوپ میں بیٹھ جائیں تو یونہی دست جاری ہو جائیں، انہیں گلقند کافی ہے۔ یہ سوجھ بوجھ اب کہاں ہے "

میر صاحب دیر تک مصروفِ جواب ہی رہے اور سیدانی غصہ کے مارے اٹھکر چلدیں۔

مجھے ایک ضروری کام سے لکھنؤ جانا تھا، اسباب براہ راست اسٹیشن پر بھیج دیا تھا، اور میں ایک صاحب سے ملنے جا رہا تھا، خیال تھا اُن سے باتیں کر کے وقت پر اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔ بدقسمتی سے میر صاحب ایک ایسی گلی کے موڑ پر مل گئے کہ میں اُن سے بچکر کسی طرح نکل ہی نہ سکتا تھا، دیکھتے ہی روح خشک ہو گئی، لیکن چونکہ یہ میرے والد کے دوست تھے اور میں ان کا بہت ادب کرتا تھا اس لئے مجبوراً چہرہ کو شگفتہ بنا کر سلام عرض کرنا پڑا اور قبل اس کے کہ اُن کا دعائیہ فقرہ پورا ہوتا میں نے ایک ہی سانس میں نہایت جلدی جلدی یہ بھی کہدیا کہ حضرت نہایت عجلت میں ہوں اس وقت کی گاڑی سے لکھنؤ جانا ہے" اور یہ کہکر بغیر انتظار میں آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے فرمایا " میاں زرا ٹھیرو، مجھے بھی ایک کام ہے، لیکن خیال ہے کہ تمہیں زحمت نہ ہو اور بعد کو - - - - - - - - - - "

میں نے قطع کلام کر کے عرض کیا کہ " اس کا خیال نہ فرمائیے، آپ جو حکم دیں گے اُس کی تعمیل ضرور ہوگی" چونکہ وہ پان کے زیادہ شائق تھے اس لئے میں نے خود ہی قیاس سے کام لیکر کہا کہ " کیا قوام کی ضرورت ہے " اور یہ اس لئے کہ کسی طرح جلدی نجات مل جائے تو میں نکل بھاگوں، مگر میر صاحب جن کو اپنے آپ سے ہمیشہ کم گوئی کی شکایت رہی کب ماننے والے تھے، انھوں نے فرمایا کہ " میاں قوام کھانا تو میں نے عرصہ ہوا ترک کر دیا، تمہارے والد اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے، اور یقیناً انہیں وہاں ایسی ہی جگہ ملی ہوگی۔ کیونکہ اُن کے اخلاق ہی ایسے تھے کہ اپنی ساری عمر دوسروں کی خدمت کے لئے وقف کر دی، اور اپنے مدعا پر کبھی نظر نہیں کی، جب غدر کے بعد مارشل لا جاری ہوا، اور ایک ایک جنٹ کو پھانسی کے اختیارات دیئے گئے تو تمہارے والد مرحوم کانپور میں مجسٹریٹ ضلع کے چیف ریڈر تھے اور اتنا وقار رکھتے تھے کہ جو حکم لکھدیا اُس پر دستخط ہو گئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے خدا جانے کتنے رئیسوں کی جان بچائی، وہ چاہتے تو کروڑوں روپیہ کما لیتے۔ لیکن انھوں نے اس طرف نگاہ ہی نہیں - - - "

میں نے پھر زرا جرأت کر کے بات کاٹی اور کہا کہ " اچھا اگر قوام آپنے ترک کر دیا ہے تو فرمائیے اور کیا لاؤں، وقت تنگ ہے اور مجھے کام بھی زیادہ ہے اس لئے زرا جلد جانا چاہتا ہوں "

میر صاحب بولے " تو ہاں تمہارے والد مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ قوام نہ کھایا کرو نزلہ کی شکایت ہو جائے گی، لیکن میں نے نہ سُنا، اب اُن کا کہنا سامنے آیا تو مجبوراً ترک کرنا پڑا۔ اس لئے میاں قوام تو منگاتا نہیں، کیونکہ میں بھی استعمال نہیں کرتا اور تمہاری چچی بھی پسند نہیں کرتیں، پتی کھاتی ہیں اور وہ بھی بغیر خوشبو کی اور یہ عادت اُن کو شروع ہی سے ہے، یہی وجہ ہے کہ انہیں آج تک کبھی نزلہ زکام کی شکایت نہیں ہوئی اور میں آئے دن کا روگی ہو گیا ہوں، سو اس کی تو ضرورت نہیں ہے لیکن میرا ایک پیغام پہنچانا ہے اگر ممکن ہو تو غالباً وکٹوریہ گنج کا پل تو دیکھا ہوگا، وہاں سے مشرق کی جانب جو سڑک آغا میر کی سرائے کو گئی ہے اُس پر سو قدم چلنے کے بعد داہنے ہات کو ایک گلی ملتی ہے، سامنے نیم کا درخت ہے، اس کے نیچے پانی کا نل لگا ہے اور بائیں طرف ایک بلند پختہ مکان لالہ کشوری مل کی حویلی کے نام سے مشہور ہے، اُس گلی میں مڑ جانا، بیس قدم کے بعد تمہیں ایک پھاٹک ملے گا، وہاں کسی سے پوچھ لینا کہ سید مبارک حسین صاحب کہاں رہتے ہیں، مشہور آدمی ہیں محلے کا ہر شخص انھیں جانتا ہے کہ

ورق والا یا سادہ قوام اور اعلیٰ درجہ کے عطر کی جن اصحاب کو ضرورت ہوتی ہے وہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگاتے ہیں۔

کیونکہ ان کے والد کا بڑا اچھا زمانہ تھا، اور نخاس کے تمام مکانات انھیں کے قبضہ میں تھے، ڈیوڑھی پر ہاتھی گھوڑے ہر وقت موجود رہتے تھے، بڑے بڑے رئیسوں سے ملاقات تھی دربار حکومت میں بھی ان کو خاصہ اقتدار حاصل تھا، لیکن پھر جو تباہی آنی شروع ہوئی تو ساری ملکیت ہاتھ سے نکل گئی اور وہ گھر ایسا بگڑ گیا جیسے آندھی نے صاف کر دیا ہو، سید مبارک حسین انھیں کے بیٹے ہیں، اور اس لئے ...." میں پھر گھبرا کر بول اٹھا کہ "ہاں تو ان سے مل کر کیا عرض کروں" اور یہ کہکر میں نے گھڑی دیکھی کہ اب بھی وہ میرے اضطراب کو محسوس کرلیں، لیکن ان کے دماغ میں احساس اور اس کی قوت ہی موجود نہ تھی، میرے شانہ پر ان کا ہاتھ رکھا ہوا تھا اور میں ان کی اس شفقت سے بیزار و متنفر تھا۔

میر صاحب نے مطلقاً اس کو محسوس نہیں کیا اور برابر اسی طرح نہایت سنجیدگی و میانہ روی کے ساتھ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا کہ "ہاں وہ ملیں تو ان سے کہدینا، اور اس طرح کہنا گویا میں کہہ رہا ہوں کہ میاں تمہارے باپ تو مجھ پر بڑی عنایت کرتے تھے، کبھی پہنچ جاتا تھا تو ہفتوں آنے نہ دیتے تھے، رات رات بھر باہر میرے ہی پاس دیوانخانہ میں بیٹھے رہتے تھے، تمہاری ماں بھی بڑا کرم فرماتی تھیں، خاص اہتمام سے میرے کھانے کا انتظام کرتیں، اور گھڑی گھڑی کنیز کو بھیجکر دریافت فرماتیں کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے، اور تمہارے بڑے بھائی بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، لیکن تم نے کیوں مجھے بھلا دیا۔ خط کا جواب نہیں، خیریت کی اطلاع نہیں، اگر مجھ سے کوئی قصور ہوا ہے تو اسے معاف کردو، تم سید ہو، سید زادے ہو اور میں ... بھی تمہارا نام لیوا ہوں، اگر اتفاق سے ......"

میں اس قدر گفتگو سننے کے بعد یہ گھبرایا اور بول اٹھا کہ "بہتر ہے عرض کر دوں گا" اور یہ کہکر آگے بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے پھر روک لیا اور بولے "ہاں ان سے میرا پیام پہنچا دینا کہ چھ مہینے اُس طرف جب سندیلہ میں ملاقات ہوئی تھی تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ میر صاحب مرحوم کی بیاض بطور یادگار کے دے دوں گا، میں چاہتا ہوں کہ اس کو اپنے پاس رکھوں" — وہ فقرہ ختم کرنے نہ پائے تھے کہ میں بول اٹھا "بہتر ہے بیاض لیتا آؤں گا" اور فوراً ایک تانگہ روکا جو اتفاق سے اسی وقت نظر آگیا تھا، کیونکہ وقت بہت تنگ ہوگیا تھا، اور گاڑی چھوٹنے میں صرف پندرہ منٹ باقی تھے، جن صاحب سے ملنا تھا وہ بھی اب ناممکن تھا، میں سلام کر کے آگے بڑھا اور تانگے پر بیٹھکر روانہ ہونا چاہتا تھا کہ میر صاحب بڑھکر تانگے کے پاس آگئے اور اس کے پائدان پر پاؤں رکھکر فرمانے لگے کہ "جہاں تک ممکن ہو بیاض ضرور لیتے آنا، اور مولوی عبدالشکور سے بھی مل کر یہ کہدینا کہ اب وقت مناظرہ اور جھگڑا کا نہیں ہے، ورنہ اس میں وقت بسر کیجئے، شیعہ سنی کے نزاع اعتقادی ہیں، اور ہماری معاشرت اور تمدن کو ان سے متاثر نہ ہونا چاہیے، رسالہ بازیوں سے تعلقات خراب ہوتے ہیں اور نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔ اگر انھوں نے اپنی ساری عمر کی کاوش کے بعد دو چار شیعوں کو سنی کر بھی لیا تو کیا، جبکہ موجودہ تعداد میں شیعوں کی قومی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت نہیں ہے، علاوہ اس کے میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ شیعوں کے خلاف جو طریق تردید و استدلال وہ اختیار کرتے ہیں اس میں بھی بہت سی خامیاں ہوتی ہیں اور بحث کے اصول ان سے اکثر و بیشتر ترک ہو جاتے ہیں اسی کے ساتھ میری طرف سے یہ بھی کہدیجئے گا کہ پہلے آپ خود اپنے مذہب کے عقائد و اصول پر تنقیدی نگاہ ڈالئے اور جب آپ پوری طور پر مطمئن ہوجائیں تو پھر شیعوں کی کتابوں کا غائر مطالعہ کیجئے آپ تحقیقی نقطۂ نظر سے ابھی تک اسی زمانہ میں ہیں جب منصور کے انا الحق کو نشان کرامت و بزرگی سمجھا جاتا تھا، ضرورت ہے کہ اب اجتہادی رنگ پیدا کر کے ایک ایک مسئلہ پر نگاہ ڈالی جائے، بغضب خدا کا ابھی تک جمعہ کے خطبہ میں عثمان غنی ہی کو جامع قرآن کہا جاتا ہے، حالانکہ حقیقی معنی میں جمع قرآن رسالت ہی میں ہوچکا تھا، میں نے سنا ہے کہ سنیوں کے اس مزعوم کو سامنے رکھکر لکھنؤ کے بعض شیعی رسائل ان کی دھجیاں اڑا رہے ہیں سو

کہدیجیے کہ اس باب میں وہ مجھ سے خط و کتابت کریں مگر مناظرہ ہی کرنا ہے، ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ وہ اس شغل ہی کو ہمیشہ کیلئے خیرباد ...... "
اب میرا ضبط اختیار سے باہر تھا اس لئے میں بے حد درجہ اضطراب کے ساتھ انکا پاؤں پادان سے ہٹا کر تانگہ والے سے کہا کہ گھوڑے کو بھگائے کیونکہ وقت بالکل نہیں ہے اور اسٹیشن پہنچکر گاڑی پر سوار ہونا ضروری ہے۔ میر صاحب وہیں کھڑے دیکھتے کے دیکھتے رہگئے اور میں روانہ ہوگیا لیکن چونکہ اسٹیشن زرا دور تھا اس لئے جس وقت میں وہاں پہنچا تو ریل سیٹی دیچکی تھی اور پلیٹ فارم تک پہنچتے پہنچتے روانہ ہوگئی، میرا ملازم سخت پریشان تھا، وہ اسباب گاڑی میں رکھکر میرا انتظار کر رہا تھا اور جب میرے آنے میں بہت دیر ہوئی تو وہ پھر اسباب اتارنا چاہتا تھا، لیکن مجھے پل پر دیکھکر رک گیا، اور جب گاڑی روانہ ہوئی اور میں نہ پہنچ سکا تو بہت گھبراگیا۔ میں نے کچھ تو اس خیال سے کہ جانا ضروری تھا، اور کچھ اس بنا پر کہ اسباب وغیرہ گاڑی میں رکھ دیا گیا تھا، اضطراری طور پر دوڑکر سوار ہونے کی کوشش کی اور غالباً میں اس میں کامیاب ہوجاتا اگر گارڈ مجھے نہ روکتا، لیکن میرا ایک پاؤں گاڑی کے تختے پر پہنچ سکا تھا کہ اس نے میرا بازو پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا اور میں پھسل کر نیچے گر پڑا۔ یہ وقت میرے لئے کس قدر نازک تھا، اسکا اندازہ تو میں اس وقت نہیں کرسکا، کیونکہ میں بیہوش ہوگیا تھا، لیکن بعد کو جب میری آنکھ کھلی اور میں نے اپنے آپ کو اسپتال میں پایا، تو مجھے معلوم ہوا کہ میر صاحب نے میرے اوپر کس قدر ظلم کیا تھا، کیونکہ میری ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اب بھی کہ اس واقعہ کو کئی سال گزر چکے ہیں میر صاحب کی یاوہ گوئی کی طرف سے ایک مستقل "معذور لنگ" ہوکر رہگیا ہوں

فکاہات

پنجاب میل

ہندوستان کی اُن تمام ریلوں میں جنھوں نے ہندوستانیوں میں زنا، اغوا، فرار، تمیت ہو جانے اور بے بھاگ جانے کی عادت عام کر دی ہو پنجاب میل ہی وہ ریل ہے جس میں مسافر، پانی کی قلت، انگریز گارڈ کے ڈیم، فول، دیسی ٹکٹ کلکٹر کی ٹھوکروں، پولیس کی لٹھ بازی، اور کسانوں کی جیقلش سے محفوظ رہتے ہیں، اس ریل میں حسب ذیل قسم کے لوگ سفر کرتے ہیں:۔

(۱) جس کے پاس قارون علیہ ما علیہ کے چالیس خزانوں میں سے کم از کم اڑھائی خزانہ کے برابر دولت ہو۔

(۲) جو کسی دوسرے شہر میں اپنے عزیز کی یکایک علالت یا وفات پر ذریعہ تار بلایا جائے، یا بلائی جائے۔

(۳) جو قتل عمد، اقدام قتل، ڈکیتی، ڈاکہ، بقصد قتل عام، گولہ مارنا بقصد اغوا، چلم پینا بقصد آتش زنی، یا محاصل سرکاری کا غبن یا ان میں سے کسی ایک جرم کا مرتکب ہوا ہو، ہوئی ہو تو اس کی فراری کے لئے پنجاب میل سے زیادہ بہتر کوئی ریل نہیں، کیونکہ یہی وہ ریل ہے جو ایسے مجرموں کو اور نہیں تو کم از کم بمبئی تک بہ یک لمحہ پہنچا دیتی ہے پھر مجرم کو اختیار ہے کہ وہ شہر بمبئی کے چور بازار میں ٹھہر جائے یا سیدھا انگلستان پہونچ جائے کیوں کہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد جنرل ڈائر بھی اسی پنجاب میل سے بھاگ کر انگلستان میں آج بھی بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں اور ہندوستانی اس واقعہ تک کو بھول بیٹھے۔

(۴) زیادہ افسران گورنمنٹ اس ریل سے سفر کر سکتے ہیں جنھیں ہندوستان میں سوراج نہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ کے ساتھ موٹر، بنگلہ اور رشوت [illegible] ذاتی بھی ملتی ہے، اور وہ کبھی کبھی اپنے ہندوستانی خانساماں کی تلی پھاڑ کر اسے جان سے بھی مار ڈالتے ہیں، مگر انھیں جرمانہ تک نہیں ہوتا۔

ان حالات کے بعد اس پنجاب میل میں سفر کرنے کے قاعدے یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلے اس ریل میں سفر کرتے وقت اپنا قومی پاجامہ اور دھوتی اتار کر ایک عدد پتلون پہن لیجئے، گھٹنوں سے نیچے تک کی شیروانی کی جگہ خوشنما پیرمنٹ سے اونچا کوٹ پہنئے، ترکی ٹوپی اور پگڑی کی جگہ انگلش ہیٹ لگائیے۔

(۲) جو سامان آپ کے ساتھ ہو اس کے لئے بستر یا نیس من تو جھٹانک وزن کے دیسی صندوقچے کی جگہ چمڑے کے سوٹ کیس اور بکس رکھیے۔

(۳) [illegible] اور روزنامچہ، حمائل شریف، اور بہشتی زیور کے انگریزی ناول، فسانے۔ اور کم از کم پانیر اخبار کے دو چار پرانے پرچے لیجئے۔

(۴) ہاتھ کے رومال میں موٹی موٹی روٹیاں، بھنا ہوا گوشت، اور انڈوں کا ناشتہ باندھ کر لیجانے کے چلتی ریل کے ڈائننگ کار میں

(۵) سٹیشن پر کھڑے کھڑے حجامت بنوائیے اگر گھبراہٹ میں داڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی صاف کر دی جائیں تو اسے امداد غیبی سمجھئے جو صرف

انگریز پرستوں کو خاص ہوتی ہے۔

(۶) کسی تعلیم یافتہ۔ تجربہ کار۔ اور ذی ہوش رفیق سفر کی جگہ ایک انگریزی کتاب بک میں بند کرا لیجئے، اور ہر اسٹیشن پر اس کی رسی پکڑ کر ٹہلاتے رہیئے لیکن اسی کے ساتھ منہ سے سیٹی بھی بجاتے رہیئے؛

(۷) پنجاب میل میں سوار ہو کر ہمراہیوں سے بجائے خندہ پیشانی سے گفتگو کرنے کے جب تک آپس میں کوئی باقاعدہ انٹروڈیوس نکرا دے اپنے چہرہ پر قحط اور فاقہ کشی کے آثار پیدا کر کے، اخبار پڑھتے رہیئے تاکہ کسی کو خیریت دریافت کرنے کی بھی جرأت نہ ہو۔

(۸) گو آپ اپنے وطن میں ٹرڈرائیور یا حجام ہی کیوں نہ ہوں لیکن پنجاب میل میں سوار ہوتے ہی خود کو کہیں کا بیرسٹر۔ ڈاکٹر۔ یا ڈپٹی کمشنر ہی ظاہر کیجیے

(۹) تمام راستہ اپنے ہندوستانی بھائیوں سے انگریزی زبان میں گفتگو کیجیے ورنہ آپ جاہل سمجھے جائیں گے۔

پس جو ہندوستانی ان اسباب کے ساتھ پنجاب میل میں بلا ٹکٹ بھی سوار ہو جائے تو اس سے محفوظ دیسی ٹکٹ کلکٹر ٹکٹ کا سوال نہیں کرتا۔

یہ ہیں وہ ترکیبیں پنجاب میل کے سفر کی جو ہمیں علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سند یافتہ مولانا صاحب نے بتلائی تھیں، چنانچہ ۲۴ جون کو امتحاناً ہم نے پنجاب میل سے شہر بمبئی تک کا جو سفر ——— کیا، اس کی تفصیلات سن لیجیے، کیونکہ وہ تو مثل مشہور ہے نہ کہ

"رکھا ہوا آتا ہے بیچ کام کے"

شب کے ٹھیک بارہ بجے ہم اپنے ایک محترم کرمفرما کو ریلوے اسٹیشن پر "خدا حافظ" کہنے گئے، جب ریل روانہ ہونے لگی تو ممدوح محترم نے بطریق مداخلت دوستانہ بہ ریل بوقت شب بلا ٹکٹ اپنے ساتھ بٹھا لیا، اور چونکہ محض تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے آج تک کسی مسلمان نے ہمارا خسر ہونا گوارا نہیں کیا ہے، اس لئے ہم بھی اہل و عیال کی فکر سے آزاد رہکر ہر وقت دنیا بھر کا سفر کرنے کیلئے ادھار ہی کھائے بیٹھے رہتے ہیں، لہٰذا بڑی خوشی سے اس پنجاب میل میں بیٹھ گئے، لیکن محترم میزبان کو نیند آتے ہی ہم نے ترکیب یہ کی کہ ہر اسٹیشن پر اتر کر سوتے ہوئے لیڈیز اینڈ جنٹلمین کو تھا تھک لیا کرتے تھے اور یہ تفریح ہر شاعر و ادیب کے لئے ہے بھی ضروری، مگر اسی کے ساتھ یہ خیال تو رہا کہ ہم ٹہلائے گئے ہیں، بلا ٹکٹ ایسا نہ ہو کہ کسی اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر صاحب سے مقابلہ ہو جائے، نتیجہ یہی ہوا کہ اسٹیشن کھنڈوا پر ایک دیسی ٹکٹ کلکٹر صاحب نے شب کے کوئی تین بجے پلیٹ فارم پر ٹہلتا دیکھکر ٹکٹ طلب کیا، تو ہم نے بڑی خوبی سے انگریزی زبان میں ڈرانا چاہا، مگر جب دیکھا کہ "زمیں جنبد نہ جنبد یہ کلکٹر" تو اس سے کہا کہ بھائی رات کے وقت پنجاب میل کے مسافروں سے ٹکٹ طلب کرنا جائز نہیں اس نے کہا ہاں یہ قاعدہ سوتے ہوئے مسافروں کے لئے ہے تو ہم نے بھی فی البدیہہ کہا کہ لیجیے تو ہم بھی سوئے جاتے ہیں یہ کہکر ڈبے کے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا ادھر ریل نے سیٹی دی اور چلدی تو وہ بھی جل گئے مگر غصہ میں آکر ترکیب یہ کرتے گئے کہ آنے والے اسٹیشن کو تار دیدیا کہ ایک صاحب فلاں ڈبے میں بلا ٹکٹ تشریف لا رہے ہیں، مگر وہ بلا پولیس کے گفتگو میں کسی سے ماننے والے نہیں ہیں، لہٰذا دوسرے اسٹیشن پر گارڈ صاحب مع ایک ٹکٹ کلکٹر اور سپاہی کے آگئے اور یہاں مجبور ہو کر ٹکٹ کے دام دینے ہی پڑے۔ افسوس صد ہزار افسوس۔!

جب نیند کسے آتی ہے دیکھا تو ایک سیٹ کے نیچے ایک مسافر صاحب کا ناشتہ دان رکھا تھا، شاید یہ مسافر صاحب بلگرام کے رہنے والے تھے؛

طبیعت میں بے انتہا صفائی تھی، اس لئے ناشتہ بھی نہایت صاف اور نفیس تھا؛ اور ساتھ ہی ایک مراد آبادی پاندان بھی رکھا تھا، ہم نے پہلے تو انھیں بیدار کیا لیکن جب دیکھا کہ غفلت کافی ہے تو اُن کا ناشتہ اور پانی کا گلاس بھر کر تھوڑی دیر بیٹھ گئے پھر پان کھالیا، پھر معلوم نہیں یہ صاحب ہم سے کیوں دریافت کر رہے تھے کہ میرا ناشتہ کہاں گیا؟ غرض جب صبح ہوئی تو محترم کرمفر ملنے ہمیں اٹھایا اور فرمایا کہ اتنی دیر تک کیوں سوتے رہے تو ہم نے رات بھر کے کارنامے سنائے تو فرمایا کہ "تم بڑے وہ ہو تمہیں مال کا افسر کردیں"

ان حالات کے ساتھ شہر بمبئی پہنچے تو اتفاق سے اسٹیشن پر حضور گرامی ہز ہائی نس نواب صاحب بہادر کوروائی کے پرائیویٹ سکریٹری قبلہ مولوی فضل رسول صاحب مل گئے، بڑے تپاک سے پیش آئے اور بمبئی میں جب تک قیام رہا نوازشوں کی ارزانی فرماتے رہے، دوسرے دن ہم نے حسب دستور سیاحت یہاں کے پبلک حالات کے معائنہ کے لئے چلنے پھرنے اور سیر کرنے کا ارادہ کیا اور کوٹھی سے نکلے تو پہلی مشکل یہ پیش آئی کہ بمبئی کے مکانوں اور سڑکوں کی یکسانیت کی وجہ سے ہر نصف گھنٹے کے بعد پھر اُسی جگہ آجاتے تھے جہاں سے چلنا شروع کرتے تھے، تنگ آکر ایک آدمی خریدا تب اُس نے صحیح راستہ بتلایا، خیال تھا کہ یہاں سے گاندھی جی کا وطن قریب ہے اور یہاں لیڈروں کا ہر وقت مجمع رہتا ہے اس لئے یہاں کی آبادی بڑی وطن پرست ہوگی، لیکن دیکھا تو بجائے "بڑی وطن پرست" ہونے کے بڑی "انگریز پرست" نکلی، کھدر کا تو نشان تک نہیں ملا۔ البتہ تمام آبادی انگریزی کپڑے استعمال کرتی نظر آئے وہ ترک موالات کا معاملہ تو گیا بھاڑ شریف میں دفاتر سرکاری سے لیکر چپراسیوں تک میں ہندوستانی ملازم بھیڑوں اور بکریوں کی طرح بھرے نظر آئے، جب ہر جگہ انگریزی ٹوپی اور انگریزی سوٹ میں ہندوستانیوں کو دیکھا تو گھبرا کر پہنچے اخبار خلافت کے دفتر میں، دیکھا تو مولوی قطب الدین سابق اڈیٹر کانگریس دہلی واسسٹنٹ اڈیٹر خلافت بجائے کرسی کے میز پر بیٹھے ہوئے تھے، ہم نے سوچا کہ دفتر خلافت کا دستور ہی یہ ہوگا کہ کرسی تو رہے خالی اور میز سے کرسی کا کام لیا جائے، لہٰذا ہم بھی بلا تکلف میز پر بیٹھ گئے، اور کہا اسلام علیکم قطب الدین صاحب نے گھبرا کر کہا وعلیکم مگر آپ ہیں کون؟ ہم نے کہا وہی جو پار سال جمعیۃ العلماء ہند دہلی کے دفتر میں آپ کے ساتھ حقّہ پیا کرتے تھے، کہا کیا ملّا رموزی؟ ہم نے کہا ہاں، تو جھوم گئے، پھر حضرت قمر احمد جیف اڈیٹر خلافت اور حضرت علی بہادر خاں بی۔اے۔سی اڈیٹر اخبار اتحاد سے ملاقات کرائی! الحمد للہ قمر صاحب کی صحت کو اتنا اچھا پایا کہ اگر وہ کسی تانگہ کے پچھلے حصہ پر سوار ہوجائیں تو تانگہ مع گھوڑے کے الٹ جائے علی بہادر خانصاحب ازل ہی سے جوانی میں پیری کا نمونہ بنے ہوئے ہیں آپ کو اس وقت (۱۰۲) ڈگری کا زکام تھا اور اثنائے گفتگو میں کبھی کبھی پوست ضعف کے ساتھ کھانس دیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر میں حضرت قمر نے چاء منگائی مگر پہلے ہمارے سامنے کوئی آدہ سیر بھیگے ہوئے چنے اور نمک رکھدیا جو ممدوح کا "ناشتۂ سحر" تھا۔ آپ فرصت کے ہر لمحہ میں سوت کاتتے رہتے ہیں، غرض جب تک ہم بمبئی میں رہے ان حضرات کی صحبت میں لطف زندگی ملتا رہا، مولانا شوکت علی صاحب کا کمرہ بھی دیکھا، اس کے دروازہ میں انگریزی حروف میں لکھا تھا (آؤٹ) یعنی باہر خدا جانے یہ آؤٹ کے معنی حجاز تک چلے جانے کے کس طرح ہوگئے۔ نیا آدمی تو شام تک دروازہ پر ہی بیٹھا رہے، کہ گئے ہونگے کہیں تفریح کو وہ کس طرح سمجھیگا کہ یہ باہر جانے کے معنی موتمر مکّہ میں تقریر کرنے کے بھی ہوجاتے ہیں، یہاں سے اخبار غالب کے اڈیٹر اور تحریک تحفظ قبہ کے سرگروہ حضرت مولوی نذیر احمد خجندی کی خدمت میں گئے، حضرت خجندی بڑی محبت سے پیش آئے ہم کو پہچان گئے اور فوراً اخبار غالب کا وہ اڈیٹوریل مضمون سنایا جو اخبار

مدینہ کے ایک نوٹ کے جواب میں لکھا تھا بعد خجندی صاحب نے فرمایا کہ سیٹھ چھوٹانی کے ہاں حضرت اقدس قطب میاں فرنگی محلی ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے بھی مل لو، خجندی صاحب لے گئے اور جب ہم حضرت قطب میاں سے ملے تو اسلامی اخلاق و تواضع کی ایک دنیا نظر آئی -------

--------- یہاں ہم نے تحریک قبہ پر ان دونوں حضرات سے ذکر کیا کہ اگر اس تحریک کے سلسلہ میں آپس میں تلخ گفتاری بند کر دی جائے تو مناسب ہے الحمد للہ کہ مولوی خجندی صاحب نے اس استدعا سے اتفاق فرمایا، مگر ساتھ ہی خلافت والوں کی جن زیادتیوں کی شکایت کی اگر وہ سچ ہیں تو ضرور قابل افسوس ہیں،

یہاں سے فارغ ہو کر سیدھے ایک تھیٹر میں گئے، کیا کہیں کیا دیکھا، اپنے پاس کی کرسی پر ایک ایسی لچک دار چیز دیکھی کہ تماشا دیکھنا تو بھول گئے اور رات بھر اسی چیز کو دیکھتے رہے، صبح کو جب اس چیز کا نام دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام پارسن ہے، الامان جو سچ پوچھو تو خلاصۂ بمبئی بھی "پارسن" تھی جس کے باپ کو پارسی کہتے ہیں پارسا نہیں، اس کے بعد بمبئی میں جو چیز سب سے زیادہ نظر آئی وہ موٹریں، شراب، اور زنانِ بازاری تھیں، پھر کیا انہیں مہذب، خلاق چیزوں پر "ڈیلی میل لنڈن" نے حال میں فخریہ کہا تھا کہ شہر بمبئی کو برطانیوں نے آباد کیا ہے جس کا جواب نہیں، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس میں ہندوستان بھر میں صرف ایک شہر تو بارونق بنا دیا جائے اور باقی شہروں میں افلاس، طاعون، اور انفلوانزا، آباد رہیں تو یہ بھی کوئی قابل فخر تنظیم ہے - ؟

ملّا رموزی

فروغِ حسن

زمیں کو فروغ۔ آسماں کو فروغ　　ترے حسن سے دو جہاں کو فروغ

ترے عکس روئے پر انوار سے　　تجلائے حسنِ بتاں کو فروغ
ترے جلوۂ مہر آثار سے　　جمالِ رخِ مہوشاں کو فروغ

ترے عالمِ رنگ گل ریز سے　　گل و گلبن و گلستاں کو فروغ
ترے حسنِ رخسار ضو خیز سے　　مہ و اختر و کہکشاں کو فروغ

ترے نورِ مہر جہانتاب سے　　زمیں تو زمیں آسماں کو فروغ
تری طلعتِ رشکِ مہتاب سے　　مکاں تو مکاں لامکاں کو فروغ

ترے لطف ہر دم کے احسان سے　　محبت کی روحِ رواں کو فروغ
تری مہرِ پیہم کے فیضان سے　　دل و دیدۂ دوستاں کو فروغ

ترے پرتو حسنِ گفتار سے　　ادیبوں کے حسنِ بیاں کو فروغ
ترے فیضِ نطقِ گہربار سے　　ادب کو ترقی زباں کو فروغ

ترے شوقِ عرفاں فزا کے طفیل　　کمالاتِ شیخ زماں کو فروغ
ترے عشقِ میخانہ زا کے طفیل　　کراماتِ پیرِ مغاں کو فروغ

ترے خوے داد و دہش کے سبب　　زمانے کے سود و زیاں کو فروغ

بہترین عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملیگا۔

تری عدل گستر روش کے سبب — جہاں کی بہار و خزاں کو فروغ

فقط تجھ سے باغ جہاں میں بہار — فقط تجھ سے کار جہاں کو فروغ
فقط تجھ سے اس گلستاں میں بہار — فقط تجھ سے اس خاکداں کو فروغ

مگر شہرت عشق آزاد سے
ترے جلوۂ داستاں کو فروغ

حکیم آزاد انصاری

شفق

لوح جبین فطرت بادے سے دُھلی ہوئی ہے — یا صاف بادلوں میں سُرخی گھلی ہوئی ہے
دوشیزۂ افق ہے آنچل ترا گلابی — ہے ماند تیرے آگے ہر جلوۂ شہابی
اے عکس حسن فطرت خونریزیاں یہ تیری — اے مست جام گلگوں خونریزیاں یہ تیری
ہیں دلفریب تیری رنگینیاں شہابی — عہد حسن در بغل ہے آنچل ترا گلابی
اے کیف شام گلگوں مست شباب عریاں — اے چشمۂ صباحت اے مستی فراواں
ہے اے شفق تو ساقی میخانۂ افق میں — تو ہے شراب فطرت پیمانۂ افق میں
اے شوخ گل بداماں آفت تیری جوانی — ہے کس شہید دل کی رنگین تو کہانی
جذبات قلب کی ہے ملفوف ایک ہستی
یا دلفریب سرخی مضمون قصۂ دل کی

درد کاکوروی

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(بہ سلسلہ ماہ جون ۱۹۳۶ء)

کلکتہ

۱۷ دسمبر۔ کلکتہ پہنچے۔ ڈاکٹر پالن[۱] پہلے سے موجود تھے (یہ لارڈ رپن کے ایڈیکانگ ہیں اور ہمارے دوست ہیں) انھوں نے ہمارے لئے ہل اسٹریٹ میں مکان کا بندوبست کیا ہے۔ پرائیویٹ سکریٹری پرم روز[۲] سے طے کر لیا ہے کہ میری بدھ کے دن سہ پہر کو لارڈ رپن سے ملاقات ہوگی۔ مدراس میں مسٹر (؟) کو ایڈریس دئے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا جلسہ ہونے والا ہے۔ صدر جلسہ ڈنیا نایڈو کو میں نے مبارکباد کا تار بھیج دیا ہے۔

۱۸ دسمبر۔ صبح سویرے انڈین مرر[۳] کے ایڈیٹر نویندر ناتھ سین ملنے کے لئے آئے۔ وسیع معلومات کے آدمی ہیں۔ میں نے لارڈ رپن کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ میں پبلک میں ان کی حمایت کرتا ہوں لیکن پرائیویٹ طور پر وہ مجھے کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اب تک ہندوستانیوں کے لئے کوئی ٹھوس کام نہیں کیا اگرچہ یہ سچ ہے کہ ان کے ساتھ انھوں نے اظہار ہمدردی ضرور کیا ہے اور انگریزوں کے مقابلہ میں ان کی طرفداری بھی کی ہے انھوں نے کہا کہ ہم چھوٹی چھوٹی مراعات کے لیے بھی شکرگزار ہیں۔ اگر البرٹ بل ابتدائی صورت میں پاس کر دیا جاتا تو واقعی وہ کچھ مفید ثابت ہوتا۔ اب اس کی کچھ اہمیت نہیں۔ اس میں صرف اصول کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس کے لئے ہم شکرگزار ہیں۔ لوکل سلف گورنمنٹ کے بارے میں لوگ ابھی شبہ میں ہیں۔ بہت سے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ اسکے ذریعہ سے کام پبلک کے نام سے زیادہ ٹیکس لگا سکیں گے بہ نسبت اس کے جتنے کہ وہ خود لگاتے۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسمٰعیل نے بھی مصر میں دار الامرا کے ذریعہ بعینہ یہی کارروائی کی تھی۔ کہ تمام مطلق العنان حکومتوں کا انتہائی مقصد محض ٹیکس ہے، اور ہندوستانی مقصد حکومت کا مقصد تو سب سے زیادہ ٹیکس لگانا ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں میں نے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ وہ بہت کمزور اور ابن الوقت ہیں۔ میری تجویز تھی کہ ...... آپ کی آمد پر بہت سے لوگوں کو جمع کیا جائے مگر لوگ گورنمنٹ سے خائف ہیں۔ امیر علی ترقی یافتہ پارٹی کے لیڈر ہیں اور بالکل انگریزوں کی طرح رہتے سہتے ہیں وہ اور ان کے رفقا گورنمنٹ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔ پرانے خیال کے مسلمان انہیں مرتد سمجھتے ہیں۔

"بعد میں مہاراجہ سر جوتندر موہن ٹگور ملنے کے لئے آئے۔ رینٹ بل (قانون مالگزاری) کے متعلق گفتگو رہی۔ وہ کاشتکاری کے پرانے طریقہ کو جدید کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ وہ مجھے دیہات کا معائنہ کرانے کے لئے لیجانے کا وعدہ کرتے ہیں تاکہ میں بطور خود مسئلہ ہذا کا مطالعہ کر سکوں۔"

"سب سے آخر میں لارڈ رپن کے پادری شومبرگ کر[۴] ملنے کے لئے آئے یہ میرے بھائی اور میری بہن سے خوب مراسم رکھتے ہیں۔"

---

[۱] Walter Pollen [۲] Primrose [۳] Indian Mirror [۴] Schomberg Kerr

---

سیاسیات پر گفتگو کرنے مین بہت احتیاط برتتے ہین میرا خیال ہے کہ شاید وہ اپنے تئین روحانی معاملات تک محدود رکھتے ہین۔

۱۹ دسمبر۔ سید امیر علی آئے اور ہم نے عربی پاشا کے متعلق گفتگو کی۔ مین نے انھین ٹائمز مین چھٹی چھپوانے پر دوبارہ ڈانٹا جسمین وہ لکھتے ہین کہ تمام مسلمان گورنمنٹ کے طرز عمل کی تائید مین ہین۔ وہ اب اظہار افسوس کرتے ہین اور کہتے ہین کہ اصلی صورت حالات کے متعلق مسلمانون کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ مسلمان اب یہ تسلیم کرنے لگے ہین کہ عربی ایماندار شخص ہے اور یہ کہ اسکی جنگ مذہب کی حمایت مین تھی۔ مین نے انھین بتایا کہ گلیڈ اسٹون عربی کو بحال کرنا چاہتے ہین اور ساتھ ہی ان سے بزور درخواست کی کہ وہ مسلمانون سے مزید لڑائیان لڑنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرین خواہ اسکی وجہ کچھ ہی ہو۔ مین نے ان سے کہا کہ مسلمانون کی خواہشات کی جانب پوری پوری توجہ حاصل کرنے کی غرض سے ضروری ہے کہ کس قدر خوف بھی پھیلا دیا جائے۔ مصری جنگ جیسے نازک موقع پر خاموش رہنے یا گورنمنٹ کے ساتھ ہمدردی کرنے کا بہانہ کرنے سے مسلمانون نے اپنے آپ کو تمام فوائد سے محروم کر لیا ہے۔ مین نے ان سے کہا کہ مجھے بھروسہ ہے کہ اگر مہدی کو دبانے کی غرض سے ہندوستانی افواج کو بھیجنے کا مسئلہ درپیش ہوا تو آپ بالضرور عام جلسہ کے ذریعہ اسکے خلاف صدائے ناراضگی بلند کرینگے۔ امیر علی نوجوان آدمی ہین۔ عمر ۳۰ سال کے قریب ہے اور اگر انھون نے آزادانہ کارروائی کرنے کی جرأت کی تو وہ بہت کچھ کام کر لین گے۔ لیکن لوگ کہتے ہین کہ ان کی خواہش اتنی ہے کہ چیف جسٹس بن جائین۔

"ایرانی قونصل جنرل مانک جی رستم جی ملنے کے لئے آئے۔ مسٹر جمشید جی جیجی بھائی بھی ان کے پاس ٹھہرے ہوئے ہین۔ آئندہ ہفتہ ہم اُن کے یہان جا رہے ہین۔

پونے تین بجے مین لارڈ رپن سے ملنے کے لئے گیا۔ گھنٹہ بھر تک گفتگو رہی۔ ابتدا مین زراعتی اضلاع کی حالت زیر بحث رہی اور بعد ازان اصلی معاملہ یعنی حیدرآباد کے معاملات پر بات چیت ہوئی۔ مین نے سارا معاملہ اُن کے روبرو پیش کر دیا اور بتایا کہ ......

خورشید جاہ نے سر سالار جنگ کی پالیسی کو بالکل ملیامیٹ کر دیا ہے اور ماہر منتظمین کو برخاست کر دیا ہے جسکی وجہ سے انتظام سلطنت مین پرانی خرابیان اور رشوت ستانیان از سر نو شروع ہو گئی ہین۔ مین نے مسٹر کارڈری کے خلاف کوئی الزام نہین لگایا جن کی نسبت میرا خیال تھا کہ وہ سرکاری جماعت کے مختلف مفاد کی نمایندگی کرنے والے ذمہ دار افسر ہین۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ یہ تمام افسر برار کی دوبارہ واپسی کا اندیشہ کرتے ہین اور اس لئے ریاست کی بدنظمی مین دیدہ و دانستہ مدد کرتے ہین پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے اور مصر مین سرکاری کارروائیون کو دیکھکر تو میرا اعتماد بالکل جاتا رہا ہے۔ لارڈ رپن یہ سنکر مسکرائے اور کہا کہ سرکاری طریقے کم و بیش ہر جگہ یکسان ہین لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ مین اسکی سچائی یا عدم سچائی کے متعلق کچھ نہین کہہ سکتا۔ انھون نے کہا کہ سر سالار جنگ کی پالیسی کو قائم و برقرار رکھنے کے لئے کسی معقول آدمی کا ڈھونڈنا سخت دقت طلب ہے۔ سر سالار جنگ کی موت بہت بڑی مصیبت ہے اگرچہ لارڈ رپن وغیرہ کی رائے مختلف ہے۔ ذاتی طور پر مین ان کی دیانتداری اور صیانت کے متعلق عالی رائے رکھتا ہون مگر ان کی جگہ کون پر کر سکتا ہے؟ اُس کے بعد مین نے نوجوان سالار جنگ کے متعلق اپنی عالی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ ان مین مدبرانہ صفات ہین اور انھین اپنے والد کے معیار تک پہونچنے کے لئے صرف تجربہ کی ضرورت ہے۔ انھون نے کہا کہ مجھے یہ تمام باتین سنکر خوشی ہوئی کہ اور سرا سٹوارٹ بیلی ———

کی بھی ایسی ہی رائے ہے۔ لیکن لائق علی اس ذمہ دارانہ عہدہ کے لئے اپنی نوعمری کے اعتبار سے موزون نہین ہین۔ مین نے کہا کہ ان کی ہیں سال کی ہے۔ انھون نے پوچھا کہ اسلامی یا انگریزی تقویم کے حساب سے۔ مین نے کہا کہ انگریزی حساب سے اس لئے کہ وہ اگست ۱۹۰۲ء مین پیدا ہوے تھے۔ اسی حساب سے ان کے والد کی عمر صرف ۲۴ سال کی تھی جبکہ وہ وزیر عظم مقرر ہوے حالانکہ اس وقت ریاست کی حالت نہایت ابتر اور غیر منظم تھی۔ اور اگر اس حالت کا موجودہ حالت سے موازنہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے والد کے مقابلہ مین زیادہ خوشگوار اور موافق حالات مین وزیر عظم ہونگے۔ مین نے ان سے بہت درخواست کی کہ جب وہ کلکتہ آئین تو آپ ان سے بالمشافہ ملین مین کسی ترجمان کی ضرورت لاحق نہ ہوگی اسلئے کہ لائق علی انگریزی بول سکتے ہین اور جہانتک میرا تعلق ہے مین ان کی پوزیشن اور خیالات سے آپ کو کما حقہ آگاہ کرنے کی کوشش کرونگا۔ اس کے بعد لارڈ ریڈنگ نے مجھ سے نظام کے چار خصائل کے بارے مین سوال کیا۔ مین نے کہا کہ مین وثوق کے ساتھ تو کچھ نہین کہہ سکتا اسلئے کہ میری ان کی جتنی ملاقاتین ہوئی ہین، وہ ان سب مواقع پر خاموش رہے ہین۔ مگر میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ وہ اپنی رائے رکھنے والے شخص ہین۔ انھون نے مجھ سے پوچھا کہ کیا حیدرآباد کے باشندے ان کے متعلق یہ چاہتے ہین کہ انہین اسی سال بالغ قرار دیدیا جائے یا دوسال بعد۔ مین نے کہا کہ ان کی خواہش سے اس کا کچھ تعلق نہین۔ وہ تو یہ چاہتے ہین کہ فی الفور اعلان کر دیا جائے اور اگر تاخیر کی گئی تو انہین سخت مایوسی ہوگی۔ ریاست کے باشندون مین نظام کی طرف سے محبت اور وفاداری کے جذبات بہت نمایان ہین اور انہین سخت رنج ہوگا اگر نظام کو اسکے حق سے کچھ عرصہ کے لئے محروم رکھا جائیگا۔

"اس کے بعد مین نے معذرت کے چند الفاظ کے ساتھ عہد نامہ کے مسودہ کا ذکر کیا۔ اس پر لارڈ ریڈنگ ہنسے اور کہا کہ مین نے یہ بات پہلی مرتبہ سنی ہے۔ مین یقیناً ایسے کسی معاہدہ پر نظام سے دستخط نہین کراؤن گا۔ یہ دھوکہ بازی اور فریب ہوگا زیادہ سے زیادہ ان سے اقرار لیا جائیگا کہ وہ اپنے اختیارات کو کم سے کم دو سال تک کے لئے غیر محدود طریقہ سے استعمال نہ کرین۔ جہانتک معاہدہ کا تعلق ہے مین اسے پیش نہین ہونے دونگا۔ مین نے امید ظاہر کی کہ ایسا ہی ہوگا۔ لارڈ ریڈنگ شروع شروع مین ذرا پیچ کر رہے مگر گفتگو کے آخری حصہ مین وہ بہت کھل گئے تھے اور انھون نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے توقع ظاہر کی اور کہا کہ آپ دوبارہ بھی ملین گے ۱۹۱۸ء مین گلیڈ اسٹون سے جو میری مشہور و معروف ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد سے مین کسی مدبر کی گفتگو سے اسقدر متاثر نہین ہوا جتنا کہ اب ہوا ہون"

"۱۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مین نے اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر نائٹ سے ملاقات کی۔ وہ انگریزی اخلاق کے تنزل پر گفتگو کرتے رہے۔ وہ مالیات کو نازک حالت مین نہین پاتے مگر کہتے ہین کہ انقلاب موجودہ حالت کا خاتمہ کر دیگا۔

"وہان سے مین سر اسٹوارٹ بیلی کے پاس گیا۔ رفتہ رفتہ بحث حیدرآباد کے مسائل پر آگئی۔ وہ یہ سنکر متعجب ہوئے کہ کار ڈونلڈ اور خورشید جاہ کی تائید و حمایت مین ہے۔ سر اسٹوارٹ نے نہایت ہمدردی کے ساتھ لائق علی کا ذکر کیا۔ مین نے کہا کہ بلاشبہ ان کی عمر کا لحاظ کرتے ہوئے اتنا ذمہ دارانہ عہدہ دینا غیر موزون ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر ریزیڈنسی کی طرف سے ان کی مناسب طریقہ سے تائید ہوئی

---

۵۱ بعینہٖ اس معاہدہ کو لارڈ کرزن نے ۲ سال کے بعد نہایت مجبور کن حالات مین دائمی اجارہ کی صورت مین نظام کے سر تھوپ دیا ۱۲

۵۲ Statesman ۵۳ Knight

انہیں مفید مشورہ دیا گیا تو وہ اپنے فرائض کو نہایت قابلیت سے انجام دے سکیں گے۔ وہ حیدرآباد میں بہت ہر دلعزیز ہیں۔

"پھر ہم نے شمال مغربی ہند کے آدمیوں کے متعلق گفتگو کی۔ سر اسٹوارٹ سید حسین بلگرامی کو پسند نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ ان کے مراسلات سود بانہ نہیں ہوتے لیکن اس بارے میں میری رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ سر سالار جنگ کی پالیسی پر عملدرآمد کرنے کے لئے جدید تعلیم یافتہ آدمیوں کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے گف کی تعریف کی مگر کلارک کی نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی مجھے اپنی گفتگو سے پورا اطمینان ہے۔ چلتے وقت انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا موجودہ حالات کو چندے اور قائم رہنے دیا جائے اور بعد میں مداخلت کیجائے یا نظام کے بالغ ہوتے ہی مداخلت کر دی جائے۔ میں نے کہا کہ معاملات کافی دور تک ترقی کر چکے ہیں، بہرحال انھوں نے لائق علی سے گفتگو کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ مجھے تعجب سا ہوگا اگر ٹریور کو نہ نکال دیا جائیگا یا کارڈری سے یہ نہ اسرار کیا جائیگا کہ تم اپنے طرز عمل کو بدل دو۔ حیدرآباد کے پرانے معاملات پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سر رچرڈ ٹمپل کا سر سالار جنگ کے خلاف امیر الکبیر سے اتحاد کر لینا سخت غلطی تھی اور اسکی وجہ سے حکومت ہند کو خواہ مخواہ کیچڑ میں لتھڑنا پڑا۔"

"۱۲ دسمبر۔ مولوی سید امیر حسین صاحب (کلکتہ پریسیڈنسی مجسٹریٹ) آئے۔ بنگال کے رنیٹ ایکٹ پر گفتگو رہی۔ کہتے تھے اس سے کسانوں کی تکالیف میں کمی نہ ہوگی اور مزید لگان لگانے کے لئے گورنمنٹ اس سے فائدہ اٹھائیگی۔ زمینداروں کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی ہے کہ انہیں کسی بلیغ معاوضہ دینے کی تدبیر نہیں کی گئی ہے۔ (مجھے یاد ہے ۱۸۶۹ء میں ٹیمپل نے شمال میں بنگال کے بندوبست آراضی کے متعلق یہ کہا تھا کہ ہندوستانی مالیات کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا تھا کہ اسے ایک ایک دن توڑنا پڑیگا) بنگالی مسلمانوں کے متعلق مولوی صاحب نے کہا کہ وہ نہایت مظلوم قوم ہے ہندو جو چاہتے ہیں کر گذرتے ہیں اگرچہ پرانے خیال کے ہندو اور مسلمان نہایت مخلصانہ طریقہ سے رہتے ہیں۔ مسلمان گورنمنٹ کے خلاف کسی قسم کا نمایاں حصہ لینے سے ڈرتے ہیں میں نے جواب دیا کہ ہندوستان کو قربانیوں کی ضرورت ہے اور جب تک ان میں اپنے عقائد پر مضبوطی سے جمے رہنے کی جرأت نہ ہوگی وہ کچھ کام نہیں کر سکیں گے۔ اصلاحات انہی لوگوں کو دی جاتی ہیں جو ان کا مطالبہ کرتے ہیں اور جبراً لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

"اس کے بعد کیر سٹو داس پال (ایڈیٹر ہندو پیٹریاٹ[1]) آئے۔ وہ آزاد بنگالی ہندو معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت سمجھدار پایا۔ وہ بھی رنیٹ بل کے اس بنا پر مخالف تھے کہ اس میں کسانوں کو امداد دینے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ اگر وہ واقعی اپنے ارادوں میں ایماندار ہیں تو ان کا فرض ہے کہ وہ مدراس اور بمبئی میں فاقہ زدہ کسانوں کی دستگیری کریں بجائے اس کے کہ وہ یہاں کے زمینداروں کی جیبیں کتریں۔ ان کی پالیسی یہ ہے کہ ایک شخص کو لوٹ کر دوسرے کا گھر بھریں۔ لارڈ رپن کے بارے میں کہا کہ وہ ہمدرد آدمی ہیں لیکن ابھی تک کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ بہترین وائسرائے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ سب سے ضروری شئے یہ ہے کہ سول سروس کا دروازہ ہندوستانیوں کے لئے بھی کھولدیا جائے اور اسے از سر نو مرتب کیا جائے۔ موجودہ سولین ہندوستانی باشندوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے۔ وہ سب موسمی پرندوں کی طرح آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو فی الحال کوئی نمائندگی

---

[1] Hindu Patriot

حاصل نہیں۔ انھون نے مجھسے پوچھا کہ کیا آپ پارلیمنٹ کے ممبر ہین اور اس بارے مین سوالات پوچھ سکتے ہین۔ مین نے اپنی پوزیشن بتائی اور کہا کہ اگر آپ مجھے مسالا مہیا کر دینگے تو مین کوشش کرونگا کہ اس قسم کے سوالات پارلیمنٹ مین اٹھائے جائین۔ انھون نے وعدہ کر لیا ہے اور مجھے ضروری ہدایات کے ساتھ اپنا پتہ دیدیا ہے۔ لیکن مین جتنا زیادہ ہندوستان کے متعلق سنتا ہون یا جتنا زیادہ میرا مطالعہ بڑھتا جاتا ہے مجھے گارڈن کی رائے حرف بحرف صحیح معلوم ہوتی ہے کہ "انقلاب کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوگا"

"سہ پہر کو مسٹر مانک جی رستم جی سے ملنے گئے۔ مسٹر جمشید جی جیجی بھائی بھی وہین تھے۔ وہ بوڑھے اور مالدار ہین اور اس لئے خوب آزادی سے گفتگو کرتے ہین۔ یہ خیال کرنا غلط ہے کہ پارسیون کو ہندوستانیون کے ساتھ ہمدردی نہین ہے وہ لارڈ ولیم بنٹنگ؎ سے لیکر ہر وائسرے کو جانتے ہین۔ لیکن سب سے زیادہ لارڈ کیننگ؎ کو پسند کرتے ہین کیننگ نے غدر کے زمانہ مین نہایت مضبوطی سے بے گناہ لوگون کا خون بہائے جانے سے روکا۔ انگریز کلکتہ مین مارشل لا کا نفاذ کرنا چاہتے تھے مگر اس نے انکار کر دیا۔ جہان کہین اس کا نفاذ ہوا وہان جو شخص بھی کسی کے خلاف دشمنی رکھتا تھا وہ اس کو باغیانہ قسم کی گمنام چٹھی لکھ سکتا تھا۔ پولیس اس چٹھی کو کھولتی تھی اور جس کے نام وہ بھیجی جاتی تھی اسے لاکر حاضر کرتی تھی اور بغیر مقدمہ چلائے ملزم قرار دے کر پھانسی چڑھا دیتی تھی۔ کیننگ اچھا آدمی تھا۔

"سر جو تندر و ملنے کے لئے آئے۔ انھون نے کہا کہ مصری مہم کے تمام اخراجات کا جو بار ہندوستان کے کندھے پر ڈالدیا گیا ہے اس سے ہندوستانیون کا سارا اعتماد جاتا رہا ہے۔ اس سے بڑھکر اور کوئی بات ذلیل نہین ہو سکتی۔ مین نے انہین بتایا کہ انگلستان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ یہ الفاظ ایسے وقت مین کہے جائین جبکہ انسان برسر حکومت نہو تو کوئی مدبر برسر حکومت ہو جانے کی حالت مین ان کا پابند نہین ہو سکتا۔ میری اس تشریح سے انہین ایک گونہ تعجب ہوا۔

"انگلشمین؎ اعلان کرتا ہے کہ ابرٹ بل پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور سید امیر علی کہتے ہین کہ بل کو پاس نہ کرنا دس گنا بہتر ہوتا۔ انگریزون کے مقدمہ کی سماعت ایسی جوری کریگی جس کے اکثر افراد انہی کے اہل ملک ہون گے۔ اس کی وجہ سے وہ قانون کی رو سے بچے رہین گے۔ سید صدائے احتجاج کے جلسے منعقد کرنے کے لئے کہہ رہے ہین۔ مسز البرٹ بھی لیڈی ملاقات آئین کہتی ہین کہ کسی شخص نے بھی میرے خاوند کا ساتھ نہین دیا حتی کہ لارڈ رپن نے بھی۔ وہ لارڈ رپن کے خلاف کمزوری کا الزام لگاتی ہین۔ لارڈ کمبرلے؎ نے ان کے خاوند کو مضبوط اور مستقل رہنے کی صلاح دی تھی لیکن کونسل کے ممبر چراغ پا ہو گئے اور لارڈ رپن کو بھی انہی کا ساتھ دینا پڑا۔ ان کے خاوند بہت مایوس ہو گئے ہین اور مارے شرم کے ایک ہفتہ کے لئے کسی گاؤن مین جا کر رہنا چاہتے ہین۔ بلاشبہ یہ نہایت شرمناک ہے۔ مین نے ان سے کہا کہ مین نہین سمجھ سکتا کہ اینگلو انڈین اشخاص کی ذرہ برابر بھی پروا کرنی چاہئے۔ وائسرائے کا فرض تھا کہ ان کے شور و غوغا پر بالکل کان نہ دھرتے انھون نے کہا اگر آپ بھی وائسرائے ہوتے تو بلاشبہ ایسا ہی کرتے۔

"آخر کار مولوی عبد اللطیف جو پرانے خیال کے مسلمانون کے لیڈر ہین ملنے کے لئے آئے۔۔۔۔۔ شیخ جمال الدین نے ان کے نام دیدیا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ وہ نہین آئین گے۔ یہ جج ہین اور بہت مصروفیت کے آدمی ہین۔ انھون نے آتے ہی کہا کہ لوگ آپ سے

؎ Lord William Bentinck ؎ Lord Canning ؎ Englishman ؎ Lord Kimberley

ملتے ہوئے ڈرتے ہیں، کچھ تو اس وجہ سے کہ گورنمنٹ آپ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اور کچھ اس وجہ سے کہ آپ جو کچھ دیکھتے ہین یا سنتے ہین اُسے معرض تحریر مین لے آتے ہین۔ انہین اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اسلامی مقاصد کا مین کسقدر حامی ہون کیونکہ انہین جمال الدین سے معلوم ہو گیا ہے کہ مین کیا کچھ کرچکا ہون۔ اس لئے وہ ہر بات آزادانہ کہ دیتے ہین اور مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہین۔ انہون نے مسلمانون کی دو جماعتون کا ذکر کیا اور بتایا کہ امیر علی اور ان کے احباب انگریزی لباس اور طریقۂ زندگی اختیار کرنے سے دوسری جماعت سے بالکل الگ ہو گئے ہین اور مصلح قوم بننا چاہتے ہین حالانکہ مذہبی اعتبار سے وہ اسکے اہل نہین ہین۔ بہرصورت امیر علی بنگالی مسلمانون کے نمایندے ہرگز نہین ہوسکتے اسلئے کہ وہ شیعہ ہین اور باقی سب کے سب سنّی ہین۔ مین خود بھی مصلح قوم ہون لیکن میرے کام کرنے کے اصول دوسرے ہین۔ مین مسلمانون کی مذہبی تعلیم کی اصلاح کرنی چاہتا ہون اور گذشتہ تین سال سے گورنمنٹ سے مناسب اسکول قائم کرنے کے لئے کہ رہا ہون۔ صرف مذہبی آدمیون کے ذریعے اصلاح کا کام شروع ہونا چاہئے ورنہ اس کا اثر نہ پڑیگا۔ یہ نوجوان باقی مسلمانون سے کوئی ہمدردی نہین رکھتے۔ وہ عربی اور فارسی سے بھی نابلد ہین۔ وہ لوگون اور حکومت کے درمیان کس طرح سے پڑ سکتے ہین؟

"ان تمام امور مین مین نے ان سے اظہار ہمدردی کیا لیکن ساتھ ہی ان سے کہدیا کہ گورنمنٹ سے تعلیمی معاملات مین زیادہ امید نہ رکھین اس لئے کہ موجودہ رجحان محض دنیوی تعلیم دینے کی طرف ہے اور بمشکل اس پالیسی کے خلاف عمل ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ وہ ازہر کے نمونہ کی یونیورسٹی قائم کرنے مین کچھ مدد کردے جہان طلبا اپنے ذرائع پر زندگی بسر کرینگے اور محض لکچرون مین شامل ہو جایا کرین گے۔ انہون نے بعض علماء سے ملاقات کرانے کا وعدہ کیا ہے لیکن اپنے گھر مین اس قسم کا جلسہ کرنے سے خائف ہین۔ یہ جلسہ مدرسہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہارنلی[۵۱] (یہ سوئٹزرلینڈ کے رہنے والے ہین) کے یہان ہوگا تاکہ گورنمنٹ کو ناراض ہونے کا موقع نہ ملے۔ مولانا امیر علی کی چٹھی سے سخت برہم تھے جو انہون نے عرابی کے خلاف شائع کرائی تھی۔ ان کی رائے ہے کہ جنگ افغانستان کی حیثیت دوسری ہے۔ ہم نے اسکی تائید اسلئے کی ہے کہ وہ درحقیقت روس کے خلاف حملہ ہے جو اسلام کا بدترین دشمن ہے۔ مین نے توقع ظاہر کی ہے کہ مسلمانانِ ہند آئندہ ان تمام لڑائیون کو جو مسلمانون سے کسی بہانہ سے بھی کی جائین گی، روا نہ رکھین گے۔

"مین امیر علی اور سید حسین سے انہین بہت بہتر سمجھتا ہون۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ان سے زیادہ کامیاب ہو جائین گے۔ وہ مسلمانون کے مستقبل کے نمایندے ہین اور مولوی صاحب ماضی کو ظاہر کرنے والے ہین۔ ان کے صاحبزادے کوٹ اور انگریزی ٹوپی اور بوٹ پہنتے ہین (جس سے ان کو بہت رنج ہے) لیکن صاحبزادے کا کہنا یہ ہے کہ اگر مین ایسا نہ کرون تو اینگلو انڈین سوسائٹی مین مجھے بار نہ ملیگا۔ عبد اللطیف مشرقی لباس زیب تن کرتے ہین۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سید جمال الدین سے ذاتی طور پر واقف نہین ہین اس لئے کہ وہ ایسے شخص سے ملتے ہوئے ڈرتے تھے جو گورنمنٹ کا معتوب ہے۔

"ہم نے کلکتہ کے بشپ ڈاکٹر جانسٹن[۵۲] کے ساتھ کھانا کھایا۔ اپنے ہمعصرون کے مقابلہ مین بہت روشن خیال ہین۔ وہ کسی آدمی کو نہ تو عیسائی بنانا چاہتے ہین اور نہ انگریز۔ وہ اسلامی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہین۔ مین انہین عبد اللطیف سے ملاؤنگا۔

Dr. Johnston ۵۲ Dr Hoernle ۵۱

"۲۳۔ دسمبر۔ نظام اپنے عملہ سمیت کل یہان پہنچ گئے اور مین سالار جنگ سے ملنے کے لئے گیا تاکہ اپنی ملاقات کا حال ان سے بیان کرون۔ مین نے انھین عبداللطیف کو ساتھ لا لینے اور امیر علی سے بہت زیادہ نہ ملنے جلنے کا مشورہ دیا اس لئے کہ ایسا کرنے سے سالار جنگ قدیم خیال کے مسلمانون کی ہر دلعزیزی سے محروم ہو جائین گے۔ اگر ذرا سا بھی ان کے متعلق یہ شبہ ہو گیا کہ وہ لامذہب ہین تو ان کا سارا کھیل بگڑ جائیگا اس لئے کہ خالصتہً اسلامی ریاست کا وزیر ہونے کی حیثیت سے انھین پورے طور پر مسلمان رہنا ضروری ہے۔ نظام پیشکار وغیرہ کے یہان اپنا کارڈ چھوڑ آیا ہون۔

"صبح کو سید نورالہدی ملنے کے لئے آئے۔ یہ جدید گروہ سے تعلق رکھتے ہین۔ ان کے ساتھ ایک عیسائی برہمن بھی تھے، ڈاکٹر سندیل ان کے والد کئی برس ہوئے عیسائی ہو گئے تھے۔ مین نے پوچھا کہ تبدیل مذہب کا آپ کے معاشرتی تعلقات پر کیا اثر پڑا ہے۔ کہنے لگے کہ ہندؤن نے تو مجھے بالکل صحبت سے خارج کر رکھا ہے، باقی رہے انگریز تو وہ بھی نہین ملتے۔ دونو البرٹ بل کے سمجھوتہ پر سخت ناراض تھے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اسکی نسبت دیسی افسرون پر کسقدر دباؤ ڈالا گیا ہے۔ میرے ایک دوست کے پاس جو سرکاری ملازم ہین، اسکے بڑے افسر نے نیم سرکاری خط اس مضمون کا بھیجا کہ اگر تم بل کے تائیدی جلسون مین شرکت کروگے تو سخت تکلیف اٹھاؤگے۔ یہ سنکر مجھے یقین آ گیا اس لئے کہ انگلستان مین مرلی کی حمایت مین جو فنڈ کھولا گیا تھا، اس مین چندہ دینے سے افسرون کو روکا گیا تھا۔

"ہم ایک اپنے زمیندار دوست سے ملنے کے لئے گئے۔ وہ ہگلی پر ایک اتار پرا مین رہتے ہین۔ ان کے والد کی زمینداری ۴، ۵ لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی رکھتی ہے۔ انھون نے ایک کتب خانہ بھی قائم کیا ہے۔ اب انکا ارادہ یہ ہے کہ لائبریری کے اوپر کے حصہ مین کالج بنا دیا جائے۔ ان کے والد کو دیکھکر کارڈینل نیومین کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ وہ بہت بڈھے ہین مگر آواز مین کرارا پن موجود ہے۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ ہندوستانیون اور انگریزون کے درمیان مخالفت بڑھتی جاتی ہے۔ جدید سویلین افسر سابق کے مقابلہ مین بہت معمولی درجہ کے ہین وہ صرف ہوشیاری مین پہلے افسرون سے بڑھے ہوئے ہین۔ البرٹ بل کے بارے مین انھون نے کہا کہ وہ انصاف کی اصلاح کرنے کی ایک کوشش تھی۔ فوجداری قانون اور عام شہری قانون جس طریقہ سے برتا جاتا ہے وہ بہت خراب ہے۔ انگریز ہندوستانیون کے رسوم و رواج سے واقف نہین ہین اور جو ہندوستانی مقابلہ مین آکر اعلی عہدون پر پہنچ گئے ہین ان کی اہل ملک کی نظر مین کوئی وقعت نہین اسلئے کہ ان کا تعلق ادنی ذاتون سے ہے۔ وہ افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اچھا زمانہ اب گذر گیا۔

"ہم دیہات کا مطالعہ کرنے کی غرض سے گئے۔ مدراس کے مقابلہ مین بنگال کے کسانون کی حالت اچھی ہے۔ واپسی پر ہم نے دیکھا کہ البرٹ بل کے سمجھوتہ کے خلاف صدائے ناراضگی بلند کرنے کی غرض سے تقریباً سو آدمیون کا جلسہ ہو رہا ہے جلسہ مین جس معیار کے مطابق کارروائیان ہو رہی تھین، اس سے انگلستان کے جلسون سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ سرندر ناتھ بنرجی کے آنے کی بھی توقع کیجاتی تھی مگر وہ نہین آئے۔ جلسہ کی کچھ کارروائی (غالباً ہمارے سمجھنے کے لئے) انگریزی مین تھی اور باقی بنگالی مین۔

"۲۴۔ دسمبر۔ آج ولایتی ڈاک کا دن ہے اور اسلئے ہم دن بھر چٹھیان لکھتے رہے۔ مولوی سمیع اللہ (علیگڑھ) اپنے دو بھتیجون سمیت آئے۔

ل Cardinal New man

وہ یہان نمائش کے سلسلہ مین آئے ہوئے ہین۔ ہم نے بہت دیر تک البرٹ بل کے سمجھوتہ کے بارے مین گفتگو کی۔ وہ کہتے تھے کہ ہندو مسلمان دونون کو اس سے صدمہ پہنچا ہے۔ وہ امیر علی سے کل ملے تھے اب انہون نے گورنمنٹ کی طرفداری شروع کردی ہے۔ مولوی نے کہا کہ وہ ترقی چاہتے ہین اور یہی وجہ ہے کہ وہ سمجھوتہ کی تائید وحمایت کر رہے ہین۔ مین نے صاف طور پر مولوی سے یہ بات کہدی ہے کہ اگر مسلمان اس معاملہ مین ہندوؤن کا ساتھ نہین دینگے تو وہ یاد رکھین کہ کم سے کم ۲۰ سال تک کوئی اصلاح نافذ نہین کیجائیگی۔ اگر آپ لوگ چاہتے ہین کہ گورنمنٹ کے ہاتھ باندھ دین تو اسکے لئے ضروری ہے کہ باہمی اختلافات کو دور کر کے متفقہ طور سے جنگ کرین یہ بل میدان جنگ ہے جسپر ہندوستان مین اصول قانون سازی کا تمامتر دارومدار ہے۔ اور مسلمان ایک طرف یا دوسری طرف ہو کے ترازو کے پلڑے کو جھکا سکتے ہین۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولوی صاحب کو میرے دلایل سے کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے۔ مین نے کہدیا ہے کہ اگر مسلمانون کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو جائیگا تو کم سے کم گورنمنٹ ان سے ویسا سلوک روا نہین رکھیگی جیساکہ وہ آج کل کر رہی ہے۔ انگلستان مین ہمین ہمیشہ ہندوستان مین اسلامی شورش کے ہونے سے ڈرایا جاتا ہے اور اگر ایک مسلمان کچھ بات کہدیتا ہے تو اسکی طرف اسقدر توجہ کیجاتی ہے کہ ۲۰ ہندوؤن کے کہنے پر بھی اتنی توجہ مبذول نہین کیجاتی۔ لیکن اگر مسلمان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے اور ان مراعات کے لئے جو انہین میسر نہین ہین، خدا تعالی کا شکریہ ادا کرتے رہے تو اس سے انگریزی پبلک بیحد خوش ہوگی۔ مولوی صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ مسلمانون کا طرز عمل طے کرنے کے متعلق آج شام کو جو کانفرنس اس بارے مین ہونے والی ہے اس مین اپنے خیالات اچھی طرح سے بیان کر دینگا۔ بہرحال مجھے بھروسہ ہے کہ مین نے تھوڑا بہت نیکی کا کام انجام دے دیا ہے۔

" ان کے جاتے ہی مولوی الف میم ملنے کے لئے آئے۔ یہ جمال الدین کے نمونہ کے آدمی ہین جنہون نے روشن خیال مذہبی تحریک کی بنیاد ڈالی ہے۔ انہون نے کلکتہ کی مختلف جماعتون کے باہمی اختلافات پر کماحقہ روشنی ڈالی۔ مسلمانون کی اصلاح اور ان مین اتحاد پیدا کرنے کے خیالات جمال الدین کے پیدا کردہ ہین۔ مین نے ان سے بھی باصرار یہ بات کہی کہ سمجھوتہ کے خلاف اظہار ناراضگی کرنے مین آپ ہندوؤن کا ساتھ دین۔ انہون نے کہا کہ اگر کوئی مشہور لیڈر جلسہ منعقد کرنا چاہیگا تو مین اس مین سو آدمی لیجاؤنگا لیکن ہائی کورٹ کا مترجم ہونے کی حیثیت سے مین خود تحریک کو شروع نہین کرنا چاہتا۔ مولوی صاحب اچھی انگریزی بولتے ہین لیکن انہون نے انگریزی آداب ورسوم اختیار نہین کئے۔ لباس بھی مشرقیانہ ہے۔ وہ عرب معلوم ہوتے ہین اور یقین دلاتے ہین کہ مین خالصتہً بنگالی ہون۔ وہ کہتے تھے کہ جمال الدین کلکتہ کے مسلمانون سے بہت مایوس تھے اسلئے کہ وہ گورنمنٹ کے خوف سے ان کی جانب متوجہ نہین ہوتے تھے۔ امیر علی کی نسبت ان کی رائے معمولی ہے۔ عبداللطیف ڈرپوک ہین اور باقی مولویون کو گرد وپیش کے واقعات کی مطلق خبر نہین۔

"پھر مین ڈاکٹر ہارنلی سے ملنے گیا۔ انہون نے مجھے مدرسہ دکھایا جس مین آٹھ سو لڑکے تعلیم پاتے ہین۔ پانچسو نے انگریزی اور فارسی لے رکھی ہے اور تین سو نے عربی۔ یہ سب ۱۲ آنے ماہوار فیس ادا کرتے ہین اور اسپر بھی انہین یہ شکایت ہے کہ فیس بہت زیادہ ہے۔ انہین معلوم نہین کہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلبا کیا کیا کرتے ہین۔ عربی طلبا کے بارے مین کہا کہ غالباً وہ مولوی بن جاتے ہین۔ کالج مین ۶ پروفیسر ہین، ہر ایک کا مشاہرہ پچاس روپے ہے۔ چونکہ تعطیلات کا زمانہ تھا اس لئے صرف نصف درجن طلبا بورڈنگ مین تھے۔

والسرایان کہتے ہیں کہ والسرائے نے ملاقات کے وقت نظام سے کہدیا ہے کہ مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد اپنے بڑے عہدہ کے فرائض سنبھالیں گے شگون اچھا ہے۔

"۲۵ر دسمبر۔ انڈین مرر نے آج کی اشاعت میں ایک لیڈنگ آرٹیکل لکھا ہے جس میں تمام جماعتوں سے درخواست کی ہے کہ ہمارا عزت و احترام کے ساتھ استقبال کریں۔ ساتھ ہی مضمون کے ساتھ جو ہمدردی ہم نے کی ہے اسکے لئے ہمارا شکریہ ادا کریں۔ میرا خیال ہے کہ ہم ٹھیک موقع پر پہنچے ہیں۔

"آج تین شخص ملنے کو آئے۔ سب سے پہلے سمبھو چند۔ انگریزی سابق ذریر راجہ صاحب پتیرا آئے۔ اعلیٰ درجہ کی پوشاک پہنے ہوئے تھے۔ انھوں نے عرب اور دنیا کے دیگر مقامات کے مسلمانوں کے بارے میں بہت سے سوالات کئے۔ بظاہر وہ اسلامی تاریخ سے اچھی طرح سے واقفیت رکھتے ہیں۔ مسٹر گلیڈ اسٹون کے خصائل پر بھی بحث کی۔ انھوں نے اس کی زندگی کا اسوقت سے مطالعہ کرنا شروع کیا ہے جب کہ انھوں نے "مذہب و سلطنت"[1] کے عنوان سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ جو طرز عمل انھوں نے مصر میں اختیار کیا ہے مجھے اس پر کچھ بھی تعجب نہیں۔ انگریزی تدبیر میں اخلاقی عنصر کی کمی پر انھوں نے اظہار افسوس کیا۔ ہماری (آریون) کے اعتقادات اور اصولوں کی اہمیت کا انھوں نے صحیح اندازہ لگایا ہے۔ یہ کسقدر حماقت انگیز ہے کہ ہندوستانی ہم سے ذہنی لحاظ سے گھٹ کر ہیں، نہیں وہ ہم سے بڑھکر ہیں۔

"دوسرے صاحب کبیر الدین تھے جو کلکتہ کے واحد اسلامی اخبار کے جوائنٹ ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں امیر علی کی جماعت کا آدمی ہوں لیکن سوائے اس کے کہ وہ انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں میں نے کوئی جدید بات ان میں نہیں پائی۔ میں نے البرٹ بل کے معاملہ میں ہندوؤں کا ساتھ دینے کے مسئلہ پر ان کی توجہ مبذول کی لیکن انھیں سخت ضدی پایا۔ وہ اس خیال سے آگے نہیں بڑھ سکے کہ سول سروس میں کوئی مسلمان نہیں ہیں جنھیں بل سے فائدہ پہنچتا۔ بلکہ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جہانتک ہندوستانیوں کا تعلق ہے اصول قانون سازی خطرے میں ہے۔ میرا خیال ہے کہ اپنی بیوقوفی کی وجہ سے وہ یہ تمام باتیں سمجھنے سے قاصر رہے۔

"اس کے بعد ہم مسٹر اور مسز لائل[2] سے ملے جو لفٹنٹ گورنر کے سرکاری قیام گاہ بلویڈیر[3] میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان سے سیاسی نوک جھونک رہی لفٹنٹ گورنر ریورز ٹامسن[4] سے ہم اس لئے نہ مل سکے کہ وہ بہت بیمار ہیں۔

"ہم نے کرسمس کا کھانا خاموشی سے کھایا۔ ہماری حالت ایسی تھی جیسی کہ یہودیوں کی کسی عیسائی تہوار کے دن ہوتی ہو۔ مگر انڈین نیشنل ایسوسی ایشن[5] کے سکرٹری یا پریسیڈینٹ مسٹر گھوش کے پاس سے ہمارے نام ایک خط آیا جس میں ہماری آمد پر اظہار خوشی کیا گیا تھا اور امید ظاہر کی گئی تھی کہ کلکتہ میں آپ کا قیام ہندوستان کے فائدے کے لئے ہوگا۔

"۲۶ دسمبر۔ تمام صبح ہم مصروف رہے۔ ہمارے ابتدائی دوست مولوی الف...م سے مستقبل اسلام کے متعلق گفتگو رہی انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستان کی نسبت آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اسے آسٹریلیا کا مرتبہ ملنا چاہئے یعنی یہ کہ ہر ایک

[5] Indian National association [4] A. R. Thompson [3] Belvidera [2] Lyall [1] Church & State

صوبہ کی جداگانہ انگریزی حکومت ہو جس کے ساتھ انگریزی افواج بھی ہون، لیکن تمامتر شہری نظم و نسق، قانون سازی اور مالیات ہندوستانیون کے ہاتھ مین ہو۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ شمالی ہندوستان قریب قریب اسلامی اور جنوبی ہندوستان قریب قریب ہندو حکومت کے تحت مین آجائیگا۔ اس حل سے وہ بہت خوش ہوئے۔ انہون نے کہا کہ کوئی بھی مسلمان ایسا نہین جو انگریزی حکومت کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ دینا چاہتا ہو اس لئے کہ ایسا کرنے سے خانہ جنگی شروع ہو جائیگی اور کم سے کم ایک سو سال تک تو ہندوؤن اور مسلمانون کا باہم متفق ہو کر رہنے کا کوئی امکان نہین، لیکن بلاشبہ ہم انگریزی نظم و نسق پسند نہین کرتے جو غیر معمولی طور پر ہندوؤن کے موافق ہے۔ لیکن اگر انہین تنہا چھوڑ دیا جائے تو تمام شمالی ہندوستان مین وہ اپنی پوزیشن قائم رکھ سکین گے۔ انگریزون کی پالیسی یہ رہی ہے کہ ان کو دبایا جائے اور ان کی تعلیم مین مشکلات پیدا کی جائین۔ کلکتہ کے مولویون کو اسکی اصلا خبر نہین کہ سیاسیات کسے کہتے ہین اور وہ معاملات دنیا سے بالکل نابلد ہین۔ مصری جنگ کے زمانہ مین انھین اتنی خبر نہ تھی کہ مصر شمال مین ہے یا جنوب مین مشرق مین ہے یا مغرب مین۔ مین کل ان کے ساتھ کھانا کھاؤنگا تاکہ جمال الدین کے مریدون سے مل سکون۔

"پھر ہم نے تعلیم اور یونیورسٹی قائم کرنے کے مسائل پر گفتگو کی۔ سب سے بڑی دقت روپیہ کی ہے۔ بندوبست دوامی کے موقع پر بڑے بڑے مسلمان زمیندار اپنی زمینون کے چھن جانے پر تباہ و برباد ہو گئے، اور باقی مالدار آدمی جو سرکاری ملازم تھے سنہ ۱۸۶۲ء مین عدالتون کی زبان بدل دیئے جانے کی وجہ سے ملازمت سے علحدہ کر دیئے گئے۔ اب یہ حالت ہے کہ بنگال مین مشکل سے مالدار مسلمان ملین گے۔ اکثر لوگ روزانہ محنت و مزدوری کرکے اپنا پیٹ پالتے ہین اور اپنے بچون کی تعلیم کے لئے ایک روپیہ ماہوار بھی خرچ کرنے کی مقدرت نہین رکھتے۔ اتنے مین اطلاع ملی کہ نواب میر محمد علی آئے ہین یہ قدیم زمینداروں کی یادگار باقی رہ گئے ہین۔ بہت معمر ہین۔ ہم نے انہین اندر بلا لیا اور اپنی گفتگو کو جاری رکھا۔ انہین بہت گھبراہٹ ہوئی جب مین نے فہرست چندہ دہندگان مین ان کا نام بھی تجویز کیا۔ ان کے لئے زیادہ دلچسپ مسئلہ بنگال کا مسودۂ لگان تھا۔ عبداللطیف کے صاحبزادے یورپین لباس مین نمودار ہو گئے۔ پھر ہم نے البرٹ بل پر گفتگو شروع کی مین نے سب سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ مین ہندوؤن کا ساتھ دین اور ان سے یہ وعدہ لے لین کہ جب کبھی ہمارے اغراض و فوائد خطرہ مین ہون گے تو وہ ہماری امداد کرین گے۔ بوڑھے میاں میری اس تجویز سے بہت خوفزدہ ہوئے اور اٹھکر چلے گئے۔ جب تک مسلمان اس قسم کے معاملات مین قوت نہ دکھائین گے اسوقت تک ان کی شکایات پر توجہ نہ ہوگی۔

"ان کے جاتے ہی سالار جنگ آئے اور میری کوششون کا شکریہ ادا کیا۔ پھر مین نے لارڈ رپن والی گفتگو کی یادداشت دکھائی۔ انہون نے پرسون کے دن نظام کی طرف سے مجھے دعوت دی۔ کارڈری ...... کی سازش کا توڑ کرنا اور نظام کو گدی پر بٹھانا بالیقین مفید ہے۔ سالار جنگ نے مجھے اطلاع دی ہے کہ لارڈ رپن نے نظام سے کہدیا ہے کہ آپ فروری مین بالغ ہو جائینگے۔ اگر سالار جنگ کو دیوان مقرر کر دیا گیا تو ہماری فتح مکمل ہو جائیگی۔ سالار جنگ اسٹوارٹ بیلی سے بھی مل لئے ہین جنھون نے ان کا تپاک آمیز استقبال کیا تھا۔

"ان کے بعد سرندرا ناتھ بینرجی آئے جو جج نارمن پر نکتہ چینی کرنے کے باعث قید بھگت چکے ہین۔ بظاہر وہ بہت کام کے آدمی معلوم ہوتے ہین اور چونکہ وہ قید برداشت کر چکے ہین اس لئے وہ زیادہ دلیر ہین۔ البرٹ بل سے سخت برہم ہین۔ انھون نے تاکید کی کہ آپ

مسلمانون کو ہمارے ساتھ صدائے احتجاج مین شریک ہونے کے لئے کہین اور مین نے وعدہ کرلیا ہے کہ آج شام کو امیر علی کے یہان ضیافت کے موقع پر مین اپنی سی کوشش کرونگا۔ وقت آگیا ہے کہ باہمی اختلافات کو بالائے طاق رکھدیا جائے۔ لیکن مسلمانون کو متحرک کرنا دشوار کام ہے۔ مولوی صاحب اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہین کہ کلکتہ کے مسلمانون مین ایسے لیڈرون کی کمی ہے جو سرکاری تنخواہ کے سوائے دوسرا ذریعۂ آمدنی رکھتے ہون، نہ تو امیر علی اور نہ عبداللطیف پورے طور پر ان کی نمایندگی کرسکتے ہین اس لئے کہ ان کی ترقیون کا دار و مدار گورنمنٹ پر ہے۔ مولوی احمد نے مسلمانون کی نہایت تاریک تصویر پیش کی ہے۔ وہ کہتے ہین کہ ہندوؤن کے ساتھ ان کا ملنا دشوار ہے اس لئے کہ وہ اتنے خود غرض ہین کہ ساری اسامیان خود اپنے پاس رکھنا چاہتے ہین۔ ۷۰ میونسپل کانسلرون مین سے صرف ۵ مسلمان ہین اور اگر ہندوستانیون کو زیادہ اختیارات دیئے گئے تو مسلمانون کی حالت اور خراب ہوجائیگی۔ مسلمانون کی مفلسی ان کی بڑی سد راہ ہے۔ ان مین تعلیم دلانے کی قابلیت نہین ہے اور اس لئے وہ پیچھے رہے جاتے ہین۔ مین نے انہین اپنا ہم خیال بنانے اور سخت جد و جہد کو کام مین لانے کی کوشش کی مگر بیسود۔

"آخر کار ہم گھوڑ دوڑ دیکھنے کے لئے گئے۔ ہمارے سامنے شیر وڈ[2] نے یوفریٹز[1] سے بازی جیتی۔ بہت سے مسلمان گھوڑ دوڑ دیکھنے کیلئے آئے تھے۔ عبداللطیف کو مین نے خورشید جاہ سے باتین کرتے ہوئے دیکھا۔ نظام بھی وہان تھے اور ان کے چہرے سے اطمینان کے آثار نمایان تھے۔ وہ مسکرا بھی رہے تھے اور ہم سے تھوڑی بہت بات چیت بھی کی۔

"کھانا امیر علی کے یہان کھایا۔ دعوت مین سب کے سب مسلمان تھے۔ صرف ایک نومسلم تھے جو انگلستان ہو آئے تھے۔ کل تعداد تقریباً ۱۵ تھی اور اس لئے ہم نے اسلامی مسائل پر آزادانہ گفتگو کی۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد کوئی ۵۰ آدمی اور آگئے۔ کلکتہ کے سب عمائدین وہان موجود تھے۔ سابق شاہ اودھ کے چچازاد بھائی بھی تھے۔ بعض اشخاص بصرہ اور بغداد کے رہنے والے تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرا ایسا تپاک آمیز استقبال کیا جائیگا۔ یہان سلطان المعظم کے ساتھ وہ اندھی عقیدت نہین پائی جاتی جسکا یقین مجھے جمال الدین نے دلا دیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے غیر حاضری مین واقعات بدل گئے ہین اور قسطنطینہ کی کمزوری نفرت کا جذبہ پیدا کر رہی ہے۔ بلاشبہ سلطان المعظم کے ساتھ دنیائے اسلام کا سرتاج ہونے کی حیثیت سے جذبۂ وفاداری موجود ہے۔

"مجھے عبداللطیف سے یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ مسلمانون کو البرٹ بل کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اور وہ متفق ہین کہ انہین اظہار ناراضگی کرنا چاہئے۔ لیکن وہ محتاط آدمی ہین اور کسی بات کا وعدہ نہین کرتے۔ مجھے تعجب ہوگا اگر نیشنل محمڈن[3] سوسائٹی کے کل والے جلسہ مین امیر علی میرا نکتۂ خیال پیش نہ کرینگے۔ میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانون کو نرم لہجہ مین وائسرائے کے پاس اپنی ناراضگی کی اطلاع بھیجدینی چاہئے جس مین انہین یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ اگرچہ اس کا براہ راست مسلمانون پر کوئی اثر نہین پڑتا تاہم مجوزہ سمجھوتہ قانون کی نظر مین مساوات کے اصول کو نقصان پہنچانے والا ہے۔ مین نے امیر علی کو صلاح دی ہے کہ وہ باہمی مفاد کی خاطر ہندوؤن سے باقاعدہ اتحاد کرلین۔

"۲۸۔ دسمبر۔ مولوی الف میم کے یہان کھانا کھایا۔ کل کی ضیافت سے وہ مختلف ہے۔ سب لوگ عربی مصری جنگ جمال الدین اور مستقبل اسلام کے متعلق میرے خیالات سننے کے بہت شائق تھے۔ انھون نے انگلستان کے خلاف اپنی نفرت چھپانے کی کوشش نہین کی۔ اور توقع ظاہر کی کہ مہدی

---

[3] National Mohammadan Society　[1] Euphrates　[2] Sherwood

انگریزون کو مصر سے نکال دیگا۔ انھون نے کہا کہ مصری جنگ کے دوران مین ہم امید کر رہے تھے کہ عربی پاشا ہماری شان و شوکت کو بحال کر دیگا کیونکہ ہماری حالت اس قدر خراب ہے کہ ہمین ایک نجات دہندہ کی ضرورت ہے۔ جمال الدین کا یہ لوگ اسقدر احترام کرتے ہین کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پرستش کر رہے ہین۔ ان نوجوانون کے چہرے شاندار ہین مگر ان کے فاقہ زدہ جسم محض ہڈیان رہ گئی ہین۔ وہ اپنا سارا روپیہ اپنی تعلیم پر صرف کرتے ہین اور میرا خیال ہے کہ دعوت پر انھون نے جسقدر روپیہ صرف کیا ہے وہ ان کی کئی ماہ کی آمدنی ہوگی۔ کھانا ہندوستانی طرز کا تھا اور ہمین پینے کے لئے پانی دیا گیا تھا۔ اس جلسہ سے مجھے ہندوستانی مسلمانون کے متعلق بہت کچھ معلوم ہوا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ہر راہ دکھانے والے کو لبیک کہین گے خواہ وہ روسی ہو یا فرانسیسی۔ حاضرین مین سے ایک نے وکٹر ہیوگو[۵۱] کی نظم پڑھی جو عربی کی تعریف مین لکھی گئی تھی اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ فرانسیسی ان کے ہمدرد ہین۔ وہ یہ بھی کہتے ہین کہ چندر نگر کی حکومت بہترین ہے۔

"۲۰۔ دسمبر کی صبح سویرے ملنے کے لئے آئے۔ وہ لارڈ رپن سے حیدر آباد کے معاملات پر گفتگو کرنے جا رہے ہین۔ مین نے اختصار کے ساتھ اپنی گفتگو بتائی تاکہ وہ بھی اس کی پیروی کرین۔ وہ حیدر آباد کی سازشون کا حال اسٹیٹسمین مین شائع کرا رہے ہین۔ خورشید جاہ بھی ملنے کے لئے آئے۔ ان کے ہمراہ انگریز سکریٹری تھے۔ ان کی گفتگو اچھی نہین ہوتی ہم نے ترجمان کے ذریعہ گفتگو کی۔

"۱۱ بجے ہم نیشنل کانفرنس کے جلسہ مین شریک ہوئے۔ بوس صدر تھے۔ انھون نے کہا کہ رفتہ رفتہ ہی ہماری قومی پارلیمنٹ ہو جائیگی۔ ابتدا مین یہ بحث چھڑ گئی کہ صنعتی تعلیم کے لئے لڑکون کو فرانس بھیجنا چاہئے لیکن ان کا اصلی مقصد سول سروس پر حملہ کرنا تھا۔ سرندرا ناتھ کی تقریر بالکل میرے خیالات کا آئینہ تھی۔ مجھ سے بھی تقریر کرنے کے لئے کہا گیا لیکن مین نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ جب تک میرا سفر ختم نہو جائے مین پبلک مین اپنے خیالات پیش نہین کرونگا۔ لیکن بمبئی مین مین تقریر کرونگا۔ مجھے ایسے اہم جلسہ مین شرکت کرنے سے خوشی ہوئی۔ بینرجی اور بوس اعلیٰ درجہ کے مقررین۔

"۲۹۔ دسمبر۔ آج صرف ایک شخص دلاور حسین ملنے کے لئے آئے۔ انھون نے مسلمانان بنگال کی مفلسی کی بھیانک تصویر پیش کی۔ میرے خیال مین ان کی حالت امید افزا نہین۔ باوجود اتنی بیشمار تعداد کے ان کا کوئی اثر نہین پایا جاتا۔ اکثر مسلمان یا تو معمولی کسان ہین یا بڑے بڑے شہرون مین مزدوری کرکے پیٹ پالتے ہین۔ تجارت ان کے ہاتھ مین نہین ہے اور جو چند امیرزادے ہین وہ سرکاری ملازمت کر لیتے ہین۔ اس کشمکش حیات مین مسلمان نہایت کمزور ہوتے جاتے ہین۔

"مین کانفرنس کے دوسرے جلسہ مین بھی گیا۔ وہان بھی سول سروس کا مسئلہ زیر بحث تھا۔ مین نے بھی مختصر سی اسپیچ دی جس مین مین نے شکریہ ادا کیا اور بیان کیا کہ یہ جلسے قومی نوعیت رکھتے ہین اور پارلیمنٹ کی ابتدا مین جس کا حاصل کرنا سب کا مطمح نظر بنا ہوا ہے۔ مین نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ انھین ایک نہ ایک دن کامل سیلف گورنمنٹ ملیگی۔ میرا عقیدہ ہے کہ تمام اقوام سیلف گورنمنٹ کے لئے موزون ہین۔ پھر مین نے یونان کی حالت بتاتے ہوئے کہا کہ جب اسے اپنا گھر سنبھالنے کے لئے دیا گیا تو وہ چور، ڈاکوؤن اور لیٹرون کی جائے پناہ تھا اور کسان نہایت جاہل تھے لیکن ۵۰ سال کے اندر انھون نے باقاعدہ حکومت قائم کر لی۔ ایسی حالت مین کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی قوم سیلف گورنمنٹ کے قابل نہین ہے! میری تقریر بہت پسند کی گئی اور سب نے میری ہمدردی پر اظہار خوشی کیا۔ کل کی بھی جلسے مین آئینگے اور دیہاتی مصائب پر تقریر کرینگے۔

---

[۵۱] Victor Hugo

ڈیورنڈ[۱] کو ساتھ لیکر پھر مین ٹاؤن ہال مین زمینداروں کے جلسہ مین گیا۔ کمرے کی ساخت نہایت خراب ہے، مقررون کی تقریرون کو آسانی سے نہین سنا جاسکتا۔ مسودۂ لگان کے خلاف ریزولیوشن پاس کئے گئے۔ سر جو ندر وہیت سے رؤسا اور نواب اور گورنمنٹ بھی شریک ہوسے تھے بسر سٹوارٹ بیلی کے یہان کھانا کھایا۔ سالار جنگ کے علاوہ لائل اور دفتر خارجہ کے سکریٹری ڈیورنڈ بھی تھے۔ ہم نے سیاسیات مین جھوٹ بولنے کی ضرورت اور عدم ضرورت پر بحث کی۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میرے بعض خیالات سے حاضرین کو تکلیف پہنچی ہوگی۔ مگر مجھے خبر نہ تھی کہ ڈیورنڈ دفتر خارجہ مین ہین۔

"عبداللطیف کے صاحبزادے عبدالرحمن سے سر سید احمد کے تعلیمی اور مذہبی خیالات پر بات چیت رہی۔ وہ دونون کو ناپسند کرتے ہین۔ سر سید کا شروع مین یہ خیال تھا کہ ہر ایک مضمون اردو کے ذریعہ پڑھایا جائے مگر اب انھون نے یہ خیال ترک کر دیا ہے۔ لوگ کہتے ہین کہ علیگڈھ مین مذہب کی تعلیم نہین دی جاتی۔ سید احمد نے سنی بنکر کام شروع کیا، پھر وہابی ہو گئے اور اب وہ محض ایک خدا کے قائل ہین اور الہامات کے منکر ہین۔ ہم نے مذہبی مبادیر ایک یونیورسٹی قائم کرنے کے خیال پر بحث کی۔ سب نے میری رائے سے اتفاق کیا کہ اختلافات، مسلمانون کی مفلسی اور گرانی کے باعث کلکتہ اسلام کا مرکز بننے کی اہلیت نہین رکھتا۔ رات کو پڑے پڑے مجھے خیال آیا کہ حیدرآباد نہایت موزون ہوگا۔ وہان نہ صرف ضروریات زندگی سستی ہین بلکہ وہ اسلامی حکومت کا مرکز ہے اور وہان مذہبی خیالات انگریزی اور ہندو دخل اندازی سے محفوظ رہین گے۔ اس خیال سے مین نے سالار جنگ کے روبرو اپنی تجویز پیش کی وہ بہت خوش ہوئے اور انہین یقین ہے کہ نظام بھی محظوظ ہونگے۔

"پھر مین نیشنل ڈیلیگیٹس[۲] کے آخری جلسہ مین گیا جس مین قومی فنڈ کی ترویج پر بحث کی گئی تھی۔ ڈیڑھ ڈیڑھ سو کے چندے سے ابتدا کی گئی۔ ایک زمیندار نے ۵۰ ہزار روپے دیئے۔ مین نے بھی ۲۰۰ روپے دیئے۔ مین نے ان کے تار اور ریزولیوشن بھیجنے کے بارے مین اپنی امداد پیش کی اور انہین بتایا کہ جلسون کی کارروائیون کی وسیع اشاعت کرنے کی کسقدر ضرورت ہے۔ مین نے ان سے یہ کہا کہ وہ اس ایجنسی کے غریب کسانون کے مفاد کو بھی اپنے پروگرام مین شامل کرلین۔ غربا کے اغراض و مقاصد کی حمایت ہی کا نتیجہ تھا کہ سارا مصر عرابی پاشا کے ساتھ ہو گیا۔

"کی آئے اور اپنا ایڈریس پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ مین نے یہان بھی اسپیچ دی۔ مین نے بتایا کہ پہلے مجالس واضعان قوانین مین نمایندگی بذریعہ انتخابات ہونی چاہیے۔ پھر پارلیمنٹ مین ہندوستان کی شرکت ہونی چاہئے اور پھر ہندوستان کو نوآبادیون کے طرز پر اپنی پارلیمنٹ ملنی چاہیے۔ جلسہ کی کارروائی کے آخر مین گی اور میرے لئے شکریہ کا ووٹ پاس کیا گیا۔ خدا کرے ہندوستانی پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس تاریخ مین یادگار رہے۔

"نظام کے ساتھ کھانا کھایا۔ مین نے مناسب نہین سمجھا کہ یونیورسٹی کے متعلق خود ان سے کہون۔ سالار جنگ کے ذریعہ مین یہ تجویز پیش کرونگا کہ نظام کی تخت نشینی کے موقع پر اسکا اعلان کر دیا جائے۔ وہ موقع بہت اچھا ہوگا اور وہ اسلئے انکار نہین کر سکین گے۔

"۱۳، دسمبر۔ آج صبح بہت سے آدمی ملنے آئے۔ ہر ایک کا ذکر ترتیب وار کرونگا۔ فریدالدین احمد اکبر حسین کو لیکر آئے موخر الذکر میری کتاب "مستقبل اسلام"[۳] کے مترجم ہین۔ ہم نے اسکے متعلق گفتگو کی۔ مین نے نیا دیباچہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے جس مین سلطان المعظم کے بارے مین دل خوش کن الفاظ درج کرونگا۔ یہ کارروائی قسطنطنیہ کو خوش کرنے کے لئے کیجائیگی اس لئے کہ سلطان المعظم کا احترام خلیفہ ہونے کی حیثیت سے جنگ مصر کے بعد سے بہت کچھ کم ہو گیا ہے۔ میری کتاب پڑھنے کے بعد وہ عربی خلافت کے زیادہ قائل ہو گئے ہین۔ پھر ہم نے یونیورسٹی پر بحث کی۔ وہ کہتے تھے کہ حیدرآباد

---

[۳] Future of Islam　[۲] National Delegates　[۱] Durand

نہایت مناسب مقام ہوگا۔ علیگڑھ کالج کو وہ اللہ ہب بتاتے ہیں۔ میں نے فی الحال یونیورسٹی کے خیال کو پوشیدہ رکھنے کا مشورہ دیا ہے۔

"شاہ اودھ کے بھائی پرنس جہان قادر اور ان کے بھتیجے پرنس سلیمان قادر آئے۔ اول الذکر نے مجھے لکھنؤ آنے اور اپنے یہاں قیام کرنے کی دعوت دی ہے۔

راجا شیو پرشاد لائل کی چٹھی لیکر آئے۔ بہت تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ملک دن بدن زیادہ خوشحال ہو رہا ہے اور ۔۔ سال پیشتر کی حالت سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ بہت سی زمینیں اب کاشت کے قابل بنا دی گئی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا چالیس سال قبل کسان زیادہ چاول کھاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آدمی کا پیٹ پہلے جتنا ہی ہے۔ انہیں لائل نے یہ بتلانے کے لئے بھیجا ہے کہ ہندوستان میں بہت سے اشخاص ایسے بھی ہیں جو گورنمنٹ کی حمایت کرتے ہیں۔ انہوں نے بنارس آنے اور مہاراجہ بنارس کے ساتھ ایک ہفتہ کے لئے ٹھہرنے کی دعوت دی۔

"عبدالرحمن مظہر اور بغداد کے ایک قاضی آئے۔ وہ کولمبو سے ہوتے ہوئے آرہے ہیں جہاں وہ محمد سامی سے ملے۔ محمد سامی کے علم و فضل کی وہ بہت تعریف کرتے ہیں۔ ازہر کے تعلیم یافتہ ہیں اور حیران تھے کہ گورنمنٹ نے انہیں کس طرح سے باغی قرار دیا ہے۔

"محمد اکرام افسر پنیس دہلی اور محمد اسحاق خان (میرٹھ) نے ہم سے کہا کہ جب آپ ہمارے شہروں میں آئیں تو ہمیں پہلے سے مطلع کردیں۔

"امیر علی مسلمانان کلکتہ کے لیڈر کی حیثیت سے البرٹ بل کے متعلق اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنا چاہتے تھے مگر جو طرز عمل انھوں نے جلسہ میں اختیار کیا وہ لیڈر کے شایان شان نہیں ہو سکتا۔ ساتھ کے ساتھ وہ گورنمنٹ کو بھی خوش کرنا چاہتے ہیں۔ پھر ہم نے ان کے انگریزی ٹوپی زیب سر کرنے کے مسئلہ پر بحث کی۔ انھوں نے یہ صفائی پیش کی کہ اس کے پہننے سے مجمع میں مجھ میں ایک خاص امتیازی حیثیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں پر ہندوستانی لباس پہننے والوں کو ریلوے کمپنی کے ملازم دھکے دے دیتے ہیں۔ انگریزی ٹوپی پہنکر ان سب سے چھٹکارا حاصل ہو جاتا ہے۔ نوجوان مکرجی جو اب تک خاموش بیٹھے ہوئے تھے ان کے چلے جانے کے بعد کہنے لگے کہ آپ نے اچھا کیا کہ انگریزی ٹوپی کے متعلق صاف صاف کہدیا۔ ہم سب اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

"گھر پہنچ کر والٹر پالین کے ساتھ کھانا کھایا اور ۱۸۸۳ء کے سال کو ختم کیا۔ میں نے آج جو گفتگو جوش سے کی تھی وہ درج ہونے سے رہ گئی۔ ان سے انقلاب کے امکان پر بحث رہی۔ انھوں نے کہا کہ اس میں بہت بڑا خطرہ ہے۔ لارڈ رپن پر ابتدا میں جو اعتماد تھا وہ اب زائل ہو رہا ہے مگر ہمیں انگریزی پبلک پر ابھی تک اعتماد ہے لیکن ایک چنگاری سارے بارود میں آگ لگا سکتی ہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندوستانی کمیٹی میں جو اشخاص ممبر ہیں ان کا رسوخ کسقدر ہے۔ میں نے کہا کہ بہت کم۔ مجھے انگریزی پبلک سے بہت کم امید ہے کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی کریگی اور اس لئے میں نے یہ مشورہ دیا کہ ہندوستانیوں کو صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا چاہئے اور کسی دوسرے کی امداد کا متوقع نہ رہنا چاہئے۔ پھر ہم نے ایجیٹیشن کی تفصیل پر بحث کی۔ وہ ہندوستان کے تمام شہروں میں جلسے منعقد کرنے والے ہیں اور ان سب کی اطلاع بذریعہ تار مجھے بھیجتے رہیں گے تاکہ میں انگریزی اخبارات میں درج کراتا رہوں۔ اس طریقہ سے انہیں حقیقی فائدہ ہو سکتا ہے۔ وہ جب تک انگریزوں کو نہ ڈرائینگے انہیں کبھی حقوق نہیں ملیں گے۔ ص۔ا۔ب

لہ لارڈ کرومر اپنی کتاب "ماڈرن ایجپٹ" (جدید مصر) میں محمد سامی کے متعلق (جو بہت بڑے شاعر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں) لکھتے ہیں کہ وہ "ان پڑھ" ہیں۔ یہ احمقانہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ مصری خصائل سے وہ کس درجہ نابلد ہیں۔"

درِ منثور

(میرے ایک عزیز دوست نے میرے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مقالاتِ ادبی سے بعض دلچسپ جملے یکجا جمع کر کے ایک کتاب مرتب کی ہے جو کئی جز و پر مشتمل ہے اُن کا اصرار ہے کہ نگار میں شائع کر دیا جائے چنانچہ اس کا ایک صفحہ "نذرِ امتثالِ امر" اس اشاعت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر ناظرینِ نگار نے اس کو پسند فرمایا تو آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہیگا، ورنہ نہیں۔ **نیاز**)

محبت صرف اذیت ہے جب تک اُس کا اعتراف نہ کیا جائے، لیکن وہ ہلاکت ہے بے پناہ اگر کوئی اُسے تسلیم کرے۔

محبوب کے لئے بیقرار رہنا محبت ہے اور محبت کے لئے بیتاب رہنا عشق۔

آنکھوں نے دیکھا، بولیں "واہ" دل کو خبر ہوئی اُس نے کہا "آہ" وہ تھی عشق کی ابتدا اور یہ اُس کی انتہا۔

میں نے تمہاری آنکھوں سے التجا کی، وہ ہنس پڑیں، میں نے صرف ایک جرعۂ شراب مانگا تھا، لیکن انھوں نے ساغر چھلکا دیا۔

سو اُٹھنے کے بعد پیشانی پر زلف کی برہمی اور آنکھوں کا خمار اگر اُس سے چھین لیا جائے تو میں حسن کے نام سے کانپنا چھوڑ دوں۔

میں کہتا ہوں تم نے مجھے کیوں دیکھا، وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ تم نے کیوں دیکھا، لیکن میرا کہنا التجا ہے اور ان کا کہنا استغنا!

میں تمہیں چاہتا ہوں مگر اس لئے کہ تم بھی مجھے چاہو، تم مجھے نہ چاہو لیکن اس لئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔

کاش مجھے تمہاری آنکھوں کا افسوں چند ساعت کے لئے مل جاتا کہ میں بھی چند دن دنیا میں خدائی کر لیتا۔

انھوں نے مجھے گلاب کا ایک پھول دیا اور میں لئے اپنے سینے سے لگا کر سو گیا۔ صبح کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پھول کہاں، وہاں تو صرف ایک زخم ہے۔

جو نگاہوں کی التجا کو نہ سمجھ سکے اُس کے سامنے دامنِ سوال پھیلانا بھی بیکار ہے۔

مخمل کے چھونے سے جو لطف ہماری قوتِ لامسہ کو حاصل ہوتا ہے، خدا کے لئے اُس کا فلسفہ نہ بیان کرو۔

کائنات کا ہنگامہ، دنیا کی رونق منحصر ہے صرف معصیت پر، معصیت کو اسی نے معصیت قرار دیا کہ لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ معلوم نہیں یہ بہشت دوزخ پر بحث کرنے والے، فطرت کے اس فلسفہ کو کیوں نظرانداز کر دیتے ہیں

کسی چیز کو نازک سمجھنا حقیقتاً اپنی قوت اپنے آپ سے تسلیم کرانا ہے۔

آنکھ کی خوبی ظاہر کرنے کے لئے دنیا کی مادی اشیاء سے تشبیہ دینا عام بات ہے، لیکن اُس کی مروت کا ذکر کوئی نہیں کرتا جو اس کا بہترین حسن ہے،

ہلکی شفقی روشنی ہے، کرۂ زمین تاریک ہے، فضا میں صرف ایک ستارہ جھلملا رہا ہے ——— ایک لڑکی جس کی آنکھوں پر پٹی ہے اور ہاتھ میں بربط، سارے کرہ پر چھائی ہوئی ہے ——— بربط کے تمام تار ٹوٹ چکے ہیں، مگر ایک جس میں وہ برابر لرزش پیدا کر رہی ہے ——— صرف ایک تارہ، صرف ایک تار اور پھر بھی اس قدر انہماک، یہ ہے ——— "تصویرِ امید" ———

تیتری، سفید کلی کے چاروں طرف تیزی سے رقص کر رہی ہے۔ جیسے کسی مقدس ہیکل، کسی سنگین مورت کے گرد کوئی پرستار، طوافِ صباحی میں مصروف ہو۔

غزل

چمن کا حال ابھی کہہ گئی صبا ہم سے — خلاف ہو گئی زمانے کی کیا ہوا ہم سے
کسی نے ہم کو ستایا، کسی سے کیا مطلب — یہ ایسی بات ہے پوچھے نہ دوسرا ہم سے
کمال پر ہیں فریبِ نگاہ کے ساماں — نہ پوچھو حال چمن کی بہار کا ہم سے
اسی کو کہتے ہیں مجبوریاں محبت کی — وفا کی رکھتا ہے امید بیوفا ہم سے
عزیز رکھتے ہیں ہم اس کو تختِ شاہی سے — فقیر ہیں کوئی بھی نہ بیٹھے نہ بوریا ہم سے
انہوں نے آئینہ خانہ میں آج کیوں مانگا — ہمارے دل کا کیا ذکر بارہا ہم سے

باسط بسوانی

استفسارات

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

(جناب محمد اکبر خاں صاحب کراچی)

"جولائی کے مہینے میں آپ وجود حضرت خضر کا انکار کر ہی چکے تھے، لیکن اگست کے ملاحظات میں کسی عیسائی بھائی (؟) سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے حضرت عیسیٰ پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔ مرداں چنیں کنند۔

اُن کا بن باپ کے پیدا ہونا، اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جلانا، مصلوب ہونے کے بعد آسمان پر چلا جانا، اور اب تک زندہ رہنا یہ تمام وہ باتیں ہیں جن کے آپ منکر معلوم ہوتے ہیں، لیکن کلام مجید میں جو صریح آیات ان کے متعلق پائی جاتی ہیں اُن کی کیا تاویل ہو سکتی ہے، میں بہت مشتاق ہوں کہ ان کی بابت بھی آپکے خیالات کا علم حاصل کروں، میں ان آیات کو اس جگہ درج نہیں کرتا، کیونکہ یقیناً وہ آپکے سامنے ہوں گی اور آپ اپنی عادت کے موافق اُن کا استقصا کرکے بحث فرمائیں گے۔

(نگار) میں نے وجود خضر سے انکار تو نہیں کیا۔ لیکن یہ ضرور بیان کیا ہے کہ اُن کے متعلق جو روایات عوام میں مشہور ہیں وہ قابل وثوق نہیں ہیں اور جن احادیث سے استدلال کیا جاتا ہے وہ ساقط الاعتبار ہیں حضرت موسیٰ کی ملاقات اُن کے سفر مداین کے وقت ضرور ایک ایسے انسان سے ہوئی جو اس نواح کا جاننے والا تھا اور جس نے موسیٰ کی رہبری کی لیکن یہ ایک واقعہ تھا جو اس وقت ختم ہو گیا اور اب نہ اس شخص کا وجود باقی ہے اور نہ وہ صحرا نوردوں کی دستگیری پر مامور، اگر سبز پوش ہونیکے لحاظ سے اس کو خضر کہا جاتا ہے تو یہ اس کا نام نہیں ہو سکتا، لیکن اگر اس نام کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں بشرطیکہ اور تمام خلاف عقل باتوں کو ظاہر اس سے منسوب کیا جائے۔ یہ ہے خلاصہ اس بحث کا جو خضر کے متعلق میں نے جولائی کے استفسارات میں کی تھی اب آپ حضرت عیسیٰ کے متعلق مجھ پر یہ الزام رکھتے ہیں کہ میں نے اُن پر بھی اگست کے ملاحظات میں ہاتھ صاف کر دیا، سو بندہ نواز، یہ صفائی میرے ہاتھ کی نہیں ہے بلکہ خود اُس قوت برتر و اعلیٰ کی ہے جس نے انھیں سولی سے بچا لیا، اور یہ معاملہ "مرداں چنیں کنند" سے متعلق نہیں ہے بلکہ "یزداں چنیں کند" سے وابستہ ہے۔

جہاں تک میں نے غور کیا ہے میری سمجھ میں یہی بات آتی ہے کہ جن کلام مجید کی آیات سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش وغیرہ کے متعلق خلاف عقل باتوں کے ثابت کرنے کی کوشش کیجاتی ہے اسی سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے، لیکن چونکہ ایک نبی کی عظمت اُس وقت تک عوام کے دل میں پیدا نہیں ہوتی جب تک

بعض خلافِ عقل باتوں کا ظہور اس سے منسوب نہ کیا جائے، اس لئے لوگوں نے کلام مجید پر کم غور کیا اور ان روایات پر زیادہ اعتماد کر لیا جو ایسی مافوق العادت امور کی مثبت تھیں، حالانکہ وہ روایات اصولاً پایہ اعتبار سے گری ہوئی ہیں۔

میں آپ کے استفسار کا جواب دینے میں زیادہ شرح و بسط سے تو کام نہیں لے سکتا، لیکن مختصراً تمام امور پر نگاہ ڈالوں گا۔ اور غور کروں گا کہ کلام مجید کا فیصلہ اس باب میں کیا ہے؟ لیکن قبل اس کے کہ قرآن پاک کی آیتوں پر غور کیا جائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً حضرتِ عیسیٰ کا وہ سارا قصہ بیان کر دیا جائے جو عام طور پر باختلاف جزئیات اکثر کتب تاریخ میں درج ہے۔ چنانچہ میں تاریخ کامل ابن اثیر اور ابن خلدون سے اس کا ملخص یہاں درج کرتا ہوں۔

ابن اثیر کا بیان ہے کہ ایک شخص عمران بن ماثان (جو داؤد کی نسل میں سے تھا) کا نکاح ایک خاتون حنہ بنت فاقوذ سے ہوا لیکن کوئی اولاد مدتوں تک نہ ہوئی، یہاں تک کہ حنہ بوڑھی ہو گئی۔ حنہ نے ایک دن خدا سے التماس کی کہ اگر میرے بیٹا ہو جائے تو میں اسے بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دوں گی۔ خدا نے اس التجا کو سن لیا اور حنہ حاملہ ہو گئی لیکن قبل ولادت اس کا شوہر عمران مر گیا۔ جب زمانہ ختم ہوا تو بجائے لڑکے کے لڑکی پیدا ہوئی اور اس کا نام مریم رکھا گیا۔ حنہ لڑکی کو دیکھ کر ملول ہوئی، کیونکہ لڑکیاں کنیسہ کی خدمت کے لئے وقف نہ ہو سکتی تھیں تاہم وہ اپنے عہد کے مطابق مریم کو متولیانِ بیت المقدس کے پاس لے گئیں اور اپنی نذر کا سارا حال بیان کر کے کہا کہ اسے لو، چونکہ یہ لڑکی عمران کی تھی جو ان کا سردار و امام تھا اسلئے ہر ایک نے چاہا کہ مجھ کو مل جائے، لیکن قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا جو مریم کے خالو بھی تھے۔ یہ اپنی خالہ کے پاس (جن کا نام ایشاع تھا) پرورش پاتی رہیں جب وہ بڑی ہو گئیں تو مسجد میں ایک بالاخانہ ان کے لئے بنوا دیا۔ وہیں تنہا رہتی تھیں اور عبادت کیا کرتی تھیں، لیکن ان کے چچا کا بیٹا یوسف بن یعقوب بن ماثان بھی کنیسہ کی خدمت کیا کرتا تھا، اور عیسائی روایات کے بموجب مریم کا نسبتی شوہر تھا، لیکن ابھی تک قربت کی نوبت نہ آئی تھی۔ یہ دونوں اپنے گھڑے لیکر قریب کے تالاب میں پانی بھر لاتے اور کنیسہ کو لوٹ آتے۔ ایک دن مریم تنہا پانی لینے گئیں تو ان کو فرشتہ نظر آیا جس نے بیٹے کی خوشخبری دی، مریم نے کہا یہ کیسے ممکن ہے جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں، یہ سن کر فرشتہ نے کہا کہ ایسا ہی ہوگا اور ان کے گریبان میں پھونک ماری جس سے وہ حاملہ ہو گئیں۔ جب یوسف کو ان کے حاملہ ہونے کا علم ہوا تو اس کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ وہ مریم کو بہت عفیفہ خیال کرتا تھا لیکن جب مریم نے فرشتے کے ملاقات کا سارا قصہ بیان کیا تو یوسف خاموش ہو رہا۔

مدت حمل کی نسبت اختلاف ہے کوئی نو مہینے بتاتا ہے کوئی آٹھ مہینے اور بعض نے صرف ایک ساعت بتائی ہے، بہرحال مریم کو جب درد زہ شروع ہوا تو وہ شرقی محراب کی طرف چلی گئیں اور وہیں آپ کے بچہ پیدا ہوا۔ بنی اسرائیل کو علم ہوا تو وہ آئے اور مریم پر تہمت رکھی، لیکن جب حضرت عیسیٰ نے گہوارہ ہی سے گفتگو شروع کر دی تو سب چلے گئے اس کے بعد انھوں نے اس حمل کی تہمت زکریا پر لگائی اور انہیں مار ڈالا لیکن اس باب میں روایتیں مختلف ہیں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ زمانۂ وضع حمل کے قریب یوسف انہیں مصر لیگیا وہیں ولادت ہوئی اور بارہ سال کے بعد مریم حضرت عیسیٰ کو لے کر واپس آئیں (مصر کے دورانِ قیام میں ان سے بہت معجزے ظاہر ہوئے جن کا اجمالی ذکر ہم آئندہ کریں گے۔)

ان کے آسمان پر اٹھائے جانیکا واقعہ ابن اثیر نے اس طرح لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے پاس کچھ یہودی آئے اور انکی برادر انکی ماں پر تہمت لگائی حضرت عیسیٰ نے بددعا کی اور یہ سب سؤر ہو گئے، اس پر یہودیوں میں بڑا جوش پیدا ہوا اور آپ کو ہلاک کرنے جمع ہوئے۔ لیکن آپ جبرئیل کی ہدایت کے موافق ایک مکان میں داخل ہو گئے اور وہاں ایک روزن کے ذریعہ سے آسمان پر اٹھا لئے گئے۔ یہودیوں نے ایک آدمی کو مکان کے اندر

بھیجا کہ حضرت عیسیٰ کو قتل کردے۔ لیکن وہاں کوئی نہ تھا جب یہ آدمی باہر نکلا تو اس کی صورت بالکل حضرت عیسیٰ کی طرح ہو گئی تھی اس لئے اسی کو پکڑ کر صلیب دیدی۔ بعض کا بیان ہے کہ خود حضرت عیسیٰ کے حواریوں میں سے ایک شخص نے ان کی صورت میں تبدیل ہو جانا منظور کر لیا تھا، اور اسے مصلوب کیا گیا۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو پکڑ کر جب صلیب کی طرف لے چلے تو فرشتوں نے آکر اندھیرا کر دیا اور جس نے حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرایا تھا وہ ان کی شکل میں تبدیل ہو گیا، اور اسے سولی دیدی گئی۔ بہرحال ان تمام روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ مصلوب نہیں ہوئے بلکہ کوئی اور ان کی جگہ مصلوب ہوا اور وہ آسمان پر اٹھا لئے گئے۔

اس واقعہ کے سات روز بعد حضرت عیسیٰ پھر زمین کی طرف بھیجے گئے، کیونکہ مریم بہت ملول تھیں اور مصلوب لاش کے پاس کھڑی رو رہی تھیں آپ جب آسمان سے نیچے اترے تو آپ نے کہا میں مصلوب نہیں ہوا ہوں بلکہ خدا نے مجھے اوپر اٹھا لیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے حواریوں کو جمع کیا اور ان کو ہدایت کر کے پھر نوری لباس پہنکر اوپر اڑ گئے۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت حضرت یحییٰ سے چھ ماہ پہلے ہوئی، مریم کی عمر تیرہ، پندرہ یا بیس برس کی تھی جب وہ حاملہ ہوئیں۔ تیس ۳۰ سال کی عمر میں وہ نبی ہوئے اور بتیس ۳۲ سال کچھ دن کی عمر میں آسمان پر اٹھائے گئے۔

ابن خلدون نے سب سے پہلے مریم کے نسبی سلسلہ کی تحقیق کی ہے، اور انجیلوں کی روایات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کو ظاہر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ یعقوب بن یوسف کی کتاب کے حوالے سے یہ بتایا ہے کہ مریم کے والد کا نام یواقیم تھا جو نسل داؤد سے تھے اور ظاہر کیا ہے کہ ممکن ہے عبرانی زبان میں عمران ہی کو یواقیم کہتے ہوں (چونکہ قرآن پاک میں مریم کو بنت عمران ظاہر کیا گیا ہے اس لئے ابن خلدون کو یہ تاویل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی) اس کے بعد طبری کے حوالہ سے مریم کی ولادت اور زکریا کی کفالت میں دیے جانے کے وہی واقعات لکھے ہیں جو ابھی ہم ابن اثیر کے حوالہ سے درج کر چکے ہیں۔

یعقوب بن یوسف کی کتاب کے حوالہ سے بعد کے حالات اس طرح لکھے گئے ہیں کہ:-

”حنہ (مریم کی ماں) کا انتقال اس وقت ہوا جب مریم کی عمر ۸ سال کی تھی، بنی اسرائیل کے ہاں رواج تھا کہ جب کوئی عورت طریق ازدواج کو پسند نہ کرتی تو اس پر ہیکل کی مجاورت فرض ہو جاتی۔ چنانچہ خدا نے الہام کیا کہ اولاد ہارون جمع کی جائے اور جس کے عصا سے کوئی علامت ظاہر ہو مریم اسی کے سپرد ہوں اور اسی کے ساتھ منسوب کی جائیں جب یہ سب جمع ہوئے تو یوسف نجار کے عصا سے ایک کبوتر سفید رنگ کا نکل کر سر پہ بیٹھ گیا۔ یوسف، مریم کو لے کر اپنے ہمراہ ناصرہ چلے گئے (جہاں یوسف کا اصلی وطن تھا) مریم کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ یہیں تالاب پر پانی بھرنے کی حالت میں فرشتہ نے بشارت دی اور آپ حاملہ ہوئیں، اس کے بعد مریم بیت المقدس زکریا کے پاس گئیں لیکن ان کا انتقال ہو چکا تھا اس لئے پھر ناصرہ واپس آئیں۔ اب یوسف کو حمل کا علم ہوا تو اسے سخت تعجب ہوا لیکن جب فرشتہ نے خواب میں آکر بتایا کہ یہ حمل روح القدس سے ہے تو یوسف کو مریم کی عفت کا یقین آیا“

اسی کے ساتھ ابن خلدون نے طبری کی بھی وہ روایت درج کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف مریم کے ساتھ بیت المقدس ہی میں رہتا تھا اور پھر استقرار حمل کے بعد مصر چلا گیا راستہ میں درد زہ ہو کر وضع حمل ہوا۔ یوسف ان کو گدھے پر سوار کرا کے لے گیا اور لوگوں سے اس راز کو پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ بارہ برس کا زمانہ گزر گیا۔ اس زمانے میں مسیح سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں اس کے بعد حکم ہوا کہ عیسیٰ کو لے کر ایلیا (بیت المقدس)

واپس جائیں۔ چنانچہ مریم آپ کو لیکر بیت المقدس آئیں، وہاں آپ سے بہت سے معجزات ظاہر ہوئے۔ اس کے بعد آپکے مصلوب ہونے اور آسمان پر اٹھائے جانیکے واقعات بعض اختلافات کے ساتھ وہی بیان کئے گئے ہیں جو ابن اثیر کے حوالہ سے بیان ہو چکے ہیں۔

چونکہ تاریخ کی کتابوں اور انجیل کی روایتوں میں باہم اس قدر اختلاف ہے کہ حضرت عیسیٰ کی زندگی کے متعلق کسی واقعہ کی صحیح تحقیق اُن کی مدد سے نہیں ہو سکتی اور خود رسول اللہ کے زمانہ میں مسیح کے متعلق عجیب عجیب غریب اعتقادات لوگوں میں رائج تھے۔ یہاں تک کہ بعض اُن کو خدا کا بیٹا اور بعض ناجائز مولود کہتے تھے اس لئے ظاہر ہے کہ صرف قرآن پاک پر غور کرنے سے حقیقت کا علم ہو سکتا ہے جس میں تمام لغو اعتقادات رائجہ کے خلاف صحیح واقعات کی خبر دی گئی ہے۔

حضرت عیسیٰ کا ذکر یوں تو کلام مجید میں کثرت سے پایا جاتا ہے لیکن امور زیر بحث پر غور کرنے کیلئے ہم کو سورۂ آل عمران، سورۂ مائدہ اور سورۂ مریم کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ سورۂ مریم میں صرف اُن کے پیدائش کے واقعات درج ہیں اور سورۂ مائدہ میں صرف اُن کے معجزات کا ذکر ہے (جن میں اندھوں کوڑھیوں کو اچھا کرنا، مُردوں کو جِلانا وغیرہ شامل ہے) اور سورۂ آل عمران میں پیدائش سے لیکر آخر تک تمام واقعات کا بیان ہے اس لئے ہم سب سے پہلے آل عمران اور سورۂ مریم کی اُن آیات کو درج کرتے ہیں جن میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کا حال درج ہے۔

اذ قالت الملائکۃ یا مریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسی ابن مریم وجیھا فی الدنیا والاخرۃ ومن المقربین ویکلم الناس فی المھد وکھلا ومن الصالحین۔ قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر قال کذلک اللہ یخلق ما یشاء اذا قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون

(آل عمران آیت ۴۰-۴۲)

جب کہا فرشتوں نے اے مریم اللہ خوشخبری دیتا ہے تجھکو اپنی طرف سے ایک کلمہ کی اُس کی بابت جس کا نام مسیح عیسیٰ مریم کا بیٹا ہوگا۔ جو دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت ہوگا۔ خدا کے مقربین میں سے ہوگا، لوگوں سے کلام کرے گا گہوارے میں اور بڑھاپے میں اور ہوگا نیکوں میں سے۔ مریم نے کہا اے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہو سکتا ہے درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، خدا نے کہا ایسے ہی ہوگا، اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے، جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ کام ہو جاتا ہے۔

واذکر فی الکتاب مریم اذ انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا فاتخذت من دونھم حجابا فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا۔ قالت انی اعوذ بالرحمان منک ان کنت تقیا۔ قال انما انا رسول ربک لاھب لک غلاما زکیا۔ قالت انی یکون لی غلام ولم یمسسنی بشر ولم اک بغیا۔ قال کذلک قال ربک ھو علی ہین ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منا وکان امرا مقضیا فحملتہ فانتبذت بہ مکانا قصیا۔ فاجاءھا المخاض الی جذع النخلۃ قالت یالیتنی مت قبل ھذا وکنت نسیا منسیا فناداھا من تحتھا الا تحزنی قد جعل ربک

اور ذکر کر کتاب میں مریم کا جب وہ علیحدہ ہوئی اپنے لوگوں سے ایک مشرقی مکان میں پس کر لیا اس نے اُن کی طرف سے پردہ پس بھیجا ہم نے اس کے پاس اپنی روح کو جو بن گئی اس کے سامنے ایک پورا آدمی۔ مریم نے کہا میں خدا کی پناہ مانگتی ہوں تجھ سے، اگرچہ تو پرہیزگار ہو۔ اس نے کہا میں تو تیرے پروردگار کی طرف سے یہ پیغام لیکر آیا ہوں کہ میں تجھے ایک پاکیزہ بیٹا دوں گا۔ مریم نے کہا میرے بیٹا کیسے ہو سکتا ہے درآنحالیکہ مجھے کسی انسان نے نہیں چھوا اور نہ میں نے کبھی بدکاری کی۔ فرشتہ نے کہا ایسا ہی ہوگا، تیرے

تحتک سریا۔ وھزی الیک بجذع النخلۃ تساقط علیک رطبا جنیا۔ فکلی
واشربی وقری عینا فاما ترین من البشر احدا فقولی انی نذرت للرحمان
صوما فلن اکلم الیوم انسیا۔ فاتت بہ قومھا تحملہ قالوا یا مریم لقد جئت
شیئا فریا۔ یا اخت ہارون ما کان ابوک امرا سوء وما کانت امک بغیا
فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم من کان فی المھد صبیا قال انی عبد اللہ
آتانی الکتاب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا این ما کنت واوصانی بالصلوۃ
والزکوۃ ما دمت حیا وبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا والسلام علی
یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیا۔ ذالک عیسی ابن مریم
قول الحق الذی فیہ یمترون۔ ما کان للہ ان یتخذ من ولد سبحانہ اذا
قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون۔

(سورۂ مریم آیت ۱۲۔ ۳۶)

رب نے کہا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور ہم بنائیں گے اُس کو نشانی
لوگوں کے لئے اور رحمت اپنی طرف سے اور یہ امر ٹھہرایا ہوا ہے۔ پھر حمل ٹھہر
مریم کو اور وہ دور چلی گئی۔ پھر درد زہ اُس کو ایک کھجور کی جڑ میں لے گیا مریم نے
کہا کاش میں اس سے پہلے ہی مر گئی ہوتی اور مٹ جاتی۔ پھر اُس کو پکارا
کسی نے نیچے سے کہ رنجیدہ نہ ہو جو رکھا ہے تیرے پروردگار نے نیچے
ایک چشمہ تو کھجور کو ہلا تجھ پر تر و تازہ پھل گرائیگا۔ تو اُسے کھا اور پی اور
ٹھنڈی کر اپنی آنکھ۔ اگر تو کسی آدمی کو دیکھے تو کہہ کہ میں نے اللہ کے نام پر روزہ
رکھا ہے اور میں آج کسی سے بات نہ کرونگی، پھر مریم اپنے لڑکے کو قوم کے
پاس لائی۔ انھوں نے کہا اے مریم تو عجیب چیز لائی ہے۔ اے ہارون کی
بہن نہ تیرا باپ خراب آدمی تھا اور نہ تیری ماں خراب تھی، پھر اشارہ کیا
مریم نے لڑکے کی طرف، لوگوں نے کہا ہم کیا بات کریں اس سے جو تھا ایک
لڑکا گہوارہ میں۔ عیسیٰ نے کہا میں خدا کا بندہ ہوں۔ وہی ہے اُس نے مجھے
کتاب اور بنایا ہے مجھے نبی اور مجھکو کیا ہے برکت والا جہاں کہیں میں ہوں
اور مجھکو ہدایت کی ہے نماز و روزہ کی جب تک میں زندہ رہوں اور بنایا
ہے مجھے نیکی کرنے والا اپنی ماں کے ساتھ اور نہیں بنایا مجھے سرکش
بدبخت۔ اور سلام ہو مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا، جس دن میں مروں گا
اور جس دن میں زندہ ہو کر اٹھوں گا۔

یہ ہے سچا قصہ عیسیٰ بن مریم کا جس میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، خدا کے
لئے موزوں نہیں ہے کہ اُس کے کوئی بیٹا ہو، وہ اس سے پاک ہے
وہ جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہی ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔

[illegible] ہنے کہ ہم کلام مجید کی مذکورہ بالا آیتوں پر غور کریں۔ یہ معلوم کرلینا ضروری ہے کہ خدا نے حضرت عیسیٰ کے نسب کے متعلق کیا فرمایا ہے۔ سورۂ انعام
میں وضاحت کے ساتھ یہ بات بیان کردی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ آل ابراہیم سے ہونگے:۔
"وتلک حجتنا آتیناھا ابراھیم علی قومہ۔ نرفع درجات من نشاء۔ ان ربک حکیم علیم۔ ووھبنا لہ اسحاق ویعقوب کلا ھدینا ونوحا ھدینا
من قبل ومن ذریتہ داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسی وہارون وکذلک نجزی المحسنین وزکریا ویحیی وعیسی والیاس کل من الصالحین الخ"

اب اگر حضرت عیسیٰ کی ولادت بغیر باپ کے تسلیم کی جائے اور صرف مادری سلسلۂ نسب پر لحاظ کیا جائے تو دیکھنا چاہیے کہ مریم آلِ ابراہیم یا آلِ داؤد سے تھیں یا نہیں؟ کلام مجید میں ایک جگہ مریم کو بنتِ عمران (عمران کی بیٹی) کہکر پکارا گیا ہے[۵۱] اور دوسری جگہ اُختِ ہارون[۵۲] (ہارون کی بہن) کے لقب سے یاد کیا گیا ہے گویا اس سے بات ثابت ہوتی ہے کہ مریم کے باپ کا نام عمران تھا اور ہارون اُن کے بھائی تھے، اس پر عیسائی علمانے اعتراض بھی کیا ہے کہ ہارون کے زمانہ سے مریم کو کیا نسبت ہو سکتی ہے، لیکن وہ اس رمز کو نہیں سمجھے کہ مریم کو ہارون کی بہن کہنا کسی حقیقی رشتہ کا اظہار نہیں ہے بلکہ صرف اس مماثلت کی بناء پر ہے کہ جس طرح ہارون حفاظت، خدمت ہیکل کے لئے مامور تھے اسی طرح مریم کی بھی زندگی شروع ہوئی، یہ صحیح ہے کہ موسیٰ کی بہن کا نام بھی مریم تھا لیکن اس جگہ مریم کو اخت ہارون کہنے سے یہ نتیجہ نکالنا کہ قرآن میں عیسیٰ کی ماں مریم اور موسیٰ کی بہن مریم کو ایک ہی ہستی قرار دیا ہے درست نہیں ہو سکتا اس لئے اخت ہارون کے الفاظ سے مریم کے سلسلۂ نسب پر تو کچھ روشنی نہیں پڑ سکتی، اب رہ گیا اُن کو عمران کی بیٹی کہنا سو یقیناً یہ بھی اسی لحاظ سے کہا گیا ہے جس طرح اختِ ہارون کے الفاظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ کلام مجید میں آل، اخت، ابن یا بنت وغیرہ کا استعمال بہت وسیع معنی میں ہوا ہے اور ان الفاظ سے وہ قریب کا رشتہ مراد نہیں لیا گیا ہے جو ان کے معنی سے متبادر ہوتا ہے، اس لئے مریم کو بنت عمران کہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ واقعی عمران کی بیٹی تھیں بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ آلِ عمران میں سے تھیں جن کی بزرگی کے متعلق کلام مجید میں یہ آیت آئی ہے۔

"ان اللہ اصطفےٰ آدم ونوحاً وآلِ ابراہیم وآلِ عمران علی العالمین"

مریم کے والد کون تھے یہ امر بالکل تاریکی میں ہے، اور اسی لئے عیسیٰ کا سلسلۂ نسب داؤد تک متعین نہیں ہو سکتا، اور اگر مریم کی ولادت کو بھی بغیر باپ کے تسلیم کر لیا جائے تو جب کہ بعض عیسائی جماعتوں کا خیال ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ مریم کے نانا کون تھے اور اُن کا سلسلۂ نسب آلِ داؤد سے ملتا ہے یا نہیں۔ اور اگر مریم کے باپ کا نام واقعی عمران صحیح تسلیم کیا جائے تو اُس کے نسب نامے کے متعلق اس قدر اختلاف ہے کہ خود عیسائیوں کو اکثر جگہ تاویل کی ضرورت محسوس ہوئی اور یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس سلسلہ سے آلِ داؤد میں شمار ہو سکتا ہے۔ بعض نے اسے ماثان کی اولاد میں شامل کیا ہے، ابن اسحاق اسے یاشیم بن اموان کی اولاد بتاتا ہے، ابن عساکر نے زریافیل کے سلسلہ سے آلِ ماثان ہونا ثابت کیا ہے اور انجیلوں میں باہم سخت اختلاف ہے یہاں تک کہ بعض جگہ مریم کا بھی بغیر باپ کے پیدا ہونا ظاہر کیا گیا ہے، اور بعض بیانات سے بجائے عمران کے مریم کے باپ کا نام یواقیم درج ہے، بہر حال مریم کے والد کا معاملہ چونکہ بالکل تاریکی میں ہے اس لئے اس پر اعتماد کر کے حضرت عیسیٰ کو مادری سلسلہ سے آلِ ابراہیم میں شامل نہیں کیا جا سکتا، حالانکہ قرآن پاک سے صراحتہً ان کا ذریات ابراہیم یا آلِ داؤد میں ہونا ثابت ہے، البتہ اگر مریم کے نسبتی شوہر یوسف نجار کو عیسیٰ کا باپ تسلیم کر لیا جائے تو آسانی سے حضرت عیسیٰ کا آلِ داؤد میں ہونا ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ یوسف یقیناً آلِ ماثان میں سے تھا اور ماثان کا سلسلۂ نسب داؤد تک پہنچتا ہے جیسا کہ متی انجیل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کے باپ کا نام یوسف تھا اور وہ بیٹے تھے یعقوب کے۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یوسف حضرت عیسیٰ کے باپ نہ تھے اور وہ واقعی بغیر باپ کے پیدا ہوئے ہیں تو پھر انجیل و قرآن کی یہ صراحت کہ وہ آلِ داؤد

---

۵۱ ومریم ابنت عمران التی احصنت فرجہا الخ (سورۂ تحریم۔ آیت ۱۲)

۵۲ یا اخت ہارون ما کان ابوک الخ (سورہ مریم۔ آیت ۲۸)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا تار کا پتہ صرف خاکا فی ہے

میں سے ہوں گے بالکل لغو ہو جاتی ہے، کیونکہ اول تو مریم کا سلسلۂ نسب داؤد تک پہنچتا نہیں اور اگر پہنچے بھی تو ساقط الاعتبار ہے کیونکہ یہود میں ہمیشہ سلسلۂ نسب باپ کا قابل لحاظ تسلیم کیا جاتا تھا اور مادری سلسلۂ نسب کو کوئی نہ پوچھتا تھا۔ یہاں تک تو گفتگو سلسلۂ نسب کے لحاظ سے ہوئی اور اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر عیسیٰ کی ولادت بغیر باپ کے تسلیم کی جائے تو نص قطعی اس کی معارض واقع ہوتی ہے۔

اب دوسری صورت بحث کی یہ ہے کہ نفس مسئلہ ولادت مسیح کے متعلق انجیل و قرآن کی آیات پر غور کیا جائے۔ انجیلیں چار ہیں

(۱) متی کی انجیل جو حضرت عیسیٰ کے دو سال بعد لکھی گئی اور تمام انجیلوں میں بہت قدیم ہے

(۲) لوک کی انجیل جو ۳۰، ۴۱ سال بعد تحریر میں آئی۔

(۳) یوحنا کی انجیل جو ۶۳، ۶۴ سال بعد لکھی گئی۔

(۴) مارک کی انجیل جو اس کے بہت بعد کی ہے۔

ان چاروں انجیلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یوسف مریم کے شوہر اور عیسیٰ کے باپ تھے۔ متعدد مقامات پر اسی نسبت کا اظہار کیا گیا ہے (دیکھو انجیل متی باب ۱ درس ۱۶۔ لوک کی انجیل باب ۲ درس ۳۳۔ یوحنا کی انجیل باب ۶ درس ۴۲)

کلام مجید کی آیات میں کسی جگہ اس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ آپ کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی ہے لیکن بعض الفاظ ایسے ہیں جن سے یہ مفہوم اخذ کیا جاتا ہے اس لئے آئیے اب ان الفاظ پر غور کریں کہ اصل بحث یہی ہے اور اسی پر فیصلہ کا انحصار ہے۔

اب آپ آل عمران کی اُن آیتوں کو دیکھئے جنھیں ہم درج کر چکے ہیں، اُن میں سب سے پہلا وہ لفظ جس کو ولادت مسیح سے متعلق سمجھا جاتا ہے، کلمہ کا لفظ ہے یعنی ملائکہ کا مریم سے یہ کہنا کہ ہم تجھے خوش خبری دیتے ہیں خدا کی طرف سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح ابن مریم ہوگا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ مسیح واقعی خدا کے صرف ایک کلمہ تھے اور یہی کلام مسیح کی ولادت کا باعث ہوا۔ لیکن کسی شخص کا ایسا خیال کرنا نافہمی کی دلیل ہے کیونکہ اول تو اس کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جس کلمہ کی خوشخبری دیجاتی ہے اس کا نام مسیح ہوگا، کیونکہ لفظ کلمہ مونث ہے اور اسمہ میں ضمیر مذکر کی ہے اگر وہ مقصود ہوتا تو اسمہا ہونا چاہیے تھا، دوسرے یہ کہ اگر مسیح کو کلمۂ الٰہی سمجھ لیا جائے تو بھی اس سے اُن کی ولادت بے باپ کے کیسے ثابت ہو سکتی ہے۔

کلمہ کا لفظ کلام مجید میں اکثر جگہ آیا ہے لیکن کسی جگہ اس کے معنی لفظ یا کلام کے نہیں لئے گئے، اکثر جگہ تو اس سے مراد پیشین گوئی لی گئی ہے، لیکن کہیں کہیں احکام ربانی کتاب آلہی اور مخلوقات مراد ہیں مثلاً۔

ان اللہ یبشرک بیحییٰ مصدقاً بکلمۃ من اللہ   کہ یہاں کلمہ سے مراد پیشین گوئی ہے

لاتبدیل لکلمات اللہ   کہ اس جگہ بھی پیشین گوئیاں یا مقادیر آلہیہ مراد ہیں۔

ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتیٰ اتاہم نصرنا ولا مبدل لکلمات اللہ (انعام۔ آیت ۳۴) } یہاں بھی کلمات سے پیشین گوئیاں مراد ہیں۔

قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مددا } یہاں کلمات سے مخلوقات مراد ہیں۔

پھر جب قرآن پاک میں کسی جگہ کلمہ کے معنی لفظ کے نہیں آئے تو آل عمران کی اس آیت میں کیونکر دہ معنی مراد ہوسکتے ہیں ظاہر ہے کہ یہاں بھی کلمہ کے معنی پیشین گوئی کے ہیں۔ جیسا کہ امام رازی نے بھی ظاہر کیا ہے یا صرف مخلوق کے اور اس لحاظ سے آیت کے معنی یہ ہونگے کہ فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ تجھے ایک بیٹے کی پیشین گوئی کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا لفظ ولد یبشرک کے بعد محذوف ہے جیسا کہ سورۂ حجر کی آیت ۵۵ میں قالو البشرنک کے بعد لفظ ولد محذوف ہے اور اس طرح محذوفات پُر کرنے کے بعد آیت یوں ہوگی:۔

ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ (بولد) اسمہ مسیح الخ یعنی اللہ خوشخبری دیتا ہے تجھے اپنی طرف سے ایک پیشین گوئی کی (اور وہ پیشین گوئی ایک لڑکے کی ہے) جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ لفظ ولد کو حذف کرکے اس کا مفہوم مراد لینا بالکل اسی طرح ہے جس طرح ہم لوگ کنایۃً کسی کو حاملہ ظاہر کرنے کیلئے کہتے ہیں کہ فلاں عورت امید سے ہے یا ولادت کے متعلق کہا کرتے ہیں کہ خدا جلد کوئی خوشخبری سنائے بالکل یہی انداز بیان اس جگہ کلام مجید کا ہے بہرحال اس آیت میں لفظ کلمہ سے کوئی مفہوم ایسا اخذ نہیں ہوسکتا جس سے عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا ثابت ہوتا ہو۔ سورۂ مریم میں بجائے لفظ کلمہ کے صراحتہً الفاظ غلاماً زکیا (پاکیزہ لڑکا) استعمال کئے گئے ہیں اور یہ مزید ثبوت اس امر کا ہے کہ یہاں بھی لفظ کلمہ کا مفہوم وہی ہے نہ کہ کلام خداوندی۔

آل عمران کی دوسری آیت جو اس امر کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے یہ ہے:۔

قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر قال کذلک اللہ یخلق مایشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون

(مریم نے کہا اے پروردگار میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے درآنحالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، خدا نے کہا یہی ہوگا۔ اللہ پیدا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے جب وہ کبھی کام کو کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو کہدیتا ہے ہوجا اور وہ ہو جاتا ہے)

مریم کا یہ کہنا کہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا، اس بات کا ثبوت نہیں کہ عیسیٰ کے کوئی باپ نہ تھا کیونکہ مریم کا تعلق ازدواج تو یقیناً اس سے ثابت ہے کہ ان کے اور اولادیں بھی تھیں پھر جس طرح اور اولادیں تعلق ازدواج کے بعد ہوئیں اسی طرح حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی ہوگی، البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ جس وقت مریم کو بشارت دی گئی اس وقت تک ان کا نکاح نہ ہوا ہوگا، اور اسی لئے انہوں نے کہا کہ مجھے تو ابتک مرد نے نہیں چھوا ہے لیکن بعد کو تعلق ازدواج قائم ہوا اور حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔

یہاں پر ایک اور نکتہ قابل غور ہے وہ یہ کہ "قال کذلک" آگے کی عبارت "اللہ یخلق مایشاء" سے متعلق ہے یا نہیں، سورۂ مریم میں بھی یہی الفاظ آئے ہیں لیکن اس طرح:۔ "قال کذلک، قال ربک ہو علی ہین" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح سورۂ مریم میں قال کذلک علیحدہ ہے اسی طرح سورۂ آل عمران میں بھی ہے اور اس صورت میں اس کا مطلب ہوگا کہ جب مریم نے کہا کہ میرے کیسے بیٹا ہوگا جب کہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا تو فرشتہ نے کہا "کذلک" (ایسا ہوگا) یعنی تمہیں مرد چھوئے گا اور تمہارے اولاد ہوگی۔

اب رہے الفاظ "اللہ یخلق مایشاء" اور "اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہ کن فیکون" سو اُن سے بھی عیسیٰ کی ولادت غیر معمولی طور پر ثابت نہیں ہوسکتی کیونکہ خدا تمام امور کو اپنے ہی طرف منسوب کرتا ہے اور قانون قدرت کے مطابق ظاہر ہونیوالے تمام واقعات کو بھی یخلق مایشاء اور کن فیکون کے انداز میں بیان کرتا ہے، کلام مجید میں نہایت کثرت سے ان الفاظ کا استعمال ہوا ہے، اور ہر جگہ مقصود یہی ہے کہ تمام امور کو اپنے سے منسوب کرے

کن فیکون سے نہیں اور کسی مفسر کے نزدیک یہ مراد نہیں ہے کہ کسی امر کا وقوع یا کسی شے کا وجود فوراً اُسی لمحہ میں ہو جائے اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ اگر ولادت مسیح کے غیر معمولی طور پر ہونے کا اظہار مقصود ہوتا تو "یخلق کیف ما یشاء" کہا جاتا نہ کہ "یخلق ما یشاء"۔

اب سورۂ مریم کی آیتوں پر غور کیجئے:۔

اذ انتبذت من اہلہا مکاناً شرقیا۔ مکان شرقی سے مراد حضرت مریم کی خوابگاہ ہے یا اُن کی عبادت کی جگہ جہاں بحالت خواب انکو فرشتہ نظر آیا اور اُس سے وہی گفتگو ہوئی جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں ہو چکا ہے۔ آگے چلکر ولنجعلہ آیۃ للناس ورحمۃ منا کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں، لیکن اُن کا تعلق حضرت عیسیٰ کی آئندہ زندگی اور نبوت سے ہے نہ کہ ولادت وطریق ولادت سے۔

اس کے بعد مریم کے حاملہ ہونیکا اور ان کے چلے جانے کا ذکر ان الفاظ میں ہے:۔ فحملتہ فانتبذت بہ مکاناً قصیا جب کلام مجید میں کوئی قصہ یا واقعہ بیان کیا جاتا ہے تو درمیان کی غیر ضروری کڑیاں چھوڑ کر خاص خاص باتوں کا ذکر کر دیا جاتا ہے لیکن بعض لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح واقعات بیان ہوئے ہیں وہ سب مسلسل اور فوراً وقوع میں آئے ہیں۔ سورۂ مریم میں پہلے مریم کا فرشتہ کو دیکھنا بیان ہوا ہے، اور اس کے بعد ہی حاملہ ہونے، وضع حمل کی تکالیف میں مبتلا ہونے، عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لانے اور عیسیٰ کا لوگوں سے گفتگو کرنے کے واقعات بیان ہوئے ہیں لیکن یہ تمام جملے "فا" سے شروع کئے گئے ہیں جس سے ترتیب واقعات تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن قرب زمانی کا اس کو کوئی واسطہ نہیں ہے بعض لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ تمام واقعات فوراً ہو گئے، یعنی فرشتہ کا آنا، مریم کا حاملہ ہونا، وضع حمل ہو جانا اور مسیح کا بولنا یہ سب ایک ہی ساعت یا دن میں ہو گیا، حالانکہ مقصود صرف واقعات کو اس ترتیب سے ظاہر کرنا ہے نہ یہ کہ وہ فوراً وقوع میں آ گئے۔

سورۂ مریم کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مریم حاملہ ہونیکے بعد کسی دور جگہ چلی گئیں اور تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جگہ ناصرہ تھی یا مصر جہاں وہ اپنے نسبتی شوہر یوسف نجار کے ساتھ تشریف لے گئیں۔ اس کے بعد جو آیت "فاجاءہا المخاض" سے شروع ہوتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وضع حمل جنگل میں کسی بلند مقام پر ہوا جب کہ مریم حالت سفر میں تھیں اور وضع حمل کی تمام وہ تکالیف آپ پر طاری ہوئیں جو عام طور پر ظاہر ہوتی ہیں یہ گویا دوسرا ثبوت اس امر کا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت اسی طرح ہوئی جس طرح عام طور پر تمام بچوں کی ہوتی ہے۔ پھر وہ آیتیں ہیں جن میں حضرت مریم کا عیسیٰ کو اپنی قوم کے پاس لانا وغیرہ بیان ہوا ہے، اور اُن میں بعض الفاظ تو ضرور غور طلب ہیں۔ ہم اُن کو مکرر درج کرتے ہیں۔

فاتت بہ قومہا تحملہ قالوا یا مریم لقد جئت شیئاً فریا یا اخت ہارون ما کان
ابوک امرأ سوء وما کانت امک بغیا۔ فاشارت الیہ قالوا کیف نکلم من کان
فی المہد صبیا۔ قال انی عبد اللہ آتانی الکتاب وجعلنی نبیا الخ

ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب مریم، حضرت عیسیٰ کو لیکر اپنی قوم کے پاس آئیں تو انھوں نے کہا اے مریم یہ تم عجیب چیز لے کر آئی ہو حالانکہ نہ تمھارا باپ برا تھا، اور نہ تمھاری ماں خراب تھی۔ یہ سنکر انھوں نے حضرت عیسیٰ کی طرف اشارہ کیا کہ اسی سے پوچھو، اس پر لوگوں نے کہا کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارہ کا بچہ تھا۔ اس پر عیسیٰ نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھے کتاب دی گئی ہے اور میں نبی بنایا گیا ہوں وغیرہ وغیرہ

غور طلب امر یہ ہے کہ قوم نے کیوں کہا کہ تم عجیب چیز لیکر آئی ہو، اور کیوں مریم کے ماں باپ کے متعلق یہ کہا کہ وہ خراب نہ تھے اسی کے ساتھ مریم کا

عیسیٰ کی طرف اشارہ کرنا اور قوم کا یہ کہنا کہ ہم بچہ سے کیا بات کریں اور پھر حضرت عیسیٰ کا گفتگو کرنا ان تمام باتوں کی کیا اصلیت ہے۔

عام طور پر ان آیات کا مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی مریم اس کو قوم کے پاس لے آئیں اور چونکہ مریم کی شادی کسی سے نہ ہوئی تھی، اس لئے ان کو بچہ پیدا ہونے پر تعجب ہوا اور انھوں نے مریم پر یہ الزام لگایا کہ تمہارے ماں باپ تو ایسے نہ تھے یہ تم نے کیا حرکت کی کہ ناجائز بچہ پیدا ہوا، لیکن حضرت عیسیٰ نے وہیں گود یا گہوارہ سے قوم کو مخاطب کیا جو ان کا ایک معجزہ تھا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ بلکہ خود انہیں آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ جب اپنی قوم کے پاس آئے ہیں تو بچہ نہ تھے اور نہ مریم پر لوگوں نے ناجائز مولود پیدا کرنے کا الزام لگایا تھا۔

وہ لوگ جو یہ بیان کرتے ہیں کہ مریم ان کو بالکل عالت طفلی و شیر خوارگی میں لائیں وہ ثبوت میں لفظ تحملہ کو پیش کرتے ہیں یعنی مریم حضرت عیسیٰ کو لائیں اس حال میں کہ وہ انہیں اٹھائے ہوئے تھیں یا گود میں لئے ہوئے تھیں، ایسا سمجھنا غلطی ہے کیونکہ خود کلام مجید میں دوسری جگہ یہی لفظ آیا ہے اور وہاں گود میں لینے کے معنی نہیں ہیں بلکہ کسی سواری پر لیجانے کے ہیں۔ ملاحظہ ہو سورۂ برأت آیت ۹۲

(ولا علی اللذین اذا ما اتوک لتحملہم قلت لا اجد ما احملکم علیہ)

اس لئے یہاں بھی یہ معنی ہوئے کہ مریم حضرت عیسیٰ کو کسی سواری پر لائیں۔ علاوہ اس کے جو گفتگو حضرت عیسیٰ نے کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عیسیٰ پیغمبر ہو چکے تھے اور ان کو کتاب الٰہی مل چکی تھی، اور یہ امر ظاہر ہے آپ کو نبوت ۳۰ سال کی عمر میں ملی ہے، اسی کے ساتھ قوم کا یہ کہنا کہ اس سے کیا بات کریں جو گہوارہ میں بچہ تھا (یعنی انہوں نے لفظ کان کا استعمال کیا ہے جس سے زمانۂ ماضی ظاہر ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ فی الحال گہوارہ کے بچے ہیں) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰ بچہ نہ تھے۔

اب رہا یہ امر کہ قوم کا مریم سے کہنا کہ تم عجیب چیز لائی ہو، اور یہ کہ تمہارے ماں باپ خراب نہ تھے سو اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ اُن پر ناجائز مولود پیدا کرنے کا الزام لگایا تھا، اور نہ ان کا کوئی شوہر نہ تھا۔ چونکہ حضرت عیسیٰ یہودیوں کے عقاید کے خلاف تلقین کرتے تھے اس لئے انہوں نے لفظ فریا استعمال کیا جس کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو عجیب و غریب باتیں کرے یا دکھائے۔ یعنی انہوں نے کہا کہ اے مریم یہ کیسا بیٹا تم نے جنا ہے جو ہمارے معتقدات کی اس قدر توہین کرتا ہے حالانکہ تمہارے ماں باپ تو ایسے نہ تھے۔

یہ سن کر مریم نے کہا کہ اسی سے پوچھو جس پر اہل قوم نے کہا کہ ہم اس سے کیا بات کریں جو کل گہوارہ میں کھیلتا تھا۔ اس سے مقصود گویا عیسیٰ کی توہین تھی اور ان کی ناتجربہ کاری کو ظاہر کرنا۔ اس کے جواب میں جو کچھ عیسیٰ نے کہا وہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ لوگوں نے مریم پر زنا کی تہمت نہیں لگائی اور نہ حضرت عیسیٰ بن باپ کے پیدا ہوئے، کیونکہ حضرت عیسیٰ نے جو کچھ جواب میں کہا ہے اس میں کہیں اپنی ماں کی برأت کا ذکر نہیں ہے۔ ورنہ یہ الزام لگایا گیا ہوتا اور قوم یہ تہمت مریم پر رکھتی تو اس کے متعلق بھی آپ کچھ کہتے، لیکن آپ نے کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب کو عیسیٰ کی ولدیت کا پورا علم تھا، اور یوسف نجار کے ساتھ مریم کے منسوب ہونے کو سب جانتے تھے اس لئے وہ یہ تہمت رکھ ہی نہ سکتے تھے اور اسی بناء پر حضرت عیسیٰ کو اپنی ماں کی برأت اور اپنی ولادت کے متعلق کسی بیان کے پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہی نہیں ہوئی۔

مذکورۂ بالا آیات کے علاوہ چند آیتیں اور ہیں جن سے غیر معمولی ولادت مسیح پر استدلال کیا جاتا ہے مثلاً۔

یا اہل الکتاب لا تغلوا فی دینکم ولا تقولوا علی اللہ الا الحق انما — اے کتاب والو اپنے دین میں غلو مت کرو اور اللہ کے حق میں سوائے

المسیح ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القٰھا الیٰ مریم وروحٌ منہ
(سورہ نساء آیت ۱۷۱)

مسیح بیٹے اور کچھ نہیں، مسیح ابن مریم اللہ کا رسول ہے اور اُس کا کلمہ ہے جو بھیجا یا اُس نے مریم کی طرف اور روح ہے اُس کی طرف سے۔

واللتی احصنت فرجھا فنفخنا فیھا من روحنا وجعلنٰھا وابنھا آیتہ للعالمین۔
سورہ انبیاء آیت ۹۱

اور (مریم) وہ ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اس لئے پھونکدی ہم نے اُس میں اپنی روح اور بنا دیا اُسے اور اُس کے بیٹے کو نشانی قوموں کے لئے۔

ان آیات یا اسی مفہوم کی دوسری آیتوں میں جو جدید لفظ قابل غور ہے وہ "نفخ روح" ہے بعض کا خیال ہے کہ خدا کا یہ کہنا کہ ہم نے "روح پھونکی" اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ عیسیٰ صرف روح اللہ تھے اور ان کے کوئی باپ نہ تھا، لیکن یہ استدلال حد درجہ ضعیف ہے کیونکہ خدا نے ہر انسان کی پیدائش کا باعث نفخ روح قرار دیا ہے۔

خلق الانسان من طین ثم جعل نسلہ من سلالۃ من ماء مھین ثم سواہ ونفخ فیہ من روحہ

علاوہ اس کے سورہ انبیاء کی آیت ۹۱ سے بھی جو اوپر درج کی گئی ہے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مریم شوہر والی تھیں، کیونکہ اس میں لفظ احصنت استعمال کیا گیا ہے، یعنی آپ کا محصنہ ہونا بیان کیا گیا ہے اور محصنہ اس عورت کو کہتے ہیں جو شوہر رکھتی ہو، کنواری کو عربی زبان میں محصنہ نہیں کہتے۔ اس آیت میں جو مریم کے متعلق یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انھوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو اس سے یہ مقصود ہے کہ انھوں نے سوائے اپنے شوہر کے مردوں سے احتراز کیا نہ یہ کہ اپنے شوہر سے بھی۔ چونکہ بعض یہودی آپ پر زنا کی تہمت رکھتے تھے اس لئے خدا نے کلام مجید میں اُن کی عفت کی شہادت دی۔ یہاں ایک نکتہ اور قابل غور ہے وہ یہ کہ یہودیوں نے زنا کی تہمت یوسف نجار کے ساتھ کبھی نہیں لگائی بلکہ ایک اور شخص پنتھیرا نامی کے ساتھ منسوب کی تھی۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یوسف نجار کا شوہر ہونا اس وقت سب کو معلوم تھا اور اسکے ساتھ تہمت نہیں لگا سکتے تھے۔

سورہ نساء میں ایک جگہ خدا فرماتا ہے۔ لن یستنکف المسیح ان یکون عبداً للہ (مسیح کے لئے اس میں کوئی امر باعث ننگ نہیں ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہو) اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ بہ حیثیت مخلوق خداوندی ہونے کے وہ دوسرے انسانوں سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے اور یہیں سے نفخ روح کے مفہوم پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس سے مراد وہی عام نفخ روح ہے جو دوسرے انسانوں کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ آپ دوسرے انسانوں کی طرح نو مہینے تک ماں کے پیٹ میں رہے جیسا کہ ابن عباس کے قول سے ثابت ہوتا ہے اور مریم کو دردزہ کی بھی وہی تکلیف ہوئی جو عام طور پر تمام عورتوں کو ہوتی ہے (ملاحظہ ہو سورہ مریم) تو کوئی وجہ نہیں کہ استقرار حمل کو خلاف قانون قدرت یقین کیا جائے علی الخصوص اس وقت جب کہ قرآن پاک میں کہیں اس کا ذکر موجود نہیں ہے۔ اگر یوسف نجار کے ساتھ آپ کا تعلق ازدواج ثابت نہ ہوتا، اگر آپ کی ولادت کسی ایسے غیر معمولی طریقہ سے ہوتی جو عادۃً طور پر نہیں دیکھی جاتی تو بیشک آپ کی ولادت بصورت معجزہ یہودیوں کے سامنے پیش کی جا سکتی تھی، لیکن جب لوگوں کو معلوم تھا کہ یوسف کے ساتھ آپ منسوب ہو چکی ہیں، انھیں کے ساتھ رات دن رہتی ہیں اور استقرار حمل کے بعد آپ کی ولادت بھی معمولی طور پر ہوئی ہے تو پھر اس واقعہ پر نہیں کیا حیرت ہو سکتی تھی۔ اور وہ کس طرح اسے مریم یا مسیح کا معجزہ یقین کر سکتے تھے۔ بہرحال کلام مجید سے یہ بات کسی طرح ثابت نہیں ہوتی کہ مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوئی۔ اس لئے اب دیکھنا ہے

کہ ایسی صورت میں جب کہ انجیل سے بی بی مریم اور یوسف کا تعلق ازدواج ظاہر ہو رہا ہے اور اُس میں متعدد جگہ یوسف کو مسیح کا باپ ظاہر کیا گیا ہے، یہ اعتقاد کہ آپ بن باپ کے پیدا ہوئے دنیا میں کیونکر پھیل گیا۔

اس میں شک نہیں کہ مسیح کو خدا کا بیٹا، خدا کی روح کہنا اور اُن کی نسبت اسی قسم کے اور الفاظ کا استعمال جن سے ایک شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ عیسیٰ کا کوئی انسانی باپ نہ تھا انجیل میں پایا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ سنٹ پال نے لکھا ہے یہ سب روحانی اعتبار سے تھا، لیکن بعد کو یہ اعتبار محو ہو گیا اور عیسائی یہودیوں کی ضد میں جو مسیح کو ناجائز مولود کہتے تھے، حقیقی معنی میں خدا کا بیٹا کہنے اور سمجھنے لگے اور اسی خیال کو بعض مفسرین اسلام نے بغیر کسی تنقیح کے اپنے ہاں لے لیا۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کلام مجید میں ہر جگہ عیسیٰ کو ابن مریم کہا گیا ہے اُن کے باپ کا نام کسی جگہ درج نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بن باپ کے پیدا ہوئے۔ لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ کلام مجید جب نازل ہوا تو عیسیٰ اُس وقت ابن مریم ہی کی کنیت سے مشہور تھے اور اسی لئے مخاطبت میں اس لفظ کو قائم رکھا علاوہ اس کے اگر کلام مجید میں کسی کے باپ کے ذکر کا نہ ہونا اس امر کی دلیل ہو کہ اُس کے باپ ہی نہ تھا تو موسیٰ کو بھی بن باپ کے ماننا پڑیگا۔ کیونکہ اُن کے پیدائش کے ذکر میں بھی اُن کے باپ کا نام نہیں لیا گیا۔

(۳)

جس طرح حضرت عیسیٰ کی ولادت کا مسئلہ اہم ہے اسی طرح اُن کی وفات یا مصلوب ہونیکا بھی واقعہ بہت غور طلب ہے۔

اس مسئلہ میں یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے خیالات مختلف ہیں، یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ صلیب پر چڑھا کر قتل کئے گئے، عیسائی کہتے ہیں کہ وہ مصلوب ہونے کے بعد پھر زندہ ہو کے آسمان پر اٹھا لئے گئے، اور مسلمان کہتے ہیں کہ وہ صلیب پر نہیں چڑھائے گئے۔ بلکہ کوئی اور شخص اُنکی جگہ مصلوب ہوا، لیکن آسمان پر چلے جانیکے یہ بھی قایل ہیں۔ کلام مجید کی جن آیتوں سے اس پر استدلال کیا جاتا ہے یہ ہیں :-

اذ قال اللہ یا عیسیٰ انی متوفیک و رافعک الی و مطہرک من الذین کفروا۔ (آل عمران آیت ۵۴)

جب اللہ نے کہا اے عیسیٰ میں بیشک تجھے مارنیوالا ہوں، اور اُٹھانیوالا ہوں اپنی طرف، اور پاک کرنیوالا ہوں تجھے اُن سے جو کافر ہوئے۔

وقولہم انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ و ما قتلوہ و ما صلبوہ ولاکن شبہ لہم وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالہم بہ من علم الا اتباع الظن و ما قتلوہ یقیناً بل رفعہ اللہ الیہ و کان اللہ عزیزاً حکیما۔ (سورۂ نساء۔ آیت ۱۵۰، ۱۵۱)

(اور اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر) بسبب اُن کے یہ کہنے کے کہ ہم نے قتل کر دیا مسیح عیسیٰ مریم کے بیٹے اللہ کے رسول کو اور انہوں نے اور انہوں نے نہیں قتل کیا اس کو نہ صلیب دی اُس کو، لیکن اُن کو اس کا دہوکہ ہوا اور جو لوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ بیشک شک میں ہیں اُن کا علم جو کچھ ہے صرف ظن و قیاس ہے اور یقیناً مسیح کو قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے اُٹھا لیا اُس کو اپنی طرف اور اللہ غالب ہے حکمت والا۔

سب سے پہلے ہم آپ کے واقعۂ صلیب کو لیتے ہیں۔ جس کا ذکر نہایت صراحت کے ساتھ سورۂ نساء میں آیا ہے، سورۂ نساء کی اُن آیتوں میں ذکر ہے

یہود کا جو کہتے تھے کہ ہم نے مسیح کو صلیب پر چڑھا کر قتل کر ڈالا۔ کلام مجید میں اس کا صاف انکار کیا گیا ہے کہ نہ انھوں نے مسیح کو قتل کیا اور نہ صلیب پر چڑھایا، لیکن بحث طلب الفاظ شبہ لہم کے ہیں، جس سے بعض نے یہ استدلال کیا ہے کہ کوئی دوسرا شخص مسیح کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا اور اسی کو سولی پر چڑھا یا گیا۔ لیکن ان الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا نہایت ناروا جسارت ہے۔ کلام مجید کے الفاظ کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ یہود ی مسیح کی موت یا ان کے قتل کئے جانے کے مسئلہ میں دہوکے میں مبتلا ہو گئے یعنی وہ ہلاک ہوئے نہیں اور انھیں مردہ سمجھ لیا گیا۔ عربی زبان میں یہ لفظ کثرت سے التباس یا دہوکہ کے معنی میں مستعمل ہے چنانچہ عام طور پر جب کسی شخص کو کسی بات میں دہوکہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں۔ شبہ علیہ الامر (فلاں امر میں اس کو التباس یا دہوکا ہو گیا) اس لئے اس سے یہ نتیجہ لینا کہ کوئی اور شخص مسیح کی شبیہ بن گیا تھا درست نہیں ہو سکتا۔

اب رہا یہ امر کہ اگر وہ صلیب پر چڑھائے گئے تھے تو کلام مجید میں کیوں اس کی نفی ما صلبوہ کہہ کر کی گئی ہے، اس کا جواب نہایت آسان ہے قرآن پاک میں قتل و صلیب دونوں کی نفی ساتھ ساتھ کی گئی ہے اور یوں ارشاد ہوا ہے ما قتلوہ و ما صلبوہ جس سے صاف ظاہر ہے کہ ما صلبوہ کا مفہوم بھی وہی ہے جو ما قتلوہ کا ہے یعنی ان کو صلیب پر چڑھانے کے بعد جو اصل مقصود تھا حاصل نہیں ہوا۔ اور وہ ہلاک نہیں ہوئے اس لئے جب صلیب دینے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ کہنا عام محاورہ کے بالکل مطابق ہے کہ انھیں صلیب دی ہی نہیں دی گئی، جس کی تصدیق شبہ لہم سے اور زیادہ ہوتی ہے، اور شبہ لہم کا مفہوم جو ہم نے بیان کیا آگے کے الفاظ مالہم بہ من علم الا اتباع الظن سے اور زیادہ موثق ہو جاتا ہے

اس کے بعد سوال ہے اُن کے آسمان پر اٹھائے جانے کا اور جس کے ثبوت میں رافعک الیّ اور رفعہ اللہ الیہ کے الفاظ پیش کئے جاتے ہیں، لیکن یہاں رفع (اٹھانے) سے مراد رفع جسم (جسم کا اٹھانا) نہیں ہے بلکہ رفعت مرتبت مراد ہے، جیسا کہ مفردات امام راغب اور تفسیر کبیر میں بھی صراحتاً مذکور ہے، عربی میں رفع کے معنی رفع قدر کے بھی آتے ہیں اور رفیع اُس شخص کو کہتے ہیں جو معزز و بلند مرتبت والا ہو۔

اس خیال کی مزید تقویت سورۂ آل عمران کی آیت ۴۸ سے بھی ہوتی ہے جہاں رافعک الیّ کے بعد ہی بذریعہ عطف کے ذریعہ سے اس فقرہ کو بھی ملا دیا گیا ہے۔ ومطہرک من الذین کفروا۔

کہا جاتا ہے کہ جب مسیح صلیب پر چڑھائے گئے تو انھیں آسمان پر اٹھا لیا گیا اور ان کی شبیہ صلیب پر قائم کر دی گئی، بعض کا خیال ہے کہ صلیب تو انھیں دی گئی تھی لیکن وہ صلیب پر مردہ سمجھ کر اتارے گئے تو خدا نے انھیں اوپر اٹھا لیا۔ الغرض آسمان پر اٹھائے جانے کا واقعہ صلیب ہی کے واقعہ سے متعلق ظاہر کیا جاتا ہے حالانکہ کلام مجید میں صراحتہً انی متوفیک و رافعک الیّ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفع آسمان کا واقعہ آپ کی وفات کے بعد ہوا ہے۔ اور آپ کی وفات صلیب پر ہوئی نہیں جیسا کہ ہم ابھی کلام مجید سے ثابت کر چکے ہیں اس لئے انحصار فیصلہ کا اس امر پر ہوا کہ آپ کی وفات ہوئی یا نہیں، یعنی آپ نے عمر طبعی کو پہنچ کر انتقال کیا یا نہیں، اگر یہ ثابت ہو جائے تو [illegible] آسمان پر اٹھائے جانے اور مفہوم رفع کی بھی وضاحت آسانی سے ہو جائے گی۔

لفظ متوفی کا مصدر توفی ہے اور جو مفسرین حضرت عیسیٰ کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے قائل ہیں انھوں نے توفی کے معنی استعمال

یا وفائے عہد کے لئے ہیں یعنی خدا نے عیسیٰ سے کہا کہ میں تجھ سے وفائے عہد کرنے والا ہوں۔ ہر چند توفی کے یہ معنی بھی آتے ہیں لیکن کوئی وجہ نہیں کہ توفی کے معنی مارنے کے نہ لئے جائیں جب کہ توفاہ اللہ کے معنی اماتہ اللہ (اللہ نے موت طاری کی کے بھی آتے ہیں۔ امام بخاری نے بھی ابن عباس کی روایت سے متوفیک کے معنی ممیتک (مجھ پر موت طاری کرنے والے) ظاہر کئے ہیں خود کلام مجید میں بھی اور مقامات پر لفظ توفی مارنے کے معنی میں آیا ہے، ملاحظہ ہو سورۂ نسا آیت ۹۹

(ان الذین توفاہم الملائکۃ الخ) اور سورۂ انعام آیت ۶۰ (و ہو الذی یتوفیکم باللیل الخ)

علاوہ اس کے یوں بھی جب کلام مجید سے نہایت صراحۃ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عیسیٰ اپنی موت سے مرے اور وہ عمر طبیعی کو پہنچے تو متوفیک کے معنی سوائے ممیتک کے کوئی اور اختیار کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے

یوں تو کلام مجید کی مختلف آیتوں سے حضرت عیسیٰ کی وفات اور ان کی طبعی موت ثابت ہوتی ہے، لیکن یہاں ہم صرف دو آیتیں پیش کرتے ہیں جن میں نہایت صراحت کے ساتھ اس امر کا اظہار ہے اور جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

واذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی وامی الٰہین من دون اللہ قال سبحانک مایکون لی ان اقول ما لیس لی بحق۔ ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک انک انت علام الغیوب ما قلت لہم الا ما امرتنی بہ ان اعبدوا اللہ ربی وربکم وکنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیہم وانت علیٰ کل شیء شہید۔

جب کہے گا اللہ (قیامت کے دن) اے عیسیٰ مریم کے بیٹے کیا تو نے کہا تھا لوگوں سے کہ مجھے اور میری ماں کو خدا ٹھیراؤ علاوہ اللہ کے عیسیٰ جواب دیگا۔ پاک ہے تیری ذات، میں کیونکر ایسی بات کہہ سکتا تھا جو حق نہ تھی اور اگر میں نے ایسا کہا ہوگا تو تجھے خبر ہوگی کیونکہ جو میرے جی میں ہے اس کا علم تجھے ہے اور جو تیرے جی میں ہے اسے میں نہیں جانتا۔ تو غیب کی چیزوں کا جاننے والا ہے۔ میں نے تو ان سے وہی کہا جو تو نے حکم دیا تھا یعنی یہ کہ اللہ کی پرستش کرو جو میرا تمہارا سب کا پروردگار ہے اور اس بات پر میں ان کا گواہ تھا جب تک میں ان کے درمیان میں رہا پھر جب تو نے مجھ پر موت طاری کی تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز کا گواہ ہے

آخیر کی آیت میں توفیتنی کے معنی سوائے مارنے کے اور کوئی نئے ہی نہیں جا سکتے، کیونکہ اگر کوئی اور معنی لئے جائیں گے تو مفہوم بالکل غلط ہو جائے گا اور یہ امر اس قدر ظاہر ہے کہ کسی مزید تصریح کی ضرورت نہیں۔

دوسری آیت جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ عمر طبعی تک پہنچنے کے بعد بوڑھے ہو کر مرے یہ ہے:۔

ویکلم الناس فی المہد وکہلا (آل عمران آیت ۴۶) ———— اور مسیح بات کریگا گہوارہ میں اور عالم ضعیفی میں۔

یہ آیت اس سلسلہ کی ہے جب فرشتہ نے مریم کو بیٹے کی ولادت کی خوشخبری دی تھی۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ اس قدر تندرست پیدا ہوں گے کہ گہوارہ ہی میں دوسرے توانا بچوں کی طرح بات کرنے لگیں گے اور ضعیفی میں پہنچنے کے بعد بھی ان کو یہی عالم رہیگا۔ اس آیت میں لفظ کہلا سے صاف طور پر یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ کلام مجید میں مسیح کی عمر طبعی تک پہنچنے کی پیشین گوئی موجود ہے۔

پھر جب مسیح کا عمرِ طبعی تک پہنچنا اس طرح ثابت ہوتا ہے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آپ صلیب سے نہیں مرے۔ کیونکہ جس وقت آپکو صلیب دی گئی آپ کی عمر ۳۲ سال کچھ دن کی تھی اور اس عمر کے انسان کو کہلاً (ضعیف) نہیں کہہ سکتے اور اس صورت میں متوفیک کے معنی وہی لئے جائیں گے جو ہم نے بیان کئے ہیں۔

بعض مفسرین نے یکلم الناس فی المہد سے آپ کا یہ معجزہ ثابت کیا ہے کہ آپ گہوارہ ہی میں باتیں کرنے لگے تھے۔ اوّل تو گہوارہ یعنی عالم طفلی میں بچوں کا باتیں کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں، بہت سے تندرست بچے شیر خوارگی ہی کے زمانہ میں بولنے لگتے ہیں اور اگر واقعی اس سے اظہار معجزہ کا ہے تو کہلاً بیکار ہو جاتا ہے اور اس کے ذکر کی ضرورت نہیں رہتی۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ہم صلیب دیئے جانے کے واقعہ کو مربوط صورت میں بیان کر دیں تاکہ واقعات یکجائی طور پر سامنے آجائیں اور آیات قرآن کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صلیب پر چڑہانا یہ معنی رکھتا تھا کہ انسان یقیناً اور فوراً مر جاتا تھا۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ صلیب پر چڑہانے کی یہ صورت ہوا کرتی تھی کہ انسان کو ایک لانبے تختے کے ساتھ ملا کر کھڑا کرتے تھے اور اس کے ہاتھوں کو دوسرے تختے پر جو پہلے تختہ پر متقاطع صورت میں جڑا ہوتا تھا پھیلا دیتے تھے اور کس کر باندہ دیتے تھے، اسی طرح پاؤں پر پاؤں رکھکر تختہ کے ساتھ کیل سے جڑ دیتے تھے یا باندہ دیتے تھے تاکہ آدمی نیچے کو نہ سرک سکے، بس اسکا نام صلیب دیا جاتا تھا، مصلوب انسان کو اسی حال میں بھوکا پیاسا چھوڑ دیتے تھے، یہاں تک کہ وہ دہوپ، بھوک اور ہاتھ پاؤں کے زخموں کی تکلیف سے دو چار دن میں ہلاک ہو جاتا تھا۔

جمعہ کے دن دوپہر کو مسیح صلیب پر چڑہائے گئے، چونکہ اسی دن شام سے یوم سبت شروع ہونیوالا تھا اس لئے یہودیوں کے اعتقاد کے بموجب شام سے پہلے مسیح کو دفن بھی ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن اس خیال سے کہ اس قدر جلد کوئی شخص صلیب پر نہیں مر سکتا، یہ رائے قرار پائی کہ مسیح کی ٹانگیں توڑ دیجائیں تاکہ وہ جلد ہلاک ہو جائیں، لیکن جب آپ کو جا کر دیکھا تو آپ پر شدتِ تکلیف سے غشی کی سی کیفیت طاری تھی اور سب نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ آپ مر گئے ہیں۔ چنانچہ آپکے دفن کئے جانے کی اجازت دیدی گئی، اور رات ہی کو آپ کے ایک حواری نے لیجا کر دفن کر دیا یا کسی غار میں چھپا دیا، اور پھر وہاں سے آپکو نکالکر لے گیا۔ اس کے تیسرے دن بعد جب آپ کی قبر کو دیکھا گیا تو پتھر سرکا ہوا تھا اور لاش موجود نہ تھی، اس واقعہ پر حواریوں نے مشہور کر دیا کہ آپ آسمان پر اُٹھا لئے گئے۔ تاکہ یہودی تلاش نہ کریں اور اس کو معجزہ سمجھکر آپ کی نبوت پر ایمان لے آویں، اس کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرتِ عیسیٰ اپنے حواریوں کے ساتھ کہاں گئے، کب تک زندہ رہے اور کہاں مدفون ہیں۔ انجیل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ معہ حواریوں کے گلیلی چلے گئے تھے۔

احمدی جماعت کا بیان ہے کہ وہ وادی کشمیر میں آئے، چنانچہ سری نگر میں اُن کا مزار موجود ہے جو نبی صاحب کا مزار کہلاتا ہے۔

جو واقعات انجیل کی روایات سے معلوم ہوئے ہیں اُن سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے مصلوب ہونے کی حالت میں جان نہیں دی، مثلاً صرف چند گھنٹے صلیب پر رہنا جبکہ کئی دن میں معمولاً مصلوب کی جان نکلتی ہے۔ مسیح کے ساتھ جو دو شخص اور مصلوب ہوئے تھے، اور وہ بھی شام کو اتار لئے گئے تھے، زندہ رہے۔ اگر خدا آپ کے جسم کو آسمان پر اُٹھا لیتا تو جہاں آپ غار یا قبر میں مدفون تھے وہاں کا پتھر سرکنے کی کوئی وجہ نہ تھی، کیونکہ خدا کو اوپر اُٹھانے کے لئے پتھر ہٹانا ضروری نہ تھا، جب آپ واقعہ صلیب کے بعد اپنی ماں سے ملے تو جسم پر زخموں کے نشان موجود تھے اور آپ بھیس

بدلے ہوئے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے واقعی آپ مصلوب ہوئے اور زندہ اتار لئے گئے اور اس ڈر سے کہ یہودیوں کو پتہ نہ چل جائے بھیس بدلکر اپنی ماں سے ملے۔

(۳)

تیسرا حصہ اس بحث کا مسیح کے معجزات سے متعلق ہے۔ سب سے پہلا معجزہ تو یہ ہے کہ آپ نے گہوارہ سے گفتگو کی، اس کے متعلق ہم کوئی مزید بحث نہ کریں گے کیونکہ گزشتہ صفحات میں ہم اس کی حقیقت واضح کر چکے ہیں، اور گہوارہ سے بات کرنیکا مفہوم صغیر سنی میں بات کرنیکا ہے اور یہ کوئی معجزہ نہیں، باقی اور معجزات وہ ہیں جن کا ذکر سورہ مائدہ اور آل عمران میں ہے۔ وہ آیتیں یہ ہیں:-

انی قد جئتکم بآیۃ من ربکم۔ انی اخلق لکم من الطین کہیئۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیراً باذن اللہ وابرئ الاکمہ والابرص واحی الموتیٰ باذن اللہ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذلک لایۃ لکم ان کنتم مومنین۔ (آل عمران آیت ۴۰)

میں لایا ہوں تمہارے پاس نشانی تمہارے رب کی طرف سے۔ میں بناتا ہوں تمہارے لئے مٹی سے طائر کی صورت میں، پھر پھونکتا ہوں اس میں پس وہ ہو جاتا ہے ایک طائر اللہ کے حکم سے، اور اچھا کرتا ہوں اندھے کو کوڑھی کو اور جلاتا ہوں مردہ کو اللہ کے حکم سے اور خبردار کرتا ہوں جو تم کھاتے ہو اور جو گھروں میں بچاتے ہو، تحقیق کہ اس میں نشانی ہے تمہارے لئے اگر تم ایمان لانیوالے ہو

اذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریم اذکر نعمتی علیک وعلیٰ والدتک اذ ایدتک بروح القدس، تکلم الناس فی المہد وکہلا واذ علمتک الکتاب والحکمۃ والتوراۃ والانجیل واذ تخلق من الطین کہیئۃ الطیر باذنی فتنفخ فیہا فتکون طیراً باذنی وتبرئ الاکمہ والابرص باذنی واذ تخرج الموتیٰ باذنی واذ کففت بنی اسرائیل عنک اذ جئتہم بالبینات فقال الذین کفروا منہم ان ہذا الا سحر مبین۔

جب کہیگا اللہ اے عیسیٰ ابن مریم یاد کرو میری نعمت کو اپنے اوپر اور اپنی ماں کے اوپر جب میں نے مدد کی تیری روح القدس کے ذریعہ سے، تو نے بات کی لوگوں سے گہوارہ میں اور بڑھاپے میں، جب میں نے سکھائی تجھے کتاب، حکمت، توریت، اور انجیل، اور جب بنایا تو نے مٹی سے طائر کی صورت میں میرے حکم سے پھر تو نے پھونکا اس میں اور وہ ہو گیا طائر میرے حکم سے اور اچھا کیا تو نے اندھے کو کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب تو نے نکالا مردے کو میرے حکم سے اور جب میں نے باز رکھا بنی اسرائیل کو تجھ سے جبکہ تو ان کے پاس کھلی ہوئی دلیلیں لایا، لیکن کافروں نے کہا کہ یہ کھلا ہوا جادو ہے۔

اذ قال الحواریون یا عیسیٰ ابن مریم ہل یستطیع ربک ان ینزل علینا مائدۃ من السماء قال اتقوا اللہ ان کنتم مومنین۔ قالوا نرید ان ناکل

جب کہا حواریوں نے اے عیسیٰ ابن مریم کیا تیرا رب ایسا کریگا کہ وہ اتارے ہم پر دسترخوان آسمان سے۔ کہا اس نے ڈرو اللہ سے اگر تم ایمان والے ہو

منہا وتطمئن قلوبنا ونعلم ان قد صدقتنا ونکون علیہا من الشاہدین۔ قال عیسیٰ ابن مریم اللہم ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء تکون لنا عیداً لاولنا وآخرنا وآیۃ منک وارزقنا وانت خیر الرازقین۔ قال اللہ انی منزلہا علیکم فمن یکفر بعد منکم فانی اعذبہ عذاباً لا اعذبہ احداً من العالمین

(سورۂ مائدہ۔ آیت ۱۱۰۔ ۱۱۵)

انہوں نے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ کھائیں اس خوان سے اور مطمئن ہو جائیں ہمارے قلوب اور ہم جان لیں کہ بیشک تو نے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں۔ کہا عیسیٰ ابن مریم نے اے میرے پروردگار اتار ہم پر دسترخوان آسمان سے تاکہ ہو جائے ہمارے لئے مسرت ہمارے اگلوں کے لئے اور پچھلوں کیلئے اور نشانی تیری طرف سے اور ہمیں روزی دے اور تو بہتر روزی دینے والا ہے۔ کہا اللہ نے میں اتارنے والا ہوں خوان تمہارے اوپر، لیکن اگر کوئی نافرمانی کریگا اس کے بعد تم میں سے، تو اس کو میں ایسا عذاب دونگا کہ عالم کے لوگوں میں سے کسی ایک کو ویسا عذاب نہ دیا ہوگا۔

سوائے معجزۂ نزول مائدہ کے اور جتنے معجزات بیان کئے جاتے ہیں وہ سب آل عمران اور سورۂ مائدہ کی آیتوں میں مشترک ہیں یعنی جو معجزات سورۂ آل عمران میں بیان کئے گئے ہیں انہیں کا ذکر سورۂ مائدہ میں بھی ہے، لیکن فرق انداز بیان کا ضرور ہے۔ آل عمران میں خود حضرت عیسیٰ اپنی زبان سے انکا اظہار کر رہے ہیں کہ میں ایسا کرتا ہوں، ایسا کر سکتا ہوں، اور سورۂ مائدہ میں خدا اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں حضرت عیسیٰ پر ظاہر کرتا ہے کہ یاد کرو اس وقت کو جب تم ہمارے حکم سے ایسا اور ایسا کر سکتے تھے، لیکن چونکہ باتیں دونوں جگہ ایک ہی ہیں اس لئے علیحدہ علیحدہ بحث کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان آیتوں سے جن معجزات کا ثبوت پیش کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں:۔

(۱) مٹی کی چڑیا بنا کر حضرت عیسیٰ کا اس کے اندر پھونک مارنا اور اس کا اڑ جانا۔

(۲) اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنا۔

(۳) مردہ کو زندہ کر دینا۔

(۴) غیب کی خبر دینا اس قبیل سے کہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور گھروں میں کیا رکھتے ہیں۔

(۵) عیسیٰ کی دعا پر آسمان سے دسترخوان کھانے کا نازل ہونا۔

معجزۂ اول کے متعلق بعض مفسرین کا بیان ہے کہ واقعی وہ مٹی کی چڑیا بناتے تھے اور ان میں جان ڈالدیتے تھے، بعض کا خیال یہ ہے جن میں سرسید مرحوم بھی شامل ہیں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ کی عہد طفلی کا ہے اور بچپن میں لڑکے اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں، لیکن میرے نزدیک یہ دونوں باتیں سمجھ سے باہر ہیں، وہ اس لئے کہ کسی جاندار شے کو پیدا کرنا یا کسی چیز میں جان ڈالنا صرف اللہ کا کام ہے اور ثانیاً اس لئے کہ اگر مٹی کی چڑیاں بنا کر ان میں جان ڈالدینے کا واقعہ صرف ان کے عہد طفلی کے کھیل سے متعلق ہوتا تو خدا اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس کا ذکر نہ کرتا جیسا کہ سورۂ مائدہ کی آیتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔

بحیثیت مجموعی اگر ان آیات کا مطالعہ کیا جائے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضرت عیسیٰ نے جہاں جہاں جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ سب قصص و حکایات

اور امثال و تشبیہات کی صورت میں بیان کیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے لٹریچر کی یہی شان تھی اس لئے غور کرنا چاہیئے کہ لفظ خلق سے یہاں کیا مراد ہے اور نفخ کے بعد طائر کی طرح اڑنا کیا معنی رکھتا ہے۔

یہ امر ظاہر ہے کہ لفظ خلق پیدا کرنے کے معنی میں تو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ متعدد آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق (پیدا کرنا) صرف خدا کا کام ہے اور یہ صفت صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے اس جگہ لفظ خلق کے معنی صرف اندازہ کرنے یا عزم کرنے کے ہیں (اس لفظ کے یہ معنی بھی عربی زبان میں آتے ہیں) طین (مٹی) سے انسان کی ضعیف پیدائش کی طرف اشارہ ہے، نفخ سے مقصود احکام الٰہیہ کی تعلیم ہے، اور طیر سے وہ انسان مراد ہیں جو عام سطح انسانی سے بلند ہو جائیں۔

(سورہ مائدہ آیات ۱۱۲-۱۱۴)

کلام مجید میں انسانوں کو دآبہ اور طائر سے تشبیہ دی گئی ہے (ملاحظہ ہو سورۂ انعام آیت ۳۸ - وما من دابۃ الخ) اسی طرح ناسمجھ لوگوں کو جانوروں (انعام) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہو یعنی اپنی پیدائش کے لحاظ سے بہت حقیر ہو۔ میں طائر کی سی ہیئت دینے کا عزم کرتا ہوں اور پھر تعلیم الٰہی دیکر واقعی بلند پرواز اور بلند خیال انسان بناتا ہوں۔

اندھے، کوڑھی اور مردہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی روحیں بیمار اور مردہ ہیں، انجیل میں اکثر جگہ بیمار بولکر گنہگار مراد لیا گیا ہے اور وہ خود کلام مجید میں بھی اعمٰی اور اموات (اندھوں اور مردوں) سے گنہگار اور کافر مراد ہیں۔ مثلاً وما یستوی الاعمٰی والبصیر وما یستوی الاحیاء والاموات اس لئے اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ میں گنہگاروں سے ان کے گناہ چھڑاتا ہوں اور جو معصیت سے مردہ ہیں ان کو اخلاق کی تعلیم دیکر زندہ کرتا ہوں

مسیح کی خاص تعلیم یہ تھی کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اُسے اللہ کی راہ میں صرف کر دو اور کل کیلئے کچھ نہ رکھو، کیونکہ ان کے زمانہ میں لوگ کثرت سے سود خوار تھے اور گھروں میں دولت جمع رکھتے تھے، خواہ قوم پر کوئی آفت آجائے، اسی امر کی طرف اشارہ ہے ان الفاظ سے۔ وانبئکم بما تاکلون وما تدخرون یعنی میں تم کو بتاتا ہوں یا تنبیہ کرتا ہوں کہ تم کتنا اور کیا کھاتے ہو اور کیا جمع کرتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس آیت سے اخبار عن الغیب کیونکر سمجھ لیا گیا۔

اب رہا مایدہ کا آسمان سے نازل ہونا۔ سو کلام مجید سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ مایدہ نازل کیا گیا۔ البتہ عیسیٰ سے حواریوں نے اس کی خواہش کی تھی، اور آپ نے دعا بھی کی تھی لیکن اس کے بعد اس کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ مایدہ اتارا گیا، علاوہ اس کے مایدہ سے یہاں مراد واقعی کھانیکا دسترخوان نہیں ہے، بلکہ مقصود صرف روزی ہے، اور عیسیٰ کی یہ دعا اسی قبیل سے تھی، جیسی کہ انجیل میں پائی جاتی ہے کہ "اے خدا آج کے دن کی ہماری خوراک دے"

مایدہ کی ان آیتوں سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ حواریوں نے وسعت رزق طلب کی تھی اور اسی کی دعا حضرت عیسیٰ نے کی تھی، سو اس کے مقبول ہونیکا ثبوت آج کل عیسائیوں کی دنیاوی ترقی سے مل سکتا ہے۔

مطبوعات موصولہ

خصائص مرتضوی | ترجمہ ہے اُن احادیث کا جنھیں امام نسائی نے کتاب "المجتبیٰ" کے نام سے مرتب کیا تھا۔ یہ احادیث تمامتر حضرت علیؓ کے فضائل و خصوصیات سے متعلق ہیں اور اس لئے اُن کے ترجمہ کو یقیناً شیعہ سنی دونوں کے لئے باعث دلچسپی ہونا چاہئے۔ اس کا ترجمہ ہمارے عزیز دوست مولوی سید اولاد حسین صاحب شاعر لکھنوی نے کیا ہے جو ریاست رامپور میں مذہبی وعظ گوئی کی خدمت پر مامور ہیں اور جو مسلکاً اثنا عشری ہیں۔

اس سے قبل آپ علامہ سیوطی کے ایک نایاب رسالہ "احیاء المیت" کا بھی ترجمہ کر چکے ہیں جو فضائل اہلبیت میں ہے، اور جس پر میں اس وقت تک کوئی اظہار رائے نہیں کر سکا۔

جدید ترین طریقۂ قدیم و نایاب نسخوں کے متن و ترجمے وغیرہ پیش کرنے کا یہ ہے کہ ایڈیٹر یا مرتب سب سے پہلے اُس کتاب پر بہ حیثیت ایک "کتاب مخطوط" یا "منسوخ بالید" ہونے کے روشنی ڈالتا ہے تاکہ معلوم ہو کہ وہ اس لحاظ سے کس حد تک قابل اعتبار ہے، اور پھر وہ ترجمہ پیش کرتا ہے، لیکن شاعر صاحب نے ان دونوں کتابوں میں اس اہم فرض کو ترک کر دیا۔

اسی قسم کا اعتراض تھا جو معزز معاصر معارف نے احیاء المیت پر کیا تھا لیکن اس کے مفہوم کو نہ سمجھکر لکھنؤ کے جدید اثنا عشری رسالہ سہیل یمن نے قدح مقدوح کے عنوان سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ شاید معارف کے ایڈیٹر کو اس امر میں شک ہے کہ اس نام کا کوئی رسالہ علامہ سیوطی نے لکھا بھی ہے یا نہیں۔ اور ثبوت میں کشف الظنون کی عبارت نقل کی ہے۔

کشف الظنون کوئی ایسی غیر معروف کتاب نہیں ہے جس سے ایڈیٹر معارف یا کوئی اور پڑھا لکھا شخص واقف نہ ہو اور اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ ایڈیٹر معارف کا مفہوم وہی تھا جو میں نے عرض کیا۔ امید ہے کہ آئندہ شاعر صاحب جب کسی ایسی قلمی نادر کتاب کا ترجمہ شائع کرینگے تو اس امر کا بھی لحاظ رکھیں گے، کیونکہ جب تک یہ تنقیح نہ ہو جائے، موجودہ زمانہ میں کوئی اہل علم کسی نایاب کتاب کی اشاعت کو وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔

کتاب المجتبیٰ کا ترجمہ کرنے میں شاعر صاحب نے نہ صرف توسین کے اندر اپنی طرف سے جن تصریحات کا اضافہ کیا ہے اُن میں بلکہ یوں بھی کہیں کہیں نا جسارت کی حد تک پہنچ گئے ہیں۔ مثلاً صفحہ (۴) سطر (۱۱) میں یہ الفاظ کہ "آنحضرت نے صرف علیؓ ہی کو بلایا اور اپنے ساتھ کھلایا" بالکل زاید ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ "ثم جاء علی فاذن لہ" اس کا ترجمہ یہ ہونا چاہئیے تھا کہ "پھر علیؓ آئے اور رسول اللہ نے ان کو کھانے کی اجازت دی" ترجمہ کے اس انداز سے مجھے شک ہوتا ہے کہ کہیں "اذن لہم" نہ ہو اور شاعر صاحب نے اس کو "لہ" کر دیا ہو تاکہ ابو بکرؓ اور عمرؓ اس واحد کی ضمیر سے خارج ہو جائیں۔

اسی طرح صفحہ (۱۶) سطر (۲۳) میں یہ الفاظ کہ "اگرچہ تمہاری (علی) تو مغفرت ہو چکی ہے" بالکل شاعر صاحب کی ذہانت کا نتیجہ ہیں۔ ۱۲۔

حدیث میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس کا ترجمہ یہ کیا جاتا۔

صفحہ (۳۳) سطر (۵، ۶، ۷) میں عبارت نظر آتی ہے "مگر حضرت عمرؓ نے میرے کولہے میں ٹھوکا دیا (یعنی پوچھو تو کہ یہ شخص کون ہے)، شاید آنحضرتؐ نے اس اشارہ کو ملاحظہ فرمالیا اور حضرت عمرؓ ہی سے فرمایا کہ اس شخص سے نہ تو مراد ہے نہ تیرا ساتھی (ابوبکر)"

جس عبارت کا ترجمہ کیا گیا ہے وہ صرف یہ ہے:-

"وکزنی عمر فی حجزتی من خلفی فقلت من تعنی قال ما ایاک اعنی ولا صاحبک"

اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ "حضرت عمرؓ نے پیچھے سے میری کمر کو پکڑا، میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کس شخص سے آپ کی مراد ہے تو آپ نے فرمایا کہ میری مراد نہ تجھ سے ہے اور نہ تیرے دوست سے"

اب ادنےٰ تامل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر صاحب نے اپنی تصریح سے مفہوم کو کس قدر بدل دیا، وہاں تو عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابوذرؓ (اوّل راوی) نے رسول اللہؐ سے سوال کیا اور انھیں کو یہ جواب ملا کہ "نہ تم مراد ہو اور نہ تمہارا دوست" لیکن شاعر صاحب نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کو پیش کر دیا جس کا کوئی موقعہ نہ تھا۔ معلوم نہیں کہ فاضل مترجم نے یہ کہاں سے سمجھا کہ اس اشارہ کو رسول اللہؐ نے دیکھ لیا اور حضرت عمرؓ ہی سے مخاطب ہو کر جواب دیا، جب کہ سوال کرنے والے ابوذرؓ تھے، اور قاعدہ ہے کہ جواب سوال کرنے والے ہی کو دیا جاتا ہے نہ کہ اُس شخص کو جس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ علاوہ اس کے لفظ صاحب سے ابوبکرؓ مراد لینا یہ بھی شاعر صاحب کی سخت ناروا ذہانت ہے۔

الغرض ترجمہ کی یہی بدعتیں ہر جگہ اور نہایت کثرت سے پائی جاتی ہیں اور افسوس ہے کہ شاعر صاحب نے اس فرض دیانت و امانت کو بالکل ترک کر دیا۔ جو ایک مترجم کی حیثیت سے اُن پر عاید ہوتا تھا، اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ ترجمہ کس حد تک خواص اور اہل علم کی نگاہ میں مقبول ہو سکتا ہے یقین ہے کہ آئندہ ترجمہ میں اپنے تخلص کے اقتضاء سے کام لیں گے اور جو کچھ لکھیں گے شاعری ترجمہ کے فرق کو محسوس کر کے لکھیں گے۔

اسی کے ساتھ جو سب سے بڑی فروگزاشت کم از کم میرے نقطۂ نگاہ سے نظر آتی ہے، وہ یہ ہے کہ مقدمہ میں ان روایات پر مطلقاً اصول درایت سے تبصرہ نہیں کیا گیا، ورنہ بغیر اس کے کہ رجال سے بحث کی جاتی، بعض احادیث کا غیر صحیح ہونا یونہی ثابت ہو جاتا۔ مثلاً تیئسویں حدیث ملاحظہ کیجئے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں "فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم" یعنی اہل بدر کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ تم جو چاہو کرو میں تمہیں بخش دونگا۔

چونکہ یہ بالکل نص قطعی کے خلاف ہے اور نہ خدا ایسا فرما سکتا ہے کہ اہل بدر اچھا برا جو چاہیں کریں بخشدئیے جائیں گے اس لئے یہ حدیث درایۃً بالکل لغو و موضوع ہے۔

اسی طرح تائیسویں حدیث ہے جس میں رسول اللہؐ نے حضرت علیؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ بعض کلمات میں تم کو ایسے بتاتا ہوں کہ ان کے ذکر سے تمہارے تمام گناہ بخشدئیے جائیں گے، اگرچہ وہ کفِ دریا کی طرح زیادہ کیوں نہ ہوں"

چونکہ وہ تمام احادیث جن میں ادنیٰ باتوں پر عظیم ثواب و عذاب کا ذکر ہو، اصول درایت سے موضوع قرار دیجاتی ہیں اس لئے یہ حدیث بھی قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔

تلاش سے اس قسم کی متعدد احادیث اس مجموعہ میں ایسی مل سکتی ہیں جو درایۃً قابل اعتناء نہ تھیں، اگر انھوں نے ان تمام احادیث کو اس لئے اور قدح سے

یا اسے سمجھ لیا تھا کہ اُن میں فضائل علی بیان ہوئے ہیں، تو افسوس ہے کہ میں اس کو علمی خدمت نہ سمجھوں گا۔ بلکہ مذہبی مناقشہ سے تعبیر کروں گا جو کم از کم میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ فضائل علی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ غلو سے کام لیکر رطب و یابس میں بھی تمیز نہ کی جائے اور اُس کے لئے ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جو علمی و تحقیقی نظر سے ساقط الاعتبار ہوں۔

اس کتاب کی طباعت و کتابت نہایت خراب ہے۔ کیا ایسے شخص کو (جو ریاست رامپور ایسے دربار سے مصاحبت خاص رکھتا ہو) مذہبی وعظ گوئی کا توسل رکھے اور جو اپنی کتاب کے انتساب کے لئے ایک "رئیس اعظم" کی ہستی تلاش کرنے میں بھی کامیاب ہو جائے) ایک مذہبی تبلیغ کی کتاب کا ایسی غیر دلچسپ صورت و حیثیت سے شائع کرنا، قابل حیرت نہیں ہے؟

یہ کتاب ۸ میں سید ابن الحسین سے بازار ملا ظریف رامپور کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

ادب العرب | مولوی زبید احمد صاحب ایم۔ اے نے جو الہ آباد یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے لکچرار ہیں عرب کی تاریخ ادب نام سے مرتب کی ہے جس کا پہلا حصہ شائع ہو کر جس کا پہلا حصہ شائع ہو کر ہمارے پاس بھی ریویو کے لئے آیا ہے

ابتدائی ۸۰ صفحات میں جغرافیہ عرب، امم عرب اور حیرہ و غسان کی حکومت سے بحث کی گئی ہے اور اس کے بعد پیدائش زبان کے چند نظرئے پیش کرکے لغات سامیہ پر گفتگو کرتے ہوئے زبان عربی کی خصوصیات سے گفتگو کی ہے، اور اسی طرح موضوع کے اور پہلوؤں کا ذکر کرکے جاہلیت کی شاعری سے لیکر عہد اموی تک عربوں کے دماغی و علمی کارناموں کی مختصر تاریخ مع مناسب تنقید کے پیش کی ہے اسی سلسلہ میں قرآن کے لٹریچر سے بھی بحث کی ہے اور علم تفسیر، سیر و مغازی، حدیث و رجال، ادب و لغت، صرف و نحو کا بھی ذیلی تذکرہ کیا گیا ہے اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب موضوع کی غیر معمولی وسعت کو پیش نظر رکھکر لکھی گئی ہے، لیکن چونکہ ۲۰۰ صفحات کی محدود جگہ میں ان تمام مباحث پر کوئی بسیط گفتگو ممکن نہ تھی اس لئے اگر اس کتاب کو صرف "مقدمۂ ادب العرب" کہا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

ہمیں نہیں معلوم کہ اس کے بعد کی جلدوں میں فاضل مولف کن امور سے بحث کریں گے، لیکن ہمارے نزدیک یہ بھی زبان کی بڑی خدمت ہوگی اگر وہ آئندہ جلدوں میں عہد اموی سے لیکر عہد حاضرہ تک عربی زبان کی تاریخ ارتقا مرتب کر دیں۔

اگر آئندہ جلدوں کی ترتیب و اشاعت اس پر منحصر ہے کہ پہلے اس جلد کی مقبولیت کا اندازہ کر لیا جائے تو ہمیں ہمیشہ کیلئے مایوس ہو جانا چاہیئے اور اسی پہلی جلد کو "مقطع الکلام" سمجھ لینا چاہیئے، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ہم فاضل مولف سے استدعا کریں گے کہ وہ جلد سے جلد اس خدمت کو انجام تک پہنچا دیں گے کہ اس وقت ایسی ہی تصانیف کی زبان کو ضرورت ہے۔

اس کتاب میں سب سے زیادہ قابل اعتراض امر یہ ہے کہ عربی کے اشعار، یا عربی کی عبارت کے ساتھ اس کا ترجمہ نہیں دیا گیا، اور یہ ایسی فرو گذاشت ہے جس پر مولف کا یہ عذر کہ کتاب کا حجم بڑھ جاتا) کسی طرح قابل سماعت نہیں ہو سکتا اور میرے نزدیک اگر پبلک نے اس کتاب کی قدر نہ کی تو اس کا بڑا سبب یہی نقص ہوگا۔

قیمت :- تین روپیہ ہے اور نور بک ڈپو ٹاؤن ہال بریلی سے مل سکتی ہے۔

آداب شاعری | یہ تالیف ہے جناب عالی رفاعی کی جسے انجمن ارباب اردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی حیثیت تقریباً کشکول

گئی ہے جس میں بڑا حصہ اس قسم کی لغت کا سا ہے، جیسے سراپا میں مُحسن۔ باب اوّل کی پہلی دوسری فصل میں مختلف الفاظ لکھ کر ان کی مُروّجہ صفات کو بتایا ہے، تیسری فصل میں جسم معشوق کے اُن اعضا کی صفات یا تشبیہات کا بیان ہے جن کا ذکر اکثر سراپا میں کیا جاتا ہے اسی طرح دوسرے اور تیسرے باب کی مختلف فصلوں میں عشق اور شاعرانہ الفاظ کی صفات اور مصطلحات و مرکبات کا ذکر ہے۔ چوتھے باب میں بعض لفظی و معنوی صنائع سے بحث کی ہے اور پانچویں باب میں فن عروض، و قافیہ پر مختصر گفتگو کر کے کتاب ختم کر دی ہے۔ فن شعر سیکھنے والوں کے لئے یہ مجموعہ ایک نعمت ہے۔ طباعت و کتابت بہت صاف ہے، و رغالباً دفتر رسالہ تحفہ حیدرآباد سے مل سکتی ہے، قیمت درج نہیں ہے۔

الکلام فی ازالۃ الاوہام | یہ تصنیف ہے جناب حکیم محمد ابراہیم صاحب کی جو اس سے قبل نواب عالی جاہ سر نصر اللہ خاں بہادر مرحوم ولی عہد بھوپال کے سیکرٹری رہ چکے ہیں۔ وجہ تالیف کے سلسلہ میں جو کچھ مؤلف نے لکھا ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع اُن ایرادات و اعتراضات کا دور کرنا ہے جو عقل کی طرف سے مذہب پر کئے جاتے ہیں اور صفحہ ۱۰ تک جو کچھ حوالۂ قلم ہوا ہے اس سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، عام اس سے کہ مباحث مفید یقین ہوں یا نہوں، لیکن اس کے بعد سے مؤلف نے جو رنگ اختیار کیا ہے اس کا تعلق سیاسیات حاضرہ سے ہے اور یہی رنگ آخیر میں جا کر بالکل God Save the King ہو جاتا ہے۔ سیاسیات کے سلسلے میں جو کچھ فاضل مؤلف نے ارشاد فرمایا ہے اس سے کوئی جدید اضافہ ہماری معلومات میں نہیں ہوتا، کیونکہ یہی داستان بہت سے طوطی صفتان ہند آئینۂ حکومت کے سامنے اس سے قبل بارہا دُہرا چکے ہیں۔ لیکن ہاں جناب حکیم صاحب کی یہ جدّت ضرور قابل داد ہے کہ انھوں نے مذہبی لکچر کی آڑ میں اس افسانۂ پارینہ کو تازہ کرنا چاہا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ "کجا می نماید کجا می زند" کی اس سے بہتر مثال مشکل سے کوئی دوسری مل سکتی ہے۔

طباعت کتابت نہایت صاف و روشن ہے۔ قیمت درج نہیں ہے، اور نہ شاید اس کی قیمت لی جاتی ہو، کیونکہ پروپگنڈا کے لٹریچر کو مفت ہی ملنا چاہیے۔

نقش ار رنگ | یہ مجموعہ ہے پنجاب کے ایک نوجوان شاعر ابو الخیال چوہدری جلال الدین کی نظموں اور غزلوں کا جو اس نام کی رعایت سے اکبر تخلص کرتے ہیں، یہ مجموعہ طباعت سے قبل بھی میرے پاس بہ طلب رائے آیا تھا اور میں اس پر اچھی رائے دے چکا ہوں جو کتاب کے ساتھ شائع ہو گئی ہے۔

اکبر اس وقت بی۔ اے میں تعلیم پا رہے ہیں لیکن شاعری کا شوق انہیں اُسی وقت سے تھا جب آپ بہت نیچے درجوں میں تھے، اس کے ظاہر کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ ان کا ذوقِ شعری اکتسابی نہیں بلکہ ایک فطری عطیہ ہے باوجود کم مشقی و صغیر سنی کے کلام نہایت صاف اور جذبات کے لحاظ سے بہت پاکیزہ ہوتا ہے۔ حسرت موہانی کا رنگ آپ کے اشعار سے اس قدر نمایاں ہے کہ آئندہ چلکر داغ و امیر کے مسئلۂ جانشینی کی طرح حسرت کی جانشینی کا معاملہ اُلجھا ہوا نہ رہ جائے گا۔ ذیل کے چند اشعار سے آپ کے رنگِ تغزل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

فروغ بیخودی ہو اُنکے پیراہن کی رنگینی ۔۔۔ کوئی موجِ شرابِ ارغواں معلوم ہوتی ہے

امید و بیم زیست سے فرصت نہیں مجھے ۔۔۔ کیسے کہوں کہ عقل مصیبت نہیں مجھے

کرتا ہوں میں بیاں ستم بیسبب ذرا　　ہر چند یار اُن سے کوئی شکایت نہیں مجھے

ہو گئے ایک مہرباں سے جدا　　مٹ گیا لطف زندگانی کا

ظلم بھی اُن کے لطف ٹھہرا لیے　　دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

تمکین ناروا میں دو پرسش نہ کرکے　　خود داریوں میں ہوتے شکایت نہ ہو سکی

کون راز جہاں پہ غور کرے　　ہاں کوئی میگسار پیدا ہو

سبب ترک محبت نہیں کہتے بنتا　　کوئی انداز ستم میرے ستمگر میں نہیں

لغزشیں بھی ہیں لیکن کم۔ مثلاً

انکساری زندگی ہے ، خاکساری زندگی

انکساری غلط ہے۔ صرف انکسار ہونا چاہیئے۔ یا

"شکر کر شکر کہ ساروں کو چھپا رکھا ہے" یا ایک جگہ سوارت کو محنت، محبت کا ہم قافیہ نظم کیا گیا ہے

طبیبہ | علی احمد صاحب زاہد جلبپوری نے فن طب میں یہ کتاب اچھی لکھی ہے ، اور عورتوں کو اسے اپنے مطالعہ میں رکھنا چاہیئے۔ اس کتاب میں عورتوں کے تمام اُن امراض کا حال و علاج درج ہے جو قبل و بعد وضع حمل لاحق ہوتے ہیں اسی طرح ، وضع حمل کے وقت جن احتیاطوں کی ضرورت ہوتی ہے یا بچہ کی پیدائش کے وقت جن باتوں کا خیال ضروری ہے اُن کا بیان نہایت صاف زبان میں کیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اس کتاب کا نام صرف زچہ دکچہ ہوتا تو زیادہ موزوں ہوتا۔

کتابت طباعت نہایت پاکیزہ ہے۔ ۸ عہ میں مطبع نادری جلبپور سے مل سکتی ہے۔

تشریح الاوزان | یہ بھی زاہد جبل پوری کی تالیف ہے موضوع نام سے ظاہر ہے اور اس میں شک نہیں ان اوزان و مقاییس جمع کرنے میں انھوں نے بہت محنت سے کام لیا ہے ، لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ اُن کے لکھے ہوئے تمام اوزان صحیح بھی ہیں یا نہیں۔ ایک کھلی ہوئی غلطی تو یہی ہے کہ انھوں نے بھوپال کے سیر کا وزن ۹۴ تولہ چار ماشہ لکھا ہے۔ حالانکہ وہ پورے ۹۶ تولہ کا ہے۔ یہ کتاب ۴ر میں نادری پریس جلبپور سے ملتی ہے۔

پیغام اسلام | جناب محمود اسرائیلی کی ایک قومی نظم ہے ، جو علیحدہ پمفلٹ کی صورت میں شائع ہوئی ہے ، اس نوع کی منظومات لکھنے میں محمود اسرائیلی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اس نظم کی زبان اور طرز بیان میں بھی اُن کی خصوصیات

حماسیات خصوصیت کے ساتھ اس قدر دلآویز و پُر اثر طریقہ سے نظم کئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ ۲ر میں دفتر ہمدرد دہلی سے مل سکتی ہے۔

شعر الهند حصہ دوم

شعر الہند کے حصہ اول کا ذکر اس سے قبل نگار میں آچکا ہے۔ اب اس کا دوسرا حصہ بھی شائع ہو گیا۔ جس میں بقول مؤلف "اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے"۔

میں نے ابھی تک غور سے اس کتاب کا مطالعہ نہیں کیا۔ سرسری نگاہ کہیں کہیں ڈالی ہے اور اس میں شک نہیں کہ کتاب کی ترتیب قابل تعریف اور اسلوب بیان دلچسپ ہے لیکن اصناف شاعری کے سلسلہ بیان میں جس اصول پر مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مثلاً صنف غزل کی تشریح و تنقید میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں، وہ اکثر متقدمین کے کلام سے لی گئی ہیں، شعرائے حال میں سے صرف عزیز لکھنوی اور وفا رامپوری کا کچھ کلام نقل کیا گیا ہے۔ متقدمین میں سے بھی بہت سے قابل ذکر شعراء کی طرف سے اعتنا نہیں کیا گیا اور جابجا اس رنگ سے ہٹکر انتخاب کیا گیا ہے جس کے ماتحت مثال پیش کرنا مقصود تھا، مثلاً انھوں نے شاعری کی دو قسمیں خارجی و داخلی قرار دیکر داخلی قسم کے امثال میں حسب ذیل اشعار بھی درج کئے ہیں:

دل تو چاہِ ذقن میں ڈوب گیا — آشنا تھا غریق رحمت ہو (شاہ حاتم)

دوسرا مصرع ممکن ہے داخلی قسم میں داخل ہو سکے، لیکن پہلے مصرع نے اسکو بھی خارجی قسم میں شامل کر لیا ہے۔

ساقی ٹک ایک موسم گل کی طرف تو دیکھ — ٹپکا پڑے ہے رنگ چمن میں ہوا سے آج (میر)

مولوی عبدالسلام صاحب خود ہی لکھتے ہیں کہ مناظر قدرت کا بیان خارجی قسم میں داخل ہے لیکن اس شعر کو داخلی قسم کے مثالوں میں شامل کیا ہے۔

اسی طرح ظاہری خد و خال کا ذکر انھوں نے خارجی قسم میں شامل کیا ہے لیکن سودا کا یہ شعر داخلی مثالوں میں شامل ہے:

ٹک جا کے اپنے ابرو مژگاں دکھا لئے — مسجد میں اپنی صف پہ کرے ہے امام ناز

الغرض مثالوں کے انتخاب میں انھوں نے اسی "بے اعتدالی" سے کام لیا ہے جو ریاض کی خمریات میں انہیں ہر جگہ نظر آتی ہے۔

صفحہ ۲۰۲ سے ۳۱۶ تک صنف غزل پر ادبی حیثیت سے تنقید کی ہے، لیکن بہت تشنہ و ناکمل۔ اگر وہ زیادہ کاوش سے کام لیتے تو اتنی ہی صفحات میں وہ متقدمین و متاخرین دونوں کے کلام کا عطر نکالکر پیش کر سکتے تھے۔ امیر کا ذکر کہیں نہیں آیا، داغ کے صرف دو چار شعر لئے ہیں اور ذلیل و بازاری شاعری کے سلسلہ میں حضرت ریاض کا بھی ایک شعر ڈھونڈھ کر درج کیا ہے۔

اردو شاعری میں صنف غزل ہی وہ چیز ہے جو اس کے لئے مایۂ ناز ہو سکتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ فاضل نقاد نے ادنیٰ استقصا سے بھی کام نہیں لیا اور ایسے انداز سے جیسے کوئی بیزار ہو نہایت سطحی و سرسری بیان سے کام لیکر ادھر ادھر کے چند شعرا کا کلام درج کرکے ختم کر دیا ہے۔ ضرورت تھی کہ شعر الہند کا دوسرا حصہ صرف رنگ تغزل ہی کے لئے وقف کر دیا جاتا۔

خمریات کے سلسلہ میں جو کچھ انھوں نے بیان کیا ہے ہر چند نہایت مختصر ہے، لیکن ان کی بالغ نظری کی داد دینی چاہیئے کہ ریاض کی " زیادہ

بے اعتدالیوں" کو انہوں نے یہاں بھی فراموش نہیں کیا، گو "اعتدالی محاسن" کے سلسلہ میں ریاض کا وجود ان کے ذہن سے محو ہو گیا ہے۔ اور اصناف سخن کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ بھی زیادہ واضح، مکمل اور مدلل نہیں ہے۔ کتاب میرے نزدیک صرف اُس خیال کی تفسیر ہے جو دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کے متعلق مولوی عبدالسلام صاحب نے قائم کر لیا ہے اور اسی لئے اکثر جگہ تنقید کے صحیح اصول سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے اور اسی "خشونت" کو ظاہر کرتی ہے جو فن نقد کا بدترین عیب ہے۔

افسوس ہے کہ صاحب شعر العجم کا مقلد، شعر الہند کو اس قدر سطحی طور پر مرتب کرے۔ قیمت اس حصہ کی چار روپیہ ہے اور دار المصنفین اعظم گڑھ سے مل سکتی ہے۔

فغان آرزو جناب سید انوار حسین صاحب آرزو لکھنوی کا پہلا دیوان ہے جو چھوٹی تقطیع پر تقریباً ۸ اجزاء کو محیط ہے۔ جناب آرزو حضرت جلال مرحوم کے شاگرد، اور لکھنؤ کے ممتاز ترین شعراء میں سے ہیں۔ آپ کا کلام بہت صاف، انداز بیان دلکش اور جذبات کے لحاظ سے اکثر و بیشتر بلند نظر آتا ہے۔ وصی احمد صاحب اخگر بی۔ اے وکیل لکھنؤ نے ابتداء میں ایک مقدمہ کی وساطت سے جناب آرزو کے خاندانی حالات اور ان کے ارتقاء شاعری کے واقعات پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آرزو فطرت کی طرف سے شاعر ہی پیدا ہوئے تھے اور قدرت کے اس عطیہ سے انہوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ جناب اخگر نے حضرت آرزو کے کلام کے تین دور قائم کئے ہیں لیکن دیوان کے دیکھنے سے اس تفریق کا پتہ نہیں چلتا مناسب تھا کہ ہر غزل کے ساتھ یہ بھی بتا دیا جاتا کہ کس دور سے متعلق ہے، تاکہ دیکھنے والوں کو تفریق و امتیاز میں آسانی ہو جاتی۔

چہل چراغ کے نام سے آپ کی رباعیاں بھی اس دیوان میں شامل کر دی گئی ہیں اور خوب ہیں۔

اس کی قیمت عـہ ہے جو یقیناً زیادہ ہے، ملنے کا پتہ کہیں درج نہیں ہے، غالباً ادبی پریس لاٹوش روڈ لکھنؤ سے مل سکے۔

مرآۃ الشعر یہ مجموعہ ہے مولوی عبدالرحمان صاحب (پروفیسر اسٹیفنس کالج دہلی) کے اُن لکچروں کا جو عربی شاعری پر انہوں نے دیے تھے، لیکن اب کتابی صورت میں پیش کرتے وقت انہوں نے فارسی، اردو اشعار کی مثالیں بھی اس میں اضافہ کر دی ہیں جس نے اس مجموعہ کو بہت زیادہ دلچسپ اور مفید بنا دیا ہے۔

فاضل لکچرار نے ان لکچروں کے دوران میں، فن شعر کے جن جزئیات سے بحث کی ہے اُن کا حال تو صرف کتاب ہی کے ملاحظہ سے معلوم ہو سکتا ہے، لیکن وہ موضوع جن پر اظہار خیال کیا گیا ہے ان میں سے خاص یہ ہیں:۔

(۱) شعر۔ اس کے تحت میں بیان کے اقسام، شعر کی تعریف، وزن و قافیہ اور دیگر متعلقات سے گفتگو کی گئی ہے (۲) الفاظ۔ اس لکچر کے سلسلہ میں حسن الفاظ، حسن معانی، فصاحت و بلاغت سے بحث کی گئی ہے (۳) مجاز۔ اس لکچر میں حقیقت و مجاز، تشبیہ و استعارہ، کنایہ و مبالغہ کا بیان ہے اس کے بعد (۴) معانی (۵) جذبات (۶) خیال (۷) تخیل (۸) تمثیل (۹) جدت ادا (۱۰) فکر (۱۱) وصف (۱۲) حسن ادا کے مختلف لکچر ہیں اور فاضل مؤلف نے ان میں بھی فن شعر کے تمام ضروری پہلوؤں سے بحث کر کے مثالوں سے انہیں سمجھایا ہے۔

میری رائے میں اردو میں شاعری پر یہ پہلی سنجیدہ تالیف ہے جو تمام ضروری مطالب پر ۔۔۔ حاوی ہو اور جس میں جدید فن تنقید کے رو سے اس موضوع پر بحث کی گئی ہو۔ یہ کتاب اگر یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے مشعل ہدایت ہو سکتی ہے تو دوسری طرف فن شاعری کے عام شائقین کے لئے بھی کم مفید و دلچسپ نہیں ہے۔

امید ہے کہ ملک اس مجموعہ کی قدر کریگا اور دوسری یونیورسٹیوں کے پروفیسر بھی اس نوع کے مفید لکچروں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی کوشش کریں گے۔ کتابت و طباعت نہایت دلکش ہے اور زبان نہایت سلیس۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات ہے اور تین روپیہ میں جناب مصنف سے مل سکتی ہے۔

آئینۂ حقیقت نما
جلد اول

مولوی اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی ملک کے ان مخصوص حضرات میں سے ہیں جو ایک خاص نقطۂ نظر کو سامنے رکھکر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اور ان کی زبان و قلم سے جو کچھ نکلتا ہے اس میں ولولۂ خدمت زیادہ اور جذبۂ خود نمائش کم یا بالکل نہیں ہوتا۔

مولوی صاحب موصوف اپنے تاریخی ذوق کے لحاظ سے ملک میں بہت معروف ہیں اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت تک وہ متعدد کتب و رسائل کے ذریعہ سے نہایت کافی اور معتبر مواد تاریخ کا اردو میں فراہم کر چکے ہیں۔ چنانچہ یہ کتاب بھی آپ کے اسی ذوق تصنیف و تالیف کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں بقول مولف: "ہندو مسلمان کے گیارہ سو سال (سنہ [illegible] سے سنہ [illegible] تک) کے تعلقات پر تاریخی واقعات کے ذریعہ سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔"

عہد حاضر میں جبکہ ہندو مسلمانوں کی باہم کشیدگی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ مدارس سرکاری میں تاریخ کی جو تعلیم دیجاتی ہے وہ ہندوؤں کے دل و دماغ کو مسلمانوں کی طرف سے مسموم کرنیوالی ہے، ایسی کتاب کا شائع ہو جانا حد درجہ برمحل ہے، اور مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ خود بھی اس کا مطالعہ کریں اور اپنے ہندو احباب کو بھی اس کے دیکھنے کی ترغیب دیں۔

میں نے اس کتاب کو بالاستیعاب نہیں دیکھا ہے، لیکن چونکہ مولوی اکبر شاہ خانصاحب کی عمر تاریخ کے مطالعہ میں صرف ہوئی ہے اس لئے مجھے وثوق کامل ہے کہ جو کچھ انھوں نے لکھا ہوگا، وہ یقیناً تاریخی نقطۂ نظر سے بہت موثق و مدلل ہوگا۔ اور غیر مدلل روایات کی پوری جرح و تعدیل کی ہوگی۔

اس کتاب میں صرف غلام بادشاہوں کے عہد تک تبصرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے حصہ میں باقی اسلامی عہد سے بحث کی جائیگی۔ جو اس لحاظ سے کہ اس میں عہد مغلیہ بھی ہوگا بہت اہم ہے۔ امید ہے کہ پبلک اس حصہ کی کافی اور جلد قدر کریگی تاکہ دوسرا حصہ بھی جلد شائع ہو کر ان کے ہاتھوں میں پہنچ سکے۔

کتابت طباعت بہت صاف ہے اور ضخامت ۳۲۶ صفحات عہ میں منیجر رسالہ عبرت نجیب آباد ضلع بجنور (یو۔پی) سے مل سکتی ہے۔

نگار کے بعض پرانے پرچے درکار ہیں

مارچ سنہ ۲۲ء، نومبر سنہ ۲۳ء، دسمبر سنہ ۲۳ء اور جنوری سنہ ۲۵ء کے رسالے اگر کوئی صاحب فروخت کرنا چاہتے ہیں تو حسب ذیل پتہ سے خط و کتابت کریں

مولوی محمد شہود صاحب۔ عیدگاہ روڈ دھنباد

فروری سنہ ۲۲ء، مارچ سنہ ۲۲ء، اگست سنہ ۲۳ء، جنوری سنہ ۲۵ء، مارچ سنہ ۲۵ء کے رسالے جو صاحب فروخت کرنا چاہیں وہ ذیل کے پتہ پر جس قیمت میں مناسب سمجھیں وی۔پی کر دیں۔ حکیم سید ظہور الحسن صاحب باسودہ (جی۔آئی۔پی آر)

اقتباسات و معلومات

شفق شمالی

گزشتہ مارچ کی ۹ کو شمالی یورپ میں غروب آفتاب کے وقت شفق شمالی دیکھی گئی جسے انگریزی میں Aurora Borealis کہتے ہیں۔ یہ آفتاب کی شعاعیں ہیں جو شمال میں قائم ہو جاتی ہیں اور ۵۰۰ میل تک بلند ہوتی ہیں۔ پچاس سال سے یہ شفق شمالی انگلستان میں نظر نہیں آئی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ جب آفتاب کی سطح میں کوئی کلف یا دھبہ ظاہر ہوتا ہے تو یہ شعاعیں پیدا ہوتی ہیں، علماء کی رائے ہے کہ وہ آتش فشاں جوف شمس سے کہربائی شعاعیں زمین کی طرف پھینکتے ہیں اور جب یہ شعاعیں زمین تک پہنچتی ہیں تو زمین کی مقناطیسیت ان کو جذب کرتی ہے اور روشنی کے ذرات قطب کی طرف ایک مرکز قایم کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ توجیہ ظن و تخمین سے زیادہ نہیں ہے اور جس طرح فطرت کے اور بہت سے مظاہر و آثار کا حقیقی علم انسان کو حاصل نہیں ہو سکا۔ اسی طرح شفق شمالی کی حقیقت بھی ابھی تک زیر نقاب ہے۔

گرمی کا مقابلہ

سردی کا علاج نہایت سہل ہے اور دنیا کا ہر شخص واقف ہے کہ آگ کی مدد سے سردی کو مغلوب کیا جا سکتا ہے، لیکن گرمی پر اس وقت تک انسان کو قابو حاصل نہیں ہوا، بجلی کے پنکھے بھی گرم ممالک میں بیکار ثابت ہوتے ہیں اور ان سے ایسی گرم ہوا پیدا ہوتی ہے کہ بجائے تسکین کے اس سے اور زیادہ تکلیف ہونے لگتی ہے۔ لیکن حال ہی میں پروفیسر مور نے مکانوں کو ٹھنڈا کرنے کی ایک کامیاب ترکیب اختراع کی ہے اور وہ اس کی مدد سے حرارت کو ۲۰ درجہ کم کر دیتا ہے۔

اس نے مکان کی چھت پر ایک ایسا ٹیوب چمنی کی طرح قایم کیا ہے جس کا منہ چوڑا ہے اور نیچے کی طرف تدریجاً چھوٹا ہوتا گیا ہے۔ جب ہوا اس کے اندر جاتی ہے تو نہایت قوت کے ساتھ گزرتی ہے اور تر چادروں کی وجہ سے مکان کے اندر سرد ہو کر پہنچتی ہے، چونکہ تھوڑی دیر میں اس ہوا کا گرم ہو جانا ضروری ہے اس لئے اس کے نکلنے کیلئے دوسری چمنی قایم کی ہے، الغرض اس طرح برابر سرد ہوا آتی رہتی ہے اور گرم ہونیکے بعد نکلتی رہتی ہے۔

قطب پر انسانی حملہ

جس طرح پہلے امریکہ پر یورپ والوں نے دھاوا کیا تھا اسی طرح اب قطب پر ہو رہا ہے۔ اور خیال ہے کہ سرزمین قطب پر قبضہ ہو گیا تو عظیم فائدہ حاصل ہوگا، کیونکہ وہاں کوئلے اور پٹرول کی معدنوں کا کثرت سے پایا جانا ثابت ہوتا ہے، اسی کیساتھ یہ بھی فائدہ ہوگا کہ اُسے ہوائی جہاز کا مرکز بنایا جائیگا، اب یورپ سے ایشیا آنے میں بہت دن لگتے ہیں اور سمندر کی صعوبت برداشت کرنی پڑتی ہے، لیکن اگر قطب شمالی ہوائی جہازوں کا مرکز بن گیا تو لندن سے وہاں اور وہاں سے ہندوستان پہنچ جانا بہت آسان ہو جائیگا۔

اب سے قبل ۱۹۰۹ء میں امریکہ کا ایک شخص بہت دور تک قطب کی سرزمین میں پہنچ گیا تھا اور وہاں امریکہ کا جھنڈا نصب کر کے خوشخبری دینے اپنے وطن آ گیا تھا، لیکن وہ اس امر کی تحقیق نہ کر سکا کہ یہاں کی سرزمین کی کیا حالت ہے، آیا وہ جزیروں کی صورت میں ہے یا کیا، اسی طرح یہ بھی نہ معلوم کر سکا کہ وہاں نبات و حیوان و معدنیات بھی پائے جاتے ہیں یا نہیں لیکن گزشتہ مئی میں بڑی بڑی جماعتیں ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے وہاں پہنچنے کی تیاریاں کر رہی تھیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اموندسن کی جماعت ہے۔ اموندسن سال گزشتہ بھی گیا تھا۔ اور ناروے سے روانہ

ہونیکے بعد بالکل مفقود الخبر ہوگیا تھا، لیکن پھر کئی ہفتوں کے بعد واپس آیا اور غیر معمولی معلومات اپنے ساتھ لایا۔ اب اس کیلئے ایک خاص غبارہ تیار کیا گیا ہے جس کے ذریعہ سے وہ پھر قطب کی سیاحت کریگا امریکہ سے بھی ایک جماعت ہوائی جہاز پر قطب شمالی کی طرف روانہ ہورہی ہے اور دوسری قطب جنوبی کی طرف فورڈ اس مسئلہ میں بہت امداد کررہا ہے۔ فرانس بھی برف پر پھسلنے والی گاڑیوں کے ذریعہ سے قطب تک پہنچنے کی کوشش کررہا ہے اور جرمنی میں بھی اسکی تیاریاں ہورہی ہیں، بالشویک ملوکیت بھی سائبیریا کے راستے سے قطب تک پہنچنا چاہتی ہے۔

یوروپ کی سب سے بڑی دوربین سنہ ۱۹۱۳ء میں برلن کے ڈاکٹر ارکن ہولڈ نے جو رصدگاہ قائم کی تھی وہ اب بھی یوروپ کی سب سے بڑی رصدگاہ تسلیم کی جاتی ہے، اور یہاں کی دوربین نہایت عظیم الشان ہے۔ اس کا طول ۲۱ مٹر ہے اور دوسری رصدگاہوں کی طرح یہ دوربین گنبد یا قبہ کے اندر نہیں ہے یہ کہربائی قوت سے حرکت کرتی ہے اور ایک چیز کو چھ ہزار گنا بڑا کرکے دکھاتی ہے اس رصدگاہ میں ۲۵۰۰۰ جلدیں فن ہیئت کی موجود ہیں اور سنہ ۱۹۲۶ء سے لیکر اس وقت تک زائرین سے ۱½ ملین مارک فیس کی صورت میں وصول ہوچکا ہے۔

مردوں کی روحیں امریکہ کے ایک شخص نے ارواح موتے کے متعلق ریاضیات کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرکے ظاہر کیا ہے کہ انسان زمین میں کم ازکم ۵ لاکھ سال سے آباد ہے، لیکن اگر کم ازکم اس کو ۲۵..... سال فرض کرلیا جائے تو بھی اس وقت انسانی آبادی کم ازکم ایک ارب رہی ہوگی اس وقت انسانی آبادی ۱،۷۴۸..... ہے جس میں سے سالانہ ۴۳۳۶۹۸۱۳ اموات ہوتی ہیں اس لئے اگر اسی نسبت سے گزشتہ ۲½ لاکھ سال کے مردوں کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد کم ازکم ۱۰۸۴۲۵ ۸۲۲۵..... ہوگی۔ اگر واقعی روح فنا نہیں ہوتی اور فضا میں باقی رہتی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ آپس میں مل بھی سکتی ہے تو کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک روح اپنی شناسا روح کو اتنی تعداد میں سے بآسانی ڈھونڈھ لے گی۔

اگر بعض عیسائی علماء کے بیان کے مطابق روح کی مخصوص شکل تسلیم کی جائے اور کم ازکم ایک چیونٹی کے برابر اس کا جسم مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہونگے کہ اس وقت تک جتنے لوگ مرچکے ہیں ان کی روحوں کے لئے کم ازکم ۲۱۳۹۰۷۶۹ میل کی جگہ درکار ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر انکو برابر جوڑکر ایک فیتہ بنایا جائے تو خط استوا پر ۱۱۷ مرتبہ اس کو لپیٹ سکتے ہیں اور اگر ان سے ایک چوکور مینار بنایا جائے تو اس کا ہر ضلع ۶½ میل اور بلندی ۱۹½ میل ہوگی، حالانکہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ اورسٹ بھی ۵½ میل سے زیادہ بلند نہیں ہے۔

ایک نیا ستارہ حال ہی میں ایک جدید ستارہ ایسا دریافت ہوا ہے جس کی روشنی آفتاب سے ۶..... گنا زیادہ ہے، لیکن وہ اس قدر بعید فاصلہ پر واقع ہے کہ اعداد سے اس کو ظاہر نہیں کرسکتے۔ نور کی رفتار تمام چیزوں سے زیادہ سریع ہے یعنی وہ ایک سکنڈ میں ۳..... کیلومٹر اور ایک منٹ میں ۱۸..... کیلومٹر طے کرتا ہے، چنانچہ آفتاب کی روشنی زمین تک ۸ منٹ اور کچھ سکنڈ میں پہنچتی ہے، لیکن یہ جدید ستارہ جس کا نام اسد راد ہے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی زمین تک ایک لاکھ سال میں آتی ہے، یہ ستارہ یوروپ میں نظر نہیں آتا، جنوبی نیم کرہ میں نہایت قوی دوربین کی مدد سے دیکھا جاسکتا ہے۔

معجزۂ عالم روح کی معرفت اس قدر دقیق امر ہے کہ باوجود علماء طبیعین کی بے انتہا کاوش و تحقیق کے اس وقت تک سب کا راز نہیں کھل سکا، روح کی حقیقت، اس کا تعلق جسم سے، جسم سے جدا ہونے کے بعد اس کی حالت، یہ تمام وہ امور ہیں جن پر

عرصہ سے غور و فکر ہو رہا ہے، لیکن کوئی قابل اطمینان نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک ماہر طبعیات نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ "عقل کیوں جسم کی تابع ہے" اور اسی سلسلہ بحث میں اس نے "انتقال افکار" کے مسئلہ پر بھی بسیط گفتگو کی ہے۔ لیکن عملی حیثیت سے بھی پروفیسر لازار ڈوف اور پروفیسر کازا مالی نے اس مسئلہ کی صحت کو ثابت کر دیا ہے۔ انہوں نے ماسکو میں ایک تجربہ گاہ قائم کی ہے اور "انتقال افکار" کے تماشے لوگوں کو دکھاتے ہیں (انتقال افکار سے مراد یہ ہے کہ انسان کا خیال منتقل ہو کر دوسروں کو متاثر کرتا ہے یعنی انسان کی قوت ارادی بڑی موثر چیز ہے) اُن کا دعویٰ ہے کہ ہر انسان کے جسم سے کہربائی شعاعیں پیدا ہوتی ہیں اور وہ سب کو متاثر کرتی ہیں، چنانچہ انہوں نے چوہوں اور کتوں پر اس کا تجربہ دکھایا، اور محض خیال کی قوت سے کام لے کر ان سے جو چاہا کام لیا۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر انسان مشق کرے تو دور دراز مقامات کے انسانوں کو بھی اسی طرح متاثر کر سکتا ہے۔ کیا علما مشائخین کے کارناموں کی اب بھی تکذیب کی جائے گی؟

فورڈ کے برکات

فورڈ کے کارخانوں میں اس وقت ۲ لاکھ آدمی کام کرتے ہیں جن میں کم سے کم اجرت پانیوالا ایک گنی روز پاتا ہے۔ فورڈ کے ایجنٹوں کے ہاں بھی ۲ لاکھ آدمی نوکر ہیں، اور وہ کارخانے جن کے ہاں سے فورڈ بعض مصنوعات طلب کرتا ہے وہ بھی ۲ لاکھ آدمی رکھنے پر مجبور ہیں، جس کے یہ معنی ہوئے کہ فورڈ کے تجارت کے سلسلہ میں ۶ لاکھ آدمی روزی سے لگے ہوئے ہیں، اور اگر ہر ملازم کے اہل و عیال بھی اس میں شامل کئے جائیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ کم از کم تیس لاکھ آدمیوں کا رزق صرف ایک شخص فورڈ کی ذہانت سے وابستہ ہے۔

زمانۂ ماضی کی تصویر

اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ دوربین کے ذریعہ سے زمانۂ ماضی بھی نظر آ سکتا ہے تو وہ ہنسے گا، کیونکہ دوربین کا کام صرف یہ ہے کہ سامنے کی مرئی چیزوں کو بڑا کر کے دکھا دے نہ یہ کہ زمانۂ ماضی کو جو بالکل غیر مرئی ہے اور جس کا تعلق مادی اشیا سے نہیں ہے پیش کر سکے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ڈاکٹر لوکیش کے بیان کے مطابق ایسا ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر ثابت ہے کہ بعض ستارے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک اور زمین کی روشنی ان تک ہزاروں سال میں پہنچتی ہے، یعنی اگر کوئی واقعہ آج یہاں رونما ہو تو اس کو شعاعیں ہزاروں سال کے بعد دوسرے ستاروں کو پہنچائیں گی اس لئے معلوم ہوا کہ اب سے ہزاروں سال قبل کے حالات زمین ایسے ہیں جو ہنوز بعض سیاروں تک نہیں پہنچے اور بعض میں اب پہنچ رہے ہیں۔ پھر چونکہ زمین کی شعاعیں اُن سیاروں تک پہنچکر دوبارہ واپس آتی ہیں اس لئے اگر اُن کو دقت نظر سے دیکھا جائے تو ہم زمین کے گزشتہ واقعات کی تصویر بھی لے سکتے ہیں۔

مثلاً زحل ایک ستارہ ہے جس کی روشنی ۴۲۶ سال میں ہم تک پہنچتی ہے، یعنی زمین کا ہر واقعہ وہاں تک ۴۲۶ سال میں پہنچتا ہے اس لئے اگر اس ستارہ کی شعاعوں کا دقیق مطالعہ تفصیل کے ساتھ کر سکیں تو ہم کو زمین کے وہ واقعات جو ۴۳۲ قبل گزر چکے ہیں نظر آ سکتے ہیں، اور یہ ناممکن نہیں اگر دوربین کی ساخت میں اور زیادہ ترقی ہو جائے۔

بظاہر یہ خیال بالکل ناممکن العمل معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کسی وقت یہ محال ممکن ہو گیا تو خوش قسمت ہونگے وہ لوگ جو دنیا کے تمام گزشتہ حوادث کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

ریشم سے شکر

جرمنی میں ایک کارخانہ ہے جو روزانہ ہزار پونڈ شکر ریشم سے نکالتا ہے۔ اس کارخانہ میں ریشم کے پرانے پھٹے ہوئے کپڑے مثل

لے جاتے ہیں اور ان کو صاف کر کے سلفورک ایسڈ اور چونے کے پانی کی مدد سے شکر نکالی جاتی ہے جو انگور کی شکر کی طرح ہوتی ہے اور کھانے پینے کی چیزوں میں مستعمل ہوتی ہے۔ اس طریقہ سے جو شکر نکالی جاتی ہے وہ بہت ارزاں پڑتی ہے اور اپنی ترکیب کیمیادی کے لحاظ سے بالکل انگور کی شکر کی طرح ہوتی ہے۔

پانی کے اندر تصویر ایک آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے جس کے ذریعہ سے پانی کے اندر کی متحرک تصویریں بھی لی جا سکتی ہیں۔ اس آلہ کے اندر انسان بیٹھ کر پانی کے اندر چلا جائیگا، اور نہایت قوی روشنی کی مدد سے وہاں کی متحرک تصاویر لے سکیگا۔ خیال ہے کہ سب سے پہلے اس آلہ کی مدد سے شہر رومانیہ کی تصویریں لی جائے جو پانی کے اندر غرق ہے۔

اس آلہ کی ایجاد سے سنما کی دنیا میں اور زیادہ ترقی ہو جائے گی اور عالم بحر کے وہ عجیب و غریب حالات معلوم ہو سکیں گے، جو اس سے قبل بالکل تاریکی میں تھے۔

بحری تجارت ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا اس وقت دنیا میں بحری تجارت کے ذرایع کس ملک کے پاس کتنے ہیں، جہازوں کی تعداد کی بجائے اُن کا وزن ٹن میں بتایا گیا ہے اور اسی سے جہازوں کی کثرت پر قیاس ہو سکتا ہے۔

ملک	وزن	ملک	وزن
برطانیہ و آئرلینڈ	۱۹۲۷۴۰۰۰ ٹن	فرانس	۳۲۶۲۰۰۰ ٹن
برطانوی نوآبادیاں	۲۲۳۰۰۰۰ "	جرمنی	۲۹۹۳۰۰۰ "
امریکہ	۱۱۶۰۵۰۰۰ "	اٹلی	۲۸۹۴۰۰۰ "
جاپان	۳۷۴۱۰۰۰ "		

بحری گھوڑا سمندر کی ایک چھوٹی سی مچھلی ہے جسے انگریزی میں Sea Horse کہتے ہیں۔ اس کا طول ۷ انچ سے زیادہ نہیں ہوتا لیکن یہ مچھلی کی طرح افقی سمت میں نہیں تیرتی بلکہ سیدھی تیرتی ہے۔ اس کا مُنہ بھی گھوڑے کی طرح لانبا ہوتا ہے یہ گھاس میں اپنی دُم لپیٹ کر لٹک جاتی ہے یا قائم رہتی ہے، اس کی پیٹھ پر صرف ایک پر سا ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ تیرتی ہے۔ نر کے پیٹ میں ایک تھیلی ہوتی ہے جس کے اندر مادہ اپنے انڈے رکھدیتی ہے، چند دنوں کے بعد ان انڈوں سے بچے پیدا ہو کر پانی میں نکل جاتے ہیں لیکن جب انہیں ڈر معلوم ہوتا ہے تو پھر اس کیسہ میں آ کر پناہ لے لیتے ہیں۔

انجمن ارباب علم پنجاب کا

ادبی مقابلہ۔ ساڑھے بارہ سو روپیہ (۱۲۵۰) انعام

ملک کی مقتدر علمی سوسائٹی "انجمن ارباب علم پنجاب" نو سال سے مشہور ادیب آنریبل خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لاء ایم ایل سی سابق وزیر تعلیم پنجاب کی رہنمائی میں اردو ادب کی جو خدمات انجام دے رہی ہے اُن خدمات کی گرانمائی کا اعتراف ہندوستان کے تمام مشہور اخبارات اور گرانقدر اہل قلم متعدد بار کر چکے ہیں۔ اردو میں بے قافیہ نظموں (بلینک ورس) کا رواج فیشن کی حد تک ہر دلعزیزی حاصل کر رہا ہے۔ اردو شاعری میں زلف و خال، کنگھی چوٹی کے سوقیانہ خیالات ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھے جانے لگے ہیں۔ اردو شاعری کو خیالات و واقعات اور معاشرت آرائی کی حیثیت سے ہندوستان کی شاعری بنانے کی طرف عام توجہ ہو رہی ہے۔ یہ تمام خوشگوار تبدیلیاں انجمن ارباب علم پنجاب کی کوششوں کا نتیجہ ہیں، گزشتہ سال سے انجمن نے اپنے ادبی پروگرام کو کامیاب بنانے کی غرض سے ادبی مقابلوں کا سلسلہ شروع کیا ہے، انجمن کے ادبی مقابلہ کے لئے بجلہ شکمپنی ڈھائی سو روپیہ سالانہ کا عطیہ پیش کر کے اپنی ادب نوازی کا ثبوت دے چکی ہے۔ پہلا ادبی مقابلہ مارچ ۱۹۲۵ء سے مارچ ۱۹۲۶ء تک جاری رہا جس میں ہندوستان کے مشہور و غیر مشہور ہر قسم کے اہل قلم نے شرکت فرمائی، مقابلے کی تمام نظمیں منصفوں کی نظر میں قابل قدر ثابت ہوئیں اور ان میں سے سید ابو محمد ثاقب کانپوری ایڈیٹر نظارہ اور سید علمدار حسین واسطی علی الترتیب کثرت رائے سے اوّل اور دوم انعام کے مستحق قرار دئے گئے۔ اس مرتبہ خوش قسمتی سے دوسرے ادب پرور حلقوں نے بھی توجہ فرمائی۔ چنانچہ "اردو مرکز لاہور" اور "انڈین ویلج کمپنی" لاہور نے پانچ سو روپیہ سالانہ کے دو عطیات انجمن کے انعام فنڈ کو عنایت فرمانیکا اعلان کیا۔ انجمن کی مجلس انتظامیہ نے اس سال کے ساڑھے بارہ سو روپیہ کے انعام کو نظم و نثر کے انعامی مقابلوں پر حسب ذیل طریقہ پر تقسیم کیا ہے:۔

(۱) بہترین مختصر افسانوں (شارٹ سٹوریز) کے مقابلہ کے لئے ۶۲۵ روپیہ

(۲) بہترین نظموں کے مقابلہ کے لئے ۶۲۵ روپیہ

تفصیلات و ہدایات

(۱) غیر مطبوعہ مختصر افسانوں کے سال بھر میں نو مقابلے ہونگے۔ سال کے اخیر میں ججوں کی رائے میں جو صاحب اوّلیت کے معیار پر اوّل درجہ حاصل کریں گے انہیں انجمن کی جانب سے چار سو روپیہ نقد پیش کئے جائیں گے، دوم درجہ حاصل کرنے والے کو دو سو روپیہ نقد۔ سوم درجہ حاصل کرنے والے کو طلائی تمغہ۔ اور اگر منصفوں کی متفقہ رائے سے رتبۂ اوّلیت اور ثانویت حاصل کیا ہے تو انجمن اوّل کو سحر طراز اور دوم کو سحر نگار کا خطاب پیش کریگی۔

(۲) غیر مطبوعہ اردو نظموں کے سال بھر میں بارہ مقابلہ ہونگے، مذکورۂ بالا تفصیل کے ساتھ اوّل، دوم اور سوم کو نقدی کی صورت میں وہی مقدار انعام کی اور خطابات کی صورت میں وہی خطابات۔

(۲) آزادی یہ دیجاتی ہے کہ مقابلے میں شریک ہونیوالے افسانہ نویس اور نظم نگار حسب پسند کوئی سرخی اپنے افسانے یا نظم کے لئے انتخاب کرکے اس پر طبع آزمائی کرسکتے ہیں۔ انجمن اپنی جانب سے افسانوں اور نظموں کے عنوانات مقرر کرکے اہل قلم کو پابند کرنا نہیں چاہتی (ب) دوسری آزادی ہے وقت کی۔ مارچ ۱۹۲۷ء کے ختم تک نوافسانے ۱۰، ریا نظمیں دفتر میں موصول ہونی چاہئیں۔

(۴) (ا) جو صاحب مقابلوں میں سب سے زیادہ اول مرتبہ حاصل کرینگے وہ اول ادر اسی طرح دوسرا درجہ حاصل کرنیوالے دوم قرار دئے جائیں گے (ب) لہذا ہر مقابلے میں کسی کے لئے اوّل آنا ضروری نہیں۔ گزشتہ مقابلے میں حضرت ثاقب کانپوری نے بارہ مقابلوں کے لئے صرف تین نظمیں بھیجی تھیں اور پھر بھی اوّل درجہ پا گئے۔ اس مرتبہ بھی یہ طریقہ برتا جائیگا۔ ممکن ہے کوئی ادیب کم سے کم افسانے یا نظمیں بھیجکر اپنی اہلیت کی بنا پر اوّل درجہ حاصل کریں۔

ہدایات افسانے ہوں یا نظمیں اُن میں چند باتوں کا ہونا ضروری ہے۔

(ا) غیر مطبوعہ ہوں (ماخوذ ہوں یا ادر تخیل دونوں منظور کرلئے جائیں گے) (ب) دوسری زبانوں سے ماخوذ افسانوں کو ہندستانی معاشرت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنا چاہیئے (ج) حیا سوزی، عریانی، اور مخرب اخلاق پہلوؤں سے احتراز قطعاً ضروری ہے (د) اہل قلم افسانے یا نظم کی کم سے کم تین خوشخط نقلیں بھیجیں (ہ) شکستہ اور یا صرہ خراش خط تکلیف دہ ہوگا۔ بدخط ادیب کو کسی خوشخط منشی سے اپنے افسانے یا نظم کی تین نقلیں بھیجنا ضروری ہیں (و) ہر مقابلہ بذریعہ رجسٹرڈ خط بھیجنا چاہیئے۔

(نوٹ) انجمن ارباب علم پنجاب ملک کے مستند اور بلند پایہ اہل قلم کی ایک گرانقدر جماعت ہے اس کی جانب سے جو خطاب عطا کیا جائیگا اس کیلئے کسی تائید کی ضرورت نہیں لیکن مزید تائید کیلئے انجمن اپنے خطابات کے لئے ملک کے باقی مشاہیر اہل قلم کی تائیدی رائیں حاصل کرکے شائع کریگی۔

منصفین افسانہ نگاری کا فیصلہ حسب ذیل منصفین کی کثرت رائے سے ہوگا۔

(ا) خان بہادر شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹرایٹ لا صدر انجمن (۲) لالہ دیانرائن نگم بی۔ اے ایڈیٹر زمانہ (۳) لالہ پریم چند بی۔ اے (۴) سید سجاد دلیدرم بی۔ اے رجسٹرار مسلم یونیورسٹی (۵) شیخ محمد ضیا الدین ہمشی جرنلسٹ (۶) پروفیسر رشید احمد صدیقی ام۔ اے مسلم یونیورسٹی۔ (۷) حضرت نیاز فتحپوری ایڈیٹر نگار۔ مزید تائید کے لئے سید افضل علی صاحب ام۔ اے انکم ٹکس کلکٹر ایبٹ آباد۔ حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

نظموں کا فیصلہ حسب ذیل حضرات کی کثرت رائے سے ہوگا۔

(ا) ادبی نقاد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دہلوی (۲) حضرت اصغر مصنف نشاط روح (۳) جناب سالک بٹالوی بی۔ اے (۴) مرزا یاس عظیم آبادی (۵) حضرت فانی بدایونی وکیل اٹاوہ (۶) بیرنیرنگ وکیل انبالہ (۷) پنڈت میلارام وفا ایڈیٹر روزانہ بھیشم

(نوٹ) منصفوں کے مقابلہ میں شریک ہونیوالے اہل قلم کے ناموں کی بجائے مقرر کردہ نشانات بھیجے جائینگے اور انصاف حاصل کرنیمیں بدرجہ غایت احتیاط برتی جائیگی آخر میں قابل اشاعت مضامین نظم و نثر کو اعلیٰ شاندار طریقہ پر کتابی صورت میں مع تصاویر شائع کیا جائیگا۔

تاجور نجیب آبادی (پروفیسر السنۂ مشرقیہ ڈی۔ ایس کالج لاہور سکرٹری انجمن ارباب علم)

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰۰ | جلد (۱۰) شمارہ (۴)

نگار

بھوپال سے ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ۔ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول ستارہ روپیہ

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۶ء

اکثر مضامین نہایت بدخط آتے ہیں جن کے پڑھنے میں بڑی دردسری ہوتی ہے اور بیکار وقت ضائع ہوتا ہے، ازراہ کرم مضامین اچھے کاغذ پر صاف لکھکر بھیجا کیجئے

بسم اللہ

نگار

ایڈیٹر نیاز فتحپوری

شمار (۴)	اکتوبر ۱۹۲۶ء	جلد (۱۰)

ملاحظات

اپریل و مئی کے نگار میں برسبیل تذکرہ میں نے اپنی بعض ذاتی پریشانیوں کا اظہار کیا تھا، جس کو دیکھکر اکثر احباب نے میرے پاس ہمدردی کی تحریریں روانہ کیں، اور بعض نے مدرجہ اصرار کے ساتھ مجھ سے ان پریشانیوں کی تفصیل بھی دریافت کی۔

ہرچند میں نے فرداً فرداً سب کو جواب لکھدیا ہے لیکن اس خیال سے کہ شاید بعض حضرات کی تحریریں نظر انداز ہو گئی ہوں میں نگار کے ذریعہ سے بھی اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں، لیکن اپنے حالات کی تفصیل نہ میں نے خط میں کسی کو لکھی، اور نہ اس جگہ اس کا اظہار کروں گا، کیونکہ درد و غم ناقابل تجزیہ چیزیں ہیں اور اس کو میں کسی طرح تقسیم کر کے اپنے بوجھ کو ہلکا نہیں کر سکتا، اور نہ غیرت اس کی متقاضی ہے۔

میری موجودہ زندگی بدستور "انتشار و فشار" میں گزر رہی ہے اور شاید قدرت کا فیصلہ یہی ہے کہ میں دم واپسیں تک اس کی اس امانت کا حامل رہوں اس لئے میری حالت دریافت کرنا اور اس کے جواب میں کسی اچھی خبر کی توقع رکھنا غالباً فطرت کے منشاء کے خلاف ہے۔

ما خانہ رسیدگان ظلیم
پیغام خوش از دیار ما نیست

حکومت بھوپال کا انقلاب، یوں تو ہر اُس شخص کے لئے جو یہاں وابستہ ہے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے، لیکن میرے لئے اس کی نوعیت وہ ہے جسے میں صرف

"عالم ہیم درجا" سے تعبیر کر سکتا ہوں۔

دل میں امیدوں کا ہجوم ہے، لیکن زبان سے ادا ہونا مشکل اور زبان یاوری بھی دے تو باب قبول تک پہنچنا دشوار ہے: تاہم اشارۂ غیبی کا منتظر ہوں، قدرت کی جانب سے فراہمی اسباب کا امیدوار ہوں، اور جب بہت جی گھبراتا ہے تو غالب کے اس مصرع سے تسکین قلب کر لیا کرتا ہوں کہ

ہو رہیگا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

چونکہ میرے اس معاملہ کے تصفیہ پر نگار کا مستقبل بہت کچھ منحصر ہے اس لئے میں نے اس کا ذکر کر دیا تاکہ اگر آئندہ ناظرین نگار کوئی خاص تبدیلی میرے لائحہ عمل میں پائیں تو اس کو ہونیوالی بات سمجھکر اظہار حیرت نہ کریں، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ کسی انقلاب کا اثر نگار پر بُرا اثر پڑیگا، کیونکہ وہ تو جب تک میں ہوں خواہ بھوپال میں رہوں یا کہیں اور نگار اسی طرح جاری رہیگا، انشاء اللہ العزیز۔

شیخ شوکت علی صاحب بی۔اے، ال ال بی، ساکن محلہ رکاب گنج لکھنؤ کی طرف سے ایک خط مجھے موصول ہوا ہے، جس میں شاید ایک وکیل کی حیثیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ میں ان حالات کو ثابت کروں جو شاہ وارث علی کاظمی قادری کے متعلق جون کے نگار میں بہ عنوان "نقاب اٹھ جانے کے بعد" میں نے تحریر کئے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی تذکرہ کیا گیا ہے کہ اگر میں نے ایسا نہ کیا تو اس کا نتیجہ میرے حق میں "جیل خانہ جانا ہوگا" (یہ انہیں کے الفاظ ہیں) اول تو میں اس تحریر کو شیخ شوکت علی صاحب کی تحریر یقین نہیں کر سکتا، کیونکہ اس کے الفاظ نہایت ناشائستہ اور طرز عبارت بالکل عامیانہ ہے، لیکن اگر ہو بھی تو قابل اعتنا نہیں سمجھتا، کیونکہ جب تک کوئی شخص "شاہ وارث علی کاظمی قادری" کی حیثیت سے میرے سامنے پیش نہ ہو، میں اپنے افسانہ کے ہیرو کو کبھی اس امر کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ خواہ مخواہ کسی معمولی "شاہ وارث علی" کا مسمیٰ بننے کے لئے سامنے آجائے۔ جس طرح وکیل صاحب موصوف اپنے فرضی موکل کی طرف سے یہ نوٹس دینے کے مجاز ہیں۔ میں بھی اپنے اس ہیرو کی پوزیشن محفوظ رکھنے کے لئے پابند ہوں، جو اس وقت خدا جانے کن کن ناموں سے ہندوستان کے اندر یاد کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر اس سے مقصود یہ ہے کہ "خرقہ پوشان سالوس" کے متعلق نگار میں کچھ نہ لکھا جائے تو میں اس تحریر کے کاتب سے خواہ وہ شیخ شوکت علی صاحب وکیل ہوں، یا کوئی اور بزرگ، ماہ نومبر کا نگار دیکھنے کی درخواست کرونگا۔ جس میں ایک اور ایسی ہستی کو "برافگندہ نقاب" پیش کیا گیا ہے۔

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

اگست کے رسالہ میں جناب تمکین کاظمی کا ڈراما "سرگزشت اشرف خاں" مرزا ملکم خان ناظم الدولہ کے ان تین فارسی ڈراموں میں سے ایک کا ترجمہ تھا جنھیں مطبع شرکت کاویانی برلن نے تیاتر کے نام سے شایع کیا ہے، اس کا اظہار مجھے اگست ہی کے رسالہ میں کر دینا چاہیئے تھا، لیکن سہواً رہ گیا، امید ہے کہ جناب تمکین کاظمی معاف فرمائیں گے۔

اس ماہ کے مضامین میں جناب احسن الظفر کا مضمون "مطالعۂ شاعری" پر خوب ہے۔ اور محمد ابن ابی عامر کا حال شاہ افضال الرحمان صاحب نے دوزی کی تالیف سے ماخوذ کیا ہے۔ جناب طالب باغپتی کا افسانہ "شکست عہد" اس نتیجہ کے لحاظ سے اگر عورتوں کی تعلیم بلند ہو تو وہ سوسائٹی میں ایک مصلح کی حیثیت اختیار کر سکتی ہیں قابل غور ہے۔

لارڈ ڈلہوزی کے عہد حکومت کی جو قسط اس مہینے میں شائع ہوئی ہے، بہت دلچسپ، لیکن آئندہ مہینے کی قسط جس میں پٹنہ اور لکھنؤ کا ذکر ہے اور زیادہ دلچسپ ہوگی۔

جناب تمکین کاظمی کا افسانہ (اعانت مجرمانہ) صرف واقعہ ہونے کے لحاظ سے دیکھنے کے قابل ہے اور روح تنقید پر جناب سروری بی۔ اے کے پرخلوص جذبات لائق تحسین ہیں۔

"ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد" جناب مولوی عبد سبحان کا مضمون ہے اور مرتضیٰ جاسوس ملک عبد القیوم خانصاحب کے انگریزی فسانہ کا ترجمہ۔

نظموں میں مجنوں گورکھپوری کی غزل اور حضرت آزاد انصاری کی دعوت فکر خوب ہے۔ جناب شیام لال صاحب جگر کی نظم "انتظار" پر حضرت رزم ردولوی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ان کا جواب دینے کیلئے میں جناب جگر کو متوجہ کرتا ہوں اور تاوقتیکہ ان کی طرف سے جواب یا سکوت کا فیصلہ نہ ہو جائے میں اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔

ماہ آئندہ کے بعض مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔ نقاب الٹ جانے کے بعد۔ تذکرہ اثر دہلوی۔ میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی۔ ہدیہ گوئی۔ یک نظر بہ عارف قزوینی۔ تاج محل بد ترین عمارت ہے۔ نصیر الدین محمود گنج معانی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ وغیرہ

دفتر نگار میں مختلف و متعدد حضرات کے مضامین بغرض اشاعت موصول ہوتے رہتے ہیں اور ان کی تعداد اتنی ہوتی ہے کہ ہر ماہ ایک کے بجائے ۲ نگار شایع ہو سکتے ہیں اگر ان کو درج کر دیا جائے، لیکن آپ غالباً حیرت سے سنیں گے کہ جو مضامین قابل اشاعت قرار دیے جاتے ہیں، ان کا اوسط دس فی صدی بھی نہیں ہوتا۔ میں ناقابل اندراج مضامین کو اگر التزاماً واپس نہیں کرتا تو کم از کم ان کے مصنفین کو اس امر کی ضرور اطلاع دیدیتا ہوں کہ وہ اشاعت کا انتظار نہ فرمائیں، لیکن کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ جو حضرات از راہ کرم نگار کے لئے مضامین روانہ فرمائیں، وہ پہلے ہی غور کر لیا کریں کہ نگار میں جس معیار کے مضامین شائع ہو رہے ہیں اس معیار پر ان کا مرسلہ مضمون پورا اترتا ہے یا نہیں۔

ٹیگور کے رنگ کے ادبی مضامین کثرت سے موصول ہوتے ہیں، لیکن میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں اور اب پھر اعلان کرتا ہوں کہ اس نوع کے ادب کے لئے نگار میں ایک سطر کی بھی گنجایش نہیں نکل سکتی۔

افسانہ نگار حضرات اگر اپنے پلاٹ سے حسن و عشق کو جدا نہیں کر سکتے، تو کم از کم انہیں اس امر کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے کہ غیر معمولی تصنع و آورد یا غیر معتدل جبارت تخیل میں نہ پیدا ہو کہ اس سے فسانہ کا لطف ضائع ہوتا ہے اور اس میں ایک قسم کا غیر فطری رنگ پیدا ہو جاتا ہے جو اس فن کا سخت عیب ہے۔

نیاز فتحپوری

مطالعۂ شاعری

اگر ہم سے دریافت کیا جائے کہ شاعری کیا ہے؟ تو شاید مشکل سے کوئی جواب اس کا دے سکیں گے۔ شاعری کے مفہوم کی بابت ایک خیال سب کے ذہن میں موجود ہے۔ لیکن اس کو صحیح طور پر الفاظ میں لے آنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ شاعری کی تعریفیں تقریباً ہر صاحب ذوق نے کی ہے لیکن ہم نہیں کہہ سکتے کہ کس تعریف پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

شاعری کی تعریفات | جانسن کہتا ہے شاعری "مقفیٰ مضمون نگاری ہے" صداقت کو مسرت کے ساتھ تخیل کی مدد سے متحد کر دینے کا نام ہے۔ "شاعری خیالات و الفاظ کے علاوہ اور کیا ہے؟" مکالے کے خیال میں شاعری سے ہمارا مقصد الفاظ کو اس طرح استعمال کرنا ہے کہ تخیل پر اثر پڑے یعنی الفاظ سے وہ کام لینا جو نقاش رنگوں سے لیتا ہے۔ کارلائل اعلان کرتا ہے ہم شاعری سے "موسیقانہ خیال" مراد لیں گے، شیلے کہتا ہے شاعری کو ہم "عام الفاظ میں اظہار تخیل کہہ سکتے ہیں" ہیزلٹ کے خیال میں "یہ تخیل و جذبات کی زبان ہے"۔ مولوی عبدالحق صاحب کے نزدیک انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے، سننے، یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق و شوق، عشق و محبت، حیرت و استعجاب، عیش و غضب، رنج و غم وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں ان کو اس طرح سے موزوں کر کے ادا کرنا کہ جو اس کے دل میں ہے وہی دوسروں پر چھا جائے۔ یہی کا نام شاعری ہے" علامہ شبلی کے نزدیک جو جذبات الفاظ کے ذریعہ سے ادا ہوں، وہ شعر ہیں، علامہ حالی مکالے کا قول نقل کرتے ہیں اور کسی دوسرے محقق کا بھی کہ "جو بات ایک غیر معمولی اور نرالے طور پر لفظوں کے ذریعہ سے اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سن کر خوش یا متاثر ہو، وہ شعر ہے خواہ نظم میں ہو یا نثر میں"۔ لے ہنٹ کہتا ہے کہ "یہ صداقت، حسن، یا قوت کے لئے جذبہ کا اظہار ہے وہ تخیل کے ذریعہ سے اپنے خیالات کی تشریح کرتی ہے" کولیرج کے نظر میں شاعری سائنس کے مقابل ہے اس لئے کہ اس کا مقصد صداقت نہیں مسرت ہے۔ میتھو آرنلڈ کے خیال میں یہ بیان کی وہ مکمل و مسرت و شکل ہے جو الفاظ اختیار کر سکتے ہیں۔ اور "حسن و صداقت شعری کے متعینہ قوانین کے تحت میں زندگی کی تنقید ہے"، کیبل کے نزدیک "زبردست جذبہ یا تخیل ...۔" رسکن اس کی تعریف اس طرح کرتا ہے "یہ تخیل کی تجویز ہے شریفانہ جذبات کے لئے شریفانہ بنیادوں کی"

ان تعریفوں کی فہرست تک وسعت دی جا سکتی ہے، لیکن مندرجۂ بالا مثالیں ہماری مشکلات کو واضح کر دیتی ہیں اور ہم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ سب علیحدہ علیحدہ یا مجموعی طور پر کسی حد تک ہمیں اس سوال کا جواب دینے میں مدد کرتی ہیں کہ شاعری کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں کی ہر تعریف بامعنی ضرور ہے، لیکن جب ان پر تنقیدی نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنوع میں تقریباً متضاد ہیں اور خواہ ان کی فلسفیانہ قیمت کچھ بھی ہو مگر جب ہم خود شاعری کا مطالعہ کر رہے ہوں تو وہ ہمیں حقیقت کی دنیا سے دور دراز مقامات پر سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔

مقصد شاعری | اس لئے ہمیں تعریفات اور شاعری کے مقاصد کے جھگڑوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اور نہ ابتدائی کام شاعری کی صحیح تعریف تلاش کرنا ہے بلکہ ہمکو شاعری کی چند خصوصیات معلوم کرنا ہیں، ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ ادب زندگی کی تشریح ہے جو خود شاعر کے

دماغ پر منعکس ہوتی ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زندگی کی اس تشریح کا جس کو ہم شعری کہتے ہیں، لازمی عنصر کیا ہے۔ چونکہ زندگی کا شعری پہلو انہی واقعات یا تجربات و مسائل سے متعلق ہوتا ہے۔ جن میں جذبی و تخیلی عناصر ممتاز ہوں۔ اس لئے شاعری کی ایک خاص خصوصیات یہ ہے کہ وہ زندگی میں جس چیز کو بھی لیتی ہے وہ ہمارے جذبات و احساسات سے متعلق ہوتی ہے اور ساتھ ہی اپنی قوت تخیلہ کی مدد سے یہ موجودات کو ایک نیا ملبوس بھی عطا کرتی ہے۔

تخیل و احساس کے ذریعہ سے شاعری کی اہمیت اس وقت تک بخوبی واضح ہوجائیگی جب ہم شاعری و حکمت کے تعلقات پر اور شعری صداقت پر غور کریں گے

شاعری فن کی حیثیت سے

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ تخیل و جذبہ شاعری میں ممتاز ہوتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ صرف ان کی موجودگی شاعری کے لئے کافی ہوتی ہے۔ ہم ان کو بھی شاعری کے لازمی صفات تو ضرور قرار دیسکتے ہیں اور اس امر پر بھی زور دیسکتے ہیں کہ ان کے بغیر جو چیز اپنے کو شاعری کی حیثیت سے پیش کرتی ہے وہ شاعری کہلانے کی مستحق نہیں ہوتی، لیکن اُن کے علاوہ شعر پیدا کرنے کے لئے بعض اور خصوصیات بھی درکار ہیں، کیونکہ یہ صفات تو نثر شعری (یا شعر منثور) میں بھی موجود ہوسکتی ہیں۔ بعض شاعری ایسی ہے جو خالصتاً نثر ہے، بعض نثر ایسی ہے جو ممتاز طور پر "شعر" ہے، لیکن شعر و نثر کے درمیان ایک تفریقی خط یقیناً موجود ہے۔ ایک خاص شکل میں شاعری اپنے حقیقی معنوں میں فن کی ایک صنف ہے۔ اور یہ ایسی اُسی وقت کہی جاسکتی ہے جبکہ تخیل و احساس ایک خاص شکل میں موجود ہو، اور یہ شکل یقیناً وہ شکل ہے جس میں وزن کا التزام کیا جاتا ہے۔

شاعری اور وزن

مشرق و مغرب ہر جگہ بہت سے نقادوں نے مسلسل طور پر اس سے انکار کیا ہے کہ شاعری کو بیرونی شکل سے کوئی تعلق نہیں ہے، سر فلپ سڈنی نے یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ اکثر شاعروں نے اپنی شاعری کو اس زیور سے مزین کیا ہے جس کو نظم (ورس) کہتے ہیں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ نظم صرف زیور ہے، اور اس پر شاعری کا انحصار مطلق نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ "بہت سے شعرا ایسے گزرے ہیں جنھوں نے کبھی نظم نہیں کیا، اور بہت سے ناظم ایسے ہیں جو شاعر نہیں کہے جاسکتے" علامہ حالی اس رائے سے لفظاً بہ لفظاً متفق ہیں اور مقدمہ "شعر و شاعری" میں شعر کو وزن سے آزاد کرنے اور نظم میں وزن کا التزام رکھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ بیکن نے بھی یہ ظاہر کرتے وقت کہ تخیل جو اس کے نزدیک شاعری کی خصوصیت ہے، نثر و نظم دونوں میں پایا جاسکتا ہے درحقیقت اسی رائے کا اظہار کیا تھا۔ کولیرج پرزور الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ اعلیٰ ترین شاعری کا وجود بغیر وزن کے بھی ہوسکتا ہے اور اپنے دعوےٰ کے ثبوت پر افلاطون و ٹیلر کے اقوال پیش کئے ہیں۔ لیکن دوسری جانب سے یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری کا کچھ اور مفہوم ہو یا نہ ہو، وزن اس کے لازمی شرائط میں سے ایک ہے۔ ہنٹ لکھتا ہے "بعض لوگوں نے اس پر زور دیا ہے کہ شاعری کو نظم کرنیکی کوئی ضرورت نہیں اور یہ کہ نثر بھی ویسا ہی عمدہ واسطہ ہے، بشرطیکہ شاعری اس میں ظاہر کیجاسکے، شعری اور نثری مضمون، موسیقی کی غرض سے موزونیت و غیر موزونیت کا سوال ہے اور اس کا سبب کہ شاعری کے لئے وزن کا التزام کیوں ضروری ہے، یہ ہے کہ شعری روح اس کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کے جوش، حسن، و قوت کا دائرہ اس کے بغیر بالکل نامکمل رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں مبالغہ کی حد تک وکالت کی گئی ہے کیونکہ اکثر شاعری کی روح واسطۂ نظم کے بغیر مکمل طور پر ظاہر ہوجاتی ہے۔ میرے خیال میں یہاں پر سوال "شعری" اور نثری "مضمون" کا نہیں بلکہ

شکل کا ہے جس کے ذریعہ سے اسی مضمون کو بیان کیا جاسکے۔ نثر میں بیان کرکے اس کو صد درجہ شعری بنایا جاسکتا ہے، لیکن صرف وزن کا التزام ہونے پر اس کو حقیقی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے اگر شاعری اپنے مضمون و روح کے لحاظ سے حکمت کی مد مقابل ہے تو ٹھیک اسی طرح یہ نثر سے بہ لحاظ شکل ممتاز ہے۔

کارلائل کے بہت سے صفحات شعر منثور کا اعلیٰ نمونہ قرار دئے جاسکتے ہیں پھر بھی وہ واضح طور پر کہتا ہے "بذات خود میں قدیم شاعری میں وزن کے التزام کو جس سے موسیقیت پائی جاتی ہے ضروری پاتا ہوں" گو وہ ساتھ ہی یہ اضافہ بھی کرتا ہے "شاعری کی شکل میں بہت کچھ ایسا بھی ہے جس کی اس شکل میں ہونے کے لئے کوئی ضرورت نہ تھی اور اُن کا نثر میں ہونا بھی بہت بہتر تھا۔" اسی طرح میتھو آرنلڈ اپنے اس خیال کے باوجود کہ شاعری "تنقید زندگی" ہے نظم میں وزن کو ضروری قرار دیتا ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ وزن کو شاعری کی عام اور مستقل خصوصیت بتا کر ہم نے اپنے کو گوناگوں مشکلات میں مبتلا کر لیا ہے، اور بہت سے ایسے لوگوں کو جنھیں ہم خارج کرنا چاہتے ہیں شاعری میں شامل کرنے پر، اور جس کو شامل کرنے کے خواہش مند ہیں اُن کو خارج کرنے پر مجبور ہیں ایک معمولی شاعر کے دیوان کو شاعری کہنا اور گیتانجلی کے شاندار جذبی و تخیلی مضامین کو یہ نام عطا کرنے سے انکار کرنا ظلم نہیں تو کیا ہے؟ اگر ہم سے یہ سوال ہو کہ اس نظم کی بابت کیا کہا جاسکتا ہے جس کی بابت ہر شخص کو اقرار ہے کہ اس میں وزن کے علاوہ اور کوئی شعری صفت نہیں؟ یا یہ کہ نظم دوسری زبان میں ترجمہ ہونے کے بعد نظم رہتی ہے یا نہیں؟ اور ہم اُن تصانیف کی نسبت کیا فیصلہ کریں جن میں وزن کا مطلق التزام نہیں کیا گیا، اور جن کی زبان نظم و نثر کے درمیان ہے؟ تو ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے، اس مسئلہ پر بحث کئے بغیر کہ وزن کے بغیر شاعری مکمل ہوسکتی ہے یا نہیں اور یہ کہ کبھی کبھی ہم اس قاعدے کے مستثنیات کو بھی تسلیم کرسکتے ہیں یا نہیں، ہم یہاں پر یہ اصول قائم کرسکتے ہیں کہ وزن ابتدا سے اس وقت بہ لحاظ شکل شاعری کی سب سے زیادہ عام اور مستقل خصوصیت رہی ہے۔ اس لئے یہ وہ چیز ہے، جس کو ہم شاعری کی بنیادی صفت کہہ سکتے ہیں

شاعری میں قافیہ کی اہمیت کی بابت بہت کچھ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ مضمون بہت وسیع ہے اور مسائل نفسیات سے متعلق ہونے کے باعث ہم یہاں صرف چند سرسری باتوں پر قناعت کریں گے۔

بعض لوگ شاعری کو قافیہ و وزن کے "رسمی پابندیوں" سے "آزاد" کرنا چاہتے ہیں، ان لوگوں کی اکثریت جو شاعری سے محبت رکھتے ہیں اس کو تسلیم کریں گے کہ قافیہ و وزن شعر کی موسیقی کے لئے ضروری ہے، اور یہی موسیقی اس کو نثر کی موسیقی سے ممتاز کرتی ہے۔

بل لکھتا ہے "جس وقت سے انسان انسان بنا ہے۔ اس کے تمام گہرے و قلبی خیالات کا رجحان مقفیٰ زبان میں ظاہر کئے جانے کی جانب رہا ہے" اور احساس جس قدر گہرا ہو، قافیہ اسی قدر ضروری اور مختص ہوجاتا ہے، یہ وہ نفسیاتی حقیقت ہے جو شعری زبان اور مقفیٰ زبان کے متعلق کی بنیاد ہے اور جو اسی وجہ سے لازمی و مستقل ہے۔

جرمنی کے مشہور فلسفی کا مشاہدہ ہے کہ قافیہ و وزن کا استعمال نثر کو بہت بلند کر دیتا ہے وزن موسیقی کی طرح احساسات کو گہرے طور پر متاثر کرتا ہے الفاظ کو مخصوص باقاعدہ سلسلے میں مرتب کرنا گویا اس کو ایک پوشیدہ سحر، ایک جدید و زبردست جذبی قوت عطا کرتا ہے، ایسی معنی خیزی پیدا کر دیتا ہے، جس کی قابلیت الفاظ میں ہرگز نہیں ہوتی، ایسا کیوں ہے؟ اس کی تشریح کا فرض تو طالب علم ادب کو ماہر نفسیات کے سپرد کرنا چاہئیے، مگر خود

طالب علم کے لئے یہ ایک حقیقت ہے اور بڑی ہی دلچسپ و اہم حقیقت ہے کہ ایسی نظموں کی باقاعدہ بندش و ہیئت، روانی اور ٹھہراؤ، گاہے گاہے تیزی اور کبھی کبھی آہستگی ایسی زبان میں جس کو وہ بخوبی سمجھتا نہیں اس کو اکثر سخت جوش یا افسردگی کے جذبات سے لبریز کر دیتی ہے اور وزن کی بہت سی شکلیں جن میں شاعر موزونیت کے ساتھ اپنے خیالات کو بیان کرتا ہے جذبات کو ابھارنے کے زبردست آلے ہیں "شاعری کی کس قدر قوت قافیہ کی خوبصورت بندش پر منحصر ہے اس کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ بہترین نظموں کو لیکر حتی الامکان بغیر تبدیلی الفاظ نثر میں ترتیب دیکر دیکھئے ایسی کوشش شبنم کے قطرات کو جمع کرنے کے مترادف ہوگی۔ جو سبزہ کے پتوں پر پرتو جواہر و موتی نظر آتے ہیں، لیکن ہاتھ میں بہ کر پانی ہو جاتے ہیں۔

شاعری اور سائنس

جس دنیا کے ساتھ سائنس کو تعلق ہے وہ عام طور پر حقائق کی دنیا کہی جاتی ہے سائنس داں اشیاء کے ہیئت و نظام ان کے صفات و عناصر، ان کے خصوصیات و تعلقات کا مطالعہ کرتا ہے، ان کا موازنہ کرتا اور ان کو ترتیب دیتا ہے، وہ ان حالات کی تفتیش کرتا ہے جن کے زیر اثر جو اشیاء اپنی موجودہ حالت میں آ سکتی ہیں، سائنس کا مقصد اشیاء کی ایسی منظم و مدلل تشریح پیش کرنا ہے جس میں ان اشیاء کی فطرت، ماہیت اور تاریخ شامل ہو، لیکن ان تشریحوں کے بعد بھی دنیا میں بہت کچھ باقی رہجاتا ہے اور اسی سے ہمیں بہت تعلق ہے، اپنے روزانہ مکالمہ و گفتگو میں ہم دلچسپی نہیں لیتے بلکہ اس شے کے مختلف اثرات سے دلچسپی لیتے ہیں اور اس عام فہم حقیقت میں ہم کو شاعری کی بنیاد اور اس کی مستقل اہمیت تلاش کرنی چاہئے۔ یہ تو ہم ہر وقت عالم کے اسرار و حسن سے متاثر ہوا کرتے ہیں، لیکن عموماً یہ احساس، یہ تاثر صرف دھندلا و غیر واضح ہوتا ہے، پھر بھی ایسی گھڑیاں ہوتی ہیں جب ہم میں یہ جذبات خاص قوت و وضاحت کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ہوتا ہے جب ہم، مسرت، حیرت، شکر گزاری، یا عظمت کے خیال سے متاثر ہو جاتے ہیں، انہیں جذبات سے شاعری پیدا ہوتی ہے۔ ایسے ہی جذبات سے یہ خطاب کرتی ہے یہ ہمیں چیزوں کا بیان " جذبی و روحانی " پہلوؤں سے مہیا کرتی ہے، یہ ہمارے اوپر ان کے اثر، اور اس اثر کے جواب میں ہماری کیفیات کو ظاہر کرتی اور اس کی تشریح کرتی ہے اس لئے یہ بیک وقت سائنس کی مد مقابل بھی ہے اور اس کی تکمیل کرنے والی بھی۔

لے ہنٹ - [illegible] کے الفاظ میں "شاعری کی ابتدا وہاں ہوتی ہے جہاں حقیقت یا سائنس کی اصلی ہیئت کا خاتمہ ہو جاتا ہے، مثلاً ایک باغبان سے پوچھو کہ یہ کونسا پھول ہے؟ وہ کہے گا " یاسمن " یہ ایک حقیقت ہے۔ ماہر نباتیات تمہارے سوال کے جواب میں اس کو نباتات کی کسی خاص قسم سے متعلق بتائیگا۔ یہ سائنس ہے۔

ماہر نباتیات پھول کا تجزیہ کر سکتا ہے، اس کی پنکھڑیوں کی بابت خطبہ دے سکتا ہے لیکن اس کا تجزیہ کردہ پھول ہمارا پھول نہیں ہے، یہ وہ پھول نہیں جس کو ہم جانتے اور پسند کرتے ہیں اور جس کا تعلق دنیائے تاثرات یا شاعری سے ہے۔ آرنلڈ اپنی اس رائے میں بالکل درست ہے کہ شاعری کی عظیم قوت یہ ہے کہ اشیاء کے ساتھ ہمارے اندر روحانی تعلق کا احساس پیدا کر دے۔ وہ آگے پھر لکھتا ہے میں اس بات کی تفتیش نہیں کرونگا کہ آیا یہ احساس کاذب ہے یا صادق اور آیا یہ ہم کو اشیاء کی اصلی فطرت سے آگاہ بنا سکتی ہے یا نہیں۔ میں صرف کہتا ہوں کہ شاعری ہم میں یہ احساس پیدا کر سکتی ہے اور اس کو بیدار کرنا ہی شاعری کی ایک بڑی قوت ہے۔ سائنس کی تشریحات ہم کو اشیاء کا ایسا قریبی احساس نہیں عطا کرتیں جیسی شاعری۔ وہ صرف ایک محدود حاسہ کو متاثر کرتی ہیں نہ کہ پورے انسان کو، ایک خیال کو شاعر اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

اور اسی بیان کو صاحب فلسفۂ جذبات ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں۔

"ہر جدید کیفیت شاعرہ خواہ وہ وقوفی ہو یا احساسی ہمیشہ نفس کی کیفیات سابقہ کے تابع ہوتی ہے، یعنی ہر فرد اپنی گزشتہ تعلیم، حوادث زندگی وحالات کی بنا پر اپنے نفس کے اندر جس قسم اور جس درجہ کی استعداد وصلاحیت رکھتا ہے اسی مناسبت سے اس کا نفس ہر جدید تجربہ کو قبول کرتا اور اسی مناسبت سے بہر نہج متاثر ہوتا ہے" باب ۴ صفحہ ۲۹

یا بحر ظلمات کے ایک طوفان کی بابت شاعر لکھتا ہے!

"پوربی ہوا نے نامعلوم طور پر گہرا بھری بادل جمع کر لیا۔ وہ شب کو منطقۂ جادہ سے روانہ ہوا، اور لیبرڈا کے چٹانوں سے ٹکرایا، وہ دونوں اطراف کے سواحل سے ٹکرایا اور اُس کی افواج راس اور نیوفاؤنڈلینڈ کے درمیان جمع ہو رہی ہیں"

اور اس واقعہ کو محکمۂ موسم کے ایک اعلان میں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے۔

"ایک نہایت ہی ادنیٰ دباؤ کا رقبہ ساحل بحر ظلمات کے بالائی جانب طوفان و بارش کی معیت میں حرکت کر رہا ہے، مرکز طوفانی اس وقت چارلسٹن سے آگے ہے، ہوا شمال مشرق، رفتار ۴۵ باد پیما ۲۹۰۰ یہ طوفان نیویارک چہارشنبہ کو پہنچے گا، اور مشرق کی جانب سواحل و خلیج سنٹ لارنس کی طرف روانہ ہوگا۔ تنبیہی اشارات شمالی اٹلانٹک کے تمام بندرگاہوں کو بھیج دیے گئے۔"

تخیلی بیان میں ایک صفت ایسی موجود ہے، جو علمی بیان میں نہیں پائی جاتی، اسی لئے ہم توفیق طوفان کا زیادہ واضح مفہوم شاعر کے تصور و خیال کے ذریعہ سے سمجھ سکتے ہیں نہ کہ صاحب فلسفۂ جذبات اور محکمۂ موسم کے غیر رنگین و غیر جذبی بیان سے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال کر لینا چاہیئے کہ چونکہ شاعر کا تعلق اشیاء کے حسن و اسرار سے ہے اس لئے وہ اُن کی مادی حقیقت کی بابت کسی شرط و قید کا پابند نہیں۔

مثلاً ایک شاعر کرکوم کی تعریف کرتے ہوئے، اُسے زر بکف یا جام زرین کے نام سے یاد کرتا ہے، اور اس میں شک نہیں کہ اس طرح وہ اُس کی خوبصورتی و دلربائی کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ لیکن جو شخص کرکوم کو جانتا ہے اور جس نے اُس کا پوری توجہ کے ساتھ مشاہدہ کیا ہے اُس کے لئے اس بیان کی سحر بیانی اپنے عدم اصلیت کے باعث بے اثر ہو جاتی ہے اس لئے کہ یہ صحیح طور پر اس کے لئے زر بکف نہیں کہا جا سکتا کہ اس کا زرد رنگ سنہرا نہیں بلکہ زعفرانی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حقیقت کا تخیلی بیان اصلیت کی غیر موجودگی کے باعث ناقابل توجہ ہوتا ہے۔ شاعری کا حسن صداقت کے ذریعہ نہیں بلکہ اصلیت کی قیمت پر کھینچا گیا ہے، یہ نقص ایشیائی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ نمایاں ہے، جس سے کی شاعری کم علمی اور مطالعۂ فطرت سے معذوری کا اظہار ہوتا ہے۔

ماننا پڑے گا کہ شعری تبدیلی ہیت اور اصل حقیقت میں رسکن ایک شاعر پر اسی لئے خفا ہے کہ وہ اپنی نظم میں لکھتا ہے "متحرک موج، بے رحم رنگیلی موج" وہ احتجاج کرتا ہے کہ موج بیرحم نہیں، نہ وہ رنگیلی ہے اور ان الفاظ کو یہاں استعمال کرنا حقیقت کو بے اصل کر دینا ہے، لیکن وہ لپیٹے ہوئے سمندر کی بابت کیٹس کی نظم میں،

"جس کی نیلی پشت کے نیچے سفید موتی بار بار بے قاعدہ نیند سے کراٹھتی ہے"

غلطی نکالتا ہے اس لئے کہ پانی نہ بے قاعدہ ہوسکتا ہے اور نہ خوابیدہ۔

ہربرٹ اسپنسر ایک حکیم کی حیثیت سے لکھتے ہوئے رقمطراز ہے: "کیا یہ خیال لغو نہیں ہے کہ جس قدر زیادہ کوئی شخص قدرت کا مطالعہ کریگا، اُسی قدر کم اس کی توقیر کریگا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ایک گول پتھر جس پر متوازی خطوط اُبھرے ہوئے ہیں جاہل آدمی کے دل میں اُسی قدر شاعرانہ خیالات پیدا کرسکتا ہے جس قدر ماہر طبقات الارض کے دل میں جو اس بات کو جانتا ہے کہ دس لاکھ برس پہلے ایک برف کا تودہ اس چٹان پر بہتے ہوئے گذر گیا تھا؟ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پانی کا قطرہ جو عام لوگوں کی نظر میں محض پانی کا قطرہ ہے، ماہر طبیعیات کی نظر میں اس کی وقعت کچھ کم ہوجائیگی۔ جو اس بات کو جانتا ہے کہ اس قطرہ کے عناصر ایک قوت کے ذریعہ سے وابستہ ہیں اور اگر وہ قوت یکایک زائل ہوجائے تو اس میں سے بجلی کی چمک پیدا ہوجائیگی، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس شے کو ناتربیت یافتہ بے پروائی سے برف کا گالا سمجھتا ہے اگر اس کے عجیب وغریب، گوناگوں، پاکیزہ برفانی، شفاف بلوری اور ان کو کوئی شخص خوردبین کے ذریعہ سے دیکھے تو اس کے دل میں اعلیٰ درجہ کے خیالات کا تسلسل پیدا نہ ہوگا"

ورڈسورتھ اپنے اعلان میں حق بجانب ہے کہ شاعری کے خیالات کے لئے موضوع ہر جگہ موجود ہے"۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ چونکہ شاعر بڑا غور کرنیوالا ہوتا ہے اس لئے وہ سائنس کے عجائب انکشافات اور مباحثات میں نہیں تو ان عظیم خیالات میں جو یہ پیدا کرتے ہیں ضرور دلچسپی لیگا۔ اور دنیا کی امیدوں و توقعات پر ان علوم کے اثرات لازماً اس کی توجہ اپنی طرف منعطف کرائیں گے اور بیشمار خوبصورت نازک طریقوں سے اس کی نظموں میں داخل ہوجائیں گے، اس لئے اس امر کی غلطی کے علاوہ کہ شاعر کو کسی حکمی علم سے کوئی تعلق نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس علم کے عظیم نتائج کو وہ کبھی نظر انداز نہیں کرسکتا، اور اگر وہ فلسفی شاعر ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس علم کو ہر اس سوال میں جو انسان کی اعلیٰ زندگی سے متعلق ہو کام میں لائے۔ الغرض شاعر اگر اپنے تخیل کے لحاظ سے بالکل آزاد ہے تو وہ حقائق اشیاء کے ...... اعتبار سے پابند بھی ہے۔

احسن الظفر

محمد ابن ابی عامر حاجب المنصور

خلیفہ حکم دوم کا عہد خلافت ہے، قرطبہ کے ایک باغ میں پانچ کمسن طالب العلم کچھ کھا پی رہے ہیں جب اس شغل سے فارغ ہو چکے تو ان میں سے چار کھیل کود میں مصروف ہو گئے اور باغ کی حسین روش پر دوڑ دھوپ سے لطف اٹھانے لگے، پانچواں طالب العلم جس کی صورت سے ایک خاص شان پیدا تھی کہ وہ محکوم بننے کیلئے نہیں بلکہ ایک باجلال حاکم ہونے کے لئے پیدا کیا گیا ہے خاموش بیٹھا تھا۔ یک بیک جیسے کوئی نیند سے چونک پڑے وہ اپنے ہمجلیسوں سے مخاطب ہوا کہ "دوستو سنو! میں ہسپانیہ کا حکمراں ہونیوالا ہوں" اس پر اس کے ساتھی بیساختہ ہنس پڑے لیکن اس نے ذرا بھی اس کا خیال نہ کیا اور بولا "اب تم لوگ اپنی دلی خواہش ظاہر کرو۔ جو جس نوکری کی خواہش کرے گا میرے عہد خلافت میں وہی پائیگا"

پہلے طالب العلم نے کہا "میاں مجھے تو بازار کا انسپکٹر بنا دینا۔ میں فرسے مزے کی چیزیں خوب مفت اڑاؤں گا، اور تمھاری جان و مال کو دعا دوں گا"

دوسرا بولا "اور سرکار مجھے تو میرے صوبہ مالقہ کا قاضی بنا دیجئے، عین ذرہ نوازی ہوگی"

تیسرے نے کہا "حضور مجھے یہ سرسبز اور شاداب باغ بہت بھاتے ہیں، اگر میں داروغہ بنا دیا جاؤں تو بڑا احسان ہو"

چوتھا طالب علم خاموش بیٹھا رہا، لیکن جب اس پر بہت زور ڈالا گیا تو اس نے کہا "مجنوں، سڑی، چھوٹا منہ بڑی بات مگر محل شاہی کا خواب دیکھنے والے۔ اگر تو خدا نخواستہ کبھی خلیفۂ وقت ہوا تو مجھے شہد میں ڈبو دینا۔ تاکہ مجھ پر مکھیاں خوب آ بیٹھیں اور پھر ایک گدھے پر الٹا بٹھا کر قرطبہ کی گلیوں میں پھرانا"

پانچویں طالب علم کی آنکھیں سرخ ہو گئیں، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے اور وہ "بہتر" کہکر خاموش ہو گیا۔

شام ہو چلی تھی اس لئے اس تفریح کے بعد وہ طالب العلم اپنے ایک رشتہ دار کے گھر چلا گیا۔ آج وہ کچھ ایسا نیک ہو گیا تھا کہ کوئی ہزار چھیڑے لیکن وہ کوئی جواب نہ دیتا تھا، اس کے اعزہ اس نئے انداز کا سبب نہ سمجھ سکے اور چونکہ رات زیادہ آ چکی تھی اس لئے اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی اپنی خوابگاہ کو چلے گئے۔

لیکن علی الصباح اس سے پھر ملے تو اُسی حالت میں پاکر از حد حیران ہوئے اور وجہ دریافت کرنے لگے، لڑکے نے جواب دیا کہ وہ ساری رات اسی فکر میں تھا کہ اپنے عہد حکومت میں کسے قاضی مقرر کریگا۔ اور اس کی نگاہ میں بجز ابن سلیم کے کوئی بھی نہیں جنچا۔

اس ہونہار نونہال کا نام محمد ابن ابی عامر تھا، نپولین اعظم کی طرح اس کے ننھے دل کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ بے کسی، بے بسی، غربت، کبھی ایک مضبوط اور منچلے دل کیلئے سنگ راہ نہیں ہو سکتی اس کا اس پر ایمان تھا کہ دنیا میں ناممکن کوئی چیز نہیں ہے، محمد ابن ابی عامر بنو عامر کے ان شمشیر زن بہادروں کی اولاد میں سے تھا، جو طارق فاتح ہسپانیہ کے ساتھ اپنی شمشیر زنی کے جوہر دکھانے آئے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ عبدالملک کو اسی صلہ میں کئی تعلقے ملے تھے۔ ابو عامر کا دادا محمد آٹھ سال تک اشبیلیہ کے عہدۂ قضا پر مامور رہا تھا، اور خود اس کا باپ عبداللہ اپنے وقت کا بڑا معزز اور جید عالم تھا۔ ابو عامر کے ننہال والے بھی خاندانی تھے اور قرطبہ کے رئیسوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، لیکن چونکہ خاندان کی مالی حالت، روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی، اس لئے

اب ہر شخص کو اپنی اپنی سدٹی کی فکر پڑ گئی تھی، اور ابو عامر بھی اسی دُھن میں قرطبہ کے ایک درس گاہ کی خاک چھان رہا تھا۔

طالب العلمی کے جلد جلد نہ گزرنے والے زمانہ کو ختم کر کے ابو عامر نے عرائض نویسی کا کام شروع کیا، اور کچھ دنوں بعد ایک معمولی سے سرکاری عہدہ پر قاضی ابن سلیم کے ماتحت مقرر ہوا۔ قاضی صاحب ذرا دقیانوسی قسم کے آدمی تھے، اُن کو ابو عامر کے انداز پسند نہ آئے اور انھوں نے وزیر اعظم مشعفی کے پاس شکایت لکھ بھیجی قسمت دیکھئے کہ یہ شکایت اس کی ترقی کا باعث ہوگئی، خلیفہ کو شاہزادہ کے لئے ایک معلم کی ضرورت تھی، مشعفی نے ابو عامر کو خلیفہ کے پاس بھیج دیا، اور ملکہ صبح (جسے عیسائی مورخ دوزی ( ) کے نام سے ملقب کرتا ہے) کی کوشش سے ابو عامر کا تقرر پچاس اشرفی ماہانہ پر ہوگیا۔ چونکہ قسمت یاور تھی اس لئے چند ہی دنوں میں ابو عامر سلطانہ کے ناک کا بال ہوگیا۔ سلطانہ نے اسے اپنی ذاتی جائداد کا نگہبان کر دیا، اور پھر داروغہ دار الضرب کے معزز عہدہ پر ممتاز کیا۔ روپیہ کا ہاتھ میں آنا تھا کہ ابو عامر کی سخاوت اپنا رنگ دکھانے لگی، ہر کس و ناکس اس سے فیضیاب ہونے لگا، لوگوں میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ ابو عامر حاتم ثانی، یا حاتم وقت ہے۔ اور اہل قرطبہ اس کا کلمہ پڑھنے لگے، اس کی سخاوت کا ایک ادنیٰ واقعہ ہے کہ ایک شخص جسے اپنی لڑکی کی شادی کے لئے روپیہ کی سخت ضرورت تھی، ابو عامر کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک خوبصورت لگام پیش کر کے ساری حالت کہہ سنائی، ابو عامر نے اس لگام کے ہموزن روپیہ دینے کا حکم صادر کیا، یہ شخص اس قدر خوش ہوا کہ وہ اکثر قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ "اگر ابو عامر مجھے خلیفہ سے بغاوت کرنے کو بھی کہے تو واللہ مجھے دریغ نہ ہو"

لیکن جس کو جتنی زیادہ مال و دولت جاہ و ثروت حاصل ہوتی ہے اُتنی قدر اس کے زیادہ دشمن بھی پیدا ہو جاتے ہیں، ابو عامر کی دن دونی رات چوگنی ترقی کو کم ظرف لوگ نہ دیکھ سکے، اور اس کے خلاف خلیفہ کے حضور میں خوب خوب زہر اگلنے لگے۔ خلیفہ نے حاضری کا حکم صادر کیا، روپیہ کا حساب مانگا، ابو عامر کے منھ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، لیکن ابو عامر نے اپنی ساری کیفیت اپنے ایک دوست سے جو عہدۂ وزارت پر معمور تھا کہی، اس نے ابو عامر کے سامنے تھیلیاں رکھدیں، اور خلیفہ کے سامنے روپیہ گن دیا گیا، خلیفہ از حد خوش ہوا، ابو عامر کی ترقی ہوئی اور اب وہ شاہزادوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا، اتفاق سے اسی وقت افریقہ کا جھگڑا چھڑ گیا۔ خلیفہ نے اپنے مایۂ ناز جنرل غالب کو ایک زبردست فوج کے ساتھ خاندان ادریسیہ کی بیخ کنی کے لئے افریقہ روانہ کیا، غالب نے اس معرکہ میں بہت خرچ کر ڈالا اور ابو عامر اسی کے روک تھام کے لئے افریقہ روانہ کیا گیا اور اس نے بڑی حسن و خوبی سے اس کام کو انجام دیا۔ ابو عامر کی فوجی زندگی کی یہ بسم اللہ تھی،

خلیفہ حکم نے اپنی وفات کے قبل شاہزادہ ہشام کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا، لیکن اس کے مرتے ہی اس کے دو سر برآوردہ غلاموں نے جن کا نام جوہر اور فائق تھا اور جن کی طاقت اس قدر زیادہ بڑھ گئی تھی کہ اُن کو خلیفہ ساز کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا اپنے وعدے سے پھر گئے۔ فائق اور جوہر کو مشعفی سے عداوت تھی اور انھیں خوف تھا کہ اگر کمسن ہشام خلیفہ ہوا تو مشعفی کی بن آئے گی، اسی بنا پر ان دونوں نے خلیفہ حکم کے بھائی مغیرہ کو خلیفہ بنانے کی سازشیں شروع کیں لیکن ابو عامر کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ بیچارہ مغیرہ مارا گیا اور دونوں غلاموں نے اپنی بدنیتی کا نتیجہ بھگتا۔

ہشام المؤید باللہ کے لقب سے خلیفہ بنایا گیا۔ اس کے عہد خلافت میں ابو عامر کی کمان بہت چڑھ گئی، مشعفی کی طاقت کو زوال ہونے لگا، اور ابو عامر کو روز بروز کمال۔

اُس وقت ہسپانیہ میں مثلیث کی حکومت تھی (مشعفی، غالب، عامر) مشعفی کو ہمیشہ غالب سے ایک قسم کا کھٹکا لگا رہتا، اور غالب کو مشعفی سے دلی

نفرت تھی۔ ابو عامر نے اس موقع کو اپنی ترقی کے لئے بہترین زینہ تصور کیا اور اس کا نہایت اچھا استعمال کیا، غالب پرانا تجربہ کار جنگ آزمودہ سپاہ سالار تھا، فوج اس کی پرستش کرتی تھی، جب عیسائیوں کی سرکوبی کا ایک موقع آپڑا تو ابو عامر نے غالب سے دوستی پیدا کی اور اس کی مدد سے جنگ میں ایسا نام پیدا کیا کہ مشعفی کے لڑکے کی جگہ چھین کر پولیس کا بڑا آفیسر بن بیٹھا، اس نازک عہد کو اس نے اس خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا کہ دیکھنے والے دنگ ہو گئے، اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ یہ بہت بڑا انصاف پسند تھا۔ قانون کے مطابق ایسی سخت سزا دی کہ غریب کی جان بچ گئی۔ اب مشعفی کی آنکھیں کھلیں، ابو عامر کی چال کو وہ خوب سمجھ گیا، لیکن بعد از وقت، ابو عامر کی طاقت بہت زیادہ بڑھ چکی تھی۔ اب بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ غالب کی دوستی خرید ہی جائے۔ مشعفی نے اپنے لڑکے عثمان کی نسبت غالب کی لڑکی سے کی اور اس میں قریب قریب کامیاب بھی ہو چکا تھا کہ پھر ابو عامر نے ایسا کھیل بگاڑا کہ مشعفی کے سنبھالے نہ سنبھلا۔ ابو عامر غالب کا داماد بن بیٹھا، مشعفی علیحدہ کیا گیا اور سارے خاندان کے ساتھ مدتوں جیل خانہ میں رہا۔

مشعفی کا زوال ابو عامر کے کمال کا باعث ہوا، جس روز غریب وزیر اعظم کی گرفتاری اور معزولی ہوئی اسی دن ابو عامر حاجب بن بیٹھا۔ اب ہسپانیہ میں اس سے بڑھکر کوئی مال و دولت والا، شان و شوکت والا۔ طاقت و جبروت والا نہ تھا۔ سپاہ سالار غالب ہسپانیہ کے سلطنت کا ایک رکن اعظم اس کا خسر تھا۔

سلطنت اس کا کلمہ پڑھتی تھی اور نو عمر خلیفہ ہشام تو صرف نام کو مسند خلافت پر تھا۔ غریب ہشام کے لئے تو خلافت بلا تھی، بجائے مستقل طریقہ سے نظر بند تھا۔ ملنا جلنا۔ ملاقات۔ آمد و رفت سب ابو عامر کی خواہش پر موقوف تھا۔ عیدین کے سوا اہلکاران سلطنت میں سے کبھی کوئی شخص خلیفہ کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ اور ایسے موقعوں پر بھی صرف اس قدر اجازت تھی کہ سلام کر کے واپس چلے جائیں۔"

ابو عامر اراکین سلطنت کو بھی دور ہی دور رکھنا چاہتا تھا اور اس لئے کل دفاتر کو عالیشان محل زاہرہ میں بھیجدیا، جو اس نے عبد الرحمان ثالث کے قصر الزہرہ کے مقابل تعمیر کرایا تھا۔

اب مشعفی سے بھی زیادہ چالاک اور زیادہ زبردست رقیب جنرل غالب سے ابو عامر کا مقابلہ تھا۔ گو غالب ابو عامر کا خسر تھا۔ لیکن دونوں کے خیالات جداگانہ تھے۔ غالب اپنے متربی خلیفہ عبد الرحمان ثالث کے پوتے کو نظر بند اور ابو عامر کے ہاتھ میں کاٹھ کا پتلا دیکھنا ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔ موروثی استحقاق کا خیال اس کے دل میں پختگی سے جما ہوا تھا اور شاہی خاندان کی محبت بھی اس کی زندگی اور جسم و جان کی جزو اہم ہو گئی تھی۔ برخلاف اس کے ابو عامر عملاً بادشاہ ہونے کے علاوہ باضابطہ طریقہ سے بادشاہ بننا چاہتا تھا، انھیں وجوہات سے ابو عامر کو غالب سے سخت خوف تھا اور وہ اس لئے غالب سے آئندہ ہونیوالی جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غالب کی ساری فوج پرستش کرتی تھی۔ بالخصوص ہسپانوی الاصل مسلمان سپاہی تو اس کے دلدادہ تھے، اور غالب کے خلاف ہسپانیہ میں ایک تلوار کا بھی نیام سے نکلنا ناممکن تھا، ابو عامر ان مشکلات کو خوب سمجھتا تھا، غالب کے مقابلہ کے لئے اسے ایک فوج جرار کی ضرورت تھی۔

ہسپانوی الاصل مسلمانوں پر بھروسہ کرنا سراسر بیعقلی تھی، اس لئے وہ جانفروش عیسائی اور وحشی جانباز بربروں کی طرف مائل ہوا فوج سے عربوں کو نکالکر ان کو بھرتی کیا، اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ اس نئی فوج کی بھرتی میں زیادہ تر حب الوطنی کا جذبہ شامل تھا، ابو عامر ہسپانیہ کو دنیا کی ایک زبردست

وقت دیکھنا چاہتا تھا اور اس مہم کے لئے عرب قوم اُس وقت ناقابل ہوگئی تھی، آرام طلبی کا ان پر بڑا اثر پڑا تھا، اور اس لئے جفاکش اور جانباز بربروں کی سخت ضرورت تھی"۔ اس کی تصدیق خود عبدالرحمان ثالث کی پالیسی سے ہوتی ہے، اُس نے اپنے عہد خلافت میں عربوں کو دوسرے درجہ پر اور بربروں کو درجہ اوّل پر کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور فی الحقیقت ابوعامر نے عبدالرحمان ثالث کے ادھورے کام کو اختتام تک پہنچایا اس کاروائی سے بہت جلد وہ ایک زبردست اور بڑی فوج کا مالک بن بیٹھا جو اُس کے ایک معمولی اشارے پر ہر وقت جان دینے کو تیار رہتی تھی، آخر وہ چنگاری جو ایک مدت سے غالب اور ابوعامر کے دل میں پوشیدہ تھی بھڑک اٹھی، ایک دن جب دونوں قلعہ کا معائنہ کر رہے اثنائے گفتگو میں کسی بات پر نزاع ہوگئی۔ غالب اب کھُلے طریقہ خلیفہ کا حامی بن بیٹھا اور دونوں کا میدان جنگ میں مقابلہ ہوا، عین اُس وقت جب ابوعامر کی فوج بھاگ رہی تھی اور فتح و نصرت غالب کا قدم چومنے کے لئے بڑھی تھی کہ غالب کو خود اُس کے ایک ہتیار کی چوٹ لگ گئی اور وہ اپنے راہوار سے گرا، اُس کا گرنا تھا کہ فاتح فوج مفتوح اور مفتوح فاتح ہوگئی اور بہادر غالب کی لاش میدان جنگ میں پامال ہوئی۔

غالب کی شکست اور موت کے بعد ابوعامر کی طاقت انتہا کو پہنچ گئی اب کوئی اس کا مخالف نہ رہا، خانگی معاملات سے اطمینان کر کے اُس نے اپنی زبردست فوج کو عیسائی سلاطین کی طاقت توڑنے کے لئے کام میں لگا دیا، گالیشیا کی سرکوبی کے بعد ابوعامر نے حیرت انگیز شجاعت اور قابلیت سے چند ہی معرکوں میں لیون اور ناوار کی ریاستوں کو باجگذار بنالیا اور ان کے دارالخلافوں میں اپنی فوجیں داخل کر دیں۔

کاٹالونیا۔ بارسلونا۔ مارٹینیا اور مغربی افریقہ میں بھی اُسے حیرت انگیز کامیابی ہوئی، ابن ابی عامر کے دل و دماغ کے مسلمان تو مسلمان خود عیسائی مورخ بھی معترف ہیں اور بقول گبن "یہی تعریف وہی ہے جو دشمن کے منہ سے نکلے"۔ آج اس سے کسی کو بھی انکار نہیں اور خود مورخ ڈوزی جو بالاتفاق بہت بڑا مورخ مانا جاتا ہے لکھتا ہے کہ "جو ترقی ہسپانیہ نے حاجب المنصور کے زمانہ میں کی وہ اسے ہرگز عبدالرحمان ثالث کے عہد خلافت میں نصیب نہیں ہوئی تھی، ہسپانیہ کے عیسائی سلاطین کے جسم پر ابوعامر کے نام سے لرزہ آجاتا تھا، ابوعامر نے اپنی فوج کی درستی اس خوبی سے کی تھی کہ نہ صرف وہ بڑی بہادر اور شمشیرزن ثابت ہوئی بلکہ اُس نے تہذیب اور ادب کا بھی اپنی فوج کو ایسا اچھا سبق دیا تھا کہ شاید آج بھی کسی شائستہ سے شائستہ فوج کو نصیب نہ ہوگا۔ اس واقعہ سے اس پر صاف روشنی پڑتی ہے کہ اگر ابوعامر اپنی فوج کا شیدا تھا اور اپنی فوج کے لئے لاکھوں اشرفیاں صرف کر دیتا تھا خرچ کر دیتا تھا تو تہذیب اور اخلاق کے معاملہ وہ ایک زبردست، جابر، اور سخت حکمران تھا ایک مورخ بیان کرتا ہے کہ ایک دن جب ابوعامر اپنی فوج کا معائنہ کر رہا تھا اتفاقاً اُس کی نظر ایک ننگی تلوار پر جا پڑی ابوعامر بھلا کب اس بد تہذیبی کو برداشت کر سکتا تھا، فوراً اس سوختہ اختر سپاہی سے اس کی باز پرس ہوئی۔ غریب سپاہی نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ اتفاقاً اُس کی تلوار میان سے نکل گئی تھی اور وہ اپنے ساتھی کو اپنی چمکتی ہوئی تلوار دکھا رہا تھا، ابوعامر نے فوراً اُسے سزائے موت دی۔

جہاں ابوعامر تہذیب کے باب میں اپنی فوج کے ساتھ اس قدر سخت تھا وہاں اس کی سخاوت کی بھی حد نہ تھی، ایک روز ایک بربر سردار حاضر ہوا اور ایک مکان کے لئے درخواست کی ابوعامر نے پوچھا کہ اس کا قصر کیا ہوا، تو اُس نے ہنسکر جواب دیا کہ حضور کی عنایت کردہ جاگیر دیں اسقدر غلہ ہوا ہے کہ مکان میں ذرا جگہ نہیں، ابوعامر نے فوراً اُسے ایک اور خوبصورت محل عنایت کیا۔

ابوعامر چوبیس سال سے ہسپانیہ پر حکمرانی کر رہا تھا۔ اب اُسے سلسلۂ خلافت کو اپنے خاندان میں مستقل طریقہ سے لانے کا خیال ہوا، لیکن

وہ عقلمند تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ موروثی استحقاق کا خیال عوام کے دل پر چھا ہوا تھا اور اس قسم کا انقلاب خالی از خطرہ نہ تھا، تاہم بایں توقع کہ شاید آہستہ آہستہ یہ احساس بدل جائے اُس نے سردست سنہ ۹۹۱ء میں اپنے بیٹے عبدالملک کو اپنی جگہ حاجب بنا دیا اور اپنے لئے صرف المنصور کا خطاب منتخب کیا اور سنہ ۹۹۶ء میں اُس نے "سید صاحب" اور "ملک کریم" کے لقب اختیار کئے (اس قسم کا خطاب صرف خلیفہ کے لئے مخصوص تھا) لیکن پھر بھی ابو عامر خوب سمجھتا تھا کہ خاندانی انقلاب پیدا کرنے میں اُس کی خیر نہ تھی، عوام ہشام اور اُس کے خاندان کے دلدادہ تھے۔

المنصور کی موت کا زمانہ اب قریب آ پہنچا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے قبل از وقت اس کی خبر ہو گئی تھی، وہ روز بروز مذہب کا زیادہ پابند ہوتا جاتا تھا اور جب وہ اپنے آخری حملے کے لئے روانہ ہوا تو اُس نے اپنا کفن جو خود اُس کی لڑکی نے تیار کیا تھا اور جو اُس کے آبا و اجداد کے مال متروکہ سے خریدا گیا تھا ساتھ لے لیا۔ بوقت واپسی راستہ ہی میں بیمار پڑا اور نقاہت اس قدر بڑھ گئی کہ مکان پہنچتے پہنچتے بہادر ابو عامر قریب الموت ہو گیا۔ بستر مرگ پر اپنے لڑکے عبدالملک کو (جو پھر المظفر کے نام سے مشہور ہوا) بلا کر وصیت کی اور دارالسلطنت کو روانہ کیا عبدالملک روانگی کے بعد افسران فوج اور اپنے پرانے مشیر کاروں کو بلا کر آخری بار چشم تر رخصت ہوا، اور دسویں اگست سنہ ۱۰۰۲ء کو بہادر اور جانباز ابو عامر اس عالم فانی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گیا، مدینہ سالم (مدینہ سیلی) میں مدفون ہوا، اُس کے مزار پر جو کتبہ ہے اُس کا مفہوم یہ ہے

"اس کی تاریخ زمین ہسپانیہ پر کندہ ہے، اگر آنکھیں رکھتے ہو تو پڑھو
تو اللہ کی قسم زمانہ اس کا ثانی نہیں پیدا کر سکتا"

اگر ایک منصف مزاج، غیر جانبدار اور بے تعصب مورخ کی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات ماننی پڑیگی کہ المنصور نہ صرف ایک بہت بڑا بہادر شمشیر زن اور کامیاب سپہ سالار تھا، بلکہ ایک اعلیٰ پیمانہ کا منتظم، علم دوست، غریب پرور اور انصاف پسند حکمران تھا، میرے ان الفاظ میں نام کو بھی مبالغہ نہیں، خود واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں، ابن خلدون لکھتا ہے "وہ باون لڑائیاں لڑا اور ہر معرکہ میں غالب رہا" ایک اور مورخ ۵۶ معرکہ لکھتا ہے

دوسرا عیسائی مورخ رینا ڈ (Renaud) کا قول ہے "اسلامی ہسپانیہ جیسا اُس کے زمانہ میں خوش حال تھا ویسا کبھی نہ ہوا، وہ علم کا سچا مربی .... اور علما کا فیاض محسن تھا"

میرے اکثر احباب "علم کا سچا مربی" دیکھ کر چیخ اُٹھیں گے اور مجھے فوراً یاد دلائیں گے کہ یہ وہی المنصور ہے جس نے ہسپانیہ کے ایک ناز خزینہ فلسفہ کو حوالۂ آتش کیا تھا، میں خود ہی مانتا ہوں کہ المنصور نے ایسا کیا۔ لیکن کیوں؟ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ فلسفہ دانی اُس زمانہ میں ایک گناہ خیال کی جاتی تھی وہ خود بچپن سے فلسفہ کا عاشق تھا اُس کے دشمن اسی تاک میں لگے رہتے تھے اور سازشیں ہو رہی تھیں کہ المنصور پر یہ الزام لگایا جائے، المنصور اپنی جان بچانے کے لئے اس تباہ کن خیالات کو عمل میں لایا۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اُس نے اسی شئے کو خاک میں ملا دیا جس کے حامی ہونیکا اُس پر الزام آ سکتا تھا۔ المنصور نے جان بچانیکو یہ کام کیا اس لئے وہ قابل معافی ہے، اس میں تعصب کو ذرا بھی دخل نہ تھا، اس کے تعلقات جو علما و فقہا خصوصاً سعید بغدادی کے ساتھ تھے اُس کے علم دوست ہونے کی کافی دلیل ہیں۔

المنصور کی منصف مزاجی سے کس کو انکار ہو سکتا تھا جب کہ اُس نے اپنے لڑکے سے بھی وہی سلوک کیا جس کا ایک معمولی آدمی مستحق ہو سکتا تھا؛

اس نے اپنے دو خاص مصاحبوں کو پابہ زنجیر قاضی کے اجلاس میں بھیج دیا اور ان کے مجرم ثابت ہونے پر انہیں علیحدہ کر دیا اس کے لئے رشتہ داری محبت نقصان کے سامنے کوئی شے نہیں تھی۔ المنصور بڑا غریب پرور تھا۔ ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بڑھیا کا مکان مسجد کے احاطہ میں اتفاق سے آپڑا۔ المنصور کو اس مکان کی مسجد کے لئے سخت ضرورت تھی۔ اس نے ضعیفہ کو ہزار کہا لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتی رہی کہ اس مکان کے عوض میں ہو بہو ایسا ہی مکان لونگی جس میں ایسا ہی کھجور کا درخت ہو۔ المنصور سخت حیران ہوا۔ لیکن اس کے لئے کوئی شے ناممکن نہ تھی بڑی مشکلوں سے ویسا ہی مکان تلاش کیا گیا اور ایک بہت زیادہ رقم میں خرید کر بڑھیا کو دیا گیا۔

مورخ دوزی کا بیان ہے کہ ایک بار ابی عامر المنصور کا قاصد عیسائی ریاست ناورا (Navarre) سے واپس آیا تو سارا حال بیان کرنے کے بعد کہنے لگا کہ ایک مسلمان ضعیفہ وہاں ایک گرجا میں بحیثیت غلام کے مقید ہے اور آپ کی مدد چاہتی ہے" ابو عامر المنصور کانپنے لگا، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اور قاصد سے برافروختہ ہو کر کہنے لگا۔ "وادر سب سے پہلے تجھے اس پیام کو کہنا چاہئے تھا" بعد ازاں اس نے اسی وقت فوج کو کوچ کا حکم دیا اور ناورا پر حملہ کر دیا حتی کہ عیسائی بادشاہ نے خوف زدہ ہو کر اس غریب بڑھیا کو مع اور دو مسلمان مصیبت زدہ عورتوں کے حاضر کیا۔

میرے اکثر مغربی احباب ابو عامر المنصور کے ان ذرائع پر جس نے اس نے سلطنت حاصل کی تھی بہت سختی سے قلم اٹھاتے ہیں، اور انصاف کا خون کر کے اسے "مذہبی تعصب کا پتلا" بتلاتے ہیں۔

میں خود اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ "اگرچہ وہ وسایل جن کو اس نے حصول اقتدار کیلئے استعمال کیا سخت نفرین کے مستوجب ہیں، لیکن یہ حق اداء ہے کہ اقتدار حاصل کر لینے پر اس نے اسے نہایت شریفانہ طور پر استعمال کیا۔ میرے خیال میں ان واقعات کا ظہور میں آنا لازمی اور ضروری تھا، ابو عامر المنصور ایک غریب شخص تھا۔ مسند خلافت تک پہنچنے کے لئے ان واقعات کا ہونا ضروری تھا۔

اگر المنصور کی ساری کارگزاریوں پر ایک منصفانہ نظر ڈالی جائے تو اس کی چند غلطیاں اس کے مقابلہ میں کچھ بھی نظر نہ آئینگی، المنصور انسان تھا اور اس سے خطا کا سرزد ہونا بھی لازمی تھا، لیکن اگر اسے مذہبی تعصب کا پتلا کہا جائے تو سراسر انصاف کا خون کرنا ہے، گذشتہ نو سو برس کے واقعات کا آجکل کے واقعات سے مقابلہ کرنا سراسر بے انصافی ہے، المنصور کا مقابلہ شہنشاہ ایڈورڈ چہارم انگلینڈ، فلپ شہنشاہ اسپین، اسابلا، فرڈینڈ وغیرہ جو اس کے ہمعصر تھے کیا جائے تو خود معلوم ہو جائیگا کہ کون تعصب کا پتلا تھا، المنصور کی فوج میں زیادہ تر عیسائی تھے، اتوار کا دن مذہبی خیال سے فرصت کا دن مقرر کر دیا گیا تھا، عیسائی اور مسلمان سپاہیوں کے جھگڑوں میں المنصور زیادہ تر عیسائیوں کے موافق فیصلہ کیا کرتا تھا۔ اگر حسب قول پروفیسر جدوناتھ کے المنصور کو، اپنے زمانہ کا بسمارک کہا جائے تو ہرگز بیجا نہ ہوگا، بسمارک نے اگر پرشیا کو جرمنی بنایا تو المنصور نے اسلامی ہسپانیہ کو دنیا کی ایک زبردست طاقت
اگر اسی سلسلہ میں ان چار طالب العلموں کا حال بھی بیان کر دیا جائے جن سے قرطبہ کے باغ میں ابی عامر سے گفتگو ہوئی تھی تو خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

ان تین طالب العلموں کو حسب وعدہ انسپکٹر، قاضی، اور داروغہ شہر بنا دیا گیا، اور چوتھے صاحب کو جنھوں نے ابو عامر کی ہنسی اڑائی تھی ساری جائداد ضبط ہو گئی، ہمکتب ہونے کے صدقہ میں گدھے پر الٹے رخ قرطبہ کی گلیوں میں پھرائے گئے۔

شاہ افضال الرحمان بسمل بی۔اے

شکستِ عہد

(۱)

شباب کے وہ جذبات جو ہر انسانی زندگی کو دنیائے حیات بنا دیتے ہیں گیتی آرا کے دل میں بھی متلاطم ہیں، اُس وقت جبکہ وہ فلسفۂ حسن و عشق پر ایک بسیط و رنگین مضمون لکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

سورج کی رخصتی شعاعیں سرو کے سیدھے سیدھے درختوں کی چوٹیوں کو ایک نمایاں خصوصیت دیتے ہوئے الوداع کہنا ہی چاہتی تھیں، ماحول کی منور فضا گلاب کی خوشبوؤں سے معطر رفتہ رفتہ تاریکی میں تحلیل ہوتی ہی جاتی تھی، کہ گیتی آرا مضمون کے مسودہ کو بند کرکے ایک ہلکی سی انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی اور کچھ دیر تک کسی گہرے خیال میں مستغرق جوہی کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت کو تکتی رہی، آخر اُس نے کہا ——

”اگر محبت اسی جذبہ آتشیں کا نام ہے تو میں اسے ایک قسم کی بیماری کہونگی جو انسان کی حیات سے متعلق ہے“

وہ پھر خاموش ہوگئی اور ایک عمیق تخیل میں غرق، آخر اُس نے یکایک اپنے بائیں ہاتھ کی نازک کلائی کو ایک ہلکی سی جنبش دی، اور گھڑی کو دیکھا۔

”ساڑھے چھ! مجھے فوراً کلب جانا چاہیئے آج کس قدر دیر ہوگئی!!“

اُس نے ڈرائیور کو آواز دیکر موٹر تیار کرنے کیلئے کہا اور خود لباس تبدیل کرنے کیلئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

گیتی آرا جو ایک مغربی تعلیمیافتہ ہونے کی بنا پر مس آرا کے نام سے مشہور تھی، مسٹر ریاض اصغر بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا کی اکیلی بہن تھی، جس نے اپنے بھائی کے ساتھ جبکہ وہ لندن میں پریکٹس کر رہا تھا، اٹھارہ سال کی عمر میں کیمرج یونیورسٹی سے بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ لیکن افسوس وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ والد کے انتقال کا تار دہلی سے موصول ہوا، اور پھر مجبوراً مسٹر ریاض اصغر اور مس آرا دونوں کو انگلینڈ چھوڑنا پڑا، ریاض اصغر کے والد دہلی کے کامیاب ترین بیرسٹروں میں سے تھے، جنھوں نے محض اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت سے لاکھوں روپیہ کی جائداد پیدا کرلی تھی، اب جبکہ وہ انتقال کر گئے تو اُن کی تنہا اولاد نرینہ ریاض اصغر اپنی بہن کی شرکت میں اس تمام جائداد کا مالک قرار پایا۔

گیتی آرا کی اعلیٰ ذہنیت، فلسفیانہ خیالات، ذوقِ ادب، مخصوص طرز انشا، اور ساتھ ہی اُس کا ملکوتی، اور معصوم حسن، یہ تھیں وہ خصوصیات جنھوں نے مس آرا کو ولایت سے واپس آنے سے پہلے ہی مشہور کر دیا، اور ہندوستان کی اعلیٰ سوسائیٹیاں اُس کے لئے جگہ خالی کرنے لگیں، ہندوستان کی قدیم رسوم سے مس آرا بالکل ناآشنا تھی، وہ ہمیشہ کلب جاتی، ٹینس کھیلتی، سیاسی معاملات میں دلچسپی لیتی، اور دیگر فنون لطیفہ میں مردوں کے دوش بدوش رہتی، وہ ایک آزاد خیال عورت تھی، اس درجہ آزاد خیال کہ اُس کی رائے ہمیشہ اپنی رائے ہوتی اور وہ جو کچھ کرتی نہایت بیباکی اور استقلال سے کرتی، اُس کا بھائی ریاض اصغر اپنی بہن کے معاملات میں قطعاً دخل نہ دیتا، اس لئے کہ وہ سمجھتا تھا کہ مس آرا اُس کی بہ نسبت اپنے معاملات بہتر سمجھ سکتی ہے۔ بلکہ وہ اکثر اپنے ذاتی معاملات میں اپنی بہن سے رائے لیتا اور وہ اس خوبصورتی سے ایک اُلجھے ہوئے معاملہ کو سلجھا دیتی کہ ریاض اصغر عش عش کرجاتا۔

انگلینڈ سے واپس آنے کے بعد مس آرا کی قابلیت سے زیادہ ہندوستان میں مس آرا کے حسن کی دھوم مچگئی، اور جیسا کہ قاعدہ ہے اعلیٰ سوسائٹی کا ہر فرد اُس پر اس طرح گرنے لگا، جس طرح شمع پر پروانہ۔

دولت، شہرت، قابلیت اور حسن ——— ایک عورت کی تکمیل کے لئے اور کس چیز کی ضرورت ہے؟ ہر ایک اپنے دل سے یہ سوال کرتا اور اپنے کو مس آرا کا گرویدہ پاتا، رہا عصمت وعفت کا سوال سو اوّل تو نئی سوسائٹی میں یہ خیال ہی فرسودہ خیال کیا جاتا ہے، اور اگر بالفرض مس آرا کو کوئی اس نقطۂ نظر سے دیکھتا بھی تو وہ متحیر رہ جاتا کہ باوجود اس قدر مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہونے کے وہ قطرۂ شبنم سے زیادہ پاکیزہ، کلی سے زیادہ معصوم اور چاندنی سے زیادہ بے داغ تھی۔

——— (۲) ———

"اگر کوئی انسان اپنا مقصدِ حیات یہ سمجھتا ہے کہ صرف وہ کھائے پیئے، اور اپنی عمرِ طبعی کو پہنچکر مرجائے، تو میرے خیال میں وہ انسان زیادہ صحیح الفاظ میں حیوان کہا جا سکتا ہے، جنسِ لطیف کے لئے یہ مخصوص انتہائی بدقسمتی ہے۔ ننانوے فی صدی عورتیں یہی ایک مقصد لیکر پیدا ہوتی ہیں، اور کسی نہ کسی طرح اس کو انجام دیکر چل بستی ہیں، مشرق اور مغرب پر اس کا انحصار نہیں، یہ وبا عام ہے جو روزِ آفرینش سے دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے، اس پر نظرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اس محدود اور مہمل مقصد کو بھی جمہور خوشی سے نہیں گذار سکتا اس لئے کہ خواہ مخواہ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا ہے کہ عورتوں کے لئے مردوں کا محکوم ہونا بھی فطری امر ہے، یہ خیال عورتوں کی ذہنیت میں اس قدر مستقل ہوگیا ہے کہ جن ملکوں میں عورتیں کسی حد تک آزاد ہیں وہاں بھی اُن کا مقصدِ حیات نہیں بدلا ——— شادی کرنا ہر عورت کے لئے ویسا ہی ضروری ہے، جیسا زندگی برقرار رکھنے کے لئے کھانا اور شادی کی غرض وغایت محض یہی دو وجوہ ہوتے ہیں یا تو اولاد پیدا کرنے کیلئے شادی کی جاتی ہے یا نفس پرستی کے لئے (جسے اکثر کوتاہ اندیش محبت سے تعبیر کرتے ہیں)

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہر انسان کے لئے شادی کی کیا خاص ضرورت پیش آتی ہے؟ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ شادی کرنا ہی نہیں چاہیئے، ضرور کرنا چاہیئے، لیکن اصولوں کے ماتحت، مثلاً فرض کیجیے کوئی شخص (مرد یا عورت) اکیلا ہے اور اس کی زندگی بلا کسی ہمدم وغمخوار کے تلخ ہے تو اُسے اختیار ہے کہ وہ اپنے مزاج وحیثیت کے موافق کسی کو شریکِ زندگی بنائے، اور بصورت تضادِ جنس شادی بھی کرلے تو مضائقہ نہیں۔ یا فرض کیجیے کوئی بے یار ومددگار ہے اور بڑی مشکل سے گذراوقات کرسکتا ہے تو اس صورت میں اگر وہ مرد ہے تو ایک ذی استطاعت عورت کا یہ انسانی فرض ہے کہ وہ فوراً اُس سے شادی کرلے، اور اس کی زندگی کو خوشگوار بنانے میں کوشاں ہو، اور اگر وہ مرد ہے تو مرد کا بھی یہی فرض ہے، اگر کسی کے لئے شادی کرنا ڈاکٹروں نے تندرستی کے لئے ضروری بتلا دیا ہے تو وہ بھی شادی کرسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سی ایسی صورتیں ہوسکتی ہیں جن میں شادی کرنا لاحق ہوجاتا ہے لیکن یہ کہ ہر عورت یا مرد کو شادی کرنا لازم ہی ہے ایک مہمل اور تباہ کن اصول ہے جو ہزارہا بد امنیوں اور تغیرات کا حامل ہے"

یہ تھے وہ الفاظ جو مس آرا نے ایم سی کلب کے ٹینس لان پر اپنے دو ایک دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہے جنھوں نے کسی خاص مصلحت سے مسئلہ ازدواج پر اُس کی رائے چاہی۔

اُس کی تقریر مسلسل تھی اور پرلطف، مسٹر ظفر اور مسٹر شوکت جو اُس کے ساتھ ٹینس کھیل چکے تھے، حیرت سے اس کی عجیب وغریب تقریر سن رہے تھے

یا لآخر جب وہ رُکی تو ظفر نے کہا۔

"آپنے فرمایا کہ شادی کرنا بُرا نہیں لیکن اصول کے ماتحت مثلاً انسانی ہمدردی کے طور پر۔ ضرورت کی بنا پر وغیرہ - - - - - - - کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ اس ضرورت کے ضمن میں محبت بھی آسکتی ہے یا نہیں؟ جو بجائے خود ایک قسم کی مجبوری ہے"

"آپ کے خیال کے پہلے حصّہ سے تو مجھے اتفاق ہے" مس آرا نے ریکٹ سے کھیلتے ہوئے کہا "لیکن دوسرے حصّہ سے اُتنی قدر اختلاف"

"اس کی کوئی وجہ ہوگی"

"بیشک ایک مستقل وجہ اس سے مجھے اتفاق ہے کہ محبت ایک جذبہ ہے" اگزیرا یک مجبوری ہے لیکن محبت کا تقاضا شادی کرنا تو نہیں بلکہ ایک دوسرے کی ہستی میں گُم ہوجانا ہے۔ یاد رکھیئے اگر جذبۂ محبت حقیقی ہے تو اس کے لئے ہجر و وصال دونوں یکساں ہیں۔

"اس کی دلیل اور مثال" ظفر نے وکیلانہ لہجہ میں پوچھا۔

"اس کی دلیل انسانی فطرت ہے جو قدرتاً یکسانیت پسند نہیں ہے، وہ ایک چیز کو دیکھتے دیکھتے عادی ہوجاتی ہے اور ایک چیز کا ذوق شوق رفتہ رفتہ بے شوقی اور بالآخر نفرت میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تمثیلاً دوسری اشیاء کو چھوڑیئے شادی ہی کو لیجیئے، دنیا میں کتنے انسان ہیں جو ازدواج میں کامیاب خیال کئے جاتے ہیں، میرے خیال میں آپ انگلیوں پر گن سکیں گے، اور کتنی شادیاں ہیں جن کے نتائج طلاق کی صورت میں رونما ہوئے ہیں، شاید آپ عمر بھر حساب نہ لگا سکیں گے۔ کیا میں برسرِ غلط ہوں؟"

"جی نہیں برسرِ غلط تو نہیں کہا جاسکتا لیکن آپ کے اصول ہیں دنیا سے نرالے اور ناقابلِ عمل"

"اب آپ نے یہ پہلو نکالا" مس آرا نے قہقہہ کے ساتھ کہا "اچھا اگر یہ دنیا سے نرالے ہیں تو ہوا کریں مگر میں آپ سے یہ دریافت کرتی ہوں کہ آپ انہیں ناقابلِ عمل کیوں قرار دیتے ہیں؟"

"ناقابلِ عمل" ظفر نے رُکتے ہوئے کہا "مگر میں آپ سے دریافت کرتی ہوں کہ یہ دنیا سے نرالے ہیں"

"تو ناقابلِ عمل سمجھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہوئی، ہر نیا اصول ابتدا میں دنیا کو عجیب اور نرالا معلوم ہوا ہوگا، لیکن ہزارہا اصول ہیں جن پر دنیا۔۔۔؟"

"مس آرا جانے دیجیئے آپ مشکل سے مسٹر ظفر کو خاموش کرسکیں گی، اُن کے بشرہ سے میں پہچان رہا ہوں کہ وہ آپ کے نظریات کے قائل تو ضرور ہوگئے ہیں، لیکن ابھی کئی گھنٹہ آپ سے بحث کرنے کے لئے تیار ہیں اور" شوکت نے بہ انداز تمسخر اپنی کلائی پر گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "نو تو فی الحال بج چکے ہیں"

"معاف کیجیئے گا شوکت صاحب، مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں، واقعی میں نے آپ صاحبان کا بہت سا وقت ضائع کردیا اور دیر بھی کافی ہوگئی، امید ہے کہ آپ مجھے معاف فرمائیں گے، ظفر صاحب! ہماری آپ کی کل اس مسئلہ پر گفتگو ہوگی"

مس آرا نے یہ فقرہ کہا اور اپنے دوستوں سے رخصت ہوکر آہستہ آہستہ ٹہلتی ہوئی اپنی کار تک آبیٹھی اور شوفر سے کوٹھی چلنے کو کہا۔

(۳)

ظفر دہلی کے ایک متمول سوداگر کا لڑکا تھا جو لاکھوں روپیہ کا بیوپار کرتا تھا، اس کی دوکان کی شاخیں، شملہ، لاہور، کلکتہ، بمبئی میں علیحدہ علیحدہ اقالیم

تھیں اور تجارتی دنیا میں وہ بہت کامیاب خیال کیا جاتا تھا۔
اولاد کی طرف سے بھی فطرت اُسے بے نیاز رکھ چکی تھی، اُس کے تین لڑکے تھے جن میں سب سے بڑا ظفر تھا۔ ظفر کو اُس کے باپ نے اصولی بنیاد پر تعلیم دلائی مگر چونکہ وہ فطرتاً بدشوق تھا اس لئے بمشکل بائیس سال کی عمر میں اُس نے کمرشل ڈپلومہ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد اُس کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا، اور باپ نے تجارت میں اُسے اپنا شریک بنا لیا۔ لیکن ظفر نہ صرف بدشوق تھا بلکہ باپ کی دولت بے پایاں کو دیکھکر کسی قدر مغرور اور آوارہ مزاج بھی ہو گیا تھا، اُس کی شادی ہو چکی تھی ہر آوارہ منش کی طرح وہ بھی اپنی بیوی سے التفات نہ رکھتا تھا، اُسے تجارتی کاموں سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اور وہ بیشتر وقت ناکارہ کوتہ اندیش دوستوں کی صحبت میں گزارتا۔ دہلی کا کوئی مشہور کلب ایسا نہ تھا جس کا وہ ممبر نہ ہو، گھوڑ دوڑ کا کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ بازی نہ لگاتا ہو۔ صورت شکل کے لحاظ سے اگر ظفر حسین نہ تھا تو بدصورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا، اور اس قدر اُس کی تسلی کے لئے کافی تھا، دولت کی فراوانی اُسے بالعموم ایک مکمل حسین نوجوان کی صورت میں پیش کیا کرتی تھی۔
مس آرا کی حسن ملکوتی کی افواہیں اُس کے کانوں تک بھی پہنچیں اور ہر بوالہوس کی طرح اُس نے بھی چاہا کہ مس آرا کو اپنا بنائے۔
ظفر ایم۔ سی کلب کا نہ صرف ممبر تھا، بلکہ معاون اعزازی بھی تھا، چنانچہ جب اُس نے یہ سُنا کہ مس آرا۔ ایم۔ سی کلب میں روزانہ ٹینس کھیلنے کے لئے آتی ہے، تو اُس نے بھی ارادہ کیا کہ اپنی شامیں کچھ عرصہ کے لئے ایم۔ سی کلب کے لئے وقف کر دے، مگر اول ہی روز جب وہ مس آرا سے متعارف ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ مس آرا غیر معمولی حسین اور قابل ہونیکے علاوہ کچھ اور چیز بھی ہے جس کے سمجھنے کے لئے مدتیں چاہئیں۔
ظفر اب سے بیشتر ہزار ہا حسین عورتوں کو دیکھ چکا تھا اور پرکھ چکا تھا، مگر مس آرا اُسے کچھ اور ہی نظر آئی، وہ سمجھنے لگا کہ اُسے مس آرا سے ضرور محبت ہو گئی ہے۔
شروع شروع کی دو چار ملاقاتوں میں تو اُس نے خیال کیا کہ اس قسم کی آزاد منش دوشیزہ کو جس کی تربیت یورپ جیسے عصمت فروش خطے میں ہوئی ہو قابو میں کر لینا آسان بات ہو گی لیکن جب اُس نے دیکھا کہ مس آرا باوجود مکمل آزاد ہونے کے خیالات ہی دوسرے رکھتی ہے اور اُس کا حاصل کرنا آسان تو آسان دشواری کی حدود سے بھی بڑھا ہوا ہے تو اُس کے دل میں آتش شوق اور بھڑکی، اور اُس نے اپنی تمام دولت اپنی تمام قابلیت، اپنے اُن تمام ہتکنڈوں کو بیک وقت مس آرا پر استعمال کرنے کا عزم بالجزم کر لیا جن کے ذریعہ سے وہ صدہا عورتوں کے استقلال کی بنیادیں ہلا چکا تھا، چنانچہ یہی تقریب تھی مس آرا کے اُن خیالات کے معلوم کرنے کی جن کا اظہار گذشتہ باب میں کیا گیا
ظفر جب دیکھ چکا کہ مس آرا اپنے اصول کے لحاظ سے اس درجہ عجیب ہے اور شادی نہ کرنیکا خیال اُس کے دماغ میں اس قدر استوار، تو اُس نے کلب سے واپس آکر غور کرنا شروع کیا کہ کس طریقہ سے اُس کے نظریہ کو باطل ثابت کرکے اُس کے غرور کو توڑے اُس نے سوچا کہ "وہ اسے دولت کا لالچ دینا بیکار ہے، وہ خود لکھپتی ہے۔ دلکش باتوں سے اس کا دل لبھانا ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ خطرناک حد تک فلسفی ہے، قابلیت کا سکہ اُس پر جمایا نہیں جا سکتا، کیونکہ وہ اس سے کہیں زیادہ قابل ہے۔
حسن کا جادو اُس پر نہیں چل سکتا، اس واسطے کہ اوّل تو وہ حسین ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو کم از کم اُس کی نظروں میں سراہنے کے لائق نہیں"
"پھر" اُس نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے غور کیا "اور کیا تدبیر رہ گئی؟"

وہ بہت دیر تک خاموش رہا اور خدا معلوم اس عرصہ میں کیا کیا تدابیر اس کے ذہن میں آئیں اور اس نے بیکار سمجھ کر انہیں نکال دیا۔

وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ وہسکی کی ایک بوتل اور ایک جام، خوشبودار سگاروں کا ایک ڈبہ اور دیا سلائی کا بکس اس کے سامنے میز پر رکھے تھے اور اس کا تخیل مس آرا کے لئے وقف۔ اس کے چہرے کا تغیر بتلا رہا تھا کہ اس نے ابھی تک کوئی رائے قائم نہیں کی۔ تقریباً ایک گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا اور رفتہ رفتہ اس کے بشرے سے مایوسی ظاہر ہونے لگی، مگر وہ پھر سنبھلا! اور سگار سلگا کر اس نے پھر سوچا یا، بالآخر وہ نتیجہ پر پہنچ گیا اور اس نے خود بخود کہنا شروع کیا۔

"یہ بالکل ٹھیک ہے" مانا کہ مس آرا تعلیم یافتہ ہے، ادیب ہے، فلسفی ہے، مستقل مزاج ہے، دنیاوی ضروریات سے بے نیاز ہے لیکن بہرحال عورت ہے اور نوجوان ——————— عورت ہونا اس کے ہر شعبۂ زندگی میں شامل ہے اور شباب کا خون اس کی ہر رگ و پے میں جاری و ساری، پس جب تک ایسا ہے وہ سب کچھ ہے اور کچھ بھی نہیں، ناممکن ہے کہ اس کے حسن کی تعریف کی جائے اور وہ دل میں گدگدی محسوس نہ کرے، محال ہے کہ اس سے اظہار عشق کیا جائے اور وہ بیتاب نہ ہو"

اس نے کامیابی کا سانس لیتے ہوئے وہسکی کی بوتل اٹھائی اور متواتر تین چار جام پی کر آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔

——————— (۴) ———————

تقریباً صبح ۹ بجے مس آرا اپنے بھائی مسٹر ریاض اصغر کے ساتھ ناشتہ میں مصروف تھی کہ ایک ملازم نے نہایت سلیقہ کے ساتھ اس کے سامنے ایک نقشی تعارفی کارڈ رکھ دیا جس پر "ظفر" لکھا ہوا تھا۔

"ملاقات کے کمرے میں بٹھاؤ، اور کہدو کہ میں ابھی حاضر ہوتی ہوں" ملازم سے یہ کہکر مس آرا نے چائے کے دو ایک گھونٹ لئے اور پیالی رکھ کر اپنے بھائی سے کہنے لگی "میں مسٹر ظفر سے مل آؤں، آپکو کہیں جانا تو نہیں ہے"؟

"نہیں میں دس بجے تک کہیں نہیں جاؤنگا تم مسٹر ظفر سے مل لو، اگر ممکن ہوا تو کچھ دیر بعد میں بھی آؤنگا"

"بہتر" ——— ——— دوسرے لمحہ میں مس آرا ملاقات کے کمرہ میں تھی، ظفر جو خدا معلوم کن کن خیالات میں مستغرق تھا مس آرا کی آہٹ سے چونکا اور مسکراتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"غالباً کل شام کی نامکمل بحث نے آج اتنے سویرے آپکو تکلیف دی ہے" مس آرا نے تبسمانہ لہجے میں ظفر سے پوچھا۔

"جی نہیں! وہ بات تو شام ہی تک محدود تھی، اور مجھے آپ کے خیالات سے انحراف ہی کب ہوا تھا جو اب ہوتا، بلکہ اس وقت اگر سچ پوچھیے تو میں اعتراف شکست کی غرض سے حاضر ہوا ہوں نہ کہ مزید بحث و گفتگو کے لئے"

"میں ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ناچیز خیالات کو شرف قبولیت بخشا"

"آپ کے خیالات درحقیقت اس قدر دقیق اور عمیق ہوتے ہیں کہ بادی النظر میں انسان ان کی تہ کو نہیں پہنچ سکتا، لیکن جب ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہے تب ان کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے اور آپکی وسیع النظری اور عجیب و غریب قابلیت کا اعتراف ناگزیر ہو جاتا ہے، چنانچہ گزشتہ رات جب میں نے اس مسئلہ پر پھر غور کیا تو مجھے آپ کا ہمخیال ہو جانا پڑا"

"میں آپ کی اس رائے کی تہ دل سے قدر کرتی ہوں، لیکن یہ تو بتلائیے کہ آپ کے شکوک کس طرح رفع ہو گئے اور آپ کے اعتراضات کا کس طرح کافی و وافی جواب مل گیا"

"اسے نہ پوچھئے" ظفر نے خفیف سی آہ کے ساتھ کہا "آپ کو علم نہیں ہے میرا حافظہ اپنی مشہور غلو توں میں آپ کے الفاظ دہرایا کرتا ہے اور مجھے یاد نہیں۔ بتا کر کس بنا پر میری رائے کا اختلاف اُس وقت مغلوب ہو جاتا ہے، میرے خیال میں تو اس کی وجہ آپ کے دلائل کی مضبوطی کے ساتھ آپکے تصور کی دلکشی بھی ہے"

"آپ منطقی ہونے کے ساتھ ساتھ ہی شاعر بھی معلوم ہوتے ہیں، ورنہ گفتگو میں رنگینیت اور مبالغہ کو غالباً آپ غیر ضروری سمجھتے" مس آرا نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔

"میری بدقسمتی ہے کہ آپ واقعہ کو مبالغہ سمجھتی ہیں۔ اگر ایک حقیقت کا انکشاف شاعری سے تعبیر کیا جاتا ہے تب تو بیشک میں اس جرم کا مرتکب ہوں ورنہ عرض کرنے دیجئے آپ اس کی مرتکب ہیں اس لئے کہ آپ صریحاً مبالغہ کے ساتھ انکسار فرماتی ہیں"

"نہایت خوب" مس آرا نے ہنستے ہوئے کہا "آپ یقیناً ایک دلچسپ منطقی ہیں، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ میں کلب میں دوسرے ممبروں کی بہ نسبت آپکی گفتگو میں زیادہ لطف اٹھاتی ہوں۔

"خدا کا شکر ہے میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں"

"مس آرا اس فقرہ پر خود بخود کچھ جھینپ گئی اور کچھ لمحوں کے لئے خون کی ہلکی ہلکی سرخیاں اُس کے صبیح چہرے پر دوڑنے لگیں، ظفر نے اس تبدیلی کو ایک دزدیدہ مگر کامیاب نظر سے دیکھا، اور گفتگو کا پہلو بدل کر کہنے لگا۔

"میں اس سے پہلے بھی غالباً یہ سوال کر چکا ہوں اور پھر کرتا ہوں، آپ دن بھر یہاں اکیلی کوٹھی میں پڑے پڑے گھبراتی ہوں گی، اپنے روزانہ مشاغل کو آپ مختلف تفریحات کیلئے کیوں وقف نہیں کر دیتیں"

"کتب بینی، میرے لئے دنیا کی دلچسپ ترین تفریحات میں سے ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ اس سے بہتر کسی اور مشغلہ میں اپنے وقت کو صرف نہیں کر سکتی"

"یہ تو بجا ہے لیکن آپ کو اپنی صحت کا خیال بھی تو ضروری ہے، اس قدر دماغی کام کر کے آپ اپنے اوپر خود ظلم کرتی ہیں، آپنے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ آپ کی نزاکت جسمانی بہ نسبت کام کرنے کے عیش و آرام کے لئے زیادہ موزوں ہے اور اس عمر میں بہ نسبت خلوت نشینی کے آپ کو ہم جیسوں اور ہم صحبتوں کی زیادہ ضرورت ہے بلکہ میں تو کہہ سکتا ہوں کہ فطرت نے آپ کو خلوت کے لئے ہی نہیں بلکہ حکمرانی کے لئے پیدا کیا ہے"

مس آرا نے ظفر کے یہ الفاظ نہایت تعجب سے سنے، اور اُس کا چہرہ اس دوران میں کئی بار شرم سے گلابی ہو ہو گیا، اس کی پیشانی پر پسینہ کے چند قطرے نمودار ہو گئے، اور اس کی نظریں خود بخود جھک گئیں، آخر کار اس نے اپنے کو سنبھالتے کہا۔

"مسٹر ظفر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" وہ رُکی اور اس نے پھر سلسلۂ کلام جاری کرنے کی کوشش کی "آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں" ظفر نے انتہائی نرمی سے کہا "میں بخوبی جان رہا ہوں کہ میں ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں۔ مس آرا یقین کیجئے کہ مجھے آپ سے سچی

ہمدردی ہے اور میں نہیں دیکھ سکتا کہ آپ کی زندگی اس قدر بے لطف گزرے "

"آپ کی ہمدردی کا تو میں شکریہ ادا کرتی ہوں لیکن" اُس نے اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا " یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتی ہوں کہ اس معاملہ میں آپ کی ہمدردی بے سود ہے، میں اپنے مستقبل کے متعلق طے کر چکی ہوں "

" ہاں یہ تو آپ کر چکی ہوں گی لیکن اُس کے ساتھ آپ کو یہی خیال ہے کہ آپ نے کسی دوسرے کے مستقبل کو تو تاریک نہیں بنا دیا "

" اس سے آپ کا کیا مطلب ہے " مس آرا نے انداز برہمی سے پوچھا۔

" میرا مطلب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مطلب " ظفر نے مس آرا کے قریب کرسی لاتے ہوئے انتہائی نجاجت سے کہا " مس آرا خدا کے لئے مجھے میرا مطلب کہنے پر مجبور نہ کرو، آہ میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھ سے برہم ہو رہی ہو۔ میں یقیناً تم سے گستاخانہ پیش آیا، لیکن میں کیا کروں؟ میں خود نہیں سمجھتا کہ جب تم سے مخاطب ہوتا ہوں تو کیا کیا کہہ جاتا ہوں اور ان الفاظ کو محض اس واسطے سوچنے کے لئے کہ مبادا انہوں نے تمہیں برگشتہ کیا ہو، یا وہ خلاف شان ہوں خدا معلوم کتنی راتیں گزار دیتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ ایک لمحہ کے لئے رُکا اور اپنی پیشانی سے پسینہ پوچھتے ہوئے اُس نے مس آرا کے چہرہ کو ناقدانہ مگر غیر محسوس نگاہوں سے دیکھا اور سلسلۂ کلام جاری کیا " مگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اسے اپنی بدقسمتی کے سوا کیا کہوں کہ تمہیں میری حالت سے مطلق آگاہی نہیں ہمدردی تو درکنار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مس آرا ۔ ۔ ۔ مس آرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ نہیں سکتا کہ تم میرے لئے کیا ہو، میں تمہیں کیا سمجھتا ہوں؟ اُف تم میرے قلب کے ہر گوشہ میں، میرے خیال کی ہر رو میں، میری حیات کے ہر تلاطم میں موجود ہو، میری راتیں تمہارے خیال کے لئے وقف ہو چکی ہیں، اور میرے خواب تمہارے تصور کے لئے مخصوص! مس آرا، میری دل کی ملکہ میری ہستی کی فرمانروا، خدا کے لئے مجھے تباہی سے بچا لو، میں اور کچھ نہیں چاہتا " اُس نے مس آرا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اور بالکل قریب آجانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " محض یہ کہ تم میری شریک زندگی ہو کر مجھے ایک خوفناک تباہی سے بچا لو "

وہ یکایک خاموش ہو گیا اور مس آرا کے عرق آلود گلابی چہرہ کے مطالعہ میں مصروف ———— بیشک مطالعہ میں اس لئے کہ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس پر شرم، حیا، نسائیت، انفعال، خودداری، اور عصمت جلی حروف میں لکھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش گردن جھکائے ظفر کا " اظہار محبت " سن رہی تھی، اور خدا معلوم کن کن خیالات میں محو تھی کہ دفعتہً گھبرا کر اُس نے اپنی کرسی ظفر سے علیحدہ ہٹاتے ہوئے ایک متین اور خوددارانہ لہجہ میں کہا۔

" مسٹر ظفر مجھے معاف کیجئے "

" خدا کے لئے ان الفاظ کے ادا کرنے میں ذرا رحم سے کام لو جن پر ایک شخص کی زیست اور موت کا دار و مدار ہے۔ جو ایک شخص کی مکمل تباہی یا ابدی خوشی کا باعث ہیں جن کے ادا کرنے پر شاید تمہیں بعد کو افسوس ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اسی وقت مجھے جواب دو، میں کچھ عرصہ کے واسطے اپنی زندگی کو یاس اور اُس کی باہمی کشمکشوں کے لئے وقف کرنے کو تیار ہوں، لیکن خدارا تم کوئی ایسا جواب دیکر میرا دل نہ توڑ دو جو مجھے کسی غیر ارادی فعل پر مجبور کر دے "

"میں سمجھ چکی مجھے آپ کی حالت سے قطعی ہمدردی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں اس وقت آپ کو کوئی صاف جواب نہ دوں، بلکہ کچھ غور کر لوں تو بہتر ہے آپ پھر کسی وقت مجھ سے دریافت کر سکتے ہیں، لیکن آپ کو خیال رکھنا چاہیئے کہ اس بارے میں اپنی مکمل رائے کا اظہار کل ہی ---------"

باہر کے کمرے سے کسی کے پیروں کی چاپ نے اُن کی توجہ منتقل کر دی، اور مس آرا کی تقریر نامکمل رہ گئی۔

"آداب عرض ہے مسٹر ظفر، کہئیے مزاج تو اچھا ہے"

یہ جملہ مسٹر ریاض اصغر بیرسٹر ایٹ لا کی زبان سے ادا ہوا جو قطعی انگریزی لباس میں ملبوس ایک رسمی تبسم کے ساتھ ظفر کی جانب دست تعارف بڑھا رہے تھے، ظفر پہلے تو کچھ گھبرایا لیکن بعد میں اُس نے اُسی رسمِ تبسم کو اختیار کرتے ہوئے نہایت اطمینان کے ساتھ مسٹر ریاض اصغر کو جواب دیا۔

"آپ کی عنایت سے بالکل اچھا ہوں، لیکن آپ آج کل بہت مصروف معلوم ہوتے ہیں، کبھی ملاقات ہی نہیں ہوتی، آپ نے کلب آنا کیوں چھوڑ دیا"

"آپ کا خیال ایک حد تک درست ہے، میں فی الحقیقت آج کل زیادہ مصروف ہوں، کچھ کثرتِ کار کی بنا پر اور کچھ سفر کی تیاریوں کی وجہ سے، اسی وجہ سے کلب وغیرہ کہیں جانا نہیں ہوتا"

"سفر! " ظفر نے متعجبانہ لہجہ میں پوچھا "کیا کہیں لمبے سفر کا ارادہ ہے ؟"

"جی ہاں دو ڈھائی ماہ کے لئے شملہ جا رہا ہوں یہاں کی گرمی ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے، میں سمجھتا تھا کہ گیتی آرا نے شاید آپ سے تذکرہ کر دیا ہوگا"

"جی نہیں مجھے مطلق علم نہیں ---------- روانگی کب ہے"

"پرسوں جمعہ کو"

مس آرا ہنوز خاموش تھی، اُس کے طرز سے ظاہر تھا کہ وہ کسی دقیق مسئلہ میں اُلجھ رہی ہے، باوجود اس کے کہ اُس کا نام دوران گفتگو میں لیا گیا لیکن اُس نے مطلق نہ سُنا، بالآخر حالاتِ حاضرہ کے متعلق کچھ گفتگو کرنے کے بعد ظفر نے مسٹر ریاض اصغر اور مس آرا سے رخصت چاہی اور افسردہ قدموں کے ساتھ ٹہلتا ہوا کوٹھی سے باہر چلا آیا۔

---------- (۵) ----------

مختلف قسم کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی بلند چوٹیاں　　وادیوں میں ادھر اُدھر بادلوں کا لوٹنا　　قسم قسم کے پرندوں کی نواپردازی　　چٹانوں پر آبشاروں کا گرنا، خدا معلوم جولائی میں شملہ کیا ہو جاتا ہے ؟

مس آرا کو شملہ آئے ہوئے تقریباً ایک مہینہ ہو چکا ہے، وہ اس درمیان میں اکثر کلب گئی، متعدد تفریحات میں شریک ہوئی، اور بار ہا قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوئی۔ آج کا تیسرا دن ہے کہ اُسے معلوم ہوا کہ ظفر بھی بسلسلۂ تجارت کچھ روز کے لئے شملہ چلا آیا ہے، اُس روز کی گفتگو کے بعد سے وہ اب تک مس آرا سے نہ ملا تھا، اور مس آرا گزشتہ واقعہ کو قریب قریب دل سے محو کر چکی تھی، شام کے پانچ بجکر کچھ ہی منٹ گزرے ہوں گے مس آرا اپنی کوٹھی کے سبزہ پر ایک کتاب ہاتھ میں لئے ہوئے خاموش ٹہل رہی تھی کہ سامنے سے ظفر آتا ہوا دکھائی دیا، اُس کے چہرے سے حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے، لیکن جیسے ہی وہ مس آرا کے قریب آیا اُس نے اپنے کو خندہ پیشانی بناتے ہوئے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"مس آرا" ظفر نے نہایت ادب سے کہا "دہلی کی بہ نسبت آپ اتنے قلیل عرصہ میں یہاں زیادہ تندرست اور بشاش نظر آتی ہیں"

"ہاں، اس لئے کہ میں یہاں کی آب و ہوا سے مکمل فائدہ اٹھا رہی ہوں۔ میں نے کچھ روز کے لئے آپ کی قابلِ قدر نصیحت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہے اور زیادہ وقت مطالعہ میں صرف نہیں کرتی۔"

"شکریہ! لیکن اس وقت اگر آپ آبادی سے باہر ٹہلنے کے لئے چلی جایا کریں تو زیادہ بہتر ہو۔ اور آپ کے لئے تو بہت کچھ آسانی بھی ہے۔ سامنے والی چوٹی جہاں سے دوسری طرف کی سرسبز وادی سے ایک شفاف چشمہ گزرتا ہے یہاں سے کچھ دور نہیں ہے۔ وہاں کا نظارہ یقیناً نہایت جاذبِ نظر ہے۔"

میں اکثر شام کے وقت وہاں جایا کرتی ہوں۔ لیکن آج نہ جا سکی۔"

"اس کا افسوس نہ کیجئے۔ اب بھی کافی وقت ہے اگر آپ چلنا چاہیں تو میں بھی آپ کی معیت کا فخر حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھے یقین ہے کہ ہم قبل از غروب واپس ہو سکیں گے۔"

"چلئے میں تیار ہوں۔" مس آرا نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

راستہ بھر ظفر اور مس آرا مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے کو مسافت طے کی اور ٹیلہ کی چوٹی پر چڑھتے رہے اور آخر کار اس جگہ پہنچ گئے جہاں وادی اور چشمے کا دلکش نظارہ اُن کے پیشِ نظر تھا۔ اب تک ان کے درمیان گزشتہ واقعہ کے متعلق کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی لیکن یہاں پہونچنے کے بعد ظفر نے یکایک موضوعِ گفتگو بدلتے ہوئے کہا۔

"مس آرا! میری پیاری مس آرا تم نے میری قسمت کا کیا فیصلہ کیا؟"

مس آرا اس طرح چونکی گویا وہ کسی دوسرے خیال میں محو تھی، اور ظفر کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ظفر صاحب آپ میرا فیصلہ سُن کر خواہ مخواہ اپنی تفریحات کو مکدر کرتے ہیں، میں تو خیال کرتی تھی کہ آپ شاید اسے بھول گئے ہونگے، لیکن میرا خیال غلط ثابت ہوا، آپ بیکار مجھ سی وارفتہ مزاج عورت کے پیچھے اپنی زندگی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں"

ظفر سمجھا کہ مس آرا کا دل کچھ پسیجا ہے اس لئے وہ بالکل اُس کے قریب آگیا اور اُس کے بازو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "ہاں تم وارفتہ مزاج ہو، اف تمہاری یہ وارفتہ مزاجی ہی تو مجھے دیوانہ بنائے ہوئے ہے، تم مجھ سے سنبھلنے کی ... ہو اس کا جواب میرے پاس یہ ہے کہ میری حالت اُسی وقت اور صرف اُسی وقت سنبھلنی ممکن ہے کہ - - - - - - ظفر شراب کے نشہ میں مدہوش تھا اس لئے اُس نے یہ گفتگو کرتے ہوئے مس آرا کے جسم کو بھی چھونا چاہا، لیکن وہ ایک جھٹکے کے ساتھ ظفر کے ہاتھوں کو اپنے سے علیحدہ کرکے دور جا کھڑی ہوئی اور ایسی نظر سے جس میں نفرت اور غصہ دونوں ملے ہوئے تھے ظفر کو دیکھنے لگی:

"تم یقیناً کوئی آوارہ مزاج اوباش ہو، میں نے اب تک تمہارے سمجھنے میں غلطی سے کام لیا، کیا تمہارا خیال ہے کہ تم میری تنہائی سے ناجائز فائدہ اُٹھا سکتے ہو، اگر ایسا ہے تو تمہیں جنون ہے، یاد رکھو کہ میں خطرناک حد تک اپنے ارادوں میں مستقل ہوں اور تم کسی طرح مجھ پر قابو نہیں پا سکتے" مس آرا نے یہ الفاظ انتہائی غیظ و غضب میں کہے۔

ظفر کچھ دیر تک تو مس آرا کو اس طرح تکتا رہا جس طرح ایک "مجسمہ سنگین" لیکن آخر اُس نے زیرِ لب کچھ مبہم سے الفاظ دہرائے اور قہقہہ کے ساتھ مس آرا

کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔

"میری روح کی فرمانروا! بگڑو نہیں، میں گستاخ ہوں لیکن عاشق سب ہی گستاخ ہوتے ہیں آؤ اب غصہ تھوک دو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ دیکھو تو یہ موقع ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ" ظفر نے گفتگو کا سلسلہ توڑتے ہوئے مس آرا کی طرف دونوں ہاتھ بڑھائے

"الگ رہو ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ" غصہ کے مارے چیخ اٹھی "تم ہرگز اس قابل نہیں کہ مجھے چھو بھی سکو، یاد رکھو کہ اب اگر تم نے آگے قدم بڑھایا تو میں" اس نے ایک پتھر اٹھا لیا "تو اس پتھر سے تمہارا سر پاش پاش کر دوں گی"

ظفر کی حالت ایک دم تبدیل ہو گئی، اس نے یکایک جیب سے ایک ریوالور نکالا اور مس آرا کے سینہ کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "اچھا اگر یہ کہتے ہیں تو تمہیں بھی کتے کی موت مرنا ہوگا ـــــــــ اب بتلاؤ کیا کہتی ہو"؟

وہ ایک زیر خند ہنسی ہنسا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ یہ بازی کا آخری پتہ ہے، اور اسی پر بازی جیت کا دارومدار ہے، اس کا خیال تھا کہ ریوالور کو دیکھ کر مس آرا سہم جائے گی اور خود کو اس کے حوالے کر دے گی کیونکہ آخر وہ عورت ہے۔ لیکن مس آرا عورت تو ضرور تھی مگر ما فوق الفطرت عورت، وہ ریوالور کو اپنی طرف دیکھ کر بجائے اس کے کہ ڈرتی، ہنس پڑی۔ ایسی ہنسی جس سے نفرت و حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ اور ظفر سے ان الفاظ میں مخاطب ہوئی:

"اب تمہارے سیہ کار اور ذلیل الفطرت ہونے کا کامل یقین ہو گیا، تم سمجھتے ہو گے کہ میں اس ریوالور کے ڈر سے زندگی بچانے کیلئے اپنے اصول اور اپنی عفت و عصمت کو قربان کر دوں گی، تم کوتاہ اندیش اور دیوانے ہو"

"دیکھو مس آرا میں ایک موقع اور دیتا ہوں، تم پھر سوچ لو، مجھے تمہاری دوشیزگی پر رحم آتا ہے"

"بکواس مت، میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی"

"اچھا اگر تم نہیں چاہتیں تو" اس نے ریوالور کی نال کو سیدھا کیا اور مس آرا کے قلب کی نشست لی ـــــــــ "دن" ـــــــ

فائر کی آواز پہاڑوں کی چٹانوں اور وادیوں میں گونجی اور چند سکنڈ تک متواتر بازگشت ہوتی رہی، بارود کا دھواں جب سامنے سے صاف ہوا تو ظفر نے اپنی کلائی ایک دوسرے شخص کی مضبوط گرفت میں دیکھی اور ریوالور کی نال کا رخ آسمان کی جانب!

مس آرا سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

ـــــــ (۶) ـــــــ

شوکت مرزا بی۔اے ایل۔ ٹی ایک نوعمر اور خوش رو نوجوان تھا، جو اپنے دوستوں میں عموماً مسٹر شوکت کے نام سے مشہور تھا، اور جسے اس سے قبل ہم ایم۔ سی کلب میں اسی نام سے متعارف بھی کرا چکے ہیں، وہ ایک تعلیمیافتہ مگر ایک غریب گھرانے کا فرد تھا اس کی عمر تیئس ۲۳ سال کے قریب تھی، اور ابھی تک اس کی کہیں شادی نہیں ہوئی تھی، وہ ایک غیر سرکاری اسکول میں ٹیچر تھا، اور نہایت معمولی زندگی بسر کیا کرتا، ایم۔ سی کلب میں سب سے پہلے روز، جب اس نے مس آرا کو دیکھا تو پہلی ہی نظر میں اس نے خیال کیا کہ وہ دنیا میں نہیں ہے اور جب اس کے عجیب و غریب خیالات سنے تو اول ہی بار اس نے اندازہ لگا لیا کہ مس آرا کوئی حسین عورت ہی نہیں بلکہ حسن کی ایک دیوی ہے جو دنیا والوں کو محبت کا حقیقی درس دینے اور ان سے اپنی پرستش کرانے کے لئے آئی ہے، چنانچہ اسی وقت سے اس نے مس آرا کو اپنی آنکھوں میں جذب کر لیا، اور دل میں اس کی تصویر اتار لی، وہ صحیح معنوں میں

اُس کی پرستش کرنے لگا۔ اُس کا عشق سچا تھا، اور اُس کی محبت حقیقی، وہ بہت جلد مجاز سے حقیقت کی طرف رجوع ہونے لگا، اور اُس کے دل میں اس بات کی کوئی خاص تمنا نہ رہی کہ وہ مس آرا سے ملے یا اُسے حاصل کرے۔ وہ بارہا مس آرا سے ملا اور کبھی اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اُسے اُس سے محبت ہے، بلکہ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ مس آرا سے نہ ملے اس لئے کہ اُسے دیکھ کر اُس کے جذبۂ پرستش میں اکثر جوش آجاتا تھا، اور اُس کا قلب اُسے مجبور کرنے لگتا کہ وہ بے اختیار مس آرا کے قدموں پر گر پڑے چنانچہ اسی بنا پر اُس نے ایک بہی کلب کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا اور ساتھ ہی اسکول کی ٹیچری سے بھی چونکہ وہ ایسی حالت میں اپنے فرائض مکمل طور پر انجام نہ دے سکتا تھا، تقریباً چھ ماہ بیکار رہنے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ گذر اوقات ناممکن ہو گئی، اور اُس کے خاندان والے اُس سے ناراض رہنے لگے تو مجبوراً پھر اُس نے تلاش معاش کی اور بڑی مرتبہ سو روپیہ ماہوار پر ایک ادبی رسالہ کا ایڈیٹر ہو گیا جس میں اکثر مس آرا کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے، اخبار روزانہ کا کام انجام دینے کے بعد باقیماندہ وقت میں وہ صرف مس آرا کے مضامین کا مطالعہ کیا کرتا اور جوش عقیدت میں اُن کے اکثر اصول کو حفظ کر لیتا۔ لیکن رفتہ رفتہ اُس کی صحت خراب ہو گئی اور دن بہ دن حالت بدتر ہوتی گئی، مجبوراً پھر ملازمت ترک کرنا پڑی، چونکہ ڈاکٹروں نے تجویز کر دیا تھا کہ اسے اب کسی پہاڑ پر بغرض تبدیل آب و ہوا چلا جانا چاہئیے، یہی اُسکے لئے بہترین علاج ہے، ورنہ دق ہو جانے کا اندیشہ ہے۔

چنانچہ اس وجہ سے شوکت ایک عرصہ سے شملہ ٹھہرا ہوا تھا، اس میں شک نہیں کہ شملہ آکر شوکت اپنی تندرستی میں نمایاں فرق محسوس کرنے لگا۔ لیکن مس آرا کی پرستش نہ اُس سے چھوٹنا تھی نہ چھوٹی، وہ اکثر تصور میں اُس سے باتیں کیا کرتا۔ یہ تھی مسٹر شوکت کی زندگی، جس وقت مس آرا شملہ پہنچی،

اس روز شام کو جس روز ظفر مس آرا کو سیر کے لئے لیگیا شوکت نے ان دونوں کو چوٹی پر چڑھتے ہوئے دیکھا، جس جگہ وہ کھڑا تھا وہ موقع ایسا تھا کہ لامحالہ مس آرا کی نظر اُس پر پڑتی اور اسے مخاطب ہونا ناگزیر ہو جاتا، لیکن وہ ہمیشہ مس آرا سے علحدگی ہی پسند کرتا تھا، پس وہ ایک چٹان کے پیچھے چھپ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ وہ گزر جائیں تو وہاں سے نکل کر واپس چلا جائے، لیکن مس آرا اور ظفر اُس جگہ کے قریب ہی آکر رک گئے، جہاں شوکت چھپا ہوا تھا!

اُس نے وہ تمام باتیں سُنیں جو ظفر اور مس آرا کے درمیان ہوئیں، اس دوران میں بارہا اُس نے چاہا کہ ظفر کا اسی جگہ خاتمہ کر دے جہاں وہ کھڑا ہوا تھا لیکن آخری لمحہ تک اُس نے ضبط کیا، اور عین اُس وقت جبکہ ظفر ریوالور سے مس آرا کو نشانہ بنانا چاہتا تھا اُس نے ایک جست کی اور ظفر کی پکڑ کر ایک ایسا جھٹکا دیا کہ ریوالور کا اوپر کو فائر ہو گیا، ظفر کو پورے طور پر قابو میں کر لینے کے بعد شوکت کا دوسرا ہاتھ ظفر کے حلق پر تھا، اور ممکن تھا کہ ظفر کا وہیں خاتمہ ہو جاتا اگر مس آرا کا یہ جملہ اُسے بروقت نہ سنائی دیتا۔

"مسٹر شوکت! اس بیوقوف کو اس کے حال پر چھوڑ دو"

اُس نے ریوالور ظفر کے ہاتھ سے چھین لیا اور ایک ٹھوکر لگا کر کہا۔

"جا شیطان تیری زندگی ابھی باقی تھی، میری آنکھوں سے دور ہو، پاجی کتے"

شوکت سیٹی بجاتا ہوا، نیچی نظریں کئے چلدیا۔ نہیں بتلایا جا سکتا کہ اُس وقت اُس کے دل میں کیا خیالات موجزن تھے —— اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں جا رہا تھا، اس لئے کہ اُس روز سے وہ آج تک لاپتہ ہے۔

اس کے بعد شوکت نے مس آرا سے رخصت ہونا چاہا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اُسے کوٹھی تک بحفاظت پہنچا دینا اُس کا فرض ہے، چنانچہ مس آرا اور شوکت دونوں اس عجیب و غریب واقعہ پر گفتگو کرتے ہوئے چوٹی سے اُترنے لگے، دورانِ گفتگو میں مس آرا نے شوکت سے پوچھا:-

"آپ یہاں کب سے آئے ہوئے ہیں اور کس تقریب سے کیا محض تفریح کے لئے۔"

"جی نہیں تفریح کیسی؟" شوکت نے عجیب انداز سے کہا اور اُس کے بعد بے کم و کاست اپنے آنے کی تمام داستان مس آرا سے بیان کر دی، لیکن اس مخصوص وجہ کو چھپاتے ہوئے جو ان تمام واقعات کا باعث تھی۔

مس آرا نے بہ نظر ہمدردی اُسے دیکھا اور خود بخود اُس کے دل میں ایک خیال پیدا ہوا،

"مسٹر شوکت کیا در حقیقت آپ کی زندگی اس قدر بے لطف ہے اور کیا واقعی آپ کے تفکرات نے آپ کو اس درجہ پریشان خاطر اور ام المریض بنا دیا ہے مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے، آپ کی شادی تو ابھی نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں،" شوکت نے لاپروائی سے کہدیا

مس آرا تقریباً پانچ منٹ تک بالکل خاموش رہی اور حسب عادت کسی دقیق خیال میں اُس کا دماغ اُلجھ گیا تھوڑی بعد اس نے نظر اُٹھائی اور شوکت کے صبیح و معصوم چہرے کو دیکھا۔ ________ وہ آنکھیں جھکائے خاموش چلا جا رہا تھا۔

بالآخر اُس نے نہایت آزادانہ طریقہ سے کہا:-

"کیا خیال ہے، آپ شادی کریں گے یا نہیں"

"اس مسئلہ میں، میں آپ سے متفق الرائے ہوں۔ میرے خیال میں شادی ایک فعل عبث ہے"

"لیکن اگر میں اپنا اصول بدل دوں تو کیا اُس وقت بھی آپ مجھ سے متفق الرائے رہیں گے" اُس نے مسکرا کر پوچھا

"غالباً"

"یہ کس لئے"

"اس لئے کہ مجھے یقین ہے آپ ہمیشہ صحیح اصول قائم کرتی ہیں" شوکت نے جوش عقیدت میں کہا بہت اچھا۔

"بہت اچھا، تو آپ یقین کر لیجئے کہ میں نے اپنے اصول نہیں بدلے، لیکن کم از کم اپنی "شادی" کے متعلق رائے تبدیل کر چکی ہوں"

"اس سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" "یہ کہ مجھے شادی کرنا چاہیئے"

"تو کیا آپ نے اس کے متعلق طے کر لیا ہے" "بیشک"

"کب؟ اور کس سے؟" "عنقریب اور اگر آپ منظور کریں تو آپ سے"

"مس آرا!" شوکت اتنا کہہ کر یکلخت رک گیا اور مس آرا کا منہ تکنے لگا ______ آخر اُس کی زبان سے نکلا یہ مذاق تو ...."

"جی نہیں قطعی واقعہ ہے"

شوکت کی پیشانی پر پسینہ کی بڑی بڑی بوندیں جمع ہو گئیں اور اُس کا دماغ چکر کھانے لگا، وہ مجسم حیرت بنا ہوا تقریباً ۵ منٹ تک مس آرا کی صورت دیکھتا رہا اُس کے نزدیک مشکل سے یہ بات قابل یقین تھی۔ بالآخر اُس نے اُس کے سامنے سر جھکا دیا اس حال میں کہ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور مس آرا اُن آنسوؤں کو اپنے معطر رومال میں جذب کر رہی تھی۔

طالب باغپتی

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(بسلسلہ ماسبق)

اسلامی یونیورسٹی

"۱۰ جنوری ۱۸۸۴ء - آج حسب ذیل اشخاص ملاقات کو آئے :۔
محمد یوسف ممبر کونسل کے روبرو میں نے یونیورسٹی کی تجویز پیش کی مگر وہ اس قدر دنیادار ہیں کہ اپنے لڑکوں کو پریزیڈنسی کالج ہی میں تعلیم دلوانے پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں۔
یمن کے ایک شیخ بھی آئے جو عربی کا تعارفی خط بھی اپنے ساتھ لائے تھے ۔ انہوں نے مہدی کا ذکر کیا اور کہا کہ اگر وہ بحیرۂ احمر عبور کر کے عرب پہنچ جائیں تو یمن اور حجاز کے عرب اس کے ساتھ مل جائیں گے۔ یمن میں مہدی کا وزیر رہتا ہے جو اس کے بہی خواہ آدمیوں کو مجتمع کر رہا ہے اور اس کارروائی سے عثمانی شیر سخت خائف ہے ، مدحت ابھی تک طائف میں قید ہے۔ خود اس بوڑھے آدمی کو مہدی پر یقین ہے اور اس نے ہمیں بتایا کہ اس کے متعلق تمام آثار اور پیشین گوئیاں پوری ہو چکی ہیں۔ جب میں نے اس سے کہا کہ " انشاءاللہ خیر " تو وہ بہت خوش ہوا۔ جاتے وقت محمد یوسف نے کمال ادب کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا باوجود اس کے کہ وہ خود انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔
جمال الدین کے پانچ مرید میری کتاب مستقبل اسلام کے متعلق اظہار ہمدردی کی غرض سے آئے یہ سب کے سب نوجوان طالب علم ہیں اور انگلستان سے نفرت رکھتے ہیں۔ جب میں نے انہیں عربی کا خط دکھایا تو انہوں نے اسے بوسہ دیا، مذہب کے متعلق ان سب کے خیالات آزادانہ ہیں یہ سب کچھ جمال الدین کی تعلیم کا اثر ہے ، یہ نوجوان طالب علم نہایت دلیری کے ساتھ اظہار خیالات کرتے ہیں اور یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔
ڈاکٹر ہارنلی کے یہاں کھانے کیلئے گئے۔ وہاں تقریباً تیس مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ میں کل کے انجمن اسلام کے جلسہ میں ہندوستان میں مسئلہ تعلیم پر تقریر کروں گا۔
اکبر حسین آئے اور " مستقبل اسلام " کے ترجمہ کے متعلق کچھ باتیں کیں ، وہ نئے دیباچہ سے بالکل مطمئن ہیں جسے کل میں نے ان کے حوالہ کر دیا ، لیکن میں ان حصوں کو خارج کر دوں گا جو ذاتی طور پر سلطان عبدالحمید سے متعلق ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب اپنے دو دوستوں کو دکھائی تھی ان پر بے حد اچھا اثر ہوا ہے ، ان میں سے ایک مذہبی امور سے قطع تعلق کر چکے تھے مگر اسے پڑھتے ہی پھر نماز روزہ کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں ، ان کا خیال یہ ہے کہ اردو ترجمہ کو بہت مقبولیت حاصل ہوگی ، میں نے ان سے کہا کہ میرا قسطنطنیہ جانیکا ارادہ ہے جہاں میں سلطان المعظم سے مل کر پین اسلامک سیناڈ Pan-Islamic Synod (اسلامی اتحاد کو ترقی دینے والی جماعت) قائم کرنیکا مشورہ دوں گا ، ہم دونوں اس امر پر متفق تھے کہ مصر میں اسلام کی شکست کے بعد اب کسی زیادہ حقدار خلیفہ کے منتظر رہنے کی ضرورت نہیں ہے ، جو بات زیادہ دلچسپ ہے وہ یہ ہے کہ

کتاب کے ترجمہ کا کام جن ہاتھوں میں ہے وہ جدید گروہ سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ قدیم خیال کے مسلمان ہیں، ہم نے تہذی اور اس کے دعاوی کے بارے میں بھی بات چیت کی، وہ سب اس پر یقین لانے کے خواہشمند ہیں، مگر کامیابی ان کے مشن کی حقیقی کسوٹی ہوگی"

دن بھر باتیں کرتے کرتے، اور لکھتے لکھتے تھک گیا، اور اس لئے ہم گاڑی میں بیٹھکر سیر کے لئے ذرا جلدی نکلے، شاہزادہ جہاں قدر اور شاہزادہ سلیمان قدر سے ملنے کے لئے گئے۔ اوّل الذکر اپنے چچا شاہ اودھ کے ساتھ رہتے ہیں۔ موخر الذکر نے سرکلر روڈ Circular Road پر ایک مکان لے رکھا ہے وہ بہت با اخلاق آدمی ہیں، اور چونکہ وہ انگریزی نہیں بولتے اور نہ کوئی ترجمان موجود تھا اس لئے تمام تماشا گونگوں کا سا تھا۔

وہاں سے ہم نمائش میں گئے جہاں شیو پرشاد سے ملاقات ہوئی۔ اگرچہ انہوں نے اپنی گفتگو اس فقرہ سے شروع کی کہ مجھے برطانوی نظام سلطنت پسند ہے، تاہم عملاً انہوں نے ہر اس امر کے متعلق شکایت کی جس کے بارہ میں دوسرے لوگ شاکی نظر آتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ انگریز ہماری ضروریات سے ناواقف ہیں، وہ ہم پر زیادہ ٹیکس لگاتے ہیں، اور لگان میں سال بسال اضافہ کرتے جاتے ہیں، ہم اپنی زمینوں میں لگان کا اضافہ کرائے بغیر کوآن تک نہیں کھود سکتے، لیکن ان کے آنے سے پیشتر ہندوستان میں اتنا امن نہ تھا جتنا کہ اب ہے، انہوں نے کہا کہ اس برکت کے باعث وہ جس قدر بھی چاہیں ہماری کھال کھینچ سکتے ہیں۔ جب تک سطح اور جسم کا تعلق ہے اور ہمارے جسموں کے ڈھانکنے کیلئے چھوڑا باقی ہے ہم ان کے شکر گزار رہیں گے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ٹیکسوں میں استقامت پیدا ہوجائے۔ خواہ ان کی مقدار پچاس فی صدی ہو یا ۸۰ فی صدی یا ۹۰ فی صدی ہی کیوں نہ ہو لیکن یہ نہ ہونا چاہیئے کہ جہاں ہم نے ذرا سا زمین درتی کا کام کیا اسی وقت انہوں نے لگان بڑھا دیا، چونکہ ان کے خیالات قوم کے خلاف ہیں اس لئے لوگوں نے ان کے دھن میں ان کا مجسمہ بنا کرا سے آگ لگا دی تھی۔ اس سے ہندوؤں کی وفاداری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

انجمن اسلام کا جلسہ بہت بڑی کامیابی ثابت ہوا۔ تقریباً دو سو شخص موجود تھے، عبداللطیف کے صاحبزادے کے سوا باقی سب ہندوستانی لباس میں تھے، جلسہ کی ابتدا فرید الدین کی تقریر سے ہوئی جنھوں نے اردو میں اظہار خیالات کیا یہ پرانی وضع کے آدمی ہیں لیکن ذہنی قابلیت اعلیٰ ہے، انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی خامیوں پر روشنی ڈالی اور "مستقبل اسلام" سے چند اقتباسات سنائے جن میں اصلاحات کا خاکہ درج تھا، اور ایرن کی عربی زبان سے واقفیت رکھنے کا ذکر کرتے ہوئے، تمام مسلمانوں سے ان کی تقلید کرنے کی درخواست کی (ہم دونوں جلسوں میں شریک تھی) اس کے بعد انہوں نے یونیورسٹی کا ذکر کیا، ان کی اسپیچ بہت پسند کی گئی، عبداللطیف نے اپنی تقریر میں سرسید اور ان کے ہمخیال لوگوں پر حملے کئے اس کے بعد میں نے تقریر کی جس کے ایک ایک فقرہ کا ترجمہ عبداللطیف کرتے جاتے تھے ایسی حالت میں کوئی شخص زیادہ فصاحت نہیں برت سکتا میں نے اپنا سفر کا حال بیان کرتے ہوئے بتایا کہ مدراس کے مسلمانوں نے شکایت کی تھی کہ ہماری انگریزی تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں ہے اور نہ مذہب کی تعلیم دینے والا کوئی شخص موجود ہے، میں نے انگلستان کے کیتھولک باشندگان سے مقابلہ کرکے بتایا کہ ان لوگوں نے مذہبی بنیاد پر کالج اور یونیورسٹی قائم کرنے میں کس قدر کوششیں کی ہیں۔ اس کے بعد میں نے مصری قوم پرستوں کے خیالات کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ ازہر کی تعلیم کو وسعت دینے اور اس کی اصلاح کرنے کے متعلق کیا کیا تجاویز رکھتے ہیں، اور پھر کہا کہ چونکہ مصر کے واقعات نے اس خیال کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالدی ہے اس لئے ہندوستان کو اس کی تکمیل کا بیڑا اٹھانا چاہیئے، پھر یونیورسٹی کا خاکہ پیش کرتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ ایسے مقام میں قائم کرنی چاہیئے جہاں ضروریات زندگی سستی ہوں اور جو مرکز میں واقع ہو، تاکہ وہ ہندوستان بھر کی ضروریات کی کفیل ہوسکے۔ میں نے

حیدرآباد کا نام اس لئے پیش نہیں کیا کہ خود نظام کی جانب سے یہ تحریک پبلک کے سامنے آنی چاہئیے۔ میں نے اس کے بعد اُن رؤسا سے جو جلسہ میں موجود تھے، چندہ کی اپیل کی اور کہا کہ آپ لوگ مذہبی کام سمجھ کر اسے انجام دیں تاکہ اس کا ثواب نہ صرف اس دنیا میں ملے بلکہ عقبیٰ میں بھی، میں نے اُن سے خاص خاص پروفیسر شپ کے لئے روپیہ وقف کرنے کے لئے کہا اور اپنی طرف سے بھی تاریخ کی پروفیسر شپ کے لئے روپیہ وقف کرنیکا ارادہ ظاہر کیا، پھر میں نے اُن کے تپاک آمیز استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ جب میں ہندوستان آیا تھا اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ مسلمان میری ہمدردی و اخلاص کو سمجھ سکیں گے، لیکن یہاں آنے پر جو نتائج برآمد ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں، میں نے یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ اگر ضرورت پڑی تو میں اُن کے مقاصد کی خاطر اپنی جان تک دے دینے سے دریغ نہ کروں گا، اور ساتھ ہی اُن سے درخواست کی کہ جب میں چلا جاؤں تو آپ لوگ مجھے یاد رکھیں جس طرح سے کہ میں آپ سب کو یاد رکھوں گا۔

۲ جنوری ــــــــ شیخ عبدالرحمن ابن حسن (جدیدہ) ملنے کے لئے آئے، نجد کے گھوڑوں کے متعلق قیمتی معلومات بہم پہنچائی۔ یہ گھوڑے سُرخی لئے ہوئے بھورے رنگ کے ہوتے ہیں اور قد درمیانہ ہوتا ہے، وہ حجاز کے گھوڑوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ایک دو سال کا ذکر ہے کہ شریف (علی ابن محمد البراد) نے ایک لڑکے کو ترکوں سے یرغمال کے طور پر جدیدہ میں قید کر دیا تھا، اس کے والد نے چند آدمی گھوڑیوں کے ساتھ خفیہ طور پر وہاں بھیجے جنھوں نے لڑکے کو لڑکی کا لباس پہنا کر قید خانہ سے باہر نکال لیا، وہ راستہ میں کہیں ٹھیرے بغیر ابو الرئش کے مقام تک پہنچ گئے جو ۱۵۰ میل کی مسافت پر ہے، لڑکا اور دوسرے آدمی پانچویں دن ان گھوڑیوں پر سوار ہو کر منزل مقصود تک پہنچ گئے ان گھوڑوں کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ پانچ چھ ہزار روپیہ میں بھی نہیں خریدے جا سکتے۔ لیکن اگر شریف سے ملنے کیلئے جائیں تو وہ ضرور ایک گھوڑا آپ کی نذر کر دیں گے۔ بوڑھے آدمی نے مجھے اپنے وطن آنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی اپنی جیب میں سے ایک نظم نکال کر پڑھنی شروع کر دی جس میں امداد کی درخواست کی گئی تھی اور بتایا گیا تھا کہ مجھے اپنے تین بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مکان بنانے کیلئے روپیہ چاہئیے میں نے اسے سو روپیہ دیکر رخصت کر دیا۔

قاضی رضا حسین آئے۔ یہ پٹنہ کے قاضی ہیں اور ہمیں اپنے وطن آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ راجہ نیل کرشنا ہمیں اس جلسہ میں شریک ہونیکی دعوت دینے آئے جو اُن کے والد کے مکان پر ہندوستانی تعلیم کے متعلق ہفتہ کے دن ہوگا۔ وہ بہت مایوسی کے ساتھ ذکر کرتے تھے کہ لارڈ ڈرین نے ہمیں کوئی عملی امداد نہیں پہنچائی، اُنہوں نے کہا کہ آزادی، انصاف، اور سلف گورنمنٹ کے بارے میں ہمیں تعلیم دینے کی ضرورت کیا تھی جبکہ ہمیں ان تینوں چیزوں میں سے ایک بھی میسر نہیں،

۳ سہ پہر کو مسٹر البرٹ سے ملنے کے لئے گئے، لیکن اُن کے خاوند گھر میں نہ تھے۔ ہنٹر ([illegible]) جو شمار و اعداد معلوم کرنے میں ماہر ہیں، اتفاق سے موجود تھے، میں نے جب لگان آراضی کے متعلق اُن کے دئیے ہوئے اعداد کے متعلق سوال کیا تو کہا کہ وہ بالکل درست ہیں، لیکن صوبہ مدراس کے اعداد میں نے سرکاری رپورٹوں سے نقل کر دیے ہیں۔ لیکن انہیں ذاتی طور پر مدراس کا کچھ علم نہیں، انہوں نے تسلیم کیا کہ دکن کا لگان آراضی ہمارے نظام ہند پر ایک دھبہ ہے، میں نے کہا کہ بہت بڑا دھبہ، اس لئے کہ دکن نصف ہندوستان ہے پھر انہوں نے مجھے مسٹر کونٹن ([illegible]) سے ملایا جو لگان کے ماہر بتائے جاتے ہیں۔ لیکن اُنہیں بھی مدراس کی کچھ خبر نہ تھی اور وہ نکی ساری

معلومات بنگال، صوبجات شمالی مغربی تک محدود تھی، میں نے اُن سے کہا کہ ہر ہندوستانی کا خیال ہے کہ مجموعی پیداوار پر جو لگان لیا جاتا ہے اُس کی مقدار ۵۰ سے ۶۰ فی صدی تک ہے، مگر انہوں نے کہا کہ نہیں، اخراجات وضع کرنے کے بعد جو باقی بچتا ہے اُس پر لگان لیا جاتا ہے، شمالی اضلاع میں جہاں بند وبست دوامی کا عمل دخل نہیں ہے وہاں لگان کا حساب کرایہ کے اُس روپیہ سے کیا جاتا ہے جسے زمیندار وصول کرتا ہے انہیں اتنی خبر نہیں کہ تمام ہندوستان میں زمینداریوں کا وجود نہیں ہے اگر یہ وہاں گورنمنٹ ہی اصلی مالک ہے۔ ہنٹر بلاشبہ قابل آدمی ہے، اور دوسروں کے خیالات معلوم کرنے کا خواہاں رہتا ہے۔ انہوں نے بنگال کے مسئلۂ اراضی سے مجھے پورے طور پر واقف کرانے کا وعدہ کیا ہے[۵۱]۔

رات کو گورنمنٹ ہاؤس میں پارٹی تھی جس میں ہندوستانی اور انگریز دونوں شریک تھے، یہاں مہاراجہ صاحب والی کشمیر سے ملاقات ہوئی، عبداللطیف اور امیر علی مجھ سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے، مگر میں نے عبداللطیف کو اپنے پاس بٹھا لیا، میں نے یونیورسٹی کے بارے میں ان سے باتیں کیں، لیکن وہ تم قسم میں کچھ ناراض سے ہے۔ کہنے لگے کہ ہندوستان میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جو محض مذہبی تعلیم کی پروا کرتا ہو۔ لیکن جب میں نے اُن سے کہا کہ مسلمانوں میں ایسے بہت سے ہیں جو صرف دنیا میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ذرا گھبرا گئے۔ کہنے لگے ایسی یونیورسٹی کے لئے کوئی چندہ نہیں دیگا، میں نے تعلیمی مقاصد کے لئے چندہ جمع کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔ جب ہم باتوں میں مصروف تھے تو لارڈ رپن ہمارے پاس آ نکلے اور امیر علی فی الفور الگ جا کھڑے ہوئے گویا کہ اُن کا میر سے کچھ بھی واسطہ نہ تھا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ لارڈ رپن مجھ سے باتیں کرنے کے لئے رک گئے ہیں تو انہوں نے زیادہ اخلاق کا اظہار کیا، بعد میں میں نے انہیں حیدرآباد کی اسکیم کا خاکہ پیش کرنے کی کوشش کیا۔ اُن کا پہلا اعتراض یہ تھا کہ ریاست حیدرآباد تباہی کے قریب آگئی ہے، لیکن میں نے اُن سے کہا کہ اس کی حالت عنقریب درست ہو جائیگی، اور یہ کہ نظام بھی یونیورسٹی سے دلچسپی رکھتے ہیں یہ سنتے ہی انہوں نے کہا کہ اگر یہ واقعہ ہے تو یونیورسٹی کامیاب ہو گی اور ہر طریقہ سے اس کی امداد کے لئے آمادگی ظاہر کی۔

لارڈ رپن بہت اخلاق سے ملے اور امید کی کہ میں آپ کو تخت نشینی کے موقع پر حیدرآباد میں دیکھوں گا۔ سالار جنگ کہتے ہیں کہ نظام یونیورسٹی کی تائید کرنے کے لئے تیار ہیں۔

۴ جنوری ——— ہم گیارہ بجے گورنمنٹ ہاؤس میں گئے تاکہ البرٹ بل کے متعلق بحث و مباحثہ سنیں۔ کارروائی غیر دلچسپ تھی، البرٹ نے بل کی تاریخ بیان کی اور جہاں تک اُن سے ہو سکا مجھوتہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔ مسز البرٹ ہمارے برابر بیٹھی ہوئی تھیں، اس کے بعد ہنٹر نے مالاباری کی تحریرات کے بعض اقتباسات یہ ثابت کرنے کے لئے پڑھ کر سنائے کہ ہندوستان کی رائے عامہ مجھوتہ کو پسند کرتی ہے میں نے بعد میں اُن سے پوچھا کہ کیا واقعی آپ کا یہ خیال ہے کہ ہندوستانی رائے مجھوتہ کی تائید میں ہے، تو انہوں نے اس کا جواب اثبات میں دیا۔ اس کے بعد امیر علی نے اپنی رائے کا اظہار کیا میرے خیال میں ان کی تقریر بہترین تھی، اور مجھے دیکھکر یہ تعجب ہوا کہ یہ اسپیچ اُن کی نجی کی گفتگو سے کس قدر مختلف تھی، انہوں نے ملکۂ معظمہ کے اعلان کا کچھ حصہ پڑھ کر سنایا جس کا اچھا اثر پڑا اور کہا کہ مسودۂ قانون جب منتخب کمیٹی کے روبرو آئے گا تو اُس وقت میں مجھوتہ کے متعلق اعتراضات پیش کروں گا، انہوں نے بعد میں مجھ سے کہا کہ مجھ سے یہ وعدہ کر لیا گیا تھا کہ اگر آپ مجموعی طور پر بل کی تائید کریں گے تو آپ کی ترمیمات پر

---

[۵۱] سر ولیم ہنٹر کی چٹھی ضمیمہ میں درج ہے

توجہ کی جائے گی، میرا خیال ہے کہ اگر وہ اپنے پورے خیالات کا اظہار کر دیتے تو بہتر ہوتا۔ کرسٹو داس پال بالکل مایوس ثابت ہوئے۔ اُن میں اتنی ہمت نہ تھی کہ یہ بیان کرتے کہ لوگ اس بل سے کس قدر ناراض ہیں، ہنٹر نے کہا کہ ہم نے بڑی مشکل سے انہیں اپنے ساتھ ملایا ہے، اس کے بعد بل کے لئے کارروائی ملتوی کر دی گئی دوبارہ مجتمع ہونے پر کسی نے یہ بات پیدا کی کہ مسودۂ قانون کی ایک دفعہ دو مختلف معنی رکھتی ہے، اس پر دوپہر کے لئے کونسل ملتوی کر دی گئی۔ نظام اپنے امراء سمیت موجود تھے اور کارروائی سے بہت دلچسپی لے رہے تھے۔ میں نے کونسل کے کئی ممبروں سے گفتگو کی سب کا یہی خیال ہے کہ ہندوستانیوں میں کوئی جوش و خروش موجود نہیں ہے یہ لوگ اس وقت تک کچھ نہیں دیکھتے جب تک کہ آگ نہ لگ جائے۔

بعد میں ہم بیلویڈیر گئے جہاں ایک پارٹی تھی اور حیدرآباد والے بھی سب کے سب موجود تھے۔ آخر کار مجھے تنہائی میں نظام سے پانچ منٹ کے لئے گفتگو کرنیکا موقع مل گیا، میں نے اُن سے درخواست کی ہے کہ آپ یونیورسٹی کی تحریک کا اجرا کریں، آپ ہندوستانی مسلمانوں کے لیڈر ہیں، اور وہ اپنی نجات کے لئے آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں، انھوں نے نہایت پختہ وعدہ کر لیا ہے اور میں نے اشارہ کر دیا ہے کہ جب وائسرائے گدی نشینی کی رسم ادا کرنے آئیں گے تو میں اس وقت وائسرائے سے اس کا ذکر کروں گا، اور یہ کہوں گا کہ نظام اپنی تخت نشینی کے موقع پر تعلیمی مراعات کا اعلان کرنا چاہتے ہیں، میں نے اُن سے درخواست کی ہے کہ وہ لارڈ رپن کے سوا اور کسی سے اس کا ذکر تک نہ کریں۔ اس کا بھی وعدہ انھوں نے کر لیا ہے۔

سالار جنگ کی وساطت سے میں یونیورسٹی کا خاکہ پیش کرنے والا ہوں۔ اس طریقہ سے میرے ہندوستان آنے کا مقصد حیرت انگیز طریقے سے پورا ہوا ہے الحمد للہ شاہزادہ فرخ شاہ سے بھی اس مضمون پر گفتگو رہی۔ یہ امیر علی کے بہت مداح ہیں، امیر علی کی طرح انھوں نے بھی اسے ناقابل عمل بتایا، لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ چند بڑے بڑے آدمیوں کی تائید حاصل ہو چکی ہے تو انہیں بھی کچھ دلچسپی ہوئی، وہ بھی بالکل یورپین نظر آتے ہیں، مگر انگریزی ٹوپی کی بجائے سیاہ ٹوپی پہنتے ہیں، یہ نہایت شائستہ اور سمجھدار شخص ہیں، افسوس ہے کہ عبد اللطیف سے ان کی بول چال بند ہے اور وہ دونوں کسی کام میں شریک نہیں ہو سکتے، اثنائے گفتگو میں عبد اللطیف آ گئے اور میں نے دیکھا کہ شاہزادہ فرخ شاہ نے اُن سے بات تک نہیں کی، بلکہ اپنا منہ تک پھیر لیا واقعی دونوں بیوقوف ہیں۔

۵ جنوری ـــــــ عبد اللطیف کے داماد سید محمد آئے ہم نے شیعہ سنی کے سوال پر بحث کی وہ سمجھتے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی مخالفت پائی نہیں جاتی، شیعہ صرف سو میں پانچ ہیں لیکن ہیں سب کے سب با اثر، مثلاً شاہ اودھ اور پرنس فرخ شاہ، میں نے پوچھا کہ کیا شیعہ امیر علی کو پسند کرتے ہیں؟ کیونکہ وہ بھی شیعہ ہیں! انھوں نے کہا کہ حالت اس کے برعکس ہے، انھوں نے پھر بنگالی مسلمانوں کی تعلیم کا حال بتایا۔ ۶ برس کی عمر میں وہ ورنیکولر اسکول میں داخل ہوتا ہے جہاں صرف بنگالی سکھائی جاتی ہے، پھر وہ کلکتہ کے مدرسہ میں تین سال تک تعلیم پاتا ہے جہاں انگریزی کی تعلیم چار گھنٹہ روزانہ اور عربی، فارسی یا اردو، بنگالی کی گھنٹہ بھر، پندرہ سولہ برس کی عمر میں انٹرنس پاس کرکے یونیورسٹی میں داخل ہو جاتا ہے، ان میں سے کہیں بھی اسے مذہب کی تعلیم نہیں دی جاتی، ورنیکولر اسکول میں استاد بالعموم ہندو ہوتا ہے، مدرسہ کے عربی فارسی پڑھانیوالے اساتذہ بالعموم مولوی ہوتے ہیں جنھیں گورنمنٹ مقرر کرتی ہے، اور جو عام طور پر نہایت وفادار مولوی ہوتے ہیں، یونیورسٹی کی ساری تعلیم انگریزی کے ذریعہ دی جاتی ہے، یہاں تک کہ جو طلبہ تمام نصاب پورا کر لیتے ہیں وہ اس زبان کے سوائے اور کوئی زبان ایسی اچھی طرح نہیں جانتے کہ اس میں بے تکلف لکھ پڑھ سکیں اس طریقہ سے وہ باقی مسلمانوں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں جنھیں وہ حقارت کی نظر سے دیکھنے لگ جاتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ ۹۹ فیصدی لوگوں پر انکا اثر ہو جاتا ہے۔

محمد یوسف بھی ہماری گفتگو میں شامل ہو گئے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں اپنے لڑکے کو انگلستان کے کونسے اسکول میں بھیجوں۔ میں نے کہا کہ ایسے زمانہ میں انگلستان جانے میں کوئی ہرج نہیں ہے جبکہ خیالات قائم ہو چکے ہوں، ورنہ چھوٹی عمر میں بھیجنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا مذہب جاتا رہیگا۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں عنقریب قسطنطنیہ جانیوالا ہوں جہاں میں سلطان المعظم سے کہونگا کہ اپنے زیر سرپرستی مذہبی اصلاحات کا نفاذ کریں۔ سب نے نہایت گرمجوشی سے اس خیال کو پسند کیا۔

مولوی الف ایم خدا حافظ کہنے کیلئے آئے، ایک نوجوان مسلمان طالبعلم سید محمد نے کہا کہ اگر جمال الدین بہ حیثیت پروفیسر آجائیں تو تمام مسلمان طالب علم یونیورسٹی کو لبیک کہیں گے، طلبہ جمال الدین کی پرستش کرتے ہیں۔

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ کارڈری کی آمد کی اطلاع ملی۔ باقی سب لوگ چلے گئے۔ مجھے کارڈری پر رحم آتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام رہ گئے۔ میں نے آتے ہی اُن سے اس گفتگو کا اعادہ کر دیا ہے جو لارڈ ریڈنگ سے ہوئی تھی، ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ میں ان کے گھر میں قیام کر چکا ہوں اور انہیں ان تمام معاملات سے بیخبر رکھنا برائی کی بات ہوتی، وہ کہتی ہیں کہ اسٹیٹسمین میں جو مضمون شائع ہوا ہے وہ یقیناً لائق علی کے قلم کا ہے، لیکن میں نے انہیں یقین دلایا ہے کہ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہے وہ انکا نہیں، میرے خیال میں لائق علی بھی ایسی احمقانہ کارروائی نہیں کرتے، بالخصوص جبکہ میری زبانی انہیں معلوم ہو چکا ہے کہ لارڈ ریڈنگ ان سے پوری پوری گفتگو کریں گے اور یہ کہ وہ انکی نسبت اچھے خیالات رکھتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے انہیں نقصان پہنچ جائیگا، کیونکہ بعض باتیں ایسی ہیں جو صرف انہیں سے معلوم ہو سکتی ہیں اور وہ غالباً انہیں آخری وقت تک شائع کرانا نہیں چاہیں گے۔ میں کل یہ لکھنا بھول گیا کہ مسٹر کلارک کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ نظام نے وائسرائے سے لائق علی کو دیوان مقرر کرنیکی درخواست کی ہے اور یہ کہ یہ معاملہ بالکل طے شدہ سمجھنا چاہئیے سالار جنگ اور وقار الامراء کے ظاہری ڈھنگ اور رویہ سے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسٹوارٹ بیلی نے میرے متعلق اُن سے کہدیا ہے کہ یہ شخص خطرناک ہے اور حکومت ہند یہ نہیں چاہتی کہ آپ لوگ اس کی صحبت میں شریک ہوں یہ بات مجھے اس وقت کھٹکی جب میں نظام کو پہنچانے اسٹیشن پر گیا، اسٹیشن پر سالار جنگ مجھے دکھائی نہیں دیے، ورنہ میں اُن سے بالضرور گفتگو کرتا۔ بہرحال حیدرآباد جانیکا فیصلہ کرنے سے پیشتر میں انہیں خط لکھونگا تاکہ یہ شبہ صاف ہو جائے۔ ہم نے کلارک کے ساتھ ٹھیرنے کا ارادہ کیا تھا مگر کارڈری نے ریزیڈنسی میں ٹھیرنے پر کہا ہے اور اس لئے میں نے کلارک سے معذرت کا اظہار کر دیا ہے۔ حیدرآباد سازشوں کا مرکز ہے اور میں وہاں اس وقت تک نہ جاؤنگا جبتک کہ مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ میرے جانے سے یونیورسٹی کی تجویز کو فائدہ پہنچیگا۔ چار بجے ہم ڈبیٹنگ کلب [illegible] میں گئے اور وہاں ڈاکٹر گھوش اور بنیرجی کی تقریریں سنیں۔ بنیرجی غضب کا مقرر ہے انہوں نے اپنی تقریر کے ہر نکتہ پر فاضلانہ طریقہ سے بحث کی، باقی کارروائی غیر دلچسپ تھی۔

۶ جنوری ——— آج کلکتہ میں ہمارا آخری دن ہے عبد اللطیف سے طویل گفتگو رہی، انہوں نے حیدرآباد جانے اور یونیورسٹی کی ابتدا کرا دینے پر زور دیا ہے اور ساتھ ہی کلکتہ کے تمام مسلمانوں کی عمدہ خواہشات کا یقین دلایا ہے، وہ ریکو اسٹیشن پر پہنچانے آئے تھے۔ میں انجمن اسلام والی اسپیچ کو ٹائمز Times میں بھیج رہا ہوں تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے میرے خیالات کی تائید کی ہے۔

ہنٹر سے بھی ملنے کیلئے گئے، وہ ناراض ہیں کہ میں نے ٹیکس کی زیادتی کے متعلق لب کشائی کیوں کی۔ انکی کتاب کو گورنمنٹ نے بالکل پسند نہیں کیا یہانتک کہ شمار اعداد کے عہدے سے بھی انہیں علیحدہ کر دیا ہے، لارڈ ریڈنگ انہیں ایک سے زیادہ مرتبہ طلب کر چکے ہیں اور ان سے کہا ہے کہ کونسل میں اپنے سخت لہجہ کو ذرا معتدل کر دیں۔ اسٹیشن جاتے وقت ہم امیر علی کے یہاں بھی ہوتے گئے، لیکن معلوم ہوا کہ وہ بخار میں مبتلا ہیں، بہ حیثیت مجموعی مجھے اپنے سفر کلکتہ کی جانب سے کامل اطمینان ہے۔

(باقی باقی)

ض۔ ا۔ ب

اعانتِ مجرمانہ

اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء کی اندھیری رات میں عابد اپنے بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا۔ اتنے میں ایک بار سیٹی کی آواز سنائی دی۔ یہ سراغرسان آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کے لئے اسی قسم کی سیٹی کا استعمال کرتے تھے۔ عابد نے دوسری مرتبہ سیٹی کی آواز سن کر سرہانے سے کنجیوں کی زنجیر نکال کر جواب میں سیٹی بجائی اور باہر نکل آیا۔ محمد ایک سیاہ کوٹ اور سیاہ ایرانی ٹوپی پہنے ہاتھ میں ہنٹر لئے سائیکل کو دیوار سے لگائے کھڑا ہوا تھا۔ قبل اس کے کہ عابد کچھ پوچھے پراسرار لہجے میں محمد نے کہا "تم کپڑے پہن لو"۔ "کیا سائیکل پر چلنا ہوگا" عابد نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کے جواب میں محمد نے سر ہلا دیا اور ایک گہری سوچ میں چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد عابد ایک ہاتھ میں سائیکل سنبھالے دوسرے ہاتھ سے فراک کوٹ کی گھنڈیاں لگاتا ہوا گھر سے نکلا اور بغیر کچھ کہے سنے دونوں سائیکل پر سوار ہو گئے۔ دس منٹ تک اندھیری گلیوں میں گزرنے کے بعد سڑک پر پہنچے تو برقی روشنی نے آنکھیں خیرہ کر دیا۔ تھوڑی دیر کے لئے محمد کے خیالات منتشر ہو گئے اور اسی کے ساتھ گھنٹہ گھر کی بڑی گھڑیال نے دس بجا دیئے۔ "اوہ دس بج گئے" محمد نے تعجب سے کہا۔ مگر عابد نے اس کا جواب نہیں دیا۔ "وقت گزر رہا ہے اور کام بہت سا"۔ محمد نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج کونسا ضروری کام ہے"۔ عابد نے جیب سے پان نکالتے ہوئے کہا۔ اور پھر بیڑہ چبانے کے بعد لونگ پھینکتے ہوئے کہنے لگا "مدد کہ کوئی ضروری ہدایات ہی ہیں"۔ محمد نے سنجیدگی سے عابد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ایک خانگی کام ہے"۔ "اخاہ تو آج کسی مشاعرے میں جانا پڑیگا" عابد نے قہقہہ لگا کر کہا۔ محمد نے بجائے جواب دینے کے سائیکل کی رفتار کم کر دی اور خود اتر پڑا اور ایک مسجد کی دیوار سے سائیکل لگا کر کھڑا کر کے خود مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ اور عابد بھی سائیکل رکھ کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ محمد نے چاروں طرف بڑی احتیاط سے دیکھ کر کہا "عابد! تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو"

عابد　تمہارے لئے؟ یہ تم کس حیثیت سے کہتے ہو:

محمد　میں صرف ایک دوست کی حیثیت سے سوال کر رہا ہوں؛

عابد　(مسکراتے ہوئے) ایک قتل؛

محمد　کس کا؟

عابد　خواہ کسی کا ہو مگر عابد تمہارے لئے قاتل بن سکتا ہے؛

محمد　خیر معاملہ کی باتیں کرو۔ مجھے تمہاری دوستی پر بھروسہ ہے آج تک میں نے تم کو بڑا بھائی سمجھا، کیا تم مجھے کسی قسم کی مدد دے سکتے ہو؟

عابد　ممکنہ امداد کے لئے ہر طرح تیار ہوں خواہ اس پر میرا کتنا ہی نقصان کیوں نہو؛

محمد　عابد تم تو قسم کھانی پڑیگی!

عابد　وہ شخص جس نے تین سال تک تمہارے ساتھ راست بازانہ سلوک کیا ہو کیا اس قدر ذلیل ہے کہ تم اسے حلف اٹھانے پر مجبور کرو، خیر میں قسمیہ

وعدہ کرتا ہوں کہ خواہ کسی معاملہ میں ہو تمہاری ممکنہ امداد کروں گا۔

محمد — مجھے تمہارا اطمینان ہے، سنو میں ایک جرم کا ارتکاب کرنا چاہتا ہوں، آج تک میں کسی جرم کا مرتکب نہیں ہوا، مگر آج مجبور ہوں، کیا تم میرے شریک ہوگے؟

عابد — گھبراؤ نہیں تم جس جرم کے مرتکب ہوگے اعانتِ مجرمانہ میں میرا نام بھی ہوگا؛ جب ہم مل کر سرکار کے قانون کی پابندی کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مل کر قانون شکنی نہ کریں۔

محمد نے کھڑے ہو کر عابد کا ہاتھ تھام لیا اور زور سے دبا کر کہنے لگا "میر چوک میں بندو علی کے کارخانہ سے تمہیں کرایہ کی بگھی مل سکیگی، تم اپنی سائیکل وہیں چھوڑ دو، سائیس کی ضرورت نہیں گاڑی تمہیں چلانی پڑے گی، محمد اور عابد دونوں نے اپنی اپنی قندیلیں روشن کیں اور محمد گلی میں، عابد سڑک کی طرف روانہ ہوگئے۔

عابد ایک نیک طینت نوجوان سی۔ آئی۔ ڈی انسپکٹر تھا، چونکہ اس کی امیدواری کے زمانہ میں محمد نے اس کا ساتھ دیا تھا، اور اپنے ہمراہ رکھکر سی آئی ڈی کے نکات سمجھائے تھے اس لئے وہ محمد سے بہت مانوس تھا، ایک سال تک عابد نے امیدوارانہ حیثیت سے انسپکٹر محمد کے ساتھ کام کیا، اور پھر اس کے بعد وہ بھی انسپکٹر ہوگیا، دونوں انسپکٹر ہو چکے تھے مگر ہمیشہ مل کر کام کرتے تھے، عابد سی آئی ڈی کا ایک قابل اور کارگزار انسپکٹر تھا، تین سالہ مدت ملازمت میں اس نے اتنی شہرت حاصل کر لی تھی، جو دوسروں نے بیس بیس سال میں بھی نہ پائی، اس کو معمولی سرقہ کی واردات میں مزہ نہ آتا تھا، وہ ہمیشہ ہیبت ناک اور پُرخوف جرائم کی سراغرسانی کی فکر میں رہتا، وہ سیاسی جرائم کا سراغ لگانا چاہتا تھا، اس نے اپنی مدتِ ملازمت میں شاید چند مہینے ہی مستقر گزارے ہوں گے ورنہ وہ ہمیشہ باہر کے مقدمات کی تفتیش کے لئے چلا جاتا، بلکہ بعض اوقات لوگ خواہش کرکے اپنے مقدمات کے لئے عابد کو بلواتے تھے۔

ٹھیک گیارہ بجے عابد ایک بند گاڑی چلاتا ہوا آیا، محمد مسجد کے پاس اس کا منتظر تھا، اس کو دیکھتے ہی وہ سائیکل پر سوار ہو کر آگے ہوگیا پیچھے پیچھے عابد گاڑی چلانے لگا، آدھے گھنٹہ تک اندھیری گلیوں میں چکر کاٹنے کے بعد محمد نے کہا "اسی راستہ سے واپس چلنا ہوگا" اور خود سائیکل بڑھا کر نکل گیا۔ عابد نے بڑی دقت کے ساتھ بگھی پلٹائی اور خود اتر کر زمین پر کھڑا ہوگیا، جس وقت بگھی کے کوچ بکس پر سے اتر رہا تھا ایک شخص شراب کے نشہ میں جھومتا ہوا، اور کچھ فحش اشعار گاتا ہوا بگھی کے پاس سے گزرا اور آگے بڑھ کر ایک چھوٹے سے مکان کے دروازہ پر پہنچ کر چلانے لگا، عابد نے اس کی طرف غور سے دیکھا مگر وہ شخص مکان میں داخل ہو چکا تھا؛ اور ایک عورت دروازہ میں سے جھانک رہی تھی جسے دیکھکر عابد نے منہ پھیر لیا؛ اور تھوڑی دیر کے بعد اس طرف دیکھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا۔

ٹھیک بارہ بجے محمد نے واپس آکر عابد کو سائیکل دی اور چلا گیا، عابد نے سائیکل کو توڑ کر بگھی میں رکھدیا، یہ نئی وضع کی سفری سائیکل تھی جو دو اسکرو کے کھولنے سے دو ٹکڑے ہو کر آپس میں مل جاتی تھی، عابد نے سائیکل رکھ کر بگھی کی دونوں قندیلیں روشن کیں مگر جب وہ دوسری قندیل روشن کر رہا تھا تو اس کی نظر دروازہ پر پڑی جس میں وہی عورت کھڑی دیکھ رہی تھی۔ عابد نے اسے دیکھکر منہ پھیر لیا، اور جیب سے سگرٹ کیس نکال کر سگرٹ پینے لگا۔ سگرٹ ختم کرکے عابد پلٹا تو دروازہ بند تھا، اس نے آگے بڑھکر کنڈی چڑھائی اور بگھی کے پاس آکر گھوڑے کو تھپکنے لگا، تھوڑی دیر کے بعد محمد ایک برقعہ پوش

کو لئے ہوئے آپہنچا، اُس کے ہاتھ میں ایک رنگین پوٹلی تھی اور دونوں کا سانس پھول رہا تھا، عابد نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا، محمد نے پہلے پوٹلی ٹمٹم میں رکھی اور پھر برقعہ پوش کو سوار کرا کے خود بھی بیٹھ گیا، عابد نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دروازہ کی کنڈی کھول دی، مگر جب عابد واپس آیا تو انسپکٹر محمد نے ٹمٹم کی کھڑکی میں سے سر نکال کر اُس کے کان میں کچھ کہا، اور پھر آئینہ چڑھا لیا، عابد نہایت ہی متانت سے مڑا اور کوچ بکس پر جا بیٹھا، اور ٹمٹم چل پڑی، ایک گھنٹہ تک راستہ چلنے کے بعد ایک تنگ گلی میں ٹمٹم رکی، اور محمد اتر کر ایک سفالی مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا جسے ایک بوڑھی نے کھول دیا عابد نے سائیکل نکال کر باہر رکھ دی اور محمد نے پہلے برقعہ پوش کو مکان میں پہنچایا، پھر سائیکل اور پوٹلی لے کر عابد کے کان میں کچھ کہا اور مکان میں داخل ہو گیا

محمد ایک پینتیس سالہ تجربہ کار سیاہ فام بلند و بالا جوان تھا، یونی فارم میں جسے وہ شاید ہی کبھی پہنتا ہے بڑا معصوم ہوتا تھا، مگر معمولی لباس سے چنداں بد نما ظاہر نہ کرتا تھا، وہ دس برس سے سی آئی ڈی انسپکٹر تھا اور اپنی نمایاں خدمات کے صلہ میں کئی بار انعامات اور گزشتہ سال ہی کنگس پولس میڈل بھی حاصل کر چکا تھا، اس کی شادی کوئی دس گیارہ برس قبل ہی ہو چکی تھی ایک لڑکا اور ایک لڑکی (۹) اور (۷) سالہ عمر کی تھی، اس نے کبھی کسی کے حسن کی تعریف نہ کی تھی۔ اگر وہ اپنی ضرورت کے لحاظ سے کسی حسین عورت سے چند دن کے لئے خلا ملا بھی پیدا کرنا چاہتا تھا تو بڑی تکلیف محسوس کرتا بلکہ اکثر اوقات اپنی بلا عابد کے سر ڈال دیتا تھا، گو اس کے تعلقات عابد سے برادرانہ تھے، مگر بعض باتیں ایسی بھی تھیں جن کی عابد کو مطلق خبر نہ تھی، گو وہ عابد کو شریک کار سمجھتا تھا، مگر اُسے رازدار کبھی نہ بناتا تھا، اس کے گھر کی کوئی بات عابد سے چھپی نہ تھی۔ مگر وہ اپنے دلی منشا سے کبھی باخبر ہونے نہ دیتا تھا!

عشق واقعی بُری بلا ہے، مجرد ہی نہیں بلکہ سلسلۂ ازدواج کے مسلسل قیدی بھی اس پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ سادہ دل اور ناتجربہ کار نوجوان ہی نہیں بلکہ بدباطن سیاہ دل سی آئی ڈی آفیسر بھی اس میں گھر جاتے ہیں، وہ ہستیاں کتنی خوش نصیب ہیں جو اس جذبہ سے متاثر نہیں ہوتیں، وہ انسان کتنا خوش قسمت ہے جو اس دائرہ میں نہیں آتا ـــــــ مگر نہیں نہ تو اس کے پہلو میں دل ہے اور نہ دل میں احساس ۔۔۔۔۔

دوسرے دن صبح کو عابد گھر سے نکل رہا تھا کہ انسپکٹر محمد آپہنچا، محمد کی آنکھیں فرطِ تشکر سے جھکی ہوئی تھیں، وہ عابد کا ممنون اور اس سے شرمندہ تھا۔ عابد نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھا "اب تو گھر پر ہنگامہ ہوگا، ہاں ذرا وہاں کی خبر بھی لینا چاہئے۔" "سنا ہے کہ گھر پر ماتم ہو رہا ہے، تم ہو آؤ تو مناسب ہے۔ میں مکان پر ٹھہرتا ہوں"

عابد اور محمد دونوں ٹہلتے ہوئے نکلے اور تھوڑی دیر کے بعد دونوں علیحدہ ہو گئے، عابد نہایت ہی احتیاط سے گلی میں مڑ گیا، اس نے پہلے مسجد کو غور سے دیکھا، اور پھر آگے بڑھ کر اس مکان کے پاس رکا جس میں سے رات کو عورت جھانک رہی تھی، مگر اس دروازہ پر قفل لگا ہوا دیکھ کر آگے بڑھا، اور کچھ سوچتے ہوئے ایک اونچی سی حویلی کے پھاٹک پر کھڑا ہو گیا ۔۔۔۔۔۔

صدر امین کوتوالی معمولی لباس پہنے بیٹھا ہوا تھا، محلہ کے چند خوش باش لوگ اور بعض خدمت گار وغیرہ اس کے اطراف کھڑے ہوئے تھے، محرر پنچ نامہ لکھ رہا تھا اور ایک عورت کچھ واقعات بیان کر رہی تھی۔

عابد ایک سفید برجس اور نیوی بلوک کا سیاہ کوٹ پہنے ہوئے تھا سر پر سرخ ترکش کیپ تھی، سفید دھاری دار ریشمی قمیص پر اودی ٹائی عجیب بہار دے رہی تھی، عابد بے تکلف پھاٹک میں داخل ہوگیا اور آداب عرض ہے کہتا ہوا، سائیکل سے اتر پڑا، صدر امین نے اٹھ کر مصافحہ کیا اور اسے بٹھا کر "عابد ذرا سننا" کہہ کر ایک نوجوان سانولی عورت کی طرف مخاطب ہوگیا۔ عابد نے کرسی پر بیٹھ کر جیب سے سگرٹ کیس نکالا اور سگرٹ جلاتے ہوئے اس عورت کی طرف دیکھنے لگا، جو صدر امین سے مخاطب تھی اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ وہی عورت جو رات کو دروازہ سے جھانک رہی تھی اور اسے لکھی کے پاس کھڑا ہوا دیکھ چکی تھی صدر امین کے سامنے ہے اور اپنا بیان لکھوا رہی ہے۔ محرر برابر کی کرسی پر بیٹھا بیان لکھ رہا تھا، عابد نے عورت کی طرف سے منہ پھیر کر لکھے ہوئے بیان کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ محرر صرف چار سطریں ہی لکھا تھا جن میں کوئی اہم بات نہ تھی، صدر امین نے پھر عابد سے مخاطب ہوکر سر کھجلاتے ہوئے کہا "عابد ذرا اس کا بیان سنو بڑا پیچیدہ معاملہ ہے"۔ عابد نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور اس عورت کی طرف دیکھنا شروع کیا۔

عورت نے پورا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح لکھی آئی اور یوں ایک نامعلوم آدمی ایک عورت کو بٹھا لے گیا وغیرہ وغیرہ "لکھی چلانے والے کے کپڑے کیا تھے"؟ صدر امین نے پوچھا، عورت کہنے لگی "وہ نوجوان تھا، سیاہ شیروانی، سیاہ ترکی ٹوپی تھی وہ ایک گھنٹہ تک کھڑا رہا اور اتنی دیر میں کم از کم دس بارہ سگرٹ پیے ہوں گے، اس کی جیب میں ایک سنہری کیس اور سفید چاندی کی کاڑیوں کی ڈبیہ تھی" "کیا تم کو اس کا حلیہ یاد ہے" صدر امین نے کہا، عورت تعجب کے ساتھ عابد کی طرف دیکھ رہی تھی کہنے لگی "بالکل ایسی ہی صورت تھی، مگر کپڑے یہ نہ تھے، میں قسم کھا کر کہوں گی ہاں ہاں سرکار! یہی بالکل یہی ہے، دیکھئے نا ان کے ہاتھ پر وہی گھڑی ہے جو کل رات کو چمک رہی تھی، یہی سونے کی انگوٹھی ہاتھ میں تھی، مجھے لال نگ کا ایک خیال ہے"

عورت کہنے لگی، پہلے تو عابد گھبرا گیا، مگر پھر ایک طویل قہقہہ لگا کر اطمینان کے ساتھ جیب سے سگرٹ کیس نکال کر عورت کی طرف بڑھایا اور قلم تھامنگا۔ یہ ٹر یہی، پھر کلائی سے سنہری رسٹ واچ اتار کر اس کی طرف پھینک دی اور کہنے لگا یہی گھڑیال تھی تا جو رات کو چمک رہی تھی، اور کیس بھی یہی تھا؟ وہ کہنے لگی میں یہ کیس نہیں تھا، مگر گھڑیال یہی تھی اور اس کے کانٹے چمک رہے تھے۔ عابد نے مسکراتے ہوئے کہا دیوانی اس میں ریڈیم ہی نہیں ہے سیاہ کانٹے بھی کہیں رات کو چمکتے ہیں۔

صدر امین نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا "عابد تم یہاں کیسے آگئے تھے عجیب معاملہ ہے" "بھئی میں خود پریشان ہوں کل رات تو میں سکندرآباد تھا" عابد نے متفکرانہ انداز سے کہا۔

تماشے یہ خبر اندر کس نے پہنچا دی کہ ایک بڈھے میاں برق کا سفید دوہرا پاجامہ باریک ململ کا کرتہ پہنے جریب ٹیکتے ہوئے برآمد ہوئے جن کو دیکھتے ہی سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ بڑے میاں نے صدر امین سے مخاطب ہوکر عابد کی طرف اشارہ کرکے پوچھا "آپ کی تعریف" "سرکار! آپ خفیہ پولیس کے انسپکٹر ہیں، اور آپکا نام عابد ہے" صدر امین نے کہا "آپ رہنے والے کہاں کے ہیں" بڑے میاں نے آستین کی شکن برابر کرتے ہوئے پوچھا، صدر امین کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر عابد نے کہا نواب صاحب میں یہیں کا رہنے والا ہوں، میرے والد مولوی ---------- صاحب سے آپ واقف ہونگے"
نواب صاحب کہنے لگے، جی نہیں اپنے دادا کا نام فرمائیے "جی میرے دادا نواب ---------- خان بہادر تھے، بڑے میاں نے آگے بڑھ کر عابد کے سر پر ہاتھ رکھدیا اور کہنے لگے "بابا تمہارے دادا سے اور مجھ سے دوستی تھی تم اس خاندان سے ہو، اچھا، مگر کل رات یہاں کیسے آگئے تھے" "قبلہ میں تو کل رات بھر سکندرآباد میں صاحب کی کوٹھی پر رہا اور اب بھی سیدھا وہیں سے آرہا ہوں لباس تک نہیں بدلا، آپ خود غور فرمائیے

کہ میں کیسے اس معاملہ میں شریک ہو سکتا ہوں، اس محلے میں میرا آنا جانا نہیں، ڈیوڑھی سے تعلق نہیں، اور میں خود خفیہ پولیس کا ملازم، حسین بی کو مغالطہ ہوا ہے، ممکن ہے کہ میری صورت کا کوئی دوسرا شخص ہو" عابد نے کہا،

"تم میرے دوست کے بیٹے ہو میں کچھ نہیں کہہ سکتا" یہ کہکر بڑے میاں واپس ہوگئے، اور عابد بھی کھڑا ہو گیا، صدر امین نے کہا آپ واں رہیئے ممکن ہے کہ آپ کی ضرورت ہو" "میں دو بجے تک انسپکٹر محمد کے گھر پر مل سکتا ہوں" عابد نے زور سے کہا، اور پھر سگرٹ جلا کر ایک پولس کانسٹبل جو صدر امین کے پیچھے کھڑا ہوا تھا معنی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا، "آداب عرض ہے" کہکر چلا گیا۔

محمد گھر بیٹھا ہوا بےچینی سے عابد کا انتظار کر رہا تھا عابد نے جاکر تمام کارروائی سنا دی، وہ ابھی گفتگو کر رہا تھا کہ وہی پولس کانسٹبل جو صدر امین کے پیچھے کھڑا تھا پہنچا، اور کہنے لگا کہ صدر امین نے عورت کا پورا بیان قلمبند کر لیا ہے اور انکا خیال ہے کہ آپ ہی اس واردات سے تعلق رکھتے ہیں عابد نے کچھ دے کر اس کو رخصت کر دیا اور محمد کے ساتھ بیٹھکر ڈائری لکھنے لگا، دونوں نے مختلف رنگ کی سیاہیوں سے اپنی اپنی ڈائری کے بارہ صفحے سیاہ کر ڈالے، عابد نے اپنی ڈائری ختم کرکے جیب میں رکھتے ہوئے کہا "الّو کے پٹھے ہیں ہم زندہ بچے ہیں، نہیں ابھی چھ مہینے پریشان نہ کیا تو کہنا" محمد نے شرارت سے جواب دیا "معاملہ ذرا ٹیڑھا ہے گو ہمیں تو اس سے کوئی تعلق نہیں مگر ڈاکٹر جنرل ضرور ہم سے بدظن ہو جائیں گے" عابد نے مسکرا کر کہا "یہ کھلی کتاب ہے کوئی ہم سے کچھ نہیں چھپا سکتے" ٹھیک ساڑھے بارہ بجے ایک سائیکل سوار تیمسرکاری ڈاک دیا جسے دیکھتے ہی عابد ڈاکٹر جنرل صاحب کے بنگلہ پر جا پہنچا۔ صاحب نے پوچھا آپ کل رات بارہ بجے یاقوت پورہ میں تھے" "جناب میں کل بارہ بجے رات کو سکندرآباد میں تھا، سات بجے سے نو بجے رات تک ڈاکٹر جنرل صاحب کے بنگلہ پر رہا، وہاں سے الفریڈ کمپنی چلا گیا، تھیٹر سے ۲ بجے رات کو پھر صاحب کے بنگلہ پر گیا اور صبح واپس ہوا" عابد نے کہا "اس کا ثبوت" اس سوال پر عابد کے چہرے پر سرخی آگئی اور ذرا درشت لہجہ میں کہنے لگا "آپ ڈاکٹر جنرل صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں، انسپکٹر محمد بھی میرے ہمراہ تھے خود انسپکٹر محمد کی ڈائری اور میری ڈائری آپ کی تشفی کر سکتی ہے" "مگر اس سے فائدہ اسماۃ حسین بی نے آپ کی شناخت کی ہے آپ ضرور وہاں تھے" اس سوال کے بعد صاحب نے عابد کے چہرہ کو گھورنا شروع کیا، جو تمتمایا ہوا تھا، اس سوال سے اور بھی سرخ ہو گیا، اور عابد نے حقارت سے کہا "جناب معاف فرمایئے آپ ایک گمنام عورت کو دو پولس انسپکٹروں سے زیادہ باوقعت خیال کرتے ہیں، مہربانی کرکے چالان پیش کر دیجئے عدالت سمجھ لے گی" اس وقت عابد کا غصہ ایک سو نو ڈگری سے بھی متجاوز ہو چکا تھا اور وہ بغیر جواب کا انتظار کئے سیدھا مکان کو چلا گیا۔ کارروائی تو بہی مگر ہوتا کیا؟ ڈاکٹر جنرل نے خود تصدیق کی کہ عابد رات کے نو بجے اور صبح کے چار بجے اس کے بنگلہ پر تھا، الفریڈ کے مینیجر نے بھی کہا کہ عابد رات کو ڈرامے کے اختتام تک تھیٹر میں رہا، مجبوراً کارروائی ختم کرنی پڑی، اور کوتوالی کو واقعی شکست فاش ہوئی۔

اس واقعہ کو چھ مہینے ہو گئے مگر پولس کسی خاص نکتہ تک نہ پہنچ سکی، پولس، اس وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب کہ اس کے مخالف کمزور ہوں، مگر یہاں معاملہ برعکس تھا، پولس بھی آئی ڈی سے مقابلہ کرنا چاہتی تھی، جو کسی طرح ممکن نہ تھا، کوتوالی والوں نے مجبور ہو کر اس معاملہ سے ہاتھ اٹھا لیا، اور خفیہ کے سپرد کر دیا، اتفاق سے اس کی دریافت کا حکم انسپکٹر محمد کو دیا گیا۔ محمد نے مطمئن ہو کر نئے گل کھلانے شروع کر دیئے روز ایک نئی اطلاع دیتا

اور سب کو پریشان کرتا اسی طرح چار مہینے گزر گئے اور سب لوگ اس کے سراغ سے ناامید ہو گئے،
کارواں ایک غیر آباد اور بہت ہی قدیم محلہ تھا، محمد نے اس محلہ میں مکان لیکر خورشید کو رکھا تھا، اس کی بوڑھی ماما اور عابد صرف وہی اس کے محرم راز تھے اور بس، عابد روزانہ دو ایک گھنٹہ یہیں ٹھہرتا۔ اس کا خیال شاید خورشید کا دل بہلانا ہو، مگر ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ صرف خورشید کے حسن پر گرویدہ تھا، چونکہ خود حسین تھا، اور حسن پرست بھی اس لئے اُسے ہر حسین سے دلچسپی تھی بقول کسے "دنیا میں جو کوئی حسین ہے وہ میری قرابت دار ہے"
مگر اس کی دلچسپی صرف تھوڑی دیر کی گفتگو تک ہی ختم ہو جاتی تھی۔
حسین بی جس نے عابد کی شناخت کی تھی مدت سے یہ پتہ لگاتی پھر رہی تھی کہ عابد کہاں کہاں جاتا ہے اور کن کن محلوں میں اس کے ملنے والے رہتے ہیں مدت تک وہ پھرتی رہی ایک دفعہ کارواں میں بھی عابد کو دیکھ لیا مکان میں جانے کے لئے بہانے ڈھونڈھنے لگی، آخر ایک دن کسی بہانے سے دروازہ پر پہنچی اور جھانک کر دیکھتی ہے تو خورشید صحن میں کھڑی نظر آئی فوراً دوڑتی ہوئی صدر امین کے پاس پہنچی اور پورا قصہ سنانے لگی، اس نے اسی وقت ٹیلیفون کر کے گرفتاری کی اجازت لی۔ اور بارہ کانسٹبلوں کو لے کر کارواں پہنچ گیا، پولس نے مکان کا محاصرہ کر لیا، حسین بی اندر داخل ہوئی۔ محمد اور خورشید دالان میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، مجبوراً خورشید کو پولس کی بگھی میں سوار ہونا پڑا، اور محمد بادلِ نالاں عابد کے گھر جا پہنچا۔
خورشید اپنے والدین کے گھر کی طرف چلی، مگر اس نے وہاں جانے سے قطعی انکار کر دیا اور کہنے لگی مجھے وہاں اپنی جان کی خیر نظر نہیں آتی، دوسرے دن مقدمہ چالان عدالت ہوا، محمد پر کئی ایک الزامات لگائے گئے، اور خورشید ایک علیحدہ مکان میں پولس کی نگرانی میں رکھی گئی۔ اسی روز محمد بھی عدالت سے تا تصفیہ مقدمہ معطل کر دیا گیا۔ چونکہ خورشید بالغہ تھی اور وہ بیان کرتی تھی کہ میں نے اپنی خوشی جائز نکاح کر لیا ہے، اس لئے مقدمہ میں کچھ اہمیت بھی نہیں رہی تھی، مگر اس کے والدین ذی اثر ذی اقتدار تھے، جنکی وجہ سے مقدمہ طول پکڑتا جاتا تھا۔

—————— ✕ ——————

سات مہینے تک مقدمہ چلتا رہا، پلیگ بڑی شدت کا تھا، روزانہ دو ڈھائی سو اموات ہو رہی تھیں، محمد مقدمہ کی پیروی میں مارا مارا پھرتا تھا، اتوار کے روز اسکی پیشی تھی، اور سب کو یقین تھا کہ یہ آخری پیشی ہوگی، محمد کی طرف سے ایک لائق بیرسٹر مقرر تھا، اور خورشید کے والدین کی طرف سے کئی ایک سر برآوردہ بیرسٹر اور وکیل، ہفتہ کی شام کو محمد واپس آیا تو اُسے خفیف سا بخار تھا رات کے دو بجے تک حرارت ایک سو آٹھ درجہ پر پہنچ گئی، اور صبح دو گلٹیاں نکل آئیں، محمد اس حالت میں بھی حاضر عدالت ہونے کو تیار تھا، مگر عابد نے اُسے روک دیا اور خود چلا گیا،
ادھر عدالت میں بڑی دھوم دھام سے بحث ہوئی اور فیصلہ سنا دیا گیا کہ "خورشید بالغہ ہے، اور اس نے خوشی سے نکاح کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ عدالت اس نکاح کو منسوخ کرے، لہٰذا خورشید اپنے شوہر محمد کے پاس رہے اور اس کے والدین کو اس کی رضامندی کے بغیر اُسے محمد سے علیحدہ کرنیکا کوئی حق نہیں ہے"
چھ بجے کے قریب عابد پسینہ میں بھیگا ہوا محمد کے گھر پہنچا اور اُسے یہ مژدہ جانفزا سنانے لگا، محمد کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، رات ہی کو اس کی گلٹیوں کا آپریشن ہوا، اور دوسرے دن عدالت کے حکم سے خورشید محمد کے گھر پہنچا دی گئی، ان دونوں فرقت نصیبوں کے لئے سات مہینے سات برس کے برابر گزرے، دونوں گلے مل کر خوب روئے، مگر اس خوشی کا انجام بہت غمگین ہوا، محمد کا بخار بڑھ گیا دوسرے دن صبح ڈاکٹر آیا، اور اس نے حالت دیکھکر

نسخہ لکھدیا جاتے ہوئے عابد کے کان میں کہتا گیا کہ " آج کا دن گزرتا نظر نہیں آتا " ۹ بجے محمد کو ہوش آیا، اُس نے پانی مانگا، دودھ اور دوا پلائی گئی۔ وہ آنکھ تکیہ کے سہارے بیٹھ گیا، خورشید بازو میں بیٹھی ہوئی تھی، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہنے لگا " پیاری خورشید میری زندگی ختم ہوچکی اب چند گھنٹے کا مہمان ہوں میں بڑی خوشی سے جان دونگا، اس واسطے کہ تم میرے سامنے ہو، تمہارا ہاتھ میرے سینے پر ہوگا، پیاری خورشید تم بھی جوان ہو۔ تمہارے والدین مجبور، تمہیں عقد ثانی کے لئے مجبور کریں گے۔ اگر تم اپنی زندگی رنڈاپے میں نہ گزارو، عقد ثانی کرلو مگر کسی شریف آدمی سے میری نظر میں تمہارے لئے عابد سے زیادہ اور کوئی شخص موزوں نہیں، وہ موجود ہے۔ خوش رو ہے، میرا جان نثار دوست ہے، اور اسے تم سے محبت بھی ہے " محمد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، خورشید دھاڑیں مار مار کر رونے لگی، عابد نے آگے بڑھ کر محمد کے آنسو پونچھے، اُس کو تسلی دینی چاہی۔ مگر محمد نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر پاس بٹھا لیا، محمد کی بیوی سرہانے بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کی دونوں لڑکیاں عابد کے دونوں پاس بیٹھیں۔ محمد نے کہا " عابد! میں تمہارا شکریہ ادا نہیں کر سکتا تم نے حق رفاقت ادا کیا میری روح ہمیشہ تمہارے لئے دعا کرے گی، دیکھو تم احتیاط کو کام میں لایا کرو۔ خدا نہ کرے کہ تم کسی جرم کے مرتکب ہو مگر اتفاق سے جرم سرزد ہو تو چھوٹی چھوٹی باتوں کو نظر انداز نہ کرنا ان لوگوں کا جو اپنے سے ذرہ برابر بھی خلاف ہوں ہمیشہ خیال رکھنا اور انہیں بیخ و بن سے اکھیڑنے کی کوشش کرنا، عابد! یہ اس پولیس انسپکٹر کا تجربہ ہے جس نے بارہ سال کامیابی کے ساتھ گزارے ہیں " محمد کا سانس پھولنے لگا وہ تھوڑی دیر ٹھیر کر پھر کہنے لگا " عابد میں تم کو اپنا دل دیتا ہوں، اس کی حفاظت مجھ سے زیادہ کرنا، یہ میرا دل بلکہ میری جان ہے " محمد نے خورشید کا ہاتھ عابد کے ہاتھ میں دیدیا، اس کی آنکھیں موٹے موٹے گرم آنسو گرانے لگیں، اُس نے اپنی بڑی لڑکی کو سامنے کھینچ کر چوما اور سر پر ہاتھ پھیر کر چھوڑ دیا، چھوٹی لڑکی کو کھینچ کر چھاتی سے لپٹا لیا، اور بار بار منہ چومنے لگا، بیوی کو آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر ہاتھ پاؤں اکڑنے لگے، زبان اینٹھ گئی، سانس رکنے لگا، عابد نے اُس کی حالت دیکھکر زور سے کلمہ پڑھنا شروع کیا محمد نے عابد کی طرف ایک عاجزانہ نظر ڈالی اور خود کلمہ پڑھنے لگا، محمد تک تو اُس نے صاف لہجہ میں کہا، مگر رسول اللہ کی ہچکی لگی اور اللہ کہتے ہوئے وہ سیدھا ہوگیا، عابد نے خورشید اور دونوں لڑکیوں کو اُس کے قریب بٹھا دیا اور محمد کی تجہیز و تکفین کی فکر میں مشغول ہوگیا۔ رات کے ۸ بجے عابد محمد کو دفنا کر لوٹا تو خورشید شدید بخار میں مبتلا تھی، اُس کو مطلق ہوش نہ تھا، کبھی محمد اور کبھی عابد کو پکارتی تھی، رات کے بارہ بجنے کے بعد اُس کا بخار اترنے لگا، مگر گلے میں دونوں طرف گلٹیاں اُبھر آئیں، صبح پھر بخار آگیا اور اس قدر شدید کہ ہوش و حواس غائب ہوگئے ڈاکٹر کے آنے تک خورشید کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی تھی!

خورشید کے والدین بھی آگئے اور غسل و کفن کی تیاریاں ہونے لگیں، جس وقت، خورشید کی نعش قبر میں اتاری جارہی تھی، تو عابد نے اُس کے والد سے قبر میں اترنے کی اجازت طلب کی بڑے میاں نے غصہ سے اُس کی طرف دیکھکر اجازت دی، اور اُس نے قبر میں اتر کر نعش اتاری اور پھر اوپر آگیا جس وقت خورشید کے جسد خاکی پر مٹی ڈالی جارہی تھی تو عابد نے اُس کے بھائی سے کہا " میاں! میں نے گھر سے نکلتے وقت اسے مدد دی، بگھی میں سوار کرایا، نکاح میں گواہ بنا، اور اب گور میں اتار رہا ہوں، آہ میں نہ سمجھتا تھا کہ یہ اعانت مجرمانہ مجھے قبر تک پہنچانے کے لئے مجبور کریگی۔

تمکین الکاظمی

خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور لکھیئے ورنہ جواب نہ دینے کی شکایت معاف! **منیجر**

روح تنقید

(۱)

دکن کی تاریخ کا بہت سا حصہ ابھی تک ظلمات میں ہے۔ جس وقت یہ روشنی میں آئیگا ثابت ہوگا کہ ہندوستان کی تاریخ میں اس نے کیسے کیسے انقلاب کن کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ اس تاریخی پہلو سے قطع نظر کرکے ہم ادبیات اردو کی طرف رخ کرتے ہیں جس کے لئے یہ سرزمین نہایت ہی مسعود ثابت ہوا، اردو کو "زبان" کا رتبہ ملا تو یہیں۔ اگر نظم کی طرف ایک دکن کی ہستی ہی کے قدم سب سے پہلے بڑھتے ہیں تو نثر کی نشو و نما کیلئے بھی یہاں کی آب و ہوا موافق ثابت ہوتی ہے۔ اب بھی جبکہ ہندوستان بھر میں بحث تھی کہ اردو زبان تعلیم کے لئے ایک اہل میں ہی ہوئی تھی۔ اس نے مستقل مزاجی کے ساتھ چپ چاپ اپنا فیصلہ صادر کردیا۔ اور اس پر عمل پیرا ہوگیا۔ ایک عام مسئلہ خیال ہے کہ بعض زبانوں کا فطری رجحان وسعت اور پھیلاؤ کی طرف ہوتا ہے۔ اور بعض زبانیں سکڑتی رہتی ہیں یا کم از کم اپنے حدود سے قدم باہر نہیں نکالا کرتیں۔ اول الذکر کی تمثیل نمونہ قدیم بابلی یا موجودہ انگریزی اور عربی زبانیں ہیں، اور قدیم مصری زبان، یا سنسکرت وغیرہ کا شمار دوسری قسم کی زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ اردو زبان کو جس کے جاننے والے ہندوستان کے ہر گوشہ میں پائے جاتے ہیں "ذریعۂ تعلیم" قرار دینے میں مؤسس جامعہ عثمانیہ نے اس حقیقت سے فائدہ اٹھا کر ملک کی اتنی بڑی خدمت انجام دی ہے، جو "رہتی دنیا تک یاد رہیگی"

عصر حاضر میں، جبکہ تصنیف و تالیف کا شوق ہر شخص کو ہو چلا تھا، یہ ضروری تھا کہ ادبی احتساب کیلئے بھی کوئی قدم آگے بڑھاتا، اور مصنفین کو بے لگام ہونے سے روک کر، صلاحیت پسند طبیعتوں کو، چند مخصوص اصولوں کے تحت، اپنے تصنیف و تالیف کے سلسلے کو جاری رکھنے میں مدد دیتا۔ ورنہ بعض دور اندیش ادبی پیغمبروں کی پیشین گوئی کے موافق، اردو ادبیات کا دامن کچھ اس طرح کے پھولوں سے بھر جاتا ہے جن میں خوشنمائی ہے تو خوشبو نہیں خوشبو ہے تو خوبصورتی مفقود ہے!

مصنفین کی بے لگامی کی طرف جو ابھی اشارہ کیا گیا ہے، اس کے متعلق صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ اہل الرائے ادیب، اخبارات و رسائل کی موجودہ "نو طرز عبارت آرائی" کو دس بار ہر الگ پڑھنے کے بعد بھی نہیں سمجھ سکتے، اور نہیں جان سکتے کہ ساری عبارت میں سے کچھ ٹھوس مواد بھی نکل سکتا ہے یا نہیں۔

اگر تعریف یا نفرت کے کلمات ...... کو بطور تنقیدی کارنامے کہہ سکتے ہیں۔ تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اردو ادبیات کے زندۂ جاوید مصنفین میں میر تقی سب سے پہلے نقاد تھے۔ جنھوں نے اپنے آپ کو اور سودا کو پورا، درد کو آدھا، اور سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے۔ اور باقی دوسروں کی شاعری کو وہ "چوما چاٹی" سمجھ کر خطرہ میں نہیں لاتے، بعد کی نسلوں نے میر کی اس رائے کی حرف بحرف تائید کی ہے، اور ان شاعروں کے مدارج میں سر مو فرق نہیں کیا، جب نقاد تیرہویں صدی میں بھی موجود تھے تو ہم کبھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ "روح تنقید" کے مصنف نے پہلے پہل تنقید کو اردو سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے کیونکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ حالی، شبلی، عبدالحق، علامہ شروانی، عبدالماجد اور پروفیسر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی دوکان بہت مشہور ہے

شیرانی کے تنقیدی کارنامے ہماری نظروں میں کچھ وقعت نہیں رکھتے! مگر واقعہ یہ ہے کہ کوئی چیز دنیا میں جس طرح موجود نہیں ہوتی، جس حالت میں کہ وہ اب نظر آتی ہے، بقول حالی کمسٹری کے مدون ہونے سے پہلے اس کی مختلف صداقتیں اِدھر اُدھر پراگندہ تھیں، مگر جب تک اُن کو مدون نہیں کیا گیا، کمسٹری "فن" کے رتبہ تک نہیں پہنچ سکی، اردو میں تنقید کے نظریے تو ضرور موجود تھے، نہ صرف نظریے بلکہ اُن پر عمل بھی ہوتا رہا، لیکن کسی نے بھی آج تک نہ اُن کے مدون کرنے کی کوشش کی اور نہ ان صداقتوں کو ایک جگہ جمع کر کے تنقید کو ایک مستقل فن بنانے کی ضرورت کو محسوس کیا۔ یوں کسی میں بھی وہ موا تو اور بات ہے، ورنہ عام قانون تو یہ ہے کہ جب تک اصول پیش نظر نہ ہوں، کامیاب تنقید نگاری ناممکن ہے۔ ہندوستان و ہندوستان اور یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے نقاد ونیز اپنی ذہنی اثرات کو تصنیف زیر تنقید میں منتقل کرنے کے حسب دلخواہ تنقید دیکھنے میں کمی نہیں کی چنانچہ یہ کس قدر حیرت انگیز افسوسناک بات ہے کہ شیکسپیئر جیسی عظیم ہستی کے شہ پاروں کے متعلق ایک بڑے ادیب (والٹیر) کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ "مجذوب کی بڑ" ہیں۔

(۲)

"روحِ تنقید" کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ ایسی تصنیف جامعہ عثمانیہ ہی کے قیام کے بعد اور اسی کی آبیاریوں سے ممکن تھی، جتنی یونیورسٹیاں آج تک ہندوستان بلکہ روئے آفاق میں نمودار ہوئیں، اُن کے نصاب میں اُردو زبان کے لئے کوئی جگہ ہی نہ تھی اور اگر کسی وسیع النظر جامعہ نے اُس کو اپنے نصاب میں جگہ دی بھی، تو صرف ثانوی اور ایک تجربے کے طور پر اس سے زیادہ اعانت اردو کے لئے فضول سمجھی گئی، کسی کو کبھی یہ خیال نہیں ہوا کہ اردو کو بھی دوسری زبانوں کی طرح علمی زبان بنایا جائے! ہمارے مخاطب یہاں وہ بزرگوار نہیں جنھیں اب تک شبہ ہے کہ آیا اردو علمی زبان بن بھی سکتی ہے؟ آخر ان "یورو پزدوں" کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے کہ انگریزی کے علمی زبان ہونے پر ایمان ہو۔ حالانکہ اُس کی حالت بھی جبکہ انگلستان کے مدرسوں میں طبی ذریعہ تعلیم بھی اردو سے کچھ زیادہ ممتاز نہ تھی، محبت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے! مبتدی کا مقابلہ منتہی کے ساتھ، مغالطہ نہیں تو اور کیا ہے؟ جامعہ عثمانیہ کی مخالفت کوئی نئی بات نہیں، دنیا ہر نئی چیز کی آج تک مخالفت کرتی آئی ہے!

ہم کو اقرار ہے کہ اردو کی موجودہ ترقی یافتہ حالت، بیشتر علی گڑھ کی احسان مند ہے تاہم مسلم یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ میں جو فرق ہے، وہ ظاہر ہے۔ اردو کا تعلق اس سے بہ حیثیت ایک اختیاری زبان کے ہے۔ نہ کہ لازمی! اردو محض اختیاری زبان ہونیکی وجہ سے علی گڑھ کی فضا صرف ادبیات تک محدود ہے، اس سے اوپر اڑنے کی اس میں طاقت نہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کی جو ترقی یہاں ایک مہینے میں ممکن ہے، وہاں ایک سال میں بھی نہیں ہوسکتی، چنانچہ گو اس مسعود جامعہ، اس سلسبیل علوم و فنون، سرچشمہ تہذیب و تربیت کے قیام کو چند ہی سال کا عرصہ گزرا ہے لیکن جہاں تک علمی اردو کا تعلق ہے، علی گڑھ نے برسوں کوشش کے بعد اس کو جس منزل پر پہنچایا تھا، وہ اب اس سے کوسوں آگے بڑھ گئی ہے:

تنقید کا ایک فرض یہ ہوتا ہے کہ:-

"وہ ادبی مذاق کی ترتیب و تہذیب میں کوشش کرے، اگر موقع بہ موقع نقاد نہ پیدا ہوں، تو بہت ممکن ہے کہ ادبی مذاق بگڑ جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ قاعدہ ہے کہ جس طرح قوم کا اثر اس کی ادبیات پر پڑتا ہے، ادبیات کا اثر بھی قوم پر پڑتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں قوم کا مذاق بگڑ جاتا ہے، ایسے وقت ہی تنقید کی سخت ضرورت ہوتی ہے"[۵]

---

[۵] "روحِ تنقید" ص ۴۱-۴۲

آج اردو ادب کی ٹھیک ٹھیک یہی حالت ہے، تصنیفوں اور مصنفوں کی تعداد سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے، نئے نئے اسالیب گھڑے جا رہے ہیں ہمکو ان کی ضرورت سے انکار نہیں، کیونکہ اردو ابھی بچپن میں ہے، ہم کو کہنا صرف اتنا ہے کہ لوگوں کو ضرورت تھی ایسی کسوٹی کی جس کی مدد سے وہ کھوٹے کھرے میں امتیاز کر سکیں، کیونکہ یہی وقت ہے کہ اعلیٰ ادب کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ادنیٰ ادب کے حوصلے پست کئے جائیں۔

اب جبکہ جامعۂ عثمانیہ ان تمام لوگوں کے لئے جن کو اردو سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق تھا مطمحِ نظر اور مرکزِ نگاہ بنگئی، تو راہ نوردانِ اردو کی ہمت بندھ گئی، قدم تصنیف و تالیف کی طرف تیز تیز بڑھنے لگے، اردو کی ترقی کو مطمحِ نظر بنا کر، چھوٹی بڑی بیشمار انجمنیں قائم ہو گئیں، اور کوئی مہینہ ایسا نہیں گزرتا کہ جس میں ایک آدھ رسالہ یا اخبار، مختلف جذبات کو ملے میں دبائے ہوئے، اردو کی ادبی محفل میں نہ آتا، اور دوسرا اس محفل کی ناقدری یا خود اپنی بیکسی کی وجہ سے محفل سے نہ اٹھا دیا جاتا ہو!

اس وقت ممکن ہے کہ خواہشِ جدت طرازی نے، ادبیات اردو کی وہ مختلف النوعی "اس قدر آوارگی اختیار کر لے کہ پھر اس کی روک تھام اور اس کا اصول کے تحت میں لانا جوئے شیر کا لانا ہو جائے،

ہر شے کی پیدائش اپنے وقت کی منتظر رہتی ہے، حالت جمود میں جب تک ضرورت ان کٹھو کر نہیں لگتی، اس وقت تک نہ ایجاد و اختراع کا ٹرونک پھاتا ہے اور نہ قوتِ تخلیق کام کرتی ہے، لیکن چونکہ فنِ تنقید کی پیدائش، اس بات کو چاہتی ہے کہ جس زبان میں اس کے اصول مرتب کئے جائیں، اس کا کوئی مستقل اور مختلف النوع ادب بھی موجود ہو تاکہ تنقیدی اصولوں کے ماتحت اس کا تحمل کامیابی کے ساتھ کر سکے، اس لئے اگر روحِ تنقید کو آج سے بعد عالمِ وجود میں نہیں آنا چاہئے تھا، تو آج سے پہلے بھی نہیں، اس سے پہلے اس کی پیدائش بلاشبہ اسے "سلطان محمد تغلق کا" "چمڑے کا سکہ" بنا دیتی حقیقت یہ ہے کہ "روحِ تنقید" عین موقع پر غیب سے ہمارے ہاتھوں میں دیدی گئی، دکن کے لئے اس کی پیدائش تو اور بھی خوش آئند ہے، بقول سر تیج بہادر سپرو[1]:

> "ابھی سے ہم کو جنوب میں ایک مختلف النوع مالا مال اردو ادب کی نشو و نما اور ترقی کا عہد طلوع ہوتا ہوا دکھائی دے رہا ہے"

تنقید کی روح کو ادبیات اردو میں جاری و ساری کرنا ان قدیم مشرقی تعلیم یافتہ بزرگوں کا کام تھا، جو ہر نئی شے کو ابتدا ہی عینک سے ملاحظہ فرماتے ہیں، یا ہر نئی ایجاد کو، کم از کم اپنی تجویز کی بے طاقِ نسیاں" کا ایک "گلدستہ" سمجھ کر اس کی طرف توجہ کرنا، تحصیلِ حاصل سمجھتے ہیں، فلسفیانہ تنقید سے، مشرقی ادب، تقریباً نا واقف ہے، اس کے لئے مغرب ہی سے اصول مستعار لینے کی ضرورت تھی، فنِ تنقید کی اہمیت، اس بات کی مقتضی تھی کہ اس کے اصولوں کی ترجمانی اور صحیح مفہوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لئے کوئی ایسا قلم آگے بڑھتا، جس کو انگریزی، اردو، دونوں زبانوں میں مہارتِ تامہ نہیں، تو کافی مہارت ضرور ہو، اور سب سے مقدم یہ کہ جس نے علمی اردو کے ماحول میں عمر گزاری ہو، اور جس کا "اوڑھنا بچھونا" اردو ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی ہستی مرکزِ علومِ مشرقیہ و مغربیہ جامعۂ عثمانیہ کے حدود کے سوا، اور کہاں سے پیدا ہوتی؟

ہم یہ بجا طور سے کہہ سکتے ہیں کہ "روحِ تنقید" جیسی خالص ادبی پیداوار، ٹھیک ٹھیک اسی زمانے میں اور انہیں حالات کے درمیان عرصۂ ظہور میں آ سکتی تھی؛

---

[1] خطبہ جلسہ تعلیم اسناد جامعہ لکھنؤ۔

"اگر اردو داں حضرات کو بھی اس کے مقاصد و اصول سے واقف کرا دیا جائے تو امید ہے کہ اردو ادب کے تمام نقائص کی تلافی ہو جائے گی۔" (روح تنقید صفحہ ۴۴)

(۴)

کتاب "انقلاب کن" ہے تو مختصر مگر بہت دلچسپ ہے! "لسان الغیب" کی عظمت مسلمانوں کے دل میں جیسی کچھ ہے وہ ظاہر ہے، لیکن اُن کے کلام کی نزاکتوں نے یورپ کے دلوں کو بھی تسخیر کر لیا ہے، اس سے بڑا کیا انقلاب ہو سکتا ہے کہ اُن کا شمار بھی بعض خود ساختہ حشرات الارض میں کر دیا۔ ہمیں مصنف "روح تنقید" معاف فرمائیں، اگر کہیں ہم اُن کے خیالات سے اختلاف کا اظہار کریں کہ "روح تنقید" کے لکھنے والے کو تنقید کا نمونہ بنجانا، اور موافق اور مخالف دونوں قسم کے خیالات کو خندہ پیشانی آمدید کہنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں کہ مولوی زور ادبیات اردو کے اسٹیج پر جلوہ گر ہوئے ہیں، اور نہ اُن کا یہ پہلا ایسا موضوع ہے جس کو انقلاب کن کہا جائے، اردو داں پبلک نے مولوی زور کو اس سے پہلے رسالہ "تحفہ" کے مستقل مضمون نگار کی حیثیت سے "فرانسیسی ادبیات" جیسے موضوع پر قلم اٹھاتے اور اجنبی ادب کے خشک بنجر زمینوں کو خیالات کی تخم ریزی اور عرق محبت کی آبیاری سے گلستاں بناتے ہوئے دیکھا ہے، دور بین نظریں اسی وقت تاڑ گئی تھیں کہ فرانسیسی ادبیات پر خامہ فرسائی کرنیوالا، خواہ کوئی ہو مگر بے انقلاب پیدا کرنیوالی ہستی،

جامعۂ عثمانیہ کی پیداوار میں یہ پہلا علمی شخص ہے جس نے ادبیات اردو کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا ہے، ابتدا ہی کو اپنا مطمح نظر قرار دیا ہے، دعویٰ تو حقیقت میں بڑا ہے، دعا یہ ہے کہ خدا انہیں اس پر قائم رکھے! اور وہ "حریف مئے مرد افگن" ادب ثابت ہوں! اور ملک و قوم کی جو امیدیں ایسے لوگوں سے وابستہ ہوتی ہیں، اُن کو کما حقہٗ پورا کریں۔

"روح تنقید" کے چوتھے اصول تنقید کو مد نظر رکھکر، اگر میں یہ کہوں کہ اس خاص حیثیت سے تصنیف زیر بحث کے متعلق جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں، وہ دوسرے سے ممکن نہیں، تو مبالغہ نہ ہوگا کیا چھ سال تک مصنف کے ساتھ، ہمراہ دنی سے ادنی موقع پر شریک رہنے اور ہم جماعت ہونے کے علاوہ، ہم مشرب ہونے کے بعد بھی کوئی شخص "مصنف کی ذات اور اس کے ماحول" سے کما حقہ واقف نہیں ہو سکتا؟

جب کتاب کا آپ مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف مصنف کی ذاتیات غیر معمولی طور پر اس میں جھلکیاں دکھا رہی ہے، بلکہ اُس کے قلبی روحانی اور فنی ارتقا کا عکس بھی اس میں جابجا نمودار ہو رہا ہے اور وہ آپ سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میرے اخلاق کی تعلیمی دلچسپی امتیازی خصوصیت رکھتی ہے اور اُس کی فطرت کو بنانے اور معین کرنے میں اُس کا

(۱) موروثی ادبی مذاق

(۲) اجداد و اسلاف کے نقوش تاثر

(۳) قلب پر احساس

اور (۴) غیر معمولی ذہانت اور محنت اور دیگر خارجی اثرات نے یہ کام کیا کہ، باوجود نو عمری کے اُس کو ایسے معرکتہ الآرا مبحث پر قلم اُٹھانے پر مستعد کر دیا۔ قلم تو ہر شخص اٹھا سکتا ہے، یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ ایک نو عمر مصنف جس قدر کامیاب ہو سکتا ہے اُس سے زیادہ اُسکو کامیاب بنایا!

(۵)

تنقید نگاری کے سب سے پہلے اصول کی رو سے "روح تنقید" میں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ مضمون زیر بحث پر حاوی بحث کرتی ہے یا نہیں؟
لارڈ بیکن کا قول ہے کہ "جو کتاب بہت سی کتابوں کے مطالعہ کے بعد لکھی جاتی ہے اس کا حال "آب مقطر" کا سا ہوتا ہے" ادبی تنقید کی نوعیت خود ایسی تھی کہ مختلف مغربی تنقید ہی کارناموں سے روح کھینچ کر ایک جگہ جمع کر دیجائے۔
منضبط اصول تنقید کا ایک مختصر سا نمونہ "سحرالبیان" کی تنقید ہے "مثال" اس سے اچھی ہو تی ہے۔ اگر مصنف نے اپنی کوششوں کو صرف اصول تنقید کے مقرر کرنے تک محدود کر دیا ہوتا، تو یقیناً وہ ایک سنگین غلطی کے مرتکب ہوتے۔
ہم نے اپنے علمی حلقوں میں "روح تنقید" پر ایک اعتراض یہ ہوتے سنا ہے کہ مصنف نے بخل سے کام لیکر صرف ایک ہی تنقیدی نمونے پر اکتفا کیا ہے اس اعتراض کی سبکی خود اسی سے ظاہر ہے حقیقت میں یہ اعتراض تو اس وقت وارد ہو سکتا جبکہ مصنف نے ایک سے زیادہ نمونے پیش کئے ہوتے، ایک سے زیادہ جتنی بھی تعداد بتلائی جاتی، اس پر یہ بجا اعتراض ہوتا کہ "اس سے زیادہ کیوں نہیں"؟ اور یہ سلسلہ غیر متناہی ہو جاتا۔
اس میں شک نہیں کہ مصنف نے بعض جگہ ایک خوفناک اختصار سے کام لیا ہے، اور بعض ضروری باتوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً جہاں تنقید کے اقسام گنائے گئے ہیں اس کی دو اصولی قسموں کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

(۱) فنی تنقید ادب

(۲) جمالی تنقید فنون

تاہم یہ چھوٹی سی کتاب گو جامع نہ سہی، لیکن دوسرے مضمون نگاروں کے لئے ضرور "تخم" کا کام دیگی، جس سے عظیم الشان "درخت"[۵] پیدا ہونے کی قوی امید ہے۔
معنوی خوبیوں کے اعتبار سے دیکھا جائے، تو اگرچہ مصنف کو اپنے ذاتی خیالات کے اظہار کا بہت کم موقع مل سکا تھا، تاہم جو موقع مل سکتے تھے ان کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، نہایت آزادانہ اپنے خیالات کا اظہار کیا، اور سلیقہ کے ساتھ ان کو ترتیب دیا ہے۔
اسکوئتھ[۲] سچ کہتا ہے کہ بعض وقت کسی شخص کی سیرت کا نقشہ کھینچنے میں ایک آدھ جملہ جو کام کر جاتا ہے ایک مبسوط سوانحعمری سے بھی ممکن نہیں، چنانچہ مشہور علامہ اور استاد الاساتذہ بنجامن جاوٹ[۳] کی سیرت کا فوٹو اس نے خود اس طرح کھینچا ہے، کہ ایک دفعہ علامہ موصوف کی سالگرہ کی غرض سے اسکوئتھ اور اس کے چند احباب گئے تھے شام ہو رہی تھی، اس استاد الاساتذہ کی سیرت اصولی خصوصیت کو ملاحظہ فرمائیے، وہ ان شاگردوں سے جو خود بچوں والے ہونگے، اس طرح مخاطب ہوتا ہے۔

۱؎ روح تنقید صفحہ ۱۰۱

۲؎ المخاطب بہ (Earl of Oxford) انگلستان کا موجودہ سربرآوردہ سیاست داں، اور ادیب۔ مختلف عہدوں سے ترقی کرتے ہوئے وزارت عظمیٰ تک پہنچ گیا تھا۔

۳؎ (Benjamin Jowett) ۱۸۱۷-۱۸۹۳ء مشہور علامہ السنہ مغربیہ ۱۸۷۰ء سے انتقال تک بیلیل کالج (آکسفورڈ) کی صدارت کے عہدہ پر فائز رہا۔

--------- اب شام ہو رہی ہے بچو! تم کو جانیکی اجازت ہے[51]۔

یہ چیزیں سرسری نظر میں پیش پا افتادہ معلوم ہوتی ہیں، لیکن اضطراراً یا اختیاراً، جب سوانح نگار کے قلم سے ایسے جملے نکل پڑتے ہیں، تو اُس کے عمیق مشاہدے، مذاق سلیم اور قوت انتخاب کا کافی پتہ دیتے ہیں۔ مصنف روح تنقید نے جہاں علامہ شروانی کا ذکر کیا ہے، ایک جملہ میں اُن کا صحیح نقشہ کھینچ دیا ہے، بعض وقت وہ بڑے بڑے عقلاؤں کی قوت سے بھی باہر ہے:

"علمائے سلف، لکھنے والے کے لئے ضروری ہی تھا کہ وہ خود علمائے سلف کا ایک کامل نمونہ بنجائے[52]۔"

اشارہ واضح نہیں، لیکن بقدر پرلس قدر روشن ہے، اس لئے ایک جملہ کے آئینہ میں علامہ موصوف کا مذاق سلیم جامعیت کمال اور سب سے بڑھ کر خود اُن کے خط و خال کس قدر صاف منعکس نظر آ رہے ہیں؟ ایک سرسری انتخاب کے بعد چند نمونے یہاں نقل کئے جاتے ہیں، جن سے مصنف کے ذاتی خیالات کا پتہ چل سکتا ہے:۔

"۱۔ اگرچہ آجکل وہمی واقعات اور خرق العادت کے پیش کرنے پر ہنسی اڑائی جاتی ہے اور اسی قصے کو شہ پارہ فن قرار دیا جاتا ہے جس کی بنیاد ناممکن باتوں پر نہ رکھی جائے۔ لیکن یورپ میں بھی ازمنہ وسطی میں اس قسم کی آمیزش.... باعث فخر سمجھی جاتی تھی۔ جوں جوں علوم و فنون میں ترقی ہوتی گئی، روزمرہ واقعات اور فطری امور کی طرف زیادہ توجہ ہونے لگی، ہر قوم اور ملک میں ایسا زمانہ ضرور آتا ہے کہ وہاں کی ادبیات کو فوق الفطرت تخیلات اور تعجب خیز توہمات کی کٹھن منازل سے لازمی طور پر گزرنا پڑتا ہے[53]۔"

"۲۔ بدر منیر سے بے نظیر کی جو بر موقع ملاقات کروائی جاتی ہے، وہ اس قدر اہم تھی کہ سوائے ایک زبردست تخلیقی صناع کے اور کسی کو یہ تخیل نصیب نہیں ہو سکتا، بڑے بڑے یورپی فسانہ نویس ان انقلابی واقعات کی تخلیق میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن میر حسن نے بالکل فطری طریقہ پر ایک بات پیدا کر دی ہے[54]۔"

"۳۔ آزاد کا اسلوب بیان کچھ اس قدر شگفتہ، با اصول اور شستہ ہے کہ باوجود سخت کوششوں کے کوئی بھی آج تک اُن کی تقلید نہ کر سکا.......... ان کے رنگ میں ابتدا، اور انتہا، انہیں تک رہی[55]۔"

تیسرے اصول کی روشنی میں کتاب کا مطالعہ ایک نہایت دلچسپ مشغلہ ہے، قطع نظر ادبی اصطلاحات کے طرز بیان کی شگفتگی، ناآشنائے ادب کو بھی اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتی، اُس کا اسلوب بیان ملاحظہ ہو۔

---

۵۱ occasional address باب بیوگریفی۔

۵۲ روح تنقید صفحہ ۲۷

۵۳ صفحات ۱۳۸-۱۳۹

۵۴ صفحہ ۱۴۳

۵۵ صفحات ۲۳-۲۴

"اور وہی اسلوب بہترین خیال کیا جاتا ہے، جس میں گونا گونیوں اور رنگینیوں کی کثرت، پڑھنے والے کو مسرت اور حیرت کو سمندر میں ڈالدے، اگر کوئی جملہ طویل ہو تو، کوئی بالکل چھوٹا، کسی میں استعارہ ہو تو کسی میں تشبیہ، کہیں فصاحت جھلکیاں دکھا رہی ہو، تو کہیں فطرت رو رہا ہو، غرض ایک طوفان خیز سمندر ہو، جس کی مضطرب موجوں پر، جزر و مد کی کیفیت طاری ہو اور جس کی سطح کچھ اس قدر عجیب و غریب اشیاء کا گہوارہ بنی ہوئی ہو کہ اُن کی دلچسپیاں بالستادگان ساحل کو نہ صرف محو استغراق کردیں، بلکہ اس بات پر مجبور کردیں کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں کود پڑیں اور گرانبہا موتی حاصل کرنیکی کوشش شروع کردیں۔" (صفحات ۱۱۰-۱۱۱)

ترجمہ میں ایک بات قابل ذکر ہے کہ تحت اللفظ نہیں، بلکہ خیالات کو اپنے طرزِ بیاں میں ادا کرنیکی کوشش کی ہے؛ کہیں کہیں موٹے لغات، اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ عربی اور فارسی کے نقوش تاثر مصنف کے دل پر ثبت ہیں۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ "دوسروں کے خیالات کو اپنے لفظوں میں توڑ مروڑ کر کہہ دینے سے اس کی اصلیت اور تازگی میں فرق آجاتا ہے اور نیز اردو زبان میں نئے اسالیب بیان کے رائج کرنیکا موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے" لیکن اس کا فیصلہ مشکل ہے کہ کہاں تک اصلیت کو برقرار رکھا جائے، اور کہاں اس سے قطع نظر کی جائے، مذاق سلیم خود اس کا فیصلہ کرسکتا ہے۔

کتاب کی زبان پر ایک اعتراض بجا طور پر وارد ہوسکتا ہے کہ اس میں نہ تو دلی کی زبان کی کما حقہٗ تقلید کی گئی ہے اور نہ لکھنؤ کی، بلکہ یہ عام "نو طرز عبارت آرائی" میں لکھی گئی ہے، ان دونوں میں کسی کو اپنا مطمح نظر قرار دینے میں، جامعۂ عثمانیہ کو بے شک سوچ سمجھکر قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔ دلی اور لکھنؤ نے اپنے اپنے مقام اور وقت پر، اردو زبان کی بڑی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اب ان مقامات سے مرکزیت اٹھ چکی ہے۔ اور ایک تیسری جگہ اُن کا نچوڑ آرہا ہے، جدید ادبیات اور فنون کی مختلف النوعی اس بات کی منافی ہے کہ ان دونوں اسکولوں میں کسی ایک کی سختی کے ساتھ تقلید کی جائے پھر یہی ہماری زندگی خود تنقید کا ایک بہترین نمونہ ہونی چاہیئے (اور یہی تنقید کی علت غائی ہے!)

جدید آزادروی اس قدر بے اصول نہ ہونی چاہیئے کہ اپنے مرکز سے دور جا پڑے، بہرحال جامعۂ عثمانیہ کا یہ فرض اولین ہے کہ وہ نہایت وسیع نظری سے کام لے اور وہ اُردو زبان کے لئے ایک اعلیٰ ادبی معیار قائم کردے، ورنہ ہر بولی کی اوگھٹ گھاٹیوں میں سرگردانی منزل مقصود تک پہنچنے میں اس کی سدِ راہ ہوگی۔

انگلستان میں بھی ایک ایسا زمانہ گزرا ہے، جبکہ زبان ہی تنقیدی تیروں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یہ حالت اس وقت تک قائم رہی جب تک دوسرے اہم اور عملی فنون نے لوگوں کے انہماک کو اپنی طرف نہ کرلیا۔

پہلے اصول کی رو سے اس میں شک نہیں کہ مصنف کی ذات اور اس کے ماحول کا گہرا مطالعہ، جس کو سلیتھ "تاریخی طریقۂ تنقید" کہتا ہے۔ تنقید نگاری میں بے حد مدد دیتا ہے، بحث زیر تنقید پر کافی روشنی ڈالتا ہے، اور کتاب کی الجھی ہوئی گتھیوں کے سلجھانے میں نقاد کا بے بدل معاون ہے، شیکسپیئر کی ذات کے متعلق ایک شمہ بھر معلومات کے لئے، انگریز، ہر ممکنہ معاوضہ (خواہ وہ حکومت ہند سے دست برداری ہی کیوں نہ ہو!) دینے کو تیار رہتے ہیں، لیکن جتنی احتیاط کی اس اصول کے استعمال کے لئے ضرورت ہے۔ کسی اور اصول کے لئے نہیں، مصنف کی ذات کے مطالعہ اور بقول "ڈزرائلی"

[1] اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کی دوکان کا عطر بہت مشہور ہے

خود مصنف کو پردہ ڈالنے، میں امتیاز کرنا چاہئیے۔ مصنف کی ذات کا مطالعہ بعض وقت خطرناک ثابت ہوتا ہے "موازنہ" میں میر انیس کی ترجیح کے اسباب کے منجملہ ایک انکا ذاتی اور خاندانی تقدس ہے۔ جس کا احساس مرزا دبیر کے حق میں نہایت مضر ثابت ہوا، واقعہ یہ ہے کہ مصنف کی زندگی کے بھلے یا برے اثرات غیر اختیاری طور پر نقاد کے قلم سے، تنقید زیر بحث میں رونما ہوتے اور مصنف کی ذاتیات کے بھلے یا برے اثرات، غیر اختیاری طور پر نقاد کے قلم سے، تنقید مشہور سیاست داں اور ادیب ڈسنڈ بری سے بعض ملنے جلنے والوں نے اس کے بعض شہ پاروں پر اس وجہ سے بیباکانہ حملے کئے ہیں کہ وہ اس کی جوشیلی طبیعت کی بعض خامیوں سے واقف تھے۔ جان بیلی، ایک معمولی شاعر و تھی۔ اس کی محبت نے اسکاٹ کو اندھا بنا کر، اس کو شیکسپیر کا ہم پلہ کہلوا دیا!

اگر اول الذکر مطالعہ مصنف کو انفرادی نقصان پہنچاتا ہے تو یہ ادبیات کے حق مضر ہے،

علاوہ ازیں بعض وقت مصنف کی عظمت کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب خود اس کی ذات سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ انگلستان کے قلب پر شیکسپیر کی بڑی وجہ اس کی شخصیت اور ذاتی واقعات سے ناواقفیت ہے۔ لہذا ہم یہ ٹھیک طور سے فیصلہ نہیں کر سکتے کہ ہر وقت مصنف کی ذات اور اُسکے ماحول کا مطالعہ کس قدر مفید ثابت ہو سکتا، اور کیا اثرات مرتب کرتا ہے؟ جب تک ادب کے سائنس بننے سے ناامیدی ہے۔ غیر جانبدارانہ تنقید بھی بیحد مشکل ہے، کیونکہ ادب اور سائنس میں ایک سب سے بڑا اصولی فرق ہے:-

"سائنس میں شخصیت کا کوئی لگاؤ نہیں رہتا ہے نہ حق و باطل کی تعلیل یا جذبات کی حوالت۔ وجدانی کیفیات اور ذوقی تاثرات سائنس کی محدود کائنات سے باہر ہیں" (روح تنقید صفحہ ۹۰)

تاہم ادبی تنقید میں مقصد کا قرب اُسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ "ادبیات کو صحیح اور تحقیقی طریقہ پر جانچا جائے اور خود اُس کے کارناموں میں سے اس کے ذاتی معین کردہ اصول اخذ کئے جائیں۔ اور نیز "ایک ادبی نقاد اس پر مجبور ہے کہ وہ کسی ادبی کارنامے کے سائنٹفک تجزیہ اور تشریح کے ساتھ خاص ادبی اصول کی طرف متوجہ ہو، ورنہ اس کی ساری کوشش نقش بر آب ثابت ہوگی" (روح تنقید صفحہ ۹۹)

(۶)

تنقید نگار کا ایک اہم ترین فرض یہ ہے کہ وہ اخلاقی پہلو کو کبھی ہاتھ سے نجانے دے "مصنف" روح تنقید "نے بھی میر حسن کی اس سنگین غلطی پر کہ" باوجود مذہب پرست" ہونیکے انھوں نے عاشق و معشوق میں نکاح کے قبل وصل کرا دیا، ایک ہلکا سا اعتراض وارد کیا ہے کہ:-

"یہاں فوری وصل البتہ معیوب ہے، مصنف تاریخ نہیں لکھ رہا تھا۔ بلکہ قصہ۔ اس حالت میں وہ آزاد تھا کہ قصے کی باگ کو جس طرف چاہے موڑے۔ نکاح کے قبل وصل ایک مذہب پرست مصنف کی غلطی ہے" (صفحات ۴۴)

پھر اس غلطی کی توجیہ بھی کی ہے کہ:-

"معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن نے یہاں بھی اپنے ماحول کی وفاداری کے ساتھ ترجمانی کی ہے" (صفحہ ۱۴۵)

یہاں یہ بتلا دینا ضروری ہے، کہ معنوی حیثیت سے ادب کی دو بڑی قسمیں ہیں-

(۱) حقیقت (Realism) جس میں انسان کی مادی زندگی کا سچا نقشہ کھینچا جاتا ہے،

(۲) تصوریت (Idealism) جس میں روحانی اور تصوری مکمل زندگی کا مرقع ہوتا ہے۔

عطر حنا کا جو نسخہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کے پاس ہے وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہے

یہاں ہمارا تعلق صرف اول الذکر سے ہے "حقیقت" میں بدکاری اور نیکوکاری دونوں کے نقشے کھینچے جاسکتے ہیں، اسی نقطۂ نظر سے اس کی دو تحتی قسمیں ممکن ہیں:

۱۔ وہ حقیقت جس میں بھلائی اور برائی کا نقشہ تناسب کے ساتھ کھینچا جائے، لیکن نتیجہ کا قنوطیت کے ساتھ اخذ کیا جانا ضروری ہے شیکسپیر کے مصنفات مثلاً "جولیس سیزر" اور "ہاملٹ" وغیرہ اس کے بہترین نمونے ہیں۔

۲۔ وہ حقیقت جس میں برائی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہو۔ اور نتیجہ رجائیت پر ختم کیا جائے۔ یہ صنفِ ادب عموماً فرانسیسی مصنفین کی منظورِ نظر رہی ہے۔ لیکن انگریزی ادیب اس آخری قسم سے ہمیشہ اجتناب کرتے رہے کیونکہ ان کے خیال کے مطابق "لٹریچر فنِ لطیف ہے" اور چونکہ ہر فنِ لطیف کا مقصد جمالیاتی احساس انسانی کو ہیجان میں لانا ہے لہذا ادبیات میں "بدی" کے مرقعوں کی گنجائش نہیں، نہایت ہی مطعون ہے وہ ادب جس میں بدی کے مرقعوں کا تسلسل پیش ہو جائے، چونکہ تنقید بھی ادب کا ایک شعبہ ہے اور مہتم بالشان شعبہ اس لئے کل پر جو ذمہ داریاں ہیں جزو اس سے بری نہیں ہو سکتا۔ ماحول کی ترجمانی اگر اندھا دھند کی جائے تو فنکار کی قوت انتخاب (جس کی فنِ لطیف میں اشد ضرورت ہو) کس مصرف کی؟

علاوہ ازیں تنقید نگاری میں ایک اخلاقیات کا خیال لازمی ہے۔ ایک مشہور ادیب یہ پند سودمند ارقام فرماتا ہے کہ "فیصلہ زندہ لوگوں پر دیکھ بھال کر اور مردوں پر بے لاگ صادر کرنا چاہیئے" اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ اس سنگین جرم کی سزا میں، اخلاقی عدالت میر حسن کو جو فیصلہ سنائے، کم ہے۔ یہ غلطی اگر کسی اور نوعیت کی ہوتی۔ تو میر حسن کی بریت آسان تھی۔ لیکن اخلاقی پہلو کو نظر انداز کرنا، قابل پرسش ہے۔

اختتام پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان تنقیدی اصولوں کی اہمیت خود ساختہ معاونوں سے زیادہ نہیں۔ جو انہیں لوگوں کے لئے مفید مطلب ہیں جنہیں فطرتاً یہ مذاق ودیعت ہو۔ کسی انشا پرداز نے۔ جہاں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ "نقادوں کے لئے کوئی اکاڈمی یا جامعہ قائم نہیں کیا جاسکتا"، اس کے یہی معنی ہیں کہ ریاضیاتی اصول پر تنقید کی تعلیم ناممکن ہے، اصول معاونین ہیں، اصل شئے مذاقِ سلیم جس کے حصول کے صرف دو ہی رستے ممکن ہیں:

۱۔ ادبیات کا وسیع مطالعہ

۲۔ اصولِ تنقید کی مشق۔

لیکن جیسا اوپر اشارہ کیا گیا ہے، فنی یا ادبی یا ادبی تنقید، بذاتِ خود مقصد نہیں، بلکہ ایک رفیع الشان مقصد "تنقیدِ حیات" کا ذریعہ ہے، نظری زندگی سے قطع نظر، عملی زندگی میں بھی حسن اور صداقت کی مخلصانہ تلاش، ہر عصر کے افرادِ انسانی کی کوششوں کے لئے بہترین اور قابل ستائش مشغلہ رہا ہے، مگر اس متلاشی کی حالت اس گڈریے سے مشابہ ہے جو، پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر سے، شفق، آسمان اور زمین کے مقامِ اتصال کا دھوکا کھا کر اور اس کو قریب پاکر، خوشی خوشی اس طرف روانہ ہوتا ہے، لیکن وہ جس قدر آگے بڑھتا ہے، وہ "مقامِ اتصال" اس سے اسی قدر دور تھا، جس قدر پہاڑ کی چوٹیوں سے! الغرض ہماری انفرادی یا مجموعی حیات کے رازوں کا افشا کرنا، نہ تو علمی ضابطوں ہی کے ذریعہ ممکن ہے اور نہ سائنٹفک تجربوں سے ہاں یہ ممکن ہے کہ بہترین خیالات اور اقوال کے ساتھ موانست، اور ان کو سمجھنے کی کوشش، ہم میں تعجب، امید اور محبت کے وہ احساسات پیدا کر دے جس کو ورڈسورتھ کے الفاظ میں، "حیاتِ حقیقی" کہہ سکتے ہیں۔

(۷)

مجموعی حیثیت سے، کتاب کی ادبی تکمیل کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس قدر انسانی کوشش کسی شے، کو تکمیل تک پہنچا سکتی ہے، "روح تنقید" بھی "مکمل ہے" مصنف کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے موضوع سے اس قدر چمٹا رہتا کہ کتاب رسمی پھیکے، خشک مضامین کا مجموعہ بنجاتی۔ ہمارے خیال میں ضمنی بحثیں، اصولی بحثوں سے زیادہ لطیف اور مفید ہیں۔ اس لئے باوجود کہیں بھی قدم ان تنقیدی اصولوں کی حد سے باہر نہیں نکلتا۔ ادبیات اور فنون لطیفہ جیسی معرکتہ الآرا طولانی مباحث سے مصنف کا دامن بچا بچا کر نکلنا، قابل دید ہے۔ "ارتقائے تنقید" کے خشک میدانوں میں بھی مصنف کے قلم نے جو گلفشانیاں کی ہیں، قابل ستائش ہیں۔ صفحہ ۸۹، مردم چشم کی راحت رسانی کی غرض سے، ہر جگہ کچھ اس قسم کے سیر تماشے مہیا کر دیئے گئے ہیں کہ تھلن تو ادبیات طبیعت کو سیری نہیں ہوتی۔ بات لوٹ کر آنیکو جی چاہتا ہے۔

تنقید کا کام سمجھنا، اور سمجھانا ہے۔ اسپ بیرو، بیرجس نے فن کی جو تشریح اور توجیہیں کی ہیں، مصنف کے ادبی مذاق کا ثبوت ہیں۔ قصہ کوتاہ، ہم یہ کہدیتے ہیں کہ "مصنف نے جو کچھ لکھنا چاہا ہے، اس کو بانہیں شائستہ کہہ دیا ہے"۔ بہت کم ایسے کارنامے ہیں، جن کو "جامع" کہا جا سکے۔ لیکن روح تنقید کے "جامع" ہونے میں شبہ نہیں۔ تاہم کتاب کو ہم انہیں معنوں میں "کامل" کہتے ہیں جن معنوں میں کسی انسانی کارنامے کو کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں جو "کامل" ہے، وہ انسانی کہاں ؟

بہرحال روح تنقید میں جامعہ عثمانیہ کے آغاز کا انجام، نظر آرہا ہے، جامعہ لکھنؤ کے دو قابل "ادبی پیغمبروں کی پیشین گوئی، اردو دنیائے اردو کی بہترین امیدیں پوری ہوتی دکھائی دیرہی ہیں۔ وہ ایک کوکب سعد بنکر آسمان ادب پر چمک رہی او۔ دنیائے ار دو میں ایک شاندار دور کے آغاز کی خبر دیرہی ہے جس میں مصنفین اور مصنفات کی گزشتہ ناانصافیوں کا بہترین معاوضہ، اور آئندہ بدعنوانیوں کا سدباب ممکن ہے۔ ان بزرگوں کیلئے جن کی نظرت تنقیدی عناصر سے مرکب ہے ایک نیا باب مدوجد کا کھل جائیگا۔ ہماری چشم خیال ایک تصوری عالم، کا خواب دیکھ رہی ہے، جس کا ہر ادبی کارنامہ، ان تمام صفات سے متصف ہوگا، جنکو "روح تنقید" کی آنکھیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ بظاہر یہ چھوٹی سی کتاب آئندہ اعلیٰ ادبیات کیلئے معیار بنجائیگی۔ اور ایک نخلبند کی طرح، جو گلہائے رنگا رنگ کو پھیلانے کی خاطر، خاردار جھاڑیوں کو صحن چمن سے کاٹ چھانٹ کر پھینکدیتا ہے، ادبیات کو ہر قسم کی آلائشوں سے پاک وصاف کرکے منزہ کر دیگی ؟

مصنف کی ادبی خدمات کی کماحقہ داد دینے کیلئے ہمارے پاس کوئی پیمانہ نہیں، جس سے ناپ تول کر کہا جا سکے

"کہ ہم سے اتنی ہو سکتی ہے، اتنی نہیں ہو سکتی"

: : قرائن اس بات کا پتہ دیرہے ہیں کہ "تاریخ ادب اردو" کے "باب تنقید" میں "روح تنقید"۔ "مفتح باب" ہوگی۔

محمد عبدالقادر سروری بی۔اے

بلبل

چمن میں لائی ہے پھولوں کی آرزو تجھکو　　بلا کہاں سے یہ احساسِ رنگ و بو تجھکو ؟

تری طرح کوئی سرگشتۂ جمال نہیں　　گلوں میں محو ہے کانٹوں کا کچھ خیال نہیں

جگر کے داغ کو پُرنور کر دیا کس نے　　تجھے اِس آگ سے معمور کر دیا کس نے ؟

تجھے بہار کا اک مژدۂ خوشنوا سمجھوں　　کہ دردمند دلوں کی کوئی صدا سمجھوں ؟

سوا اک مئے ساغر بستہ بود ہی کیا!　　تو ہی بتا کہ ترا سرمایۂ وجود ہے کیا ؟

ہزار رنگ خزاں نے، بہار نے بدلے　　ہزار روپ جہانِ روزگار نے بدلے

تری قدیم روش دیکھتا ہوں بچپن سے　　ہے صبح و شام تجھے کام اپنے شیون سے

نہ آشیانہ کہیں ہے نہ ہے وطن تیرا　　رہیگا یوں ہی بسیرا چمن چمن تیرا

متاعِ ہوش کو اک جستجو میں کھونا ہے　　مجھے بھی یعنی ترا ہمصفیر ہونا ہے

تو خوش بنال مرا با تو حسرت یاریست

"کہ ما دو عاشقِ زاریم و کارِ ما زاریست"

مجنوں گورکھپوری

غزل

دو چیز یافتم از ہر چہ آفرید خدا　　جوانِ تازہ و از بادۂ کہن جامے

زشانِ روز و شبِ عاشقاں چہ می پرسی　　طلوعِ صبحِ سعادت بود سر شامے

نزادہ اند بہر کرم، سوزِ پروانہ　　نگیرد آتشِ عشقِ بتاں بہر خامے

فسونِ محوز ز سرابِ کرم و فریبِ جہاں　　ز آب گوہر و آئینہ تر نشد کامے

دریں ہوس کہ جانے تہ نگیں شود ت　　بہ نیشتر برگِ جاں زنی بے نامے

براہِ دوست اگر گامے نہی اشدار　　نہادہ اند دریں رہ بہر قدم دامے

ولی بہ قلبِ تابطور مے نرزد

کہ دارد آرزوئے جلوۂ لب بامے

میر ولی اللہ بی۔ اے

دعوتِ فکر

غافل! اے جانِ زار غفلت سوچ　　وقتِ فرصت ہے وقتِ فرصت سوچ

اب سے بیدار ہو یہ سوچ سمجھ　　ساعتِ چند اپنی بابت سوچ

دیکھ، تو بند بند قید میں ہے　　سوچ، او دشمنِ فراغت سوچ

دیکھ، تو زندگی بھی دو بھر ہے　　سوچ او مائلِ ہلاکت سوچ

قصہ باہمدگر عداوت دیکھ　　لطف باہمدگر محبت سوچ

حالتِ زار ملک و ملت دیکھ　　حاصلِ ترکِ شرم و غیرت سوچ

آہ! تو اور یہ تری حالت　　آہ! تو اور یہ تری گت سوچ

پھر کوئی زندگی کی شکل نکال　　پھر کوئی جانبری کی صورت سوچ

پھر کوئی فکرِ دفعِ ذلت کر　　پھر کوئی شکلِ اوجِ عزت سوچ

پھر کوئی ابتلا کا درماں چاہ　　پھر کوئی چارۂ مصیبت سوچ

پھر کوئی مامنِ سلامت ڈھونڈھ　　پھر کوئی صورتِ حفاظت سوچ

پھر مداوائے فرطِ غم فرما　　پھر علاجِ ہجومِ آفت سوچ

پھر سبیلِ فلاحِ قوم نکال　　پھر طریقِ نجاتِ ملت سوچ

پھر بنائے عزم و ہمت ڈال　　پھر تدابیرِ فتح و نصرت سوچ

ساری دنیا میں تیری دھوم مچے　　سارے عالم سے شکلِ سبقت سوچ

آہ! آزادِ بے نوا کی صدا
سوچ- بابا! مآلِ غفلت سوچ

حکیم آزاد انصاری

برکھارت میں

پھر حسینوں کی طبیعت لاجونتی ہو گئی
تھی جو سادی سادی وہ بسنتی ہو گئی

کالی کالی اور متوالی گھٹائیں چھا گئیں
یا سیہ پریاں فضا میں بال کھولے آ گئیں

برق سے انوار پر ابرِ سیہ مرنے لگا
چونچلوں سے نور کی سرگوشیاں کرنے لگا

پتی پتی ڈالی ڈالی کا نیا عالم ہوا
[illegible] اک قطرۂ شبنم ہوا

یوں نکل آئے ہر شجر پر [illegible]
جیسے کیفِ وجد میں ہوں مست خاصانِ خدا

دوب نے مخمل بچھایا ہے پرِ طاؤس کا
رنگ سبزے نے اڑایا تختِ کیکاؤس کا

ایک ہو سارے حسینوں پہ بخشش تری
آرزو ہے کاش اتنی پوری ہو جائے مری

وہ ادا پھولوں کے پردے میں جو ہے پردہ نشیں
وہ ادا جسکو کہتے ہیں سب نازک بدن ناز آفریں

جسکے ہر انداز پر "شہناز" کو آتا ہے "ناز"
غزنوی سے مدتوں ملتا رہا بنکر "ایاز"

یہ لبِ سوسن "مسی مالیدہ" ہو جس کیلئے
بھیس ہیں لیلیٰ کے جس نے قیس کو صدمے دئے

"دامنِ صد برگ" جسکے واسطے ہو چاک چاک
جس کی خاطر ہو گیا فرہاد تیشہ سے ہلاک

نازکی جو ہے یہی جس کی بانکپن شبو میں ہے
زلفِ شیریں میں جو خم تھا سنبل کے اک اک مو میں ہے

سینۂ لالہ کے جوہر داغ میں ہے ضو فشاں
نور جس کا تھا جبینِ ماہِ کنعاں سے عیاں

دل میں رہ رہ کر بتائے طرزِ حسنِ دلبری
یہ نہ ماہر کہہ سکے "من دیگرم تو دیگری"

ماہر

غزلیات

صفدر علی شارق ایرانی

حواس و ہوش کو سطحِ محوِ خواب بنا　　نگہ کو جام بنا حسن کو شراب بنا
وہ ساز چھیڑ کہ ہر برگ ہر شجر جھومے　　اٹھا اور روح کو مستِ نشۂ رباب بنا
جمالِ دوست سے کسبِ کمال کر غافل　　سیاہ خانۂ دل رشکِ آفتاب بنا
نگاہِ شوق کو بھی لذتِ نگاہ ملے　　رخِ صبیح کو بیگانۂ نقاب بنا
بہارِ گلشنِ دنیا خزاں مآل ہی ہے　　یہاں نہ اپنا نشیمن دلِ خراب بنا
مرے خیال میں یہ فلسفہ ہے ہستی کا　　جو قطرہ جوش میں آیا وہی حباب بنا

بڑے غضب کا ہے شارق جگر کا یہ مصرع
" جہاں کو سایہ بنا خود کو آفتاب بنا "

اکبر حیدری

جس دل میں کبھی دن تھی دزدیدہ نظر محدود　　اب بے خبری تک ہے اس دل کی خبر محدود
جذبات محبت میں کیوں ہو نہ اثر محدود　　کچھ خونِ جگر بے سود کچھ کیفِ نظر محدود
میں تم کو دکھا دیتا وسعت شبِ ہجراں کی　　ہوتے نہ اگر اتنے یہ شام و سحر محدود
اے گل تری رعنائی دیکھے کوئی کیا دیکھے　　صیاد کی بند آنکھیں گلچیں کی نظر محدود
کچھ اور سنا دیتا افسانۂ ناکامی　　ہوتے نہ مرے لب پر الفاظ اگر محدود
قسمت سے اگر مجھکو یہ اوج ملا ہوتا　　میں تجھکو دکھا دیتا عنقا تیرے پر محدود
افسانۂ ناکامی تھا آہ کے پردے میں　　سمجھا ہی نہیں کوئی دو حرف مگر محدود

کچھ داد مجھے ملتی اکبر مری کاوش کی
ہوتے نہ اگر اتنے اربابِ نظر محدود

باسط بسوانی

اُس شوخ کی ناوک فگنی کے انداز نرالے ہوتے ہیں
وہ تیر و کماں کو دیکھتا ہے، ہم دلکو سنبھالے ہوتے ہیں

زنداں میں ترا وحشی، قسمت شاید ابتک جیتا ہے
کچھ صبح کو آہیں ہوتی ہیں، کچھ شام کو نالے ہوتے ہیں

اُس وقت مزہ کچھ آتا ہے مجھ دشت نوردِ الفت کو
جب راہ میں کانٹے چبھتے ہیں جب پاؤں میں چھالے ہوتے ہیں

تاثیر سے خالی ہوتی ہے فریاد کہیں مظلوموں کی،
وہ آہ سحر بنجاتے ہیں جو شام کے نالے ہوتے ہیں

آغاز محبت میں باسط دل ہی پہ مصیبت آتی ہے
انجام محبت میں آخر کیوں جان کے لالے ہوتے ہیں

ہادی مچھلی شہری

کام چلے گا کیا بھلا حُسن کرشمہ ریز سے
حسرت دل مری نکال نوک سنانِ تیز سے

گوشۂ قبر ہے مجھے منزل راحت و خوشی
کٹ گئی راہ زندگی برش تیغ تیز سے

میرے دل حزیں میں بھی دیکھ بھڑک اٹھی نہ آگ
طور کا حشر کیا ہوا جلوۂ برق ریز سے

بانیِ جور خود ہوا، شاہدِ جور حشر میں
خونِ وفا برس پڑا جوہرِ تیغ تیز سے

صرفِ خمار بیدلی ساغرِ شوق ہو نجائے
ایک نظر ادھر بھی ڈال چشم سرور خیز سے

واہ رے ہمتیں مری دشتِ بلا میں خار بھی
دیتے ہیں دادِ رہروی نوک زبانِ تیز سے

دامنِ آرزو پہ کچھ داغ سے پڑ کے رہگئے
نقش وفا نہ بن سکا دیدۂ اشک ریز سے

دل کو مرے کہ سرد تھا دیدۂ مست یار نے
پھونکدیا، جلا دیا بادۂ تند و تیز سے

جذب نگاہِ شوق نے حسن کو کھینچ ہی لیا
پردہ نہ ہوسکا ذرا پردۂ جلوہ بیز سے

دیدہ و دل کی بن پڑی منہ سے نقاب کیا ہٹی
دامنِ شوق بھر گیا جلوۂ حسن ریز سے

اُف تری آنکھ ناکہاں، رنگ جمائے وہ انکھڑیاں
سارا جہاں خراب تھا ساغرِ بادہ ریز سے

طور کا ظرف چاہیئے ہادی ناتواں تجھے
دیکھ رہے ہیں آج وہ دیدۂ برق ریز سے

محمود اسرائیلی

شکر ہے نالہ نے رسائی کی　　　رہ گئی شرم جبہ سائی کی
پر نہ نکلیں قفس میں دم نکلے　　　کوئی صورت تو ہو رہائی کی
نئی دنیا نے غم دکھاتی ہے　　　مجھکو اک اک گھڑی جدائی کی
کیوں شب تیرہ بخت سمجھا کے لکھوں　　　داستاں تیری بیوفائی کی
آئینہ روز اُسے سمجھاتا ہے　　　اک نئی شکل دلربائی کی
شوخیاں ہو رہی ہیں حسن کی دُون　　　آج بن آئی خودنمائی کی
کیوں ابد تک ہوں نہ مستِ الست　　　پی ہے میں نے دورِ ابتدائی کی

عمر نے دل نے یار نے محمود
جس نے کی مجھ سے بیوفائی کی

سیّد کاظم علی باغ

دل دے کے کسی بے مہر کو تو کس واسطے روتا دھوتا ہے　　　انجام یہی تو ہونا تھا انجام یہی تو ہوتا ہے
سب عمر گزاری غفلت میں بھولے سے خدا کی یاد نہ کی　　　یہ چند نفس جو باقی ہیں کمبخت انھیں کیوں کھوتا ہے
ناواقفِ رازِ محبت ہو اتنا تو بتا دو اے لوگو،　　　کیا یادِ صنم میں ہجر کی شب کچھ درد بھی دل میں ہوتا ہے
اے عشق بلا یہ بھید ہے کیا اتنا تو بتا دے ہر انساں　　　کیوں دیکھ کے مجکو ہنستا ہے کیوں دیکھ کے مجکو روتا ہے
دولت کی اگر خواہش ہے تمہیں ہشیار رہو غفلت سے بچو　　　ہر جاگنے والا پاتا ہے ہر سونے والا کھوتا ہے

ہر اشک مسلسل دیکھ کے وہ اغیار سے ہنس کر کہتے ہیں
یہ باغ حزیں جب روتا ہے تو موتی خوب پروتا ہے

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

ہندوستان میں مسلمانوں کے آمد کے تین مقاصد ہیں :-

(۱) تجارت
(۲) اشاعت اسلام
(۳) ملک گیری

عرب اور مشرق قریب کا سلسلۂ تجارت ظہور اسلام سے بہت پہلے قائم ہو چکا تھا، یہاں تک کہ عربوں نے جن کا میل جول قدرتاً اہلیان مصر سے زیادہ تھا، بحر ہند میں جہازرانی شروع کر دی تھی زمانۂ جاہلیت میں عرب عورتیں ہندوستان کا نام بند اشعار میں بصیغۂ تانیث لاتی تھیں، جزیرہ سیلون یعنی لنکا کی چوٹی اس سلسلۂ روایات کی بنا پر کہ نوع انسان کے مورث اعلیٰ نے جنت سے نکلکر سب سے پہلے وہیں قدم رکھا تھا مقدس زیارت گاہ بن چکی تھی موپلا کی قوم جو جنوبی و مغربی ہندوستان میں ساحل ملیبار پر آباد ہے اور جن کے آباؤ اجداد عراق سے آئے تھے اور مذہباً مسلمان عربی النسل تھے ان کی آمد دوسری صدی ہجری یا آٹھویں صدی عیسوی سے سمجھنا چاہیئے، یہ زمانہ قریب قریب وہی ہے جبکہ مسلمانوں نے سندہ کو فتح کیا تھا، چونکہ گرم مسالوں، ہاتھی دانت اور جواہرات وغیرہ کی تجارت سیکڑوں برس سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں اور ایرانیوں کے توسل سے جاری تھی اس لئے اسلام کا اثر جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر تجارت کی حیثیت سے برابر پھیلتا رہا۔ سولھویں صدی عیسوی کے شروع میں موپلا قوم کے ذ مسلم ملیبار کی کل آبادی کا پانچواں حصہ تھے ٹیل حصہ میں عربوں کی ایک خاص آبادی اب بھی موجود ہے جو ٹمیل زبان بولتے اور قرآن کی تلاوت اسی زبان میں کرتے ہیں۔

۲۔ خلیفہ منصور عباسی کے عہد میں بہت سے عرب اشاعت اسلام کی غرض سے ہندوستان میں آکر آباد ہو گئے تھے جن کی نسل اب بھی مغربی ساحل ہند پر موجود ہے اگرچہ ابتدا زمانہ سے انہیں اسلام کا اصلی رنگ و روپ کم نظر آتا ہے۔

۳۔ حضرت عمرؓ کے عہد ۲۳ھ ۶۳۶ء بمقام تھانہ متصل بمبئی ہندوستان پر ایک یورش کی گئی۔ جب حکم نے مال غنیمت اور خمس دربار خلافت کو روانہ کیا اور اپنے بڑوں کا حال دریافت کر لیا تو سہیل حاکم کو لکھ بھیجا کہ فوجیں جہاں تک پہنچ گئی ہیں وہیں رک جائیں اور موجودہ فتوحات ہی پر اکتفا کیا جائے۔

حضرت عثمانؓ کے عہد میں عبدالرحمان والی سیستان نے کش سے وادی تک قبضہ کر لیا۔ عبداللہ بن عامر نے عبدالرحمان کی جگہ صحار عبدی کو فتح سندہ پر مامور کیا جس کے مفتوحہ شہر کا نام عربی تاریخوں میں قیقان لکھا ہے۔

سنہ ۳۸ھ میں حضرت علیؓ کی اجازت سے حارث بن مرہ سرحد ہند تک آئے ان کو فتوحات حاصل ہوئیں یا لاخر وہ اور ان کے ساتھی قیقان میں جو سرحد خراسان کے قریب سندہ میں واقع ہے شہید کئے گئے، اس کے بعد مسلمانوں نے کئی مرتبہ چھوٹے چھوٹے حملے کئے۔

سنہ ۴۲ھ میں امیر معاویہ نے زیاد بن امیہ کو بصرہ، خراسان و سیستان کا والی مقرر کیا، اسی سال عبدالرحمان بن سمرہ نے زیاد کی ایما سے کابل اور مغربی افغانستان کو

اور وہاں کے باشندوں کو مطیع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ عبد الرحمٰن بجز ورد (واقع سندھ) تک پہنچ گئے تھے، اس زمانہ میں مہلب ابن ابی صفرہ عرب کا ایک سردار جو اپنی متواتر ایشیائی فتوحات کے سبب سے خاص طور پر ممتاز تھا۔ سندھ پر حملہ آور ہوا اور قندہار سے لیکر ملتان تک کا کل علاقہ تسخیر کر لیا اور سندھ پر مسلمانوں کا پورا تسلط ہو گیا۔ مہلب پشاور کی راہ سے ملتان اور کابل (کابل) ہوتے ہوئے اور یابا، دالہ دار (لاہور؟) سندھ، ساگر، میں بڑی فتوحات حاصل کیں، عبد الملک بن مروان کے عہد میں بیرونی ممالک کی تسخیر کی طرف خاص توجہ ہوئی، اس خلیفہ نے حجاج بن یوسف کو ۷۵ھ مشرقی ممالک عراق، ایران، خراسان، ترکستان کا کامل الاختیار نائب مقرر کیا جس نے سندھ کا حاکم مجاعہ بن سعد التمیمی کو تجویز کیا جس کے مفتوحہ شہر کا نام قندابیل لکھا ہے غالباً یہ شہر جنوبی سندھ میں ہوگا۔ مجاعہ نے سرحد پر بزور قوت قبضہ حاصل کرکے اپنی ماموری نے ایک برس بعد مکران و قندابیل کے اکثر شہروں کو فتح کر لیا۔

مسلمانوں کا سندھ پر قابض ہونا اور پھر چھوڑ کر واپس جانا

خلیفہ ولید بن عبد الملک نے حجاج کو اپنی وزارت سے معزول کرکے بعد میں عراق کا حاکم اور مشرقی صوبجات کا انچارج کر دیا حجاج نے مجاعہ کے بعد محمد بن ہارون کو سرحد سندھ کا حاکم مقرر کیا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے فتوحات کا سیلاب اقصائے عالم میں پھیل رہا تھا ہر اعلیٰ و ادنیٰ فرمانروا ان کی اطاعت مایۂ فخر خیال کرتا تھا، سراندیپ کے راجہ نے خلیفہ ولید کی شوکت و عظمت کا خیال کرکے مسلمان یتیم بچے جن کے مربی لنکا میں بہ سبب تجارت مر چکے تھے قیمتی تحائف کے ساتھ آٹھ جہازوں میں بار کرکے حجاج کے پاس روانہ کیا۔ ہوا کی مخالفت سے وہ جہاز دیبل (ٹھٹھہ) واقع سندھ میں آ گئے، سندھی ڈاکوؤں نے یہ جہاز دیبل کے بندر کے پاس (جسے اب کراچی بندر کہتے ہیں) لوٹ لئے، حجاج نے داہر راجہ سندھ کو جس کی راجدھانی آلر (سکھر بکھر) میں تھی اور جس کی حکومت کشمیر کے قریب تک تھی لکھا کہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر روانہ کر دے، لیکن راجہ داہر نے یہ کہکر ٹال دیا کہ قزاق میرے اختیار سے باہر ہیں۔ حجاج نے اول تو عبد اللہ بن نبہان السلمی کو دیبل روانہ کیا جو شکست کھا کر وہیں کام آیا، پھر اس نے بدیل کو اہل سندھ کے مقابلہ کیلئے روانہ کیا جو محمد ہارون حاکم مکران اور عبد اللہ بن قحطانی کی امدادی فوج لیکر جو تعداد میں چار ہزار تھی دیبل پہنچا اور داہر کے بیٹے جی سب (کیشب) سے صبح سے شام تک لڑا مگر گھوڑے سے گر کر شہید ہوا مسلمان اس دفعہ بھی ناکام رہے؛

محمد بن قاسم

۹۱ھ میں حجاج نے اپنے چچازاد بھائی محمد بن قاسم کو سندھ کی سرحد کا حاکم اور چھ ہزار جنگ آور دن کا افسر مقرر کرکے روانہ کیا خلیفہ ولید نے جو درازی سفر اور مصارف جنگ اور مسلمانوں کے جان کے خیال سے مذبذب ہو رہا تھا تاکردہ رضامندی ظاہر کی۔ محمد قاسم کی عمر اس وقت ۱۷ برس کی تھی، اس کے ہمراہ چھ ہزار شتر سوار بھی تھے، تین ہزار اونٹ رسد کے تھے، لوازمۂ سفر کا اہتمام اس پیمانہ پر کیا گیا تھا کہ سوئی تاگہ تک ساتھ لیا گیا تھا، محمد بن قاسم مکران پہنچے۔ ایرانی سواحل پر گذرتے ہوئے حاکم صوبہ نے اور بھی فوج ساتھ کر دی، گولہ پھینکنے والی پانچ توپیں (منجنیق) جو محاصرہ کا کام دیتی تھیں سنہ ۹۲ھ میں سمندر کے راستے دیبل کو روانہ کی گئیں۔ محمد بن قاسم نے مکران سے قیر نور کا رخ کیا اسے فتح کرکے ارمابیل پر قبضہ کیا اور پھر ملکر دیبل (ٹھٹھہ) محاصرہ کر لیا، دیبل میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا جی کھولکر مقابلہ کیا، راجہ داہر کا بیٹا برہمن آباد کو بھاگ گیا، لیکن مسلمانوں نے اسے مطیع کرکے نیرون پر بھی جسے اب حیدر آباد سندھ کہتے ہیں قبضہ کر لیا، جس کے بعد آلر راجہ کی راجدھانی پر چڑھائی کی جہاں خود راجہ مقابلہ کیلئے موجود تھا، مسلمانوں نے خندقیں کھودیں نہر پر پل باندھے جسے عبور کرکے داہر کی فوج پر جا پڑے جو ایک ہاتھی پر سوار تھا، اور سیکڑوں ہاتھی اس کے اردگرد ڈٹے تھے۔ مسلمان قدر اندازوں نے تیر برسانا شروع کئے، ہاتھیوں کا جھنڈ بھاگ کھڑا ہوا، داہر مجبوراً پیادہ لڑتا ہوا عساکر اسلامیہ کی طرف بڑھا، راجہ اور اس کی فوج ماری گئی، داہر کی رانی بھاگ کر شہر آلر میں جا چھپی جہاں بخوف گرفتاری مع خواصوں کے جلکر خاک ہو گئی، مسلمانوں نے آلر پر بھی قبضہ کر لیا اور تمام مغربی ہندوستان کو ملتان اور

جے پور تک فتح کرلیا اور پھر قنوج پر حملے کی تیاری کی۔ ملتان کے فتح ہوتے ہی سندھ کا کل ملک محمد بن قاسم کے قبضہ تصرف میں آگیا، یہاں کا مالی انتظام کرتے وقت فاتح نے عدل و انصاف کو مدنظر رکھا، برہمن آباد کے ہندو مالی افسروں کو مامور کرتے ہوئے محمد بن قاسم نے ہدایت کی:۔

"دیکھو تمہارا فرض ہے کہ رعایا اور سلطنت کے معاملات میں دیانت سے کام کرو، تقسیم کے موقع پر انصاف کو مدنظر رکھو، جھگڑے اور فساد میں کسی ایک فریق کی رعایت نکرو، تحصیل مالگزاری کے وقت اس امر کا ہمیشہ لحاظ رکھو کہ رعایا کو ادائگی کی استطاعت ہے یا نہیں، بلکہ تشخیص کرتے وقت اس کا خیال رکھا جائے کہ مالگذاری رعایا کے لئے ناقابل برداشت نہ ہوجائے، آپس میں اتفاق و اتحاد قائم رکھو، بغض و عداوت کو دلوں میں جگہ نہ دو، تاکہ ملک سرسبز و خوشحال اور بربادی سے محفوظ ہے۔ ورنہ یاد رکھو تمہاری نااتفاقی سے ملک پر آئے دن قسم قسم کی آفتیں نازل ہوتی رہیں گی"

اس نے ہندوں کے ساتھ مراعات کیں اُن کے منادر اور مذہبی حقوق کا لحاظ کیا، اس بارہ میں خود حجاج نے جس کے مظالم کا پلہ مسلمانوں کے مقابل ہمیشہ بھاری رہا ہے محمد بن قاسم کو لکھا:۔

"جب وہ ہماری اطاعت قبول کرچکے اور خلیفۂ اسلام کو جزیہ دینا منظور کرتے ہیں تو اب اس کے بعد حسب قاعدہ اُن سے کسی امر کی بابتہ باز پرس نہیں کی جاسکتی، اُن کو ہم نے اپنی حمایت و حفاظت میں لے لیا ہے، اس لئے کسی طرح پر بھی ان کے جان و مال پر دست درازی نہیں کرسکتے، انہیں اپنے دیوتاؤں کی پرستش کی عام اجازت ہے، کسی آدمی کو اس کے مذہبی احکام کی پیروی کرنے سے نہ روکا جائے، اور نہ انہیں کسی بات کی ممانعت کیجائے۔ وہ اپنے گھروں میں جس طرح چاہیں رہ سکتے ہیں"

جن دنوں محمد قاسم ملتان آیا اسی زمانہ میں اُسے حجاج کے مرنے کی خبر پہنچی، وہ برابر سندھ کا گورنر رہا، عربوں نے گو سندھ کو فتح کرلیا، لیکن یہ کامیابی زیادہ نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی، سندھ کا صوبہ وسعت میں تو بڑا تھا، لیکن ریگستانی ملک ہے اس لئے انھوں نے اس لئے انھوں نے اور آگے شاداب و زرخیز حصۂ ملک پر توجہ نہیں کی۔

جب سلیمان بن عبدالملک تخت حکومت پر متمکن ہوا تو اس نے محمد بن قاسم کو معزول کرکے یزید بن ابی کبشہ تسکسکی کو مامور کیا، محمد بن قاسم ہندوستان سے صحیح و سلامت واپس گیا، لیکن اس کے بعد پھر کوئی جدید فوج سندھ کی طرف نہیں بھیجی گئی، بلکہ آئندہ بیس سال تک خود عرب سندھ میں غیر محفوظ حالت میں رہے جب عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے ملک سندھ کو جو یزید بن ابی کبشہ کے اٹھارویں دن وفات پانے اور بجائے اُن کے حبیب بن مہلب کے گورنر سندھ مقرر ہونے کے بعد اپنے ممالک پر از سرنو قابض و متصرف ہوگئے تھے خط لکھا اور اسلام کی دعوت دی اور بشرط قبول اسلام انکو ملک وجاندادیں دینے، عفو تقصیر کرنے، اور مسلمانوں جیسا برتاؤ کرنیکا اقرار کیا، اس تحریر کا یہ اثر ہوا کہ جے سنگھ بن داہر اور دیگر ملوک سندھ مسلمان ہوگئے اور ہندوانہ نام ترک کرکے اسلامی عربی نام رکھے۔

عمر بن مسلم باہلی نے جو عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے مامور تھا، ہند کے بعض شہروں پر چڑھائی کی اور اُن کو فتح کیا۔

ہشام بن عبدالملک کے عہد میں جنید بن عبدالرحمن سندھ کا گورنر ہوا، اس نے نہ صرف گجرات پر قبضہ حاصل کیا بلکہ بروچ تک جو احاطۂ بمبئی میں مشہور شہر ہے جا پہنچا اور کچھ کاٹھیاواڑ، راجپوتانہ کے شمالی مغربی حصہ اور جنوب میں مارواڑ تک اور شمال میں وسط پنجاب، شورکوٹ ضلع جھنگ تک کا تمام علاقہ خلیفۂ دمشق

کے ماتحت کردیا

جنید کے بعد تمیم بن زید قینی، اس کے بعد حکم بن عوانہ کلبی ان ممالک کا گورنر ہوا جس نے دشمنوں کے قبضہ سے کل ممالک واپس لئے اور عدل و انصاف سے رعایا کو خوش کر دیا۔ حکم کے مارے جانے اور محمد بن قاسم کے واپسی سے ۳۶ برس خاندان بنی امیہ کی تباہی پر جبکہ دولت امویہ کے قوی انتظام مملکت ہند سے ضعیف ہوگئے مسلمان خود اس ملک مفتوحہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔

خلفاء عباسیہ سنہ ۱۳۶ھ میں المنصور نے جو عباسیوں کے سلسلہ حکومت میں سفاح کے بعد خلیفہ ہوا تھا عمر بن حفص کو سندھ کی سند گورنری عطا کی اور امویوں کے بعد عباسیوں کا تسلط سندھ پر قائم ہوا۔

سنہ ۱۵۹ھ ہجری میں خلیفہ المہدی نے عبد الملک بن شہاب مسمعی کو عظیم الشان فوج کا جن میں جیش مطوعہ (والنٹیر) اور بیڑہ جہازات بھی تھے افسر مقرر کر کے خلیج فارس کے راستہ سے سندھ و بلاد ہند کو روانہ کیا۔ مسلمانوں نے شہر باربد فتح کیا راجگان ہند نے خلیفہ بغداد کی اطاعت قبول کی، لیکن عباسی فتوحات حدود اربعہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔

سنہ ۱۸۴ھ ہجری میں ہارون رشید نے اسحاق بن سلیمان کو سندھ و مکران کی گورنری مرحمت کی۔ سنہ ۱۸۴ھ میں داؤد بن یزید حاکم گورنر ہوا لیکن اس زمانہ میں حدود سلطنت ہند میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ مامون رشید نے داؤد بن یزید کے بعد بشر بن داؤد کو سندھ کا گورنر مقرر کیا۔ سنہ ۲۱۱ھ میں حاجب بن صالح کو سندھ کی حکومت عطا کی، سنہ ۲۱۶ھ میں عمر بن موسیٰ حنفی سندھ کے گورنر ہوئے۔

فتوح البلدان میں لکھا ہے کہ اس خلیفہ کے عہد میں فضل بن ماہان نے سندان کو فتح کیا اور مامون کی خدمت میں ایک ہاتھی بطور تحفہ کے روانہ کیا۔ یاقوت حموی نے اس مقام کو سندھ کے حدود کے قریب خیال کیا ہے۔

دسویں صدی عیسوی میں مسعودی نے جب وادی سندھ میں قدم رکھا تھا، تو اس نے شمالی اور جنوبی صوبہ پر قریشی عربوں کو برسر حکومت دیکھا ہے، اور پھر کچھ زمانہ بعد جب دوسرے سیاح ابن حوقل کا گذر ہوا ہے تو یہاں عربی اور سندی زبانیں بولی جاتی تھیں اور مسلمان و ہندو آبادی میں مساوات اور رواداری قائم تھی جب تک خلافت بغداد مضبوط رہی ہندو مسلمانوں کے مطیع رہے خلافت میں ضعف آنا تھا کہ سندھ کے راجے مسلمانوں کی اطاعت سے منحرف ہونے لگے، پھر بھی سندھ سے مسلمان خارج نہیں ہوئے اس زمانہ میں مسلمانان سندھ اسماعیلیہ یا قرامطیہ مذہب کے پیرو ہو چلے تھے، یہاں تک کہ سندھ کا مسلمان رئیس اعظم مع خاندان کے ملاحدہ مشہور تھا، اور اس ریاست کا صدر مقام اس وقت ملتان تھا جس زمانہ میں سلاطین غزنویہ کے حملے شروع ہوئے ہیں علاقہ سندھ اور ملتان میں بھی ملاحدہ فرمانروا تھے۔ اس وقت مسلمانوں کی لڑائی کی وجہ وہی ہوتی تھی جو ابتدائی زمانہ میں تھی، یہ جب کسی شہر یا بستی پر حملہ آور ہوتے تو ان کی پہلی درخواست یہی ہوتی تھی کہ یا تو مسلمان ہو جاؤ یا جزیہ ادا کرو، انکار کی صورت میں حملہ کر دیتے تھے، ہتھیار بند قتل کئے جاتے تھے، مگر عورتوں، بوڑھوں اور سترہ برس کے بچوں، اہل پیشہ اور عام باشندوں کا تعرض نہیں کیا جاتا تھا جب کوئی ہندو سردار و عدہ اطاعت کرتا اور جزیہ دیتا تو رعایا کے تمام حقوق اس کو عطا ہوتے۔ مندروں کی تعمیر اور مذہبی رسومات کے اجرا کی اجازت ہوتی، اور مذہبی اوقاف و نذرانے سابق سے جاری ہوتے تھے وہ سب بحال رکھے جاتے تھے۔

عربوں کے حملے ناکام تو کہے نہیں جا سکتے پھر بھی ان کی کوئی مستقل سلطنت ہندوستان پر قائم نہیں ہوئی، اس کا سبب یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے

حملے کے لئے غلط راستہ اختیار کیا اور ایسے ہی صوبہ میں اپنی توجہ محدود رکھی جو بہت کم زرخیز اور ریگستانی تھا، آگے نہ بڑھنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یا تو شمال اور مشرق کے راجپوت راجاؤں میں اُس وقت تک مسلمانوں کے مقابلے کی طاقت باقی تھی اور ان میں پھوٹ پیدا نہوئی تھی یا یہ کہ ایسے بڑے ملک کو فتح کرنے کے لئے مقام خلافت سے فوج کافی طور پر مہیا نہ ہوتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ خلفا کا طبقہ شروع سے ان فتوحات کے خلاف تھا، حضرت عمر فاروق نے حبل عاصم کو آگے بڑھنے کی ممانعت کردی تھی، ولید بن عبدالملک نے بھی محمد بن قاسم کے، وانگی کی با کراہ اجازت دی تھی۔

بنی امیہ کے زوال کے بعد ان کے جانشین عباسیوں نے دمشق سے دارالخلافت منتقل کرکے بغداد کو از سر نو آباد کیا اس تبدیلی کے سبب وہ زبردست اثر تھا جو عربوں کے طرز معاشرت میں ایرانی خیالات کے پرتو سے پڑ رہا جاتا تھا، سلطنت کے اہم اور ذمہ داری کے عہدوں پر عربوں کی بجائے بہتر تعلیم یافتہ اور معاملہ فہم ایرانی مامور ہونے لگے، اس امر خاص میں ذاتی عقاید کا بھی زیادہ پاس ولحاظ ہوتا تھا، مرکزی حکومت نیا قالب اختیار کرکے روز بروز نازک اور کمزور ہوتی جاتی تھی، تحصیل اور تشخیص مالگزاری میں جوہر قابلیت دکھلا کر دور دراز صوبوں پر ایرانی گورنروں کو خود مختارانہ حیثیت پیدا کرنے اور موروثی حکومتیں قائم کرلینے کا اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ ان خود مختار حکومتوں میں سے سامانی خاندان بھی تھا جو نہایت طاقتور اور تربیت یافتہ تھا، اُن کی سلطنت کی حد ماوراء النہر سے اصفہان تک تھی، اس خاندان کے نو بادشاہوں نے سنہ ۲۶۱ھ سے سنہ ۳۹۹ھ تک فرمانروائی کی، عنصری نے کہا ہے ؎

نہ تن بودند ز آل سامان مشہور　ہر ایک حکومت خراسان مغرور

"اسمعیل و احمد و نصری دو نوح دو عبدالملک دو منصور"

ایرانیوں کے بعد ترکوں کی باری آئی، جنھوں نے آئندہ چلکر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی بنا قائم کردی، ایرانیوں کی اس پسند حکمت عملی نے جس سے مقدونیہ کے عرب ہمیشہ بدگمان رہے خلفا کو اس امر پر آمادہ کیا کہ تخت خلافت سے ملحق تنخواہ دار باڈی گارڈ رکھے جائیں اس غرض کے لئے جانباز اور خوش اندام ترک جو شمالی سرحد پر گرفتار ہوئے تھے بہادری اور قابلیت کے لحاظ سے پورے اُترے ان محافظین کی آڑ میں ایرانیوں کی دست درازی اور عربوں کی بغاوت سے بیخوف ہوکر خلفا عیش و نشاط میں منہمک ہوگئے، چنانچہ مامون الرشید کے بعد آئندہ ڈیڑھ سو برس تک ہندوستان پر مسلمانوں کا اور کوئی حملہ نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ ترک سپاہی خلفا کے عقل کل بن گئے، اور ماتحت صوبوں پر اُن کا اثر قائم ہو چلا۔ مصر سے لیکر سمرقند تک یہی قوم ممتاز نظر آنے لگی، اور تمام فارس پر چھا گئی، سامانیوں کی سلطنت اُن کے دست و برد کا نشانہ بن گئی۔ اور اُن کو ہندوستان پر حملہ کرنیکا موقع ہاتھ آگیا۔

الپتگین ان با قتدار ترکی سرداروں میں جو شمالی ایران میں ممتاز عہدوں پر مامور ہوئے۔ الپتگین تھا جو عبدالملک بن نوح بن نظر سامانی کے زمانہ میں بصلہ وہی خدمات والی خراسان ہوگیا تھا، جب منصور سامانی کے جانشینی کا مسئلہ چھڑا تو الپتگین نے بھی جو خاندان سامانیہ کا پروردہ اور امیر شہید ابو نصر احمد بن اسمعیل کا جانثار غلام ترکی نسل سے تھا۔ اراکین سلطنت کی رائے سے اتفاق کرکے عبدالملک کے حق میں تخت نشینی کی رائے دی اس سبب سے منصور الپتگین سے ناراض ہوگیا، الپتگین نے خراسان کو خیرباد کہا اور غزنی پر آکر ایک مختصر سی حکومت قائم کرلی جو اُس وقت تک مختصر سا گاؤں تھا لیکن بعد میں ہندوستان کے شمال و مغرب کوہستانی ملک افغانستان کا جہاں سے راستہ کھلا ہوا تھا، محمود کے زمانہ میں مشہور شہر ہوگیا، الپتگین نے غزنی میں سولہ برس تک حکومت کی اس زمانہ میں اُس کے سپہ سالار سبکتگین نے کئی بار ہندوؤں کے مقابلہ میں فتح حاصل کی

اور اپنی قوت بازو اور خداداد قابلیت کا سکہ بٹھا دیا اور اس طرح استگین کی نام نہاد سلطنت کا رکن اعظم ہوگیا، گو اس وقت عہدہ نظارت پر مامور تھا تاہم سلطنت کے ہر جزو کل پر حاوی تھا۔

استگین نے ۰۰ برس سے زیادہ عمر پاکر ۳۶۵ھ ۹۷۶ء میں وفات پائی آل سامان کا وفادار صادق القول شجاع، مدبر فیاض غلام تھا۔

استگین کے انتقال کے بعد منصور نے اُس کے بیٹے ابو اسحاق کو اس کا ولی عہد قرار دیا، لیکن اسحاق نے جلد وفات پائی امرا نے سبکتگین کے رشد و متانت سے موثر ہو کر اُسے اپنا حاکم تسلیم کر لیا، جس کی شادی بھی استگین کی بیٹی سے ہو چکی تھی۔

سبکتگین سبکتگین کا سلسلۂ نسب بعض مورخوں کے قول کے مطابق یزدجرد شہریار ایران سے ملتا ہے۔ استگین کا غلام[۱] اور اپنے پیش رووں کی طرح امیر کے لقب سے پکارا جاتا تھا بعد میں اُسے امیر عادل کہنے لگے، دربار سامانی سے ناصر الدین کا لقب ملا۔ اُس نے اپنے زمانۂ امارت میں اطراف و جوانب کی طرف لشکر کشی کی اور زمین بست قصدار بادیز طخارستان اور غور قبضہ کیا راجہ جیپال کو باینہمہ حشم و انبوہ کثرت خیلا شکست دی بغرا خاں کا شر دفع کیا جو سامانیوں پر آفت ڈھائے تھا۔ بلخ پہنچکر امیر بخارا کو پھر دوبارہ تخت دلایا اس کے عہد میں بڑے بڑے کام انجام پائے، اس نے خراسان سے باطنیوں کا فساد دور کیا۔ اس کی وجہ سے خاندان غزنویہ کا ستارۂ اقبال درخشاں ہونا شروع ہوا۔

نہایت کریم النفس، خلیق، عادل تھا۔ شجاعت، تدبر اور نیک نیتی کی وجہ سے اُس نے استگین کے دل میں گھر کر لیا تھا، فیاضی کی وجہ سے فوج کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اس کا کرم سپاہیوں کے علاوہ ا۔ اکین سلطنت کو بھی مالا مال کئے تھا۔ رعایا خوشحال تھی اور ہمیشہ اُسے نیکی کے ساتھ یاد کرتی تھی۔

۳۶۶ھ ۷-۹۷۶ء میں اس نے ہندوستان کی سرحد کی طرف رخ کیا اس وقت ولایت لاہور میں سرہند سے لمغان اور کشمیر سے ملتان تک راجہ جیپال کی حکومت تھی، جس کی راجدھانی بھٹنڈہ تھی جو اب ریاست پٹیالہ میں واقع ہے۔ صوبۂ پنجاب سندھ کے اس پار کابل اور قندھار کی قربت سے معرض خطر میں تھا جیپال نے حفظ ما تقدم کے خیال سے دو مرتبہ بڑی بڑی فوجوں سے چڑھائی کی مگر دونوں مرتبہ اُسے ہزیمت ہوئی اور لمغان دریائے اٹک تک مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

---

[۱] تاریخ بیہقی میں سبکتگین کے فروخت ہونے کا واقعہ بالتفصیل درج ہے مشرقی سلطنتوں میں غلام کا خطاب خاص رسالہ شاہی (باڈی گارڈ) کے سپاہیوں کو دیا جاتا تھا، اگر فارس کے کسی بڑے رئیس کا بیٹا بھی اس رسالہ میں داخل ہوتا تو اسے بھی بادشاہ کی غلامی کا دعویٰ ہوتا تھا، جس سے اوروں کو رشک ہوتا تھا۔ عربی زبان میں دو لفظ غلامی کے متعلق ہیں، ایک عبد، دوسرا مولی۔ مولی آزاد شدہ غلام کو کہتے ہیں۔ خلافت عباسیہ نے ایرانیوں کا زور توڑنے کے لئے ترک غلاموں کو جو جہاد میں پکڑے جاتے تھے جنگی تعلیم کے بعد آزاد کر کے اعلیٰ جنگی مناصب دیتے تھے، یہی ترک موالی آگے چلکر سلطنت پر قابض ہو جاتے تھے، عباسیوں سے الگ ہو کر خراسان میں طاہریہ اور سامانیہ ریاستیں قائم ہوگئیں انہوں نے بھی یہی دستور کیا۔ استگین و سبکتگین وغیرہ بھی اسی قسم کے غلام تھے، چونکہ ان کا مورث اعلیٰ غلام تھا اس لئے رسمی حیثیت سے یہ خاندان غلاموں کا خاندان کہلاتا ہے۔ شرعی حیثیت سے یہ عبید کا خاندان نہ تھا، بلکہ موالی سے تھا۔ یہ بھی سچ ہے کہ شریر تاجر چوری سے لڑکوں کو پکڑ یا غریب والدین سے خرید لاتے تھے اور بازاروں میں انکو غلام کہکر بیچتے تھے۔ ایسے لوگ شرع اسلامی کی رو سے غلام نہیں ہو سکتے مگر دوسری قوموں اور مذہبوں میں یہ بھی غلام ہوگئے، اور عرف عام بھی ان کو داغ غلامی سے پاک نہیں کرتا۔

مشاہیر عالم کے نادر شاعرانہ خیالات

(۱)

نیاوبی[ا] (Niobe) کے مجسمہ پر ایک یونانی شاعر کا یہ کتبہ درج ہے:۔

"دیوتاؤں نے میری زندگی کو پتھر میں منتقل کر دیا، اور پراکز ٹیلیز[۲] (Praxiteles) نے مجھے پتھر سے زندگی عطا کی۔"

(۲)

ایک اطالوی شاعر پی کونسرا (P. Concera) تیتری کی پرواز کے متعلق لکھتا ہے:۔

"تیتری اس طرح اڑ رہی ہے جیسے کوئی پھول بیتاب ہوا میں تیر رہا ہو"

(۳)

والی ٹور[۳] (Voiture) کارڈنل رچلو[۴] (Cardinal Richelieu) سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

"عوام الناس کی زبان سے اگر کوئی شخص اپنی تعریف سنے تو اس پر اسکا اثر شعرا کی ثناخوانی سے زیادہ ہوتا ہے"

(۴)

کروانیٹز[۵] (Cervantes) ملفوظات کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ:۔

"ایک سب سے بڑا مرجع فائدہ جو شہزادوں کو دوسرے لوگوں پر حاصل ہے وہ یہ ہے کہ ان کی خدمت کے لئے ان کی مساوی حیثیت رکھنے والے خدام موجود رہتے ہیں"

---

[۱] یونانی روایات کی ایک دیوی،
[۲] اٹیک، (Attica) صناعی کا بہترین بت تراش، ایتھنز کا باشندہ تھا، اور اس کا زمانہ چوتھی صدی قبل مسیح تھا؛
[۳] ایک فرانسیسی شاعر (۱۵۹۸ء — ۱۶۴۸ء)
[۴] مشہور فرانسیسی مدبر (۱۵۸۵ء - ۱۶۴۲ء)
[۵] ہسپانوی ناول نویس، شاعر، اور ڈراماٹسٹ (۱۵۴۷ء -- ۱۶۱۶ء)

(۵)

ایک اطالوی شاعر کا قول ہے جو پلوٹارک کے خیالات میں بھی پایا جاتا ہے کہ:-

"میانڈر[51] (Menander) کے طرب انگیز ڈراموں میں کچھ ایسی مافوق الفطرت نمکینی پائی جاتی ہے کہ گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دریا سے نکلے ہیں جس میں سے زہرہ پیدا ہوئی تھی"

(۶)

غصہ کے متعلق سنیکا[52] (Seneca) کا ایک قیمتی قول ہے کہ:-

"کاش اس جذبہ کی شدت اس کی پہلی نمود کے ساتھ ہی فنا ہو سکتی جیسا کہ شہد کی مکھیوں کی حالت ہے کہ ان کے نیش پہلی مرتبہ کاٹنے کے بعد برباد ہو جاتے ہیں"

(۷)

ارسٹے نیٹس[53] (Aristaenetus) ایک حسین عورت کے متعلق لکھتا ہے کہ:-

"جب وہ لباس فاخرہ سے آراستہ ہوتی ہے تو انتہائی خوبصورت معلوم ہوتی ہے لیکن جب وہ معمولی لباس میں ہوتی ہے تو دلفریب بہت نظر آتی ہے"

(۸)

مینیج[54] (Menage) ایک عورت کی تصویر سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:-

"اے میری حسین محبوبہ! میں تیری تصویر میں ایک ایسی ہستی کی شباہت پاتا ہوں جو ایک مست ساحرہ ہے، اور وہ بعینہٖ تیرے مانند ہے"

(۹)

ایک فرانسیسی شاعر دو عاشقوں کے فوری جذبۂ ہمدردی کو ایک انوکھے طرز سے بیان کرتا ہے۔ ایک شاہزادی اپنی ایک رازداں سے اپنے عشق میں

---

[51] یونانی ڈراما نویس جو طربیہ کے طرب انگیز ڈراموں کا علمبردار تھا (۳۴۲-۲۹۱ ق م)
[52] قرطبہ کا مشہور مقرر (۵۴ ق م - ۳۹ ب م)
[53] یونان کا زبردست طرب انگیز ڈراما نگار اور شاعر (۴۴۸-۳۸۵ ق م)
[54] ایک مشہور فرانسیسی ادیب (۱۶۱۳-۱۶۹۲)

مبتلا ہونے کا یوں ذکر کرتی ہے :

"عالم شباب میں تو خیز دل جذبۂ محبت سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھا، اور مجھ پر فریفتہ ہو گیا۔ میں نے اُسے دیکھا اور محبت کرنے لگی"

(۱۰)

کیلڈران[1] (Calderon) اس سے زیادہ مبالغہ سے کام لیتا ہے، ایک ہی قسم کے موقع پر وہ کہتا ہے :-

"میں نے اُسے دیکھا اور کچھ انتہائی وارفتگی سے اس سے محبت کرنے لگا، کہ مجھے نہیں معلوم کہ کبھی میں نے اسے اس پر فریفتہ ہونے سے پہلے دیکھا تھا، یا اُسے دیکھنے سے قبل میں نے اپنا دل اُس کے نذر کیا تھا۔"

(۱۱)

ایک قدیم فرانسیسی شاعر پچون (Pichon) ایک افسانہ بیان کرتا ہے، ایک عورت کا عاشق ایک دریائی پری کو ایک برگد کے درخت کے نیچے بیہوش پاتا ہے۔ حسن اور دہشت کے تصادم کو ایک لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے :

"اگر محبت نزع کے عالم میں ہوتی تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ وہ یہی ہے۔ اگر موت محبت کر سکتی تو اس کی تصویر اسی طرح اتر سکتی ہے"

(۱۲)

یہی عاشق آخر کار اس بات پر رضامند ہو جاتا ہے کہ اُس کی محبوبہ اس کے رقیب سے محبت کرے، اور اس پیچیدہ موقع پر اپنے جذبات کا اظہار کچھ کم پر لطف طریقہ سے نہیں کرتا۔

"ہاں تیری روح دوہری محبت کی آگ میں جلتی رہے، اوہ، انتھی، اور نبیتی، عشق کے نام سے محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے، اور جب میری زندگی کے آخری لمحوں میں میرے آلام ختم ہونے لگیں، تو اس وقت ایک کو تو اپنی آتش محبت سپرد کرنا، اور دوسرے کو اپنے آنسو نذر کرنا"

(۱۳)

ٹیاسو اپنی محبوبہ دلنواز ارلنڈو کا بیان ایک مصرعہ میں عجیب نزاکت خیال سے بیان کرتا ہے :-

"اتنی زیادہ محبت، اور اتنا زیادہ حجاب"

[1] ایک ہسپانوی شاعر اور ڈراما نویس (۱۶۰۰ء - ۱۶۸۱ء)

(۱۴)

Holcroft[۵] اپنے ترجمہ میں ایک انوکھا خیال پیش کرتا ہے:۔

"وہ جو حجاب اور صداقت سے معمور تھا، محبت زیادہ کرتا تھا، امید کم کرتا تھا، اور تمنا کچھ نہ کرتا تھا"

(۱۵)

ایک بے نظیر تصویر کے متعلق کہا گیا ہے:۔

"آنکھ سے اندازہ لگانے کے لئے اسے تقریر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا پتہ صرف کان سے لگایا جا سکتا ہے"

(۱۶)

ایک الہامی شاعر ایک عاشق کی زبان سے جو اپنی محبوبہ کی موت کے بعد زندہ ہے، اس کے جذبات کو ایک شیریں طریقہ پر اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"میں اس کی موت پر نوحہ کرتا ہوں، اور اپنی زندگی پر ماتم"

عزیز احمد خاں بی۔اے
(حیدرآبادی)

[۵] ایک انگریزی ڈراما نویس اور مترجم (۱۷۴۷-۱۸۰۴ء)

نظم انتظار پر ایک سرسری نظر

نگار جس حیثیت کا ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کے اکثر مضامین بہتر ہوتے ہیں۔ مجھے اس پرچہ سے ایک گونہ دلچسپی ہے، خذ ما صفا دع ما کدر پر عمل کرتا ہوں۔ ہر شے میں کچھ نہ کچھ حسن و قبح فطرتاً رہا ہے۔ نیاز صاحب کوئی معصوم ہستی نہیں کہ جن کے پرچہ میں سوائے خوبیوں کے برائیاں نہوں نثر یا نظم بعض اوقات خاطراً شائع کرنی پڑتی ہے، اس وقت پرچہ میں عیب و حسن کا ایک مجموعہ رہتا ہے۔ اگر مضمون قابل و فاضل مضمون نگار سے حاصل ہوا ہے تو پرچہ میں ایک نمایاں خوبی معلوم ہوگی۔ اور اگر کسی نومشق صاحب نے عنایت فرمائی تو .... اگر ایڈیٹر صاحب کا نوٹ نہ ہوتا تو مجھے قلم اٹھانے کی ضرورت مجبور نہ کرتی۔ حال کی اشاعت میں مشہور و معروف جگر صاحب مرادآبادی کی ایک نظم بعنوان انتظار شائع ہوئی ہے، اس میں مجھے کچھ شکوک ہیں۔ غالباً فاضل مسؤل تسکین فرمائیں گے، میری نیت نہ پوچھیے جب اس نوٹ کو دیکھتا ہوں اور یہ نظر پڑتی جاتی ہے (نظم انتظار میں حضرت جگر نے شوق کی وارفتگی و محویت کے عالم خیال کا تتبع کیا ہے اور کامیاب رہے ہیں) حضرت نیاز با ایں فروگذاشت کامیاب سمجھے ہوئے ہیں، فاضل ایڈیٹر سے مجھے شکوہ ہے، شاید ان دیکھے آپ نے نوٹ لکھا ہے ورنہ یہی نظم غلطیاں ہیں۔ ناظرین کے حسن نظر کو بجائے لطف کے تکلیف ہو کیا معنی۔ گہری نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس سے زیادہ اغلاط کا احساس ہوگا۔ مختصراً سے اندراز ہے، ملاحظہ ہو شعر

لے سکی نہ کام کچھ صبر سے قرار سے
ہونٹھ ہل کے رہ گئے بوسۂ عذار سے

اس شعر کا مفہوم کم از کم میرے احاطۂ فہم سے باہر ہے، مگر ما قبل و ما بعد کے اشعار پڑھنے سے یہ سمجھ میں آتا ہے، کہ جیسے کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر لفظ نہیں ملتے ہیں غیر ضروری الفاظ میں کہہ جاتا ہے، کہنا یہ ہے کہ جب جذب خیال نے اس کی صورت پیش کر دی، اس خیال کی مقصد آفرینی سے بیحد محظوظ ہوئی دل میں بوسہ لینے کا تصور آیا۔ مد شغولیت یہ کہ خیالی تصویر کو واقعی سمجھ کر ہونٹھ ہل کر رہ گئے، اس مبالغہ جذبہ سے آگاہ ہوتے ہی میں شرم سے کٹ گئی، اور سر جھکا کے رہ گئی، چونکہ اس سے دور تھی اس جذبہ کی ناکامیابی کے سبب سے لب چبا کر رہ گئی، اشعار پیش کرتا ہوں کیا ان سے یہ مطلب صاف طور سے ظاہر ہو سکتا ہے، ملاحظہ ہوں۔

جذب دل بڑھا دیا نازش جمال نے　　اس کو لا کے روبرو کر دیا خیال نے
لے سکی نہ کام کچھ صبر سے قرار سے　　ہونٹھ ہل کے رہ گئے بوسۂ عذار سے
شرم سے میں کٹ گئی سر جھکا کے رہ گئی　　اس سے دور تھی بہت لب چبا کے رہ گئی

.... دوسری مثال ملاحظہ ہو۔

کپڑے پہ ہیں انگلیاں اور سوئی پر نظر　　بار بار انگلیوں میں سوئی چبھتی ہے، مگر

مطلب یہ ہے کہ وقت کاٹنے کیلئے کچھ سینے پرونے کا مشغلہ کیا گیا، اور قاعدہ کے ساتھ تاکہ خیال بٹ جانے سے سوئی دن جو اور زمانہ جوکہ بغیر لاگ کی دل سے بڑھ رہا ہے آسانی سے ختم ہوجائے، مطلب تو خیر ادا ہوگیا مگر لفظ سوئی کے استعمال سے مصرعہ ثانی کی گت بن گئی، سوئی کے ساتھ بوجھاڑ یا واری کی پٹھی لکھی بیٹھنے والیاں خفت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، لیکن اب میر کا زمانہ نہیں ہے۔ معاف فرمائیگا، اگر ادھر کو آپ بہکیئے تو کوئی صاحب فہم صحیح نہ مانیگا۔ اس لفظ کے استعمال میں کلام ہے۔ سند کی ضرورت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیسری مثال

اے خط حبیب تونے وہ سلوک ہو کیا
ہوں اسی خیال میں کچھ کہوں میں کیا بھلا

مصرعہ ثانی میں بھلا کا لفظ کس قدر بُرا معلوم ہوتا ہے، اگر صلا کا لفظ استعمال کیا جاتا تو کیا نقصان تھا، وہی مضمون جو آپ ادا کرنا چاہتے تھے ادا ہوجاتا اور کوئی قباحت بھی نہ ہوتی نہ شعر میں بندش کا عیب ہوتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چوتھی مثال

دن تو گھٹ گیا مگر اضطراب بڑھ چلا
ہونے کو ہوئی تو شام پیچ و تاب بڑھ چلا

دن کا گھٹنا اور اضطراب کا بڑھنا، سبحان اللہ آپ تو انگریزی داں اور قابل گریجویٹ ہیں، آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ کس مہینے سے دن بڑھنا شروع ہوتا اور کس مہینے سے گھٹتا، یہ موقع گھٹنے کے استعمال کرنیکا نہیں ہے۔ رعایت لفظی کے خیال نے خلاف محاورہ عمل کرنے پر مجبور کردیا، اگر یوں ہوتا تو کونسا عیب پیدا ہوجاتا "دن تو کٹ گیا مگر اضطراب بڑھ چلا" جس طرح آپنے پہلے مصرعہ میں تو کے لئے مگر استعمال کیا ہے اسی طرح سے دوسرا مصرعہ بھی چاہتا ہے، مگر اس کمی نے مصرعہ کو کمزور کردیا یوں ہونا چاہیئے تھا "شام تو ہوئی مگر پیچ و تاب بڑھ چلا" نثر میں یوں کوئی نہ کہے گا ہونے کو ہوئی تو شام پیچ و تاب بڑھ چلا۔ بغیر مگر کے مصرعہ کی وضع مگر چاہتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالانکہ اسی نظم کے پہلے شعر میں آپ نے رات کے لئے "دگلنا" استعمال کیا ہے۔ مگر معلوم یہاں کیا جی میں آگئی۔

کہاں تک لکھوں، ایک یہ شعر بھی کمبختی سے میری سمجھ میں نہیں آتا۔

آج چمکا ہے نصیب کیا بتاؤں کیا ہوں میں
اسکو سمجھیں گے وہی شانِ کبریا ہوں میں

شانِ کبریائی میری سمجھ میں نہیں آتی، اسی طرح یہ شعر بھی غور طلب ہے۔

کھینچنے لگتی ہیں رگیں شوق اگر دباتی ہوں
جان لب پہ آتی ہے آگ اگر بجھاتی ہوں

شوق کا دبانا سند طلب ہے، دوسرے مصرعہ میں آگ اگر تنافر کلمات ظاہر کر رہا ہے، اگر یہ نہوتا تو خوب تھا

جعفر مہدی رزم رددوی

مرتضیٰ جاسوس

(۱)

مرتضیٰ مجہول النسب تھا۔ اُس کی ولدیت مشتبہ تھی۔ وہ ایسے مقام پر پیدا ہوا تھا جو برٹش سلطنتوں کی سرحد پر تھی۔ اس کا باپ ایک فوجی افسر کا خانساماں تھا۔ اس افسر کی ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہی مرتضیٰ کے باپ کا انتقال ہوگیا، اور اب مرتضیٰ بے یار و مددگار [illegible] کی حراست میں رہ گیا۔ اتفاق دیکھئے کہ قسمت اُس کو ایسے ملک میں لے آئی جو مغرب میں تھا [illegible] اپنی خداداد قابلیت اور فطری ذہانت سے سرعت کے ساتھ ترقی کرتا رہا۔ اور تمام مشکلات پر غالب آتا رہا۔ [illegible] مربی سرپرست کے [illegible] نیک ذوق اور قابلیت کی [illegible] مرتضیٰ کی ترقی کی ان اداؤں کو ابتدا ہی میں فوراً تاڑ لیا تھا، کیونکہ [illegible] اور اس جیسے بچے [illegible] طور پر [illegible]

مرتضیٰ شرارت کا پتلا تھا اور پنشن یافتہ کرنیل نے [illegible] قدیم وفادار خادم کی خدمت اور وفاداری سے متاثر تھا اس لئے اُس نے کچھ تو مرتضیٰ کے باپ کی وفاداری کے صلے میں اور زیادہ تر مرتضیٰ کے آئندہ خوفناک عزائم سے متاثر ہو کر [illegible] کرنیل مذکور نے مرتضیٰ کو ایک سکول کے بورڈنگ میں داخل کرا دیا۔ یہ تعلیم کو اس طرح حاصل کرنے لگا جس طرح بھوکا بھیڑیا [illegible] چند سال [illegible] لڑکے نے اسکول ہی میں تعلیم پائی اب اگرچہ وہ سکول کی لگاتار اور پُر از قیود زندگی سے کچھ برداشتہ خاطر سا ہوگیا تھا لیکن سکول کا [illegible] ہیڈ ماسٹر [illegible] مرتضیٰ سے ساتھ نرمی اور فیاضی سے پیش آتا تھا، اور وہ اس کو ایک ہونہار طالب علم سمجھتا تھا۔ اس میں ایک ہوشیار [illegible] ہونے کی علامات ابھی سے نظر آنے لگیں۔ اور پھر لطف یہ کہ جن لوگوں کو ناپسند کرتا تھا، وہ بھی اس کو عزیز رکھتے تھے۔

مرتضیٰ بالآخر سکول کے امتحان میں اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوا اور [illegible] کالج میں داخل ہوگیا۔ اس نے اپنی اعلیٰ تعلیم شروع کرنے سے قبل چند روز ہنستے بولتے اپنے محسن و سرپرست کے ہاں گذرے اور اس دوران قیام میں کرنیل موصوف نے [illegible] ایک سیاسی دوست سے مرتضیٰ کا تعارف کرایا۔ یہ افسر مرتضیٰ کی قابلیت، ذہانت، ذکاوت اور شوقِ ترقی سے بیحد متاثر ہوا اور وہ اس کو دفتر خارجہ کے محکمۂ جاسوسی کے ہیڈ کوارٹر میں اپنے ہمراہ لے گیا۔ افسر مذکور نے مرتضیٰ کی قابلیت کا امتحان لیا اور مختلف طریقوں سے جانچا۔ مندرجہ بالا افسر مرتضیٰ کو ایک خاص کام پر لگانا چاہتا تھا۔ مرتضیٰ کی قابلیت کے متعلق ناظرین نے افسر کی رائے کی بالاتفاق تائید کی اور اس انتخاب کی داد دی۔

نوجوان مرتضیٰ کی اس کے نئے دوستوں نے خوب خاطر مدارات کی، اور جب انھوں نے اپنی مخفی تجاویز کی تکمیل کے لئے مرتضیٰ کو رازدار، ذمہ دار اور مستعد پایا نیز اُن کو یہ بھی اطمینان ہوگیا کہ یہ بھی اس قسم کی زندگی سے کچھ بیزار نہیں تو اس اولوالعزم نوجوان کو جو اپنی حیات کو بامِ عروج پر دیکھنے کا آرزومند تھا، افسر اعلیٰ کے سامنے پیش کر دیا گیا، افسر نے اس کی خواہشات کے متعلق متعدد سوالات کئے، اور مطمئن ہونے کے بعد مرتضیٰ کو یقین دلایا کہ اگر وہ اپنے نامعلوم آقاؤں کی خدمت مستعدی اور کورانہ عقیدت کے ساتھ کریگا تو اس کے لئے روپیہ کی کچھ کمی نہیں۔

افسر اجنبی نے اس سے کہا "نوجوان دوست" یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ الوالعزمی کی زندگی ہی ایک شاندار زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کے چند سال اگر حیرت انگیز تجربات کی تلاش، غیر ملکوں میں سفر، ہر قسم کے آدمیوں سے ملاقات، ان کی خصوصیات، خصائل، عادات و اطوار اور ان کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنے اور مطالعہ میں صرف ہوں تو یہ زمانہ انسان کی زندگی کا بہترین زمانہ کہنا چاہیئے۔

افسر مذکور اس سلسلۂ تقریر میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ اپنے سامع (مرتضیٰ) کے چہرہ کو غور سے دیکھا، اور پھر سلسلۂ کلام اس طرح شروع کیا میں ایک عالمگیر نظام کا ڈپٹی چیف ڈائریکٹر ہوں جس کے نمائندے تعلیم یافتہ اور ذی مقدرت لوگ ہیں، اور وہ انسانی خیالات کے مد و جزر کے مطالعہ میں مصروف ہیں اور دیکھ رہے ہیں کہ سیاسی تحریکات کے رو مختلف ممالک میں کس رخ کو جا رہی ہے۔ تم ابھی بہت کم عمر ہو، اس وقت تم ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن ہم تم کو تعلیم دے کر ترقی کے ایسے زینہ تک پہنچا سکتے ہیں کہ تم ہماری جماعت میں ایک قابل قدر اور بہترین آدمی شمار ہونے لگو، لیکن اس راہ میں تمہیں پہلا قدم اس طرح اٹھانا چاہیئے کہ جس قدر بھی تم سے ہو سکے، حصول علم میں منہمک اور مشغول ہو جاؤ، اور جتنی زبانیں بھی تم سیکھ سکتے ہو سیکھ لو، اور جن لوگوں سے تمہیں دلچسپی ہو ان لوگوں کی حرکات و سکنات معلوم کرنے میں اس قدر مشاق اور ماہر ہو جاؤ کہ فوراً ان کے عندیہ کو سمجھ سکو، امید ہے کہ اب تم سرسری مطلب بخوبی سمجھ گئے ہو گے

اب ڈائریکٹر خاموش ہو گیا اور جو میز اس کے سامنے تھی اس میں سے اس نے ایک پنسل نکالی اور میز پر پنسل سے آہستہ آہستہ کھٹ کھٹ کرنے لگا۔

نوجوان مرتضیٰ ابھی بالکل ناتجربہ کار تھا، اور ڈائریکٹر کی تقریر کا اصلی مطلب قطعاً نہیں سمجھ سکا تھا، وہ حصول علم، تجارت و سفر کے مصارف کیلئے خاطر خواہ روپیہ کے موعودہ مواقع کے خیال سے مبہوت و مسحور سا ہو گیا اور اپنے ممتاز و معزز میزبان کی ہر تجویز کو بکمال شوق منظور کر لیا۔ اب افسر اپنی کرسی پر سے اٹھا تاکہ اپنے نوگرفتار شکار کو ان باتوں کے سوچنے اور سمجھنے کے لئے موقعہ دے، اس نے اپنے مکان اور آراستہ کمرے کی کھڑکیوں کو کھول دیا، یہ کمرہ خاص ڈائریکٹر کے تفریحی دیہاتی محل کا دارالمطالعہ تھا، اور شاداب باغوں اور گلزاروں کے درمیان واقع تھا۔ صبح کا سہانا وقت تھا آفتاب عالمتاب اپنی خوشگوار روشنی اور تمازت کے ساتھ ان کھڑکیوں میں جلوہ ریزیاں کر رہا تھا، اس سرد اور کہر زدہ جزیرہ میں آفتاب کا اس شان سے نمودار ہونا ایک بالکل نئی بات تھی، اور نسیم سحری کے عطر بیز پھولوں کی مہک سے لدے ہوئے جھونکے اندر آ رہے تھے جنہوں نے انسانی جذبات کو مخمور و مسحور کر رکھا تھا۔ ڈائریکٹر واپس آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مرتضیٰ کے چہرے پر تبسم کے آثار دیکھے۔ مرتضیٰ نذرین توقعات کے ہجوم اور عطر بیز ہوا کے جھونکوں سے مسحور ہو رہا تھا۔

ڈائریکٹر نے دریافت کیا "غالباً تم آخری فیصلہ سے قبل یہ تجویز اپنے والدین کے سامنے پیش کرنی چاہتے ہو؟"

مرتضیٰ نے کہا میرے سر سے والدین کا سایہ اٹھ چکا ہے اور نہ میرا کوئی گھر ہے نہ ٹھکانہ، میں مشرق میں پیدا ہوا، اور میرے محسن کرنیل نے میری پرورش کی۔ اس ہی کے مکان پر پہلی مرتبہ آپ سے ملاقات ہوئی یہ کرنیل ہی میرا محافظ و سرپرست ہے، غرضیکہ میرا سب کچھ وہی ہے میں اب تک اپنی مادری زبان جانتا ہوں، میری ساری پونجی جو مجھے اپنے وطن سے ملی ہے وہ یہی ہے۔"

ڈائریکٹر نے کہا میں یہ سب کچھ پہلے ہی جانتا ہوں میں نے تو صرف اس امر کے دریافت کرنے کے لئے تم سے سوال کیا ہے کہ تمہارے شفیق بوڑھے کرنیل کے علاوہ جو تمہارا سرپرست ہے۔ آیا دنیا میں کوئی اور دوست بھی تمہارا ہے؟ ایک حیثیت سے تو بہت سے آدمیوں کی نسبت تم ہماری

جماعت میں شریک ہونے کے لئے زیادہ موزوں ہو میں اپنی جماعت کا نام تم کو بتلا چکا ہوں، چند روز میں تم کو اس ملک کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی میں بھیجدیا جائیگا، اور ہم تمھارے تمام اخراجات کے کفیل ہوں گے، ور تمھاری تمام دوسری ضروریات کا بھی خیال رکھیں گے، ہمیں امید ہے جو حیرت انگیز موقع تمہیں حاصل ہے اوس سے فائدہ اوٹھاؤ گے اور کالج میں بہترین نمونہ ہوگے، اب محکمہ جاسوس کے افسر نے اپنے سحر کار الفاظ کا اثر دیکھا کہ نوجوان ان الفاظ سے بہت زیادہ متاثر ہوا ہے، اس نے اپنی آخری تقریر سحر آگیں ختم کرتے ہوئے نوجوان کو مکرر یقین دلایا کہ اس کے سرپرست اُس کی ہر ممکن طریقہ سے امداد کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔

چند روز کے بعد نوجوان مرتضیٰ یونیورسٹی میں داخل ہونے کے لئے روانہ ہوا۔ جس کو اخراجات کے لئے بہت زیادہ روپیہ دیا گیا، اور ساتھ ہی تعارف کے خطوط یونیورسٹی کے ان ارباب حل و عقد کے نام دئیے گئے جن کے ذمہ غیر ملکی طلبا کی سرگرمیوں کی نگاہداشت کا کام تھا۔ یونیورسٹی ہرا دنیا کی مشہور ترین درس گاہ تھی، مرتضیٰ نے بہت جلد یونیورسٹی کے تعلیم کے زمانہ میں ہی اپنے سرپرستوں کے تمام توقعات کو جو انھوں نے مرتضیٰ سے وابستہ کر رکھی تھیں پورا کیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک محنتی طالب علم ثابت کیا، اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اُن لوگوں کی نہایت مفید امداد کی جو ایسے طلبا کی نگرانی میں مصروف تھے، جن کی حرکات و سکنات سے حکومت کو خاص دلچسپی تھی۔ یونیورسٹی کے طویل قیام اور عام معلومات میں اضافہ کی وجہ سے، مرتضیٰ نے رفتہ رفتہ اپنے مشن کے مقصد اعظم کو معلوم کر لیا جس کے لئے وہ نامعلوم طور پر آلہ کار بنایا گیا تھا۔

مرتضیٰ کی آزاد خیالی کا یہ عالم تھا کہ اُس نے ملکی مذہبی اور رشتہ داری کی محدود زنجیروں کو توڑ دیا اور وہ آزادی اور خود مختاری کی جس منزل میں تھا وہ اس کے لئے بہت پسندیدہ تھی وہ اپنی وسعت مطالعہ، اور خداداد ذہانت کی وجہ سے ایک ہوشیار اور کامیاب جاسوس بن گیا اور اپنے جدید سرپرستوں کی اعلیٰ اور بہترین آرا اپنے حق میں حاصل کیں۔ اور اُن کی نظروں میں عزیز بن گیا۔

یونیورسٹی کے داخلہ کے تین سال بعد وہ گریجویٹ ہو گیا اور اس نے جدید علم سیاست اور حکمت عملی میں امتیازی کامیابی حاصل کی، گریجویٹ ہونیکے بعد اس کی طبیعت کا رجحان قانونی تعلیم کی جانب تھا، لیکن یہ نوجوان امیدوار اپنی آرزو پوری نہ کرسکا۔ اس کی پرانی مشکلات زندگی کے تجربہ کی وجہ سے اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ مالی حیثیت سے دوسروں کا دست نگر ہے۔ لہذا اسے ایسی راہ اختیار نہ کرنی چاہئیے جو مالی مجبوری کی وجہ سے مشکلات سے اتنی پرُ ہے کہ وہ اختیار کر بھی نہیں سکتا۔

بالآخر اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہونیکے بعد اس نے خود کو اپنے آقا کے دیہاتی تفریحی محل میں پایا، جس کی دور اندیشی نے مرتضیٰ کے خیالات کو اپنے مستقبل کے فکر پر متوجہ ہونے سے روکدیا۔ چند ہفتے اس کو آرام کرنے کے لئے دئیے گئے تاکہ اس کے دماغ کو یکسوئی حاصل ہو سکے، اور وہ اپنے میزبان کے صرفہ پر کچھ وقت سیر و تفریح میں گذار سکے، موسم خزاں کے آنے پر ڈائرکیٹر نے، مرتضیٰ کو اپنے ارادہ سے مطلع کیا کہ اب وہ مرتضیٰ کو ہیڈ کوارٹر پہ لے جائے گا۔

مرتضیٰ نے مصنوعی تعجب سے دریافت کیا "کونسا ہیڈ کوارٹر"؟

ڈائرکیٹر نے کہا "عزیز من مرتضیٰ محکمہ سیاسی کے سراغرسانی کا ہیڈ کوارٹر" تم اسی محکمہ کے طفیل میں قابل اور لائق بنے ہو۔ حکومت کے دفتر خارجہ نے محکمہ سراغرسانی سے میرا تعلق ہے اور ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم دیگر تمام دنیوی تعلقات کو منقطع کرکے اپنے آقاؤں کی خدمات کو کامل یکسوئی

اور مستعدی سے انجام دیں۔ اس کے بعد ڈائرکیٹر نے ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ اس سے کہا آپ تو تم کام کی اندرونی حالت کو یقیناً سمجھ گئے ہو گے کیونکہ ابتک تم کامیابی سے اس کام کو انجام دیتے رہے ہو۔ تمہاری یونیورسٹی کے احباب جنھوں نے تمہاری تعلیم پر روپیہ خرچ کیا ہے انھوں نے تمہاری قابلیت کے متعلق عمدہ رائے ظاہر کی ہے، میں ہرگز خیال نہیں کرسکتا کہ تم سا سمجھدار نوجوان زیادہ ٹھوس کام کے موقع کو ہاتھ سے جانے دیگا۔

یونیورسٹی کی تعلیم تو اس کام کے لئے ایک تیاری تھی۔ مرتضیٰ نے صرف گردن کی حرکت سے خاموشی کے ساتھ ڈاکٹر کی تمام تقریر کا جواب دیا، اس اثنا میں وہ اپنے مستقبل کے ان امکانات پر غور کرتا رہا جن سے وہ مایوس ہو چکا تھا۔

دوسرے دن وہ اپنے میزبان کے ساتھ ہیڈ کوارٹر کو روانہ ہو گیا، اور مقام مقصود پر پہنچکر ڈائرکیٹر نے اندر لیجا کر متعدد کمروں کی سیر کرائی، یہ کمرے مختلف اقسام کے ساز و سامان۔ کتابیں، خفیہ کاغذات، مہریں، وضع وضع کی وردیں، عجیب و غریب آلات، کیمیاوی اشیاء، اور اسلحہ سے بھرے پڑے تھے، یہ سب کچھ ان لوگوں کے استعمال کے لئے تھا جو محکمہ سیاسی سراغرسانی میں جاسوسی کو پیشہ کی حیثیت سے اختیار کرتے تھے۔

محکمہ سیاسی کے خفیہ سراغرساں کے صدر دفتر کے اس مخصوص شعبہ کو مرتضیٰ نے ایک اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ۔ اسلحہ خانہ اور دارالتجربہ کا ایک مجموعہ سمجھا مرتضیٰ نے ایسے عجیب و غریب آلات اور سامان کے حیرت انگیز مجموعہ کو اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اس لئے مرتضیٰ نے اس مخفی تجارت کے ان عجیب و غریب آلات کے بڑے ذخیرہ کو نہایت غور اور ٹکٹکی باندھکر دیکھا، اور وہ خوف و تحیر سا ہو گیا۔ مرتضیٰ کا مکار رفیق اس کے احساسات اور جذبات کی حالت کو تاڑ گیا، جب مرتضیٰ نے بعض اشیاء کے استعمال کے متعلق شوق آمیز استفسارات کئے تو وہ مطمئن ہو گیا!

مرکزی محکمہ خفیہ خبر رسانی کے پر اسرار کمروں کے دیکھنے کے بعد کمروں کی عجیب و غریب اشیا کو دیکھکر مرتضیٰ بالکل مبہوت و مسحور ہو گیا، ہکہ بکہ ہو کر اپنے رہنما سے کہہ اٹھا کہ یہ تو ایک عجیب عالم ہے، یہاں انسانی معلومات کی کوئی حد نہیں، ہر نئی چیز ایسی اشیاء کی ایک غیر محدود معلومات کی کوئی حد نہیں کے دروازے کھولدیتی ہے، جو اب بھی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ ڈائرکیٹر نے کہا کہ ابھی تو تمہارے استعجاب و تحیر کا آغاز ہی ہے آگے چلکر تو ابھی تم بڑے بڑے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہو گا۔ اور یہ راز تم اور مجھ جیسے انسانوں کی تمام عمر کی محنت شاقہ اور جانفشانی کا نتیجہ ہیں، گھنٹے نے گیارہ بجائے اور یہ دونوں حضرات جو ابھی محکمہ مرکزی کے خفیہ کمروں کی سیر کر چکے تھے اب ڈائرکیٹر جنرل محکمہ خفیہ خبر رسانی کے پرائیویٹ کمرے میں بغرض ملاقات گئے۔ ایک اردلی نے انھیں ملاقات کے ایک چھوٹے سے کمرہ میں بٹھا دیا، جہاں انھوں نے کوئی ایک منٹ انتظار کیا ہو گا کہ کمرے میں ایک گھنٹی بجی مرتضیٰ اور اس کا رفیق باہر آئے اور ایک بڑے ملحقہ کمرے کے دروازہ کھولکر اندر داخل ہو گئے، وہ ایک ایسے آدمی کے دفتر کی میز کے سامنے پہنچے جو انسانی طبائع کے ضروری اور قیمتی معلومات کے متعلق ان دونوں سے زیادہ عالم اور ماہر تھا۔ اسکی میز پر کاغذات کے انبار اور مثلوں کے ڈھیر سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کام میں نہایت سرگرمی سے مصروف ہے۔

ڈائرکٹر جنرل نے اپنا سر اٹھایا اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ اس کا شباب اور گزشتہ زمانہ پاکبازی سے گذرا ہے۔ یہ شخص عورتوں کا سا لباس پہنے تھا۔ . . . .

دیوار میں متعدد بلند الماریاں تھیں، ان میں چھوٹی بڑی سب طرح کی مثلیں، کتابیں اور ضروری کاغذات رکھے تھے، فرش پر ایک خوبصورت قالین بچھا تھا میز کے گرد تین بڑی بڑی کرسیاں رکھی تھیں۔ کتابوں کی ایک گھومنے والی الماری اور دیگر ضروری ساز و سامان رکھا تھا، اور ایک چھوٹا سا

ٹیلیفون بھی تھا۔ یہ سب چیزیں بائیں ہاتھ کو تھیں اور داہنی جانب دفتر کی میز تھی۔ ڈائرکٹر جنرل اپنے ملاقاتیوں کو خوش آمدید کہنے کیلئے اٹھا، اور گرمجوشی کے ساتھ ان نو وارد حضرات سے مصافحہ کرنے کے بعد مرتضیٰ کو اچھی نظروں سے دیکھا، اور پھر کرسی پر بیٹھکر پائپ پینے لگا۔

اُس نے بے تکلفانہ انداز سے کہا کہ مرتضیٰ گزشتہ سال شب کو رقص و سرود کے جلسے میں تم نے اپنے رفیق کو کیسا پایا۔ یقیناً تم نے ہمیں اس طالعلم کے تمام حالات نہیں بتائے جو مشرقی ہے۔ یہ کاغذ مجھے یہ یقین ہے کہ تم اس کے متعلق زیادہ تجسس نہ کرسکے؟

ڈائرکٹر جنرل نے ایک تشریف تمام نفتیش کے چہرے پر ڈالی جس کی نگرانی میں مرتضیٰ ابتک تھا، جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ایک دو مرتبہ پائپ کے کش زور سے لگائے، جو موتی کے عجائب خانہ کی سیر، محکمۂ خفیہ خبر رسانی سے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے والوں کی آتنی کثیر تعداد، اور ڈائرکٹر جنرل کی شستہ اور غیر معمولی معلومات، اور خبر رسانی کا ایک وسیع نظام یہ ایسی چیزیں تھیں کہ جنہوں نے مرتضیٰ کو مبہوت اور بھونچکا بنا دیا تھا۔ مرتضیٰ ایک معمل اور غیر فصیح زبان میں اس طرح بڑبڑایا کہ وہ خود بھی مطلب نہ سمجھ سکا۔ چیف آفیسر کچھ مسکرایا اور پھر اپنے رفیق سے مخاطب ہو کر کہا مرتضیٰ اگرچہ خاموش ہے لیکن میں یہ ضرور کہونگا کہ یہ اپنی نو آموزی پر کامیابی سے غالب آیا ہے۔ اب تو صرف ضرورت ہے کہ وہ کوئی زیادہ سخت اور دلیرانہ کام کرے جس سے کہ یہ ثابت ہو جائے کہ یقیناً ایک جوہر قابل ثابت ہوگا۔ اس کے بعد ڈائرکٹر جنرل نے اس کی صحت دریافت کی، اور پوچھا کہ اس کی خاص دلچسپی کیا ہے اور اسے کس چیز کی طرف زیادہ رغبت ہے، اور یہ کہ آیا اس نے ابھی تک کسی عارضی کام میں مصروفیت کا ارادہ تو نہیں کیا ہے۔ مرتضیٰ نے آخری سوال کا جواب نفی میں دیا۔ جس سے افسر مطمئن ہو گیا۔ وہ مرتضیٰ کے جوابات سے مطمئن ہو کر مرتضیٰ کی پاس والی کرسی پر جا بیٹھا اور مرتضیٰ کو اس طرح مخاطب کیا۔ "مرتضیٰ تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارا سب سے بڑا محسن اور مربی ابتک اس سلطنت کے محکمہ خفیہ خبر رسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ تم اس ملک کے باشندے نہیں ہو لیکن قیافہ شناسی میں تمہاری غیر معمولی قابلیت تمہارے نرم اور ملائم بال، غیر ملکی زبانوں کے سیکھنے کا تمہارا شوق اور عادت و اطوار تمہارے لئے محکمہ ہذا کی سرپرستی حاصل کرنے کے لئے زبردست سفارشیں تھیں، اس محکمہ کا افسر اعلیٰ میں ہوں تم نے خود کو ایک کامیاب مبصر ثابت کیا ہے، اور محکمہ ہذا نے تمہاری تعلیم پر ہزارہا روپیہ خرچ کیا ہے، لہٰذا میں تم کو اپنے محکمہ خفیہ خبر رسانی میں بطور ایک ایجنٹ کے بھرتی کرتا ہوں۔"

اب افسر اعلیٰ نے ذرا توقف کیا، اور مرتضیٰ کے چہرہ پر ایک متاثر کن نظر ڈالی، قبل اس کے کہ موخر الذکر افسر کی مبہوت کن تقریر اور اپنے سامنے کی ہوش ربا منظر کے اثرات کی وجہ سے اپنے حواس درست کرسکتا، کہ افسر نے اپنے دونو ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دئیے اور اس کی آنکھوں کی طرف دیکھکر نہایت سنجیدگی سے کہا، "یاد رکھو جو کچھ تم سے کہا جائے، اس کو وفاداری سے کرو۔ اور اپنی مشکلات میں سلطنت کے غیر محدود اور وسیع ذرائع پر اعتماد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ ذراسی لغزش اور ادنیٰ سی غداری تمہارے لئے پیام موت ہے۔" افسر نے اب پھر ذرا توقف کیا اور اپنے رفیق کی طرف اشارہ کیا، جو اس تماشہ بینی میں بالکل خاموش و ساکت بیٹھا تھا، تینوں اب اس خاص کمرے سے اٹھے، افسر اعلیٰ میز کی دائیں جانب گیا اور ٹیلیفون کی "کی بورڈ" کا ایک سرخ بٹن دبا دیا۔ کوئی تین منٹ بعد چار افسر بالکل سیاہ کوٹ پہنے کمرے کے اندر داخل ہوئے، اور مرتضیٰ کے گرد ایک زرد رنگ کی تھیلی جس میں ایک ... تین چیز بھری تھی، ایک ... ل، ایک بڑا چاقو اور ایک گز لمبی ریشم کی ڈوری، یہ سب اشیاء اس نے مرتضیٰ کے سامنے والی میز کے اوپر رکھدیں اور ایک پر رعب الفاظ میں اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم مندرجہ ذیل الفاظ کو دوہرا کر قسم حلف ادا کرو

"میں مرتضیٰ اپنے تمام محبوب و مطلوب اشخاص و اشیاء سے اپنا تعلق"
"منقطع کرتا ہوں اور میں اس جھنڈے کی قسم کھاتا ہوں کہ میں محکمہ جاسوسی"
"کے افسر اعلیٰ کے تمام احکام کی تعمیل پوری گرم جوشی سے بغیر چون و چرا"
"کرتا رہوں گا اور میں اپنی زندگی کے آخر لمحہ تک اس جھنڈے کی عزت"
"قائم رکھوں گا خواہ اس میں میری جان ہی جائے"

مرتضیٰ نے حسب الحکم تین مرتبہ حلف کے الفاظ کو دہرایا اور خاتمہ پر حاضرین نے اس کو گرم جوشی سے مبارکباد دی۔ افسر اعلیٰ نے ایک خوبصورت اور دیدہ زیب مجلد کتاب نکالی جس کی جلد سرخ رنگ کے چمڑے کی تھی اس پر مرتضیٰ نے اپنا نام لکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے نشان لگائے اور جھنڈے سے وفاداری کی حلف کے الفاظ تحریر کئے۔ افسر اعلیٰ نے اس وقت کچھ مزید تفصیلات اس کے ذہن نشین کیں اور پھر متانت کے ساتھ کہا۔ "تم مرتضیٰ خفیہ خبر رسانی کی ملازمت میں بطور ایجنٹ نمبر ۳ باقاعدہ بھرتی کر لیا گیا"۔

افسروں نے بھی رجسٹر پر اپنے دستخط ثبت کئے اور پھر مرتضیٰ اور اس کے رفیق سے گرم جوشی سے مصافحہ کے بعد کمرہ سے چلے گئے۔ اس کے بعد افسر اعلیٰ نے اس سے کہا "عزیزم مرتضیٰ! آج سے تم کو ایک ماہ کی رخصت آرام کے لئے دی جاتی ہے اس کے بعد تمہارے رفیق جو مشرقی شعبہ کے ڈائرکٹر ہیں تم کو ضروری ہدایات اور متعلقہ کاغذات دیں گے جو تمہارے نئے فرائض کے متعلق ہوں گے"۔ افسر نے دروازہ تک اُن کی مشایعت کی اور ان کو محبت و احترام سے رخصت کیا۔

نوجوان مرتضیٰ اپنے رفیق کے پیچھے پیچھے اس خوفناک عمارت سے باہر نکلا جو حیرت زا عجائبات اور رعب کا خزانہ تھی۔ مرتضیٰ کو اب بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے اور اپنے رفیق کے چند سوالات کے مختصر جوابات کے علاوہ وہ اب بھی بالکل خاموش تھا۔ بالآخر وہ ہوٹل میں پہنچ گئے۔ ایک ماہ کی رخصت ختم ہوئی۔ اسے ہمارا جانباز مرتضیٰ ایک بیرونی مقام پر مختلف زبانیں، بین الاقوامی قانون اس کے قواعد و ضوابط اور طریق کار سیکھنے کے لئے بھیجا گیا اس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت اور خدا داد قابلیت کی وجہ سے بہت جلد مختلف زبانوں پر عبور حاصل کر لیا۔ نیز مشرقی و مغربی ممالک کی سیاست کے پیچیدہ مسائل اور رسم و رواج سے بھی جلد واقفیت حاصل کر لی ایک بین الاقوامی جنگ کے بادل سیاست کے افق پر امنڈ رہے تھے۔

مرتضیٰ کو سب سے پہلا حکم یہ ملا کہ انقلاب پسند ... کی ایک جماعت نے اپنے وسائل اور ذرائع کو مجتمع کر کے ———— سرحد پر اپنی نقل و حرکت اور کارروائیاں شروع کر دی تھیں مرتضیٰ موقع پر پہنچ کر عام سازشیوں سے مل گیا اور بہت جلد ان کے اندرونی معاملات اور رازوں میں دخیل ہو گیا۔ اس کی ابتدائی کامیابی نے اس کے مستقبل کو عظیم الشان طور پر کامیاب بنا دیا۔

(۲)

پاشائے اعظم دو مشہور جنگوں کا ہیرو تھا ترکی میں قومی تحریک کا بانی تھا۔ نہایت معزز ... صاحب ہستی اور باوقار تھو ... سے خائف اور متنفر بھی تھے پاشائے موصوف ترکی کے چھوٹے دار الریاست میں مجلس آئین ساز کے صدر کا کمرہ ہے ایک دور دراز ملک کے مسلمانوں کی طاقتور جماعت

کے مستند نمائندہ کے استقبال و مہمان نوازی کے سلسلہ میں وہاں مقیم تھا۔ ترکی کی سیاہ بختی کا یہ بدترین زمانہ تھا یونان نے حملہ کرکے آیدونیا پر قبضہ کر لیا تھا، علاقہ پانطس کے متعلق ایک نونائیدہ یونانی جمہوریت کا اعلان کر دیا گیا تھا اور غیر ملکی افواج نے ہر طرف سے آبائی وطن کی تمام شہر پناہوں کو محصور کر رکھا تھا۔ دنیا بھر کے اخبارات ایک قدیم مشہور و تاریخی سلطنت کی تباہی اور سقوط پر بغلیں بجا رہے تھے۔ اس سلطنت کی بری اور بحری طاقت نے، تقریباً سات صدیوں سے مغربی طاقتوں اور قوموں پر اپنی دھاک اور ہیبت بٹھا رکھی تھی، اور ان کو لرزہ براندام کر رکھا تھا۔ دور دراز کے ممالک کے مسلمانوں کی ہمدردی اور دوستی کی زبردست لہر اور ترکی کے دشمنوں کے خلاف اشتعال انگیز اور آتشیں جذبات نے شدت سے اظہار کیا تھا، تمام ملک میں دیوانگی آمیز مسرت و جوش کا عالم پیدا کر دیا تھا۔

ایشیائے وسطیٰ کے مسلمانوں کا ایک نمائندہ محکمہ خارجہ اور جاسوسی کے افسروں کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ترکی میں خفیہ طور پر آ گیا اس کی آمد کی غرض یہ تھی کہ غازی پاشا کی خدمت میں حاضر ہو کر مسلمانانِ ایشیا سے کی محبت۔ ہمدردی و عقیدت کا اظہار کرے۔ تحریک جدید کے رہنما کی طرف سے اس کا بہت کچھ اعزاز کیا گیا اور حکومت ملیہ کے معزز مہمانوں کے طور پر اس کو رکھا گیا، اخبار نویس۔ سرکاری حکام شہری اور تاجر اپنے دینی بھائی، اور معزز مہمان کی جو ترکی کے سچے ہمدرد و عقیدتمند اور جاں نثار غیر ترکی مسلمانوں کا نمائندہ تھا، مجلس ملیہ کی عمارت ہزاروں کی تعداد میں جوق در جوق دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ غازی پاشا نے اپنا خاص موٹر اس کو اسٹیشن پر سے لانے کے لئے بھیجا تھا اور دارالریاست کے دروازے پر غازی پاشا کے اس محترم مہمان کا "مرحبا ہمارے دینی بھائی" "مرحبا محترم دوست" کے سامعہ شکن غلغلہ انداز اور فلک بوس نعروں میں خیر مقدم کیا گیا۔ یہ معزز مہمان نہایت قیمتی اور فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھا، غازی پاشا اس محترم مہمان کو خود اندر لے گئے۔ اُن کے ہمراہ معزز ارکان سلطنت اعلیٰ حکام ممبران پارلیمنٹ اور چھوٹے بڑے فوجی افسروں کی ایک جماعت تھی اور ہر ایک کی یہ دلی خواہش تھی کہ وہ اس معزز اجنبی کے اعزاز احترام اور خیر مقدم میں ایک دوسرے سے سبقت لے جائے، جو کہ مسلمانوں کے حقوق مدافعت کی مرکزی کمیٹی کا نمائندہ معلوم ہوتا تھا۔

غازی پاشا نے جدید حکومت کے تمام ارکان اور قائدین سے ذاتی طور پر اس کا تعارف کرایا جنھوں نے ترکی کی آزادی میں حصہ لیا تھا احسانمندی کے جذبات اور فرط مسرت سے اُن کی آواز بھی اچھی طرح نہیں نکلتی تھی، سب نے یک زبان ہو کر اس معزز مہمان کا شکریہ ادا کیا اور اس کے بعد سب بیٹھ گئے تاکہ معزز نمائندے کی زبانی اس کی کمیٹی کی جد و جہد کے تمام و کمال واقعات سنیں جو بے یار و مددگار ترکوں کی مدد کے لئے ہر طرح قربان ہونے کو تیار ہے؛

ترکوں کے خلاف نفرت و عداوت پھیلانے کیلئے اس زور شور سے تمام دنیا میں پروپاگنڈہ کیا جا رہا تھا کہ ترکوں کو خود اپنی معصومیت پر شک ہونے لگا تھا، ہوشیار نوجوان نمائندے نے ایک طویل تقریر میں اپنے ہم وطن اور ہم مذہب لوگوں میں ترکوں کی ہمدردی کی تحریک کی داستان سنائی اور کہا کہ "وہ سب میری واپسی کے بےچینی سے منتظر ہیں تاکہ میں اُن سے بیان کر سکوں کہ ترکوں کی موثر امداد کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ ترکوں کی دلیرانہ اور مدافعانہ جد و جہد نے دنیا کو محو حیرت کر دیا ہے۔"

غازی پاشا اور اُن کے رفقا بےحس و حرکت بیٹھے ہوئے اس داستان کو سنتے رہے یہ ہوشیار نوجوان نمائندہ ترکوں کی ہمدردی کی تحریک کے واقعات بالتفصیل بیان کرتا رہا کہ کس طرح اس کے وطن میں ترکی کے ایجاب یا تحریک کے بغیر ترکوں کی ہمدردی کی لہر پیدا ہو گئی۔

مسحور سامعین جو ترکی کی جدید تحریک کے سردار تھے وفد و دراصل کے مسافر اور اپنے مہمان کی طویل تقریر کامل خوشی سے سنتے رہے۔ البتہ دوران تقریر میں کبھی کبھی بارک اللہ مرحبا اور ماشاء اللہ کے نعروں سے داد دیتے رہتے تھے، مہمان نے آخر میں کہا کہ "اگر آپ کے دشمنوں نے اپنے ناپاک ارادہ کی تکمیل کرنی چاہی، اور جو خطرات آپ کے سامنے ہیں انہوں نے اصلیت کی شکل اختیار کی تو میری تمام قوم آپ کے دوش بدوش میدان جنگ میں سربکف ہو کر اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دینے کو تیار ہے، میں بکمال ادب معزز غازی پاشا کی خدمت میں عرض کر کے انہیں یقین دلاتا ہوں کہ ایشیائے وسطیٰ میں آپ کے تمام ہم مذہب بنہایت اشتیاق اور انتہائی بے چینی سے ترکی کی مردانہ، اولوالعزمانہ مدافعانہ جد و جہد کے نتائج کے منتظر ہیں، وہ ترکی کے واجبی اور جائز مقصد کی تکمیل میں امکانی جد و جہد کریں گے۔ اور کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔

اس باقاعدہ جلسہ کے بعد نمائندہ مذکور اپنے میزبانوں میں آزادانہ طور پر مل جل گیا سب حاضرین اس کے اعزاز و احترام میں اس درجہ غلو اور زیادتی کرتے تھے کہ اگر کسی بڑی ہمسایہ اتحادی سلطنت کے حکمران کا استقبال کیا جاتا تو اس سے زیادہ ہوتا، نوجوان نمائندہ کو موقع دیا گیا کہ وہ ملک کی حالت کو بچشم خود دیکھے، اور معلوم کرے کہ موجودہ قوم پرست جماعت اپنے دشمنوں کو نیچا دکھانے کے لئے کیا کیا کاروائیاں عمل میں لا رہی ہے، اس نے ملک کی دیکھ بھال شروع کر دی، چند ہفتوں کے اندر اندر اس نے اہم سیاسی حلقوں کا سراغ لگا لیا اور نہایت ہوشیاری سے بعض اہم اور قیمتی معلومات فراہم کر لیں یہ جن مقاصد کے لئے اطلاعات حاصل کر رہا تھا اس کے مقصد اور غرض و غائت سے اس کے میزبان بالکل بے خبر تھے اس کی اعلیٰ تعلیم متعدد زبانوں پر اس کا کامل عبور، اس کے آزادانہ اور آسان ذرائع یہ ایسی باتیں تھیں کہ اس نے اپنے دوستوں کا حلقہ بہت جلد وسیع بنا لیا اس نوجوان مسلمان نمائندے نے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں انتہائی ہر دلعزیزی پیدا کر لی کہ وہ ہر مجلس اور ہر جلسہ میں شریک کیا جاتا تھا۔

ایک شام کو وہ دیر سے ایوان حکومت میں گیا، اور اس نے دیکھا کہ ایوان کے چاروں طرف محافظ فوج کا پہرہ لگا ہوا ہے۔ اس نے وجہ دریافت کی تو محافظ فوج کے کپتان نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ "آج بند کمرے میں مجلس ملیہ کا خفیہ اجلاس ہو رہا ہے" نمائندے نے مسکراتے ہوئے کپتان کا شکریہ ادا کیا اور وہاں سے واپس چل دیا، دو گھنٹہ بعد ایوان کے دروازے کھل گئے اور اجلاس برخاست ہوتے پر اکثر ارکان واپس چلے گئے نوجوان نمائندہ یہ جاننے کے لئے سخت بے قرار و بے چین ہو رہا تھا کہ بند کمرے میں جو خفیہ اجلاس منعقد ہوا ہے اس میں کن معاملات پر بحث ہوئی ہے اس بیقراری کے وجوہ کو خود نمائندہ ہی کو معلوم ہوں گے، لیکن اس کی دانائی اس امر سے مانع تھی کہ وہ ان ممبروں سے جن سے زیادہ اس کی راہ و رسم نہیں تھی اور جن سے وہ کم مانوس تھا، اجلاس کے متعلق سوالات کرتا۔

نوجوان نمائندہ جو اسی خیال میں مستغرق تھا کہ جلد کسی نہ کسی طرح اس کا پتہ چلائے، آخر کار اس کو ایک تدبیر سوجھی وہ شہر کے شرقی حصے کی جانب ٹہلتا ہوا بہت دور تک نکل گیا۔ اور واپسی میں بھی اس کے قلب و دماغ میں یہ خیال جاگزیں رہا چنانچہ وہ ڈاکٹر نعمان بے کے پاس جو مجلس ملیہ کا خطیب تھا اور جس کا مکان پاس ہی تھا ملنے کے لئے گیا، ڈاکٹر نعمان سے اس کا گہرا دوستانہ تھا، اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو دربان نے جو اس کو پہلے سے جانتا تھا، فوراً اندر پہنچا دیا، اندر جاتے ہی مالک مکان کی جانب سے اس کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر نے نوجوان مہمان کے اس فیصلہ پر شکریہ ادا کیا کہ ٹخنے میں موچ آنے پر وہ یہاں آ گیا۔ ڈاکٹر مذکور نے پاؤں کے زخمی جگہ پر دوا لگا کر پٹی باندھی۔ کھانے کے بعد ڈاکٹر نے اس سے مجبوری کہ کہ وہ رات کو وہیں رہے نمائندہ کے دلی ارادہ کے متعلق اس کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا وہ دل سے اس امر کا خواہاں تھا کہ کسی طرح میں رات کو

یہیں رہ جاؤں: شاید رات کو باتوں میں خفیہ جلسہ کے متعلق کچھ پتا لگا سکوں معمولی معذرت کے بعد اس نے شب کا قیام منظور کر لیا، اب اس کے دل میں مسرت چٹکیاں سی لینے لگی، اس کے ذہن میں ایک تجویز آتی تھی اور ایک جاتی تھی اور روز ہ گر خفیہ جلسہ کی کارروائی معلوم کرنے کی خواہش اس کے دل میں گدگدیاں کرنے لگی۔ مہمان و میزبان قہوہ نوشی میں اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے تو نمائندہ نے مصنوعی لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے بالکل معمولی بھولے پن سے دریافت کیا کہ :-

"آج دوپہر مجلس ملیہ کے خفیہ اجلاس میں کن امور پر بحث ہوتی رہی"

ڈاکٹر مذکور نے اس سوال کو معمولی سی بات سمجھ کر معذرت کرتے اور مسکراتے ہوئے کہا کہ :-

"یہ خفیہ معاملات سینۂ راز میں ہیں افسوس ہے کہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا"

اس پر نمائندہ مذکور نے اپنے غیر محتاط سوال اور جرأت پر فوراً معافی مانگی اور گفتگو کا موضوع فوراً بدل دیا۔

دوسرے روز صبح کو ناشتے کے بعد نمائندہ اور اس کا معزز میزبان شہر کے اس حصے کی جانب روانہ ہوئے، جدھر حکومت کے دفاتر تھے اوّل الذکر سلطنت کے سرکاری مہمان خانہ میں اتار دیا گیا، اور موخر الذکر اسمبلی کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس طویل خفیہ اجلاس کے آخری دن ممبران نے دو روز کے لئے مجلس ملیہ کا اجلاس ملتوی کر دیا تھا، ڈاکٹر کچھ دیر سرکاری کام میں ایوان حکومت کے اندر سرکاری دفاتر میں مصروف رہا۔ بعد ازاں وزیر داخلہ سے ملنے کے لئے گیا، اس نے دفتر وزارت میں وزیر کے ساتھ ایک طویل ملاقات کی وزیر مذکور کا محکمہ احتساب سے بھی تعلق تھا، اس روز کے بعد سے ڈاکٹر کا روزمرہ کا دستور ہو گیا تھا کہ جب وہ ایوان حکومت میں جایا کرتے تو پہلے وزیر داخلہ سے ملاقات کر لیتے۔

پریزیڈنٹ کی جانب سے ایک کتبس کی نگاہ پڑتی۔ وزیر داخلہ کچھ اشارہ کر دیتا اور ملاقات ختم ہو جاتی ؛ اور ڈاکٹر نعمان بے دفتر وزارت سے نکل کر اپنے سرکاری دفتر میں چلے جاتے پہلا خفیہ جلسہ کے ایک ہفتہ بعد وزیر داخلہ بہت جلد اپنے دفتر میں آ گیا اور آتے ہی اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو ہدایت کی کہ پریزیڈنٹ کو فوراً لے آئے، وزیر کے حکم کی تعمیل فوراً کی گئی ایک فوری مصافحہ کے بعد دفتر کابینہ میں دونوں ارکان حکومت وارد ہوئے جنھوں نے آتے ہی کاغذ کے ایک ورق کو جس کے ایک حصہ پر کچھ لکھا ہوا تھا، نہایت غور سے دیکھنا شروع کیا۔

ڈاکٹر نے اضطراب کے ساتھ پوچھا کہ "آپ نے کچھ معلوم کیا؟"

وزیر نے مختصراً جواب دیا کہ "ہاں! سب کچھ معلوم ہو گیا" تمہارا یہ دلی دوست سخت خطرناک اور چالاک جاسوس ہے۔" وزیر نے ڈاکٹر کے ہاتھ میں وہ کاغذ کا ورق دیا۔ جس کی ایک جانب تو خط کے طور پر کچھ لکھا تھا اور دوسری جانب ایک قیمتی اطلاع درج تھی جو محکمہ جاسوس کے ایجنٹ کی زبردست خفیہ عظیم الشان تحقیقات کا نتیجہ تھی۔ اس کا ایک حصہ تو گذشتہ خفیہ اجلاس کی کارروائی اور حالات پر مشتمل تھا اور دوسرے حصہ میں افواج ملیہ کی روز افزوں قوت وعروج کے متعلق پوری تفصیل لکھی تھی اور اس حصہ ملک کی طبعی حالات کی اطلاع دی گئی تھی جو قوم پرستوں کے دارالحکومت کا مرکز تھا کاغذ کے دوسری جانب کسی کے دستخط ثبت نہیں تھے مگر ریاضی کے طریقہ پر پنسل سے ایک سرے پر ۳ اور دوسرے سرے پر ۶ کا ہندسہ تھا، جو کہ تحریر کنندہ کی ہوشیاری پر دال ہے۔

مگر یہ اطلاع ایک نہ دکھائی دینے والی سیاہی سے لکھی گئی تھی، اس اطلاع کی انتہائی اہمیت کا اظہار ہوتا ہے، وزیر نے کہا کہ "یہ تیسرا خط ہے جو ہمیں ملا ہے اور جس کے مطابق ہم نے کارروائی کی ہے، یہ خط خود ہی اپنا ترجمان ہے" وزیر نے ذرا توقف کیا اور خط کو دوبارہ لیمپ شیڈ کے ہاتھ سے لیکر نصف کھلی ہوئی کھڑکی کی روشنی میں دوبارہ دیکھا...... لیکن کوئی مزید بات معلوم نہیں ہوئی، اس نے صرف اتنا کہا کہ "ہمارا فرض ظاہر ہے، اس خط کے محرک کی کامل مستعدی اور توجہ سے ہر ممکن طریقہ اور انتہائی ہوشیاری سے نگرانی کرنی چاہیئے"

اس خط کا لکھنے والا سوائے مرتضیٰ کے کوئی دوسرا نہیں تھا، وہ محکمہ خفیہ سراغرسانی کا ایجنٹ نمبر ۲ تھا۔ اس نے اپنی انتہائی چالاکی سے انگورہ کے سرکاری حلقوں میں اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا اور محکمہ احتساب کی مداخلت سے آزاد ہو چکا تھا.......

اس نے فوراً قوم پرستوں کے دارالحکومت میں پہنچتے ہی اپنی سرگرمیاں اور کارروائیاں شروع کر دیں گذشتہ دو ماہ سے مجرمانہ خطوط قسطنطنیہ میں ایک ایسے بے لاگ پتہ پر اپنے رفقاء کے نام برابر ارسال کرتا رہا اور ملک کے تمام واقعات و حالات کی اطلاعات بہم پہنچاتا رہا۔ اس نے تمام قیمتی حالات باہر بھیجنے کے لئے ایک عجیب طریقہ اختیار کر رکھا تھا اس نے ایک معمولی پیغام جو کسی طرح قابل اعتراض نہ تھا ورق کے ایک طرف لکھا اور دوسری جانب اپنی خاص خفیہ تحقیقات سے حالات انگورہ سیاسی محکمے کے افسر اعلیٰ کے لئے لکھے تھے وہ اس قسم کے پیامات میں مخصوص اور مخفی اصطلاحات کو دل کھول کر استعمال کرتا رہا۔ مگر جب سے خطرہ ہو گیا کہ بعض خاص اصطلاحات کے کثیر استعمال اور آزادانہ خط و کتابت سے راز افشا ہو جانے اور گرفتار ہو جانے کے پورے وجوہ ہیں اس نے دوسرا اس سے بہتر اور مفید طریقہ خط و کتابت کے لئے اختیار کیا تاکہ وہ خطرناک مجرمانہ اطلاعات باہر آزادی سے پہنچ سکے انگورہ کے محکمہ احتساب نے زیادہ مستعدی سے نگرانی کے جال اس کے گرد پھیلا دیئے اور محکمہ خفیہ کے جاسوس نہایت ہوشیاری سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کرنے لگے، لیکن مرتضیٰ کو معلوم نہیں ہونے دیا کہ اس مستعدی سے اس کی دیکھ بھال کی جا رہی ہے اب محکمہ ہذا اس خطرناک جاسوس کے تمام پیغامات کی ضروری نقل کرتا جاتا تھا اور جو جوابات قسطنطنیہ سے آتا تھا اس کے نام آتے ان کی اسی طرح نقل کی جانے لگی۔

انگورہ نے محکمہ جاسوسی کے تقریباً نصف درجن ماہرین قسطنطنیہ بدیں غرض بھیجے گئے کہ وہ معلوم کریں کہ مرتضیٰ کے خطوط کن اشخاص کے ہاتھوں میں پہنچتے ہیں، مگر ان خطوط کا مکتوب الیہ بیرونی فوج کے محکمہ مرکزیہ خفیہ خبر رسانی کے ماتحت شعبہ کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا "تشکیلات خصوصیہ" کے ترکی ارکان نے محکمہ خارجہ کے ایک مسلمان سراغرساں سے ملنے کی کوشش کی، آخر کئی ہفتوں کی جانسوزی اقتیاد تفتیش اور دانشمندانہ گفت و شنید کے بعد نمبر ۳ کے قیام انگورہ کے اصلی مقاصد و اغراض کے معلومات کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

انھوں نے فوراً اپنے ہیڈ کوارٹر کو اطلاعات ارسال کر دیں تشکیلات مکمل کر لی اور تمام ضروری شہادتیں مہیا کر لیں۔

اس کے دوسرے دن بعد جبکہ افواج ملیہ کا مظاہرہ تھا، وزیر مدافعت نے تمام ارکان مجلس اور انگورہ کے تمام ممتاز مہمانوں کا سرکاری طور پر استقبال کیا، مرتضیٰ جاسوس بھی ان لوگوں میں سے ایک تھا جو مدعو کئے گئے تھے، اس کے شرمناک اور ہولناک مقصد کا علم صرف وزیر داخلہ اور صدر مجلس، صدر کابینہ اور پاشائے اعظم کو تھا۔ موخر الذکر پردہ ہاتھ صاف کرنیکا ارادہ کئے ہوئے تھا۔ مرتضیٰ کا استقبال اس کے بے تکلف دوستوں فوجی افسروں کے ایک دستہ نے قہقہوں کے درمیان کیا، اور اس کو گھیر لیا، یہ فوجی افسر تشکیلات کے کارندے تھے، اور ان کا فرض تھا

کہ وہ مرتضیٰ کی نقل و حرکت کی کامل طور پر نگرانی کریں۔ مرتضیٰ نے معذرت کی اور رفع حاجت کو گیا، اور بیت الخلا کا دروازہ بند کر لیا، ایک افسر نے دروازے کے سوراخ میں سے دیکھا کہ نمبر ۳۰ اپنی نیچے کی جیب میں ہاتھ بار بار ڈالتا ہے اور کسی چیز کو دیکھتا ہے اور کسی خاص کام کے لئے تیاری کر رہا ہے۔ جب وہ باہر نکلا تو اس کے چہرہ پر ایک غیر معمولی خجالت کے آثار پائے گئے اس نے ایک یا دو مرتبہ انتہائی کوشش کی کہ وہ کسی طرح اس گروہ میں پہنچ جائے جو معزز و مقتدر حضرات پر مشتمل تھا، اور جہاں افغانی، روسی، اور ترکی کلاہیں نظر آ رہی تھیں اور ان ہی میں خود پاشائے اعظم بھی تشریف فرما تھے، مگر وہ سخت مجبور تھا کیونکہ اس کے خداداد دو دوست اس کا پیچھا کئے ہوئے کرام کاتبین کی طرح اس کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ ان میں سے ایک افسر تھوڑی دیر کے لئے وہاں سے سرک گیا، لیکن فوراً ہی واپس آ کر اپنے ان دوستوں میں مل گیا جو مرتضیٰ کے گرد حلقہ باندھے ہوئے تھے اس نے مرتضیٰ سے کہا کہ آپکو وزیر داخلہ نے یاد فرمایا ہے، اور سلام کہا ہے۔ مرتضیٰ لاپرواہی سے نوجوان افسر کے ساتھ ہو لیا جو اس کو ایک ایسے کمرے میں لے گیا۔ جہاں وزیر داخلہ محکمہ پولیس کا افسر اعلیٰ اور مجلس ملیہ کا صدر بیٹھے تھے جونہی مرتضیٰ کمرہ میں داخل ہوا مذکورہ بالا تینوں حضرات نے تعظیماً استادہ ہو کر اس کو اپنے درمیان میں لے لیا۔ مرتضیٰ کے ہاتھ میں جو کہ مصافحہ کے لئے دراز ہوا تھا، پولیس افسر نے خاموشی سے ہتھکڑی ڈال دی، وزیر داخلہ نے فوراً اس کی جیب میں ڈال کر گولی بھرا ہوا پستول نکال لیا۔
پولیس افسر نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

"مرتضیٰ ہمارے مہمان محترم تم آج سے قیدی ہو اور سلطنت کے محکمہ سیاسی کے حوالے کئے جاؤگے"

مرتضیٰ کا چہرہ زرد پڑ گیا، اس کا جسم بے حس ہو گیا اور اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکال سکا۔ اور غروب آفتاب کے وقت اس کو پرانی اکروپولیز کے حوالات میں بھیجا گیا جو مشتبہ مجرمین کے لئے مخصوص ہے۔

محض چند آدمیوں نے مسلم سوسائٹی کے نمایندہ مرتضیٰ کے یکایک غائب ہو جانے کو محسوس کیا۔ وزارت کے کمرے میں اس کا شاہانہ استقبال ابھی تک بھی یاد تھا، لیکن اس کے بہت سے دوست و احباب اس کی موجودگی کو قریب قریب بھول گئے تھے۔ حوالات میں اب نمبر ۳۰ کے پاس ترکی کے محکمہ سیاسی کی خفیہ سراغرسانی کا افسر اعلیٰ آتا اور سوال کرتا، تاکہ وہ مرتضیٰ کی جاسوسانہ سرگرمیوں کی خفیہ مقاصد کے متعلق اطلاعات حاصل کرے۔ افسر مذکور کی کوشش ناکام رہی انھوں نے ایک عجیب تجویز سوچی، اس زمانہ میں جزیرہ رہوڈز کے نظر بند شدہ غیر ملکی قیدیوں کے تبادلے کے مسئلہ پر حکومت انگورہ اور غیر ملکی حکومتوں کے درمیان ایک طویل گفت و شنید جاری تھی اس کی آڑ میں انھوں نے اپنا کام نکالنا چاہا، غیر ملکی رہا ہونیوالے قیدیوں کے نام شائع کر دیئے گئے تھے مگر مرتضیٰ کا نام اس فہرست میں تھا اور نہ کسی نے اس کی رہائی ہی کا مطالبہ کیا تھا اکروپولی کے قیدی کو دوبارہ یقین دلانے کے لئے "تشکیلات" کے ایجنٹوں نے مرتضیٰ کو زیادہ سہولتیں بہم پہنچائیں، ایک چھوٹے قلعہ کے احاطہ میں وہ آزاد کر دیا گیا اس کو پہلے کی نسبت اچھی خوراک دی جانے لگی، اور اس کے مطالعہ کے لئے اخبارات و کتابیں مہیا کی گئیں اس کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے چند دوستوں سے ملاقات بھی کر سکتا ہے۔ جن کو یقین تھا کہ وہ آخر کار بے گناہ ثابت ہوگا۔

ایک ہفتہ کی اس تبدیلی کے بعد مرتضیٰ جب غیر ملکی اخبارات دیکھ رہا تھا تو اس کی نظر ایک اخبار کے ایک صفحہ کی مندرجہ ذیل عنوانات پر پڑی۔

مسلم ایسوسی ایشن کا ایجنٹ

مرتضیٰ کا اپیل مسترد ہوگیا

اس نے ان سطور کو جو مذکورہ بالا عنوانات کے ماتحت تھیں، کمال اشتیاق اور نہایت غور سے پڑھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جس حکومت کے ہر اشارہ پر اپنا جگر جان جوکھوں کا کام کر رہا ہے اس نے اس سے بے تعلقی کا اظہار کر دیا ہے۔ نیز اس کے متعلق یہ بیان بھی کیا گیا تھا، کہ جو کچھ وہ کرتا ہے وہ اپنی ذاتی اغراض کے لئے اور خود ہی کر رہا ہے اور "ایسے بدقماش شخص سے کوئی حکومت کسی کا واسطہ نہیں رکھتی"

مندرجہ بالا مختصر بیان پڑھنے کے بعد مرتضیٰ کے دماغ میں اپنی حکومت کے خلاف نفرت و حقارت کے اشتعال انگیز جذبات پیدا ہوگئے اُسے خیال آیا کہ "میرے آقاؤں نے میرے جان جوکھوں کے کام کا یہ صلہ مجھے عطا کیا ہے" وہ کئی گھنٹہ تک اس چھوٹے سے احاطے میں ٹہلتا رہا اور آئندہ تدابیر کے متعلق نہایت غور سے سوچتا رہا۔ آفتاب غروب ہونے سے قبل ایک دوست اُس کے پاس ملاقات کے لئے آیا، مرتضیٰ نے اُس آدمی کو نہایت غور سے دیکھا۔ اس تنگ صحن سے اب وہ اپنے کمرہ میں داخل ہوا؛ اور اس کا دوست بھی اُس کے پیچھے کمرہ میں چلا گیا، ان دونوں کے درمیان ایک طویل رازدارانہ گفتگو ہوتی رہی اُس کے دوست نے اُسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے لئے بہتر ہوگا کہ تم عدالت استقلال کے جج کے سامنے اپنی تمام باتیں صاف صاف بیان کر دو، تمہارے اس فیصلہ پر سلطنت کا سرکاری
" وکیل مسرور ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ تمہاری صاف بیانی اور اقبال جرم عدالت کو تم پر رحم کرنے کے لئے متاثر کر سکے"

اپنے دوست کے مندرجہ بالا مشورہ پر مرتضیٰ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔ بالآخر اُس نے اپنا سر ہلایا اور اپنے دوست کی تجویز پر کاربند ہونے پر رضامندی ظاہر کی۔ چند منٹ بعد اُس کا دوست وہاں سے چلا گیا۔

ترکی "تشکیلات" کے ایجنٹوں کی یہ ایک زبردست چالاکی تھی، کہ انہوں نے کمال ہوشیاری سے مرتضیٰ کو اقبال جرم پر آمادہ کر لیا۔ اخبار کی جن سطور میں مرتضیٰ سے بے تعلقی اور بیزاری کا اظہار تھا اور جن کو پڑھ کر مرتضیٰ برداشتہ خاطر اور ناامید ہوگیا تھا، وہ سطور در اصل اخبار میں درج ہی نہیں تھیں بلکہ "تشکیلات" کے ایجنٹوں نے اس غیر ملکی اخبار میں غیر ضروری مضمون کو کاٹ کر اور ان سطور میں تصرف کر کے بجنسہٖ وہ ورق دوبارہ چھاپ کر اصل اخبار میں لگا دیا تھا، جو ہو بہو اصل اخبار کے بالکل مشابہ تھا، اور اس رد و بدل کے بعد اخبار اس کے پاس اس طرح بھیج دیا گویا کہ اس میں کسی قسم کی دست اندازی نہیں کی گئی، جیسا کہ قدرتی طور پر توقع تھی۔

مرتضیٰ نے اس کو پڑھا، اور اس کو معلوم ہوا کہ اُس کی رہائی کے لئے اُس کی حکومت نے کوئی کوشش ہی نہیں کی، اور نہ یہ ہی بتایا کہ وہ اُنکا ملازم ہے۔ بلکہ اس اخبار کے دیکھنے سے تو یہ ظاہر ہوا کہ ان کو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ناامید ہوگیا اس مایوسی نے اُسے مہر سکوت توڑنے اور اپنے آپ کو عدالت کے رحم پر چھوڑنے پر آمادہ کر دیا۔ (باقی)

راجہ حسن اختر دہلوی

استفسارات

پردہ اور اسلام

(جناب عبدالحفیظ خانصاحب اکولہ)

"براہ نوازش پردہ کے مسئلہ پر روشنی ڈالئے، قرآن و حدیث سے کس قسم کا پردہ ثابت ہوتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ پردہ کی بنا کیونکر اور کب سے پڑی دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ہندوستان ہی جیسا پردہ رائج ہے"۔

(نگار) جب تک کسی مسئلہ میں قرآن پاک کی ہدایات صراحتاً نظر آئیں، اُس وقت تک ہم کو احادیث کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کیونکہ وہ نص قطعی کے خلاف تو ہونگی نہیں، اور اگر ہیں تو وہ حدیثیں نہ ہوں گی اس لئے پردہ کے مسئلہ میں بھی سب سے پہلے کلام مجید کو دیکھنا چاہئیے۔

قرآن پاک میں دو جگہ اس کا ذکر آیا ہے، ایک سورۂ احزاب میں اور دوسری جگہ سورۂ نور میں۔ سورۂ احزاب کی آیت یہ ہے:۔

یا ایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیہن من جلابیبہن۔ ذلک ادنیٰ ان یعرفن فلا یوذین وکان اللہ غفوراً رحیما۔

اے پیغمبر کہدے اپنی بیویوں، لڑکیوں اور مومنوں کی بیویوں سے کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں، یہ زیادہ مناسب ہے تاکہ وہ پہچان لیجائیں اور ستائی نہ جائیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

سورۂ نور میں یہ ارشاد ہوتا ہے:۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارہم ویحفظوا فروجہم، ذلک ازکیٰ لہم ان اللہ خبیر بما یصنعون۔
وقل للمومنٰت یغضضن من ابصارہن ویحفظن فروجہن ولا یبدین زینتہن الا ما ظہر منہا ولیضربن بخمرہن علیٰ جیوبہن ولا یبدین زینتہن الا لبعولتہن او آباءہن الخ

مومنوں سے کہدے کہ وہ اپنی نگاہیں جھکا لیا کریں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ زیادہ پاکیزہ بات اور اللہ خبردار ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ مومن عورتوں سے کہدے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی کر لیا کریں، اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو (مجبوراً) ظاہر ہو جائے۔ وہ اپنے دوپٹوں کو سینوں پر ڈال لیا کریں، اور اپنی زینت نہ ظاہر کریں سوائے اپنے شوہروں، باپوں وغیرہ وغیرہ کے۔

سورۂ احزاب کی اول الذکر آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ چہرہ پر نقاب ڈالنے کا حکم اس لئے آیا تھا، کہ راستہ میں لوگ جب انہیں اس حال میں دیکھیں تو اُن کو عفیفہ و محصنہ سمجھکر چھیڑیں نہیں، اور وہ اطمینان و عافیت کے ساتھ گزر جائیں۔ سورۂ نور کی موخر الذکر آیتوں میں مردوں عورتوں دونوں کی

عصمت کوشی کی تعلیم دی گئی ہے، اور اسی کے ساتھ یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ جب راستہ میں مرد عورت کا مقابلہ ہو تو دونوں نگاہیں نیچی کرلیں، عورتوں کے لئے ایک زائد حکم یہ بھی ہے کہ وہ نقاب ڈالیں اور اپنی زینت کو غیر مرد پر ظاہر نہ کریں۔

لفظ زینت کی تشریح میں اختلاف ہے، بعض اس سے زیور مراد لیتے ہیں، اور بعض اعضائے جسم، میرے نزدیک اس میں دونوں چیزیں شامل ہیں یعنی ان کو نہ اپنی آرائش زیور و ملبوس کسی غیر مرد کو دکھانی چاہیئے، اور نہ ایسا لباس پہننا چاہیئے جس سے ان کا حصۂ جسم یا کسی حصۂ جسم کا حسن نمایاں ہوسکے۔

ان آیات سے حسب ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں:۔

(۱) عورتوں کے لئے چار دیواری کے اندر بند رہنے کا کہیں حکم نہیں ہے

(۲) وہ مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ باہر نکل سکتی ہیں۔ کیونکہ نگاہیں نیچی کرلینے کی صورت اسی وقت پیدا ہوگی، جب عورتیں باہر نکلیں اور مردوں کے سامنے سے گذرنیکا احتمال ہو۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہیئے جس سے اُن کی آرائش وغیرہ ظاہر نہ ہوسکے۔ اس لئے ہمارے ہاں کا موجودہ برقع عین اس حکم کے مطابق ہے

(۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے۔ جو چلنے میں چھپایا نہیں جاسکتا ہے جیسے پاؤں یا ہات یا آنکھ تو کوئی حرج نہیں جیسا کہ الا ما ظہر منہا سے ثابت ہوتا ہے۔

ہندوستان میں پردہ کا رواج کب سے ہوا اس کے متعلق کوئی صحیح تاریخ متعین نہیں کی جاسکتی تاہم یقینی ہے کہ جب اس کی ابتدا شاہان اسلام کے عہد میں ہوئی۔ اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ حاکم و محکوم کے درمیان ایک حد فاصل قائم کرنی مقصود تھی، شاہی خاندان کی عورتوں کا عوام کی طرح باہر نکلنا، اور غیر مردوں کی نگاہوں کا انپر پڑنا چونکہ اُن کی خودداری وغیرت کے خلاف تھا، جو حکومت و سلطنت کے خیال کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی اس لئے پہلے شاہی خاندان میں پردہ ہوا اور پھر رفتہ رفتہ امرا و اراکین، شرفا و معززین میں بھی رائج ہوگیا۔

پردہ کا مسئلہ اسلام کے ان مسائل میں سے ہے جن کو ضرورت و مصلحت کے لحاظ سے برتنے رہنا چاہیئے، اگر آج ملک و تمدن کی مصلحت کا اقتضا یہ ہو کہ عورتیں بالکل پاؤں توڑ کر گھروں کے اندر بیٹھ جائیں۔ تو پردہ اس شدت تک ضروری ہوجائیگا۔ اور اگر کبھی وقت ضرورت اس امر کی ناشی ہو کہ عورتیں آزادی کے ساتھ باہر نکلنے لگیں تو اس پر عمل کرنا ہوگا، بہرحال پردہ کا حکم ہر ملک و قوم اور ہر وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر ہے۔

علاوہ ہندوستان کے جہاں جہاں بھی اسلامی آبادیاں ہیں سب جگہ پردہ اٹھتا جارہا ہے، اور ہم کو اس پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے، کیونکہ وہاں کی ضروریات کا اقتضا یہی ہوگا۔ ہندوستان میں بھی اس خیال میں ضعف پیدا ہورہا ہے، اور ایک حد تک میں اس کے موافق ہوں عورتوں کو ایک محدود فضا کے اندر جانوروں کی طرح بند کرکے رکھنے کا وقت گزر گیا ہے اور اب زمانہ کا اقتضا یہی ہے کہ انہیں آزادی دیجائے تاکہ وہ پوری طرح تعلیم و تربیت کے اصول سے واقف ہوکر اپنے بچوں کی پرورش اسی انداز سے کریں اور اپنی کھوئی صحت کو واپس لاسکیں۔

اصل پردہ اپنے نفس کا ہے، اگر اس میں کوئی بدی نہیں ہے، تو کھلے بندوں پھرنا بھی مضرت رساں نہیں ہو سکتا، اور اگر خرابی تربیت کی وجہ سے نفس میں گندگی پیدا ہو گئی ہے تو پھر "ہرزہ میشد" بھی نسوانی عصمت کی حفاظت نہیں کر سکتے؛

مختلف سوالات

(جناب ابوالمنصور تصدق حسین صاحب نظیر، سلطان پور)

"براہ کرم ذیل کے استفسارات کے جواب نگار میں درج فرما کر رہین منت فرمایئے، صرف تحقیق مقصود ہے مباحث مذہبی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۱) قرآن میں کسی قسم کی تحریف ہوئی ہے یا نہیں۔

(۲) کیا قرآن کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا

(۳) کون گروہ تحریف کا قائل ہے۔

(۴) عقیدہ تحریف منافی اسلام تو نہیں ہے۔

(۵) تعزیہ کا موجد کون تھا، سبب ایجاد کیا تھا، اور زمانۂ ایجاد کیسا ہوا،

(۶) تقیہ کی تعریف کیا ہے اور اس کے عمل پر ولیت کا نظر کسے رہی ہے۔

(۷) حور و غلماں کی خلقت انسانی ہے، یا کوئی جداگانہ خلقت ہے جیسے ملائکہ کی؟"

(نگار) (۱) قرآن میں کوئی تحریف نہیں ہوئی۔ غیر مذہب کے لوگوں میں سب سے زیادہ کاوش و کوشش تحریف ثابت کرنے کی عیسائیوں نے کی ہے اور سب سے اخیر میں ڈاکٹر منگنا (Mangana) نے تو اپنے نزدیک اس کو ثابت ہی کر دیا تھا، کیونکہ انھیں قرآن کے بعض اجزا ایسے مل گئے تھے، جن کو وہ عہد عثمان غنی رض سے قبل کا ثابت کرتے تھے، اور ان میں بعض الفاظ ایسے پائے جاتے تھے، جو موجودہ قرآن کے الفاظ سے مختلف تھے لیکن بعد کو وہ تحقیق سے خود شرمندہ ہوئے، اور زیادہ سے زیادہ جو فرق نکلا وہ رسم خط کا تھا۔ الغرض قرآن میں کوئی تحریف آج تک نہیں ہو سکی، اور دشمنوں نے باوجود صد درجہ کوشش کے اس کو ثابت کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی۔

(۲) قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ اس میں کوئی نقص نہیں ہو سکتا۔ انا لہ لحافظون نص قطعی موجود ہے

(۳) شیعہ جماعت کے بعض افراد (اور وہ بھی بہت کم) تحریف کے قائل ہیں، اور کہتے ہیں کہ حضرت علی کی ولایت و وصایت کے متعلق بعض آیات اس میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن یہ صرف ان کا خیال ہے، جو پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچا، بحث طویل ہے ورنہ میں ان کے دلایل کا ذکر کر کے ان کا جواب دیتا۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ کلام مجید کی جمع و تدوین رسول اللہ ہی کے زمانہ میں ہو گئی تھی، ہزاروں اس کے حافظ موجود تھے، اس لئے اگر بعد کو عہد خلفاء میں بعض

آیتیں ترک کردی تھیں تو اس کو تسلیم کون کرتا، اور اس کی جرأت کیسے ہو سکتی تھی۔

(۴) بیشک عقیدۂ تحریف اسلام کے منافی ہے۔

(۵) یہ امر اب تک غیر محقق ہے کہ تعزیہ کا موجد کون تھا۔ بعض اسے تیمور لنگ کی یادگار بتاتے ہیں۔

(۶) یہ بحث مذہبی ہے اور ممکن ہے کہ ایک جماعت کے خلاف ہو اس لئے نظر انداز کی جاتی ہے

(۷) حور و غلمان مخلوق انسانی کی طرح نہیں ہیں، اور نہ اُن سے مراد وہ ہے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے، بہشت دوزخ کے بیانات سب تمثیلی ہیں۔ اور لوگوں کے سمجھانے کے لئے، اصل میں انکا تعلق صرف روحانی مسرت۔ اذیت سے ہے، نگار میں اس سے بیشتر ضمناً اس کو بارہا ظاہر کر چکا ہوں

فنا و یوم حساب

(الٰہی بخش عبدالغنی صاحبان، بمبی)

(۱) سنتے ہیں وقت قیامت ہر ایک چیز کو فنا ہے، کیا پانی کو بھی فنا ہے۔

(۲) روز محشر حساب زمین پر ہوگا، یا آسمان پر

(نگار) (۱) یوں تو ہر وہ شخص جو مرجاتا ہے اس کے نزدیک قیامت ہو جاتی ہے۔ من مات فقد قامت قیامتہ لیکن اگر اس سے زیادہ وسعت پر قیامت کے مفہوم کو سمجھا جائے تو بھی غلط نہیں کیونکہ ایک نہ ایک دن کرۂ ارض کو خواہ جذب آفتاب سے یا کسی اور مادۂ آتشیں رکھنے والے کرہ سے ٹکرا کر فنا ہونا ضروری ہے اور اسی کو ہم قیامت کبریٰ کہہ سکتے ہیں۔ جب پہاڑ اڑتے پھرینگے، زمین ریزہ ریزہ ہو جائیگی اور زمین کا ذرہ ذرہ فنا ہو جائیگا ظاہر ہے کہ ایسے وقت میں پانی بھی خشک ہو جائیگا۔

پانی سے... تو آپ کو کیا خاص لگاؤ ہے، کہ اس کے فنا ہونے سے آپکا جی دکھتا ہے اور اس کے معدوم ہو جانے پر آپ کو تعجب ہوتا ہے۔

(۲) روز محشر سے معلوم نہیں آپکی کیا مراد ہے؟ اگر آپ کے نزدیک اس کا کوئی خاص دن مقرر ہے تو کم از کم میری سمجھ سے آپکا یہ عقیدہ ضرور باہر ہے، کیونکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو شخص مرجاتا ہے اس پر عالم بعد الموت کی راحت یا اذیت اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے اور چونکہ اس راحت یا اذیت کا تعلق صرف روح سے ہے اس لئے اس کے لئے نہ زمین کی شرط ہے نہ آسمان کی، جب قیامت قایم ہوگی تو نہ زمین رہی اور نہ اس کا یہ آسمان پھر وہاں حشر و نشر کیسا؟

عشق و محبت

(جناب سید محمد مبارک شاہ جیلانی، بہاولپور)

• اگر کوئی انسان بدقسمتی سے عشق و محبت کی گرفت میں آجاتا ہے تو سوسائٹی اس سے گریز کرنے لگتی ہے، حالانکہ حافظ و سعدی، در اسی طرح کے تمام شعرائ متقدمین و متاخرین سے کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔ جن کے رندانہ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عمر کا سارا حصہ اسی شغل میں بسر ہوا۔

اگر آپ بھی اس حرماں نصیب کو لائق سرزنش خیال کرتے ہیں تو وہ تدبیر بتائیے جس سے یہ مرض دور ہو سکے، اور غریب عاشق زہد و اتقا کی طرف مایل ہو سکے۔"

(نگار) آپ کا استفسار جواب طلب تو نہ تھا، لیکن اس خیال سے کہ شاید آپ محبت میں مبتلا ہیں، اور ایسے آدمی کا جی دُکھانا اچھا نہیں معلوم ہوتا، آپکے سوال کو درج کئے دیتا ہوں، بلحاظ اس امر کے کہ میں اس کا جواب کیا دے سکتا ہوں، اور کونسی تدبیر ایسی بتا سکتا ہوں کہ آپ اس عذاب سے نجات پاسکیں۔

اوّل تو مجھے حیرت یہ ہے کہ اگر آپ واقعی اس مرض کے مریض ہیں تو آپ میں نگہداشت اخلاق کا یہ جذبہ ابتک قایم کیسے رہا اور یہ آپ کا عشق کس قسم کا عشق ہے جس میں آپ اس درجہ صحت عقل و ثبات ہوش کے ساتھ فلسفیانہ نکتہ سنجی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ آپ کو شکایت ہے کہ سوسائٹی آپ سے گریز کرتی ہے، اور شعرا سے کوئی باز پرس نہیں۔ لیکن ذرا غور کیجئے کہ کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ آپ رسوائی سے ڈرتے ہیں اور شعراء کا مسلک یہ ہے کہ "ما نمی خواہیم ننگ و نام را" آپ ترک محبت کی تدبیر دریافت کرتے ہیں اور ان کی خواہش یہ ہے کہ

غم تو خجستہ باد اکہ غم ست جاودانی
ندہم جہان غمے را بہ ہزار شادمانی

بندہ نواز، یہ مغربی تہذیب کا دور ہے، اس میں اول تو عشق و محبت کا کہیں گزر نہیں اور ہو بھی تو رسوائی کیسی جب کہ انتہائی بد اعمالی کو بھی "ایک اخلاقی بحران" سمجھکر انسان معذور قرار دیدیا جاتا ہے۔ آپ اس کی پرواہ نہ کیجئے،

کہ دور دور شجاع ست مے دلیر بنوش

اور آپ کو اپنی خواجہ زادگی کی رعایت بہت منظور ہے، تو "ہدف عشق" کو بدل ڈالئے۔ اور غور سے دیکھتے رہئے، کہ پردہ سے نمودار ہونیوالے ہاتوں میں کس دست ارادت کی نرمی قابل توجہ ہے، توجہ کو ذرا طویل کر دیجئے اور ریاکارانہ خشونت و دوراندیشی کو کچھ کم، کامیابی آپ کی ہے، اور اگر اس طریق زندگی کو آپ پسند نہیں کرتے، تو پھر اپنے شہر کے اس حصہ میں کوئی صورت انتخاب کیجئے جس کے متعلق ہر "کیفہ زردار" کو یہ علم حاصل ہے کہ وہ

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست
چنانکہ خود تشناسی کہ از کجا بشکست

خواجہ

(جناب فضل الٰہی صاحب کلکتہ)

"پنجاب میں ایک نومسلم قوم خواجہ کہلاتی ہے، یہ لوگ مہذب تعلیم یافتہ اور تجارت پیشہ ہیں
سوال یہ ہے کہ دوسری بہت سی مسلمان ہونیوالی قوموں کے خلاف ان لوگوں کو خواجہ
کیوں کہتے ہیں۔ یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ بضا و رغبت مسلمان ہونے کی وجہ سے انھیں
یہ خطاب بادشاہوں نے دیا تھا، لیکن معلوم نہیں تاریخی حیثیت سے یہ ٹھیک ہے یا نہیں؟"

(نگار) خواجہ فارسی زبان کا لفظ ہے اور عزت و اقتدار کا مفہوم پیدا کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ پہلے وزرا، امرا وغیرہ اسی لقب سے یاد کئے جاتے تھے اور مالک کے معنی میں تو اب بھی مستعمل ہے، فارسی زبان میں اس کا استعمال بہت قدیم ہے اور لسانی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس عہد میں جبکہ شاہان اسلام ہندوستان آئے، تاجروں کو عام طور پر خواجہ کہتے تھے۔ اس لئے میری رائے میں پنجاب کی نومسلم قوم خواجہ کو خواجہ کہنا اسی بنا پر تھا کہ یہ تجارت پیشہ تھے۔

ان کا یہ کہنا کہ برضا و رغبت مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کو یہ لقب دیا گیا صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ مسلمان تو جو بھی ہوتا تھا اپنی خوشی سے ہوتا تھا کوئی جبر و اکراہ تو تھا نہیں، پھر چاہیے تھا کہ ہر نومسلم قوم خواجہ کہلاتی۔

یہ لفظ بعد کو عربی اور ترکی زبانوں میں بھی لیا گیا، اور ہر زبان میں ادنیٰ تغیر کے ساتھ اس کے مفہوم میں، عزت و اقتدار کے معنی ضرور پائے گئے ہیں حتیٰ کہ ترکستان میں صرف صدیقی، فاروقی، اور علوی خاندان کے افراد کو اس لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

اصلاحی نزاع

(جناب شمعون احمد صاحب بی اس سی الہ آباد)

"میرے خیال میں اگست کے نگار میں پودے اور ماحول کے معنوں میں فعلیات کے بجائے عضویات غلط ہے معاف کیجئے۔ اپنی عبارت میں نے اس وجہ سے کی کہ دونوں الفاظ کا مفہوم بالکل جدا ہیں عضویات سے مطلب morphology یا anatomy ہوتا ہے اور فعلیات اور اعضاء کے فعل سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کو انگریزی میں فزیالوجی (Physiology) کہتے ہیں، اگر آپ میری رائے سے مطابقت کریں تو مجھے مطلع کریں اور نیز آئندہ پرچہ میں اس کا تذکرہ

فرمادیں۔ عضویت و فعلیات میری رائے میں دو مختلف علوم ہیں۔

دوسری بحث منشور کے بارے میں ہے۔ یہ موشور بھی بولا جاتا ہے لیکن منشور معنی کے اعتبار سے زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کا کام روشنی کو منتشر کرنا ہے۔

(نگار) (۱) یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کے مضمون "پودے اور ماحول" میں فعلیات سے مراد آپ کی فزیالوجی تھی لیکن سوال یہ ہے کہ فعلیات فزیالوجی کا اصطلاحی ترجمہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔

فزیالوجی کا صاف صحیح ترجمہ تو علم وظائف الاعضاء ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس سے مراد افعال اعضا کا علم ہے، لیکن کوئی وجہ نہیں کہ محض عضویات بولکر یہ مفہوم مراد نہ لیا جائے جب کہ اصطلاحی شان اس میں بہ نسبت فعلیات کے زیادہ پائی جاتی ہے، اور لفظ فعلیات اپنے غیر محدود معنی کے لحاظ سے اصطلاح بننے کی بہت کم اہلیت رکھتا ہے۔

اگر آپ کسی ایسے شخص کے سامنے جو فزیالوجی سے بالکل ناواقف ہے، فعلیات کا لفظ استعمال کرینگے تو اس کا ذہن کسی طرح فزیالوجی کی طرف منتقل نہ ہوگا، لیکن عضویات کہنے سے وہ کم از کم اس قدر جان لے گا کہ اس علم سے اعضا کا تعلق ضرور ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فزیالوجی کا ترجمہ عضویات کیا جائے تو اناٹومی کا مفہوم کس لفظ سے ادا کیا جائیگا۔ سو میری رائے میں علم التشریح یا صرف تشریحات بہت مناسب ہے علی الخصوص اس حالت میں کہ ایک لفظ اس معنی میں رائج بھی ہے۔ اور سرجری کے لئے ایک جدا لفظ جراحی پہلے سے پایا جاتا ہے۔

آپ نے اپنی تحریر میں اناٹومی اور مارفالوجی کو ہم معنی ظاہر کیا ہے، لیکن کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ مارفالوجی اور مارفانومی میں کیا فرق ہے، اور اس فرق کی بنا پر اناٹومی کا مفہوم ان دونوں میں سے کس لفظ سے زیادہ مکمل طور پر ادا ہوتا ہے؟

(۲) منشور یا موشور سے مراد وہ مثلثی شیشہ ہے، جس کے ذریعہ سے شعاعوں کو منتشر کر کے ان کے مختلف الوان کا مطالعہ کیا جاتا ہے اور جسے انگریزی میں　　　کہتے ہیں۔ اس لئے محض مفہوم نشر یا انتشار کے لحاظ سے آپ منشور کو زیادہ مناسب سمجھتے ہیں تو پھر آپکو ناشر یا منشار کہنا چاہیے۔ منشور تو بالکل غلط ہے۔

چونکہ اس کا یہ ترجمہ عربی سے لیا گیا ہے اور اس میں اس کو موشور ہی کہتے ہیں (منشور کوئی نہیں کہتا) اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آپ اسے منشور کر دیں جو ترکیب کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے۔

عربی میں دستر ریتنے کو کہتے ہیں، اور چونکہ مثلثی شیشہ کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے کسی نے ریت کر اسکو بنایا ہو، اسلئے عربی میں اسے موشور کہتے ہیں، جو معنی کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے۔

مختلف سوالات

(جناب ابو تراب شرف الدین احمد صاحب - حیدرآباد)

---

(۱) نظریۂ عشق پر کچھ روشنی ڈالئے کیا شہوانیت سے جدا ہو کر بھی اس جذبہ کا وجود رہتا ہے

(۲) ان الفاظ کا مناسب اور اصطلاحی ترجمہ کیا ہوگا۔

Genius — Pessimism — Optimism — Epictetus — Fools — Stoic — Polarimeter — Happiness — Pleasure

(۳) ایران کے صفوی خاندان کے اسباب زوال، اگر ممکن ہو تو مختصراً بحث کیجئے۔

(۴) دنیا کے طرزِ حکومت اور بالشویزم وغیرہ سے صرف عوام ہی نہیں بلکہ اکثر تعلیم یافتہ اشخاص بھی ناواقف ہیں، اچھا ہو اگر ان کی نسبت مختصر مگر دلچسپ مضمون سلسلۂ استفسارات میں شائع ہو جائے۔

(۵) Kant کے Practical Reason کا کیا مقصد تھا۔

(۶) یوگا (Yoga) کے اصول کا ابتدائی دور فلسفہ پر کیا اثر ہوا

(نگار) آپ کے سوالات کا سلسلہ وار جواب یہ ہے:۔

(۱) نومبر ۳۲ء کے استفسارات میں نظریۂ عشق پر گفتگو کر چکا ہوں، ملاحظہ فرمائیے۔

(۲) ترتیب وار ترجمہ یہ ہے:۔ تفاول، تشاؤم، نابغہ یا عبقریت، رواقی یا زینونی، عطال دفنرر، ابقطیطوس، لذت۔ مسرت، استقطابیہ

(۳) صفوی خاندان کی حکومت ایران میں ۹۰۷ھ سے شروع ہوئی اور ۱۱۴۸ھ میں ختم ہوگئی، گیارہ فرمانروا اس خاندان میں ہوئے، پہلا اسمٰعیل تھا اور آخری عباس ثالث۔ صفوی خاندان کا زرین دور شاہ عباس اول کا زمانہ تھا جب ایران کو بہت ترقی ہوئی اور علوم و فنون کی وسیع پیمانہ پر سرپرستی کی گئی، یہ عہد عجیب و غریب تھا، کہ سلطنت عثمانی سلیمان اعظم کے ہاتھ میں تھی، ہندوستان میں اکبر اعظم ایسا شخص فرمانروائی کر رہا تھا، اور انگلستان میں ملکہ الزبتھ کا دور دورہ تھا۔

یوں تو صفوی خاندان کی حکومت کا خاتمہ اسی وقت ہوگیا تھا، جب افغانوں نے محمود کی سرکردگی میں بغاوت کر کے شاہ حسین کو شکست دی، اور ہرات، مشہد اور اصفہان پر قبضہ کر لیا، لیکن صفوی خاندان کے بعض افراد مازندران میں صاحب اقتدار تھے، لیکن اس کے بعد دس سال کے اندر ملکی بغاوت اور روسی و ترکی حملوں نے رہی سہی حکومت کا بھی خاتمہ کر دیا، اور آخرکار نادر علی نے جو افشاری ترک تھا، صفویوں کی مدد کرنے کے بہانے سارے ملک پر اپنا قبضہ کر لیا، اور اس طرح صفوی خاندان ۱۱۴۸ھ میں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

(۴) بالشویزم کے متعلق اپریل ۳۳ء کا نگار ملاحظہ فرمائیے۔

(۵) کینٹ کے پریکٹیکل ریزن سے مقصود یہ تھا کہ نفسیات، کونیات اور الٰہیات یا بالفاظ دیگر روح، کائنات اور خدا کے تعلق کو ظاہر کرے۔ وہ امر مطلق (Categorical Imperative) کا قائل تھا، اور تعلقات علم کے مختلف پہلوؤں سے اُس نے اسکو ثابت کرنا چاہا۔

(۶) یوگ سے مراد ہے اتحاد و تطبیق یعنی غور و فکر، تامل و مراقبہ اور طہارت حیات و اخلاق کے ذریعہ سے روح کا ذات باری کے ساتھ متحد ہوجانا
چونکہ بودھ مذہب ایک قسم کا Pessimistic مذہب تھا، اور نجات حاصل کرنے کے لئے ساری عمر کی تکلیف و اذیت بھی
اس میں ناکافی سمجھی جاتی تھی، اس لئے اس کے مقلدین نے یوگ کے اصول اختیار کرنے میں بہت زیادہ غلو سے کام لیا اور نفس کشی کے لئے
بدترین اذیتوں کے بھی اختیار کرنے سے گریز نہ کیا۔ ہندوؤں میں بھی یوگی لوگ ترک لذات کر دیتے تھے، لیکن اس قدر شدت کے ساتھ نہیں جتنی
بودھ مذہب میں پائی جاتی ہے۔ فلسفۂ روحانیین میں خواہ وہ کسی ملک و طبقہ سے متعلق ہو، تقشف ضروری چیز ہے، اور چونکہ بودھ مذہب
بالکل روحانی مسلک تھا، اس لئے اس میں بھی زہد و تقشف کی شدت بہت پائی جاتی تھی، اور فلسفہ یوگ پر اس کو عمل کرنا ضروری تھا۔ آپ بودھ کی
ساری سیرت اور مذہب بودھ کے تمام اصول کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوگا کہ فلسفۂ یوگ ہر جگہ نمایاں تھا اور اسی کو انھوں نے بنیاد قرار دیا تھا

معلومات

چاء کی جانچ

لندن کے ایک بازار میں، جہاں چاء کی خرید فروخت ہوتی ہے، سیکڑوں بکس روز آتے ہیں اور ان کا سودا ہوتا ہے، اور یہ دیکھنے کے لئے کہ جس چاء کا سودا ہو رہا ہے، وہ اچھی ہے یا بُری متعدد آدمی موجود رہتے ہیں، اور ان کا ذریعہ معاش یہی ہے۔

جب چاء کی خریداری مقصود ہوتی ہے اس میں سے تھوڑا شہ کے قریب یعنی ایک پیسے کے چاء دان میں ڈال کر ابلا ہوا پانی ڈال دیتے ہیں، اور پانچ منٹ کے بعد چاء دان کو (جس کا ڈھکنا بند رہتا ہے) الٹ دیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں چاء کی جو پتیاں ڈھکنے میں چپک رہ گئی ہیں وہ کیسی ہیں، اگر ان کا رنگ ہلکا اور سنہرا ہوتا ہے، تو چاء اچھی سمجھی جاتی ہے، اور اگر ان کا رنگ سیاہی مائل ہو یا ہو جائے تو بُری خیال کی جاتی ہے، اس کے بعد اسکو چکھتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں۔

ہر طریقہ سے اس چاء کے جانچ کرنیوالے جو صرف ایک چاء دان، تقریباً ابلا ہوا پانی اور ایک پیالی لیکر بیٹھتے ہیں لندن کے اس بازار سے کم از کم دو ہزار پونڈ سالانہ (یعنی تقریباً ڈھائی ہزار روپیہ ماہوار) کماتے ہیں

آویزوں کی زبان

مغرب کی تازہ ترین اختراع جس سے ایک عورت کے مرتبہ کا اندازہ ہو سکتا ہے آویزوں کا استعمال ہے، یعنی آویزوں کو دیکھکر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں عورت اس مرتبہ و حال کی ہے، اگر اس کے دونوں کانوں میں آویزے موجود ہوتے ہیں، تو سمجھا جاتا ہے کہ اس کی شادی ہو گئی ہے، اگر صرف داہنے کان میں ہو تو معلوم ہوگا کہ وہ کہیں جگہ منسوب ہو چکی ہے، لیکن اگر کان بالکل ننگے ہیں تو معلوم ہوگا کہ دوشیزہ ہے اور وہ ابھی تک کہیں منسوب بھی نہیں ہوئی۔ اگر اس میں جواہرات کے چھلے یا حلقے یا موتیوں کی لڑیاں پڑی ہوتی ہیں تو سمجھا جائیگا کہ وہ اپنے موجودہ حال پر قانع و مسرور ہے، اور نئے ملاقاتیوں کی اس کو ضرورت نہیں، اگر اس کے آویزے گھنٹی کے شکل کے ہیں تو سمجھا جائیگا، کہ وہ اپنا وقت لطف و تفریح میں بسر کرنا چاہتی ہے۔

قلب کی حرکت ڈاک کے ذریعہ سے

ڈاکٹر رچارڈ نے ایک مریض کے ضربات قلب ڈاک کے ذریعہ سے منتقل کرنیکی کامیاب تدبیر اختیار کی ہے، قلب کے ضربات گراموفون کے رکارڈ پر منقوش ہو جاتے ہیں، اور اس طرح تشخیص مرض کے لئے اُسے دور رہنے والے ڈاکٹروں کے پاس بھی ڈاک کے ذریعہ سے بھیج سکتے ہیں۔

وہ آلہ جس کے ذریعہ سے یہ عمل اختیار کیا جاتا ہے اس کا نام ([illegible]) ہے اور بہت زیادہ حساس ہے، یہ آلہ قلب کی آواز کو بہت زیادہ بڑا کرکے رکارڈ کرتا ہے۔

معمولی آلہ سماعۃ الصدر ([illegible]) میں یہ خرابی بہت بڑی ہے کہ وہ قلب اور پھیپھڑوں کی آوازیں کوئی تفاوت نہیں کر سکتا، لیکن اس جدید آلہ کے ذریعہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے۔

اس طریقہ سے ایک ہی مریض کے ضربات قلب ۰۰ ۵ ڈاکٹروں تک پہنچائے گئے ہیں۔ اور وہ زمانہ جلد آنیوالا ہے، جب ایک مریض اپنے گھر میں لیٹے لیٹے سیکڑوں میل دور رہنے والے ڈاکٹروں کے پاس اپنے ضربات قلب لاسلکی کے ذریعہ سے پہنچاکر تشخیص مرض کرا سکے گا۔

زار کا دشمن

امریکہ میں ایک دوا ایسی ایجاد کی گئی ہے، جس کو پچکاری کے ذریعہ سے خون میں پہنچاکر آدمی کو بیہوش کر دیا جاتا ہے اور اُس سے سوالات کئے جاتے ہیں، اس بیہوشی کی حالت میں وہ ہر سوال کو سنتا ہے اور اس کا صحیح جواب دیتا ہے، لیکن ہوش میں آنیکے بعد اُسے بالکل یاد نہیں رہتا، کہ اُس سے کیا سوال کیا گیا تھا، اور اُس نے کیا جواب دیا تھا۔

اس دوا کا امتحان وہاں کے علماء طبیعین نے ایک مجلس میں کیا اور تین آدمیوں پر تجربہ کرکے اس دوا کی اس خصوصیت پر سخت حیرت کی۔

یوروپ میں مسلمانوں کی تعداد

امریکہ کے ایک رسالہ نے یوروپ میں مسلمانوں کی آبادی کے متعلق حسب ذیل اعداد پیش کئے ہیں:۔

البانیہ (۸۳۰۰۰۰) بلغارستان (۶۷۲۵۰۰) یونان (۴۰۵۰۰۰) جبل اسود (۱۰۵۰۰۰) رومانیہ (۴۴۰۸۷) روس (۵۲۰۰۰۰۰) دیگر ممالک یوروپ (۳۶۲۲۰۰) مجموعہ (۱۰۰۰۴۴۰۰)

جرمنی میں قانون نکاح

برلن میں ایک محکمہ قائم کیا گیا ہے جس کو تعلق صرف معاملہ نکاح سے ہے اور بغیر اس محکمہ کے اجازت کے وہاں کوئی نکاح نہیں ہوسکتا۔ جب کسی مرد و عورت کو نکاح کرنا ہوتا ہے تو یہاں حاضر ہوکر درخواست کرتا ہے، اور پھر جب اُن کے حالات و صحت کی پوری تصدیق ہوجاتی ہے، تو اجازت دیجاتی ہے۔ اگر عمر کے لحاظ از دواج نامناسب ہوتا ہے تو انتظار کی ہدایت کی جاتی ہے اور اگر مرد و عورت میں سے کسی کے خاندان میں کوئی موروثی مرض پایا جاتا ہے تو نکاح کی اجازت نہیں دی جاتی۔

بالوں کی قیمت

انگلستان کی ایک حسین خاتون الزبتھ نے حال ہی میں وہاں کے ایک پوڈر اور رنگ بنانیوالے کارخانے کے خلاف مقدمہ دائر کیا تھا کہ اُس کا رنگ استعمال کرنے سے اُس کے بال خراب ہوگئے جو بہت خوش رنگ تھے، کارخانہ نے عدالت میں یہ عذر پیش کیا کہ خاتون نے رنگ کا استعمال ہدایت کے موافق نہیں کیا، اور اس لئے اوسکے بال بدرنگ ہوگئے۔ لیکن عدالت نے ۵۴۴ پونڈ کی ڈگری خاتون کے حق میں دیدی۔

باریک نویسی

اب سے پہلے دانۂ خشخاش، چاول یا مسور کے دانہ پر ایک شعر یا چھوٹی سی سورت کلام مجید کی لکھدینا بڑا کمال سمجھا جاتا تھا، لیکن اب امریکہ کے ایک ماہر خطاط نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے دو انچ مربع جگہ میں دس لاکھ نقطے لگائے جاسکتے ہیں۔ اس ترکیب کے موجد کا خیال ہے کہ تمام اہم تاریخی تصانیف کو اس خط میں دھات کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کردینا چاہیئے۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا بلکہ ایک بڑی لائبریری کو جیب میں لیجانا ممکن ہوجائیگا۔

مچھلی اور بجلی

سمندر میں ایسی مچھلی پائی جاتی ہے جو اپنے اندر ۲۰۰ دولٹ کی کہربائی قوت رکھتی ہے، یہ برقی قوت اُس کے عضلات سے پیدا ہوتی ہے، اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے، اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو ہلاک کرکے غذا بنانے میں اس قوت سے مدد لیتی ہے۔

ہات کی قیمت

امریکہ میں ایک ٹائپ کرنیوالی عورت کا ہات موٹر میں سوار ہوتے وقت جھوٹا پڑگیا اس لئے اُس نے موٹر کمپنی کے خلاف دعویٰ کردیا عدالت نے فیصلہ کیا کہ چونکہ اس خاتون کے کسب معاش کا ذریعہ صرف اس کا ہات تھا اور اُس میں صدمہ پہنچ جانے کی وجہ سے اسکو

رجسٹرڈ نمبر ال ۲۰۰

جلد ۱۰ شمارہ ۵

نگار

بھوپال سے ہرماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ۔ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۶ء

اب بھی مضامین بدخط اور نہایت ردّی کاغذ پر آتے ہیں، عرض کرنے پر کچھ توجہ نہ کی گئی۔ ازراہ کرم مضامین صاف، خوشخط اور اچھے کاغذ پر لکھکر روانہ فرمائیے کہ پڑھنے میں دردسری اور بیکار وقت ضائع نہ ہو۔ "کاتب"

ایڈیٹر۔ نیاز فتحپوری

شمار (۵)	نومبر سنہ ۱۹۲۶ء	جلد (۱۰)

ملاحظات

شاہ صفی کا شعر ہے، اور بہت پر لطف شعر ہے :-

ہر چہ بادا باد حرفے چند می گویم باو
کار خود در عاشقی ایں بار یکسو می کنم

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی شاعر نے اس پر عمل کیا، کیا حقیقتاً وہ کوئی اخیری فیصلہ عمل کرنے میں کامیاب ہو گیا ؟ مجھے یقین نہیں نہ اس خیال سے کہ شاعر کی بات کا اعتبار کیا، بلکہ محض اس بنا پر کہ کمبخت انسان مایوس ہونے کے بعد بھی امید کا سر رشتہ ہات سے جانے نہیں دیتا۔ چہ جائیکہ ایک عاشق جس کی زندگی کا ایک اک لمحہ اسی تعادل پر قایم ہے۔ مرزا نوشہ کہتے ہیں :-

نازم فریب صلح کہ غالب ز کوئے دوست
ناکام رفت و خاطر امیدوار بود

یعنی "فریب صلح" نے دل میں امید پیدا کر دی، حالانکہ یہ بھی "فریب امید" ہے۔ پہلے ہی اگر دل اس جذبہ سے خالی ہوتا تو "فریب صلح" کی نوبت ہی

نہ آتی۔

اس تمہید سے مدعا یہ ہے کہ میں بھی کبھی کبھی شاہ صفی کی طرح "کار خود ایں بار بگیو کنم" کے لئے بالکل آمادہ ہو جاتا ہوں، اور اپنے حالات میں وہ تغیر پیدا کرنا چاہتا ہوں جو مجھے موجودہ طلسم "بیم و رجا" سے نکال دے۔ لیکن بُرا ہو اس خاطرِ "امیدوار" کا کہ کبھی اس ارادہ میں کامیاب نہیں ہوتا۔ اور باوجود اس کے کہ تکمیل عزم کے اکثر اسباب مہیا ہیں، لیکن جب سرے سے عزم ہی کا فقدان ہو تو پھر تکمیل کس کی دشوار ہے۔

ہزار رخنہ بدام دم از سادہ دلی
تمام عمر در اندیشۂ رہائی رفت

خدا کرے نگار کا نیا سال اس حال میں طلوع ہو کہ میں سارے افکار سے آزاد ہو کر اپنے آپ کو اسی کے لئے وقف کر چکا ہوں۔

نگار میں ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، میرے ایک عزیز دوست کو جنھیں عربی کی پوری استعداد حاصل ہے، اور جو ماشاء اللہ ادیب بھی ہیں لفظ "ذہنیت" پر اعتراض ہے۔ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں مجھ پر طعن کیا ہے کہ "ذہانت یا ذکاوت کے فرق کو اگر محسوس کر لیا جاتا تو ذہنیت کا لفظ استعمال نہ کیا جاتا"۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ لفظ ذہانت ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے یا یہ کہ ان کے نزدیک ذہنیت غلط ہے۔

میں نے اس کے جواب میں ان سے دریافت کیا کہ براہ کرم Mentality اور Intellect کے فرق سے آگاہ کیجئے اور اسی کے ساتھ ان کا ترجمہ بھی لکھ بھیجئے، لیکن اس کا جواب انھوں نے نہیں دیا چونکہ میرے دوست غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں اس لئے میں انکو بتانا چاہتا ہوں کہ انگریزی میں قریب قریب اسی مفہوم کے تین لفظ ہیں Intellect - Intelligence - Mentality اور ان کا ترجمہ اردو میں بالترتیب ان الفاظ سے کیا جاتا ہے ذہنیت، ذکاوت، ذہانت۔ اگر ان کے نزدیک لفظ ذہانت، ذہنیت کے مفہوم کو ادا کرتا ہے تو پھر انہیں Intellect اور Mentality کے ترجمہ میں کوئی تفریق اس کے علاوہ کرنی چاہیئے۔

میں اپنے فاضل دوست کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ Mentality کا ترجمہ اہل مصر بھی ذہنیت ہی کرتے ہیں، اور اب اردو کے تمام اہل قلم اسی ترجمہ پر متفق ہیں اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اپنی ذہنیت میں تھوڑا سا تغیر پیدا کر کے طوعاً یا کرہاً اس کو تسلیم کر لیں اور زیادہ ذہانت سے کام نہ لیں۔

بعض حضرات استفسار کے ساتھ اپنا نام اور پتہ تحریر نہیں فرماتے، شاید انہیں اس کا علم نہیں کہ میں ایسے استفسارات کی طرف توجہ نہیں کرتا، جو کسی نقاب پوش ہستی کی طرف سے پیش کئے جائیں۔ یہ تو ممکن ہے کہ میں نگار میں ان کا نام نہ ظاہر کروں لیکن میں بھی اس سے بے خبر رکھا جاؤں یہ کہاں کا انصاف ہے۔

حال ہی میں حکیم منزل بریلی سے کسی صاحب کا استفسار آیا ہے، جس میں بجائے نام کے "ش، ا، ی، ا، ے، ا، م" لکھا ہوا ہے مجھے شک نہیں کہ

استفسارات اچھے ہیں اور اگر اُن کا جواب دیا جائے تو لوگ بہت دلچسپی سے پڑھیں گے۔ لیکن افسوس ہے کہ میں گمنام ہونے کی وجہ سے اُن کو ضایع کرنے پر مجبور ہوتا ہوں، اگر وہ چاہتے ہیں کہ نگار میں جواب شائع ہو تو براہ کرم اپنے نام سے مطلع فرمائیں، یہ "راقم الحروف" قسم کا تتمہ مجھے پسند نہیں۔

مرتضیٰ جاسوس کا افسانہ راجہ حسن اختر صاحب کے نام سے درج ہوا ہے۔ حالانکہ صاحب مضمون کا صحیح نام راجہ غلام احمد ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ غلطی کیوں ہوئی اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟ بہرحال میں راجہ صاحب کی خدمت میں معذرت پیش کرتا ہوں۔

سید محی الدین صاحب قادری کا دوسرا تنقیدی مضمون ہے جو میر تقی میر کے عنوان سے نگار میں شائع ہو رہا ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ "نقاب اُٹھ جانے کے بعد" کا سلسلہ ختم کر دوں لیکن اس کو جاری رکھنے کے متعلق اس قدر کثرت و شدت سے مطالبہ کیا گیا کہ اس مہینے میں اس کی دوسری کڑی پیش کرنے پر مجبور ہوگیا ہوں۔ "ایک نظر بہ عالم [illegible]" سید محمد ہادی صاحب کا مضمون ہے۔ موصوف کو کچھ عرصہ سے فارسی کے مطالعہ کا بہت شغف ہوگیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ آپ نہایت آزادی کے ساتھ بے تکلف مضامین فارسی میں لکھتے ہیں۔ تاج کے متعلق جو مضمون درج ہے، اس کی طرف ارباب فن کو توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ افسر صاحب کی نظم "نشاط خیال" اصول تغزل [illegible] کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ملک میں اب ایسے ہی ہمت افزا خیالات کو رواج دیا جائے۔ غزلوں میں لطافت کیفی چریاکوٹی کی قند پارسی کی حلاوت اور جناب آزاد انصاری کے کلام کی سلاست قابل داد ہے۔

آئندہ ماہ کے خاص خاص مضامین کی فہرست یہ ہے۔ فن افسانہ نگاری — غالب و ذوق — سیاحت ماہتاب — مطالعۂ شاعری — دولت آباد (ایک ملکہ (افسانہ)) — رحمت کا فرشتہ (افسانہ) — داؤد دکھنی — ناکردہ گناہ (افسانہ) — آل انڈیا افیونی کانفرنس (انکشافات)

نگار کی کاپیاں پریس کو جا رہی تھیں کہ جے مارٹن صاحب کی ایک تحریر پھر موصول ہوئی۔ میں نے جون کے ملاحظات میں صاحب موصوف کا ذکر کیا تھا، یہ تحریر گویا اس ذکر کا جواب ہے۔

اس مرتبہ موصوف نے انگریزی زبان میں ایک مختصر مضمون بھی روانہ فرمایا ہے جس کی سرخی "قرآن اور اس کا غلط جغرافیہ" ہے۔ یہ مضمون گویا ثبوت ہے اس امر کا کہ اسلام سچا مذہب نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ اس مرتبہ ہم اس مضمون کے لئے جگہ نکالنے سے مجبور ہیں، انشاء اللہ آئندہ مہینے میں اس کو درج کر کے غور کریں گے کہ جے مارٹن صاحب کے اعتراضات کس حد تک قابل اعتنا ہیں۔

صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ ہم ان سوالات کو بمبئی کے بڑے بڑے علماء کے پاس لے کر گئے، لیکن بجائے اس کے کہ جواب دیا جاتا، ہم کو کافر کہہ کر نکال دیا گیا۔

نیاز فتح پوری

میر تقی میر اور خارجی حالات کی ترجمانی

میر کی شاعری کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ زیادہ تر اُن کی آپ بیتی پر مشتمل ہے۔ جس میں داخلی کیفیات اور ذاتی واقعات کو جس تکمیل و صداقت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کی مثالیں اُردو کے بہت کم شاعروں کے کلام میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ تاہم یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ میر نے کائنات اور اُس کی فطرت کے متعلق کوئی قابلِ وقعت مرقع نہیں پیش کیا۔ اس بارے میں ان کی مثنویاں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہیں، جب ہم اُن پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میر کی شاعری میں خارجی حالات کے مرقعوں کی کمی نہیں ہے۔

میر کی حالت اور اُن کی مثنویاں

میر کی مثنویاں اُن کی عمر کے کسی مخصوص زمانہ کی پیداوار اور ترجمان نہیں ہیں۔ بلکہ وہ اُنکی طفولیت سے لیکر بڑھاپے تک کی ساری زندگی پر حاوی ہیں۔ اور اُن میں تجربہ اور کیفیات نمایاں ہیں۔ معاً طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ایک ہی نوع کی تخلیق اور ایک ہی شخصیت کے مظاہر ہیں۔ اُن کے گہرے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ ہر ایک مثنوی میں ایک ہی قدرت نغمہ کہنے والی ہستی اپنی ذات کو منعکس کئے ہوئے ہے۔ لیکن اگر کسی مثنوی میں ان کی حیات کا ایک پہلو نظر آتا ہے تو کسی میں دوسرا، کسی میں اُن کی جوانی کی جوشیلی طبیعت، انہیں تیزی کے ساتھ عشق و محبت کی ترجمانی پر مجبور کرتی ہے، تو کسی میں اُن کی طویل عمری اور قنوطیت اُن کے جذبات قلم کو [illegible] کر دیتی ہے، لیکن ساتھ ہی اُن کی قادر الکلامی اور پختہ مزاجی اس فقدانِ جوش و خروش کی تلافی بھی کر دیتی ہے۔

اُن کی بعض مثنویوں کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ ذاتی رہبری اور عبرت آموزی انسان کو کیا کیا سکھا سکتی ہے، اور بعض سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کائنات پر ایک نظر ڈالنے کے بعد کسی کی انفرادیت پر کس قسم کا اور کس حد تک اثر پڑ سکتا ہے؟ گو میر تقی نے اپنی شاعری کے ذریعہ ان عورتوں اور مردوں کے کردار اور زندگیوں کو پیش کرنے کا دعویٰ نہیں کیا جن میں اُن کی زندگی بسر ہوئی تھی، نہ اُن کی مثنویاں اس مقصد سے لکھی گئی ہیں لیکن وہ ضرور ہمیں مطلع کرتی ہیں کہ کوئی شخص ان میں رہ کر کس قسم کے نقوش تاثر اپنے دل و دماغ پر ثبت کر سکتا ہے؟ اور کسی کا ماحول اس کے کردار کی تخلیق میں کہاں تک اُسکی مدد کیا کرتا ہے؟

خارجی حالات کے مرقعوں کی اہمیت

اردو زبان میں نیچر کا لفظ ایک عجیب اہمیت رکھتا ہے، مگر اس وجہ سے نہیں کہ اُردو والے نیچر پرست ہیں یا اردو شعرا نے نیچر کے بہترین مرقع پیش کئے ہیں بلکہ معلوم نہیں وہ ایسی کونسی بری گھڑی تھی جب یہ لفظ سرسید کے قلم سے پہلی بار لکھا گیا کہ اس کی گونج سے ہندوستان کی ساری مذہبی فضا میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ نہ صرف سرسید بلکہ جو کوئی ان سے ذرا ہم آہنگ ہوتا، نیچری کہلاتا، اس پر چاروں طرف سے لعنتوں کی بوچھار ہوتی اور اس کے بعد سے خواہ وہ کسی امر میں خواہ وہ مذہبی یا ادبی، سیاسی یا اقتصادی اس کی بات کو کسی قسم کی وقعت نہ دیجاتی۔

یورپ میں جو انشا پرداز نیچر کی صحیح ترجمانی کرے یا جو شاعر نیچر پرستی کو اپنی شاعری کا مطمحِ نظر قرار دے وہ ایک اعلیٰ قسم کا انشا پرداز اور صحیح المذاق شاعر سمجھا جاتا ہے، اس کی نیچر دوستی اس کے لئے باعثِ معراج بنتی ہے، نقاد اس کی نیچر پرستی کی مدحت طرازی کرتے ہیں اور عوام قبولیتِ عام کی سند

پیش کرکے اُس کی عداوت و خوش مذاقی کی داد دیتے ہیں یہ سب اس لئے نہیں ہوتا کہ یورپ کے لوگ نیچر کو اپنا خدا مانتے ہیں یا یہ کہ ایشیا والوں کی طرح انکے سینے "محبت ربانی" کے نور سے معمور نہیں ہوتے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغوں میں فطرت کا لفظ ان معانی کو اپنے بغل میں دبائے ہوئے نہیں ہوتا۔ جن معنوں کو لئے ہوئے وہ ہندوستانیوں کے خیالات میں چلتا پھرتا ہے۔ یورپ والوں کی زبان سے نکلنے کے بعد یہ لفظ جس قدر وسیع اور رفیع الشان فضا پر حاوی ہوتا ہے، ہندوستانیوں کی بولی میں اسی قدر وہ فضا محدود اور پست ہو جاتی ہے۔

نیچر یا فطرت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک تو وہ جو اُس نظر آنے والی دنیا پر مشتمل ہے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور جو پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں اور آسمانوں کی دنیا کہلاتی ہے اور دوسری وہ جو ہم میں سے ہر ایک کے دل کی ایک مخصوص خانگی دنیا سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر کوئی فطرت کی طرف بڑھنا چاہتا ہے تو اس سے مطلب یہ ہوگا کہ وہ ایک طرف تو بیرونی کائنات سے سرگرم گفتار ہونا اور اس کے گوناگوں معنوں اور بھیدوں سے خبردار ہونا چاہتا ہے اور دوسری طرف اپنے اندر کی اس عظیم الشان دنیا کی سیر و تفریح میں مشغول ہونا چاہتا ہے جو اگرچہ خود ساختہ ہوتی ہے لیکن بیرونی کائنات سے کسی طرح کم نہیں ہوتی۔

بعض ادیب ایسے ہوتے ہیں جو پہلی قسم کی فطرت کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انہیں اس کی کامل ترجمانی کرنے پر کافی قدرت حاصل ہوتی ہے اور بعض ادیب ایسے ہوتے ہیں جو دوسری قسم کی فطرت کے اظہار پر اچھی طرح قابو حاصل کر لیتے ہیں، لیکن موخرالذکر فطرت کی ترجمانی بہ نسبت اول الذکر کی ترجمانی کے زیادہ آسان ہے اور اسی شاعر کی قدر و منزلت زیادہ ہوتی ہے جو پہلی کی کامیاب ترجمانی کرتا ہے۔

میر کی شاعری میں خارجی حالات کے اعلیٰ مرقعوں کا فقدان اور اس کے اسباب

میر تقی، مرزا غالب کی طرح ایک گوشہ نشین شاعر تھے، اُن کی مشہور "بے دماغی" اور خودداری نے انھیں ماحول کی کیفیات اور بیرونی مطالعہ سے باز رکھا، برخلاف ان دونوں کے مرزا سودا، میر حسن اور میاں نظیر اکبرآبادی اپنے زمانہ کی تفریحی سوسائٹیوں میں شریک رہتے تھے، اور اسطرح اُنھیں ہر بیرونی اور اندرونی چیز کی فطرت پر گہری نظر ڈالنے کا موقع حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں کے کلام میں بستی اور اس کے متفرق پہلوؤں کے متعلق بہت زیادہ مرقع دستیاب ہوتے ہیں۔ خصوصاً نظیر اکبرآبادی کی نظر سوسائٹی اور ماحول کی ہر چیز پر پڑا دی تھی۔ ان کی آوارہ گردی اور قلندر مزاجی نے انھیں اس امر کا کافی موقع دیا تھا کہ وہ ہر قوم اور ہر طبقہ کے افراد سے دل کھول کر میل جول رکھیں اور اسی کے طفیل میں اُنکے متعلق صحیح سے صحیح اور بہتر سے بہتر تصویریں پیش کر سکیں، سودا اور میر حسن کے بیانات بھی شگفتہ مزاجی اور خوش باشی کے باعث میر تقی اور مرزا غالب کے بیانات سے زیادہ اصلی اور دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔

میر کو چونکہ زمانہ نے بہت زیادہ گھریلو بنا دیا تھا اس لئے انھیں گھریلو اشیا کی فطرت کے مطالعہ کا تمام عمر موقع ملتا رہا۔ یہی سبب ہے کہ خانگی اشیا پر وہ بڑی شائستگی کے ساتھ روشنی ڈالتے ہیں، چنانچہ پالتو جانور مثلاً مرغ، بلی، کتے، بندر، بکری وغیرہ اور کھٹمل، برسات میں گھر کے در و دیوار پر انھوں نے اپنی مثنویوں میں جو واقعات لکھے ہیں ان میں تفصیل کے ساتھ پتہ پتہ کی باتیں نہایت خوبی سے بیان کی ہیں۔

جب وہ نواب آصف الدولہ مرحوم کے ہمراہ دو تین دفعہ شکار کو گئے اور بیرونی کائنات کا مطالعہ کیا تو اُس کی تصویریں بھی پیش کرنے کی کوشش کی جنمیں سے بعض واقعی قابل تعریف ہیں، نیز ایک دو دفعہ خانگی طور پر سفر بھی پیش آیا تھا تو اس کے واقعات بھی قلمبند کر لئے ہیں اور یہ سب خارجی تصویریں

کچھ بُری نہیں ہیں۔ پس اگر زمانہ میر کو بیرونی کائنات کے مطالعہ کا اور زیادہ موقع دیتا تو بہت ممکن تھا کہ ان کی شاعری میں خارجی حالات کی بھی اچھی سے اچھی تصویریں نظر آتیں اور ان کی مثنویوں میں جہاں داخلی بیانات اور ذاتی حالات کی گہرائیوں کی کمی نہیں خارجی معاملات کی بلند پروازیاں بھی کثرت سے پائی جاتیں۔ تاہم اگرچہ ایشیا کے اکثر شعرا کی طرح ان کی شاعرانہ قوتوں کی حقیقی جولانگاہ دلی کیفیات کی ترجمانی ہے، لیکن کائناتی فطرت کی بھی انھوں نے جو جو تصویریں پیش کی ہیں وہ بھی ایک حد تک پاکیزہ اور دلچسپ ہیں، ان میں سے بعض یہاں تک مکمل ہیں کہ اُنکے مطالعہ کے بعد یہ یقین ہو جاتا ہے کہ میر خارجی فطرت کے اظہار میں بھی قادر الکلام تھے۔ نیز یہ کہ انھوں نے ضرور ان اشیا اور واقعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے جن کی وہ تصویریں کھینچ رہے ہیں۔

مرغوں کی لڑائی ایک جگہ میر مرغوں کی لڑائی کا سماں کھینچتے ہیں اور ایسی چیزیں بیان کرتے ہیں جو نفسیات کی رو سے بھی پوری اترتی ہیں۔ مرغوں کا لڑنا، ان کے مالکوں اور طرفداروں کا ان کی ہمدردی کے اظہار میں آپے سے باہر ہو کر عجیب عجیب حرکتیں کرنا اُن کی فتح مندی پر اظہار جوش و مدحت طرازی اور شکست و ہزیمت پر چیخ پکار، ان سب کا مکمل مرقع بعید دلچسپ اور صحیح پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سب کی ہوں ان سفیدوں کی باتیں
ان نے پر جھاڑے، یہ اُدھر کھنکے — اُن نے کی نوک پر کھڑے ہونے لگے
وہ جو ہمرا جا ہوا، تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے برستے ہیں سچ مچ
مرغ کی ایک پرفشانی ہے — اس کی سو رنگ پر زبانی ہے
ایک کہے کہ "کاری آئی چوٹ" — ایک کہتا ہے "بس گیا اب لوٹ"
جھلتے ہیں، آپ کو چراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منہ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منہ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے — ٹیڑھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ، طرفہ صحبت ہے! — بعد نصف النہار رخصت ہے

نواب آصف الدولہ کا شکار میر کی وہ مثنویاں جو نواب اودھ آصف الدولہ مرحوم سے متعلق ہیں تعداد میں چھ ہیں، تین صید نامے، ایک کدخدائی نواب، پانچویں آصف الدولہ کا ہولی کھیلنا اور چھٹی ساقی نامہ۔ پہلی تین مثنویوں میں انھوں نے شکار کے سین تھے تفصیل دار مرقع پیش کئے وہ ضرور قابل ذکر ہیں۔ کیا حسب ذیل بیانات سودا کے خارجی معاملات سے ٹکر نہیں کھاتے؟ نواب اور ان کے ہمراہی جب شکار کے لئے جنگل میں داخل ہوتے ہیں تو اس کی وجہ سے جنگل کے جانوروں کی جو حالت ہوتی ہے اس کی تصویر پیش کرتے ہیں

چلا آصف الدولہ بہر شکار — نہاد بیاباں سے اٹھا غبار
روانہ ہوئی فوج دریا کی رنگ — لگا کانپنے ڈر سے شیر و پلنگ
طیور آشیانے سے جانے لگے — وحوش اپنی جانیں چھپانے لگے

صید نامہ کی دوسری مثنوی میں اسی حالت کا جو نقشہ اتارا ہے وہ یہ ہے۔

پلنگوں نے کہسار کی راہ لی   نہنگوں نے دریا کی جا تاہ لی
بچیرے جو تھے دام سے چھاگئے   کشف نیچے ڈہالوں کے گھبرا گئے
شغال اور روباہ خرگوش سے   نہیں بحث کچھ یہ ہیں بیہوش سے
کوئی ڈھونڈھتا ہے بیاباں میں جھاڑ   کوئی چاہے ہے پھاند جاؤں پہاڑ
کہ شاید یہ اودھم ہو کچھ سکل   کوئی دن جئے اس بلا سے نکل

فوج کا دریا پر سے گزرنا

نواب آصف الدولہ کے شکار میں ایک عجیب دریا حائل ہوتا ہے اور ان کے سب ہمراہی اس کو عبور کرنے کی فکر کرتے ہیں، اس وقت عام لوگوں کی جو حالت تھی اور دریا کا جو عالم تھا ان دونوں کی کس قدر اصلی تصویر پیش کی ہیں۔

ہوا حائل راہ بحر عمیق،   کہ ہو وہم ساحل پہ جس کے غریق
قریب آکے اتری پہ خائف تھی فوج   کہ بیٹھ دل اُٹھتی تھی ہر ایک موج
غضب لجہ خیزی، بلا جوش پر   تلاطم قیامت لئے دوش پر
تردد میں ہر اک کہ ہوں کیونکہ پار   کنارے پہ سرگشتہ گرداب وار
رواں آب ایسی روانی کے ساتھ   کہ جوں جنگی ہو جوانی کے ساتھ

کدخدائی نواب آصف الدولہ بہادر

نواب اودھ کی کدخدائی کی مثنوی میں ایک ساقی سے مخاطب ہو کر ماحول کی رنگ رلیوں اور سرمستیوں کی بہترین عکاسی کی گئی ہے، ان بیانات کے پڑھنے کے بعد ہمیں اس زمانہ کے رسوم کا ایک اچھا خاصہ نقشہ نظر آجاتا ہے مثلاً جب بادشاہوں یا امیروں کی شادی میں جلوس نکلتا تو سب سے پہلے نشان کا ہاتھی ہوتا تھا جو زرق برق آرائش کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سونے کا پہاڑ چل رہا ہے اس کے بعد کئی ہاتھی ہوتے تھے جو مست نوجوانوں کی طرح چلتے تھے، ان تمام کی زیب و زینت زمین پر وہی سماں پیدا کر دیتی تھی جو آسمان پر تاروں سے ہویدا رہتا ہے۔ جلوس کے آخر میں خاص سواری کا ہوتا تھا جو ابر بہار کی طرح جھومتا ہوا جاتا تھا۔ برابر، برابر پلٹنیں چلتی تھیں رنگ برنگ کے خوبصورت اور شوخ و شنگ گھوڑے عجیب بہار دکھایا کرتے تھے، لوگ ہر دلعزیز بادشاہ یا امیر کے جلوس کے وقت اس کثرت سے پھول پھینکتے کہ راستوں میں ہر طرف پھول ہی پھول بکھرے ہوئے نظر آتے تھے، اس مثنوی کے بعض شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے سواری کے فیل کی وہ دھوم   جیسے ابر بہار آوے جھوم
آئی دولت سرا سے ہو کے سوار   لعل ناب و گہر میں صرف نثار
اک مہابت کے تئیں فیل نشاں   آگے مانند کوہ زر کے رواں
اور ہاتھی ہیں جھومتے جاتے   جیسے آویں جوان مدماتے
پلٹنیں جاتی ہیں برابر یوں   صف مژگاں ہو لبرزنگی جوں
مال بستہ رکاب میں ہیں سرنگ   جن کے دیکھے کمیں چرخ ہو دنگ

ساقی شمع اک ذوق نہ ہو　　　مطرب بانو ہے اک نقل گل ہے

اس کے بعد ایک بہاریہ غزل سنائی جاتی ہے اور اسی سلسلہ میں اُن کے وہ اشعار آتے ہیں جو انہوں نے شراب پر لکھے ہیں ان اشعار میں شراب کے تقریباً ہر متعلقہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے :

وہ دارو ئے دردِ بے حضوراں　　　وہ مایۂ نورِ چشمِ کوراں
سرمایۂ عمرِ جاودانی　　　یعنی وہ ہے آبِ زندگانی
وہ بوئے خوش رسیدہ جانے　　　وہ عیشِ دلِ گزیدہ جانے
آئینۂ حسنِ خود پسنداں　　　زینت دہ عیش پُر کنداں
وہ رنگِ رخِ بہارِ ہستی　　　وہ بادۂ خوشگوار یعنی
وہ کامِ دلِ سیہ بدستاں　　　یعنی کہ وہ ہے شرابِ جوشاں
وہ موجبِ دل خوشی کہاں ہے　　　وہ دارو ئے بے غمی کہاں ہے
وہ جس کی عادت کو ہو تہ دل　　　یعنی وہ ہے شیشہ ماہ منزل
وہ آتشِ تیز آب آمیز　　　وہ عربدہ جو وہ فتنہ انگیز
وہ قاصدِ دیدن ناامیداں　　　وہ روسپیدِ روسفیداں
وہ رونقِ کارگاہِ شیشہ　　　وہ شوکتِ بارگاہِ شیشہ
وہ جس سے ہے توبہ پریشاں　　　وہ جس سے ہے گفتگو پریشاں
وہ دامنِ خشک جس سے ہو جائے　　　ثابت قدموں کا پاؤں چل جائے
وہ سرخیِ چشمِ خوبرویاں　　　اسبابِ خرابیِ نکویاں
وہ دلبرِ خود سر و شتابیں　　　وہ رہزنِ راہِ دین و آئیں
وہ جس سے غبارِ دل کے دھو دیں　　　میناکے گلے سے لگ کے رو دیں

ایک گاؤں کے کتے

میر تقی میر کے خارجی بیانات میں کتوں کے ہنگامے بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، وہ کتوں سے بہت بیزار ہو گئے تھے، چنانچہ کئی مثنویوں میں انھوں نے اُن کی شکایت کی ہے۔ کسی گاؤں میں پہنچتے ہیں تو وہاں کتے خوب ستاتے ہیں میر نے اس کا کس قدر عمدہ مرقع پیش کیا ہے، حسب ذیل اشعار پڑھنے کے بعد کیا اس امر کا ثبوت نہیں ملتا کہ میر تقی معمولی معمولی اشیا کا نہایت گہرا مطالعہ کرتے تھے ؟

کتوں کے چاروں اور رستے تھے　　　کتے ہی واں کے تو ابستے تھے
دو کہیں ہیں کھڑے اکہیں بیٹھے　　　چار لوگوں کے گھر میں ہیں پیٹھے
ایک نے پہوڑے پاس اکوئی　　　کھو مارے گھروں کے سب کونے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر بہت مشہور ہے

کوئی گھورا کرے کوئی چونکے	خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے
سانجھ ہوتے قیامت آئی ایک	شور عف عف آفت آئی ایک
گرگرا کر گھر دھیں بھرنے لگے	روٹی ٹکڑے کی بو پہ گھنے لگے
ایک نے آکے دیگچہ چاٹا	ایک آیا سو کھا گیا آٹا
ایک نے دوڑ کر دیا بھوڑا	پھر چپا آکے تیل اگر چھوڑا
گھورنے اک لگا اندھیرا کر	ایک نے دور ایک پھیرا کر
گھر میں چھینکے اگر ہیں توڑ دیے	ہانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے
لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں	لڑتے ہیں دوڑتے ہیں گرتے ہیں
جگہ جگہ ہی پہ چار چار لڑیں	گوشت پہ چھیڑیں سے دوڑ پڑیں
کتے ہی واں دو چار رہتے ہیں	دو گئے بھی تو چار رہتے ہیں
جاگتے ہو تو دو بدو کتے	سو کر اٹھو تو رو برو کتے
منہ میں کف دور دور کو نیسے	حال بے حال شور کرنے سے
کتوں کی کیا سماجتوں کو کہیں	پیچھڑی سے رات دن لگے ہی رہیں
باہر اندر مکاں کہاں کتے	بام و در چھت جہاں تہاں کتے
جھڑ جھڑا دے ہے کان کو کوئی	رو دے ہے اپنی جان کو کوئی
اک طرف ہڑ چپڑ چپڑ کی صدا	یعنی کتا ہے پلی چاٹ رہا
ایک چلنی کو منہ میں لے آیا	ایک چولہے کو کھودتا پایا
ایک کے منہ میں ہانڈی کی کالی	ایک نے چینی چاٹ کے ڈالی
تیل کی کپی ایک لے بھاگا	ایک چلنے کہڑے سو جا لاگا

آدمی کی معاش ہو کیونکر؟

کتوں میں بود و باش ہو کیونکر؟

گھر میں کتوں کا ہنگامہ

جس طرح ہم نے پہلے بھی اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میر تقی میر کو کائنات کی جن جن اشیا سے سابقہ پڑا ان تمام کا انھوں نے اپنی شاعری میں مرقع پیش کر دیا ہے، اور چونکہ کتوں سے ان کو سب سے زیادہ سابقہ تھا اس لئے انھوں نے انکی شکایت میں بہت زیادہ اشعار لکھے ہیں، اور یہ اشعار کتوں کی فطرت اور عام ہندوستانی دیہات اور ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں ان کے ہنگاموں کی اس قدر فطری اور دلچسپ تصویریں پیش کرتے ہیں کہ شاید ہی اردو کے کسی اور شاعر کو یہ بات نصیب ہوئی ہو۔ وہ ایک مثنوی میں اپنے گھر کا حال بیان کرتے ہیں اور

نکلتے ہیں کہ جب ان کے گھر کی ایک دیوار گر پڑی، تو کتوں کے آنے جانے کیلئے کوئی روک ٹوک باقی نہ رہی اور وہ بے تکلف اپنا گھر سمجھکر آنے جانے لگے، کس خوبی سے اس کا اظہار کرتے ہیں ۔

اِدھر سے اُدھر کتوں کا رستہ   کاش جنگل میں جاکے میں بستا!

ہر گھڑی دو گھڑی تو دو تین چار   ایک دو کتے ہوں تو میں مارو

جا جاتے ہیں، چار آتے ہیں   چار عف عف سے مغز کھاتے ہیں

کس سے کہتا پھروں یہ صحبت نغز   کتوں کا ساٹھ سال سے لاؤں مغز

کھٹملوں کا حال

متذکرہ بالا مثنوی میں جس کے ذریعہ سے اپنے گھر کا حال پیش کیا ہے، کھٹملوں کا بھی ذکر آگیا ہے۔ اس موقعہ پر غریبوں کی زندگی کا بعینہ نقش کھینچا ہے۔ کھٹمل جو غضب ڈھاتے ہیں اس کا بیان شاید ہی اس سے بڑھکر دلخراش اور مکمل کوئی اور پیش کر سکے ایک تو میر کی طبیعت ہی افسردہ تھی اور دوسرے یہ خود ان کی بیتا تھی! بھلا کیونکر بیان مکمل نہوتا۔ بعض شعر ملاحظہ ہوں ۔

گرچہ جھتوں کو ہی مسل مارا   پر مجھے کھٹملوں نے مل مارا

ملتے راتو نکو گھس گئیں پوریں   ناخنوں کی ہیں لال سب پوریں

ہاتھ تکئے پہ، گہہ بچھونے پر   کبھو چادر کے کونے کونے پر

سلسلا یا جو پائنتی کے اوپر   وہیں مسلا، کراہیڑیوں کا زور

تو نشان ان رگڑوں ہی میں بہا   ایڑیاں یوں رگڑتے ہی کاٹی

جھاڑ جھاڑ تلے گیا سب بان   سارہی کھاٹ کی جولیں کونڈا

نہ کھٹولا نہ کھاٹ سونے کو   پاٹے پٹی لگائے کونے کو

جب تب بیٹھے پڑے پائے   سیتلا کے سے دانے مرجھائے

سوتے تھانہ بان میں کھٹمل   آنکھ، منہ، ناک، کان میں گھٹمل

اک ہتھیلی میں، ایک گھائی میں   سیکڑوں ایک چارپائی میں

ہاتھ کو چین ہو تو کچھ لکھیے،   کب تلک یوں ٹٹولتے رہیے ؟

اگر ہم میر کی شاعری کو حقیقی طور پر سمجھنا، اور انکی مثنویات سے اچھی طرح مستفید ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ انھیں ایک ایسا متمول اور متکبر انسان تصور نکریں، جو کسی بڑے شہر کے ایک عظیم الشان محل میں زرق برق لباس سونے چاندی کے ظروف، اور قیمتی ساز و سامان لئے عیش و عشرت میں زندگی بسر کر رہا ہو، بلکہ انکو ایک ایسا خود دار اور مستغنی مزاج شریف آدمی سمجھیں جو کسی اجاڑ محلے کے ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں اپنی دردآشنا زندگی کے طویل ایام غربت و مصیبت کیساتھ گزار رہا ہو، اور آئے دن ایک نہ ایک سانحہ بلا کی صورت میں نازل ہوکر قنوطیت کے ان بادلوں میں جو اسکی افسردہ طبیعت پر ہر وقت چھائے رہتے ہیں ایک قیامت خیز اضافہ کرتا رہتا ہو، اور ان اضافوں کا سلسلہ اسوقت تک جاری رہتا ہو جبکہ اسکی نازک دماغ شخصیت، اور ہمیشہ لرزتے رہنے والا قلب رکھنے والی ہستی اپنی پژمردہ زندگی کے ایکسو سال ختم کرنیکے بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کر جاتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور بی۔اے

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

(۲)

(۱)

خواجہ مسرور شاہ کی زندگی کا ابتدائی زمانہ جس ماحول میں گزرا وہ باعتبار اپنے علم و فضل کے خواہ کیسا ہی تاریک کیوں نہ ہو، لیکن درویشی و تصوف کے لحاظ سے ضرور اس میں وہ تمام اسباب مہیا تھے جو ایک شخص کو ہر طرح سے پیر و ولی بنا سکتے ہیں۔ ان کے باپ خواجہ منصور شاہ ایک مشہور خانقاہ کے متولی تھے، نذر و نیاز کی رقم کا حساب کتاب بھی انھیں کے پاس رہتا تھا، یوں تو بہت سے مجاور اس آمدنی کے حصہ دار تھے لیکن یہ اپنے ریاضی داں دماغ کی بدولت خانقاہ کی آمدنی تمام شرکا میں تقسیم کرنیکے بعد بھی بہت کچھ اپنے لئے بچا رکھتے تھے، علاوہ اس کے ان کا حلقۂ ارادت و بیعت بھی کافی وسیع تھا، اور شاید ہی کوئی مخصوص دن ایسا ہوتا ہو کہ دو چار ارادتمند ادھر اُدھر سے آکر کچھ نہ کچھ بطور نذر کے پیش نہ کرتے ہوں، ہر جمعرات کو خانقاہ میں جلسۂ سماع مرتب ہوتا، دور دور کے قوالوں کا یہاں حاضری دینا، شہر کی ہر گوار بازاری عورت کا نہایت ادب ہیئتِ نمائش حسن و پندار شباب کے ہر ممکن کوشش کے ساتھ اس میں شریک ہونا، اور پیر منصور شاہ کا سپید داڑھی اور نورانی صورت لیکر "رقص حال" میں مصروف ہونا!

یہ تھی وہ فضا جس میں خواجہ مسرور کی نشو و نما ہوئی، چونکہ خواجہ مسرور فی الجملہ قبول صورت تھے اور اُن کی آنکھوں میں قدرت نے شروع ہی سے ایک مقناطیسی کیفیت ودیعت کر دی تھی اس لئے جب ان کے شباب کے ساتھ ساتھ ان کی رعنائیوں میں بھی اضافہ ہوا جو دائرہ تصوف کے اندر رہکر بھی پیدا کی جاسکتی ہیں تو تھوڑے دنوں میں بجائے منصور شاہ کے "مسرور میاں" کے پوچھنے والے زیادہ ہوگئے اور جنس نازک کے ارادتمند ان بوڑھی کا تو ہر وقت ان کے حجرہ میں ہجوم نظر آنے لگا۔ معلوم نہیں بیٹے کی تربیت کا خیال تھا یا جذبۂ رشک کہ منصور شاہ نے "مسرور میاں" کو بارہا اس طرف توجہ دلانی چاہی، لیکن جب وہ اس حقیقت پر غور کرتے تھے کہ ہمارا تو پیشہ ہی یہ ہے اور پھر فتوحات میں بھی اضافہ ہو رہا ہے تو خاموش ہوجاتے، اور جب کبھی مجمع میں ذکر آجاتا تو کہتے کہ "ماشاءاللہ مسرور میاں کی شب زندہ داریاں بہت بڑھتی جاتی ہیں، میں منع کرتا ہوں کہ اس قدر زیادہ محنت شاقہ نہ برداشت کریں کیونکہ سنت نبوی کے خلاف ہے، لیکن ان پر تو ان کے دادا کا حال زیادہ غالب ہے اور وہ اپنے ملفوظات میں پیشین گوئی کر ہی چکے ہیں کہ "میرا ایک پوتا میرے عہد کی یادگار ضرور قایم کریگا" اس نے میں کیا کر سکتا ہوں، اللہ کی یہ مرضی ہے، اپنے بندہ کو جس کام کے لئے منتخب کرے، کیا عذر ہوسکتا ہے، بہر حال میرے دن تو ختم ہوگئے! اللہ مسرور میاں کو خرم و آباد رکھے کہ انھیں کی ذات سے اس خانقاہ کی دیرینہ روایات قایم ہونیوالی ہیں"

مسرور میاں کے جوان ہونے اور کاروبار خانقاہ سنبھالنے کے چند دن بعد ہی خواجہ منصور شاہ کا انتقال ہوگیا، اور مسرور میاں اُس گدی پر خواجہ مسرور شاہ چشتی نظامی کی حیثیت سے رونق افروز ہوگئے۔

منصور شاہ ذرا قدیم خیال کے انسان تھے اور جاہل ہونیکے لحاظ سے ان کا حلقۂ اثر بھی ویسا ہی تھا، لیکن مسرور شاہ چونکہ نئی روشنی کے پیدا وار تھے

اور فی الجملہ کچھ تعلیم یافتہ بھی تھے، اس لئے انھوں نے ذرا بلند سطح پر اپنا میدان عمل قایم کرنا چاہا، یقیناً یہ ارادہ بہت دشوار طلب تھا، لیکن مسرور شاہ کی فطری ذہانت اور فہم سلیم نے جو قدرت نے ان کے دماغ میں ودیعت کردی تھی نہایت آسانی سے تمام دشواریوں کا مقابلہ کیا اور دو چار سال کے اندر انھوں نے خاصہ اقتدار ملک میں حاصل کرلیا۔ اب ان کی شہرت حیدرآباد کی چار دیواری کے اندر محدود نہ تھی، بلکہ ملک کے ہر گوشہ میں ان کے جاننے والے، ماننے والے پیدا ہوگئے تھے اور دور دور مقامات سے ان کو دعوت دیجاتی تھی تاکہ وہاں پہونچکر اپنے برکات درویشی سے فیضیاب کریں چنانچہ یہ کبھی ایسی دعوتوں کو رد نہ کرتے کیونکہ دعوت کا رد کرنا سنت کے خلاف ہے اور اپنے برکات درویشی سے لوگوں کو فیضیاب کرتے۔

مسرور شاہ صاحب دل درویش ہوں یا ہوں لیکن اس میں کلام نہیں کہ ان کی آنکھ میں موہنی اور زبان میں سحر ضرور تھا آنکھ میں آنکھ ڈال کر مسکراتے ہوئے ان کا کسی سے بات کرلینا قیامت تھا یہ معلوم ہوتا تھا کہ تیلیوں سے خاص قسم کی ٹھنڈی شعاعیں نکل کر دل و دماغ میں نشہ کی سی کیفیت پیدا کررہی ہیں اور لبوں کی جنبش سے پیدا ہونیوالا ہر ہر لفظ روح کے لئے ایک مخصوص حلاوت ہے صورت کے لحاظ سے بھی بدقسمت نہ تھے اور صاف رنگ پر ان کی کاکلیں وسیع پیشانی، بڑی آنکھیں، نمایاں ابرؤں پر بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔

جب کبھی وہ باہر سفر کرتے تو اکثر گیروا لباس ان کے جسم پر ہوتا اور اس میں شک نہیں کہ ان کے منڈی ہوئی داڑھی مونچھ پر بہت کھلتا تھا۔

مسرور شاہ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں سفر کرتے تھے، دو تین خادم ساتھ رکھتے اور اسباب سفر بھی نہایت مہذب و شایستہ ہوتا، پہلے سے تمام درمیانی اسٹیشنوں پر جہاں جہاں ان کے مرید ہوتے ذریعۂ تار اطلاع دیدی جاتی اور وہ ہجوم کرکے آتے اور پھولوں کے ہار، تحائف وغیرہ خدمت میں پیش کرتے۔ منزل مقصود پر تو خیر اہتمام ہونا ہی چاہئیے، ہمیشہ کسی شاندار کوٹھی یا ہوٹل میں قیام کرتے، دو چار وعظ فرماتے اور مریدوں کی تعداد میں کافی اضافہ کرکے کسی دوسری جگہ تشریف لیجاتے۔

خصایل: عادات کے لحاظ سے مسرور شاہ بظاہر بالکل بے عیب معلوم ہوتے تھے۔ پنجوقتہ نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنا، روزے رکھنا، صدقہ و زکوٰۃ دینا رات کا اکثر حصہ ذکر و شغل میں بسر کرنا، لوگوں کو ادائے حق کی تلقین کرنا، یہ تھے وہ مشاغل جن میں ان کے اوقات بسر ہوتے تھے، ان کے مخالفوں کو بھی ان میں کوئی بات قابل گرفت نظر نہ آتی تھی سوائے اس کے کہ وہ عورتوں کو بھی مرید کرتے تھے اور پھر ان سے کوئی پردہ نہ رہتا تھا۔ الغرض اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا اور مسرور شاہ کی کامیابیاں وسیع ہوتی رہیں۔

―――― (۲) ――――

حیدرآباد کے رئیس چودھری عالم الزمان کے ہاں ان کی لڑکی کی شادی ہورہی ہے، دوست احباب کا ہجوم ہے اور مسرور شاہ صاحب بھی ایک ہفتہ سے وہیں مقیم ہیں، چودھری صاحب کا سارا گھر شاہ صاحب کا مرید ہے اور شاہ صاحب کو بھی اتنی خصوصیت شاید ہی کسی دوسرے سے ہو، جتنی اس خاندان سے ہے گھر میں کسی سے پردہ نہیں ہے اور شاہ صاحب ایک محرم کی طرح اس گھر میں زندگی بسر کررہے ہیں، چودھری صاحب کا بیٹا بدیع الزمان بھی (جسے شاہ صاحب ہمیشہ بدیعی کے محبت آمیز نام سے پکارتے ہیں) کالج سے رخصت لیکر آگیا ہے، اور خاندان کے دوسرے افراد کی طرح یہ بھی ان کی خدمت میں مصروف ہے رات کا وقت ہے سب لوگ کھانا کھاکر اپنے اپنے کمروں میں لحاف اوڑھ کر پڑ گئے ہیں۔ بالاخانہ کے ایک خوبصورت کمرہ میں چار کا سماوار سنسنا رہا ہے، عود سلگ رہا ہے، مخملی قالینوں پر آرائش کی مختلف چیزیں قرینے سے چنی ہوئی ہیں مسہری پر ریشمی لحاف اور نرم نرم خوشنما جھالردار تکئیے رکھے ہوئے ہیں سرہانے

مختصر سی میز پر شمع جل رہی ہے، سوائے بیچ کے تمام دروازے بند ہیں جس کی خوبصورت چلمن سے ہلکی روشنی چھن چھن کر آ رہی ہے، شاہ صاحب مسند پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے ہیں اور صفیہ جس کی شادی کی تقریب میں یہ اجتماع نظر آتا ہے سامنے پاندان کھولے شاہ صاحب کے لئے پان بنا رہی ہے۔ شاہ صاحب نہایت غور سے پان بنانے میں اس کے ہاتھوں کی جنبش کو تھوڑی دیر تک دیکھتے رہے اور بولے "صفیہ، تمہیں معلوم ہے کہ پان کھانے سے زیادہ، تمہارا یہ ننھے پان بنانا کیوں زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے" صفیہ یہ سن کر کچھ شرما گئی اور خاموش رہی، لیکن شاہ صاحب نے اپنا سلسلہ سخن جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "تمہارا نہایت سبک انداز میں صرف دو انگلیوں کی مدد سے چھالیہ پکڑنا اور باقی انگلیوں میں ترتیب وار خم پیدا کر کے تھپکیاں اس طرح علیحدہ رکھنا گویا وہ بہت بیزار ہے قیامت کا منظر پیش کر دیتا ہے" صفیہ نے یہ سن کر حد درجہ شوخی آمیز انفعال کے ساتھ اپنا ہاتھ ڈوپٹہ سے چھپا لیا اور جلدی جلدی گلوری بنا کر تھالی میں رکھی اور سامنے سرکا دی، شاہ صاحب نے جن کے لئے یہ ادا اور زیادہ تباہ کن دیکھا، اس کو بھی دیکھا اور غیر محسوس ٹھنڈی سانس لیکر گلوری اٹھاتے ہوئے بولے "کیوں صاحب، یہ گلوری آپ کی ویسی تو نہیں ہے جس کو زہر عشق کی زبان میں "پان کل کے لئے لگاتے جائیں" کہتے ہیں۔ یقیناً ایسا ہی ہے کیونکہ یہ رات ایک ایسا سمندر ہے جس میں میرے شاہد زندگی کا آفتاب ہمیشہ کے لئے ڈوبنے والا ہے کل تمہاری شادی ہو جائے گی اور تمہاری ان تمام اداؤں سے لطف اٹھانے والا، تمہاری صورت پر قربان ہونے والا، تمہارے جسم کی بھینی بھینی خوشبو سے مست ہونے والا جو ہو گا، وہ میں نہ ہوں گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ پھر میں تمہیں کبھی دیکھ بھی سکوں گا یا نہیں"

صفیہ شاہ صاحب کی خدمت میں بہت گستاخ تھی اور وہ بھی نہایت آزادانہ گفتگو اس سے کیا کرتے تھے، لیکن اس کا رنگ بے تکلفانہ ہوتا تھا نہ کہ عاشقانہ آج ان کے منہ سے اس قسم کی باتیں سن کر اسے تھوڑا سا تعجب ہوا لیکن چونکہ وہ شاہ صاحب کی شاعرانہ خصوصیت سے بھی آگاہ تھی اس لئے اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ یہ فقرے بھی ویسے ہی ہیں مگر ذرا گہرے رنگ کے ساتھ لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئی، وہ شاہ صاحب کے ایسے عجیب فقروں کا جواب ہمیشہ ایک معصوم شوخی کے ساتھ دیا کرتی تھی لیکن چونکہ اس وقت شاہ صاحب کے الفاظ میں اس نے ایک خاص درد محسوس کیا، دل کی گہرائیوں کی مخصوص التجا ان میں چھپی ہوئی دیکھی ایک ایسی گرفت ان کے اندر پائی جس کی تاب وہ مشکل سے لا سکتی تھی اس لئے اس نے چاہا کہ وہاں سے اٹھ کر چلی جائے لیکن شاہ صاحب نے اسے روکا اور بولے کہ "کیا آج چائے تم نہ پلاؤ گی، کیا اپنے ہاتھ سے اسے دو آتشہ نہ بناؤ گی؟"

صفیہ جو بہت چھوٹی عمر سے شاہ صاحب کی ہر بات ماننے کی عادی بنائی گئی تھی، باوجود حیا کے تقاضوں کے، وہاں سے قدم نہ اٹھا سکی اور چار و ناچار اسے ٹھیرنا ہی پڑا۔ جب تک کہ وہ چائے بنا کر پیش کرتی۔ شاہ صاحب کے اوباشانہ فقرے (جن کے درمیان وہ ایک آدھ لفظ اصطلاحات تصوف کے بھی اس لئے صرف فرما دیتے تھے کہ اگر کبھی ضرورت ہو تو ان کی کوئی درویشانہ تاویل بھی ہو سکے) برابر اسی طرح جاری رہے اور صفیہ کا سوء ظن بڑھتا رہا یہاں تک کہ جب وہاں سے نکلی تو اس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور شاہ صاحب کے آخری مرتبہ روکنے کے بعد بھی وہ یہ کہہ کر "مجھے نیند لگی ہے" وہاں سے چلدی۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

صفیہ کا نکاح ہو چکا ہے جہیز کا سامان بکسوں میں بند کیا جا رہا ہے، رخصت کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور صفیہ ایک کمرہ کی خلوت میں دلھن بنی ہوئی جھلملا رہی ہے

محلہ کی عورتیں، پڑوس کی سہیلیاں، عزیزوں کی لڑکیاں صفیہ کے پاس آ جا رہی ہیں کہ دفعتاً چودھری صاحب مکان میں داخل ہوتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ دلہن کا کمرہ خالی کر دیا جائے شاہ صاحب آ رہے ہیں پڑھ کر دم کریں گے اور تعویذ باندھیں گے۔ یہ سنتے ہی ساری لڑکیاں تیتریوں کی طرح اِدھر اُدھر غائب ہو گئیں اور تھوڑی دیر میں شاہ صاحب اندر تشریف لائے اور آہستہ آہستہ کمرے کی آرائش و زیبائش اور خلوت گاہ عروس کی اس عطریت کا لطف لیتے ہوئے جس میں دلہن کے جسم و ملبوس کی خوشبو کا عنصر زیادہ غالب ہوتا ہے، آگے بڑھے اور صفیہ کے سامنے بیٹھکر بولے کہ "ذرا گھونگھٹ اُٹھاؤ صبیح قیامت دیکھنے کے لئے بیتاب ہوں"

صفیہ جو شاہ صاحب کی طرف سے اپنے اندر اب نفرت محسوس کرنے لگی تھی یہ فقرہ سنکر دل ہی دل میں برہم ہوئی اور ان کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی لیکن شاہ صاحب نے اس کو ادائے معشوقانہ سمجھکر اور زیادہ لطف لیا، اور آخرکار ہات بڑھا کر گھونگٹ اُلٹ دیا۔

ریشم سے باریک گھونگھری چوٹی اور اس میں زربفت کا موباف ——— آڑی مانگ اور اس میں سچے مقیش کے ذروں کی افشاں ——— بالوں کی ایک چھوٹی سی لٹ کا گوری پیشانی پر پسینہ کی وجہ سے بھیگ کر چپک جانا ——— نکھرے ہوئے کندنی رنگ میں خمدار ابرووں کی نمایاں سیاہی ——— بڑی بڑی آنکھوں کا لانبی نوکدار پلکوں کے ساتھ ایک ہیجان پیدا کرنا ——— نازک ہونٹوں پر پان کی سرخی کا خشک ہوکر ذرا سیاہی مائل نظر آنا ——— حنائی انگلیوں میں جڑاؤ انگوٹھیوں کی زیبایش ——— گلے میں پڑے ہوئے طلائی ہار کا سینے پر جگمگانا ——— ہات میں طلائی چوڑیوں کا اپنے جال کے اندر سے جسم کے رنگ کو نمایاں کرنا ——— نیم چڑھے تنگ کفوں کا کلائی میں پہنچ کر خون صبیح کے اجتماع سے جابجا گلابی دھبے پیدا کر دینا یہ تھا وہ منظر جو گھونگھٹ الٹنے کے بعد شاہ صاحب کو نظر آیا۔ اور جس کو دیکھنے کے بعد ہی وہ حد درجہ بیتاب ہوکر (شاید پھونک ڈالنے کی غرض سے!) آگے بڑہے، لیکن صفیہ نے جو اچھی طرح سمجھ چکی تھی کہ اس بڈھے کے دل و دماغ میں شیطان حلول کر گیا ہے اور جو یقین کرتی تھی کہ اب اس طرح بے حجاب اسکے سامنے ہونا اپنے شوہر کی طرف سے خیانت کا مرتکب ہونا ہے دفعتاً اپنا ہات اٹھایا اور زور سے شاہ صاحب کو ڈھکیل کر کھڑی ہو گئی، لیکن قبل اسکے کہ وہ کچھ کہتی یا وہاں سے روانہ ہوتی، شاہ صاحب نے موقع کی اہمیت کو سمجھکر ایک قہقہہ لگایا اور یہ کہکر کہ "اچھا جاؤ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں" وہاں سے چلے آئے۔

رات کو جس وقت نوشہ دلہن کو رخصت کرا کر اسٹیشن پر لایا اور گاڑی روانہ ہونے لگی تو ایک اجنبی آیا اور نوشہ کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکر چلا گیا

(۳)

ریاض احمد دہلی کے ایک مشہور و معزز خاندان کا فرد تھا اور اپنے خصایل و عادات کے لحاظ سے حد درجہ دلکش انسان تھا، اس کے باپ دہلی کے مشہور وکیل تھے، لیکن انھوں نے اپنے بعد کوئی جائداد نہ چھوڑی، ریاض نے بی۔ اے کرنے کے بعد پہلے تو تجارت کی طرف توجہ کی لیکن جب اس میں ناکامی ہوئی تو ملازمت کی کوشش کی اور اعزاز خاندانی کی وجہ سے گورنمنٹ سکریٹریٹ میں دو سو روپیہ کی جگہ اس کو مل گئی، چودھری حاتم الزمان کے خاندان سے پہلے کی بھی قرابت تھی اس لئے صفیہ کے ساتھ اس کا نکاح دونوں خاندانوں کے لئے باعث مسرت تھا، ریاض بھی واقف تھا کہ صفیہ بہت پاکیزہ خصایل و شایستہ اطوار لڑکی ہے اور صفیہ بھی آگاہ تھی کہ ریاض کس درجہ پسندیدہ عادت کا انسان ہے، اس لئے قبل اس تعلق کے دونوں میں غائبانہ رشتہ محبت قایم ہو چکا تھا، اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ مسرور نظر آتا تھا۔

ریاض اس سے قبل بھی خود بھی اکثر کئی مرتبہ چودھری صاحب کے ہاں مہمان ہو چکا تھا لیکن کبھی اس نے شاہ صاحب کو نہ دیکھا تھا، اس مرتبہ جو آیا تو دیکھا کہ ایک نئی ہی ہستی نظر آتی ہے اور اس کو یہ معلوم کر کے سخت حیرت ہوئی کہ گھر میں کسی سے ان کا پردہ نہیں ہے۔ جب کبھی وہ خیال کرتا تھا کہ صفیہ بھی ان کے سامنے آتی جاتی ہوگی تو اسے غصہ بھی آ جاتا تھا، چودھری صاحب نے جب شاہ صاحب کا تعارف ریاض سے کرایا اور گفتگو ہوئی تو اس کو شاہ صاحب کی ساری حقیقت معلوم ہوئی، اور اسی وقت سے ایک خاص فکر اس کو دامن گیر ہو گئی، لیکن چونکہ ریاض ہمیشہ اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہتا تھا اس لئے اس نے بالکل خاموشی اختیار کی، اور آئندہ واقعات پر فیصلہ کرنے کے لئے دم بخود ہو گیا۔

مختصر یہ کہ دہلی پہنچ کر صفیہ سے ملنے کے بعد وہ اس افسردگی و آزردگی کو دور کر دیتا، لیکن اس خط نے جو اسٹیشن پر ملا تھا، دیا گیا تھا اس کو سخت مضطرب کر دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خط چودھری صاحب کے کسی دشمن کا ہے جس نے مسرور شاہ کے حالات لکھ بھیجے ہیں، لیکن چونکہ وہ مسرور شاہ کی گھر میں بے تکلفانہ آمد و رفت کو خود دیکھ چکا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ خط کے مضمون کو غلط قرار دیتا۔

خط میں تو خیر بڑی داستان درج تھی، لیکن جو فقرے اس کے دل میں تیر و نشتر کا کام کر رہے تھے وہ یہ تھے کہ:۔

"مسرور شاہ کی محبوبہ سے تعلق ازدواج خدا کرے آپ کو مبارک ہو۔"

وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح اپنے دماغ سے اس خیال کو جدا کر دے لیکن جب اس کے سامنے یہ منظر پیش آ جاتا تھا کہ مسرور شاہ جوان ہیں، معمور تدارمیں تکلف گفتگو میں خاص کشش رکھتے ہیں، گھر میں بلا تکلف آتے جاتے ہیں تو اسے یقین ہی کر لینا پڑتا تھا کہ لکھنے والے کا یہ فقرہ غلط نہیں ہو سکتا۔

اس کے احباب نے اس کے چہرہ پر حزن و ملال کے آثار دیکھ کر دریافت بھی کیا کہ کیا بات ہے، اور یہ خط کس کا ہے لیکن اس نے مصنوعی ہنسی سے ٹال دیا اور کہہ دیا کہ میرے ایک دوست کا خط ہے جو سے میں چلتے وقت نہ مل سکا بیمار ہیں اور اپنی بیماری کی وجہ سے عدم شرکت کا عذر کیا ہے۔

(۴)

دہلی آئے ہوئے صفیہ کو ایک ہفتہ گزر چکا اور ریاض کا اضمحلال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، وہ اس کو محسوس کرتی ہے، لیکن شرم کی وجہ سے سبب دریافت نہیں کر سکتی، کبھی کبھی دبی زبان سے یہ تو ضرور پوچھا کہ "کیا مزاج ہے" لیکن یہ خشک جواب ملنے پر کہ "الحمد للہ اچھا ہوں" خاموش ہو گئی۔ شادی سے قبل صفیہ نے اپنی جنت ارضی کی جو تصویر اپنے خیال سے کھینچی تھی وہ اب اسے بالکل وہم و گمان نظر آ رہی تھی، اور پریشان تھی کہ کیونکر ریاض کے اس غیر معمولی حزن و ملال کو دور کرے جس نے سارے گھر کو افسردہ بنا دیا تھا، اس نے ایک دن ہمت کر کے ریاض کو خط لکھا۔

میں نے آپ کو غیر معمولی افسردہ پا کر ہمیشہ کوشش کی کہ صحیح سبب دریافت کروں، لیکن میری ہمت قاصر رہی، اور زیادہ سے زیادہ صرف خیریت مزاج پوچھ سکی، جس کا آپ نے بھی اسی طرح رسمی جواب دیا، لیکن جب میں سوچتی ہوں کہ آخر یہ صورت کب تک قائم رہیگی اور تمام اسباب پر غور کرتی ہوں تو سخت پریشان ہو جاتی ہوں، آپکا غیر معمولی سکوت میرے نشاط و طرب کے لئے حقیقتاً ایک سنگین مہر ہے جس کو میں توڑنا چاہتی ہوں لیکن اپنے دست و بازو کو اس کے لئے بہت ضعیف محسوس کرتی ہوں۔ خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے اور اگر کوئی سبب میری ذات سے متعلق ہے تو مجھے بتایئے کہ میں اپنے طرز عمل میں ویسی ہی تبدیلی پیدا کر لوں۔ مجھ کو اپنے آپ سے اب شرم آتی ہے، کہ میری وجہ سے آپ

ملول ہیں، اور یقیناً مجھکو مر جانا چاہیئے اگر میری ذات آپ کی مسرتوں کے راستے میں حایل ہو۔

میں نے اپنے مستقبل کے متعلق جو خیال قایم کیا تھا۔ وہ بالکل موجودہ حال کے مخالف تھا، میں اس کو اپنے تصور میں بہت رنگین و شگفتہ پاتی تھی اور یقین کرتی تھی کہ میری آیندہ زندگی یکسر تمتع و مسرت ہوگی، لیکن میں نتیجہ کو مجسم دردناک پاتی ہوں اور اپنی جان سے بیزار ہوئی جاتی ہوں۔

اگر اس کا سبب میری ذات کے علاوہ کسی اور چیز سے متعلق ہے تو بھی غالباً مجھے حق حاصل ہے کہ اس کو سنوں اور اگر اسے دور نہیں کر سکتی، تو کم از کم آپ کے ساتھ اسی خیال کے ماتحت ملول رہوں۔

بد نصیب صفیہ

ریاض واقعی سخت افسردہ و مضمحل تھا، اور اس کی حساس طبیعت روز آنہ اس کو زیادہ دلگرفتہ بناتی چلی جا رہی تھی، وہ جس قدر غور کرتا تھا کہ اس گمنام خط کی تحریر صحیح ہے اور اسی خیال سے وہ دق کی سی گرمی اپنے جسم کے اندر پیدا ہوتے ہوئے پاتا تھا۔ اس نے بارہا ارادہ کیا کہ صفیہ سے سرور شاہ کا ذکر چھیڑ کر حقیقت کا علم حاصل کرے لیکن چونکہ وہ فطرتاً بے انتہا محجوب واقع ہوا تھا، اس لئے اس میں کامیاب نہ ہو سکا اور بدستور سکوت و خاموشی کیساتھ کڑھتا رہا، گھلتا رہا۔ جس وقت صفیہ کی تحریر اسے ملی، وہ اور بھی زیادہ دلگیر تھا اور ارادہ کر رہا تھا کہ اپنی ملازمت پر جا کر بقیہ ایام کی رخصت منسوخ کرا دے۔ اس تحریر کو اس نے بار بار پڑھا اور اس میں ہر بار ایسی صداقت پائی کہ بار غم کچھ ہلکا ہونے لگا اور آہستہ آہستہ شام تک وہ اس قدر شگفتہ ہو گیا کہ آخر کار صفیہ کے پاس جا کر وہ اس معاملہ میں گفتگو کرنے پر مجبور ہو ہی گیا۔

صفیہ مغموم و افسردہ ہتیلی پر ٹھوڑی رکھے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی اور کبھی کبھی سامنے فانوس کے گرد ان پتنگوں کے ہجوم کو بھی دیکھ لیتی تھی جو بیتابانہ طواف کر رہے تھے، ریاض کی آہٹ سن کر وہ چونکی اور سنبھل کر بیٹھ گئی، ریاض آکر سامنے کی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک خاص انداز تبسم کے ساتھ بولا۔

"میں تمہارا بہت شکرگزار ہوں کہ تمہارے خط نے بڑی حد تک میرے غم کو دور کر دیا، مجھے افسوس و ندامت ہے کہ کیوں اس وقت تک میں نے اپنے طرز عمل سے تمہیں تکلیف پہنچائی، لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہوں کہ ذرا سی بات بھی دل پر تیر کا سا کام کرتی ہے اور جو خیال قایم ہو جاتا ہے مشکل سے نکلتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میری افسردگی کا سبب تمہیں سے متعلق تھا اور اس وقت مجھے صاف صاف کہدینا چاہیئے کہ مجھے تمہارے اور سرور شاہ کے تعلق کی نسبت جو خبر معلوم ہوئی تھی اس نے مجھے ملول بنا رکھا تھا، لیکن تمہاری تحریر میں ایسا جذبۂ محبت پنہاں تھا کہ اس نے خود بخود میرے اس خیال کو دور کر دیا اور میں اب تمہارے منہ سے بھی یہ سننے کے لئے آیا ہوں کہ تم سرور شاہ کے سامنے نہ آتی تھیں اور تم سے اس سے کبھی گفتگو نہیں ہوتی۔"

صفیہ گفتگو شروع ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ کیا قصہ ہے اور اس نے ساری صورت حال اور اپنے شوہر کی طبیعت پر غور کر کے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کو کلیتہً جواب دینا چاہیئے، اس کو اپنی عفت کا یقین تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اگر ریاض کو معلوم ہو گیا کہ سرور شاہ سے وہ بے تکلفانہ ملتی تھی تو کبھی اس کو اس کی عصمت کا

یقین نہ آئیگا اور نتیجہ بہت خراب پیدا ہوگا۔ اس لئے اُس نے دروغ مصلحت آمیز پر عمل کرنا مناسب سمجھا اور ریاض کی گفتگو ختم ہوتے ہی اُس نے کہا کہ:

"خدا کا شکر ہے کہ آپ پر میری تحریر نے اچھا اثر کیا اور آپ نے مجھ سے دریافت کرنا مناسب سمجھا، میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ جو کچھ آپ سے کہا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے، اس میں شک نہیں کہ میرا باپ اُس درویش کا مرید ہے اور میں بھی اُن کی مرید ہوں، لیکن آپ یاد رکھیے کہ میں اُن کے سامنے کبھی نہیں آئی اور کبھی گفتگو کی نوبت آئی۔"

ریاض صفیہ کے اس جواب سے بالکل مطمئن ہو گیا اور اُس کا رنج و ملال بالکل دور ہو گیا۔

شادی کو دو مہینے کا زمانہ گزر چکا ہے اور ریاض مع اپنی بیوی کے شملے میں مقیم ہے، اس دوران میں دو مرتبہ صفیہ خورجہ گئی اور آئی۔ ریاض ایک ایک ہفتہ اپنی سسرال میں رہے اور صفیہ کو بھی خوشی ساتھ لائے۔ دونوں کی زندگی نہایت لطیف اور مسرت کے ساتھ بسر ہو رہی ہے، محبت و خلوص میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اس وقت تک پھر کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جو ادنیٰ سا اختلاف بھی اُن کے درمیان پیدا کرتی۔

ایک دن صبح کو ریاض باہر مردانخانہ میں بیٹھا تھا کہ ڈاکیہ نے دو خط لاکر دیئے، دونوں لفافے تھے اور چودھری صاحب کے ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا، ایک اُس کے نام کا تھا اور دوسرا صفیہ کے نام کا۔ صفیہ کا خط تو اُس نے اسی وقت خادمہ کے ہاتھ اندر بھیجدیا، اور اپنے نام کا کھول لیا، لیکن کھولنے کے بعد تحریر کو دیکھکر معلوم کیا کہ مضمون خط کا صفیہ کے نام کا ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ لفافہ بند کرنے وقت غلطی ہو گئی ہے اور میرے نام کے لفافہ میں صفیہ کا خط بند ہو گیا ہے اُس نے چاہا کہ اس خط کو اندر بھیجکر پہلا خط منگوالے کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اس میں میرے نام کا خط ہوگا، لیکن اس لفافہ میں ایک بند لفافہ بھی صفیہ کے نام کا ملا۔ جس پر پتہ کسی غیر ہاتھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پہلے تو اس کو کھولنے میں تامل ہوا، لیکن پھر خدا معلوم کس خیال سے اُس کو کھول لیا اور شروع سے آخر تک پڑھا، لیکن حالت یہ تھی کہ چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا اور ایک ایسا کرب اس کی حرکات سے ظاہر ہو رہا تھا جیسے جان نکلتے وقت طاری ہوتا ہے اس خط کا مضمون یہ تھا۔

"پیاری صفیہ؛

تمہاری شادی کے بعد میں بھی وطن چلا آیا اور پھر خورجہ نہیں آیا، اس خیال سے کہ اب وہاں کون ہے جس کو دیکھکر جی لگیگا۔ چودھری صاحب نے جب بہت اصرار کیا تو اب آیا ہوں اور یہ خط تمہیں لکھ رہا ہوں۔ شادی کے بعد میں نے تمہیں نہیں دیکھا، اور نہیں کہہ سکتا کہ تم میں اب کیا تغیر ہو گیا ہوگا، لیکن اب میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا، اور دیکھنا کیا نہیں چاہتا، واقعہ تو یہ ہے کہ دیکھ ہی نہیں سکتا۔

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دلربا ادائیں

تم نے شادی سے ایک شب قبل جو پان مجھکو دیا تھا، وہ میرے پاس اب تک موجود ہے اور شاید ہمیشہ محفوظ رہے کبھی کبھی جب جی بہت

گھبراتا ہے تو اس کو دیکھ کر تسکین دے لیتا ہوں کہ اس کو تمہارے ہاتھوں نے چھوا ہے، میں آجکل خورجہ میں ہوں
اور بے اختیار جی چاہتا ہے کہ تم بھی ہفتہ عشرہ کے لئے آجاتیں، یہ ناممکن ہو تو اطلاع دو میں شملہ آسکتا ہوں یا نہیں "

خط کے نیچے کاتب کا نام درج نہ تھا، لیکن ریاض فوراً سمجھ گیا کہ مرزا شاہد کی تحریر ہے۔ اور اس کے غم و غصہ کی انتہا نہ رہی جب اس نے محسوس کیا کہ صفیہ اس سے جھوٹ بولی ہے اور یقیناً یہ جھوٹ اسی لئے بولا گیا تھا کہ اس تعلق کو چھپایا جائے۔

اس کا چہرہ سرخ تھا، آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور کبھی کبھی وہ نہایت سخت ارادہ اپنے دل میں قایم کرتا تھا، کامل ایک گھنٹہ تک کمرے میں بھرے ہوئے شیر کی طرح ٹہلتا رہا اور پھر باہر ہی باہر دفتر چلا گیا، دفتر میں اس نے کچھ کام نہیں کیا اور برابر اسی امر پر غور کرتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ آخرکار اس نے فیصلہ کرلیا اور وہیں سے صفیہ کو اطلاع دی کہ خورجہ چلنے کے لئے تیار ہو جائیں، چودھری صاحب کی سخت علالت کا تار آیا ہے، اس نے چودھری صاحب کو بھی تار دیدیا کہ فلاں گاڑی سے خورجہ آرہا ہوں لیکن اتروں گا نہیں، دوسری جگہ ضروری کام سے جاتا ہے، صفیہ کو لینے کے لئے کسی کو اسٹیشن بھیج دیا جائے۔
شام کو جب ریاض گھر آیا تو غصہ سے اس کا برا حال تھا۔ صفیہ بھی اس خبر سے بہت ملول تھی - - - کہ چودھری صاحب سخت علیل ہوگئے ہیں اس نے اس نے ریاض کے اضمحلال کو بھی اسی پر محمول کیا اور اسی خاموشی کے عالم میں شملہ سے خورجہ تک کا سفر طے ہوگیا۔ جب صفیہ خورجہ کے اسٹیشن پر پہنچی اور اسے معلوم ہوا کہ ریاض نہیں اتریگا، کیونکہ اسے کہیں جانا ہے تو وہ کھٹک گئی لیکن وہاں کیا کہہ سکتی تھی، اس نے بہت کچھ کوشش کی کہ پالکی میں سوار ہوتے وقت ریاض سے مل لے لیکن اس نے آنے سے انکار کردیا، اور صرف یہ کہلا بھیجا کہ "خدا حافظ ہے"!

——— (۵) ———

صفیہ کو خورجہ آئے ایک مہینہ گزر چکا ہے اور اس دوران میں یہ حقیقت سب پر روشن ہوگئی ہے کہ ریاض ناخوش ہو کر صفیہ کو چودھری صاحب کی علالت کے بہانہ سے یہاں پہنچا گیا ہے، لیکن برہمی کا سبب کسی کو معلوم نہ ہو سکا صفیہ نے متعدد خطوط ریاض کو لکھے لیکن کسی کا جواب نہ آیا، بدیع الزماں کو بھیجا گیا لیکن اس سے بھی ریاض نے کوئی سبب نہیں بتایا اور صرف یہ کہلا بھیجا کہ میں صفیہ کو اپنے پاس رکھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے گھر میں رہیں میرے امکان میں جو خدمت ہے بہیں سے کرتا رہوں گا، لیکن اگر اس پر وہ مطمئن نہ ہوں تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ ہمیشہ کے لئے ان کو آزاد کردوں اور وہ مجھ سے زیادہ اہل انسان سے رشتہ ازدواج قایم کرلیں۔

چودھری صاحب اور ان کے خاندان کو اس واقعہ سے جو صدمہ ہونا چاہیئے ظاہر ہے، لیکن صفیہ کی حالت جیسی ردی ہوگئی وہ ناقابل بیان ہے، غذا ترک ہوگئی، سونا حرام ہوگیا اور فرط الم سے حرارت قایم ہوگئی، رات دن اک بند کمرے میں منہ لپیٹے رویا کرتی تھی اور موت کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ چودھری صاحب کا ایک مرتبہ ارادہ ہوا کہ ریاض سے طلاق حاصل کرلی جائے، لیکن جب صفیہ سے اس کا ذکر آیا تو اس نے سخت مخالفت کی، اور پھر یہ خیال ترک کردیا گیا۔

——— (۶) ———

صفیہ کی علالت کو چھ ماہ ہوگئے ہیں اور متفقہ طور پر طبیبوں اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کردیا ہے کہ وہ سل و دق میں مبتلا ہے، علاج ہو رہا ہے لیکن ناکام کیونکہ اول تو صفیہ دوا پیتی نہیں اور پیتی بھی تو کیا جبکہ غم ہر وقت شمع کی طرح اسے گھلائے دیرہا تھا، زمانہ گذرتا گیا، صفیہ کی حالت بدتر ہوتی رہی، ریاض کو پھر بھی بلانے کی کوشش کی گئی لیکن بے سود۔

چونکہ صفیہ کو اپنے مرجانے کا یقین تھا اس لئے وہ اس سنے وہ اس خیال سے تو خوش تھی، لیکن یہ کانٹا اُس کے دل میں برابر کھٹک رہا تھا کہ ریاض کی برہمی کا سبب اس کو معلوم نہ ہوسکا۔ ایک دن جب اُس نے دیکھا کہ اس کا نظام تنفس خراب ہوگیا ہے تو اُس نے ریاض کو آخری خط اور لکھا جس میں داستہ پن دن بہت دردناک طریقہ سے دہرائی اور آخر میں یہ بھی لکھا کہ:-

> میں اب مررہی ہوں اور غالباً اب اگر آپ آئیں بھی تو مجھے زندہ نہ پائیں گے، اس لئے بغیر اس کے کہ برہمی کا سبب معلوم کروں، آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی چاہتی ہوں، خدا کرے اب بھی آپ کو رحم آجائے اور میری التجا کو سُن لیں، کیونکہ مرنیکے بعد اگر واقعی کوئی زندگی ہے تو وہ اسی طرح بسر ہوسکتی ہے کہ مجھے یہاں نہ سہی عالم روح ہی میں اس بات کا علم ہوجائے کہ آپ میری خطاؤں سے درگزر کرچکے ہیں۔

اس خط کے بھیجنے کے بعد صفیہ کی حالت پھر بگڑی اور آثار نزع نمودار ہوچلے، جیسا کہ مرنے سے چند روز قبل بعض آدمیوں میں ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ ساتویں دن جبکہ صفیہ صبح کو بات منہ دھو کر پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی، ڈاک سے ریاض کا خط آیا، صفیہ نے جس اضطراب کے ساتھ اُسے کھولا ہوگا ظاہر ہے، لیکن کس قدر حسرتناک منظر تھا کہ خط پڑھتے ہی اس پر نہایت سخت دورہ اختلاج کا پڑا، اور فوراً قلب کی حرکت بند ہوجانے سے وہ ہمیشہ کے لئے دنیا کے غموں سے فارغ ہوگئی۔

ریاض نے لکھا تھا۔

> میری برہمی کا سبب تو دوسرے خط سے معلوم ہوگا جسے میں ملفوف کرتا ہوں لیکن باوجود ان تمام باتوں کے میں نہایت سچائی اور صداقت کے ساتھ تمہاری خطاؤں کو معاف کرتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ خدا کرے تمہاری آئندہ زندگی (خواہ وہ اس دنیا کی ہو، یا کسی دوسرے عالم کی) مسرور بسر ہو!

دوسرا ملفوف خط وہ تھا جو مسرور شاہ نے صفیہ کو لکھا تھا۔ ہرچند چودھری صاحب نے اس واقعہ کو چھپانے کی بہت کوشش کی، لیکن سارے قصبہ کو رفتہ رفتہ حقیقت کا علم ہوگیا اور چودھری صاحب کو فرط غیرت سے اپنی ساری جائداد فروخت کرکے جلاوطن ہوجانا پڑا۔

نیاز

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد

(گزشتہ اشاعت سے آگے)

جدید مراعات نے جن کا اظہار خلیفہ بغداد کے واسطے بصورت منشور سلطنت پیش تھا خلعت اور خطاب یمین الدولہ امین الملت ہوا تھا، سلطان محمود کا حوصلہ بڑھا دیا، گو سبکتگین بھی با حوصلہ دلیر تھا، لیکن بیٹا اُس سے کہیں بڑھکر ثابت ہوا بلا تامل یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے نومسلموں میں حمایت اسلام کا خیال زیادہ راسخ تھا، جیسا کہ جدید مذہب اختیار کرنیوالوں میں عموماً ہوتا ہے۔ اسلامی کارنامے عرب اور ایران پر چھائے تھے، جنھوں نے ترکوں کی قوم میں ایک نئی امنگ پیدا کردی تھی، نیز کے ساتھ ہی اشاعت اسلام کے خیال نے ان کے قدرتی جوش کو دوآتشہ کردیا تھا، اسی امنگ نے سلطان محمود کو بھی میدان کارزار کا مرد غازی بنا دیا۔ وہ ایسا راسخ الاعتقاد مسلمان تھا کہ ہندوستان کے جنگ وجدال سے اُسے جو کچھ بھی ہاتھ آیا اُس نے خدا پرستی کا اُسے صلہ سمجھا، وہ ہندوستان پر پورا حکمراں ہونے کا ارادہ گو پورا نہ کرسکا تاہم اس کی حکومت کا زیادہ تر حصہ انھیں مہموں میں صرف ہوا۔

سبکتگین کے ساتھ جیپال کی چھیڑ چھاڑ نے محمود کو اس طرف رخ کرنے کی محبت پیدا کردی تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ شریک جنگ رہکر ہندوستانی فوج کی اہمیت کا اندازہ بخوبی کرچکا تھا۔

چنانچہ اُس نے سنہ ۱۰۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۰۲۷ء تک کم و بیش سترہ حملے کئے اور سندھ سے دریائے گنگ تک درمیانی میدان پر متواتر فوج کشی کرتا رہا، سرایچ الیٹ نے اپنی مشہور تاریخ میں اُس کے حملوں کی یہ تاریخ لکھی ہے۔

(۱) سرحدی مقامات سنہ ۱۰۰۰ء
(۲) نیشاپور اور سنہ ۱۰۰۱ء
(۳) بھیرا (بھٹنیہ) سنہ ۱۰۰۳ء
(۴) ملتان سنہ ۱۰۰۶ء
(۵) نواسہ شاہ کے مقابل سنہ ۱۰۰۷ء
(۶) نگرکوٹ سنہ ۱۰۰۸ء
(۷) نارائن سنہ ۱۰۰۹ء
(۸) ملتان سنہ ۱۰۱۰ء
(۹) نندونہ سنہ ۱۰۱۳ء
(۱۰) تھانیسر سنہ ۱۰۱۴ء
(۱۱) لوہ کوٹ سنہ ۱۰۱۵ء ۱۴
(۱۲) متھرا، قنوج سنہ ۱۰۲۲ء
(۱۳) راہب سنہ ۱۰۲۱ء
(۱۴) قیرات لوہ کوٹ لاہور سنہ ۱۰۲۲ء
(۱۵) گوالیار و کالنجر سنہ ۱۰۲۳ء
(۱۶) سومنات سنہ ۱۰۲۵-۲۶ء
(۱۷) جاٹو نپر سنہ ۱۰۲۷ء

نام ونسب — محمود نام، نظام الدین، ابو القاسم کنیت، سیف الدولہ السلطان الغازی یمین الدولہ وامین الملت لقب۔

سلسلہ نسب — محمود بن سبکتگین بن جوق قرابجکم بن قرا ارسلان بن قراملت بن فیروز بن یزدجرد شہریار بن فارس بن شہردیہ بن خسرو بن ہرمز بن کسریٰ۔ اس طرح خاندان غزنویہ میں حکومت کا آنا گویا دار کسریٰ کا عود کرنا تھا جس کے نامور سلاطین عدل و انصاف، جاہ و جلال شان و شوکت تربیت علم و فن غرض ہر بات میں اپنے اسلاف کا نمونہ تھے۔

محمود کی ماں رئیس زابلستان کے نسل سے تھی اسی لئے اُسے زابلی لکھتے ہیں، جیسا کہ فردوسی کا قول ہے ؎

خجستہ درگہ محمود زابلی دریاست کدام دریا کہ آنرا کنار پیدا نیست
شدم بدریا و غوطہ زدم ندیدم دُر گناہ بخت من است و گناہ دریا نیست

شب عاشورہ کو جو سنہ ۳۶۱ھ مطابق ۱۰ر اکتوبر سنہ ۹۷۱ء کی شب پنجشنبہ تھی محمود پیدا ہوا تھا۔

پہلا حملہ

سلطان محمود کو اطلاع ملی کہ جیپال نے فوج جمع کرکے مسلمانوں سے مزاحمت کا ارادہ کیا ہے، اس لئے وہ ہندوستان کی سرحد کی طرف بڑھا اور بہت سے قلعے اور صوبے فتح کرکے وہاں مسلمان گورنر مقرر کر دیے۔ اگست سنہ ۱۰۰۱ء میں خود جیپال کی سرحد کوبی کا ارادہ کیا اور دس ہزار گزیدہ کار سوار دستہ لیکر غزنین سے روانہ ہوا۔ ۲۷ر نومبر سنہ ۱۰۰۱ء کو دریائے سندھ عبور کرکے پشاور کے قریب خیمہ زن ہوا۔ جیپال نے بھی بارہ ہزار سوار، تیس ہزار پیدل اور تین سو جنگی ہاتھیوں سے صف جنگ آراستہ کیا۔ ۸ محرم روز دوشنبہ کو دونوں فوجیں مقابل ہوئیں۔ دوپہر تک جنگ ہوکر راجہ کی شکست پر خاتمہ ہوا۔ خود راجہ مع پندرہ اعزہ اور رفقا اور بیٹوں کے گرفتار ہو گیا۔ جیپال نے پچیس ہاتھی نذر دینے قبول کئے اور اپنے بیٹے اور پوتے کو بطور یرغمال حوالہ کیا۔ موسم بہار قریب تھا، صلح ہو جانیکے بعد راجہ کو آزاد کیا گیا، اور خود غزنین چلا گیا۔ جیپال نے ہاتھی تو بھجوا دیئے اور اسیروں کو رہا کرا لیا لیکن دو دفعہ شکست کھانے کے بعد مارے غیرت کے جینا پسند نہ کیا، اور اپنے بیٹے انند پال کو ولی عہد کرکے شاہانہ لباس پہنے چتا پر بیٹھکر جل گیا، پشاور کا علاقہ غزنین میں شامل لیا گیا، اور سلطان نے غازی کا لقب اختیار کیا، گو اس لقب سے وہ کم مشہور ہوا۔

دوسرا حملہ

محمود نے دیہند پر کیا، یہ مقام دریائے سندھ سے مغرب اٹک سے ۱۵ میل اور پشاور سے تین منزل کے فاصلہ پر واقع تھا، جس کا بانی سکندر اعظم بتلایا جاتا ہے، بعض مورخ فتح پشاور کے بعد سلطان کی روانگی بھٹنڈا کی طرف لکھتے ہیں جس کے بابت الفنسٹن صاحب لکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں یہ مقام اس سے زیادہ شان و شوکت کی جگہ تھی، جو اس کے جنگل میں واقع ہونے سے سمجھ میں آتا ہے۔"

کرنیل ٹاڈ لکھتے ہیں کہ وہ بڑا آباد اور نامی مقام تھا، لاہور کا راجہ جیپال یہاں کبھی کبھی فروکش ہوتا تھا۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ محمود موسم زمستان کے آخر میں جبکہ پنجاب کے دریا قابل عبور ہو گئے ہوں گے بھٹنڈا آیا ہوگا۔ جو ستلج سے آگے ایک آباد مقام تھا، یہ علاقہ اب ریاست پٹیالہ کی حکومت میں ہے۔ تاریخ یمینی میں ویہند (شہد اویہند) یا بہیند لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیہند سے مراد بھٹنڈا ہی ہے جس کو فارسی مورخوں نے تبر ہند لکھا ہے، دیہند میں کچھ دنوں خیمہ زن رہکر اس نے پورا قبضہ کر لیا، اور جب اسے معلوم ہوا کہ دشمن بہ تعداد کثیر پہاڑ کے دروں میں چھپے اس کے مقابلہ کے لئے در پردہ سازش کر رہے ہیں تو اس نے ایک دستہ فوج ان کے دفع شر کے واسطے روانہ کیا اس فتح کے بعد اس کو ہندوستان کی اگلی فتوحات آسان ہو گئیں

تیسرا حملہ

بھاطیہ[1] سنہ ۱۰۰۴ء۔ آنند پال اپنے باپ راجہ جیپال کے عہد و پیمان کے مطابق برابر سلطان کو خراج دیتا رہا۔ لیکن اس کے باجگزاروں میں راجہ بھٹا نے خراج ادا کرنے سے انکار کر دیا، جیپال کے ساتھ یہ بھی سلطان کے ساتھ مزاحمت ہو چکا تھا۔ سلطان محمود سیستان کی مہم سے فارغ ہو کر ملتان

[1] بھاریہ یا بھاطیہ دیکھو تاریخ ابو الفدا ابن خلدون و ابن اثیر۔ الفنسٹن صاحب کی رائے میں یہ مقام ملتان کے جنوب راجہ لاہور کے زیر فرمان تھا۔ بریگز صاحب اسکو بھٹنڈا پنجاب کے مشرق بیکانیر کے شمال بتاتے ہیں، ہمیر برگس کا قول ہے کہ اس وقت بھاولپور کو بھٹیا یا بھیرا کہتے تھے۔ ایلیٹ صاحب بھیرہ دریائے جہلم کے ساحل پر بتاتے ہیں کیونکہ بھٹی راجپوت اپنا اصل وطن اس کو ثابت کرتے ہیں۔ جیپال غالباً اسی نسل سے تھا۔ عجب نہیں کہ سلطان نے تیرکے گھاٹی ہو کر خرم کے راستہ سے اسماعیل پر سندھ کو عبور کیا ہو اور سندھ ساگر کے دوآبے سے گزر کر شاہ پور ہوتا ہوا بھیرہ آیا ہو۔ مصنفین انسائیکلوپیڈیا نے بھی بھیرا یعنی بھیڈہ، بعض بھٹنیر لکھتے اور کہتے ہیں کہ یہ ایک زبردست سلطنت اور بھاٹی راجپوتوں کی راجدھانی تھی، فرشتہ نے بھاطنہ لکھا ہے۔

کی حدود سے گزر کر بھاٹیہ پہنچا، قلعہ کے ہر چہار طرف نہایت مضبوط شہر پناہ تھا اور عمیق خندق واقع تھی۔ یہاں کے راجہ بیجے راؤ کے لشکر میں بلند اور قد آور جنگی ہاتھی بکثرت تھے تین روز تک لڑائی ہوا کی چوتھے روز راجہ قلعے کے اندر محصور ہو گیا۔ سلطان نے خندق پاٹنے کا حکم دیا۔ بجے راؤ رات کو قلعے سے نکل کر دریائے اٹک کے کنارے جنگل میں چھپ گیا۔ سلطان نے تعاقب کرایا، راجہ گرفتار ہو گیا۔ اس ننگ سے خود سینہ میں خنجر مار کر مر گیا۔ ۱۲۰ ہاتھی سلطان کے ہاتھ آئے اس نے جابجا مسجدیں تعمیر کرائیں علماء و فضلاء اسلام کا وعظ کہنے کے لئے مقرر کئے گئے۔ اور خود دار السلطنت غزنین کی طرف مراجعت کی۔ برسات آ گئی تھی راستے میں دریا طغیانی پر تھے شکر کا بہت بڑا حصہ مع مال و اسباب کے غارت ہو گیا

چوتھا حملہ

ابو الفتح داؤد بن نصیر بن شیخ حمید والی ملتان ملحد اور قرامطیہ ہو گیا تھا، بعض کہتے ہیں اسماعیلیہ مذہب اختیار کر لیا تھا اور اس نے سلطان کی اطاعت میں کوتاہی کی خطبہ میں اپنا نام داخل کرا دیا، رعایا پر اپنے عقیدہ کا اثر ڈالنا چاہا جو سلطان کے یہاں فریادی ہوئے۔ محمود اس وقت بھاطیہ کے محاصرہ میں مصروف تھا۔ دوسرے سال اس پولیٹیکل دشمن کے استیصال کے لئے ملتان کو روانہ ہوا اور راجہ انند پال سے کہلا بھیجا کہ ہماری فوج کو اپنے ملک سے گزرنے دے۔ ابو الفتح راجہ سے پہلے ہی سازش کر چکا تھا اور کو خراج گزار تھا، لیکن امرا کی ایک جماعت سلطانی فوج کے سد راہ ہونے کو روانہ کر چکا تھا اس نے محمود کی اس خواہش کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ محمود نے غصہ میں آ کر بد عہد اور غدار راجہ کی پامالی کا حکم دیدیا۔ راجہ بھاگ کر سودھرہ یا شاہدرہ میں جو دریائے چناب کے کنارے وزیر آباد کے قریب ہے پناہ گزیں ہوا، وہاں بھی تعاقب کیا گیا تو کشمیر چلا گیا۔ ابو الفتح نے ترک وطن مناسب سمجھا اور سارا مال و اسباب و خزانہ ہاتھیوں پر بار کر کے سراندیپ کو روانہ کر دیا اور خود مع خویش و اقربا ملتان کو خیرباد کہا محمود نے قلعہ پر قبضہ کر لیا ملحدوں پر سختی کی بیس ہزار دینار وصول کر کے اسی قدر زاید محصول مقرر کر دیا۔

ابو الفتح نے سلطان کی اطاعت قبول کی اور اپنے عقیدہ سے توبہ کی۔ حدود علاقہ میں احکام شرعیہ کے اجرا اور ہر سال بیس ہزار درہم خراج دینے کا وعدہ کیا سات روز تک ملتان کا محاصرہ قائم رہنے کے بعد سلطان نے صلح منظور کر لی۔

ابن خلدون بعد فتح ملتان سلطان کی روانگی ایک اور مقام کو لکیر کی طرف لکھتے ہیں جہاں کے راجہ کا نام بیدا تھا۔ راجہ قلعہ کالنجر میں بھاگ گیا جس میں پانچ سو ہاتھی بیس ہزار اور جانور موجود تھے، رسد کا پورا سامان فراہم تھا، مگر راستہ جھاڑ جھنکاڑ کے سبب متعذر تھا، سلطان محمود نے درختوں کے کاٹنے کا حکم دیا، قلعہ کے گرد ایک بڑی وسیع نہر تھی مشکوں میں مٹی بھر کر اس پر پل باندھا گیا جس پر بیس سوار ایک ساتھ چل سکتے تھے۔ قلعہ کا ۴۳ روز محاصرہ رہا، راجہ نے پچاس ہاتھی اور بہت سا زر نقد دیکر صلح کر لی۔

پانچواں حملہ ۳۹۸ھ / ۱۰۰۷ء
نواسہ شاہ کی معزولی۔ انند پال کی گوشمالی

سلطان محمود ترکستان میں ایلک خان سے مصروف جنگ تھا کہ اسے اطلاع ملی کہ سیوک پال اسکھ پال[1] ملقب بہ نواسہ شاہ باغی اور مرتد ہو گیا ہے اس نے ہندوستان کی طرف رخ کر دیا اور نواسہ شاہ کو گرفتار کر کے غزنین بھجوا دیا اور جانے اسنے

---

[1] جب سلطان محمود ایلک خان کی بغاوت فرو کرنیکی غرض سے ملتان سے واپس جانے لگا تو سکھ پال کو (انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا اور الفنسٹن صاحب کی تاریخ ہندوستان) جو ہندوستان کے کسی راجہ کا بیٹا تھا اور جسے ابو علی سموری نے نیشاپور میں گرفتار کر کے مسلمان کیا تھا ممالک مفتوحہ بھٹنڈا وغیرہ کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ چونکہ انگریزی زبان میں پوتا اور نواسہ کے لئے ایک ہی لفظ گرینڈسن مستعمل ہے اس لحاظ سے برگ صاحب کا یہ حملہ ملتان پر ہوا تھا، جہاں شیخ حمید کا پوتا داؤد حکمراں تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ یہ راجہ جیپال کا نواسہ ہو، الیٹ صاحب نے نواسہ پر بڑی دلچسپ بحث کی ہے۔

بہت ملک کو ان مقامات کا گورنر مقرر کر دیا۔ بعض واقعہ نگار لکھتے ہیں کہ سلطان نے پنجاب کے رؤسا کو باغی قرار دیا تھا جب کے احکام بھیجے تھے جنھوں نے اُسے شکست دیکر قید کر لیا تھا۔ اور سلطان پانچواں حملہ انندپال پر بتاتے اور لکھتے ہیں کہ اُس نے ۳۹۹ھ میں انندپال پسر جے پال کی گوشمالی کا ارادہ کیا، کیونکہ تسخیر ملتان کے وقت اُس نے بغاوت اختیار کی تھی۔ آنندپال راجگان اجین (اجمیر) گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی[1] اور دیگر بہت سے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کو ساتھ لیکر پشاور روانہ ہوا۔ یہ جنگ اُن کے خیال میں درحقیقت اسلام و ہندو ازم میں تھی۔ تمام مذہبی فوج میں شامل ہو گئے۔ ہندوؤں نے دریائے سندھ کو عبور کر کے پشاور کے قریب اپنا مورچہ قائم کیا۔ اس جنگ میں ہندو عورتوں نے اپنے زیورات فروخت کر کے اور غریبانے سوت کات کات کر اپنے مردوں کی مدد کی تھی۔

سلطان نے ہر طرف لشکر لے کر دونوں جانب خندق کھود کر مورچہ بندی کی۔ اس لڑائی میں تیس ہزار گکھر[2] نے تیر باران سے مسلمان کام آئے۔ یکایک انندپال کا ہاتھی جاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ طائی نے پانچ ہزار عرب سواروں اور ارسلان جاذب نے دس ہزار ترک و افغانی لیکر دوسرے بازو سے حملہ کیا۔ اس جنگ میں علاوہ غنائم کے تیس ہاتھی بھی ہاتھ آئے۔

چھٹا حملہ

سلطان نے ۳۹۹ھ میں نگرکوٹ پر جسے کوٹ کانگڑا یا بھیم نگر کہتے ہیں اپنا نشان نصب کیا۔ یہ مقام ایک برفانی پہاڑ کی شاخ پر جس کے چاروں طرف خندق تھی واقع تھا۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ نگرکوٹ میں انندپال کا سراغ لگانے گیا تھا۔ قلعہ میں اُس وقت سوائے برہمن اور پجاریوں کے باضابطہ کوئی فوج نہ تھی۔ کیونکہ فوج تو اُس جنگ میں پھنسی ہوئی تھی جو خود محمود نے دی تھی۔ محاصرہ کے تیسرے دن قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ سلطان نے چند عمائد کو قلعہ کی محافظت پر مامور کیا اور وطن کو مراجعت کی

---

[1] اس وقت صوبہ دہلی کا پایہ تخت میرٹھ تھا (برڈ صاحب کی تاریخ گجرات صفحہ ۴۲ کا فٹ نوٹ)

[2] گکھر کی قوم اس وقت سندھ اور جہلم کے دوآبہ میں آباد تھی۔ طبقات ناصری میں لفظ کھوکر لکھا ہے اس قوم نے غوریوں اور شاہان دہلی کا اکثر مقابلہ کیا ہے اور بعض دفعہ لاہور پر بھی قابض ہوگئی ہے۔ اب چناب اور جہلم کے کنارے کہیں کہیں ضلع جھنگ تک آباد ہے۔

[3] بعض مورخ لکھتے ہیں کہ اس جنگ میں سلطان کے ساتھ توپخانہ بھی تھا جس کے متعلق انسائیکلوپیڈیا نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ جس خیال سے ان مورخین نے توپخانہ یا پلیس کے الفاظ استعمال کئے ہیں وہ بعینہ اس واقعہ سے ہے جس کو ڈی ریمان نے اس یونانی آگ کی بابت جو دو صدی سے بھی زیادہ بعد سینٹ لوئی کی فوج کو حیرت میں ڈال چکی تھی لکھا ہے اگرچہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت موجودہ توپخانہ یا مثل اسکے کوئی اسلحہ موجود تھا یا نہیں دوسرے ایک موقع پر جہاں سلطان نے نفط کا استعمال کیا ہے اُس سے اور اس امر سے کہ دریائے سندھ کے آس پاس جہاں انندپال کی فوج سے جنگ ہوئی تھی نفط بکثرت ہوتا ہے اس خیال کو اور بھی ترقی ہوئی ہے، گبن صاحب بھی ہوا۔ فرشتہ ڈو صاحب کی تاریخ ہندوستان جلد اول صفحہ ۴۹ توپ کا استعمال ہونا لکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ مجھکو بھی اُس وقت اس اسلحہ کے موجود ہونے میں تامل تھا مصنف ایسی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ اصلی تاریخ میں تیروں کی جگہ توپیں اور بندوقیں مندرج ہیں اگرچہ برگز صاحب اس مشکل کو بطور معقول حل کرتے ہیں یعنی جو لفظ فارسی میں توپ اور بندوق کے معنی میں مستعمل ہو کچھ برسنے سے اسکے معنی تیروں اور نفط کے گولوں کے ہوتے ہیں، مگر تمام قلمی نسخے اس لفظ کے توپ اور بندوق ہونے پر متفق ہیں۔ فرشتہ کے نسخہ میں ہیں: ناگاہ خیلے کہ انندپال برادو سوار نفط و خدنگ سراسیمہ گشتہ روی نہاد" توپخانہ کا لفظ صحیح استعمال نہیں ہوا۔ دبابہ وغیرہ یا لفظ منجنیق مستعمل ہوتے تھے دبابہ اور منجنیق میں بڑے بڑے پتھر رکھکر زور سے گھما کر قلعہ کی دیوار میں مارتے تھے جس کے صدمہ سے دیوار ٹوٹ جاتی تھی۔ نفط ایک قسم کا آتشگیر مادہ تھا۔ جس کو پچکاری میں بھر کر مکانات پر یا ذخیرہ پر یا خیموں پھینکتے تھے اُس سے آگ لگ جاتی تھی۔

ساتواں حملہ ناراین — [illegible] تاریخ یمینی میں عتبی نے اس حملے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہاں کے راجہ نے ۶۰ ہاتھی نذر کئے اور صلح چاہی بسالانہ خراج دینا قبول کیا، سلطان صلح پر راضی ہوگیا اور غزنین واپس گیا۔

آٹھواں حملہ ملتان — [illegible] بعد فتح غور سلطان دوبارہ ملتان آیا۔ ابوالفتح نقض عہد کرکے پھر مفسد ہوگیا تھا اسے گرفتار کیا آنند پال بھاگ کر اوچ چلا گیا ابوالفتح قلعہ غور میں قید کیا گیا۔

نواں حملہ تھانیسر — [illegible] تھانیسر دہلی سے ۴۰ میل کے فاصلہ پر جمنا اور ستلج (سرسوتی) کے درمیان واقع ہے، راجہ دہلی نے اطراف و جوانب کے راجگان سے مدد چاہی لیکن ان کی فوج آنے سے پہلے ہی محمود تھانیسر پہنچ گیا اور اُسے فتح کرکے دہلی کی تسخیر کا ارادہ کیا مگر ارکان دولت نے مشورہ دیا کہ جب تک پنجاب پر پورا تسلط نہ ہوجائے دہلی پر چڑھائی مناسب نہیں ہے، یہ مشورہ پسند آیا اور فسخ عزیمت کرکے غزنین واپس گیا۔

دسواں حملہ نندونہ — [illegible] یہ قلعہ ضلع جہلم کے حدود میں کوہ بالنات پر واقع ہے جسے آجکل ٹلہ کہتے ہیں، چونکہ غزنین کی راہ میں حائل تھا اس لئے ہمیشہ سیاسی خطرہ رہتا تھا۔ [illegible] میں محمود نے اس قلعہ پر چڑھائی کی۔ جیپال کا پوتہ بھیم پال کو قلعہ میں چھوڑ کر کشمیر چلا گیا۔ قلعہ والوں نے امان طلب کی۔ محمود نے ایک گورنر مقرر کردیا اور خود راجہ کے تعاقب میں کشمیر کی طرف متوجہ ہوا۔ نبیرہ جیپال یہ خبر پاکر وہاں سے مفرور ہوگیا اور سلطان کو وہاں سے بہت مال غنیمت ہاتھ آیا یہیں سے واپس غزنین گیا۔ الیٹ صاحب اور دیگر یورپین مورخین نواں حملہ نندونہ اور دسواں تھانیسر پر [illegible] میں بتاتے ہیں۔

گیارہواں حملہ لوہ کوٹ — [illegible] والی نندونہ کے تعاقب میں گو محمود کو [illegible] میں کوہستان کشمیر تک جانا پڑا تھا، لیکن اس وقت نہ تو راجہ گرفتار ہوا نہ کشمیر کے کوہستانی قلعے قبضہ میں آئے تھے۔ دشمن کے مامن پر مستقل قبضہ کرنے کے خیال سے [illegible] میں اس نے قلعہ لوہ کوٹ کا محاصرہ کیا۔ مگر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں اور عمیق غاروں کے سبب سے کامیابی نہ ہوئی۔ طرفہ یہ کہ اثنائے محاصرہ میں برف باری شروع ہوگئی سلطان واپسی پر مجبور ہوا۔ فوج راہ بھول کر ایک وسیع صحرا میں داخل ہوگئی، جہاں راستہ مسدود تھا، بہت سے لوگ ضائع ہوگئے۔ یہ پہلا موقع تھا جس میں خود سلطان کو ہندوستان کے سفر میں بہت سی مشکلات اور تکالیف کا سامنا پڑا۔ بہزار دقت اس بلا سے نجات پاکر غزنین واپس پہنچا۔

بارہواں حملہ قنوج — [illegible] اکتوبر [illegible] میں اس نے شمالی ہندوستان کے مشہور مقام قنوج پر جو تومارا راجگان کا دارالحکومت تھا ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیدل کے ساتھ چڑھائی کی اس مہم میں دریائے سیحون سے بیس ہزار جانباز بطور خود فوج میں بھرتی ہوگئے، درہائے کشمیر پر جو راجہ قابض تھا رہنما بنا ابن خلدون و ابن اثیر کے قول کے مطابق یہ کشمیر کا راجہ تھا جو مسلمان ہوگیا تھا سیلی بن شاہی سپہ سالار تحفہ لیکر حاضر آیا۔ ۲ دسمبر [illegible] کو دریائے جمن عبور کیا گیا اور سلطان قلعہ برہ (بلند شہر) میں داخل ہوا، میرٹھ کا راجہ ہرات یہاں کا حاکم تھا، سلطان کی آمد کی خبر سن کر بدحواس ہوگیا اور بقول فرشتہ بھاگ کھڑا ہوا، مگر اور مورخین لکھتے ہیں کہ راجہ مع دس ہزار آدمیوں کے بطیب خاطر مسلمان ہوگیا۔ محمود وہاں سے کوچ کرکے قلعہ مہابن پر جو دریائے جمن کے ساحل پر متھرا کے قریب واقع ہے فوج کش ہوا۔ کلچند راجہ نے جب صورت مفرنہ دیکھی تو بی بی بچوں کو مفت قتل کرکے اپنے سینہ میں خنجر بھونک لیا۔

یہاں سے سلطان نے متھرا کا رخ کیا جو باعتبار عمارات و بلحاظ آبادی ہندوستان کے شہروں میں بے نظیر تھا جسے دیکھکر وہ دنگ رہ گیا، چنانچہ اپنے ایک

سپہ سالار کو لکھتا ہے "اس حیرت انگیز شہر میں ایک ہزار سے زیادہ عمارتیں ہیں جو زیادہ سنگ مرمر کی اور استحکام میں مثل دین اسلام کے ہیں اور پھر کفار کے مندر ان کے سوا ہیں، اگر حساب کیا جائے کہ ان عمارتوں میں اندازاً کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے تو غالباً اس کی مقدار کئی کروڑ دینار ہوگی، اور پھر اس کثرت سے عمارتیں دوسو برس کے اندر نہیں تیار ہوسکتیں۔ ان مندروں میں میری فوج نے پانچ بت سونے کے پائے جن کی آنکھیں یاقوت کی تھیں اور صرف آنکھوں کی قیمت پچاس ہزار دینار تھی ایک اور بت کے گلے میں ایک نیلم تھا جس کا وزن چار سو مثقال تھا، یہ بت گلایا گیا تو اس میں ۹۸ مثقال خالص سونا نکلا، دوسری جگہ ہم کو دس بارہ بت چاندی کے ملے جن میں ہر ایک ایک ایک اونٹ کا بوجھ رکھتا تھا" آخیر ہفتۂ دسمبر سے قبل ہی سلطان قنوج پہنچ گیا، یہاں کے راجہ کے دربار کی شان وشوکت اور دارالسلطنت کے جاہ وحشمت کی تعریف سبھوں نے کی۔ راجہ کے پاس پانچ لاکھ سپاہ تیس ہزار سوار، اسی ہزار زرہ پوش تھے ہیونؔ سانگ نے سفرنامہ میں شہر کا طول سوا تین میل لکھا ہے، فرشتہ لکھتا ہے کہ شہر کو دور سے دیکھکر محمود نے یہ الفاظ کہے۔ "یہ وہ شہر ہے جس کی شہر پناہ اور عمارات آسمان سے باتیں کرتی ہیں اور اگر یہ اپنے تئیں تمام عالم میں لاثانی خیال کرے تو بیجا نہ ہوگا۔"

قنوج کے راجہ کا نام بعض کورہ بعض کنور رای اور بعض جیپال لکھتے ہیں برد صاحب نے اس کی تطبیق یوں کی ہے کہ جیپال ثانی اننگ پال کا بیٹا قوی لقب کی وجہ سے کورہ مشہور تھا۔ بہرحال راجہ محمود کے تحمل وحشمت سے سراسیمہ ہوگیا اور باظہار اطاعت وفرمانبرداری پہلے تو قاصد روانہ کئے پھر خود بدولت، اور فرزندوں اور غلاموں کو لیکر سلطان کی خدمت میں حاضر ہوکر آستانہ بوس ہوا حبیب السیر میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ مشرف باسلام ہوگیا، محمود تین دن کے بعد بغیر ایذا دہی قنوج سے روانہ ہوگیا اور کچھ دنوں بعد ایک خاص موقع پر راجہ قنوج کے دشمنوں سے انتقام لینے کے لئے غزنین سے ہندوستان آیا۔ قنوج کے بعد سات قلعہ اس نے اور فتح کئے۔ قلعۂ منج جو اصل میں منجھور تھا (منجادن کانپور سے جنوب دس میل پر کھنڈر موجود ہیں) قلعہ اسی (اس کو اسونی کمار نے جو سورج بنسی تھا آباد کیا تھا۔ گنگا کے گوشۂ شمال مشرق میں فتحپور سے دس میل پر ہے) قلعہ شروہ (سروادہ سیونرا ہی جو کین ندی کے کنارے پر کالنجر اور باندہ کے درمیان واقع ہے یا سرساگڈھ سے جو پہوج ندی کے کنارہ پر کوچ سے کچھ فاصلہ پر ہے جن پہاڑوں میں راجہ چندرای جاکر چھپا تھا وہ بندیل کھنڈ کے پہاڑوں کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتے) کی تسخیر کی اسی سلسلہ میں اس کا صوبہ واقع ضلع ہمیر میں آنا پایا جاتا ہے۔ بشردی سے آمتہ نے بھی لکھا ہے کہ قنوج کے بعد سلطان محمود ضلع فتحپور کی طرف بڑھا، جہاں سے گزر کر وہ بندیل کھنڈ کی پہاڑیوں میں داخل ہوا، اور پھر موسم گرما شروع ہوتے ہی غزنین کو لوٹ گیا عتبی کی عبارت کا یہ ترجمہ ہے جب سلطان چندپال کے معاملہ سے فارغ ہوا اور صوبہ میں اسے سخت تکلیف ہوئی تو چندی کی طرف متوجہ ہوا جو ہندوستان کے بڑے راجاؤں میں تھا، اور جو قلعہ شردہ میں رہتا تھا۔

تیرہواں حملہ ۴۱۲ھ / ۱۰۲۱ء سلطان کو خبر ملی کہ نندا والی کالنجر نے والی قنوج کو یہاں اہتمام کہ اس نے باوجود قدرت وطاقت کے محمود کا مقابلہ نہیں کیا اور مطیع ہوگیا۔ قرب وجوار کے راجاؤں سے مدد لیکر قنوج پر یورش کرکے راجہ کو قتل کر ڈالا ہے وہ بخیال انتقام کالنجر پر حملہ آور ہوا۔ دریائے جمنا کے قریب پہنچا تو راجہ ترجے پال دم یا سرد جپال نبیرہ جیپال نے جس کو فارسی مورخین پور جپال لکھتے ہیں دریا کے عبور میں مزاحم ہوا، لیکن مقابلہ کی تاب نہ لاسکا اور بھاگ نکلا۔ سرداروں نے شہر باڑی کو جسے راجہ نے بعد تسخیر قنوج دارالحکومت قرار دیا تھا، غارت کیا، وہاں سے راجہ نندا والی کالنجر کے حدود سلطنت کی طرف

ل ایلیٹ صاحب نے متھرا و قنوج کے بارھویں حملہ کا ۴۰۹ھ اور راجپ کے تیرھویں حملہ ۴۱۲ھ لکھا ہے۔ مسٹر لین پول ۱۰۱۸ء میں قنوج کے حملے کا ذکر کرتے ہوئے

بڑہے راجہ ۲۰ ہزار سوار ۴۵ ہزار پیادے چھ سو ہاتھی لیکر مقابلہ کو نکلا، لیکن اس پر کچھ ایسا خوف غالب آگیا کہ رات کو خیمہ وخرگاہ چھوڑکر روپوش ہوگیا۔
اس مہم میں چھ سو کے قریب ہاتھی سلطان کو ملے۔

چودھواں حملہ

قیرات، نور، لوہ کوٹ، لاہور سنہ ۴۱۲ھ

ہندوستان اور ترکستان کی درمیانی سرحد پر قیرات ایک شاداب کوہستانی مقام تھا (قیرات اور نار دین دو ملک ہیں جن میں پرات باجور اور ایک حصہ کافرستان کا بھی شامل ہے) اس حملہ میں سلطان کے ہمراہ کئی ہزار بت شکن تھے۔ لوہار اور سنگتراش بھی تھے، حاکم شہر نے اطاعت قبول کی اور مسلمان ہوگیا۔ سلطان نے علی بن ارسلان حاجب کو نار دین یا نور کے تسخیر کو بھیجا جو فتح ہوگیا، علی بن قدر سلجوقی یہاں کا گورنر مقرر ہوا، سلطان وطن واپس گیا اور پھر اسی سال کشمیر کی طرف رخ کیا اور قلعہ لوہ کوٹ کا ایک مہینہ تک محاصرہ کئے رہا جو کسی طرح تسخیر نہ ہوا، وہاں سے لوٹ کر لاہور آیا اور اطراف وجوانب میں لاہور اور شمالی سرحدی علاقہ کے سوا۔ سرو جیپال ولد انند پال یعنی جیپال کے پوتے نے جس کی حکومت میں لاہور اور شمالی سرحدی علاقہ کے سوا بقیہ کل حصہ پنجاب کا تھا بھاگ نکلا، اور راجہ اجمیر کے یہاں پناہ لی محمود لاہور اور اس کے متعلق تمامی اضلاع پر قابض ہوگیا، اس کے نام کا خطبہ ان مقامات پر پڑھا گیا۔ پنجاب غزنین کا صوبہ قرار پایا۔ لاہور صدر مقام ہوا۔ ایک مسلمان صوبہ دار مقرر ہوا سکے جاری ہوئے۔ اسی وقت سے مسلمانوں کے آئندہ ہونیوالی سلطنت کی بنا پڑی۔

پندرہواں حملہ

گوالیار و کالنجر سنہ ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء

لاہور سے واپسی پر طاقت نندا کے تسخیر کا ارادہ کیا اور گوالیار پہنچکر وہاں کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، چار روز بعد راجہ نے ایلچی کی معرفت ۳۵ ہاتھی بطور نذر بھیجکر صلح کی درخواست کی جو منظور ہوئی، وہاں سے کالنجر کا رخ کیا۔ راجہ محصور ہوگیا۔ ۳۰۰ ہاتھی تحفتہً پیش کئے اور صلح چاہی سلطان نے اس کی بھی عرضداشت منظور کی۔ راجہ نندا نے سلطان کی مدح میں ہندی زبان میں اشعار لکھکر پیش کئے جو مقبول ہوئے کالنجر کے علاوہ پندرہ قلعوں کی حکومت انندا کو عطا ہوئی۔ یہیں سے غزنین واپس گیا۔

سولھواں حملہ

سومنات سنہ ۴۱۶ھ / ۱۰۲۵-۲۶ء

یہ محمود غزنوی کا سب سے بڑا اور اہم حملہ بتایا جاتا ہے۔ دسویں شعبان سنہ ۴۱۵ھ م وسط دسمبر سنہ ۱۰۲۵ء کو تیس ہزار اور بہت سے والنٹیر ہمراہ لیکر سومنات کی فتح کو روانہ ہوا۔

لکھتے ہیں کہ دو برس بعد سلطان محمود نے قنوج کے دھوکہ باز راجہ سے مٹھ بھیڑ کی یہ حملہ راہب واقع رام گنگا پر ہوا تھا یہ دریا نہایت گہرا تھا جس کے سیاہ تہ میں نفط کی آمیزش تھی اس کا پانی خارش کے زخم جلانے میں کام آتا تھا۔ عبور کا مسئلہ مشکل تھا۔ محمود نے مقدمۃ الجیش کو مشکوں کے ذریعہ عبور کرنے اور تیراکی کے وقت برابر تیر اندازی کرتے رہنے کا حکم دیا تھا، مسٹر وی۔ اے اسمتھ لکھتے ہیں چونکہ راجہ جیپال نے ایک اجنبی ملک کے فرمانروا کی اطاعت قبول کر لی تھی اس سے گرد ونواح کے اور ہندو راجے اس سے سخت ناراض تھے اور انھوں نے سرداری راجہ کالنجر کے چندیل راجہ ودیا دھار ابھر گنڈا اور راجہ گوالیار قنوج پر حملہ کرکے راجپال کو قتل کرڈالا، جس کا جانشین ترلوچن پال تھا محمود نے چونکہ راجہ قنوج کو اپنا مطیع وفرمانبردار جانتا تھا، یہ خبر سنتے ہی غضبناک ہوکر ان بیباک ہندو راجاؤں کی سرکوبی کا ارادہ کیا اور سنہ ۱۰۱۹ء میں غزنین سے روانہ ہوکر باوجود ترلوچن پال کے مخالفت کے زبردستی جمنا کے راستہ سے گنڈا چندیل کے سرحد میں بڑھتا چلا گیا۔ جہاں راجہ نے لشکر عظیم جمع کر رکھا تھا غنیم فوج کو دیکھکر محمود ایسے شہزور کا دل کانپ اٹھا، اور رہ کر پچھتایا، لیکن بہادر گنڈا ہمت ہار گیا، اور بزدلی کے ساتھ خیمہ وخرگاہ مع ۵۸۰ ہاتھیوں کے سلطان کا شکار ہونے کیلئے چھوڑ کر چند ساتھیوں کے ساتھ فرار ہوگیا۔ محمود اس فتح وکامیابی سے مالا مال ہوکر غزنین کو واپس گیا اور سنہ ۱۰۲۱-۲۲ء میں پھر ایکبار چندیلوں کے ملک میں آیا، اور مشہور قلعہ کالنجر کا جو اب ضلع باندہ میں واقع ہے محاصرہ کرلیا اس دفعہ بھی گنڈا نے مقابلہ سے خوف کھایا اور صلح پر قناعت کی سلطان حسب معمول مال غنیمت سے مالا مال ہوکر فتحمندانہ غزنین کو واپس گیا۔

سومنات کا بت بزرگ ترین اصنام تھا، وہی لوگوں کو مارتا جلاتا، اور اُن کے دنیاوی معاملات کا متکفل تھا، روح جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد سومنات میں حاضر ہوتی اور وہ بت بطریق تناسخ اُسے جس جسم میں مناسب سمجھتا پھر پیدا کرتا۔ مد و جزر اُس کی عبادت کے لئے تھے وہ بیماروں کو شفا دیتا تھا۔ کرشن جی کے عہد سے جبکہ چار ہزار برس سے زیادہ گذر رہے برہمنوں کا معبود تھا۔ یہ روہاں کی تاریخوں میں اسے گنگا کے پانی سے غسل دیا جاتا تھا وہ فاصلہ دو سو فرسخ سے کم نہ تھا کسوف و خسوف کے موقع پر دو تین لاکھ جاتری جمع ہوتے تھے، اخراجات کے لئے دو ہزار گاؤں بعض دس ہزار لکھتے ہیں وقف تھے۔ مندر میں دو ہزار برہمن پنڈت تھے جو ہمیشہ حاضر رہا کرتے تھے پانسو مغنیہ تین سو سازندے ملازم تھے، تین سو حجام مقرر تھے اس کے گھنٹے کی طلائی زنجیر دو سو من کی تھی۔ اصل بت اکتوبر کے مہینہ میں تین سو پچاس میل کا وسیع ریگستان طے کر کے محمود ملتان پہنچا۔ بیس ہزار سے زاید اونٹوں پر سامان رسد بار کیا گیا۔ وہاں سے اجمیر پہنچا راستہ میں بہت سے قلعے فتح ہوئے۔ گجرات کی سرحد پر پہنچا تو تین گجرات میں گجرات کا راجہ شہر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ ماہ ذیقعد بروز جمعرات ۴۱۶ھ میں سومنات پہنچا۔ مندر ایک ایسے جزیرہ نما میں واقع تھا جو ایک مضبوط اور مستحکم خاکنائی کے ذریعہ سے بر اعظم ہندوستان سے ملا تھا۔ قلعہ کی فوج دریا کے عبور سے مانع ہوئی کشتی کے ذریعہ سے فوج فصیل تک پہنچی مندر والے چلائے کہ ہمارا دیوتا تمہیں ہلاک کرنے کی غرض سے لایا ہے، ہندوستان میں جو مندر اور شوالے تم نے برباد کئے ہیں ان سب کے بدلے تمہیں یہیں سزا دیگا خیریت چاہو تو واپس چلے جاؤ ورنہ ایک مسلمان بھی زندہ نہ بچے گا۔ اگلی صبح کو حملہ کیا گیا سلطانی فوج قلعے کے نیچے جنگ میں مصروف ہوئی اور دشمن کو فصیل سے ہٹا کر سیڑھیوں اور کمندوں کے ذریعہ سے اوپر چڑھ گئی۔ برہمن اور راجپوت مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور اُن کو مار مار کر فصیل سے گرا دیا۔ دوسرے دن اور بھی زیادہ مسلمان مارے گئے۔ تیسرے دن مندر کی حفاظت و مدافعت کے لئے اور بھی جا بجا سے فوجیں آگئیں راجہ برہم دیو یا پرم دیو اور دیگر امرا نہروالہ و گجرات بھی پہنچ گئے لیکن تیسرے روز کی سخت لڑائی میں پانچ ہزار ہندو کام آئے چار ہزار برہمن اور پجاری جانیں بچا کر مندر سے باہر آئے اور کشتیوں پر سوار ہو کر بھاگے۔ محمود مندر میں داخل ہوا۔

اس حملہ میں کم سے کم دس کروڑ روپیہ کا مال سلطان کے ہاتھ آیا۔ تمدن ہند کا مصنف اس کی کل قیمت کا اندازہ ... ذکر کرتا ہے، جو سومنات کے فتح کرنے میں ہاتھ آئی تھی۔

سومنات سے فارغ ہو کر سلطان نے نہروالہ کا رخ کیا جو سومنات سے چالیس فرسخ تھا یہاں کا راجہ بھیم برلکر کی طرف نکل گیا قلعہ فتح ہو گیا صاحب روضۃ الصفا یہاں سے سلطان کی روانگی بیابانہ کی طرف لکھتے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ محمود نے نہروالہ میں برسات تک قیام کیا اور گجرات کو دارالسلطنت بنانا چاہا۔ مگر اراکین سلطنت کی رائے نہ ہوئی اور اس نے دشلیم مرتاض کو نہروالہ کی حکومت عطا کی۔ اور سندھ کے مشرقی ریگستان میں ہو کر ملتان جانا چاہا۔ سومنات کا ایک فدائی رہبر بنا تھا جس نے شاہی فوج کو ایسی جگہ پہنچا دیا جہاں پانی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہزار خرابی و نقصان یہاں سے روانہ ہو کر سلسلۂ کوہ نمک کے غارت گر جاٹوں کے ہاتھ پڑ گیا سخت جد و جہد کے بعد ان سے چھٹکارا پا کر محمود ملتان اور وہاں سے وطن کو روانہ ہوا ۴۱۷ھ میں غزنین پہنچا۔ خلیفہ بغداد کی خدمت میں فتحنامہ سومنات ارسال کیا۔ وہاں سے فرمان شاہی۔ خراسان بلاد ملتان نیمروز اور خوارزم کا نشان حکومت عطا ہوا۔ یمین الدولہ محمود کو کہف الدولہ والاسلام۔ امیر مسعود کو شہاب الدولہ جمال الملۃ۔ امیر محمد کو جلال الدولہ وجمال الملۃ، اور امیر یوسف کو عضد الدولہ ومؤید الملۃ کے خطابات عطا ہوئے۔ مسلوب الاختیار خلیفہ نے اجازت دی کہ آپ جسے چاہیں اپنا ولی عہد نامزد کریں۔

سترھواں حملہ ۴۱۷ھ ۱۰۲۶ء	تسخیر لاہور کے زمانہ میں جو دریا جہلم کے جاٹوں نے جو تاتاریوں کے ایک جرگہ جیناؤں کے ہم نسل خیال کئے جاتے ہیں اور اس حصہ میں کالا ہیہ کے مقام پر آباد تھے بڑا جتھا قایم کر لیا تھا۔ قرب و جوار میں لوٹ مار کرتے تھے۔ والی مندور کو ترک مذہب نہ کرنے پر بہت ستا چکے تھے

سومنات سے واپسی کے وقت محمود کی فوج سے مزاحم ہو چکے تھے اس لئے محمود نے ان کی گوشمالی کا ارادہ کیا۔ ملتان میں چھ سو کشتیوں کا بیڑہ تیار کرلیا جاٹوں نے بھی دریائی لڑائی سے مقابلہ کیا لیکن سلطانی فوج غالب آئی اور محمود غزنین واپس گیا۔

۳۵ برس بڑی شان و شوکت عزت و حشمت کے ساتھ سلطنت کرکے ۴۲۱ھ میں جبکہ اس کی عمر کم و بیش ۶۰ سال کی تھی سلطان محمود نے وفات پائی، قصر فیروزہ میں جسے اب روضۂ السلطان کہتے ہیں تابوت ہند سپرد خاک کیا گیا۔

مسلمان مورخین نے سلطان محمود کی نسبت جو کچھ لکھا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

سلطان محمود کی وفات ماہ ربیع ۴۲۱ھ میں ہوئی۔ وہ جلیل القدر بادشاہ تھا اور ممالک اسلامیہ میں بہت زیادہ حصہ پر قابض تھا، وہ علما کی تعظیم و تکریم کرتا تھا، جو اکثر بلاد اسلامیہ سے اس کے دربار میں آتے تھے، رعایا کے حق میں عادل، ان کا رفیق اور محسن تھا، اکثر جہاد و غزوات میں مصروف رہتا تھا۔ اس کے فتوحات مشہور ہیں۔ (ابن خلدون)

۴۲۱ھ کا آغاز ہوا۔ اسی سال ربیع الآخر میں محمود بن سبکتگین نے وفات پائی جو عاشورہ ۳۶۱ھ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ مرض اسہال و سوء مزاجی میں دو سال تک مبتلا رہا بالآخر اسی مرض میں انتقال کیا، مگر چونکہ وہ قوی النفس تھا اس لئے اس کے حالات میں کوئی بین فرق نہیں آیا۔ مرض کی حالت میں لیٹتا نہ تھا، بلکہ تکیے کے سہارے سے بیٹھا رہتا تھا یہاں تک کہ اسی حالت میں اس نے وفات پائی (ابو الفداء)

سلطان محمود کے اوصاف زیادہ ہیں اور اس کی سیرت احسن السیر ہے مرتب نامہ، ۳۶۱ھ ہجری میں پیدا ہوا اور ماہ ربیع الآخر میں ۴۲۱ھ وفات پائی، بعض ۱۱ صفر اور بعض ۴۲۲ھ کہتے ہیں۔ بمقام غزنین فوت ہوا، اللہ تعالیٰ اس پر اپنی رحمت نازل کرے۔

۴۲۱ھ شروع ہوا۔ اس سنہ کے ربیع الآخر میں یمین الدولہ ابو القاسم محمود بن سبکتگین نے وفات پائی۔ اس کی ولادت روز عاشورہ ۳۶۱ھ میں ہوئی بعض تاریخ وفات ۱۱ صفر بتاتے ہیں اس کی وفات مرض اسہال و سوء مزاجی میں ہوئی، جس میں وہ دو سال تک مبتلا رہا، وہ بہت مضبوط دل تھا۔ بیماری میں لیٹتا نہ تھا۔ بلکہ تکیہ کے بیٹھا رہتا تھا۔ اطبا نے مشورہ بھی دیا کہ وہ آرام کرے مگر وہ صبح شام دربار عام کرتا تھا، اور کہتا تھا کہ کیا تم لوگ مجھے معزول کرنا چاہتے ہو یہاں تک کہ وہ بیٹھے ہی بیٹھے انتقال کر گیا۔ جب انقضا کا وقت آیا تو اپنے بیٹے محمد کو جانشین کئے جانے کی وصیت کی۔ . . . .

وہ عاقل دیندار ادیب علم و معرفت سے بہرہ ور تھا، علوم و فنون کی بہت سی کتابیں اس کے پاس تھیں۔ دور، دور سے علما اس کے پاس آتے تھے اور وہ ان کی تعظیم و توقیر اور خبر گیری کرتا اور ان سے احسان و سلوک کے ساتھ پیش آتا۔ رعایا کا شفیق اور محسن فرمانروا تھا۔ اکثر غزوات و جہاد کرتا تھا۔ اس کی فتوحات مشہور ہیں۔ (تاریخ کامل)

علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفا میں ذہبی کے حوالہ سے سرتاج الملوک سلطان محمود بن سبکتگین کو لکھا ہے "سلطان محمود کے بعد غزنویہ خاندان کے تیرہ فرمانروا سریر آرائے سلطنت ہوئے خسرو ملک پر اس حکومت کا خاتمہ ہوا اور غوریوں کی حکومت کی باری آئی۔

سید عبد السبحان ناظر الہ آبادی

ازراہ کرم خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری ضرور لکھ دیا کیجئے۔ منیجر

مرتضیٰ جاسوس

(بسلسلۂ ماسبق)

(۳)

عدالت استقلال کا وسیع احاطہ عورتوں اور مردوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ فوج کے افسر عام خاکی وردی میں ملبوس تھے اور ملکی حکام اپنے سفید فراک کوٹوں میں مزین تھے۔ بڑے بڑے کاشتکار شلوار پہنے تھے اور علما عمامہ سے ڈھکی ہوئی ٹوپیاں زیب سر اور اپنے چوغے زیب بدن کئے ہوئے تھے ان سب سے عدالت کے کمرہ کی طویل قطاریں بھری ہوئی تھیں۔ گیلریوں میں امتیازی عوام بیٹھے تھے۔ مثلاً عمال حکومت، مجلس ملیہ کے ارکان، مختلف صوبہ جات کے نمائندے۔ ان میں سے اکثر اس خطرناک جاسوس کی تاریخی اور سنسنی پیدا کرنیوالے مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے جو ہمیشہ یاد رہنے والی تھی۔

جب عدالت کے گھنٹے نے گیارہ بجائے تو جنڈارمہ (فوج) کا ایک دستہ احاطۂ عدالت کے اندر داخل ہوا اور ہجوم کے درمیان مختلف مواقع پر بالترتیب سپاہیوں کو پہروں پر متعین کیا گیا، اتنے میں ایک گاڑی کے آنے کی آواز لوگوں کے کانوں میں پہنچی جسکے دیکھنے کے لئے بعض لوگ تو اپنی اپنی نشستوں پر سے اٹھ کھڑے ہوئے تاکہ پولیس کے اس محافظ دستے کو ایک نظر دیکھ لیں جو اپنی حراست میں ایک مشہور قیدی کو لا رہا تھا، تمام گردنیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں تاکہ اس عجیب تماشے کے خاص ایکٹر کو دیکھیں جس کا اس دن آخری ایکٹ ہونے والا تھا احاطہ کے ایک عقبی حصہ سے آواز آئی اور حاضرین کو مخاطب کیا۔

بیٹھ جائیے حضرات! بیٹھ جائیے!!

اس کے بعد یکایک ایک سناٹا چھا گیا اور محکمۂ استقلال کے قلموں کی آواز کانوں میں آنے لگی۔ جب عدالت کی پشت کی جانب کے دروازے کا پردہ اٹھایا گیا تو تمام حاضرین سرو قد کھڑے ہو گئے جونہی اعلیٰ حضرت قلیچ بے صدر عدالت اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو تمام حاضرین بھی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

صدر بے سرکاری وکیل معمولی ابتدائی کارروائی کے بعد اپنی نشست پر سے اٹھا اس نے اعلان کیا کہ قیدی نے اپنے جرم کے اقبال پر آمادہ ہے۔

اس اعلان نے منتظر مجمع میں عجیب انگیز سنسنی پیدا کر دی اور لوگوں کے سر قیدی کے تکتے کی جانب پھر گئے۔

صدر نے کہا "مرتضیٰ آفندی! تم نے بھی سنا؟ وکیل عمومی نے جو اعلان کیا ہے، کیا یہ سچ ہے"

مرتضیٰ "جی ہاں آفندیم۔ وکیل موصوف نے میری خواہشات قلبی اور ارادہ معلوم کرنے کے بعد یہ اعلان کیا ہے"

صدر بے "اچھا تو اب ہم تمہارا بیان سننے کے لئے تیار ہیں، دیکھو تمہارا اقبالی بیان خود تمہاری مرضی کے مطابق ہونا چاہیئے اور کسی اثر یا دباؤ کی وجہ سے تم کو ہرگز متاثر نہ ہونا چاہیئے۔ اگر تمہارا بیان کسی اثر، جبر یا دباؤ کی وجہ سے ہوا تو مقدمہ کا مقصد ہی فوت ہو جائیگا" صدر عدالت نے کچھ توقف کیا اور پھر ملزم سے کہا "حکومت نے بنظر ترحم تمہیں فوجی عدالت (کورٹ مارشل) کے سپرد نہیں کیا جو سلطنت کی حفاظت و مدافعت کے لئے تمام سیاسی

مجرمین کے مقدمات کی سماعت کرتی ہے تمہارا مقدمہ اب عدالت انصاف میں پیش ہے اور میری یہ خواہش ہے کہ تم کو ایک عدالتی مقدمہ کی تمام مراعات ملنی چاہئیں"۔

جب صدر عدالت مذکورہ بالا الفاظ کہہ چکا تو غیر ملکی اخبارات کے نمایندے جو بمشکل حاضرین میں جگہ حاصل کر سکے، انقلابی حکومت کی ایک عدالت کے انصاف اور فیصلہ پر تعریف و توصیف کے جذبات و احساسات کو بمشکل روک سکے! صدر عدالت جب اپنی تقریر ختم کر چکا، اور تمام ہدایات ملزم کے ذہن نشین کرا چکا تو ملزم نے سر کے اشارہ سے اس کا جواب دیا۔ سرکاری وکیل نے ایک جنٹلمین کے کان میں کچھ چپکے سے کہا یہ شخص وکیل کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، وہ خاموشی سے ملزم کے جنگلے کے قریب گیا اور مرتضیٰ سے کچھ سرگوشی کی صدر نے اپنا سر اٹھا کر اس جنٹلمین کی جانب دیکھا۔

موخر الذکر نے کہا "میں" صدر بے دعویٰ وکیلی" ہوں مجھے وزارت انصاف نے ملزم کی جانب سے اس مقدمے کی مدافعت کے لئے مقرر کیا ہے"۔

"صدر عدالت کہا "میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں، شاید آپ نے یقین دلا دیا ہے کہ ملزم کا اقبالی بیان کسی طرح دباؤ یا جبر کا نتیجہ نہیں ہے"

صدر بے "ہاں میں نے یقین دلا دیا ہے یہ بیان خود اس کی مرضی کے مطابق اقبالی بیان ہے" دعویٰ وکیلی یہ کہکر اپنی نشست پر بیٹھ گیا"

صدر عدالت نے ملزم کو مخاطب کر کے کہا "براہ مہربانی اب اپنا بیان شروع کیجئے"۔

مقدمہ نویس اور نمائندگان اخبارات نے اپنی اپنی پنسلیں نکال لیں اور تماشہ دیکھنے والے بھی ہمہ تن متوجہ ہو کر مقدمہ کی کارروائی کو سننے کے لئے اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ ملزم نے ایسے لب و لہجہ میں اپنا بیان شروع کیا جس سے خود اعتمادی کا اظہار ہوتا تھا اس نے کہا۔

بیان ملزم

" بے آخذیم: میرا مولد مشرق ہے، میرے والد کے آقا مجھے مغرب میں لائے جنھوں نے میری پرورش کی اور مجھے تعلیم دلائی۔ ایک دنتی ملاقات و تعارف کا یہ نتیجہ ہوا کہ میری اسکول کی تعلیم کے بعد انھوں نے مجھے مزید تعلیم دلانے کے لئے ایک مشہور اور بہترین یونیورسٹی میں بھیج دیا۔ میرے والد کے آقا کے یہ دوست محکمہ سیاسی کے خفیہ سراغرسانی کے ڈائرکٹر تھے انھوں نے میری تعلیم کے مصارف برداشت کئے۔ ——— میری تعلیم پر بے اندازہ روپیہ صرف کیا اور مجھے شہزادوں کی طرح رکھا۔ میں نے اعلیٰ تعلیم میں امتیاز اور اعزاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں مجھے خفیہ سراغرسانی میں بطور ایجنٹ نمبر ۳، بھرتی کیا گیا۔ میں نے پہلی مرتبہ سرحد پر صریح کامیابی حاصل کی۔ جنگ شروع ہو گئی تھی اور میں مشرق کے انقلاب پسندوں کی ایک جماعت کی نگرانی پر متعین کیا گیا میں انقلاب پسندوں کا اعتماد حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہو گیا اور میں ان کے ہمراہ ایک یورپین وفد کے ساتھ روس میں گیا اور وہاں پر ہم نے ایک ایڈریس پیش کیا جس کو سونے کی ایک تختی پر کندہ کرایا گیا تھا، جس میں انقلاب پسندوں کے نظام کی تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ اور ان کی جماعت کو تسلیم کر لینے کے متعلق تمنا ظاہر کی گئی تھی۔

وفد کے ارکان کو میں نے بے خبر رکھکر حکومت راز کے اعلیٰ افسران کو ان کی سرگرمیوں کی خبر کر دی اور میں نے ان کی کارروائیوں پر اپنی جانب سے

نفرت و حقارت کا اظہار کیا، اُن میں سے اکثر کو اس جرم میں توپ دم کر دیا گیا کہ وہ بین الاقوامی کے مخاصمت اور تباہ کرنے والے ہیں۔ احکام میں کچھ غلطی ہو گئی اور مجھے بھی مجرموں کے اس زمرہ میں شامل کر کے روک لیا گیا جن کے متعلق موت کا فتویٰ صادر ہو چکا تھا، میں نے اپنی رہائی اور گورنمنٹ کے افسران سے کسی طرح خط و کتابت کرنے کے لئے متعدد مرتبہ دیوانہ وار جد و جہد کی مگر سب رائیگاں گئیں میرے ساتھی میری تو دعوتیں کرتے۔ [illegible] تھے اور مجھے ملامت کرتے تھے۔ میری زندگی موت و حیات کے درمیان معلق تھی بالآخر تعجب انگیز طور پر غلطی کی اصلاح ہو گئی اور میری جان بچ گئی۔

میں روس سے جرمنی آیا اور طلبہ کی منتشر پراگندہ جماعت میں شریک ہو گیا اور اُن کی حرکات و سکنات کی نگرانی کرتا رہا جب یہ طلبا سرحد کو عبور کرنے لگے تو اُن کا تعاقب کیا گیا اور وہ گرفتار کر لئے گئے اگرچہ سرحد پر زبردست پہرہ متعین تھا اور سختی سے نگہداشت کی جاتی تھی لیکن ہمارے محکمہ خفیہ رسانی کے ذرائع اس قدر مؤثر اور غیر محدود تھے کہ چند گھنٹوں کے اندر اندر ہر مقام کے اور ہر قسم کے پروانہ اجازت ہم کو مل سکتے تھے میرے لئے ایک سرحد سے دوسری سرحد پر جانا ایک معمولی سی بات تھی۔

اسکے بعد میں ایک دوسری خدمت پر مامور کیا گیا۔ امریکہ سے اہل مشرق کی ایک جماعت آ رہی تھی اور قریب تھا کہ جرمنی پہنچنے والی تھی ان سے ملنے اور ان کی نگہداشت کے لئے مجھے ہدایت کی گئی، میں نے اُن کو اترنے کی ترغیب دی کہ وہ آئرلینڈ کے بندرگاہ پر اتر جائیں۔ رات کو وہ محصور کر لئے گئے اور انکو کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا اس کے بعد دوبارہ مجھے جرمنی بھیجا گیا یہاں پر میں نے ایک دوسری مہم سر کی اس دفعہ اتفاق سے سرحد پر میرے جعلی پاسپورٹ کا راز افشا ہو گیا۔ سنتریوں نے مجھے دوسرے تفتیش کنندہ افسروں کے حوالہ کر دیا میرا پاسپورٹ بھی نکلا میرے پاس ہی تھا میں اپنی فطری عیاری اور چابکدستی کی وجہ سے اندر کی جیب سے اپنا اصلی پاسپورٹ نکالنے میں کامیاب ہو گیا جب افسر متعلقہ نے اصلی پاسپورٹ کو دیکھا اور مجھ سے سوال کیا تو میں نے اس کے ماتحتوں کی حماقت کا اظہار کیا اُس نے معذرت کی اور مجھے جانے کی اجازت دی۔

میرا ترکی سے تعلق اس زمانے میں شروع ہوا جبکہ میں برلن میں تھا اور جنور پاشا ان ایام میں پوٹسڈم میں بطور مہمان مقیم تھے اوّل اوّل تو مجھے اُن سے ملاقات کا کوئی موقع نہ مل سکا لیکن ایک روسی مسلمان کے اثر سے میری مساعی اس خوش قسمت انسان تک پہنچنے میں کامیاب ہوئیں۔

اُن کی شیریں کلامی اور صاف بیانی نے مجھے ایسا مرعوب اور خوف زدہ کر دیا کہ مجھے دوبارہ وہاں جانے کی جرأت نہیں ہوئی، میں وہاں سے سوئٹزرلینڈ کو عبور کرتے چلا گیا اور وہاں سے میں مشرق قریبہ کی طرف روانہ ہوا جو میری آئندہ کارروائیوں اور سرگرمیوں کا مرکز اعظم تھا۔

قسطنطنیہ میں مجھے انقلاب پسند جماعت کی نگرانی کا کام سپرد ہوا، میں نے بہت جلد اس جماعت کا اعتماد حاصل کر لیا، اور وہ میری رہنمائی میں کام کرنے لگی۔ ایک بار روسی نے انقلاب پسندوں سے میری مذمت کی اور میری حقیقت سے آگاہ کر کے کسی نہ کسی طرح میری تمام خفیہ سرگرمیوں کا بھانڈا پھوڑ دیا لیکن ان لوگوں نے اس کی بات پر یقین نہیں کیا مجھے روسی کو قتل کر کے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا پڑا۔

اس روسی مقتول کے دوستوں کو میرے اس دلیرانہ جرم کا علم ہو گیا۔ انہوں نے مجھے روس کے محکمہ خفیہ خبر رسانی کے پاس کئی ہزار روبل (روسی سکہ) میں فروخت کر دیا۔ میں اُن کے حکم سے سرتابی نہ کر سکا کیونکہ انھوں نے مجھے نقد روپیہ دیکر خرید لیا تھا۔ اگرچہ وہ روپیہ بجائے میری جیب کے دوسروں کی جیبوں میں چلا گیا۔ اور نہ میں اپنے قدیم آقاؤں کے خلاف کچھ کر سکتا تھا، وہ میری اس جدید ملازمت کے حالات سے قطعی بے خبر تھے، میں نے اُن بدترین صورت حالات سے بھی فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا چنانچہ میں ایک نہایت کارآمد اور مفید اطلاع اپنے روسی رفقاء سے جو مجھ پر شبہ نہیں کرتے

ست حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ اطلاعات میں نے ہیڈ کوارٹرز کو بھیج دیا کرتا تھا۔ میرے ان ذرائع نے میرے آقاؤں کو بہت مسرور اور محظوظ کیا انھوں نے میرے سپرد یہ کام کیا کہ میں ان عرب ممبران جنگ کی فہرست مرتب کروں جو ترکی سے جنگ کرنے میں قید ہوئے تھے یہ میری ہی کارگزاری تھی اور بچھ مارے ہوئے راستے میں ان سب کا ایک وحشت ناک اور خوفناک رات میں کام تمام کر دیا۔

اس محکمہ میں تین سال سے زائد ملازمت سے بعد ڈائرکٹر جس کے ذمہ شرقی ممالک کا کام تفویض تھا۔ خاص طور پر مجھ سے ملاقات کے لئے مشرق میں آیا تمام مہمات اور کارروائیوں میں میری کامیابی پر مبارکباد دی اور کہا کہ میری تنخواہ میں اضافہ کیا گیا ہے اور میری اعلیٰ قابلیت۔ روشن دماغی اور دلیرانہ خدمت کی وجہ سے میں جاسوسی کی ایک جدید مہم اور جان جوکھوں کی خدمت پر بھیجا جانیوالا ہوں جنگ یورپ بنی نوع انسان کو تباہ و برباد کرنے ختم ہو چکی تھی اور جرمنی خارج اپنی فاتحانہ ترمیم و آزمایش میں مخمور و مسحور ہو رہے تھے کہ ان کے حریصانہ حوصلوں کے نتائج کی انتہا کسی کو معلوم نہ تھی۔ لیکن تمام ممالک میں صرف ترکی معصومیت اور سنجیدگی کی راہ اختیار کئے ہوئے تھی وہ اپنے ستانے والوں کی عیاریوں کا شکار نہ ہوئی ترکوں سے مصالحت کے لئے معقول اور شریفانہ طریقے اختیار کرنے پڑے لیکن قسمت سب سے زیادہ ہوشیار ہے۔

میرے خیال میں میں تو ایک ہوشیار شخص ہوں لیکن میں نے تمام محبوب اور مقدس ترین رشتوں اور چیزوں سے محکمہ خفیہ سراغرسانی کی خاطر اپنے تمام تعلقات منقطع کر لئے لیکن میری ناکامی پر اس محکمہ نے مجھ سے بے تعلقی کا اظہار کیا۔ انھوں نے اب مجھے تمہاری تحریک کی بنیادوں کو تباہ کر دینے کے لئے بھیجا تھا۔ میں اپنے جرم کا اقبال کرتا ہوں لیکن مجھے اپنی صفائی کے لئے ایک خفیف سا موقع حاصل ہے۔

عدالت سے باہر کی طرف دیکھا تماشائی جو مسلسل دو گھنٹوں سے جاسوس کا بیان سن رہے تھے اور بت بنے بیٹھے تھے۔ اب اپنے سروں کو زرا اونچا کیا تماشائیوں کو یہ توقع تھی کہ ملزم کوئی خاص بات یا یادگار راز افشا کرنیوالا ہے۔

مرتضیٰ نے اپنا بیان ختم کرتے ہوئے کہا۔

"میری موجودگی گردوپیش کے حالات کا نتیجہ ہے اور میں بچپن سے اپنے حالات کی وجہ سے قسمت کے حوالہ تھا"

صدر نے صرف اپنے سر کو حرکت دی اور پھر سر جھکا لیا۔ قدرے توقف کے بعد انھوں نے مرتضیٰ سے دریافت کیا کہ۔

"تمہیں اب تو کچھ اور کہنا نہیں ہے"

مرتضیٰ نے جواب دیا "حضور کچھ نہیں"

دوسرے دن صبح عدالت کا اجلاس حسب معمول ہوا آج بہت کم لوگ مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے آئے تھے۔ وکیل صفائی نے ایک مختصر تقریر میں ملزم کے لئے عدالت سے رحم کی درخواست کی۔

- - - - - - - - - - - - - - -

تیسرے دن علی الصبح نمبر ۳ کی نعش پھانسی کے تختے پر وہاں لٹک رہی تھی جہاں دو ماہ پیشتر "مہمان محترم" اور "معزز دوست" کے فلک بوس نعروں سے اسی میزبان نے اعزاز و احترام کیا تھا، جس کی جان لینے کے ارادہ سے وہ مہمان بنکر آیا تھا۔

راجہ غلام احمد

لارڈ رپن کا عہدِ حکومت

(مسلسل)

پٹنہ و لکھنؤ

۷- جنوری ــــــ

۱۱ بجے اسٹیشن پر پہنچے، تقریباً ۰۰ مسلمان موجود تھے۔ ہمارے میزبان سید رضا صاحب ہمیں نفیس گاڑی میں اپنے گھر لے گئے، جہاں ہم بہت آرام سے ہیں۔ میں نے پٹنہ کے ہر بڑے مسلمان سے واقفیت پیدا کر لی ہے۔ پٹنہ کی آبادی میں پچاس ہزار مسلمان ہیں۔ بہت سے خاندان اسلامی سلطنت کے زمانہ سے پائے جاتے ہیں یہاں کے مسلمان کسانوں کی تعداد تیس چالیس ہزار کے قریب ہے اور کہتے ہیں کہ وہ پٹھان حملہ آوروں کی اولاد ہیں، اور جنگی صفات سے متصف ہیں۔

ہمارے پرانے دوست محمد علی روگھے (بمبئی) سے بھی ملاقات ہوئی۔ نور الہدیٰ، فخر الدین وغیرہ بھی ملنے کے لئے آئے۔ مدینہ کے شیخ السعادت محمد [illegible] ابن حسین ہاشمی نے ہمیں مدینہ آنے اور ان کے یہاں قیام کرنے کی دعوت دی ہے۔ انھوں نے ایک سے زائد مرتبہ اپنی دعوت دی اور اس لئے مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اُن میں اخلاص ہے۔ لنچ کے بعد ہم شہر میں سیر کرنے کے خیال سے گاڑی میں بیٹھ کر نکلے۔

نواب ولایت علی خاں رئیس پٹنہ کے وسیع ہال میں تقریباً ۱۵۰ مسلمان میرا لکچر سننے کے لئے جمع تھے میں یہاں اپنی اسپیچ درج نہیں کرونگا اس لئے کہ وہ فی البدیہ تھی، اور دوسرے یہ کہ یہاں کے اخبارات میں وہ شائع ہوگی انجمن اسلام کے جلسے میں میں نے جو کچھ کہا تھا تقریباً وہی بیان کیا، حاضرین نے اسے بہت پسند کیا۔

۸- جنوری ــــــ

[illegible] سے ہم پٹنہ سے روانہ ہو گئے نواب ولایت علی اور تقریباً ۳۰ آدمی ہمیں پہنچانے کے لئے آئے تھے، عین گاڑی چھٹنے کے بعد ایک ناخوشگوار واقعہ ظہور میں آیا یعنی کہ ایک اسکاچ ڈاکٹر نے نواب اور ان کے ساتھیوں کو دھمکا کر کہا کہ میری گاڑی کے قریب مت آؤ ورنہ چھڑی سے خبر لونگا۔ بلاشبہ میں نے سخت سست کہا اور یہ کہنے کے بعد کہ تو بدمعاش ہے، میں نے دوسرے اسٹیشن دانا پور پر اُسے حکام کے حوالہ کر دیا، پولیس کے افسروں نے اسے [illegible] کی سخت کوشش کی اور مجھ سے معاملہ کو آپس ہی میں طے کر ڈالنے کی درخواست کی، لیکن میں نے اُس کا نام اور پتہ معلوم کرنے پر اصرار کیا۔ اور تقریباً [illegible] منٹ کے [illegible] بعد اُس نے مجھے اپنا کارڈ دیا جس پر ڈاکٹر کلارک لکھا ہوا تھا، اس کا تعلق سیالکوٹ کی آرمی اینڈ نیوی کلب (A.N.N. Club) سے تھا۔ میں نے لارڈ رپن کو ایک سخت خط لکھا ہے اور بتایا ہے کہ انگریزوں کے حسب عادت بدسلوکی کرنیکے باعث ہندوستانی باشندوں کے مزاج نہایت خراب ہوتے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب اپنے رفقا کے پلیٹ فارم پر پہنچانے آئے تھے کہ اتنے میں اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص نے جس کی نسبت بعد میں معلوم ہوا کہ پنجاب کا چیف میڈیکل آفیسر ہے، کھڑکی میں سے اپنا سر اور ہاتھ نکالکر نواب موصوف اور اُن کے دوستوں کو چھڑی ماری اور انھیں نہایت بیہودہ اور گستاخانہ تحکم کے لہجہ میں حکم دیا کہ میری گاڑی کی کھڑکی کے پاس مت کھڑے ہو۔ یہ واقعہ عین گاڑی چلنے کے بعد وقوع میں آیا اور مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک کہ گاڑی دوسرے اسٹیشن پر پہنچ گئی۔ خوش قسمتی سے ٹرین کے دو اسٹیشن ہیں اور وہاں ہم ۵ منٹ میں پہنچ گئے۔ میں وہاں ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوا اور اس کا نام و پتہ معلوم کرنے پر اصرار کیا۔ اس نے انکار کرنے پر میں نے اسٹیشن ماسٹر کو دھمکایا کہ اگر تم نے مداخلت نہ کی، تو میں اس معاملہ کو لارڈ رپن تک پہنچا دونگا۔ ٹرین کے چند دوست میرے ساتھ گاڑی میں تھے جنھوں نے میری تائید و حمایت کی۔ یہ واقعہ اس وجہ سے اور زیادہ عظیم الشان بن گیا کہ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی انگریز نے اپنے اہل ملک کے خلاف ہندوستانیوں کی حمایت کی ہو۔

۳ بجے ہم بنارس پہنچے جہاں ہم مہاراجہ صاحب کے مہمان ہیں۔ بنارس میں دریا کا نظارہ توجہ کو اپنی جانب جذب کرلیتا ہے لیکن اس قدر خوبصورت نہیں جسقدر میں سمجھا بیٹھا تھا۔

۹۔ جنوری ۔۔۔۔

صبح کو میں نے کل کے واقعہ کے متعلق لارڈ رپن کو چٹھی لکھی، میں نے لہجہ ایسا اختیار کیا ہے کہ خواہ مخواہ اُن کی توجہ اس جانب مبذول ہو۔ ساتھ ہی یہ مزید اشارہ کر دیا ہے کہ اگر اس بارے میں جلد کارروائی نہ کی گئی تو میں چٹھی کو اخبارات میں شایع کرا دونگا۔

اس کے بعد مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی غرض سے احمد نگر کے محل میں کشتی میں سوار ہوکر گئے۔ یہ محل حیرت انگیز ہے۔ مہاراجہ نے تپاک آمیز استقبال کیا۔ نزلہ کی وجہ سے انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا، مگر مجھے دیکھکر بہت محظوظ ہوئے۔ مذہب اور ہندوستانیوں کو ضرورت سے زیادہ انگریزی تعلیم دینے کے نقائص پر دیر تک بات چیت ہوتی رہی، اس رائے سے انھوں نے بھی اتفاق کیا۔ میری گفتگو کا اردو میں ترجمہ کر دیا جاتا تھا۔ اُن کے انگریز دوستوں کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ مسٹر جان اسٹریچی کا نام آتے ہی وہ ہنس دیے اور کہنے لگے انہیں اپنی شان کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ یہ سنکر اور بھی ہنسیں گے کہ انگلستان میں جب کوئی شخص اُن سے محض اتنا پوچھ لیتا ہے کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں تو پھر وہ بہت ہی خوش کلامی سے بات کرتے ہیں۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

مندر، تالاب اور محل کے مختلف نظارے دیکھنے کے بعد ہم کشتی میں بیٹھکر دریا کی سیر کو گئے۔ اپنی شان و شوکت کے زمانہ میں بغداد بھی اسی حالت میں ہوگا لیکن بنارس میں جو امر حیرت انگیز ہے وہ یہ ہے کہ دریا کے جنوبی حصے میں کوئی مکانات نہیں ہیں۔ ہلکر کا مکان جو تمام و کمال دریا میں ڈوب گیا ہے ظاہر کرتا ہے کہ دیر یا سویر تمام مکانات غائب ہو جائینگے اور صرف مٹی کے جھونپڑے باقی رہجائیں گے۔ یہاں کے مندر جنوبی ہندوستان کے مندروں سے لگا نہیں کھا سکتے۔

۱۰۔ جنوری ۔۔۔۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ لارڈ رپن کو یہ احکام بھیجدیے گئے تھے کہ مجھے گورنمنٹ ہاؤس میں نہ مدعو کیا جائے۔

صبح کے وقت بھی ہم نے کشتی کی سیر کی۔ شام کے مقابلہ میں یہ نظارہ عجیب و غریب ہے، خاندان مغلیہ کی آخری یادگار سے بھی ملنے کے لئے گئے، کیونکہ اُنکے

بغیر ہمارا سفر ناکمل رہتا۔ یہ دریا کے قریب ایک پرانے محل میں رہتے ہیں اور جیسا کہ انھوں نے خود ہم سے بیان کیا، انہیں ۲۴۹ روپیہ ۲ آنہ اور تین پائیاں ماہوار ملتی ہیں۔ گویا ہر مجسٹی انھیں سلطنت ہندوستان کا اس قدر معاوضہ دیتی ہے، ان کی بیوی کو بھی ۲۴۹ روپیہ ملتے تھے، مگر اب ان کا انتقال ہو گیا ہے، اور وہ اب اپنا معاملہ پبلک کے روبرو پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ ہماری ملاقات سے بے انتہا محظوظ ہوئے، کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکو غریب ہونے کی وجہ سے کوئی شخص نہیں پوچھتا۔ لیکن ہمارے اخلاق سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے خاندانی حالات بتائے، اور کہا کہ اورنگ زیب کے سب سے بڑے بیٹے میرے دادا تھے اور چونکہ ان کے والد نے انھیں میراث سے محروم کر دیا تھا اس لئے وہ دہلی چھوڑ کر بنارس آ بسے تھے۔ غمگین معمر شخص ٹوٹے پھوٹے مکان میں اپنے غریب ملازمین کے ساتھ رہتے تھے اور وہیں سے بیمار عقاب کی طرح دریا اور بلائی شکر کے شہر کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ ہم ان پر ترس کھا رہے تھے اور ان کے خاندان کا حال سن کر دل ہی دل میں افسوس کر رہے تھے کہ اتنے میں انھوں نے اپنا رقت انگیز لہجہ بدلا اور پوچھا کہ آپ مرغوں کی لڑائی کے دیکھنے کے خواہش مند ہیں، اور جب میں نے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تو وہ فوراً اٹھے اور ہمیں صحن میں لے گئے، جہاں مرغ پہلے سے اس غرض سے تیار تھے۔ مرغوں کی لڑائی ایک دھوکہ ہے۔ مرغ اس قدر قیمتی تھے کہ انھیں ایک دوسرے کو زخمی کرنے کا موقع نہیں دیا جا سکتا تھا اور ان کے کانٹوں کو دھجی سے ڈھانک دیا گیا تھا تاکہ کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ اس دلچسپ مشغلہ سے تھوڑی دیر کے لئے ان کی تفریح ہو گئی، اور پھر وہ اپنی پرانی حالت بیچارگی میں آگئے، ہمارے لئے ہار اور خوشبو لائی گئی اور اس کے بعد ہم ان سے رخصت ہو گئے کروڑوں روپیوں کے عوض میں بھی میں اس ملاقات کو ترک نہیں کرتا۔

یہاں سے ہم الہ آباد پہنچے جہاں ہم لائل (Sir Alfred Lyall K. C. B.) کے یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں فروکش ہوئے۔ بہت سے مسلمان اسٹیشن پر موجود تھے اور فریدالدین بھی ہم سے ملے، گورنمنٹ ہاؤس میں جب پہنچے تو کھانا تیار تھا جسے ہم نے بہت سے غیر دلچسپ افسروں کے ساتھ کھایا۔ اینگلو انڈین اشخاص کی صحبت بھی کس قدر دلچسپ ہے۔ جب سب چلے گئے تو میں نے اسلامی اصطلاحات کے متعلق لائل کے روبرو اپنی تجاویز پیش کیں اور یونیورسٹی کا خاکہ بھی بتایا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مؤخرالذکر اسکیم کو انھوں نے نہایت جوش کے ساتھ پسند کیا اور کہا کہ اگر میرے صوبہ میں ست افتتاح ہوا تو میں گورنمنٹ کی طرف سے بھی امداد کروں گا۔ انھوں نے کہا کہ جو پور یا تیپور اسکے لئے مناسب مقامات ہونگے۔

فریدالدین ایڈریس اور لکچر کے متعلق طے کرنے کے لئے آئے مگر لائل سے مشورہ کرنے کے بعد لکچر کا خیال ترک کر دیا گیا ہے۔ فریدالدین نے بہتیرا کہا مگر انھوں نے انکار کر دیا ہے۔ یہ دیکھ کر رنج ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے دلوں میں لائل کا کس قدر خوف چھایا ہوا ہے، باوجود اپنی دلیری کے فریدالدین ان کے سامنے خاموش اور ننگے پاؤں کھڑے تھے، میں نے فریدالدین سے جوتہ پہننے کے لئے کہا، لیکن لائل نے کہا کہ انھیں انھی کے میں رہنے دو۔ باوجود اس کے لائل تنگ خیال شخص نہیں ہے اور ان سے ہم نے نہایت اہم سوالات پر گفتگو کی۔ البرٹ بل کے متعلق ان کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک مقامی قانون ثابت ہوگا۔ آسام کے کاشتکار تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس قانون کے ذریعہ انہیں اپنے ہندوستانی ملازمین کو پیٹنے کے حق سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جیوری کا طریقہ ناقابل عمل ہے اس لئے کہ وہ من مانی کارروائی کرے گی۔ ہم نے انقلاب کے امکانات پر بحث کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ممکن ہے کہ ۲۰ سال میں ظہور میں آجائے لیکن ہندوستانی کمزور ہیں اور تنہا کبھی نہیں رہ سکیں گے۔ ساحل پر وہ ان اقوام کا شکار ہو جائیں گے جو سمندری اقتدار رکھتی ہیں اور اندرون ملک میں روس یا چین کا

ڈنر کے بعد ہم میو ہال (Mayo Hall) میں گئے جہاں تقریباً ۲۰۰ مسلمانوں نے ہمیں ایڈریس دیا۔ جس کا جواب ہم نے محتاط اور معتدل الفاظ میں دیا۔ مگر یہ سب کارروائی محض تماشا تھا اس لئے کہ قیام گورنمنٹ ہاؤس نے ہمارے اور لوگوں کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی ہے۔ وہ اب بے محابا میرے پاس چلے آنے اور کھل کر بات چیت کرنے کی جرات نہیں کر سکتے۔

انگلستان میں معاملات کی حالات ٹھیک ہیں۔ چرچل نے مصر کے متعلق ایک تقریر کی ہے اور مجھے یہ دیکھکر خوشی ہوئی ہے کہ جو پروگرام میں نے انکے لئے مرتب کیا تھا، اس کے مطابق انھوں نے حکومت کی بنیاد اصول اخلاق پر رکھی ہے۔ گلیڈ اسٹون نے نیکی کا لبادہ اتار کر پھینک دیا ہے، اور اب جو شخص چاہے اسے پہن سکتا ہے۔ مصر میں انگریزی ملازمین کی تعداد میں اضافہ کرنے اور قبضۂ مصر کو اور پانچ سال تک رکھنے کے لئے گفتگو کی جا رہی ہے۔

۱۲ - جنوری :-

اکبر حسین اور اُن کے بھائی علی الصباح آئے۔ ہم نے کل کے جلسے کے متعلق پانیر میں ایک مضمون بھیجا ہے۔ سہ پہر کو گارڈن پارٹی میں میں نے ٹپنہ کے واقعہ کا ذکر ہائی کورٹ کے جج سر ڈونالڈ اسٹوارٹ (Sir Donald Stewart) سے کیا اور وہ بہت متعجب ہوئے۔ چند مسلمان دوست بھی پارٹی میں تھے مگر میں نے دیکھا کہ وہ انگریزوں سے بالکل الگ تھلگ رہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ ہندوؤں سے بات چیت کرتے تھے۔

ڈنر میں سر جان کے نوجوان بیٹے اسٹریچی سے ملاقات ہوئی۔ باپ بیٹا ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے والد کی طرح بیمار کوے کی مانند گردن ایک طرف کو لٹکا کر بیٹھتے ہیں۔ ان کی آواز بھی نرم ہے۔ گو بہت ہوشیار ہیں۔ لائل سے پھر گفتگو ہوئی، ان کا خیال ہے کہ اب مصر کو یقیناً ملحق کر لیا جائیگا۔

۱۳ - جنوری :-

لارڈ ڈفرن کے پاس سے کوئی جواب نہ آنے کے باعث میں پریشان تھا۔ لیکن شام کو ڈاک آئی اور اس میں اُن کا عنایت نامہ بھی ملفوف تھا مجھے اپنے خط کے سخت لہجہ کا افسوس ہے اب میں تمام معاملہ کو انھیں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔

لائل نے بھی مجھ سے ٹپنہ کے واقعہ کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ لارڈ ڈفرن نے آپکی چٹھی کی نقل میرے پاس بھیجدی ہے، اور درخواست کی ہے کہ خط کے اُن حصوں کو خارج کر دیا جائے جو مسئلہ کے عام پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے کہ اگر انھیں فی الحال زیر بحث لایا جائیگا تو تمام ہندوستان میں شور مچ جائیگا، اور لارڈ ڈفرن کے ارادوں میں رکاوٹ پیدا ہو جائیگی۔ لائل نے یہ بات کہی ہے کہ لارڈ ڈفرن نے وعدہ کیا ہے کہ اگر آپ چٹھی کو از سر نو لکھدیں گے تو پورا پورا انصاف کیا جائیگا۔ لائل نے یہ صلاح دی ہے کہ ڈاکٹر ٹپنہ آئے اور نواب صاحب سے معافی مانگے، اور ریلوے کمپنی کے نام حکم نافذ کر دیا جائے کہ آئندہ سے ہندوستانیوں کی حفاظت کی جائے۔ میں نے اس سب کارروائی سے اتفاق کرتے ہوئے چٹھی کو از سر نو لکھدیا ہے اور ساتھ ہی لارڈ ڈفرن کے نام شکریہ کی علیحدہ چٹھی بھی ارسال کر دی ہے۔ لائل مجھے حکم دیتے ہیں کہ آئندہ کسی انگریز سے اس واقعہ کا ذکر نہ کروں۔ بہرحال مجھے یہ دیکھکر مسرت ہوتی ہے کہ ٹپنہ کے واقعہ پر نہایت مناسب کارروائی ہو رہی ہے۔

لائل کہتے ہیں کہ حکام سیلون نے حکام بنگال کے نام آپکے متعلق تار روانہ کیا ہے (اور میرا خیال ہے کہ لائل کو بھی یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ میری نگرانی رکھیں) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فرید الدین کو تنبیہ کر دی گئی کہ مجھ سے بہت زیادہ نہ ملیں جلیں۔ لائل نے مجھے مشورہ دیا ہے۔

کہ راجہ امیر حسن (لکھنو) جس شخص سے ملنے کے لئے کہیں صرف اُسی سے ملوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ میں خطرناک اشخاص کی صحبت سے علیحدہ رہوں۔ گورنمنٹ کی مخالفت کا اب یہ اثر ہوگا کہ مسلمانوں سے میرے تعلقات اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گے ناظم کی شخصیت انسان ہونے کی حیثیت سے دلفریب اور ہمدردانہ ہے لیکن افسر ہونے کی حیثیت سے ان کی تعلیم نہایت ہی خراب۔ رسم میں ہوتی ہے سر سالار جنگ کے نظام حکومت کو خراب کر دینے کی زیادہ ذمہ داری انہیں کے سر ہے اور انہوں نے اس کا اقرار بھی کر لیا ہے۔ سالار جنگ اپنی ملکی حکومت کی بنا پر چاہتے تھے (وہ یہ وہ بات ہے؟ جسے وہ حاصل نہیں کر سکے) اگر گورنمنٹ ہند سے بے نیاز ہو جائیں بعض امور ایسے ہیں جن کے متعلق گورنمنٹ مشورہ دیا کرتی ہے اور باصرار چاہتی ہے کہ ان پر عملدرآمد ہو۔ لیکن سالار جنگ نے اس کی پروا نہ کی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنی عقلمندی اور انگلستان کے خیر سگالی حلقوں کی ہمدردی پر بھروسہ رکھنا چاہتے تھے اور بس۔ لیکن اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی اس امر میں آپ سے متفق ہوں کہ سالار جنگ خطرناک آدمی ہیں۔ امپریل پالیسی میں یہ چیز کبھی شامل نہیں رہا کہ صوبہ برار نظام کو دوبارہ واپس کیا جائیگا۔

۱۴-جنوری:-

پاؤنیر نے مولوی صاحب کے جلسہ کا حال شائع کرنے کے بجائے یہ لکھا ہے کہ مٹینگ سے لوگ ریزیڈنٹ کو انگریزی حکومت کا نمائندہ اور جاسوس سمجھتے ہیں اسپر میں نے لائل سے بحث کی اور کہا کہ اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے کہ پاؤنیر نیم سرکاری اخبار ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کا اقرار کیا اور مجھ کو بلا بھیجا، کیونکہ مسٹر ایڈیٹر ایلین (Allen) موجود نہ تھا، لائل نے ان کے سامنے پہلے تو مختصر سا لیکچر دیا اور پھر مجھ سے ملایا۔ یہ شخص بالکل ترچھا تھا اور بظاہر ۲۰ برس سے کم عمر کا معلوم ہوتا تھا، اور اس قدر خوفزدہ تھا کہ اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا تھا اور وہ کرسی پر بھی نہیں بیٹھ سکا۔ مجھے لڑکے کی اس حالت کو دیکھکر افسوس ہوا۔ میں نے نہایت نرمی سے اس سے بات چیت کی اس نے بہت معذرت خواہی کی اور وعدہ کیا کہ ایڈیٹر اور آپ کی ساری اسپیچ چھاپ دی جائیگی اور ساتھ ہی معافی نامہ بھی شائع کر دیا جائیگا۔ اور یہ کہ مٹینگ کے مسلمانوں کی طرف سے اگر کوئی چٹھی آئی تو اسے بھی شائع کر دیا جائیگا۔ لائل نے مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ لڑکا کانٹینس کا بہت شائق ہے اور جو باتیں وہاں سنتا ہے انہیں صحیح اخبار کر دیتا ہے۔ مزید برآں کالون اور ایلین کی گاڑھی چھنتی ہے اور وہ دونوں ساتھ ہی رہتے ہیں۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ میرے متعلق پاؤنیر نے جو معاندانہ رویہ اختیار کیا ہے وہ سب کالون کا طفیل ہے۔ لیکن یہ اخبار نویس کس مضحکہ انگیز طریقہ سے دنیا پر حکومت کرتے ہیں۔

۱۵-جنوری:-

ہم لکھنو گئے اور وہاں سے کانپور راستہ میں کوئی بات وقوع میں نہیں آئی۔ کانپور کے اسٹیشن پر تقریباً ... مسلمان ہمارے منتظر تھے چونکہ ان میں سے صرف ایک ہی شخص ذرا سی انگریزی جانتا تھا۔ اس لئے ہماری ملاقات مزاج پرسی اور مصافحہ کے حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔
لکھنو میں ہمارا شاندار استقبال ہوا۔ ہمارے میزبان راجہ امیر حسن ہیں اعلیٰ درجہ کی چار گھوڑوں والی گاڑی میں اپنے گھر تک لیگئے۔ انھوں نے اپنے غریب خانہ کے متعلق بہت کچھ معذرت کی اور کہا کہ میرے محل ایام غدر میں جلا دیے گئے تھے۔ اور انگریزی حکومت نے ان کی عوض میں مجھے یہ مکان دیدیا ہے۔ راجہ نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا کہتے تھے کہ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ یورپین اصحاب کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ اور یہ پہلی ہی دفعہ ہے کہ میں نے کسی انگریز کی مہمانداری کی ہے۔

بر قسمہ کا مطلوا عنصر علی محمد علی آ ... لکھنو سے نکا ہے

۹ر جنوری ۔۔۔

میزبان سے بہت دیر تک دلچسپ گفتگو رہی۔ یہ بڑے کٹر شیعہ ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ شیعوں اور سنیوں میں اصولاً کیا کیا اختلافات ہیں۔ سب سے بڑا اختلاف یہ ہے کہ شیعہ خدائی انصاف کے قائل ہیں۔ وہ نبیوں کو معصوم اور غلطیوں سے مبرا و منزہ سمجھتے ہیں۔ حضرت علیؓ کے دعویٰ خلافت کی پرانی بحث پر انھوں نے شد و مد سے گفتگو کی اور اپنے فرقہ کی بعض عجیب و غریب باتیں بھی بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ سہ سالار جنگ میرے بہت بڑے دوست ہیں، اور میں نے ہی سید حسین کو انکے پاس بھیجا تھا۔

شام کو شہر کی سیر کے لئے گئے، امام باڑہ بھی دیکھا جہاں انھوں نے ایک قبر پر فاتحہ پڑھی۔ انھوں نے غدر کی تاریخ اپنے نقطۂ خیال سے بیان کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے والد باغیوں کے سرگروہ تھے، اور جب قتل عام کے واقعات رونما ہوئے تو وہ نفرت میں باغیوں سے علیحدہ ہو کر اپنے قلعۂ محمود آباد میں چلے گئے، جہاں وہ بیمار ہونے کے بعد انتقال کر گئے۔ میرے بارہ بھائی اور چچا زاد بھائی کچھ تو نشانۂ بندوق بنا دیے گئے، اور کچھ یا تو توپ سے اڑا دیے گئے یا پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ صرف میں بچ گیا۔ اس وقت میری عمر ۱۰ سال کی تھی۔ انگریزوں نے مجھے چھوڑ دیا اور اپنی نگرانی میں تعلیم دی، خاندان کی ساری جائداد ضبطی کے بعد ضائع کر دی گئی، اس لئے کہ انگریزوں نے ہر حصہ شہر کا تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اب سوائے رنج و غم کے مجھے میراث میں کچھ نہیں ملا۔ خوبصورت کھنڈرات کو دیکھکر انھوں نے کہا کہ ہم اپنی تاریخ اور اپنی شان و شوکت کے زمانہ کو بھول گئے ہیں مگر انگریز اسے بھولنا پسند نہیں کرتے۔ وہ ان کھنڈرات کو خونریزی کی یادگار قائم کرنے کے ارادے سے جوں کا توں قائم و برقرار رکھنا چاہتے ہیں اگر میرا بس چلتا تو میں گورنمنٹ کو مشورہ دیتا کہ یا تو انہیں مسمار کر دیا جائے یا از سر نو تعمیر کیا جائے۔

راجہ کی عمر صرف ۴۰ سال کی ہے، مگر بال سفید ہو گئے ہیں اور پچاس برس کے معلوم ہوتے ہیں، انہیں جگر کی شکایت ہے۔ میں نے مشورہ دیا کہ جسم و روح کی بہتری کی خاطر آپ کو کربلائے معظمہ کا سفر کرنا چاہیئے اور انھوں نے میری صلاح پر کاربند ہونیکا وعدہ بھی کر لیا ہے۔ وہ انگریزی سوسائٹی میں نہیں جاتے اس لئے کہ انہیں اس امر سے نفرت ہے کہ ان کے ساتھ برا سلوک کیا جائے۔ افسر لوگ بڑے ظالم ہیں۔ جنرل [illegible] کی نسبت ان کی رائے بہت اعلیٰ تھی اس لئے کہ انھیں کے توسط نے تعلقہ داران اودھ کو غدر کے بعد تباہی سے بچا لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تعلقہ داران کا مجسمہ نصب کروانے والے ہیں۔

۱۰ر جنوری ۔۔۔

چھتر منزل کو دیکھنے کے لئے گئے جسے گورنمنٹ نے شاہزادگان اودھ سے چھین لیا ہے۔ پاؤنیر میں میرے خلاف زہر افشانی کی گئی ہے۔ غالباً یہ مضمون کاتوان کے قلم سے نکلا ہے یا ان کے کہنے سے کسی دوسرے نے لکھ دیا ہے۔ میرے خلاف یہ الزام تراشا گیا ہے کہ میں مدینہ اور دیگر اسلامی مرکزوں میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔ اسی صفحہ پر میری الہ آباد والی اسپیچ بھی چھاپ دی گئی ہے۔

ہم راجہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھکر نکلے۔ وہ کھنڈرات کو دیکھکر بہت غمگین ہوتے تھے۔ شہر میں سے ایک بڑی سڑک غربا کے مکانات کو مسمار کر کے بنائی گئی ہے۔ مشکل سے کسی کو معاوضہ ملا ہوگا اس سڑک کا نام وکٹوریہ اسٹریٹ (Victoria Street) ہے۔

شیعوں کے مجتہد اعظم محمد ابراہیم ملاقات کے لئے آئے۔ وجیہ بزرگ ہیں عربی اچھی بولتے ہیں۔ وہ حیدرآباد میں یونیورسٹی کے قیام کو اس لئے اچھا

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا بہت بڑا کارخانہ ہے

نہیں سمجھتے کہ سنیوں کا مرکز ہے ۔ راجہ تصدق رسول خاں نزدیک ہی کے بڑے ٹیشن پر سے آئے ۔ ہم سے زیادہ ملنے کے لئے نہیں آیا اور نہ چھوٹے آدمیوں میں سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمارے میزبان لائل کی ہدایت پر عمل کر رہے ہیں یہ امر بحث طلب ہے لیکن چارہ کار کچھ نظر نہیں آتا۔

۱۸۔ جنوری :۔۔۔۔۔

حسین آباد کا امام باڑہ دیکھنے کے لئے گئے۔ لکھنؤ میں یقیناً یہ نہایت خوبصورت ہے۔ بڑا امام باڑہ کے مقابلہ میں زیادہ شاندار نہیں یہاں آتے ہی ہم نے اپنے بوٹ اتار لئے جس سے راجہ صاحب بہت خوش ہوئے ہمارے لئے ہار وغیرہ لائے گئے تھے مگر ان کے کہنے سے ہم نے ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ یہ وقف ہے اور چونکہ انگریزوں کے ہار وغیرہ دینے پر صرف کیا جائے وہ گویا اس کا بیجا استعمال ہے جس طریقہ سے روپیہ خورد برد ہو جاتا ہے واقعی حیرت انگیز ہے حال ہی میں گورنمنٹ نے بارہ لاکھ روپیہ کے ترکہ سے ایک گھنٹہ گھر بنایا جو نوم Sir George Couper کی یادگار بنانے کے لئے قائم کیا ہے۔ حالانکہ یہ وہ شخص ہے جس کو لکھنؤ کے مسلمان نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں، یہی وہ باتیں ہیں جن سے حکومت بدنام ہوتی ہے۔

ہم نے راجہ صاحب سے لگان وغیرہ کے متعلق سوال کیا اور انھوں نے کسان، تعلقہ دار اور گورنمنٹ کی حالت یوں بیان کیا۔ مثال کے طور پر ایک کھیت لیجئے جس کی پیداوار ۱۰۰ من ہے کسان اس میں سے ۶۰ من اس میں ۱۵ یا ۲۰ من تخم کے طور پر اور ۴۰ یا ۴۵ اس کے نفع اور محنت کے معاوضہ کے طور پر سمجھنا چاہئے باقی ماندہ چالیس من میں سے گورنمنٹ ۲۰ یا ۲۵ من لے لیتی ہے اور باقی ماندہ ۱۵ یا ۲۰ من تعلقہ دار کے حصہ میں آتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان اعداد کو اوسطاً سمجھنا چاہیے۔

قیصر باغ ہال کا جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ تمام مذہبی عمائدین سنی اور شیعہ موجود تھے کل تعداد تقریباً ۔۔۔ تھی جن میں ایک درجن کے قریب انگریز بھی تھے مجھے تین ایڈریس پیش کئے گئے ان کے جواب میں میں نے ڈیڑھ گھنٹہ تک اسپیچ دی یہ چھپنے والی ہے اس لئے یہاں درج کرنیکی ضرورت نہیں۔ پاؤنیر کے مضمون کے لئے لائل نے معذرت کی اور لکھا ہے کہ کلکتہ کے کسی شخص نے لکھی ہے۔ ساتھ ہی وعدہ کیا ہے کہ میں اپنے صوبہ میں احکام نافذ کر رہا ہوں کہ جہاں جہاں آپ جائیں سرکاری حکام آپ کے ساتھ اچھی طرح سے پیش آئیں۔ مجھے صرف حیدرآباد کی فکر ہے۔ میں لارڈ رپن کو لکھنے والا ہوں کہ میں آؤں یا نہ آؤں۔ رات کی گاڑی سے ہم علی گڑھ پہنچے۔

۱۹۔ جنوری :۔۔۔۔۔

مولوی سمیع اللہ، سید احمد اور بہت سے آدمی ہمیں لینے کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے ہم سمیع اللہ کے مکان میں فروکش ہیں جسے بہترین قسم کے آرائشی ساز و سامان سے آراستہ کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نیاس سے کاربک معلوم ہوتے ہیں۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ علی گڑھ والوں کو کیوں پسند نہیں کیا جاتا خود مجھے بات کرتے ہوئے تکلف معلوم ہوتا ہے کیونکہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آیا انہیں دیندار مسلمان سمجھ کر بات کروں یا جوویٹ (Jesuits) کے پیرو قرار دوں یہ بات نہیں کہ وہ نہایت متواضع اور با اخلاق نہیں ہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی بات بات سے معذرت ٹپکی پڑتی ہے، کہ ہم اتنے کافر نہیں ہیں جتنا کہ آپ سمجھتے ہیں۔

سید احمد سے مل کر مجھے مایوسی ہوئی۔ وہ یقیناً "نیک بزرگ" تو ہیں لیکن میرا دل انہیں معتمد علیہ نہیں بناتا۔ ان کے خد و خال ذرا بھدے ہیں اور

باہم بھی ایسے ہی ہیں اور میں ہرگز متعجب نہ ہوں گا اگر یہ آخر میں بھی غیر مخلص ثابت ہوں۔ لیکن یہ میری پہلی رائے ہے جو انھیں دیکھ کر میں نے قائم کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابھی تک مجھے اتنا موقع نہیں ملا کہ سطحی طور پر بھی میں ان کے بارے میں کچھ رائے قائم کروں۔ ہم کالج دیکھنے کے لئے گئے جو یقیناً حیرت انگیز کام تھا۔ مسلمان لڑکے کرکٹ کھیل رہے تھے وہ بالکل اوسط درجہ کے انگریز لڑکوں کی طرح کھیلتے ہیں۔ اثنا میں کالج کے جدید پرنسپل مسٹر بیک بھی تھے اُن کے رخسار گلابی اور آنکھیں نیلی ہیں وہ بظاہر بہت ہوشیار اور سمجھدار ہیں۔ وہ کامیاب ہو جائیں گے[1]۔

کالج مسٹر وارڈ ([illegible]) اور جج لائل کے علم سے ملنے کے لئے آئے میں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں کی باہمی منافرت کا ذکر کیا۔ کہنے لگے کہ اس کا کچھ علاج نہیں جج بھی اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں جب ہم چائے پینے کے لئے اٹھے تو انھوں نے سمیع اللہ سے جرعۂ شراب پینے کے لئے کہا۔ پھر بعد میں اپنی اس فروگذاشت کی معافی بھی مانگ لی۔

۲۰۔ جنوری ء

جامع مسجد دیکھنے کے لئے گئے امام صاحب بہت اخلاق کے ساتھ ملے مسجد کی مرمت حال ہی میں ختم ہوئی ہے۔ میں نے دیکھا کہ مسجد کے اندر جاتے وقت سمیع اللہ خاں نے جوتیاں نہیں اتاریں۔ مرمت پر ڈیڑھ لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ کل اسپیچ دینے کے متعلق وعدہ لے لیا گیا ہے۔ لیکن کسی پارٹی کو ناراض کئے بغیر تقریر کرنا ناممکن ہے۔

سید احمد کے ساتھ کھانا کھایا جس میں مسلمان اور انگریز دونوں شریک تھے۔ سید احمد نے کہا کہ آپ کی کتاب مستقبل اسلام کے پانچویں باب سے مجھے کلی اتفاق ہے۔

۲۱۔ جنوری ء

دوسرے مقامات کے مقابلہ میں یہاں کا جلسہ ناکامیاب رہا بہت سے قدیم وضع کے مولوی اس لئے نہیں آئے کہ جلسہ سید احمد کی طرف سے کیا گیا تھا لیکن اس پر بھی انھوں نے عربی میں ایک ایڈریس لکھ کر بھیجا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا سید احمد نے بھی میرے لکچر کو پسند کیا یا نہیں۔

اتنا لکھنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میری تقریر اکثر حاضرین نے پسند کی۔ سید احمد اختلاف رائے کے عادی ہو گئے ہیں اور اس لئے امید ہے کہ وہ ناراض نہ ہوئے ہوں گے۔ انھوں نے میری تجاویز پر عملدرآمد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ میں پہلے کی نسبت انہیں اب زیادہ پسند کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ سچے آدمی ہیں، لیکن میرا اُن کے دشمنوں سے ملنا غالباً انہیں پسند نہ ہوگا۔ وہ چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں پنجاب جا رہے ہیں، اکرام اللہ خاں دہلوی بھی اُن کے ساتھ ہوں گے، پاؤ نیر نے لوگوں کو ڈرا دیا ہے اور اکرام اللہ کا خیال ہے کہ آپ کے پیچھے خفیہ کے آدمی لگے رہتے ہیں، میں نے لارڈ ڈفرن کو خط لکھا ہے کہ تخت نشینی کے موقع پر مجھے شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اب یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ کلکتہ کے دفتر خارجہ نے سالار جنگ اور وقار الامرا کو اور شاید نظام کو بھی متنبہ کر دیا ہے کہ وہ ہم سے بہت زیادہ نہ ملیں۔ لیکن لارڈ ڈفرن کی اجازت کے بعد ہمیں پھر کچھ بھی اندیشہ نہ رہیگا۔

رات کو میرے اعزاز میں علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ سید احمد صدر تھے۔ کلکٹر اور دیگر انگریز افسران بھی موجود تھے میں

---

[1] مسٹر بیک یقیناً کامیاب ثابت ہوئے اور مسلمانوں کی جدید نسل پر انکا نہایت زیادہ اثر پڑا۔ چند سال پیشتر ان کے انتقال پر عام طور سے اظہار رنج و غم کیا گیا۔

سید احمد اور مسٹر وارڈ کے بیچ میں بیٹھا۔ موخر الذکر نے مستقبل ہند پر تقریر کی انھوں نے کہا کہ میں ہندوستان میں پارلیمنٹ کا قیام دیکھنا چاہتا ہوں انگریزی پارلیمنٹ سے ماتحت کے مقابلہ میں ہر شے اچھی ہے سید احمد نے اپنی تقریر پڑھی جس میں ہر مجسٹریٹ کو عام تحت تجویز کی گئی تھا اور جسے ہم نے چار بجے کر سنایا، اس کے بعد بہت کچھ وفاداری کا اظہار کیا گیا۔ پھر سید احمد نے بہت اعزاز میں عربی کے چند اشعار پڑھے پھر میں نے جواب دیا۔ میں نے کہا کہ میں ہندوستان میں شورش برپا کرنے کے ارادہ سے نہیں آیا ہوں، بلکہ امن اور ہمدردی کے مقاصد کو ترقی دینے کے خیال سے آیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ انگریز اور ہندوستانی اتحاد و اتفاق سے زندگی بسر کریں، لیکن معاشرتی تعلقات کی پہلی شرط معاشرتی مساوات ہے جلسہ میں سب لوگ سید احمد کے مخالف تھے۔

۲۲ - جنوری ۶۔

صبح کی گاڑی سے ہم دہلی روانہ ہوگئے۔ روانگی سے پیشتر شیعوں کے مجتہد نے ایڈریس پیش کیا یہ مصری علماء کا لباس زیب تن کرتے ہیں۔ اسٹیشن پر ہر شخص موجود تھا۔ سید احمد نے چیرز ہُرّے (نعرۂ مسرت) تجویز کئے مگر مسلمان یہ نعرہ اچھی طرح نہیں لگاتے میں نے سید احمد سے چندہ دینے کا وعدہ کیا۔ (باقی)

ض - ن - ب

اثرؔ دہلوی

شعرائے اردو کے طبقۂ متوسطین میں بڑی بڑی باکمال ہستیاں گذری ہیں، لیکن میر، سودا، درد اور سوز کے سامنے کسی کا رنگ نہ جم سکا، اور وہ گوشۂ گمنامی میں پڑی رہگئیں، انھیں میں سے ایک سید محمد میر اثرؔ بھی تھے۔

سید محمد میر نام تھا اور اثرؔ تخلص، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے چھوٹے بیٹے تھے اور حضرت خواجہ میر دردؔ کے چھوٹے بھائی ان کے والد شاہ گلشن صاحب سے نسبت ارادت رکھتے تھے ان کا خاندان پیری مریدی کے باعث دلی میں نہایت معزز اور معظم تھا۔ گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور چھبیس واسطوں سے حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے آغوش شفقت میں تربیت اور برادر بزرگ کی زیر نگرانی پرورش پائی، اسی زمانہ کے رواج کے مطابق جب سن شعور کو پہونچے تو کتب درسیہ کی تکمیل و تحصیل میں مشغول ہوئے۔ علوم ضروریہ اور مروجہ کی تحصیل خواجہ احمد دہلوی سے کی اور فنون ریاضیہ کی تعلیم بھی انہیں سے پائی، جو مرزا خیر اللہ مہندس کے شاگرد تھے، یہ وہی مرزا خیر اللہ ہیں جن کے اہتمام سے دلی میں محمد شاہی رصد قایم ہوئی تھی، اور زیچ محمد شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے دنیا میں کافی شہرت رکھتے تھے اثرؔ نے نکاتِ علوم و باطن و تصوف جو اس زمانہ میں سینہ بسینہ چلے آتے تھے اپنے برادر بزرگ سے حاصل کئے وہ فن تصوف سے واقف اور علم معرفت سے آگاہ تھے۔

اپنے بڑے بھائی کی بہت عزت کرتے تھے اور ان کے نقش قدم پر چلنا باعث فخر سمجھتے تھے ان کی خوشنودی ان کے لئے سرمایۂ ناز تھی۔

میر صاحب کو شعر گوئی کا شوق ابتدائے سن شعور سے دامنگیر تھا، اسواسطے کتب درسیہ کی تحصیل کے بعد بالکل اسی کی طرف مائل ہوے اپنے بھائی کی شاگردی اختیار کی طبیعت کی موزونی اور آتش بیانی خداداد تھی، حضرت درد کی اصلاح نے اور بھی چمکا دیا جس طرح کلام ظاہری تصنع سے پاک صاف تھا، اسی طرح باطن بھی ریاکاری کے لوث سے منزہ تھا، تصوف کی طرف زیادہ رجحان تھا عشقیہ مضامین کے ساتھ ساتھ اس شعبہ میں بھی خوب خوب جوہر دکھاتے تھے۔ کلام میں نازک کی خیالی سادگی، اور متانت ہے، باوجود معمولی عشقیہ مضامین کے اداکرنے کے بھی متانت اور سنجیدگی کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔

نہایت نیک طینت، پاک صورت اور پاکیزہ سیرت بزرگ تھے، وضع نہایت سادہ اور معمولی تھی، ان کی مجلس ادب آموز اور کاشانہ تہذیب تھی ان کی تقریر نہایت دلکش اور موثر ہوتی تھی، نفسانیت اور سخن پروری سے علیحدہ رہتے تھے۔ ان کا سینہ باصفا کینہ کی آلودگی سے پاک تھا، حق گو اور حق پسند تھے۔ امر حق کو نہایت شکر گزاری سے تسلیم کرتے تھے، اگلے لوگوں کی طرح وضع کے پابند تھے۔ دینداری کی طرح وضعداری کا بیحد پاس و لحاظ تھا سخن گو اور سخن سنج تھے اور محفل مشاعرہ کے دلدادہ تھے۔

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-[1]

"گہر سلک متاخرین اثر از فصحائے نامدار و صلحائے کامگار، خوش اوقات و نیک سیر موسوم محمد میر المتخلص بہ اثرؔ درد یشے"

"ہست موقر و صاحب سخنے است موثر، عالم و فاضل، مرتبہ قدرش بغایت بلند، گوہر صدر نش نہایت ارجمند، برادر خورد خواجہ"

[1] تذکرۂ گلِ رعنا۔

" بیرِ دردؔ دام افضالہ در شرح رسالہ دارد، ادرا مشمار شد و در جمال توجہ خدو متہ بستہ در خدمت برادر بزرگوار خود
" نشینی اختیار کردہ و قدم بر جادۂ بزرگاں خود نہادہ سری برد "

مزاج میں قناعت بہت تھی جب دلی تباہ ہوا تو قتل وغارت کے سبب سے بعض امرا و شرفا گھر اور شہر چھوڑ کر نکل گئے، اور بعض امرا و فقرا نے تلاش روزگار میں ترک وطن کیا۔ لیکن حضرت دردؔ کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، اللہ پر توکل کیا جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اس پر بیٹھے رہے۔ ان کے ساتھ اثرؔ نے بھی دہلی سے باہر قدم رکھنا گوارا نہ کیا، جس طرح بھی ہو سکا اپنی زندگی وطن مالوف میں گذار دی، مرزا علی لطف، تذکرۂ گلشن ہند میں اس واقعہ کو کس عمدگی سے لکھتے ہیں :-

" جس ایام میں معمورہ شاہجہاں آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال ہے اور کثرت متجانِ روزگار عدیم المثال[1] سے رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا تو معمورے ہر شہر کے عرصہ ربع مسکون کا تنگ اور اس خراب آباد کو تشبیہ ہفت اقلیم کے ننگ تھا، جبکہ متواتر نزول آفات کے باعث اور مکرر ورود بلیات کے سبب خراب ہوا، اور ہر ایک بجائے زاویہ گزیں بنے اور ہر ایک تو انگر بالوارثہ، و ہر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور ہو لگے ادہر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وہ سید والا تبار کہ نام نامی اس کا خواجہ میر دردؔ تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہجہاں آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنی کنج عزلت سے نہ گئے "

یہی تھی وہ وضعداری جس کو آخر تک نبھایا۔ تکلیفیں اٹھائیں، مصیبتیں برداشت کیں، خون کی ندیاں بہتے دیکھیں، مال برباد ہوتا دیکھا، لیکن اپنے قدیم مسکن سے ہلنا گوارا نہ کیا، الغرض باوجود دلی کی تباہی و بربادی اور کسب معاش کی دقتوں کے اثرؔ نے دلی ہی میں قیام رکھا اور اپنی وفات تک وہیں زندگی گزار دی۔

حضرت دردؔ کے عالم ضعیفی میں ان کے ایک مرید نے عرض کیا کہ دنیا دار فانی ہے اور حضرت کا وقت آخر، حضور ہدایت فرمائیں کہ آپ کے بعد کس کو جانشین اور صاحب سجادہ مانیں، آپ یہ سن کر آنسو بھر لائے اور جواباً یہ قطعہ پڑھا :

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے	مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں
تاقیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے	دردؔ ہم اپنے عوض چھوڑے اثرؔ جاتے ہیں[2]

بہر حال اثرؔ نے دردؔ کے انتقال کے بعد آبائی سجادہ کو زینت دی اور مدت دراز تک اپنے ظاہری و باطنی کمالوں سے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے، تقویٰ توکل، زہد و قناعت میں یہ کسی طرح اپنے باپ اور بھائی سے پیچھے نہ رہے، تصوف و شاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے وہی ان کا تھا[2] دردؔ و ثنا ان صاحب معنی کی طرح گوشہ نشینی اختیار کی اور دردؔ و اثرؔ کے ساتھ طبیعت نہایت ہموار کی تھی، بھائی سے کمالوں کا کسب کیا، سچ تو یہ ہے کہ ان کا کلام دردؔ و اثرؔ کی چاشنی سے آشنا ہے[3]

لہ خمخانۂ جاوید　ٹہ تذکرۂ گل رعنا　سہ تذکرۂ گلشن ہند

تاریخ وفات صحیح طور پر معلوم نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ آپ نے ۱۲۰۰ھ ہجری سے پہلے عالم بالائی کی طرف کوچ کیا۔ ترکمان دروازہ کے باہر اپنے برادر مہرور حضرت میر درد کے پہلو بہ پہلو والد کے تکیے میں آسودہ ہیں جہاں حضرت شاہ ولی اللہ کے مشہور خانوادہ محدثین کے ارکان بھی ابدی نیند سو رہے ہیں۔

تصنیفات میں ایک چھوٹا سا دیوان غزلوں کا ہے اور ایک مثنوی "خواب و خیال" بہت طولانی عشق کے بیان میں یادگار ہے، مثنوی لاجواب لکھی ہے، دیوان ابھی تک طبع نہیں ہوا، مگر تلاش و جستجو سے مل جاتا ہے۔ لالہ سری رام اپنے تذکرہ خمخانہ جاوید میں لکھتے ہیں کہ ایک قلمی دیوان ان کے ہاں موجود ہے غدر سے پیشتر ان کی مثنوی بہت مشہور اور جا بجا موجود تھی مگر اب وہ بھی عنقا ہے۔

حضرت درد ان کے لئے "آئیڈیل" تھے، وہ ہر طرح ان کی پیروی کرنا اور ان کے نقش قدم پر چلنا مطمح نظر سمجھتے تھے سخن طرازی بھی برادر والا قدر کی روش پر کرتے تھے ان کی چھوٹی چھوٹی بحروں کے اشعار نہایت پر تاثیر اور پرلطف ہوتے ہیں وہ جو کچھ کہتے شگفتہ بحر میں کہتے، جس سے اہل درد کے دل بھر آتے۔ ان کا کلام آورد سے پاک اور آمد سے لبریز ہے، تصنع کا نام نہیں، بناوٹ کا وجود نہیں۔ روزمرہ کے سوا اجنبی الفاظ کا استعمال نہیں، تصوف کے خوب ماہر تھے کلام میں محاورہ کی خوش اسلوبی کا زیادہ خیال رکھتے تھے، سادگی ان کا خاص حصہ ہے۔ سادگی کے یہ معنی ہیں کہ جو لفظ شعر میں استعمال کیا جائے بے تکلف سمجھ میں آجائے، عوام و خواص دونوں اس سے لطف اندوز ہوں، گو ان دونوں کے سمجھنے میں بڑا فرق ہوگا اس لئے کہ عوام اس کا سرسری مطلب سمجھیں گے اور خواص کی نظر اس کے نکات اور دقائق تک پہنچے گی، انہوں نے دور از فہم استعارے اور تشبیہیں استعمال نہیں کیں، اس لئے کہ تلمیحات بھی نہ آنی چاہئیں جن کے سمجھنے سے عوام قاصر رہیں اس نقطہ نظر سے آپ اثر کے کلام کو دیکھ ڈالئے معلوم ہوگا کہ سادگی اور سادہ بیانی کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، بلکہ سادگی کے ساتھ سوز و گداز کو کچھ اس طرح ملا دیا ہے کہ دل کو بے چین کر دیتا ہے، بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ وہ اس بات کا بھی خیال رکھتے تھے کہ کوئی لفظ فصاحت کے خلاف نہ آجائے۔

تخیل کا اعلیٰ ہونا بذات خود ایک خوبی ہے جو معمولی سے معمولی واقعہ پر آب و رنگ چڑھاتا ہے بات سے بات پیدا کر دیتا ہے ادنیٰ سی بات کو اعلیٰ کر دکھاتا ہے اصل سے زیادہ خوشنما منظر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور اصل چیز کے دیکھنے سے وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو تخیل کے ایک معمولی کرشمہ سے پیدا ہوتا ہے، مگر پرواز تخیل میں واقعات سے بالکل بالا بالا گذر کر زمین و آسمان کے قلابے ملانا ایسے دقیق اور پیچیدہ مضمون کا پیدا کرنا جن سے بجائے مسرت کے دماغ کو کاوش اور محنت کرنا پڑے شاعرانہ خوبی نہیں ہے اس لئے کہ "اصلیت اور حقیقت" سب سے زیادہ ضروری شے ہے اگر ان خیالات کو پیش نظر رکھ کر اثر کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اثر اس میں کہاں تک کامیاب ہے، گو مثنوی "خواب و خیال" مفقود ہے تاہم جن لوگوں نے نگاہ غور اور چشم حقیقت سے اس کا مطالعہ کیا تھا ان کی رائے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مثنوی میں مضامین کو جس خوش اسلوبی اور عمدگی سے ادا کیا ہے اور اردو زبان پر جو احسان کیا ہے اس کے لحاظ سے اردو ہمیشہ ان پر ناز کرتی رہیگی،

مثنوی اصناف سخن میں سب سے زیادہ مفید اور بکار آمد صنف ہے۔ طویل اور مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے لئے مثنوی سے بہتر کوئی صنف نہیں ہے اس سے دیگر اصناف اس قدر دشوار نہیں ہیں جس قدر مثنوی، غزل میں شاعر پابند نہیں ہوتا۔ ایک شعر زمین کا ہوتا ہے تو دوسرا آسمان کا چونکہ انہیں باہمی ربط و تسلسل ضروری نہیں دونوں اپنی اپنی جگہ لطف دیتے ہیں مگر مثنوی کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ چونکہ مثنوی میں کسی واقعہ کو بیان کیا جاتا ہے

اس لئے تسلسل کا خیال رکھنا لازمی ہوجاتا ہے۔ مثنوی میں ہر بیت دوسری بیت سے ایسی وابستہ و گرویدہ ہونی چاہیئے کہ اگر کسی بیت کو درمیان سے نکال لیا جائے تو فوراً معلوم ہوجائے کہ یہاں کوئی تعلق رہ گیا ہے، جس طرح کسی لڑی کے موتی آب و تاب میں ایک دوسرے سے مطابق ہوتے ہیں، اسی طرح مطالب کے اعتبار سے ان بیانات میں بھی ایک قسم کا تناسب ہونا چاہیئے، کمال شاعری یہ ہے کہ واقعات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ ہر بات اپنے موقع پر مزہ دیجائے۔ اور تسلسل کہیں ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ شاعر کا کمال جس قدر مثنوی میں ظاہر ہوتا ہے اس قدر کسی اور صنف شاعری میں نہیں معلوم ہوتا ہے مثنوی کو کامیاب بنانے کے لئے شاعر کو حسب ذیل باتوں پر خاص توجہ کرنا لازمی ہے ان میں سے کسی ایک میں جس قدر خامی ہوگی اسی قدر مثنوی کا پایہ معیار سے گرا ہوا متصور ہوگا۔

(۱) تسلسل و روانی
(۲) سادگی
(۳) موافق فطرت و عادت یعنی حال کے موافق ہے۔
(۴) اثر
(۵) رمز و کنایہ

ابتدا میں مثنوی کی فارسی اور اردو میں سات بحریں تھیں، لیکن آج کل شعرا غزل اور قصیدہ کی بحروں میں بھی مثنویاں کہنے لگے ہیں۔ مثنوی کی قدامت پر تمام شعرا متفق ہیں اور ادبی تاریخ کی ورق گردانی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرق اور مغرب کی زبانوں میں مثنوی کی شاعری کی ابتدا ہوئی، قومی کارنامے اور جنگی افسانے بیان کرنے کے لئے مثنوی کو انتخاب کیا اور زمانۂ قدیم ہی میں اس قسم کے واقعات مثنوی کی طرز میں بیان کردیئے گئے، وجہ یہ ہے کہ تمام واقعات اور معاملات کو معانی اور سادگی سے مسلسل دار بیان کرنے میں مثنوی کو جو کمال حاصل ہے اس میں قصیدہ یا غزل اس کی برابری نہیں کرسکتی۔ عجم کی وقائع نگاری کا سہرا اسی کے سر ہے اور یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دیجا سکتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ فارسی زبان میں سب سے پہلے بہرام نے مثنوی کی طرز میں اشعار کہے تھے لیکن اس کی بحر بڑی تھی۔ عہد قدیم سے اب تک فارسی زبان میں جو مثنویاں لکھی گئی ہیں ان میں شاہنامہ اور سکندر نامہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، فارسی زبان نے مثنوی کی صنعت کو معراج کمال پر پہنچا کر اس کے مدارج قائم کئے ہیں پہلے درجہ میں صوفیانہ مثنویاں ہیں جن میں تصوف کے پیچیدہ مضامین حسن و خوبی سے ادا کئے گئے ہیں اور اس صنف کے ہیرو مولانا روم ہیں، مثنوی مولانائے روم مشہور عالم ہے۔ شاید ہی کوئی بدنصیب ایسا ہوگا جس نے اُسے نہ پڑھا ہو اور لطف نہ اٹھایا ہو۔ دلنشیں پیرایہ بیان، خلی سلاست زبان اور پیر تصوف کی چاشنی فوراً ناظر پر اپنا اثر کرتی ہے۔ خصوصاً تصوف کا مشکل مسائل حل کرنے کے لئے جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ انسان کو دریائے حیرت میں غرق کردیتا ہے۔ دوسرے درجہ میں ناصحانہ مثنویاں ہیں جیسے پندنامہ فریدالدین عطار اور بوستان، جو اپنے رنگ کی لاجواب ہیں۔ تیسرے درجہ میں رزمیہ مثنویاں ہیں، جو کافی سے زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔ فردوسی کے بعد ہر عہد کے شعرا نے اس رنگ میں کچھ نہ کچھ لکھا، نظامی کا سکندر نامہ کچھ کم مشہور نہیں ہے لیکن شاہنامہ کی جادو بیانی کو، کوئی رزمیہ مثنوی اب تک نہیں پہنچی۔ اسی لئے عرب اس کو قرآن العجم کہتے ہیں آخری درجہ میں عشقیہ مثنویاں ہیں، اس میں لیلیٰ و مجنوں، شیریں خسرو وغیرہ نہایت مشہور ہیں۔ نظامی گنجوی جدت طراز شاعر تھے، مگر افسوس نے

جس کام کو غیر مکمل چھوڑا تھا اس کو امیر خسرو دہلوی نے پورا کیا، اور مثنوی قرآن السعدین، لکھکر فارسی زبان میں نیچرل شاعری کی طرف توجہ کی۔ غالب نے بھی اس فن میں اپنا کمال دکھلایا ہے اور گیارہ مثنویاں لکھی ہیں۔

چونکہ شعرائے اُردو زبان فارسی کے خوشہ چین ہیں اور انھوں نے زیادہ تر فارسی کی ہی پیروی کی ہے اور انہیں اصنافِ سخن کو اختیار کیا ہے جو فارسی زبان میں رائج تھے، اس لئے اسی تقلید میں اردو شعرا نے اس میدان میں بھی خوب خوب جوہر دکھائے ہیں، لیکن اردو شعرا نے مثنوی کی چوتھی قسم کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔ شروع سے اب تک عشقیہ مثنویاں ہی کثرت سے لکھی گئی ہیں۔

خدائے سخن میر تقی میر نے بھی اس طرف توجہ کی، یہ امر مسلمہ ہے کہ سادہ بیانی میر صاحب کی شاعری کا جزوِ اعظم ہے، "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" میں بھی موجود ہے، اثر دہلوی نے بھی اسی رنگ میں خوب زور دکھایا ہے، پیرایہ دلکش، اور طرزِ بیان موثر و دل نشین ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کی صفائی ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی، محوِ حیرت کر دیتی ہے، میر اثر کی شاعری کے نمایاں جوہر سلاست، روانی اور ندرتِ بیان ہے۔

اثر نے حسن و عشق کی واردات کو نہایت پر درد مگر سادہ طریقہ میں بیان کیا ہے جس سے سننے والا مسحور ہو کر رہ جاتا ہے، مثنوی میں عاشقانہ رنگ اور محاسنِ سخن نمایاں طور پر ظاہر ہیں۔ اُن کی باتوں میں سوز ان کے بیان میں گداز ہے، اُن کی طبیعت میں کوئی ایسی خاص بات پوشیدہ تھی جو حسن و عشق کے احساسات کو ابھارتی رہتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اُن کی مثنوی کے اشعار فوراً دل پر اثر کرتے ہیں۔

میر حسن کی مثنوی بدر منیر نے اپنی مخصوص خوبیوں کی وجہ سے وہ شہرت حاصل کی کہ میر صاحب کی مثنویوں کا رنگ بھی اس کے سامنے نہ جما، لکھنؤ میں "گلزار نسیم" کی تردماغی نے مختصر نویسی کا حق ادا کیا، صنائع و بدائع کے نخل میں نئی کونپلیں نکلیں، اور اس نے لکھنؤ کی شاعری میں چار چاند لگا دیے، مثنوی "خواب و خیال" ندرتِ خیال، بندشِ الفاظ، سلاست بیان اور جدت طرازی کے لحاظ سے مثنوی "بدر منیر" اور گلزار نسیم سے سبقت نہیں لے گئی تو کسی سے کم بھی نہیں ہے۔

مصحفی نے بھی "بحر المحبت" لکھی، مومن خاں مومن نے بھی طبع آزمائی کی، نواب مرزا شوق نے بھی عاشقانہ جذبات کو بہت عمدگی سے مثنوی میں ادا کیا ہے لیکن معیار ذرا گرا ہوا ہے، اور اخلاقی نقطۂ نظر سے پست ہیں، تاہم "زہرِ عشق" اور "بہارِ عشق" بیحد مشہور ہیں۔

دورِ جدید کے شاعر شوق قدوائی مرحوم نے بھی اس رنگ میں خوب کہا اور حدِ کمال کو پہنچا دیا "مثنوی عالمِ خیال" اپنی آپ نظیر ہے۔ جس میں انھوں نے قدیم خصوصیات کلام کو جدید خیال آرائی میں سمو دیا ہے۔ قادر الکلامی اور کہنہ مشقی ایک ایک شعر سے ٹپکتی ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال کو بڑی خوبی سے استعمال کیا ہے۔

ربطِ کلام مثنوی کی جان ہے تسلسل برقرار رہنے کے لئے ہر بیت کو دوسری بیت سے، ہر مصرع کو دوسرے مصرع سے ایسا تعلق ہونا چاہیئے جیسے زنجیر کی ایک کڑی کو دوسرے سے ہوتا ہے اور اس میں مضمون آفرینی و بلند پروازی کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ مطالب ایسی صفائی سے ادا کئے جائیں کہ نظم کی طرزِ بیان نثر سے زیادہ موثر، دلکش اور دلآویز ہو، نیز جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور فوق العادت باتوں پر نہ رکھی جاوے ورنہ وہ صرف لفاظی کا نمونہ ہوگا جو حقیقت سے بہت دور، اور اصلیت سے بالکل بے تعلق ہوگا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس کا اثر سامع کے دل پر نہ ہوگا اور اس کو ایک بے سر و پا واقعہ سمجھکر نظر انداز کر دیگا۔ علاوہ ازیں

مقتضائے حال کے موافق کلام ایزاد کرنا خاص کر قصہ کے بیان میں بہت ضروری ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا۔ بلاغت کا بھید اسی میں چھپا ہوا ہے[1]

یہ ضروری ہے کہ جب کسی قوم یا ملک کا ذکر کیا جائے تو اس کے طرز تمدن، تہذیب، معاشرت اور اس ملک کے باشندوں کے میلان طبع اُن کی دماغی کیفیت اور اُن کی سرت کی باتیں بھی بیان کی جائیں تاکہ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہو جائے کہ جس ملک یا قوم کا ذکر کیا جا رہا ہے اور اس ملک کی تہذیب اور تمدن کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ ساتھ ہی حسن و عشق کی داستان سے لطف اُٹھانے اور سوز و گداز، رنج و ملال کا ذکر دلوں پر اثر کرے۔

ہندوستان کے گمنام شاعر میر اثر کو یہ افتخار حاصل ہے کہ وہ شاعرانہ خوبی بیان، واقعات و عمدگی اور خوش اسلوبی سے بیان کرنے میں کمال رکھتا تھا بعض کے قول کے مطابق اردو یا ریختہ میں سب سے پہلے مثنوی کی طرف انھیں نے توجہ کی[2] در اصل عمدگی سے اپنا فرض انجام دیا۔ ان کی مثنوی بعد امتداد زمانہ بھی اپنی آپ مثیل ہے۔ اثر نہ صرف جذبات انسانی کو بیان کرنے میں قادر تھے بلکہ ان کو جامہ بھی ایسا پہناتے تھے کہ نہایت مناسب اور موزوں ہوتا ہے، اور پھر اُس پر محاورہ کی چاشنی دو آتشہ کا کام دیتی ہے۔

لالہ سری رام خمخانۂ جاوید میں میر حسن کے بیان میں لکھتے ہیں "اردو زبان میں صرف ایک ہی مثنوی لکھی گئی ہے جس کو "سحر البیان" کا نام دیا جا سکتا ہے، اور جو فی الواقع منصف مزاج مبصروں کے نزدیک اسی تعریف کی مستحق ہے، فی الواقع قبول عام کی جو سند سحر البیان اور گلزار نسیم کو ملی ہے وہ آج تک کسی تیسری مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔"

ہماری رائے میں لالہ صاحب کا یہ فیصلہ صداقت پر مبنی نہیں ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ واقعات سے دانستہ چشم پوشی کی گئی ہے۔ کون ایسا اردو داں شخص ہے جس نے مرزا شوق اور اُن کی مثنوی "زہر عشق" "بہار عشق" کا نام نہیں سنا۔ مقبولیت اور قبول عام کی جو سند اس کو ملی ہے کوئی دوسری مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چار دانگ عالم میں شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ہم پڑھنے والوں [illegible] حقیقت انھوں نے پڑھ ہوا کہ [illegible] اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم سحر البیان، گلزار نسیم کی قدر و منزلت کے ماننے سے انکار کریں، بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے تو ان کو مرزا شوق کی مثنویوں پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔ لیکن عشقیہ واقعات جس دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں اس لحاظ سے مرزا شوق کی مثنویاں کسی طرح مذکورہ بالا دو مثنویوں سے کم درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ لالہ صاحب نے اس کا بھی ذکر نہ کیا اور اس طرح تعریف و توصیف میں اس شخص کو بھی فراموش کر دیا جس کی نسبت نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے:-

"مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است و ازیں جہت مرغوب عام۔"

مولانا محمد حسین آزاد آب حیات میں صرف حضرت میر درد کے بیان میں اثر کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ایک مثنوی خواب و خیال اُن کی مشہور ہے اور بہت اچھی ہے۔"

نیز ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ اس میں اردو زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجہ کمال موجود ہے۔

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری مؤلفہ مولانا حالی مرحوم؛

[2] مولوی عبدالحق صاحب تحریر فرماتے ہیں "یہ مثنوی اُس زمانہ میں لکھی گئی جب کہ اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی"

میر اثر کا ایک شعر بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے۔

میر اثر

باتھا پائی میں ہانپتے جانا گھٹتے جانے میں ڈھانپتے جانا

مرزا شوق

باتھا پائی میں ہانپتے جانا چھوٹے کپڑے کو ڈھانپتے جانا

حالانکہ ان دونوں اشعار میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے ایک تو پردے ہی پردے میں خدا جانے کیا کچھ کہدیا، اور دوسرے نے عامیانہ رنگ میں ظاہر کیا۔ اب اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا میر اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد مرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گذری ہے، اور پھر اس طرز کا اثر ضرور ان پر پڑا ہوگا۔

مولنا حالی مرحوم تحریر فرماتے ہیں۔

"خواب و خیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے سے تفاوت سے بہارِ عشق میں موجود ہیں"

مولانا سید عبد الحئی صاحب مرحوم تذکرۂ گل رعنا لکھتے ہیں :۔

"تصنیفات میں ایک دیوان غزلوں کا ہے، ایک مثنوی جو اپنے رنگ کی اردو میں پہلی مثنوی ہے اس کا نام خواب و خیال" ہے"

مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے (علیگ) ایڈیٹر رسالہ اردو مقدمہ گلشن ہند میں لکھتے ہیں :۔

"یہ مثنوی اس زمانہ میں لکھی گئی جب اردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی"

ہم اب اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے کہ واقعی اثر سے پہلے بھی کسی نے مثنوی لکھی ہے یا نہیں تاہم اس بات کا اظہار نہ کرنا صداقت اور حق کا خون کرنا ہوگا۔ اسلئے شعرائے دکن نے بھی اس صنف میں اپنے طبع کے جوہر دکھائے ہیں چنانچہ مولوی عبد الحق صاحب کے حال کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ نصرتی، اور غواصی وغیرہ وغیرہ نے جو مثنویاں لکھی ہیں لیکن قدیم زبان میں ہیں یعنی زبان وہی ہے جو عہد اولین میں دکن میں رائج تھی۔

اس سے قبل کے صفحات میں ہم نے اس پر کافی بحث کی ہے کہ مثنوی کون کن صفات سے معمور ہوا چاہیئے۔ اب ہم میر اثر کی مثنوی خواب و خیال کے چند اشعار جنہیں عام تذکرہ نویسوں نے درج کیا ہے نقل کرتے ہیں، سخت افسوس ہے کہ تذکرہ نویسوں نے مثنوی کی دوسری خوبیوں کو نظر انداز کرکے صرف سراپا کے اشعار کا انتخاب کیا ہے اور دوسرے اشعار کو چھوڑ دیا ہے، مگر میر اثر کے تخیل سے لطف اندوز ہونے کے لئے یہ سراپا کے اشعار بھی بہت کافی ہیں ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں کہ معاصرین میں ان کا کیا درجہ تھا۔

سراپا پر ایک مثنوی نگار نے نہایت شد و مد کیساتھ لکھا ہے اور حق یہ ہے کہ ہر ایک نے اپنے اپنے انداز میں خوب لکھا ہے مگر اثر نے جو بات پیدا کی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ناک کی تعریف یوں تو سبھی نے کی ہے مگر یہ بھی ملاحظہ ہو :۔

ناک تیری عجب کچیلی ہے پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے

ناک ہے یا کہ ایک توتا ہے چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے

پہلے شعر میں ناک کے کچیلے پن کو، اونچی اور نکیلی ہونے سے کس عمدہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے اور پھر توتے کی مثال دیکر چونچ کو شہد میں ڈبویا ہے گو شعرائے

---

۵۰ مقدمہ گلشن ہند از مولوی عبد الحق صاحب بی۔ اے۔

تھنے کی چونچ کو، نمک حنا، رنگ خون وغیرہ سے تشبیہ دی ہے مگر یہ لطافت اثر ہی کا حصہ تھی۔ اسی مضمون کو مرزا شوق نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے

ناک میں تیم کا نقطہ تھا۔　　　شوخی، چالاکی، مقتضا سن کا

مگر افسوس ہے کہ وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو میر اثر نے پیدا کی، پہلے شعر میں ناک کا سجیلا پن اور اس کا ادنیٰ اور نکیلی ہونا ظاہر کیا ہے، دوسرے شعر میں بتلایا ہے کہ یہ ناک نہیں ہے بلکہ ایک توتا ہے جس نے اپنی چونچ شہد میں ڈبوئی ہے، بخلاف اس کے مرزا شوق نے فقط ناک میں تیم کا نکتہ ڈبوا کر شوخی اور چالاکی مقتضائے سن بتلایا ہے، گویا ناک شوخی اور چالاکی کی تصویر ہے، الغرض دوسرے مصرع کو پہلے مصرع سے کوئی ربط نہیں ہے۔ تھنے کو ہر ایک نے پھڑکتے ہیں اور ہر ایک نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق تشبیہ دی ہے مگر

تھنے ایسے تیرے پھڑکتے ہیں　　　جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں

معشوق کے لئے وحشی ہونا چاہیئے چنانچہ مضمون کی بے ترتیب پھڑک کو وحشی جانوروں کے پھڑکنے سے کیا مربوط المثال تمثیل دی ہے۔

شعرانے سراپا میں لبوں کو برگ گل، ورق گل، وغیرہ وغیرہ کہا ہے۔ مگر لبوں کے ذائقہ کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی

ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں　　　شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں

دانت ہر ایک شاعر کے لئے مایۂ ناز مضمون ہے، مگر اثر کہتے ہیں:-

دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں　　　دل کلیجہ سب ہی چباتے ہیں

مرزا شوق نے بھی خاص لوچ اور نزاکت پیدا کی ہے، ملاحظہ ہو:-

لب وہ نازک کہ جان دیجئے　　　دہن ایسا کہ پیار کر لیجئے

آج تک کسی نے آنکھوں کو موتی سے تشبیہ نہیں دی مگر اثر کہتے ہیں:-

دیکھکر آنکھیں آبدار کو یاں　　　لوٹ جاتا ہے گوہر غلطاں

اس میں شک نہیں کہ میر صاحب کا تخیل اچھوتا ہے، لیکن مرزا شوق نے بھی اس خیال کو نہایت عمدگی سے باندھا، چنانچہ فرماتے ہیں

ہنس کے جس سمت آنکھ پھرتی ہے　　　جان عاشق پہ برق گرتی ہے

گر کبھو اُن کے جی میں آوے ہے　　　مسی دو انگلیاں لگاوے ہے

دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے　　　رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے

مگر مرزا شوق نے سراپا میں مسی کو لازمی قرار نہیں دیا اور ان کے ہاں بغیر مسی کے دانت رشک گہر ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں

بے مسی کے وہ دانت رشک گہر　　　جان عاشق نثار ہو جس پر

اثر گردن کی تعریف میں لکھتے ہیں

جب خیال آ بندھے ہے گردن کا　　　یاں ڈھلک جائے ہے پیالہ منکا

جسم کا حسن بیان کرتے ہیں:-

گو کہ تنقاف ہے تن مینا | یاں تو جھکتی ہے گردن مینا
کیوں نہ کھینچے وہ بے آب تو دور | جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور

سراپا کا آخری شعر ہے ؎

گیا جوش آئندہ یہ کلائی ہے | اس کو دل سینے کی کل آئی ہے

اثر کی مثنوی کا ایک اور شعر ہے

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا | آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا

اب ہم دیوان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ خواجہ میر درد کے کلام میں اثر بدرجہ غایت موجود ہے، اور بڑی حد تک اپنے بھائی میر درد کا رنگ انھوں نے پیدا کیا ہے جس کا ثبوت آئندہ اشعار سے مل سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

بس رفع اب خیال مے و جام ہو گیا | ساقی بیک نگاہ مرا کام ہو گیا
جینے نہیں تو کام نہ تھا کچھ تو ہے آہ | پر دل کے ساتھ مفت میں نام ہو گیا

بیک گردش چشم، خیال مے و جام کا رفع ہو جانا پامال مضمون سہی لیکن انداز بیان نے اس میں ندرت پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں دل کی مجبوری کو نہایت اچھے اسلوب سے ظاہر کیا ہے۔ ایک غزل ہے:

ہم ہیں بے دل، دل اپنے پاس نہیں | آہ اس کا بھی تجھکو پاس نہیں
پوچھ مت حال دل مرا مجھ سے | مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر | مجھکو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدائی خدا کی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

مقطع میں زبان و محاورہ کا لطف ملاحظہ ہو۔

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں | پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
درد دل چھوڑ جائیے سو کہاں | اپنے باہر تو یاں گزر ہی نہیں
تیری امید چھٹ نہیں سکتی | تیرے در کے سوائے در ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھیے مجھ سے | بات میری تو معتبر ہی نہیں

کر دیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

ان سب نے مل کر اشعار میں خاص زور پیدا کر دیا۔

کون وہ ہے کہ خیر خواہی سے — حال میرا تجھے سناویگا
دیکھ سمجھ یہ انتظے میرا — ایک دن تجھکو کھینچ لاویگا
یاد رکھنا، بھلا نہ دل ہو بہتر — پھر کبھو تو خدا ملا دے گا
اثر اب تو ملے ہے تو اُس سے
پر یہ ملنا مزا دکھاویگا

ایک اور مختصر بحر کی غزل ہے:-

نالہ کرنا کہ آہ کرنا — دل میں اثر اسکے راہ کرنا
تیرا وہ جور میرا یہ صبر — انصاف سے ٹک نگاہ کرنا
کیا لطف ہے لیکے دل مکرنا — اور اُلٹے مجھے گواہ کرنا
جی اب کے بچا خدا کر — پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

کبھی بحر طویل میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں، مثلاً ؎

کہوں کیا، دل اڑانیکا ترا کچھ ڈھب نرالا تھا — وگرنہ ہر طرح سے اب تلک تو میں سنبھالا تھا
ہوا آوارہ وہ دشت و بیاباں دیکھیے اپنے — وہ طفلِ اشک جو الفت سے آنکھوں بیچ پالا تھا

خاک نشینانِ محبت کی ثابت قدمی کس عمدہ پیرایہ میں دکھائی گئی ہے، آئے دن نزولِ آفات ہے، طوفانِ حیات الگ ستم ڈھا رہا ہے، حوادثِ روزگار نے الگ پریشان کر رکھا ہے، لیکن عاشق نا شاد ان سب کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

یہ خاک نشیں تیرے سر راہ جو بیٹھا — اب نفع کی امید نہ ہے خوف ضرر کا

ایک شعر ملاحظہ ہو:-

پہلے سو بار اِدھر اُدھر دیکھا — جب تجھے ڈر کے ایک نظر دیکھا

اس مضمون کو اس عمدگی کے ساتھ ادا کرنا مشکل تھا۔ زود رنج اور نازک مزاج معشوق کی حالت کے ظاہر کرنے کے لئے اس سے عمدہ الفاظ نہیں مل سکتے۔
قسمت کا رونا ہر شخص رو رہا ہے، مگر اثر کی قسمت سب سے انوکھی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں ؎

غم ہی دکھلاتی ہے صد قسمت — واہ اپنی بھی ہے کیا قسمت
جسکی خاطر سبھی ہوئے دشمن — نہ ہوا دوست وہ ہی یا قسمت

یہ دو شعر بالکل خواجہ میر درد کے نظر آتے ہیں ؎

تو ہی بتا نہ گی یوں نہیں بات کس طرح — بالفرض دن کٹا پہ کٹے رات کس طرح

شب زندہ دار ہوں اثر مردہ دل ہجوم درد   مانوں نہ پیر تیری کرامات کس طرح

بیکسی کی تصویر اس سے زیادہ پر اثر شاید ہی کوئی اور کھینچ سکے ؎

اس بیکسی میں آہ مرا تو نہیں کوئی ،   دل ایک ہے سو اور کے پہلو میں نہیں
آہ و فغاں یہی ہے کہ سنتا نہیں کوئی   فریاد ہے یہی کہ کوئی فریاد رس نہیں

یہ مختصر سی غزل بھی کس قدر پردرد اور پرکیف ہے ؎

تجھ سے نہ تھا جو کچھ کہ گماں سو یقین ہوا   جو تجھ سے تھا یقیں سو اب اسکا گماں نہیں
مر تو چلے کہاں تھیں اب ہر گذر کریں   یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں ،
وابستہ سب یہ اپنے ہی دم سے ہے کائنات   گو ہو جہاں پہ آپ نہیں تو جہاں نہیں ،

دل کے ہاتھوں یوں تو کئی وقت اظہار بیزاری کیا ہے، مگر یہ پیرایہ بیان ملاحظہ ہو ؎

نہ لگا لے گئے جہاں دل کو   آہ لیجائیے کہاں دل کو
یوں تو کیا بات ہے تیری لیکن   وہ نہ نکلا جو تھا گماں دل کو
رکھ نہ تو اب دریغ نیم نگاہ   مار مت دیکھ نیم جاں دل کو

یہ معافی کا طریقہ بھی انوکھا ہے، کہ خود اپنی تقصیر نہیں مانتے لیکن معافی چاہتے ہیں ؎

بےگناہوں سے دلکو صاف کرو   نہیں تقصیر پر معاف کرو

دو غزلیں اور ملاحظہ ہوں:-

دل اپنا پڑا اس بت بے مہر کے پالے   دشمن کو بھی جس سے کہ خدا کام نہ ڈالے
ساقی مئے جلوہ سے انھیں کیجئے معمور   ہیں خالی پڑے مثل حباب آنکھوں کے پیالے
سب حیلے حوالے سے تمھارے ہو نہیں واقف   مت آسیے پر دل تو مرا کیجے حوالے

تو مری جان گر نہیں آتی   زیست ہوتی نظر نہیں آتی
دلربائی و دلبری تجھکو ،   گو کہ آتی ہے پر نہیں آتی
کیجئے نامہربانی ہی آ کر   مہربانی اگر نہیں آتی
حال دل مثل شمع روشن ہے   تو مجھے بات کر نہیں آتی
نہیں معلوم دل پہ کیا گزری   ان دنوں کچھ خبر نہیں آتی
دن کٹا جس طرح کٹا لیکن   رات کٹتی نظر نہیں آتی

ظاہرا کچھ سوائے مہر و وفا
بات تجھکو اثر نہیں آتی ،

عبدالمنعم سعیدی بی اے علیگ.

درآں حالتے را پیدا کردہ و ہیچ گوشہ نیست کہ آہنگ جاں پرورش بروں نخزیدہ۔

یک اسباب فوق العادتے کہ جہت مقبولیتش گردیدہ ایں ہم است کہ عارف موسیقی داں ہم میباشد و تصانیف خودش را اکثر بہاکر برائے او نمائش میدہند بطرز خوبے میخوانند۔ بندہ عبارت حضرت شفق را در باب اسباب عارف برائے خوانندہ محترم ذیلا درج می نمایم

"گماں می کنم ہمیں دو صفت سادگی و شیرینی اغلب اشعار عارف را توجیہ می نماید چون از کلمات ثقیلہ و ترکیب ہائے مخصوص عربی و کنایہ ہائے بے نمک عاری بودہ و بسیار سلیس و گوش نواز و آہنگ دارند۔ شاید استعداد موسیقی عارف در انتخاب کلمات تاثیر زیادے داشتہ باشد زیرا اغلب غزلہایش مانند بلور صاف صاف تراشیدہ و تواتر کلمات مانند آب صاف بیرون و آہنگ دارنے تغنیش مثل نشید مرغان بہار خوش آیند است۔ البتہ بعض بازی الفاظ و تلفظ و جناس ہائے مستعمل پوشیدہ در اشعار وے دیدہ می شوند۔ وے اینہا اشعارے ہستند کہ عارف در آنہا از خود در آمدہ تابع و مقلد گذشتگان است۔ از اغلب اشعار عارف صدائے حافظ و رائحہ سعدی می آید و یقین دارم ایں دو شاعر شہیر را بیشتر خواندہ و شاید روح اشعار را از منابع الہام ایں دو پیر ادب گرفتہ باشد وے اشعار سادہ و دلچسپ او کہ در فوق ذکر شد مال حلال خود عارف است۔ مقصود ازیں تقلید نیز ہرگز ایں نیست کہ اشعار عارف جز و تقلید ہائے خام بے نمک قرار دادہ باشیم ہرگز! یک مطالعہ بے طرف ایں اشعار نشان خواہد داد کہ عارف در پیدا نمودن مضمون و ادائے مطلب حتی در شعرہائیکہ شبیہ باشعار سلف اند و امثال آں معنی و عبارت در گذشتہ زیاد آمدہ است باندازہ توضیح و تصرف و استقلال نشان میدہد کہ آدمی را اصلا در استعمال کلمہ تقلید متحیر و متردد می سازد۔ بایں ہمہ عارف ہرگز از تاثیر محیط ادبی خود آزادہ نیست او نیز مانند مرشدش سعدی و پیرش حافظ خرقہ را بہ یک جام وام میسکند۔ خودش در کوی خرابات و دیر مغان دلش ہمیشہ در سر زلف بتان جا میگیرد و حتی گاہے طرہ بجایہ رخ می انداز زلف را با "ضحاک" مارے ابروان را با کمان دارے و تیر ہائے مژگان را با مردم آزارے یاد می نماید۔"

در جائے دیگرے نوشتہ "کسانیکہ در کنسرتہائے عارف شرکت داشتہ و اشعار دلدوز او را بہ نغمہ سوز و موثر او شنیدہ و ہیجان و رقت و تاثیر مستمعین را دیدہ اند می توانند پایہ تاثیر ایں شاعر شور انگیز ایران را بہتر بسنجند۔ عارف در انتخاب کلمات و صفات مہارت مخصوصی نشان میدہد و در مطالعہ تمام اشعارش نادر آنہا تعبیرات غلیظ و ناہنجار تصادف میگردد۔ اشعارش تماما روان و خوش آہنگ و سلیس و شیوہ دار است۔"

درباب حسیات متجددانش می نویسد۔ "عارف اگر ہم بواسطہ عدم الفت با ادبیات و حسیات مغرب زمین نتوانستہ یک جریان تجدد ادبی ایران نمودہ است یقیناً دراں وادی قدمہائے اولین را برداشتہ است و مخصوصاً خیالات تازہ انقلابی و آزادی خواہی ایران را در بہترین اسلوبے و باتاثیر ترین کلمہ ہا ادا نمودہ و ازیں رو بے مبالغہ شاعر ملی و رسمی دور مشروطہ ایران گردیدہ۔"

عبارت حضرت شفق کہ در فوق درج شدہ علاوہ تبصرہ بر کلام عارف ذوق ادبیت ایرانیان عصری را نشان میدہد۔ تا اندازہ کہ معلوم بندہ گردیدہ دریں روزہا یک کشاکش ادبی فوق العادتے بین ادب خواہان ایرانی رخ دادہ، بعضے ہا کہ دلدادہ و صنعیات قدیم میباشند جز مضامین خیالات پوسیدہ "زلف و کمر" کہ از جذبات سطحی عشق و عاشقی علاقہ دارد حرفے نمی زنند۔ وے دیگران بجو حسیات را ابداً ترک گفتہ شعر را برائے تظاہرات مطالب اقتصادی و پالیٹیکی بکار می برند۔ وے جنبہ سومی کہ از قبیل حضرت ..... عارف میباشد واقعات اقتصادی و پالیٹیکی را با اسلوب سادہ

و شیرین دوره حسیات طبیعی عشق ادا می نماید و نجابانی بنده همین قبیل شعرا میباشند که در آینده خرابات ادبیات پارسی را استیلا می نمایند۔
اگرچه مطالب خشک پلیتیکی هم موقتاً در اوایل یک نوع لذتے میباشند ولے چونکه نظریات انسان درین خصوص همیشه رو به تبدیل و تغییر میباشد لهذا لذت شعر هم کمتر حیاتش بوده بعد ازینها آن کم کم محو میگردد۔ اکنون که غلغلهٔ پلیتیکی از دلهاے ایرانیها تا اندازه محو شده و صداے قلقل توسے نسیم شمال هیچ لذتے را ندارد ولے جذبات عشق که یک نوع قابلیتے از احساسات بین المللی انسانی میدارد بجاے خودش میماند و تا هنگامه که انسان داراے یک قلب حساسے میباشد این جذبه هم بخودانه از اعماق روحش سرزده براے تجزیه شدن حسیات عشق و عاشقی را تلاش میکند امثال عارف ایران قبیل شعراے لاهوت است که نغمات پر شورش را هیچ نوع انقلاب ادبی نمی تواند از لوح دلهاے مردم محو گرداند۔
درذیل بعضے از اشعارش را که خیلے شیرین و آهنگ دار است براے خواننده درج می نمایم

نشانهٔ شیفتگی و آوارگی نشان من است — درین ره آنچه که بے قیمت است جان من است
الہی آنکه نشود به تجاب خراب — اسیر من شده جان تن حجاب جان من است
هر امتحان که از آن سخت تر بوادی عشق — تصورش نه توان کرد امتحان من است
من آنقدر شده ام بد گمان ز خلق بنیا — که هر چه سے به حقیقت بد گمان من است

بسوخت سینه ندیدم اثر ز آه سحر — ز من گذشت کسے بعد ازین دعا نکند

خرقهٔ من به یکے جام کسے وا نکرد — من ازین خرقهٔ تهمت زده بیزار شدم
سرم از زانوے من راست نگردد چه کنم — حالی چند لیست که سرگرم بدین کار شدم

بریز خونم و اندیشه از حساب مکن — بحشر دیدن روے تو خونبهاے من است

خم دو طرهٔ طرار یار یکدله ببیں — بپاے دل ز خمش صد هزار سلسله بیں
اگر اثر نکند آه دل مپرس چرا — میان آه و اثر صد هزار مرحله بیں

خرقه از زهد بسوزان و بجز دیباش — جامه هیچ به از جامهٔ عریانی نیست

پیش ازاین که جهان گل نکند دیدهٔ من — مشت خاکے ز غم یار بسر باید کرد

عارفا گوشۂ غفلت مدہ از دست کہ دگر — از ہمہ خلق جہاں صرف نظر باید کرد

لباس مرگ باندام عاطلے زیباست — چہ شد کہ کوتہ و زشت این قبا بقامت ماست
بیار بادہ کہ تا راہ عیسی گیرم — من از دوام آخر بقای من بفناست

گویند گریہ عقدۂ دل باز میکند — خون گریہ میکنم دل من وا نمی شود

از بسکہ غم کشید مرا سر بزیر پر — خو شد ز عاشقی شدہ کنج قفس مرا
پرسد طبیب درد دلم را چہ گویمش — چون نیست اہل درد دہین درد بس مرا

ہزار عقدہ ز دل اے سرشک وا کردی — بیا بیا کہ چہ خوش آمدی صفا کردی
تو درس عشق ز بس دادیم بمکتب عشق — مرا ز وصل چو طفل گریز پا کردی
برو کہ جغد نشیند بخانہ ات ای شیخ — چہ خانہ ہا کہ تو محتاج بوریا کردی

گفتم حساب جام شماری بدست کیست — ساقی جواب گفت چہ پرسی ز حد گزشت
ہر کردہ را بگوشۂ کہ بدار تو تا بہ — اے بی خبر ہاند ز ناخوب و بد گزشت

گدائے عشقم و سلطان عشق شاہ من است — بحسن عزت عشقم خدا گواہ من است

بعہد داد سر زلف خود بباد صبا — چنانکہ با من ہستی بباد دادہ نکرد

این قدر از نمونۂ طبعش کہ حاکی از حسیات حسن و عشق می باشد کفایت می کند و ہم در ذیل چند اشعار وطنی را کہ در سرود حب وطن خواہی سرودہ درج می نمایم

منم کہ در وطن خویشتنم غریبم و زین — غریبتر کہ ہم از من غریب تر وطن است

درین دیار چہ خاکے بسر توانم کرد — بہر کجا کہ روم اوفتادہ در

چو گشت محرم بیگانہ پردہ گور — کفن بیار کہ نامحرم است پیراہنم

بحرف غیر چو دیدند نفع خویش ازان — جماعتی رگ یک ملتی بخواب زدند
خدائے رو بہ مصدر را خراب کند — بملک دست خرابی ازین خراب زدند
وکیل مجلس جمعی کہ مغزشان خشک است — زبس بہ راس بر فرق ہم کتاب زدند

من باد صبح تو ای کشور بے صاحب — نکنم گریہ بس اگر بہ نجندم چہ کنم

قحط الرجال گشت در ایران کہ از ازل — گوی کہ ہیچ مرد درین دودمان نبود
ہر اجنبی برین ایرانی آنچنان — در داستان کہ بہتر ازین امتحان نبود
تمیز اجنبی و خائن و بیگانہ مجرمی — در داستان شاہ و ملک پاسبان نبود
ایرانیان بروز نکار غیبہ دچہ داشت اگر — مفتی دریغ نفت خور در وقعہ خوان نبود
زین سی کرور نامہ ادلا یک نفر — عارف کہ بشکل تو بے خانمان نبود

ہادی مچھلی شہری

تاج بدترین عمارت ہے

بمبئی کرانیکل کے ہفتہ وار ایڈیشن نے انگریزی رسالہ "دی فیشن ایبل نیو" سے مسٹر آلڈس ہکسلے کے خیالات تاج محل کے متعلق نقل کئے ہیں، جو بالکل جدید ہیں۔ مسٹر آلڈس ہکسلے نہایت اچھے ادیب ہیں، اور مشرق کے تاثرات سفر کو انھوں نے بالکل ایک نئے اور لطیف انداز میں قلم بند کیا ہے۔ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے موجودہ تعلقات کا جہاں انھوں نے تذکرہ کیا ہے، وہاں بڑی ہوش مندی، فراخدلی اور بے تعصبی کا پورا ثبوت دیا ہے، لیکن تاج محل کے متعلق ان کے خیالات بالکل نرالے ہیں اور گو اس کی مسلمہ حیثیت بے نظیر حسن اور لاجواب کمال فن ہے، انھوں نے جو نقائص نکالے ہیں ان کی طرف اب تک کسی کے ذہن کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ اور تو انھوں نے اس کے مقبول عام ہونے سے بحث کی ہے اور اس کا سبب اسراف پرستی اور نظر فریبی کو قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"سرو کے تاریک درختوں کے درمیان مقابل تاج کا سفید رنگ اس میں شک نہیں کہ نہایت نظر فریب معلوم ہوتا ہے۔ دراصل اس کی قیمت تو ضرب المثل ہے اس کے مرمریں پتھروں پر جو نقوش بنائے گئے ہیں ان میں قیمتی پتھر پیوست کئے گئے ہیں اور چھوٹے سے چھوٹا گلاب بنانے کے لئے بھی بیس بیس مختلف قسم کے بیش قیمت پتھر جڑے گئے ہیں اس لحاظ سے جدید پروشلم بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ تاج کا اس ناقابل اعتبار حد تک بیش قیمت ہونا بہت سے لوگوں کے لئے قابل قدر ہے، لیکن جو لوگ حقیقت سے آشنا ہیں وہ جانتے ہیں کہ تاج اس قدر بیش قیمت چیز نہیں ہے جس قدر اُسے ظاہر کیا جاتا ہے اور اس کا سنگ مرمر صرف سستی کاریگری کا پردہ پوش ہے۔ پوری عمارت ٹھوس سنگ مرمر کی بنی ہوئی نہیں ہے"

مسٹر آلڈس کے نزدیک تاج میں مندرجہ ذیل نقائص پائے جاتے ہیں:۔

"فن عمارت کے لحاظ سے تاج کی بدترین خصوصیت اس کے مینارے ہیں۔ انسانی ہاتھوں نے کبھی ان چار پتلے گاؤدم مناروں سے زیادہ بدنما (جو اس چبوترہ کے چاروں کونوں پر قائم ہیں جس پر کہ تاج بنایا گیا ہے) کوئی عمارت تعمیر نہیں کی معماران کے متعلق متعدد عذرات پیش کر سکتا ہے مثلاً وہ کہہ سکتا ہے کہ اصل عمارت اور چبوترہ کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے ان ضمنی تعمیروں کو اس سے زیادہ وسعت دینا ناممکن تھا۔ یہ صحیح ہے کہ فن عمارت کے نقطۂ نظر سے اس محدود جگہ میں چار نیچی عمارتیں بنانی ضروری تھیں، لیکن ان کو مقابلۃً وسیع ہونا چاہئے تھا؛ مگر بدقسمتی سے مذہبی ضروریات نے موجودہ جگہ میں میناروں کی تعمیر ناگزیر کر دی تھی۔ جگہ کم تھی اس لئے میناروں کا اپنی لمبائی کے مقابلہ میں غیر واجب حد تک پتلا ہونا لابد تھا۔

جہاں تک ان عذرات کی رسائی ہے یہ قابل سماعت ہیں۔ مذہبی قوانین کی پابندی میناروں کا وجود چاہتی تھی اور قوانین تناسب اس بات کے خواہشمند تھے کہ میناروں کو حیثیت سے زیادہ پتلا ہونا چاہئے۔ لیکن اس کی کیا ضرورت تھی کہ وہ رفتہ رفتہ پتلے ہوتے جائیں۔ اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایسے پتھر کے

بڑے بڑے ٹکڑوں کو منتخب کیا جائے جن کے کنارے سیاہ تھے؟ اس کے علاوہ اس کی کیا ضرورت تھی کہ موٹے، بھدے برآمدے میناروں کے چاروں طرف نکال دیے جائیں؟ اور یہ نکالے بھی گئے تھے تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ایک دوسرے سے غلط فاصلے پر نکالے جاتے، خود تاج میں اس قسم کے معائب پائے جاتے ہیں جیسے کہ میناروں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس کا حسن، ایک بے کیف اور منفی قسم کا حسن ہے، اس میں جو کلاسک شان پیدا ہو گئی ہے اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ تخیل کی فراوانی کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ محض اس لئے ہے کہ تخیل ہی کا فقدان ہے، اور ایک شخص فقدان نیرنگی سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک عملی جائزہ لینے کے بعد صرف دو مختلف عنصر تمام عمارت میں نظر آتے ہیں، ایک تو پیازی شکل کا گنبد ہے جسے دو ابعادی غلہ دار نوکیلی محرابوں کے ذریعہ سے بنایا گیا ہے، اور دوسرے چپٹی دیواریں ہیں جن کے اضلاع و زوایہ نہایت ناگوار طریقہ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کا مقابلہ جب موجودہ یورپین عمارتوں سے کیا جاتا ہے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اور اسے اس کے معلوم کرنے کے لئے اس قدر دور جانے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ جب ہم ہندوستان ہی میں ہندو عمارتوں سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو اس بات کا پتہ چل جاتا ہے، ہندو معماروں نے نیرنگی و حسن تخیل کے نہایت اچھے نمونے پیش کئے ہیں اور ان کی عمارتیں صنعت کے نقطۂ نگاہ سے تاج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ فراوانی تخیل اور دلچسپی سے معمور ہیں۔ راجپوتانہ میں چتوڑ کے مندر، کلاسک تعمیر کا صحیح نمونہ ہیں وہ ایک عظیم الشان اور وافر تخیل کے حامل ہیں جس پر نہایت دانائی اور فراست سے اقتدار حاصل کیا گیا ہے۔ ان کا حسن اور اپنے نصب العین کے مطابق وہ ایسے ہی حسین ہیں جیسا کہ تاج، آسودہ اور دشوار ہے اور مہارت فن سے مالامال ان کے ظاہری عناصر بھی متعدد ہیں اور نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ ان میں مقابلہ و اختلاف بھی پیدا کیا گیا ہے اور نقش و نگار وغیرہ چاہے کسی قدر وافر کیوں نہ ہوں ہمیشہ عمارت کے تخیل کے ماتحت رہتے ہیں اور زیبائش کے اعلیٰ اصولوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

اس آخری حیثیت سے ہندوؤں کا طریقۂ آرائش بلا خوف تردید، بعد کے مغلوں سے بہتر کہا جا سکتا ہے۔ تاج اور لال دریں شاہ دارا کے مقبرے پر پچی کاری کا کام تعجب خیز حد تک صاف اور مسرفانہ حد تک بیش بہا ہے۔ یہ باتیں فی نفسہ بری نہیں۔ لیکن صنعت کے نقطۂ نگاہ سے یہ کسی کام کی آرائش میں اضافہ نہیں کرتیں۔ آرائش کا جہاں تک تعلق ہے تاج کی پچی کاری نہایت کم حیثیت اور غیر دلچسپ نظر آتی ہے۔ راجپوت محلات اور مندروں کے نقوش بنانے میں اس سے بہتر طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ تاج کے دروازہ پر جو ابھرے ہوئے پھول بنائے گئے ہیں ان کا جہاں تک تعلق ہے وہ بلا تکلف نہایت خراب کہے جا سکتے ہیں، نہ وہ رسمی کہلائے جانے کے مستحق ہیں نہ اصل زندگی کے مطابق۔ نہ وہ پھولوں کی اصلی تصویریں ہیں نہ آزادانہ طریقہ پر کھینچے ہوئے پھولوں کی نقل، یہ امر کہ کس طرح کوئی شخص جس نے صرف یورپ یا ہندوؤں کے طریق تعمیر کو دیکھا ہے وہ تاج کی طریقۂ آرائش کی تعریف کر سکتا ہے، میرے فہم کی رسائی سے بالاتر ہے۔ تاج کی تعمیر کو زبردستی نرالی تصور کر کے اور اس کے لئے ایک نیا نصب العین قائم کرنے کے بعد تو البتہ اس کی تعریف کی جا سکتی ہے، لیکن تاج کو اسی دنیا کی ایک عمارت خیال کرنے کے بعد اور صنعت کے ان اصولوں پر نگاہ رکھتے ہوئے جن سے کہ دنیا کے شاہکاروں پر رائے قائم کی جاتی ہے تاج کو دنیا کی بہترین عمارت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ عمارت سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے، اور سنگ مرمر اس کے ہزاروں معایب پر پردہ ڈالے ہوئے ہے۔ یہ ہیں مسٹر الڈوس کے وہ خیالات جو یقیناً اہل ہند اور علی الخصوص مسلمانوں کے لئے باعث حیرت ہونگے، اس وقت تک تاج سے

متعلق ایشیا و یورپ کے تمام ماہرینِ فن نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں اُن سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمارت عجائباتِ عالم میں شمار ہونے کے لائق ہے، لیکن مسٹر اولڈہم اس کو (عجیب و غریب تو خیر بڑی بات ہے) معایب و نقائص کا مجموعہ بتاتے ہیں۔

ان کی تمام نکتہ چینی کا ماحصل یہ ہے کہ:-

(۱) عمارت سستی کاریگری کا نمونہ ہے۔

(۲) چاروں مینار نہایت غیر موزوں بنائے ہیں۔

(۳) تخیل کی فراوانی اس میں نہیں ہے ——————— اور

(۴) اس کے نقش و نگار بھی غلط ہیں۔

پہلے اعتراض کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ مسٹر اولڈہم کا بیان کہاں تک صحیح ہے کیونکہ اول تو اندر سے کھود کر میں نے دیکھا نہیں اور اگر دیکھا بھی ہوتا تو میں نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کو سستی کاریگری کا نتیجہ سمجھوں یا بیش قیمت عرق ریزی کا علی الخصوص اس وقت جبکہ تاریخ سے یہ امر پوری طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ اس عہد میں جبکہ محنت و مادہ دونوں ارزاں اور بہت ارزاں تھے، اس پر موجودہ سکے کے لحاظ سے لاکھوں روپے صرف ہوئے تھے مناروں کی مخروطی شکل کو ناموزوں سمجھنا، ان کو نامناسب حد تک پتلا ظاہر کرنا، اُن کے برآمدوں یا چھجوں کو بدنما بتانا، اگر اس کا تعلق صرف نظر اور ذوقِ سلیم سے ہے، تو ہمیں تعجب نہیں کیونکہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے کہ وہی چیزیں جو دنیا کے اکثر افراد کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، بعض کے نزدیک بری ہوتی ہیں، لیکن اس سے نفس تاج کی تعمیر پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔

بعض لوگ ایسے ہیں جن کے کانوں میں آواز کے امواج کوئی تغیر پیدا نہیں کر سکتے اور انہیں ہم بہرا کہتے ہیں، بعض کی آنکھوں پر نور کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور ہم انہیں اندھا کہتے ہیں، اسی طرح جس کا شامہ خوشبو و بدبو کا ادراک نہیں کر سکتا، اسے اخشم کہتے ہیں، پھر جس طرح ان حواسِ ظاہری کا فقدان ایک انسان میں ہو سکتا ہے، اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ذوقِ سلیم، وجدانِ صحیح، اور احساسِ حسن کی قوت اپنے اندر نہ رکھتا ہو اور ایسی صورت میں اس کا ایک حسین چیز کو دیکھ کر برا کہہ دینا اس سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا جیسے اندھا کسی کتاب کو ٹٹول کر یہ کہہ دے کہ اس کی طباعت و کتابت نہایت ناقص ہے۔

یہ صحیح ہے کہ تاج میں تخیل کی فراوانی نہیں ہے اور نہ ہو سکتی تھی، فاضل نقاد نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ یہ عمارت مقبرہ کی ہے اور قبر یا مزار کے ساتھ انسان کا جو خیال وابستہ ہوتا ہے وہ جدت پسند نہیں ہوتا، اور نہ اس کی تنوع کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اک ایسے انعطاف (Sentiments) سے ہوتا ہے جو صرف متشائم (Pessimism) ہے اور اس میں بہار کی رنگینی، مجلسِ نشاط کی چہل پہل کی جستجو کرنا یقیناً نقاد کی بے بصیرتی پر دلالت کرتا ہے۔

رہا یہ امر کہ نقش و نگار غلط ہیں، ممکن ہے اس الزام میں کچھ صحت ہو کیونکہ جن پھولوں اور بیلوں کو پچی کاری کے ذریعہ سے دکھایا گیا ہے ان میں وہ سایہ (Shade) دکھانا جو اس کو حقیقی پھول یا بیل کی صورت دے سکے ناممکن تھا، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ابھرے ہوئے پھولوں کو بڑی حد تک اصل کے مماثل بنایا گیا ہے اور سترھویں صدی کی عمارتوں میں مشکل سے کوئی عمارت ایسی نظر آسکتی ہے جس میں اس درجہ فن و نزاکت

نقش کا لحاظ رکھا گیا ہو۔

چونکہ میں فن تعمیر سے ناواقف ہوں اس لئے افسوس ہے کوئی گفتگو فن کے نقطۂ نظر سے نہیں کر سکتا۔ لیکن ناظرین نگار کے حلقے میں یقیناً ایسے حضرات بھی ہیں جو اس فن کے ماہر ہیں اور میں بہت ممنون ہونگا اگر وہ اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں۔ نگار کے صفحات اس لطیف بحث کے لئے کھلے ہوئے ہیں، چونکہ مسٹر اولڈہم نے اپنی عجیب و غریب تنقید سے گویا مشرقی ہندسۃ البناء (Oriental Architecture) کے تمام ماہرین کو کھلا ہوا چیلنج دیا ہے اس لئے مجھے افسوس ہوگا اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی۔

ایڈیٹر

نظارۂ قدرت

یہ پھول زمیں پر کیا کم ہیں یہ چہچہے پرندوں کے کیا کم ہیں
انسان کا جی بہلانے کو قدرت کے نظارے کیا کم ہیں

پُر نور یہ کرنیں سورج کی، زرتار یہ ٹکڑے بادل کے
یہ تاب سحر کی شام شفق، گردوں پہ نظارے کیا کم ہیں

یہ قوسِ قزح یہ رنگ فزا، یہ اودی گھٹا یہ سرد ہوا
آنکھیں تو اٹھا کر دیکھو ذرا، آثار یہ پیارے کیا کم ہیں

مہتاب کا چھپنا بادل میں، پھر اس سے نکلنا رہ رہ کر
پردے سے سحاب رنگیں کے بجلی کے اشارے کیا کم ہیں

پُر درد صدائیں کوئل کی، دلدوز پپیہے کی پی پی
طاؤس کا رقص، اشجار کا وجد، آہوئے طرارے کیا کم ہیں

ہر دم وہ جھلکنا شاخوں میں، جھم جھم وہ چھپنا پتوں میں
جنگل کی گھنی چھاؤں میں شب کو جگنو کے شرارے کیا کم ہیں

یہ پچھلا پہر، یہ لطف سحر، یہ رنگ فلک، یہ نورِ افق
مستانہ ہوا کے یہ جھونکے یہ چند ستارے کیا کم ہیں

پانی کا بلندی سے گرنا چاندی کا ہر گل گل کر بہنا
کہسار کے دامن میں نالے، چشمے فوارے کیا کم ہیں

پانی کی چمک موجوں کی تڑپ اٹھ رکنا پیچ و خم دلکش
بلور کی صفیں سارس کے پرے ندی کے کنارے کیا کم ہیں

جھیلوں کے قریں اور جھاڑیوں میں جنگل کے سہانے سبزہ میں
بانسوں کی قطاریں ہوں جن میں اور ہلکے کنارے کیا کم ہیں

ہیرے یہ موتی شبنم کے یہ موج ہوا یہ نکہت گل
ذی حس کے لئے ترتیب جو نکلے یہ استعارے کیا کم ہیں

ہاں ان کا مزہ لینے کے لئے ہو ذوق نظر ہر کا نجیب
قدرت کے مناظر موا تھے پیارے پیارے کیا کم ہیں

پیر سعادت حسین نجیب

بدیہہ گوئی

بدیہہ گوئی و شاعری کا ایک ایسا کمال ہے جو ہر شخص کا حصہ نہیں اکثر شعرا محض اسی کمال کے باعث ہلاکت سے محفوظ رہے، اکثر نے اس کی بدولت ایسے مراتب اور صلے حاصل کئے، جن کو دیکھ کر شاہانِ سلف کی فیاضی و قدر دانی کے حیرت انگیز نقشے آنکھوں میں پھر جاتے ہیں۔
ہم اس وقت فارسی شاعروں کے کلام سے بدیہہ گوئی کی چند دلچسپ اور پر لطف مثالیں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔
اگرچہ اس دور میں جب کہ بہت سے شریف و قدیم علوم دم توڑ رہے ہیں اور رفتہ رفتہ اوراقِ زمانہ سے محو ہوتے جا رہے ہیں اس قسم کے قصے چھیڑنا جو ایسی زبان یا علم سے تعلق رکھتے ہوں جس پر "سکراتِ موت" طاری ہو عجب تھی سی بات ہے، تاہم فارسی زبان کا ذوق ابھی ارضِ ہند سے بالکل فنا نہیں ہوا، اس سے اس سے لطف اندوز ہونے والی ہستیاں ابھی موجود ہیں اور اسی وثوق پر یہ جرأت کی جاتی ہے۔

(۱) امیر نظام الدین استرآبادی کو سلطان تگش کے یہاں خاص عزت حاصل تھی، بہت سی فتوحات اس کی دلیری و شجاعت کی زیر بار احسان تھیں، ایک مرتبہ حاسدوں نے سلطان سے اس کی شکایت کی، یہاں تک کہ سلطان امیر کے قتل پر آمادہ ہو گیا، اور ایک جماعت کو حکم دیا کہ امیر نظام الدین کا سر کاٹ کر بارگاہِ عالی میں پیش کرے، لیکن امیر نصیر الدین نے بہت کچھ صرف کر کے جماعت کو اس امر پر راضی کیا کہ نظام الدین کو زندہ بادشاہ کے سامنے حاضر کیا جائے۔ جس روز نظام الدین گرفتار ہو کر آیا ہے سلطان کے یہاں زبردست جشن برپا تھا، سلطان کی نظر اس پر پڑی تو غضبناک ہو کر اس نے چاہا کہ ان لوگوں کی سرزنش کرے جو اس کو زندہ گرفتار کر کے لائے تھے اور اس طرح تعمیلِ حکمِ شاہی میں تاخیر واقع ہو گئی تھی اس موقع پر امیر نصیر الدین نے فی البدیہہ یہ رباعی عرض کی ؎

من خاکِ تو در چشمِ خرد می آرم ۔۔۔ عذرت نہ یکے نہ دہ کہ صد می آرم
سر خواستہ بدستِ کس نتوان داد ۔۔۔ می آیم و برگردنِ خود می آرم

سلطان نے خوش ہو کر اس کے سر و چشم کو بوسہ دیا، اور تمام اسبابِ مجلس اس کو مرحمت فرمایا، نظام الدین کی جان بخشی کی گئی، اور جو لوگ اس کو گرفتار کر کے لائے تھے ان کو بھی انعام دیا گیا۔

(۲) نظامی عروضی سمرقندی سلطان علاؤ الدین غوری کا درباری شاعر تھا اس کے عہد میں دو شاعر اور بھی تھے جو نظامی تخلص کرتے تھے ایک روز عید الفطر کو شہزادہ بلخ نے سلطان کے سامنے ان دو نظامیوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ میں اس نظامی کی حقیقت نہیں جانتا، اگر اس معاملہ میں کچھ کہے تو اس کی حقیقت استعداد معلوم ہو، سلطان نے نظامی سے کہا، دیکھو مجھے شرمندہ نہ کرنا۔ دورِ شراب جو اس وقت مجلس میں جاری تھا ہنوز ختم نہ ہوا تھا۔ کہ نظامی نے یہ اشعار لکھ کر پیش کئے ؎

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ　　　کہ وحید زمانہ ایشاں اند
من یکے بندہ پیش تخت شہم　　　واں دو در مرو پیش سلطاں اند
بہ حقیقت نہ در سخن امروز　　　بے سخن معجز خراساں اند
گرچہ ہمچوں زواں سخن گویند　　　در چہ ہمچوں خسرو سخن راند
من شرابم کہ شاں چو دریابم　　　ہر دو از کار خود فرو مانند

شہزادہ نظامی کی حاضر جوابی سے مسرور ہوا اور سلطان نے اس کو انعام سے سرفراز کیا۔

(۳) سلطان محمود کی نظر ایک رات ایاز کی زلف سے الجھ گئی، چونکہ ایاز کی سیاہ و طویل زلفیں دیکھکر محمود کے دل میں فساد انگیز جذبہ پیدا ہوا تھا اس لئے اس نے ایاز کو حکم دیا کہ آدھی آدھی زلف کاٹ ڈالے، ایاز نے زلفیں کاٹ کر محمود کے سامنے رکھ دیں سلطان جس وقت ہوش میں آیا، تو بہت پریشان و خشمناک ہوا یہاں تک کہ حضار مجلس میں سے کسی کو بولنے کی تاب نہ رہی آخر علی حاجب نے عنصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا، کیا ممکن ہے کہ تم سلطان کے مزاج سے یہ برہمی و بے کیفی دور کر سکو؟

عنصری نے بادشاہ کے سامنے جاکر برجستہ یہ رباعی عرض کی:

گر عیب سر زلف بت از کاستن است　　　گر عیب سر زلف بت از کاستن است
وقت طرب و نشاط و می خواستن است　　　کاراستن سرو ز پیراستن است

سلطان بیحد خوش ہوا، اس کی آتش غضب بالکل سرد ہو گئی، حکم دیا کہ عنصری کا منہ تین بار جواہر سے پُر کیا جائے اور مطربوں کو رباعی کے گانے کا حکم دیا۔

(۴) شکیبی تبریزی جس وقت عہد طہماسپ صفوی میں قزوین پہنچا اتفاق سے اس وقت وہاں کے ارباب سخن امیر حسن دہلوی کے اس مطلع کا جواب لکھنے کی کوشش کر رہے تھے ؎

اے شہد نوشیں لبت پاک از ہمہ آلودگی
بنشیں کہ تا باز چشم زخوں پالودگی

شکیبی نے اس کے جواب میں کہا:۔

گلگل شدہ بیرا ہنم از درد بے پالودگی،
گلہائے رسوائی شگفت آخر ازیں آلودگی

اور انعام میں سونے کی کافی مقدار حاصل کی

(۵) سلطان سیلکی نے ایک مرتبہ علی قلی خاں سلطان کی مدح میں قصیدہ پیش کیا، خان مذکور نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت انعام میں دیکر

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کا عطر خاص بہت مشہور ہے

استدعا کی کہ یہ تخلص میری خاطر سے چھوڑ دو۔ سلطان نے صلہ واپس کر بھیجا اور کہلا بھیجا کہ سلطان محمد میرے باپ کا، کیا ہوا نام ہے میں اسکو کس طرح چھوڑ سکتا ہوں، نیز میں آپکے چند سال پہلے سے یہ تخلص کرتا ہوں اور اب بھی اسی تخلص سے مشہور ہوں خان نے کہا اگر نہ چھوڑو گے تو میں تمہیں ہاتھی کے پیر سے کچلوا دوں گا! وہ شدت غضب میں ہاتھی بھی طلب کر لیا۔ سلطان نے کہا زہے سعادت کہ میں شہید ہو جاؤں آخر مولانا علاؤالدین لاری نے جو خان کے استاد تھے فیصلہ کیا کہ کوئی غزل دیوان جامی کی (جو اس وقت وہاں موجود تھا) نکالی جائے اگر سلطان اس کا جواب برجستہ کہدے تو معاف کر دیا جائے ورنہ جو ارادہ ہے وہ پورا کر لیا جائے، دیوان جامی کھولا گیا تو یہ غزل برآمد ہوئی ؎

دل خلق را رقم صنع الٰہی دانست
بر سر سادہ رُخان حجت شاہی دانست

سلطان نے بے تکلف غزل کہدی جس کا مطلع یہ ہے:-

ہر کہ دل را صدف مہر الٰہی دانست
قیمت گوہر خود را بہ کماہی دانست

خان بہت مسرور ہوا، اور دوگنا تگنا صلہ دیکر رخصت کیا

(۶) بعضا۔ امیر الامرا نے ایک مرتبہ چائے پیتے وقت یہ مصرعہ موزوں کیا۔

"عرق داغ لالہ قہوہ ماست"

مرزا نے بے تکلف کہا:-

نور چشم پیالہ قہوہ ماست

امیر الامرا بہت خوش ہوا اور پانچ ہزار روپیہ صلہ دیا۔

(۷) خواجہ نورالدین وزیر سلطان خوارزم شاہ کی علمی نوازش کا شہرہ سنکر شاہ نور نیشاپوری خوارزم پہونچا لیکن یہاں پہنچکر اس کو خواجہ کے دربار میں باریابی نہ ہوئی کیونکہ خواجہ شراب بکثرت پیتے تھے، اتفاق سے ایک روز کہیں جانے کے لئے خواجہ برآمد ہوئے، ڈیوڑھی پر شاہ نور حاضر تھا، خواجہ نے دریافت کیا "تمہیں نیشاپوری شاعر ہو" جسکی میں نے بہت تعریف سنی ہے، اچھا کچھ سناؤ" خواجہ اس وقت بھی مخمور تھے، آنکھوں میں نشہ بھرا ہوا تھا شاہ نور نے موقع کی مناسبت سے برجستہ یہ رباعی کہی ؎

فضل تو دریں بادہ پرستی باہم مانند بلند لیست و پستی باہم
حال تو بچشم ما ہر دیان ما ند کانجاست مدام نور و مستی باہم

یعنی آپ کا علم و فضل، بادہ پرستی کے ساتھ مل کر، نشیب و فراز کے ساتھ مشابہ ہے، اور جناب کی کیفیت بالکل معشوقوں کی آنکھ سے ملتی ہے

جس میں نور اور مستی کی کیفیات ممزوج ہوتی ہیں، گویا یہ این علم و فضل آپ کا شراب مینا پرا ہے ہیں کیونکہ بلندی کے ساتھ پستی بھی تو ہوتی ہے۔
خواجہ نے خوش ہو کر کہا "ہمراہ ما شو" اسی وقت سے شاہ نور خواجہ کا مصاحب ہو گیا۔

(۸) رشیدی سمرقندی۔ سلطان خضر بن ابراہیم خاقان کے دربار کا ایک معزز شاعر تھا، اور "سید الشعراء" کے خطاب سے ممتاز۔ عمعق بخاری بھی اس دربار کا مقبول شاعر تھا جس کو "ملک الشعراء" کا خطاب تھا۔ ایک روز بادشاہ نے جبکہ رشیدی موجود نہ تھا عمعق سے دریافت کیا "رشیدی کے اشعار کیسے ہوتے ہیں" عمعق نے جواب دیا "اچھے ہوتے ہیں، مگر ذرا نمک کی ضرورت ہے" (یعنی بے نمک ہوتے ہیں) اتفاق سے اس وقت رشیدی بھی آگیا۔ بادشاہ نے عمعق کا قول نقل کر کے کہا کہ اس باب میں کوئی شعر موزوں کرو۔ رشیدی نے برجستہ کہا:-

شعرہائے مرا بہ بے نمکی عیب کردی روا بود شاید
شعر من ہمچو شکر و شہد است اندر یں ہا نمک نہ خوش آید
گفتہ ات شلغم است و باقلا نمک اے قلتباں ترا شاید

یعنی تو نے میرے اشعار میں بے نمکی کا عیب نکالا شاید یہ صحیح ہو کیونکہ میرے اشعار شہد اور شکر کی طرح ہیں ان میں نمک کی آمیزش اچھی نہیں معلوم ہوتی، اور تیری گفتار شلغم و باقلا کے حکم میں ہے، پس اے بے غیرت نمک تیرے ہی لئے مناسب ہے۔
بادشاہ رشیدی کی اس بدیہہ گوئی پر بہت مسرور ہوا، اور اس کو انعام سے سرفراز کیا۔

(۹) بدر جاجرمی۔ خواجہ بہاء الدین کے زمانہ میں اصفہان پہنچا اور خواجہ کی مدح کو وسیلہ معاش بنایا، ایک روز خواجہ کے سامنے یہ رباعی لکھکر پیش کی:-

دریا چو محیط است و کف خواجہ نقط پیوستہ بگرد نقطہ میگردد خط
پروردہ تو کہ در شدہ دون و وسط دولت ندہد خدائے کس را بہ غلط

قاعدہ ہے کہ خط، نقطہ کے گرد گھومتا ہے، شاعر کف ممدوح کو نقطہ اور اس کے بحر کرم کو نقطہ کا محیط تصور کر کے کہتا ہے کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ ہر کس و ناکس تیرے لطف عمیم سے متمتع ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ خداوند عالم کسی کو دولت بیکار نہیں دیتا۔
خواجہ نے اس کی پشت پر یہ رباعی موزوں کر کے لکھ دی۔

سی صد برہ سپید چوں بیضۂ بط دروی ز سیاہی نبود ہیچ نقط
از گلہ خاص ما نہ از جائے غلط چوپاں بدہد بدست دارندۂ خط

یعنی تین ہزار بکرے جو بط کے انڈے کی طرح سفید ہوں اور ان پر سیاہی کا کوئی دھبہ بھی نہ ہو، چوپان ہمارے "گلہ خاص" سے حامل رقعہ کو دیدیے جائیں۔

---

(۱۰) ایک روز نصیرت خاں جو خان جہاں ناظم لاہور کا لڑکا تھا داراشکوہ کی تعزیت کے بعد لاہور بغرض تفریح گیا۔ شاہ آفریں جو لاہور کا ایک خوش گو شاعر تھا وہیں طلب کر لیا گیا۔

آسمان ابر آلود تھا، چھوٹی چھوٹی بوندیاں پڑ رہی تھیں، ہوا میں کافی خنکی اور کیفیت آگئی تھی۔
نصیرت خاں نے فضائی کیفیت سے متاثر ہو کر ہوا کی تعریف کی، شاہ آفریں نے برمحل یہ دو شعر پڑھے

خوشا ابرے وابرے کم ستیزہ   کہ باراں ریزد از وے ریزہ ریزہ

زنم نقش قدم پامال نمی شد   زمیں ترمی شد و پا گل نمی شد

نصیرت خاں نے زر احمر کی تو اشرفیاں شاہ آفریں کو انعام میں دیں۔
(۱۱) ایک روز سلطان ملک شاہ سلجوقی ارکان دولت کے ساتھ عید کا چاند دیکھ رہا تھا، اتفاقاً سب سے پہلے سلطان کی نظر چاند پر پڑی، سلطان نے انگلی کے اشارے سے سب کو چاند دکھایا، معزی نیشاپوری نے اس موقع پر برجستہ کہا ؎

اے ماہ کمان شہریاری گوئی   یا ابروے آں طرفہ نگاری گوئی

نعلی زدہ از زر عیاری گوئی   در گوش سپہر گوشواری گوئی

معزی نے چاند کو چار چیزوں سے تشبیہ دی ہے، یعنی اے ہلال تو بادشاہ کی کمان ہے، یا معشوق کی ابرو ہے، یا زر خالص کی نعل ہے، یا گوش آسمان کا گوشوارہ ہے۔
سلطان نے خوش ہو کر ایک گھوڑا انعام میں دیا، معزی نے پھر بے تکلف کہا ؎

چوں آتش خاطر ما شاہ بدید   از خاک مرا بر زبر ماہ کشید

چوں آب یکے ترانہ از من بشنید   چوں باد یکے مرکب خاصم بخشید

یعنی بادشاہ نے میرے دل کا شوق دیکھا تو مجھے زمین سے آسمان پر اٹھا لیا۔ پانی کی طرح مجھ سے ایک ترانہ سنا اور ہوا کی مثال ایک تیز گھوڑا بخشا۔ شاعر نے اربع عناصر کے اجتماع سے ان اشعار میں خاص لطف پیدا کیا ہے، اس میں ایک لطف یہ بھی ہے کہ آگ ہمیشہ اوپر کی طرف بالطبع مائل ہوتی ہے، کیونکہ کرہ آتش "فلک قمر" کے نیچے واقع ہے، "آتش خاطر" کو دیکھ کر خاک سے ماہ تک پہنچا دینا اسی مناسبت سے ہے۔ اس پر سلطان نے ہزار دینار انعام دیا۔
(۱۲) ایک روز سلطان سنجر (ملک شاہ کا بھائی) گیند کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے دفعتہً گھوڑے سے گر پڑا، معزی نے فوراً عرض کیا۔

شاہا ادب کن فلکِ بے ادبِ خود را — کو چشم رسانید رخ نیکو را

گر گوی خطا کرد بچوگانش بزن سر — ور اسپ خطا کرد بمن بخش ورا

شاہا! فلک بے ادب کو تادیب کر، جس نے تیرے رخ حسین کو نظر لگائی (سلطان بہت حسین تھا، اور گرنے سے اس کے منہ سے خون بہنے لگا تھا) اگر گیند کا قصور ہو تو چوگان سے اس کی خبر لے، اور اگر گھوڑے کی کوئی تقصیر ہو تو وہ میرے حوالہ فرما، سلطان نے یہ سن کر گھوڑا معزی کو دیدیا۔
معزی نے پھر برجستہ کہا:-

رفتم بر اسپ تا بجرمش بکشم — گفتا که نخست بشنو این عذر خوشم

نی گاو زمینم که جہاں بر گیرم — نے چرخ چہارم که خورشید کشم

میں نے گھوڑے کو اس کے سخت جرم کی پاداش میں، مارنے کا قصد کیا تو گھوڑے نے کہا پہلے میرا عذر تو سن لو، یعنی میں کوئی "گاو زمین" تو ہوں نہیں کہ سارے جہان کو پشت پر اٹھا سکوں، نہ چرخ چہارم ہوں کہ خورشید کو اٹھا لاں۔

(۱۳) راسخ سیالکوٹی نہایت شوخ طبع شاعر تھا اور شعر عجیب دلپذیر انداز سے پڑھتا تھا۔ ایک روز خواجہ محمد فاضل خان (قبلہ آبرادر زادہ سیف الدولہ عبدالصمد خان ناظم لاہور) نے راسخ سے کہا کہ جو یہ مصرعہ کہوں اس پر مصرعہ لگادو۔

اے حنا انگشت فندق بند و از دست تو

راسخ نے فوراً کہا:-

ازکمان ناخنی خوردم خدنگ از شست تو

خان نے خوش ہو کر ستر روپیہ انعام دیا۔

(۱۴) ایک دن شہزادی جہاں آرا بیگم (بنت شاہجہان) ہاتھی پر سوار ہو کر اپنے باغ میں جو وسط شاہجہان آباد میں واقع تھا سیر کرنے آ رہی تھی پردہ کا اہتمام ہو رہا تھا، اتفاق سے میر شیدی طہرانی بھی اس وقت وہاں آ نکلے تھے باغ کے باہر بہت سے حجرے بنے ہوئے تھے ان میں سے کسی حجرے میں پردہ کی آواز سن کر چھپ گئے، جس وقت سواری قریب آئی میر نے پشت کی کھڑکی سے سر نکال کر کہا ؎

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش

تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش

بیگم نے بظاہر خفا ہو کر دریافت کیا یہ کون ہے؟ اس گستاخ کو ہمارے سامنے لاؤ خواجہ سرا میر کو کھینچتے ہوئے شہزادی کے پاس لائے بیگم نے کہا کیا پڑھ رہے تھے، پھر پڑھو، میر نے اسی شعر کو پھر پڑھا بیگم نے کہا اس سادہ دل کو پانچ ہزار روپیہ دیکر شہر سے نکالدو۔ یہ حکم دیکر بیگم باغ میں چلی گئی۔

علی کوثر ـــــ چاندپوری

میرے پاس اس وقت متعدد تذکرے ہیں لیکن اس کے متعلق سب میں اختلاف ہے، یہ تذکرہ "خزانہ عامرہ" سے لیا گیا ہے۔ کوثر

نشاطِ خیال

مانا وہ چھپنے والا ہر دل میں چھپ جائیگا — لیکن ڈھونڈنے والا بھی ڈھونڈیگا اور پائیگا

کیا ہوتا ہے محبت میں یہ مجھکو معلوم نہیں — جس نے آگ لگائی ہے وہ خود آگ بجھائیگا

میں تو نام کا مالی ہوں پھر بھی رکھوالا ہوں — جس نے بیل لگائی ہے خود پروان چڑھائیگا

جس نے خزاں کو بھیجا ہے اُسکے پاس بہار بھی ہے — جس نے باغ اجاڑا ہے، وہ خود پھول کھلائیگا

زانو کا تکیہ ہوگا، مٹی کا بستر ہو گا — گھر گھر جس کا چرچا ہے میرے گھر بھی آئیگا

افسر میرے کانوں میں کوئی یہ کیا کہتا ہے

وہ سرکار ہماری ہے بے مانگے بھی پائیگا

حامد اللہ میرٹھی

افسر

حور و رضواں

بادۂ خواب نے عالم کو کیا ہے مدہوش　　عارضِ مہ ہے، داماں فلک میں روپوش
ڈال کر چہرۂ پرنور پہ بادل کی نقاب　　رونق افروز ہوا بامِ فلک پہ مہتاب
سقفِ افلاک میں سوراخ ہیں مثلِ غربال　　ضوئے انجم نہیں چھپتا ہے یہ حوروں کا جمال
باغِ فردوس میں نکلی ہیں ہوا کھانے کو　　دل میں رضواں کے شررِ حسن کا چمکانے کو
بانکپن ان کا نیا، عشوہ نیا، ناز نیا　　شوخیِ طبع نئی اور ہر انداز نیا
اٹھ کے رضواں نے قدم ما جبینوں کے لئے　　اور کہا وقت ہو تم خاک نشینوں کیلئے!
جن کی فطرت میں دغا، جن کی جبلت میں عناد　　جن کی طینت میں جفا، جن کی طبیعت میں فساد!
حسنِ دل کش کی مگر تم ہو وہ یکتا تصویر　　کہ تصور میں بھی انساں کے نہو جس کی نظیر
اور اس حسنِ یگانہ پہ یہ فطرتِ معصوم　　بے بجا تم ہو اگر شکوہ گزارِ مقسوم
ہوئے خاموش وہ جنتی، ہیں رضواں کا کلام　　بولی اک حور کہ "اے سرِ گلستاں کے غلام"——!
"کیا یہ گلشنِ جنت نہیں آدم تھا جہاں　　یوں ہوا، یہ سرِ تسلیم ترا خم تھا جہاں"——!
"کیا کبھی خدمتِ انساں پہ تو معمور نہ تھا——؟
اس سے پہلے تو کبھی ایسا تو مغرور نہ تھا"——!!

محمود——اسرائیلی

نورجہاں

جس وقت آئی وہ پری، غالب تھا دور اکبری — ساجد تھی بزم عشرتی، رنگ تھا چرخ اخضری

اس ضوفشانی کا گماں، تھا آسماں کو بھی کہ زن — وہ ہوگی اک نور جہاں، شباب عروس خاوری

پیکر جو تھی حسن کا جواب، آئی نظر جو بے نقاب — شیریں و لیلیٰ و رباب، سب بھولتے افسونگری

ہوتے تھے جب پرتو فگن گلہائے رخ از بزم تن — بنتا تھا گویا اک چمن آئینۂ اسکندری

انسان کہتے حور حور، کہتے فرشتے نور نور — موسیٰ سمجھتے طور طور، تقریب جلوہ گری

گویا پس مسکت دیا، اک نقد دل کو پا لیا — دیکھ کبوتر کو اڑا، حسرت ہمائے چنبری

پھر دل نہ ہوتا کیوں دو نیم، تھا شہوتی کیوں مستقیم — جب کر چکی تھی سے سلیم، وہ رشک آن پری پری

جب عقد کا چرچا کیا، ماں باپ نے منسلک کیا — بیٹا نہیں ہرگز بیاہ سب کس پر تھا ایت دہری

یہ حملۂ حسرت فزا، اک درد سے تا مرتبا — بس دل پکڑ کر رہ گیا، خود دار اسے دلبری

وہ شیر افگن ساجواں تھی جس کی دولت داستاں — ثابت ہوئی یہ جان جاں، اک جیب غارتگری

ہے ایک کے حق میں قضا، اور ایک کے حق میں فنا — دنیا میں یہ زیب خدا ہے حسن کی بازیگری

گیا تھا حسن رزن ہوا، مقتول شیر افگن ہوا — جب عاشق پر فن ہوا، داراے تخت کشوری

داخل ہوئی وہ نازنیں، مشکو بنا قصر بریں — سمجھا جہانگیر حزیں، تسخیر یہ خوش اختری

خونریزیِ شو کا ملال، بیشک ہوا اسکو کمال — اس سوگ میں وہ چار سال کرتی رہی نوحہ گری

نکلا طبیعت کا بخار، آخر مٹا سب انتشار — لی پھر عنان اقتدار، پھر نظم داوری

نیرنگیِ ایام میں، ہر زحمت و آرام میں — سلطاں نے سارے کام میں جاناں سے ترغیب بری

اک بلند و پست تھا، کچھ بھی نہ پھر سرمست تھا — ہر وقت زیب دست تھا، جام گلاب عنبری

انگشت حیرت در دہاں، ہوتے تھے سارے پہلواں — جس وقت وہ نخچیر بستاں کرتی تھی کار لشکری

خجلت وہ باغ جہاں، اس وقت تھا ہندوستاں — اب تک ہیں سب رطب اللساں، اس شان سے کی سروری

سید شفاعت حسین ریحانی اعظم گڑھی

قربانی

(۱)

چارلس دس برس کا تھا جب اس کے باپ مشہور شاعر کاؤنٹ مانٹ نے اپنے نہایت ہی عزیز دوست کی شش سالہ بیٹی یوحنا کو گود لیا۔ اس کا باپ نہایت ہی عسرت اور فلاکت میں چھوڑ کر مر گیا تھا۔

یہ بڑی پیاری بچی تھی۔ اس کی صورت بھولی، نیلی آنکھیں بڑی اور بال سنہرے تھے۔ اس کے چہرے کو جس پر کسی قدر ملال کے آثار پائے جاتے تھے، تبسم شاذ و نادر ہی روشن کیا کرتا تھا۔ اس کی نہ ماں تھی نہ کوئی بھائی بہن، تنہا اپنے مفلس و مریض باپ کے پاس رہا کرتی تھی۔ اور اب وہ بھی نہ رہا تھا۔ دیگر بچے جو خوشیاں و عیش کیا کرتے ہیں وہ ان میں سے کسی سے واقف نہ تھی۔ اس کی صحت و تندرستی ضعیف تھی، وہ ننھی سی اور ڈرپوک تھی، ماتمی لباس کی وجہ سے ہر شخص کو اس پر ترس آتا تھا۔ چارلس اس سے عمر میں بڑا اور قوی و تندرست تھا، وہ پہلے ہی دن سے یوحنا کا محافظ بن گیا۔

دونوں بچے بہن بھائی کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ یہاں آ کر وہ پہلی مرتبہ دوسرے بچوں کی تفریحوں سے واقف ہوئی اب وہ اپنے باپ کے غریبانہ گھر کی طرح اکیلی نہ تھی۔ اسکا ایک ہم سن ساتھ کھیلنے والا تھا۔ جس نے اسے بڑے خوبصورت اور انوکھے کھلونے دیے تھے۔ بہت جلد اس کا حزن و ملال دور ہو کر اس کا چہرہ گلاب کی طرح سرخ ہو گیا اور کشادہ مکان میں اس کی ہنسی کی آواز گونجا کرتی تھی۔

لیکن یوحنا چارلس سے ایک گڑیا تھی جس نے کھلونوں کو زیادہ دلچسپ اور گھر کو بارونق بنا دیا تھا اور کاؤنٹ مانٹ کے لئے وہ بیٹی تھی جس کی وہ اکثر حسرت کیا کرتا تھا۔ یوحنا ایسی پسندیدہ عادتوں والی تھی .... کہ سب گھر والے اس سے محبت کرتے تھے اور وہ اس گھر کی پری ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ہر شخص مسرور و شادماں تھا، ہر چیز میں دلکشی پیدا ہو گئی تھی۔ گویا کوئی ہوائی ہستی دیوتاؤں کی بھیجی ہوئی اس وسیع مکان میں اس بھلائی کا انعام لے کر آئی تھی جو کاؤنٹ مانٹ نے ایک یتیم بچی کے ساتھ کی تھی

اس بڑے شاعر نے اپنی وہ نہایت ہی اچھی نظمیں یوحنا کے نام منسوب کی تھیں جو اس نے بچپن پر لکھی تھیں۔

دو سال کے بعد جب یوحنا آٹھ سال کی ہوئی، تو اس کا ماتمی لباس اتار دیا گیا۔ اس وقت کوئی اس زار و نحیف لڑکی کو نہیں پہچان سکتا تھا، جس کو اپنے باپ کے جنازے کے ساتھ روتا ہوا دیکھ کر ہر شخص پر رقت طاری تھی۔

آج کاؤنٹ مانٹ نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیکر اس سے کہا:۔

——— کیا تم ہمارے پاس خوش ہو، میری بچی؟

——— جی ہاں، جناب۔

——— تم مجھ سے ہمیشہ جناب کیوں کہتی ہو، میری پیاری؟ کیا میں تمہیں باپ کی طرح محبت نہیں کرتا۔

——— جی ہاں! آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں اور میں بھی آپ سے محبت کرتی ہوں۔ —— آپا ———

——— یوحنی پیاری۔

چارلس جو اب تک خاموش کھڑا تھا اُس کے پاس آیا۔

——— اور مجھ سے ننھی بہن، کیا تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟

——— تم خوب جانتے ہو میرے چارلی

——— پیاری یوحنی۔

اس دن سے وہ یہی پیار کے نام لیا کرتے تھے "آپا، چارلی، یوحنی، یوحی" جو ان میں سے ہر ایک کے لئے احساس محبت کی اصطلاح تھی اور ناقابلِ افتراق روحوں کی ایجاد۔

——— (۲) ———

چارلس کا ایک ہم عمر دوست فریڈرک تھا۔ اس کے ہم درس لڑکوں میں سے یہی گھر میں آیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بچے عادات و خصائل کی یکسانی، نیک مزاجی و ہمدردی، شاعری کی طرف میلان اور ہم مذاقی کی وجہ سے ایک دوسرے کے بڑے ہمدرد تھے۔ ان کی سب سے بڑی تفریح یہ تھی کہ کانٹامانٹ کے کمرے میں جمع ہوتی اور تازہ نظمیں سنایا کرتے تھے اور اُن کی کمسن روحوں میں اوزان و بحور کا ادراک پیدا ہو گیا تھا۔ یوحنا بھی بہت جلد شعر خوانی کے مختصر جلسے میں شریک ہونے لگی اور اُس نے بھی محسوس کیا کہ اس میں شاعرانہ مذاق بیدار ہوگیا ہے۔ یہ تینوں بچے کانٹامانٹ کے شعروں کی حسن کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور جب اُس نے اپنی پرشکوہ نظم ان کو سنائی تو فرطِ خوشی سے اُن کے آنسو نکل آئے۔

——— (۳) تینوں کا دیکھ کر مسرور ہونا ———

چارلس اور فریڈرک کانٹامانٹ کی آرام کرسی کے پاس دہنے بائیں کھڑے تھے، ایک ہاتھ شاعر کے شانے پر رکھے نئے اشعار اس کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے تھے اور یوحنا آہستہ آہستہ قریب آگئی تھی، آخر اپنے آپا کے زانو پر بیٹھ گئی اور جونہی وہ نظم ختم ہوئی اس نے اپنے ننھے بازو اس کی گردن میں ڈال دیے اور بوسہ دے کر کہا۔

——— آپا، میرے آپا! اس خوبصورت نظم کی وجہ سے میں کس قدر آپ کو پسند کرتی ہوں، جو ابھی آپ نے ہم کو پڑھ کر سنائی۔ یہ ایسی ہی خوبصورت ہے جیسے آپ اچھے ہیں! سچ ہے نا بھائی جان"

اور دونوں "بھائی جان" نے باری باری سے کانٹامانٹ کو بوسہ دیا جس نے انکو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔

——— تم میری زندگی کی مسرت و شادمانی ہو۔ تمہاری بڑی بڑی آنکھوں کی نظم کے مقابلہ میں، ابیات کی نظم کیا چیز ہے! تمہارے گلاب کی سی پنکھڑی سے لب کی دل پسندی کے مقابلے میں بحور و اوزان کی دل پسندی کیا چیز ہے۔ تمہارے دلربا چہروں کی شباہت کے مقابلہ میں قافیوں کی مشابہت کیا چیز ہے؟ بچو، میرے بچو، تم ہمیشہ تین بھائی بہن رہو، تمہاری باہمی محبت ایثار و قربانی کے درجے تک ہو۔ اس طرح تمہاری وجہ سے مجھ کو خوشبخت مسرور و پرسکون نصیب ہوگی اور لوگوں کی مدح و تحسین سے زیادہ تمہاری محبت کی وجہ سے مجھے عظمت و شان حاصل ہوگی۔

پاکیزہ و نفیس بچوں نے ان اقوال کو سمجھ لیا۔ ان دونوں میں شاعری کے نئے انشراح پیدا ہو گیا۔ ڈرتے ڈرتے انھوں نے چند شعر لکھنا شروع کئے۔ سب سے پہلے چارلس نے اپنے شعر باپ کو دکھلائے کیونکہ اگرچہ غلطیاں بہت زیادہ تھیں، لیکن والد! شعریت موجود تھی، کاشاماتٹ نے تحسین و حوصلہ افزائی کی۔ ہر ولہلم فریڈرک نے بھی اشعار دکھلائے۔

—— کاشاماتٹ نے پیار کیا، تم دونوں شاعر ہو گئے، اور اس نے یوحنانہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ کیا تو نے، ننھی پری اب تک کوئی ننھی سی نظم لکھنے کی کوشش نہیں کی؟

یوحنانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا، لیکن تذبذب کے بعد اس نے کاشاماتٹ کو ایک چھوٹی سی کاپی دی۔ وہ حیرت میں آگیا۔

—— قریباً کوئی غلطی نہیں ہے، اس نے کہا۔ ننھی پری تجھ پر ہم سب سے زیادہ شاعری کی دیوی مہربان ہو گی اور تمہارے خیالات تمہارے دونوں بھائیوں کی ابتدائی نظموں سے کہیں مستقبل کی ایک راہ عظیم کھولیں گے۔ میرے بچے میں تم کو برکت دیتا ہوں۔

—— (۲) ——

سال پر سال گزر گئے۔ چارلس ۲۲ برس کا ہو گیا۔ ابتدا میں اس نے اپنے باپ کے شاندار راستے کی پیروی کی، چند ابتدائی نظمیں لکھیں جن کی سب نے تعریف کی۔ لیکن وہ نئے اوزان و بحور تصنیف کرنا بھول گیا۔ اس نے سخت نقادوں کی تحسین و آفرین گویا سنی ہی نہیں، وہ صرف اپنے عہد طفلی کی دلربا پری، اپنی موجودہ مضامین القا کرنے والی شاعری کی دیوی یوحنانہ کے خیال میں محو رہا کرتا تھا۔

وہ نحیف چھوٹی لڑکی اب دلکش دوشیزہ ہو گئی تھی۔ اس وقت اٹھارہ سال کی تھی، اس کی ذہانت نے چارلس کے دل کو اس قدر پرجذبات بنا دیا تھا جس قدر یوحنانہ کا قوی جسمانی حسن تھا، چارلس کی عہد طفلی کی دوستی کی تمام مقام سرگرم محبت ہو گئی تھی اور یہ اس پر اس قدر مستولی تھی کہ اس کو کوئی دوسرا خیال ہی نہ تھا۔ اس کی تمام نظمیں عشق پر اور یوحنانہ کے نام معنون ہوتی تھیں۔

جب دل میں یہ نیا جذبہ پیدا ہو گیا تو اس وقت ان کی طرز گفتگو میں تغیر آگیا۔ وہ بہن بھائی کی طرح ایک دوسرے سے مل کر کبھی مس اور مسٹر کے القاب سے خطاب نہیں کرتے تھے، لیکن انھوں نے پیار کے نام بھی چھوڑ دیے تھے، البتہ کاشاماتٹ ان دونوں کے لئے ابا رہ گیا تھا۔

ایک دن علی الصباح چارلس اپنے کمرہ میں کچھ لکھ رہا تھا۔ یکایک دروازے پر کھٹ کھٹ نے اس کا قلم روک دیا۔ اس نے اپنا سر اٹھا کر کہا۔

—— اندر آجاؤ!

دروازہ کھل گیا اور طلوع شدہ آفتاب کی روشن شعاعوں سے نہائی ہوئی ایک آسمانی ہستی نمودار ہوئی، صبح کی پری کی طرح شاندار اور اسکی شاعری کی دیوی کے دلچسپ شاعرانہ مضامین ساتھ لئے ہوئے۔

—— تم، یوحنانہ! —— وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ تمہیں کیا ضرورت ہے؟ —— تم کیا چاہتی ہو؟

یوحنانہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

—— "چارلس" اس نے زیر لب کہا "مجھے معاف کرو۔ آہ! میں جانتی ہوں کہ جو بات میں ابھی تم سے کہنے والی ہوں پہلے مجھے ابا سے کہنا چاہیے لیکن مجھے نام نہ رکھنا، چارلس مجھے جرأت نہ ہوئی پیارے بھائی مجھے تمہارے سامنے زیادہ جرأت ہو گی۔"

——— "کیا معاملہ ہے"؟ چارلس نے بیقرار ہو کر سوال کیا۔

پہلے سے زیادہ اُس کے منہ پر خون دوڑ گیا۔ اور اپنے سیاہی کے نشانے سے اپنی پیشانی چھپا کر اُس نے آہستہ سے کہا۔

"میں محبت کرتی ہوں"

وہ لرز گیا۔ وہ محبت کرتی ہے اور اس نے بے تکلف اُس سے کہدیا۔ اس درد کو جسے بغیر چوائس کو تکلیف دیگا، اگر وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی ہے

بیچ بیچ ورجا کی کیفیت طاری ہوگئی کہ دیکھیں وہ کس کا نام لیتی ہے۔

وہ صرف یوحنا نہ کے الفاظ کا اعادہ کرنے لگا۔

——— تم محبت کرتی ہو؟

اور بہت آہستہ اُس نے یہ اور اضافہ کیا۔

——— کس سے؟

حسین دوشیزہ کا چہرہ روشن ہوگیا، اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور اس نے زیادہ زور دار آواز میں جواب دیا۔

——— کس سے؟ جوانوں میں سب سے زیادہ حسین، نہایت ہی شریف رو سے، نہایت ہی عالی حوصلہ دل سے۔ کس سے؟ کیا

تم کو میری نسبت شبہ ہے؟ اور تم نہیں سمجھتے ہو کہ میں عدیم المثال شاعری سے محبت کرسکتی ہوں۔ میرے چارلی؟

اس پیارے نام پر، اس پرجوش خطاب پر، محبوب شاعر چارلس کا دل اُچھلنے لگا۔ وہ محبوب تھا اور محبت کرنے والی مہربانی سے خود پہلا اعتراف محبت کیا تھا۔

اے مبارک دن! بغیر مترقبہ لمحے۔

اُس نے اپنا سر جھکایا اور اپنی محبوبہ کے بالوں کو چوم کر آہستہ سے کہا۔

——— یوحنی! میری یوحنی!

اس نے چارلس کو دیکھکر کہا۔

——— آج صبح تم آبا سے کہو گے؟

——— پیاری، آج صبح

وہ چلی گئی اور چارلس نے میز کے پاس بیٹھکر حسب ذیل اشعار لکھے۔

میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، تو مجھ سے محبت کرتی ہے،

دلبر یا دوشیزہ،

میری بہن، منگیتر،

میری محبت کی

مانند دو بہ سوں میں،
پوسوں کو تباہ کراتے ہوئے
ہم اپنی زندگی بسر کریں گے،
دل بہ دل پیوستہ
اور کیونکہ ہماری پیاری محبت
کبھی ختم نہ ہوگی
دنیا ہمارا نام رہے گی " دائمی
عاشق و معشوق "

---- ۴ ----

دو پہرنے آفتاب کے نیچے جھیل کا پانی چمک رہا ہے : جنگل کے درختوں کے پتے ہلکی ہلکی ہوا سے ہلتے ہوئے ساکن پانی کی طرف جھکے ہوئے ہیں، ایک پگڈنڈی سے جو کانٹا مانٹ کے دامن سے جھیل کی طرف گئی ہے نوجوان عاشق و معشوق کا جوڑا نکلا عنقریب حاصل ہونیوالی مسرت کی امید سے سرشار کیونکہ اُس کے بھائی چارلس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ آج ابا سے تذکرہ کریگا، اور اُس نے نو ہزار مرتبہ چارلس کے دوست اپنے شوہر سے اُس پیارے وعدہ کی تکرار کی تھی۔

دونوں جھیل کے ساحل پر ٹھیر گئے۔ وہ سبز پانی کو دیکھ رہے ہیں جس پر بطیں اور ہنس تیر رہے تھے، جن کے اوپر ابابیلیں گاتے ہوئے اڑ رہے تھے۔ اُن کے دلوں میں ایک ہی جذبہ ہے۔ جوان کے ہاتھوں کو اُن کے لبوں کے قریب لا رہا ہے۔ فریڈرک کا ہاتھ اپنی دوست کی کمر میں ہے۔ وہ بے حس و حرکت ہیں اپنی محبت، اپنے شوق کی نہایت پرواز میں قریباً بے خود۔

تمام وقت چارلس نے اسی شوق میں گذارا۔ وہ اپنے آپ کو محبوب یقین کرتا تھا اور اپنی خوشی میں اُس نے اپنے شاندار مستقبل کے دیکھنے کی جرات نہیں کی اس خواہش کی وجہ سے کہ جس قدر دیر تک ممکن ہو یہ مبارک راز تنہا اُسی کے لئے ہو، اُس نے اپنے باپ سے ذکر نہیں کیا۔ جب رات ہو جائیگی، جب پہاڑ کے سائے میدانوں کو ڈھانپ لیں گے۔ بس اُسی وقت شاعر اعظم سے محبت کے شیریں نغمے کا اپنی بیوی کی محبت کا اعتراف کریگا۔

جب سورج آسمان میں بلند ہوتا ہے، تو اُس کے خون میں ہیجان پیدا ہوتا ہے، اُسے گرمی معلوم ہوتی ہے۔ فرط خوشی سے اُس کا دم گھٹتا ہے۔ وہ دن کا کھانا نہیں کھا سکتا۔ وہ پرگو و نکلتا ہے۔ پُر مسرت عہد طفلی کے گھر سے، اپنے باپ کے گھر سے جہاں وہ اُس سے آشنا ہوا، اُس سے محبت کی جہاں خود اُس نے آج اپنی محبت کا اعتراف کیا وہ جنگل کی طرف قدم اُٹھاتا ہے۔ اس جھیل کی طرف جس کے قریب بیٹھکر آج کی غیر مترقبہ لا انتہا مسرت شادمانی سے پہلے بہ اثر ہے خیال میں رہا کرتا تھا۔

[illegible] بہت جلد ان کی ہو جائیگی !

بوسوں کی آواز اُس کو روک دیتی ہے، کوئی عاشق و معشوق قریب ہی موجود ہیں۔ محبت کی وجہ سے اس کی طرح مسرور، آہا ! نا آشنا عاشق و معشوق

جن کا لطف و نشاط گویا ابھی سے لطف و نشاط کا وعدہ ، و توثیق ہے ! وہ اپنے شناسائی کی جھیل کے سامنے ان کے شوق میں حصہ لینے کی خواہش کرتا ہے ، وہ سب کچھ ان سے کہدیگا ، جو کچھ وہ محسوس کرتا ہے ، جو کچھ وہ خیال کرتا ہے ! اگر وہ غریب ہیں تو وہ ان کو جگہ دیگا تاکہ ان کی شکر گذاریاں اس کی محبت کو متبرک بنادیں ، وہ آگے بڑھتا ہے ---------- اور وہ دیکھتا ہے ! ---

وہ ! وہ ! یوحنانہ ، یوحنی ، اس کی یوحی ! ---------- وہ ! وہ ! نہایت عزیز دوست فریڈرک ! ---------- وہی ہیں ، اپنی لطف و شوق میں اپنے کو کہ انھوں نے اسے نہیں دیکھا ، اس کے قدموں کی آہٹ نہیں سنی ، وہ سبز جھیل کو نیلے آسمان کو دیکھ رہے ہیں ، اور مسکراتے ہوئے ایک دوسرے کے بوسے لے رہے ہیں -

وہ دغاباز جھوٹی . اس نے آج صبح خود اس سے اپنی محبت کا تذکرہ کیا ! یہ کیوں ؟ اس نے کبھی تمنا نہیں کی ، وہ بلا حرف شکایت زبان پر لائے درد کو برداشت کر لیتا - لیکن ایسا اس امید کے بعد ، مستقبل کے اس یقین کے بعد ، حادثہ نہایت سخت ، جھوٹ نہایت بیجا ہے . سنگدل عورت کے لئے کوئی رحم نہیں ہے ، وہ اسے رسوا کر دے ، اسے قتل کر دے !

چند قدم آگے بڑھکر وہ اسیر عشق جوڑے کے سامنے آجاتا ہے - وہ ابھی کہے گا . وہ ابھی فریب دہی پر سرزنش کریگا - لیکن یوحنانہ اپنی خوبصورت نیلی آنکھیں اٹھاتی ہے ، اس کے چہرے پر خوشی سے خون دوڑ جاتا ہے ، اور وہ شیریں لہجہ میں کہتی ہے !

میں کس قدر خوش قسمت ہوں ، پیارے بھائی چارلس ، کہ تم نے بوسلنے اولیں دیکھے جن کا میں نے ابھی اس سے تبادلہ کیا . جو بھائی تمہاری مہربانی سے اب میرا منگیتر ہے -

ہاں ، فریڈرک نے کہا ، ہاں دوست ، یوحی نے مجھ سے کہدیا ، میں جانتا ہوں کہ تمہاری عنایت سے میں اپنی مراد حاصل کرونگا -

چارلس سمجھ گیا ، یوحی جھوٹی نہیں ہے - وہ غلطی پر تھا ، وہ بھول گیا تھا ، کہ اس کی طرح فریڈرک بھی شاعر تھا ! اور ایک نوجوان دوشیزہ کا جوش محبت جس طرح اس کی طرف ، اسی طرح فریڈرک کی طرف بھی رخ کر سکتا ہے -

سخت کوششوں کے بعد وہ اپنے جذبات کو قابو میں کرکے اخلاق سے جواب دیتا ہے -

میرا شکریہ ادا نہ کرو ، میں صبح ابا سے نہیں ملا . لیکن شام کو میں ان سے کہونگا -

اور وہ روتا ہوا اپنے گھر واپس جاتا ہے ، اور عاشق و معشوق جنھوں نے اس کے درد کو نہیں سمجھا ، جنگل میں سیر و تفریح کرتے رہتے ہیں -

(۵)

میز پر ایک سفید ورق پڑا ہوا ہے . صفحے کے بالائی حصے پر چند اشعار لکھے ہوئے ہیں جو چارلس نے اپنی امیدوں کا گیت گاتے ہوئے صبح کو لکھے تھے ، وہ ان اشعار کو بار بار پڑھتا ہے - نہیں ! نہیں ! یہ ممکن نہیں ہے ! وہ یوحنانہ کا ہاتھ فریڈرک کے ہاتھ میں نہیں دیگا ! شاید باوجود ان سب باتوں کے وہ شادی کر لیں گے ، لیکن اس حالت میں وعدے کو حقیقت بنانے والا وہ نہیں ہوگا ! وہ اپنے باپ سے نہیں کہے گا ؛ وہ خود ہی کہیں ! معلوم ہوتا ہے کہ کانٹا مانٹ فریڈرک سے زیادہ محبت نہیں کرتا - رفتہ رفتہ جب دونوں جوانوں کی شاعرانہ عزت نے ترقی کی تو باپ کی رشک آمیز محبت نے یہ اندیشہ دل میں پیدا کر دیا تھا کہ بیٹے کا دوست اس کا حریف مقابل ہوگا - آہ ! آج یہ اندیشہ اک واقعہ ہو گیا : یقیناً یہ بات

سمجھ گئی ہے اسی لئے وہ شاعرِ اعظم سے کہتے ہوئے ڈرتی ہے ، اگر وہ باپ سے منظوری کی درخواست کریگا ، تو کانٹا مانٹ برابر انکار کر دیگا۔ نہیں اسکی دوست ، قزاقِ محبت کی بیوی کبھی نہیں ہوگی ! یہی خیال اُس کے زخمی دل کا مرہم ہے۔

لیکن نہ صرف فریڈرک کو جواب مردود سے صدمہ ہوگا، بلکہ یوخانہ : وہ دلربا دوشیزہ ، سالہائے ماضی کی ننھی بچی محمد غلام کی بہن ، وہ پیاری ، باوجود سب باتوں کے وہ پیاری ہے ، اس کو بڑی صدمہ ہوتا !

چارلس کاغذ کا ورق ہاتھ میں لیکر ان اشعار کو چومتا ہے جو صبح اُس نے لکھے تھے ، اور انکے نیچے وہ نئے اشعار لکھتا ہے ، آنسو ، درد ، اور قربانی کے اشعار۔ پھر وہ اپنے کمرے سے نکلکر باپ کے پاس جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ وہ یوخانہ کی شادی فریڈرک کے ساتھ منظور کرے۔ کانٹا مانٹ اس تجویز کی مخالفت کرتا ہے ، لیکن آخر قبول کر لیتا ہے۔ چارلس تہ دل اور صداقت سے اس کا شکریہ ادا کرتا ہے ، کیونکہ یوخانہ اس کو اپنی جان سے پیاری ہے۔

وہ اپنے کمرے میں واپس آتا ہے دونوں نظمیں ایک کاغذ پر لکھی ہوئی وہیں رکھی ہیں وہ صفحہ چاک کر ڈالتا ہے ، امید کے اشعار جو اس نے صبح لکھے تھے اپنے سینے پر رکھ لیتا ہے۔ دوسری نظم کو میز ہی پر چھوڑ دیتا ہے ، اور وہ جنگل کی طرف نکل جاتا ہے نرم کا جھٹپٹا ہوجاتا ہے۔ آنیوالی رات ، امیدوں کو ، کلیوں کو ، خوشیوں کو ، اور پورے خاموش عالم کو ڈھانپ رہی ہے جو اس وقت اس جگہ ہو رہا تھا ، پرسکون کائنات ، روحوں کی بےچینی نہیں جانتی جیسا اُسی طرح چھپا رہے ہیں جس طرح مسرت بخش امیدوں میں چھپاتے ہیں۔

چارلس مسرتِ مرحومہ کے اشعار اپنے دل پر رکھکر اس پگڈنڈی سے جو کانٹا مانٹ کے مکان سے گئی ہے جھیل کی طرف جاتا ہے۔ پانی قریب آگیا وہ برابر بڑھتا چلا گیا ، اُس کے پیر پانی میں ڈوب گئے وہ نہیں رکا۔ اُس کے گھٹنے ، اُس کی کمر ، اس کا سینہ پانی میں ڈوب گیا وہ نہیں رکا ، اور جب آخری مرتبہ وہ جوشِ عشق سے چلایا " یوحی " اس کا سر خوابیدہ جھیل کی ساکن سطح کے نیچے چھپ گیا۔

(۴)

جب کانٹا مانٹ نے یوخانہ اور فریڈرک کی شادی منظور کرلی تو اسی وقت اُس نے اُن دونوں کو بلوایا اور انکو برکت دیکر عیش و نشاط کے بےپایاں راستے کی طرف بھیجدیا۔ اسکے بعد وہ اپنے بیٹے کے کمرے کی طرف آیا کہ چارلس کو اس شادی کا علم ہوجانے ، لیکن کمرہ خالی تھا اور کانٹا مانٹ نے میز پر صرف ایک پھٹا ہوا کاغذ دیکھا اور اس نے اپنے قابل بیٹے کے آخری اشعار پڑھے۔

محبوبہ کو الوداع۔

جبکہ میں نے تیرے حسن کو دیکھا ؛　　　خوشی سے میرا دل اچھلنے لگا ؛

تو سب سے زیادہ دلربا دوشیزہ ہے ؛　　　میں تجھ سے محبت کرتا ہوں ؛

جبکہ میں نے تیرے محبوب کو دیکھا تھا ؛　　　میں درد سے رونے لگا ؛

میں تجھے ہاتھ سے کھو دونگا اور مجھے بےانتہا رنج ہوگا ؛　　　تو اُس سے محبت کرتی ہے ؛

الوداع ، تو حسین محبوبہ　　　تو اس کے ساتھ عیش کر ؛

میں مر جاؤنگا ؛ تم دونوں یاد رکھو کہ میں نے اپنے آپکو　　　قربان کر دیا　　　اس لئے کہ تیرے دلکو پیاری کبھی رنج نہ پہنچے ؛ ؛ ؛

جب کانٹا مانٹ نے ان اشعار کو ختم کیا ، اسی وقت خدمتگار اسکے بیٹے کی لاش گھر میں لیکر آئے ———— دو میاں بیوی کو جو دوسرے ملکوں میں چلے گئے اس کی قربانی کا علم نہیں ہوا۔

" سماک رامح "

سرمدی زندگی عطا کر دی — لے غم دوست! تیری عمر دراز
طاقتِ ضبطِ راز سلب نہ کر — جو مرا راز خود وہ تیرا راز!
اے حقیقت کے چہرۂ تاباں — حیف! تو اور پس حجاب مجاز
اگر آزادہ گردش ہے تو ہو — کون سمجھائے۔ میں نہ آپ مجاز

اکبر حیدری

محروم التجا ہیں سب التجا شناس — اہلِ خدا میں کوئی نہیں اب خدا شناس
تیری ادائے ناز کے پردہ میں آ گری — میری قضا ہے مجھ سے زیادہ ادا شناس
مجھ کو بگڑ گیا ہے تبسم مرا اسے — تیری نگاہِ مست بھی ہے مدعا شناس
اظہارِ التفات کی زحمت نہ کیجئے — میں ابتدا شناس ہوں اب انتہا شناس
تعمیلِ حکمِ ضبط تو برحق سہی مگر — قسمت سے مل گیا جو کوئی مدعا شناس

اکبر کو دشمنوں کی ملیگی ضرور داد
قسمت اگر بنا ئیگی تم کو وفا شناس

باسط بسوانی

اپنے اپنے گھر گئے سب مجھکو سمجھانے کے بعد — پھر بھی میں روتا رہا تیرا خیال آنے کے بعد
کچھ یہاں آتا تھا غالب پر بیخودی عشق کا — سو گئی محفل کی محفل میرے افسانے کے بعد
زندگی میں بھول کر لغزش نہ ہو انسان سے — گر خیال آتا ہے کیا ہوگا مر جانے کے بعد
اور ہوں گے شکل بلبل آشنائے زندگی ہو — ہمنے دامن سے نہ پھینکے پھول مرجھانیکے بعد

باسطِ مجنوں سے آشفتہ سری کا نام تھا
ختم ہوگی دیوانگی بھی تیرے دیوانیکے بعد

استفسارات

فرقۂ زیدیہ - ابوالعتاہیہ - جناب شہربانو

(جناب سید محمد جعفر حسین صاحب خسرو چہ)

(۱) فرقۂ زیدیہ جس کے متبعین یمن میں بکثرت موجود ہیں اس کی بنیاد کب پڑی، اس فرقہ کے مخصوص عقاید کیا ہیں، مفصل بیان سے آگاہ فرمائیے۔

(۲) عربی شاعر ابوالعتاہیہ کے مختصر حالات درکار ہیں۔

(۳) علامہ شبلی نعمانی نے الفاروق حصۂ دوم میں جناب شہربانو کا حضرت امام حسینؑ کی زوجہ ہونے سے انکار کیا ہے اگر یہ صحیح ہے تو امام زین العابدین کی والدہ کون تھیں۔

(۴) تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پندرہویں سولھویں صدی عیسوی میں عربوں کے جہاز تمام بحر ہند میں موجود تھے آپ براہ کرم اسلامی عہد کی عربی بحری تجارت پر روشنی ڈالیے۔

(نگار) (۱) اس جماعت کو زیدیہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ امام زین العابدین کے بعد زید کی امامت کے قایل ہیں۔ جب زید بن علی بن زین العابدین نے خروج کیا تو ہشام بن عبدالملک مروانی کا زمانہ تھا اور کوفہ و عراق کی گورنری یوسف بن عمر ثقفی کے ہاتھ میں تھی، اوّل اوّل تو بہت سے شیعہ اُن کے ساتھ ہوگئے تھے، لیکن بعد کو علیحدہ ہوگئے، اور آپ شہید ہوئے۔ تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے بھی اس خروج میں اعانت کی تھی اور لوگوں کو اس طرف راغب کرتے تھے اور مالی مدد بھی دیتے تھے۔ مولانا شبلی نے اس واقعہ سے انکار کیا ہے، لیکن علامہ زمخشری، امام رازی اور صاحب صواعق محرقہ نے اس کی تصدیق کی ہے۔

حضرت ابوبکر و جناب فاروق کے متعلق حضرت زید بن علی کا جو خیال تھا وہ اس واقعہ سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جب آپ نے ہشام کے خلاف جنگی تیاریاں کیں اور بعض لوگوں نے آپ سے سوال کیا کہ "شیخین کے بابت آپ کیا کہتے ہیں" تو آپ نے جواب دیا کہ "وہ اچھے لوگ تھے، انھوں نے عدل و انصاف کیا قرآن اور سنت رسول پر عامل رہے"

تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک زیدیہ جماعت میں کوئی تعصب پیدا نہ ہوا تھا اور مسئلۂ خلافت میں اُن کا یہ اعتقاد تھا کہ "ہر چند حق خلافت جناب امیر کو پہنچتا تھا، لیکن انھوں نے خود خلفاء ثلثہ کو یہ حق دیدیا تھا، اور اس لئے اُن کی خلافت بالکل درست تھی" لیکن تیسری صدی ہجری کے آخر تک اسماعیلیہ

واماميہ مذہب کی بہت سی باتیں اس جماعت نے اختیار کرلیں اور خیالات و اعتقادات میں بہت تغیر پیدا ہوگیا۔

چونکہ زید بن علی مشہور معتزلی امام واصل بن عطا کے شاگرد تھے، اس لئے ان کے اصول میں بہت کچھ جھلک اعتزال کی پائی جاتی ہے، گو فروعی مسائل میں زیادہ تر حنفی مسلک کا اتباع پایا جاتا ہے۔ آخر چھٹی صدی ہجری کے حالات ابن جبیر کے سفرنامہ سے یہ معلوم ہوتے ہیں کہ حرم میں اکثر شرفا کا مذہب زیدیہ تھا اور ان کا ایک امام بھی تھا، نماز جمعہ وعصر ملا کر پڑھتے تھے۔

جناب زید کی شہادت کے بعد اس جماعت میں امامت کے متعلق بہت اختلاف پیدا ہوگیا۔

(۲) ابو العتاہیہ کے حالات ابن خلکان نے تفصیل سے لکھے ہیں، اس کا پورا نام ابو اسحاق اسمٰعیل بن ابی القاسم بن سوید بن کیسان تھا ۱۳۰ھ میں مقام عین التمر میں پیدا ہوا جو مدینہ الانبار کے قریب ایک قصبہ تھا۔ اس کی پرورش کوفہ میں ہوئی جوان ہوکر بغداد میں بود و باش اختیار کی یہ گھڑے بیچا کرتا تھا اسی لئے جرار کہلاتے تھے۔ خلیفہ مہدی عباسی کا زمانہ تھا اور اس کی کنیز عتبہ کے ساتھ ابو العتاہیہ کو عشق تھا، چنانچہ اس کے بہت سے اشعار اس کنیز سے متعلق ہیں اور بعض دلچسپ واقعات ابن خلکان نے درج کئے ہیں، یہ اپنے زمانہ کا بڑا بے مثل شاعر تھا اور علاوہ مدحیہ اشعار کے اس نے دواعی عشق و محبت کے جذبات بھی نہایت حسن کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار مثالاً درج کرتا ہوں:-

ولقد صبوت الیک حتی — صار من فرط التصابی

یجد الجلیس اذا دنا — ریح التصابی فی ثیابی

یعنی تیری محبت میں میرا یہ حال ہوگیا ہے کہ اگر کوئی میرے قریب آتا ہے تو اس کو میرے کپڑوں سے بوئے سوزش محسوس ہوتی ہے

کم من صدیق لی اسا — رقہ البکاء من الحیاء

واذا تفطن لامنی — فاقول ما بی من بکاء

لکن ذہبت لارتدی — فطرفت عینی بالرداء

فرط حیات سے میں اپنی گریہ وزاری دوستوں سے چھپاتا ہوں، کیونکہ وہ ملامت کرتے ہیں اور مجھے کہنا پڑتا ہے کہ میں روتا نہیں ہوں، اس غرض سے میں اپنی چادر کا کونہ آنکھ میں مار لیتا ہوں تاکہ یہ کہنے کو ہو جائے کہ آنسو نکلنے کا سبب یہ ہے۔

ایک مرتبہ ابو العتاہیہ نے شعر کہنا ترک کر دیا تھا جس پر خلیفہ مہدی نے اسے قید کر دیا، لیکن بعد کو جب اس نے وعدہ کیا کہ شعر کہے گا تو چھوڑ دیا۔ جب وقت آخر آیا تو اس نے مخارق مغنی کو بلاکر کہا کہ یہ شعر گائے۔

اذا ما انقضت عنی من الدہر مدتی — فان عزاء الباکیات قلیل

سیعرض عن ذکری وتنسی مودتی — ویحدث بعدی للخلیل خلیل

یعنی جب میری عمر ختم ہو جائیگی تو مجھ پر رونے والیوں کا رنج بھی رفتہ رفتہ کم ہو جائیگا، میرا ذکر بھی لوگ چھوڑ دیں گے، دوستی کو بھی فراموش کر دیں گے، اور میرے بعد دوستوں کے اور نئے دوست پیدا ہو جائیں گے۔

اس نے وصیت کی تھی کہ میری قبر پر یہ بیت کندہ کر دی جائے۔

ان عیشاً یکون آخرہ الموت لعیش معجل التنغیص

وہ زندگی جس کا انجام موت ہے، بہت جلد مکدر ہو جانے والی زندگی ہے سلا۲۱ھ میں اس کا انتقال ہوا اور رود عیسیٰ کے ساحل پر دفن کیا گیا

(۳) جناب شہر بانو اور امام زین العابدین کے متعلق جو امور اس استفسار مخصوص کے سلسلہ میں زیر بحث آسکتے ہیں یہ ہیں:-

(۱) جناب شہر بانو امام زین العابدین کی والدہ تھیں یا نہیں۔

(۲) اگر تھیں تو امام حسین علیہ السلام کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں کب منسلک ہوئیں۔

امر اول کی نسبت تو کسی کو انکار نہیں اور سب اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ امام زین العابدین کی والدہ جناب شہر بانو تھیں، لیکن مورخین کی روایات میں نام کا اختلاف پایا جاتا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں پہلے اس مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی جائے اور اس کے بعد یہ تحقیق کی جائے کہ آپ کب امام حسینؑ کی بیوی بنیں۔

ابن خلکان حالات زین العابدین کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ "آپ ائمہ اثنا عشر میں سے ایک امام ہیں، سادات تابعین میں سے ہیں، ان کی ماں سلافہ تھیں، جو فارس کے آخیری بادشاہ کی بیٹی تھیں"

ابن قتیبہ نے معارف میں بیان کیا ہے کہ "زین العابدین کی ماں کا نام سلافہ تھا اور غزالہ بھی کہا جاتا ہے"

طبقات ابن سعد میں آپ کا نام غزالہ لکھا ہے۔

کتاب الالکافی میں "سارہ بنت کسریٰ نوشیرواں" لکھا ہے اور ابن خلکان کے ایک دوسرے نسخہ میں "سلامہ بنت یزدجرد" تحریر ہے واقدی نے ایک طویل روایت موسیٰ بن عبداللہ سے نقل کرتے ہوئے آپ نام شاہزان بتایا ہے، اور مولانا جامی نے شواہد النبوۃ میں شہر بانو تحریر کیا ہے اسی طرح تحفۃ العالم میں آپ کا نام شہر بانو درج ہے۔

یقیناً ناموں کا یہ اختلاف بہت تعجب انگیز ہے، لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ امام زین العابدین کی ماں ایران کے آخری بادشاہ کی لڑکی تھیں تو یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ان کا نام سارہ، غزالہ، سلافہ، یا سلامہ کسی طرح نہیں ہو سکتا تھا، کیونکہ عجمیوں میں ان ناموں کا رواج ہی نہ تھا، واقدی نے شاہزان لکھا ہے، جو یقیناً شاہ بانو کی بگڑی ہوئی صورت ہے، باقی سارہ اور غزالہ وغیرہ سو یہ یا تو وہ نام ہیں جو مدینہ آنے کے بعد رکھے گئے یا پھر انھوں نے بھی مختلف راویوں کے مختلف تلفظ کی وجہ سے بگڑ کر یہ صورت اختیار کرلی، بالکل قرین قیاس ہے کہ لفظ شہر بانو نے پہلے شاہزان کی صورت اختیار کی ہو اور شاہزان بعد کو سارہ ہو گیا ہو، اور سلافہ یا سلامہ اسی سارہ کی مسخ صورتیں ہوں، غزالہ ان کا یقیناً لقبی نام ہوگا، جو ان کے حسن و رعنائی کے لحاظ سے رکھا گیا ہوگا۔

چونکہ امام زین العابدین کی والدہ کا بادشاہ کسریٰ کی بیٹی ہونا ثابت ہے اس لئے نام کی بہترین تحقیق کا ذریعہ عجم کی فارسی تاریخیں ہو سکتی ہیں اور ان سب میں شہر بانو ہی لکھا ہے۔

اب یہ مسئلہ غور طلب ہے کہ آپ کب امام حسینؑ کے ازدواج میں آئیں اس کے متعلق علامہ زمخشری نے ربیع الابرار میں لکھا ہے کہ عہد فاروق اعظم میں یزدجرد (شہنشاہ ایران) کی تین بیٹیاں گرفتار ہو کر آئی تھیں، جن میں سے ایک عبداللہ بن عمر کو دی گئی، دوسری محمد بن ابی بکر کو، تیسری

حسین بن علی کو واقدی نے جو روایت موسیٰ بن عبداللہ سے نقل کی ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے :-

"ہاشم بن عتبہ نے ان لوگوں کا تعاقب کیا جو شاہ ایران کے لشکر سے بھاگے تھے چھپا چھپاتے کرتے مرج جلولاء تک پہنچا یہاں اہل فارس کا دوسرا لشکر ملا جو ہتیاروں، ہودجوں، خدمتگاروں اور لونڈیوں، غلاموں وغیرہ پر مشتمل تھا اور یہ سب لوگ ایک گیلی لکڑی کے بنے ہوئے مکان کے گرد جمع تھے۔ اس مکان پر طرح طرح کے زرین کپڑے پڑے تھے جو جواہرات سے جگمگا رہے تھے۔ جب ہاشم نے یہ دیکھا تو اپنے تمام لشکر سے ان پر حملہ کر دیا۔ یہ مکان بادشاہ یزدجرد کی بیٹی شاہزان کا تھا جو سافر بن ہرمز کی نگرانی میں تھا، ہاشم نے سافر اور اُس کے اکثر ساتھیوں کو قتل کر دیا لکڑی کا یہ مکان اور اس کی چیزیں ہاشم کے سپرد کی گئیں ان سب کو لیکر یہ سعد کے پاس آئے اور بتایا کہ کسریٰ کی بیٹی ان کے ساتھ ہے، سعد نے یہ سنکر کہا اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر۔"

واقدی کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے جنگ قادسیہ کے متعلق یہ روایت لکھی ہے، کیونکہ ہاشم بن عتبہ اسی جنگ میں کمک لیکر پہنچے تھے اور سعد بن ابی وقاص نے ذکر سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت جنگ قادسیہ سے متعلق ہو گی یا جنگ مدائن سے، لیکن ان جنگوں میں کسریٰ کی بیٹیوں کا ہاتھ آنا کسی اور معتبر تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا اور نہ ایسا ممکن معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں جنگوں میں ایرانیوں کو ایسی شکست نہیں ہوئی تھی کہ مسلمانوں کا ہاتھ کسریٰ کی لڑکیوں تک پہنچ جاتا۔

واقدی اور زمخشری کو مورخ ہونے کی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں اس لئے محض ان کی روایات پر اعتماد کرکے یہ کہدینا کہ بنات ثلٰثہ عہد فاروقی میں گرفتار ہو کر آئی تھیں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ علی الخصوص اس وقت جبکہ بلاذری جو نہایت ثقہ مورخ ہے فتوح البلدان میں عبداللہ بن صالح سے ایک ایسی روایت نقل کرتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنگ مدائن میں جو عورتیں ہاتھ آئی تھیں وہ کسریٰ کی چند کنیزیں تھیں اور اصل راوی کا بیان اس لئے اور زیادہ موثق ہے کہ ان لونڈیوں میں خود اُس کی ماں بھی شامل تھی، چنانچہ بلاذری نے اصل راوی کے جو الفاظ نقل کئے ہیں یہ ہیں :-

"اخذ المسلمون یوم المدائن جواری من جواری کسریٰ فکانت امی احداھن"

یعنی مسلمانوں نے جنگ مدائن میں کسریٰ کی چند لونڈیاں گرفتار کیں جن میں سے ایک میری ماں بھی تھی، اگر کسریٰ کی کوئی بیٹی گرفتار کی گئی ہوتی تو اس کا ذکر سب سے پہلے کیا جاتا۔

اب یہ دیکھنا چاہئیے کہ یزدجرد کب قتل ہوا، سو اس میں کلام نہیں کہ وہ ۳۱ھ میں بمقام مرو مارا گیا، لیکن اس بے سروسامانی اور دربدر مارے پھرتے رہنے کی حالت میں بھی اس کی شان و شوکت کا جو عالم تھا وہ صاحب ناسخ التواریخ نے اس طرح لکھا ہے :-

"در ہنگامیکہ در روز سے چند بود زاد انجا کوچ داده به مرو آمد- ایں وقت چهار هزار مردم ملازم خدمت یزدجرد بود"

"و ایشاں ہمہ ندیمان و دبیران و فراشان و غلامان و طباخان و خاصگان خدمت بودند، و ہمچناں زنان و کنیزگان"

" وخصیان بودند وایں جملہ از مداین سے شہر بشہر با خود کشیدہ ہمی داد "

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مداین میں شکست کھانے کے بعد جب یزدجرد بھاگا ہے تو اخیر وقت تک جب وہ مرو پہنچا ہے تمام حشم و خدم اس کے ساتھ تھے، پھر یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کی لڑکیاں ساتھ نہ ہی ہونگی، اور وہ پہلے ہی مسلمانوں کے ہاتھ آگئی ہونگی۔

اس سے بھی زیادہ ثبوت ایک اور ہے جو بلاذری کے فتوح البلدان سے دستیاب ہوتا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ :۔

" جب یزدجرد خراسان کی طرف بھاگا اور حدود مرو سے گزر گیا تو طرخان نے یزدجرد کے پاس پیغام بھیجا " کہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کردو " جس کو سن کر یزدجرد نے یہ جواب لکھا کہ تو میرا غلام ہو کر ایسی جرات کرتا ہے "

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب یزدجرد مرو پہنچا ہے تو اس کی لڑکیاں ساتھ تھیں ورنہ طرخان پیغام کیوں بھیجتا۔ پھر چونکہ یزدجرد سنہ ۳۱ھ میں مارا گیا ہے اس لئے یہ یقینی ہے کہ سنہ ۳۱ھ سے پہلے یزدجرد کی بیٹیاں مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آئیں اور عمر فاروق کا زمانہ سنہ ۲۳ھ میں ختم ہو کر عہد عثمانی شروع ہو گیا تھا، بنابراں جناب شاہ بانو کا آنا عہد عثمان غنیؓ میں ثابت ہوتا ہے۔

مولانا شبلی نے الفاروق میں جو اس واقعہ سے انکار کیا ہے تو غالباً اس سے مراد ان کی یہی ہے کہ عہد فاروقی میں جناب شاہ بانو کا آنا ثابت نہیں ہوتا، اور ہر چند اس امر پر انھوں نے کوئی تاریخی تحقیق پیش نہیں کی ہے، لیکن شاید اس کا موقع بھی نہ تھا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ حضرت فاروقؓ کے عہد میں جس وقت جناب شاہ بانو کا آنا ظاہر کیا جاتا ہے اس وقت امام حسینؓ کی عمر صرف بارہ سال کی تھی اور اس سن میں یقیناً کسی طرح مناسب نہ تھا کہ شاہ بانو آپ کے سپرد کر دیجاتیں جب کہ وہ خود بھی بچہ تھیں۔

امام زین العابدینؓ کی ولادت سنہ ۳۳ھ میں ہوئی اور سنہ ۳۱ھ میں یزدجرد قتل ہوا ہے، اس لئے قرینہ بھی یہی چاہتا ہے کہ سنہ ۳۱ھ میں آپ آئی ہونگی جبکہ وہ خود بھی جوان تھیں اور امام حسینؓ بھی جوان تھے، اور اس مواصلت کے تیسرے سال سنہ ۳۳ھ میں امام زین العابدینؓ پیدا ہوئے۔

(۴) اس موضوع پر نگار میں ایک تفصیلی مضمون شائع ہو چکا ہے۔

جناب شہر بانو

(محمد فضل حسین صاحب فاروقی عادل آباد)

" امید ہے کہ آپ اپنے پرچۂ نگار میں اس واقعہ پر روشنی ڈالیں گے، جس سے اکثر مستند تاریخیں بھی ساکت نظر آتی ہیں کہ واقعۂ کربلا کے بعد حضرت بی بی شہر بانو صاحبہ کہاں تشریف لے گئیں اور کب تک بقید حیات رہیں۔ آپکی محترم ہستی ایسی نہیں ہے کہ آپ کی زندگی پر پردہ پڑا رہے۔ امید ہے کہ جناب حوالۂ تاریخ کے ساتھ مفصل بحث فرمائیں گے "

(نگار) یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ جناب شہر بانو کے متعلق ساتھ ہی دو استفسار آگئے، لیکن ان کی نوعیت مختلف ہے، ایک صاحب نے

تو مرت مولٰنا شبلی کی الفاروق دیکھ کر یہ دریافت کیا کہ جناب شہربانو امام زین العابدین کی والدہ تھیں یا نہیں اور آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ واقعۂ کربلا کے بعد وہ کہاں تشریف لے گئیں اور کب تک زندہ رہیں۔

اس میں شک نہیں کہ جناب شہربانو کے حالات ہمارے ہاں کی تاریخی کتابوں میں بہت کم ملتے ہیں، یہاں تک کہ بڑے بڑے مورخ طبری، ابن اثیر اور ابن خلدون وغیرہ نے بھی سکوت اختیار کیا ہے، آپ نے ماسبق استفسارات میں ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ جناب شہربانو کے گرفتار ہو کر آنے اور خود ان کے نام کے متعلق مورخین میں کس قدر اختلاف ہے، لیکن چونکہ اور تاریخی قرائن ایسے موجود ہیں جن سے یہ بات تحقیق ہو سکتی کہ آپ کب تشریف لائیں، اس لئے میں نے اسے عرض کر دیا، لیکن آپ کا سوال تو ایسا ہے جس کا میں کوئی جواب دے ہی نہیں سکتا۔

واقعۂ کربلا کے وقت آپ کا موجود ہونا ثابت ہوتا ہے لیکن اس کے بعد کا حال کتب تاریخ میں بالکل نہیں ملتا۔ خیال ہوتا ہے کہ وہ واقعۂ کربلا کے بعد دُلدُل پر سوار ہو کر عجم کی طرف چلی گئیں اور وہیں کسی جگہ آپ کی وفات ہوئی۔ شیعی مورخین کی روایات چونکہ زیادہ تر مذہبی خوش اعتقادی کا پہلو لئے ہوئے ہیں اس لئے ان کا اندراج مناسب نہیں ہے، تاہم میں نے اپنے بعض ایسے شیعی احباب کو لکھا ہے جو مورخانہ نقد و اختبار کی قابلیت رکھتے ہیں، اور اگر انھوں نے کوئی معقول جواب دیا تو پھر میں اس پر اپنی رائے ظاہر کروں گا۔

(جناب سید ضامن حسین صاحب۔ انبالہ)

"شیخ سعدی کا ایک شعر۔

قرص خورشید در سیاہی شد
یونس اندر دہان ماہی شد

اس دوسرے مصرعہ کا مطلب بعض لوگ یہ بتاتے ہیں کہ ماہی سے مراد برج حوت ہے۔ اور یونس کسی سیارہ کا نام ہے شاید وغیرہ۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تو اس سے مراد یونس نبی ہیں اور دہان ماہی میں چلے جانے کا واقعہ وہی ہے جو مشہور ہے کہ آپ مچھلی کے پیٹ میں چالیس دن تک رہے، براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس شعر کا کیا مطلب ہے، اگر موخر الذکر مطلب صحیح ہے تو از روئے تحقیق اس سے بھی مطلع فرمائیے، کہ یونس علیہ السلام کیونکر مچھلی کے پیٹ میں اتنے دنوں تک رہے اور پھر زندہ نکل آنے کا کیا سبب ہوا۔؟"

(نگار) سعدی کے اس شعر کا مطلب تو وہی ہے جو آپ سمجھے ہیں۔ برج حوت اور وغیرہ نہایت لغو اور مہمل تاویل ہے، اور مطلع مصرعہ

کا شبہ پیدا ہوتا ہے یا برعکس اس کے یعنی یونسؑ کا دہانِ ماہی میں چلا جانا ایسا تھا جیسے آفتاب ابر کی سیاہی میں چھپ جاتا ہے۔ یا آفتاب کا ابر میں چھپ جانا ایسا تھا جیسے یونسؑ کا دہانِ ماہی چلا جانا، بہرحال سیاق و سباق کے لحاظ سے جو صورت بہ آسانی لگا نے سے شبہ و مشبہ بہ کی تعیین ہو سکتی ہے۔

اب آپ کا یہ سوال کہ یونس بطنِ ماہی میں کیونکر چالیس دن تک زندہ رہے، ضرور غور طلب ہے۔ یونسؑ کے متعلق جو قصہ عام طور پر مشہور رہے پہلے میں اسے درج کرتا ہوں اور پھر غور کروں گا کہ کلام مجید سے اس کی تصدیق کہاں تک ہوتی ہے، کیونکہ ہمارے پاس عہد قدیم کے اس قسم کے واقعات کی جانچ کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ یونسؑ شہر نینوا کے لوگوں کو شریعت موسوی کی دعوت دیتے تھے، لیکن جب کسی نے آپکی وعظ و نصیحت کو نہ مانا تو آپ نے بد دعا کی اور نزول عذاب کے وقت آپ شہر سے باہر چلے گئے۔ صبح کو ایک ابر سرخ شہر پر چھا گیا جس سے آگ برسنے لگی، لوگوں نے یونسؑ کو ڈھونڈھا کہ اُن کے ہات پر توبہ کرکے اس عذاب سے نجات حاصل کریں لیکن وہ نہ ملے کیونکہ وہ بہت دور چلے گئے تھے، مجبور ہو کر شہر والے باہر نکلے اور تین روز تک گریہ و زاری کے ساتھ توبہ کرتے رہے، چوتھے روز یہ طوفانِ عذاب دفع ہوا۔

یونسؑ اہل نینوا سے بیزار ہو کر دریا کے کنارے پہنچے اور کشتی میں سوار ہو کر چل دیے جب کشتی نصف دریا میں پہنچی اور مخالف ہوا نے جان کا خطرہ پیدا کر دیا، تو آپ کو اپنی غلطی یا خطا کا احساس ہوا، اور اپنے آپ کو دریا میں ڈالدیا، ایک مچھلی آپ کو نگل گئی، اور چالیس دن تک آپ اُس کے پیٹ میں رہے، اس کے بعد اُس نے آپ کو ساحل پر اُگل دیا اور چالیس روز تک یہاں پڑے رہے۔ جب اس عرصہ کے بعد آپ میں توانائی آئی تو پھر اسی شہر کی طرف جانیکا حکم ہوا۔

چونکہ شہر سے چلا جانا خدا کی مرضی کے خلاف تھا، اس لئے آپ کو یہ سزا دی گئی کہ مچھلی نے نگل لیا اور جب آپکی توبہ قبول ہوئی تو پھر مچھلی نے اُگل دیا اور آپنے پھر وعظ و تبلیغ کی خدمات انجام دینی شروع کیں۔

کلام مجید میں چھ جگہ یونسؑ کا ذکر آیا ہے۔ ایک سورۂ نسا میں:-

انا اوحینا الیک کما اوحینا الیٰ نوح والنبیین من بعدہ واوحینا الیٰ ابراہیم
واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایوب ویونس و
ہارون وسلیمان وآتینا داؤد زبورا ———— (سورۂ نسا۔ آیت ۱۶۳)

دوسری جگہ سورۂ انعام میں:-

ووہبنا لہ اسحاق ویعقوب کلا ہدینا ونوحا ہدینا من قبل ومن ذریتہ
داؤد وسلیمان وایوب ویوسف وموسیٰ وہارون وکذٰلک نجزی
المحسنین وزکریا ویحییٰ وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین واسماعیل
والیسع ویونس ولوطا وکلا فضلنا علی العالمین۔ (سورۂ انعام آیت ۸۵-۸۶)

تیسری جگہ سورۂ یونس میں:-

فلولا کانت قریۃ آمنت فنفعھا ایمانھا الا قوم یونس۔ لما آمنوا کشفنا عنھم العذاب
الخزی فی الحیوۃ الدنیا ومتعنٰھم الی حین ——— (سورۂ یونس آیت ۹۸)

چوتھی جگہ سورۂ انبیاء میں :-

وادخلنٰھم فی رحمتنا انھم من الصالحین وذاالنون اذ ذھب مغاضبا فظن ان
لن نقدر علیہ فنادی فی الظلمٰت ان لا الٰہ الا انت سبحٰنک انی کنت من الظالمین (سورۂ انبیاء آیت ۸۶-۸۷)

پانچویں جگہ سورۂ الصافات میں :-

وان یونس لمن المرسلین۔ اذ ابق الی الفلک المشحون۔ فساھم فکان من المدحضین
فالتقمہ الحوت وھو ملیم فلولا انہ کان من المسبحین۔ للبث فی بطنہ الی یوم یبعثون (سورۂ الصافات آیت ۱۳۹-۱۴۴)

چھٹویں جگہ سورۂ قلم میں :-

فاصبر لحکم ربک ولا تکن کصاحب الحوت اذ نادی وھو مکظوم لولا ان تدارکہ نعمۃ
من ربہ لنبذ بالعراء وھو مذموم ——— (سورۂ قلم آیت ۴۸-۴۹)

سورۂ نساء اور سورۂ انعام کی مذکورۂ بالا آیتوں سے تو صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یونسؑ نبی تھے اور اللہ نے انہیں ہدایت کے لئے مامور فرمایا تھا۔
سورۂ یونس کی آیت ۹۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم یونس ہی ایک ایسی قوم تھی جس کو عذاب میں مبتلا ہونیکے بعد ایمان لانے اور توبہ کرنے پر نجات حاصل ہوئی
سورۂ انبیاء میں انہیں ذوالنون کے لقب سے یاد کیا گیا ہے، نون مچھلی کو کہتے ہیں اس لئے ذوالنون کے معنی ہوئے "صاحب الحوت" کے جیسا کہ سورۂ قلم
میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سورۂ انبیاء کی اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ "جب یونس غصہ ہو کر چلے گئے اور گمان کیا کہ ہم اس کو تنگی میں نہ ڈالیں گے تو اس نے
مصیبت میں ہمیں پکارا کہ سوائے تیرے کوئی خدا نہیں اور تیرے ہی لئے پاکی و برتری ہے، بیشک میں حد سے تجاوز کرجانے والوں میں تھا"
اس آیت سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ یونس اپنی قوم سے برہم ہو کر چلے گئے کشتی میں روانہ ہوئے، اور مچھلی سے نگل لئے جانیوالا کوئی ذکر
نہیں ہے، سوائے اس کے کہ انہیں ذوالنون کے لقب سے یاد کیا گیا ہے۔
سورۂ الصافات میں بیشک آپ کے کشتی میں سوار ہو کر جانے اور مچھلی کا لقمہ ہو جانیکا ذکر ہے اور انہیں آیات پر فیصلہ کا انحصار ہے۔ ان آیات کو
اوپر نقل کر چکے ہیں۔ ان کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

" یونس بیشک رسولوں میں سے تھا جب وہ بھاگا ایک بھری ہوئی کشتی کی طرف، پس وہ شریک ہو گیا ان کا،
اس حال میں تھا کہ وہ خارج البلد لوگوں میں سے — پس پکڑ لیا اس کو مچھلی نے، اس حال میں کہ وہ ملامت زدہ تھا
پس اگر وہ نہ ہوتا خدا کی پاکی بیان کرنیوالوں میں سے تو وہ رہتا اس کے پیٹ میں قیامت کے دن تک "

ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یونس جب نینوا سے چلے ہیں تو وہ بھاگ کر ایسی کشتی میں سوار ہوئے جو لدی ہوئی تھی یعنی اس میں اور مسافر
بھی تھے اور اسباب بھی بہت سا موجود تھا، ان کو خارج البلد کہنا اس احساس کے بنا پر ہے جو ان کے دل میں پایا جاتا تھا چونکہ وہ اپنے

شہر اور اعزا کو چھوڑ کر آئے تھے اس لئے اپنے آپ کو خارج البلد محسوس کرتے تھے اور ملامت زدہ کہنا قوم کے نقطۂ نظر سے ہے، لیکن قابل غور صرف التقمہ الحوت کے الفاظ ہیں اور اس کے بعد للبث فی بطنہ کا فقرہ جس سے یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ مچھلی نے آپ کو نگل لیا اور وہ اس کے پیٹ میں رہے جن لوگوں نے توریت کے انداز بیان پر غور کیا ہے اُن سے یہ امر مخفی نہیں کہ اس میں آفات ارضی و مصائب طبیعی کو ہر جگہ طوفان سمندر کی تاریکی اور بحری درندوں وغیرہ سے تعبیر کیا ہے اور چونکہ یہ اسلوب عوام کے ڈرانے اور سمجھانے کے لئے زیادہ مفید ہوتا ہے اس لئے کہیں کہیں قرآن پاک میں بھی بجنسہ اس کو اختیار کر لیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی التزام کیا ہے کہ اصل واقعہ کی حقیقت کو بھی ظاہر ہو جانے اور جو عام ہو گیا ہے جو حشو و زائد داخل ہو گئے ہیں ان کی تردید کر دی جائے۔

یہودیوں کے ہاں یونسؑ کے متعلق یہ روایت پائی جاتی تھی کہ وہ چالیس دن تک مچھلی کے پیٹ میں رہے، لیکن قرآن میں اس کا کہیں ذکر نہیں کیا گیا، بلکہ التقمہ الحوت سے صرف اُن کا آفات دنیا آفات بحر میں مبتلا ہونا مراد لیا گیا ہے، اور اگر اس سے مقصود واقعی یہ ہو کہ مچھلی نے آپ کو پکڑ لیا، تو بھی کوئی خلاف عقل بات نہیں، کیونکہ ایسا ہونا بالکل ممکن ہے، اگر مچھلی کے نگل لینے اور پھر مدت تک اُن کے پیٹ میں رہنے کا بیان ہوتا تو اس کو خلاف عقل کہہ سکتے تھے، اور کلام مجید میں اس کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اس کی تائید رسول اللہ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں ارشاد فرمایا ہے" مچھلی نے صرف آپ کی ایڑی پکڑ لی تھی۔

اب رہ گیا للبث فی بطنہ، سو ظاہر ہے کہ بطنہ میں ضمیر مذکر کی ہے اور حوت مونث ہے اس لئے اگر اس سے مراد بطن ہی ہوتا تو بطنہا ہوتا نہ کہ بطنہ اور اگر اسے بطن ماہی مان لیں تو بھی کوئی حرج لاحق نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلام مجید میں یہ نہیں لکھا کہ یونس بطن ماہی میں رہے، بلکہ ارشاد یوں ہوتا ہے کہ "اگر وہ مسبحین میں سے نہ ہوتے تو بطن ماہی میں قیامت تک رہتے، لیکن ایسا نہیں ہوا"

بعض نے بطن کے معنی قبیلہ و خاندان کے لئے ہیں، اور یہ معنی کئے ہیں کہ اگر اللہ کی پاکی بیان کرنے والوں میں نہ ہوتے تو ہمیشہ اپنے خاندان اور قبیلہ میں صرف ایک معمولی آدمی کی حیثیت سے رہتے، اور رسالت کی خدمت انہیں نہ ملتی۔

سورۂ قلم میں آپ کو صاحب حوت کہنا اسی واقعہ کی مناسبت سے ہے۔

سال گزشتہ

میں یہ رعایت کی گئی تھی کہ جن کا چندہ دسمبر میں ختم ہوا تھا اور وہ سال حال
کے لئے خریدار رہے ان کو شہاب کی سرگزشت مفت دی گئی تھی، یہ رعایت اس سال بھی قائم ہے یعنی
جن حضرات کا چندہ آئندہ دسمبر کے مہینے میں ختم ہوتا ہے وہ اگر دسمبر میں چندہ بھیج دیں گے تو سال آئندہ نگار کے
خریدار بھی رہیں گے، اور شہاب کی سرگزشت بھی انہیں مل جائے گی، اس معاملہ میں ناظرین کو کم از کم ایک روپیہ کا فائدہ ہے

منیجر نگار بھوپال

معلومات

عجائب علم و فطرت

اڈنبرا میں علم ریحانیات (بیولوجی) کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں بہت سے تجربات دکھائے گئے، چنانچہ منجملہ ان کے ڈاکٹر کریو کے وہ نتائج تفتیش بھی تھے جو عالم حیوانات کے متعلق انھوں نے حاصل کئے ہیں۔

چند سال ہوئے ڈاکٹر مذکور نے دنیا کو اپنے اس اعلان سے حیرت زدہ کر دیا تھا کہ ایک مرغی بعض اندرونی اعضاء کی بیماری کی وجہ سے مرغا میں تبدیل ہو گئی اور جوں جوں یہ تبدیلی زیادہ ہوتی گئی اس کے نرینہ صفات میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔ ڈاکٹر کریو کے عمل میں اب متعدد جانور ایسے موجود ہیں، جنھیں اس قسم کے تغیر پیدا ہوئے اور اب وہ مزید تحقیق کر رہے ہیں تاکہ جانور پالنے والوں اور علماء حیوانیات کے سامنے کوئی مفید نتیجہ پیش کر سکیں۔

ڈاکٹر اسپال نے بھی اپنا ایک تجربہ پیش کیا جو کم پر لطف نہ تھا۔ گرگٹ کی قسم کا ایک جانور ہے جو پانی میں رہتا ہے، ڈاکٹر مذکور نے گلے کے بعض مخصوص غدود کا مادہ اس جانور میں متعدد بار پچکاری کے ذریعہ سے پہنچایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بجائے پانی کے وہ خشکی میں رہنے لگا، اس عمل سے غدود کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

مسٹر گرے نے خشکی کے جانوروں کے انڈے میں سپیدی ہونے کا سبب بیان کیا جو عجیب و غریب ہے۔ مسٹر موصوف نے ظاہر کیا کہ مچھلی اور پانی کے دوسرے جانوروں کے انڈوں میں سپیدی نہ پائے جانے کا سبب یہ ہے کہ پانی اس کمی کو پورا کرتا ہے اور چونکہ خشکی کے تمام جانور بھی پانی ہی کے جانوروں سے رفتہ رفتہ ترقی کرکے معرض وجود میں آئے ہیں اس لئے فطرت نے ان کے انڈوں میں پانی کا ایک حصہ سفیدی کی صورت میں رکھ دیا، تاکہ یہ کمی پوری ہو سکے۔

ڈاکٹر رسل نے تصاویر کے ذریعہ سے بتایا کہ انسان کے جگر پر شراب کا کیا خراب اثر پڑتا ہے، ان تصویروں کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شراب کا استعمال جگر کے خلایا کے ریشوں کو بالکل ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور اس طرح جگر کا فعل خراب ہو جاتا ہے۔ جب کثرت بادہ نوشی سے یہ ریشے بالکل ہی بیکار ہو جاتے ہیں تو انسان مر جاتا ہے، یا مرنے سے پہلے کسی اور مہلک عارضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

نئے نئے ڈپلوما

اہل امریکہ کی جدت پسند طبیعت کا اندازہ اُن کی ہر ہر بات سے ہوتا ہے، چنانچہ حال ہی میں انھوں بعض نہایت عجیب و غریب ڈپلوما اختراع کئے ہیں۔ مثلاً۔ مثلاً لفٹننٹ کمانڈر بائرڈ کو جس نے سب سے پہلی مرتبہ ہوائی جہاز کے ذریعہ سے قطب شمالی کو عبور کیا انھوں نے "ڈکٹور عرض البلاد و طول البلاد" ([illegible]) کا ڈپلوما عطا کیا۔ پھر یہ ڈپلوما یا سند کوئی ایسا لقب نہیں ہے جیسے ہندوستان میں غیر ذمہ دار لوگوں کی طرف سے شعراء یا مصنفین کو دیا جاتا ہے، بلکہ کمانڈر مذکور کو یہ ڈپلوما وہاں سرکاری جمعیت جغرافی کی طرف سے دیا گیا ہے۔

کارنل یونیورسٹی میں ایک خاص کورس ایسا ہے جس کے ذریعہ سے نظم ہوٹل کی تعلیم دی جاتی ہے، اور اس کو اس میں کامیاب ہونے والے کو D.H

ڈپلوما ملتا ہے جو اختصار ہے (Doctor of Hospitality) کا۔

کیلیفورنیا کے بورڈ تعلیمات نے ایک خاتون کو حال ہی میں Art- اور Whistling فن اور سیٹی بجانے کے کمال پر ڈپلوما دیا ہے اور اس ڈگری کا نام .B. A. W ہے۔

مودہ لندن لالہ لاجپت رائے نے اخبار People میں اپنے سفر لندن کے جو حالات لکھے ہیں، ان میں سے بعض کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

سب سے عجیب و غریب نفسیاتی رجحان جو نوجوان عورتوں میں پایا جاتا ہے وہ سر کے بالوں کو ترشوا دینا ہے، نئی نسل کی عورتیں بالعموم سر کے بال نہیں رکھتیں اور مشکل سے لڑکے لڑکیوں میں تمیز ہوتی ہے ان کا لباس بھی بہت سادہ ہو گیا ہے اس قدر سادہ کہ اس میں کانٹ چھانٹ اور سلائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی اور اس طرح جو روپیہ بچتا ہے وہ کتابوں کی خریداری اور تفریحات میں صرف کیا جاتا ہے۔

جنگ نے یہاں کی عورتوں میں نہایت عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا ہے، اور ان کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے، علوم و فنون میں وہ مکمل مردوں کے دوش بدوش چل رہی ہیں اور معیشت و معاشرت کے اسباب فراہم کرنے میں وہ مردوں کی محتاج نہیں رہیں۔

لندن میں لاسلکی سماعہ (Broad - casting) کا رواج کثرت سے ہو گیا ہے ۲۰ لاکھ گھر ایسے ہیں جن کو اس کا لائسنس ملا ہے اور تقریباً ایک کروڑ آدمی ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کا لائسنس ۱۰ شلنگ سالانہ میں ملتا ہے اور آلہ کی قیمت ۲ پونڈ سے بیس پونڈ تک ہوتی ہے مقررہ اوقات پر لاسلکی خبریں، تقریریں، اور گانے لوگ اپنے اپنے مکانوں پر سن سکتے ہیں، اتوار کے دن اخبار بہت کم شائع ہوتے ہیں لیکن رات کو ۹ بجے ساری دنیا کی خبریں لاسلکی سماعہ کے ذریعہ سے سنی جا سکتی ہیں، اس سے شہر اور گاؤں کے لوگ دونوں برابر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

یہاں کی خوش حالی کا یہ عالم ہے کہ باوجود اس امر کے کہ بیس لاکھ آدمی بیکار ہیں اور اتنے ہی انسان محتاج خانہ سے مدد حاصل کرتے ہیں، ان کا معیار زندگی اس قدر بلند ہے کہ اگر ہندوستان کے متوسط الحال لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو یہاں کے مزدوروں کے مکان بھی قصر نظر آئیں گے، یہاں کی غریب سی غریب جماعت بھی تعلیم جسمانی اسباب آسائش اور بہترین طبی امداد سے محروم نہیں ہیں، زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کی نگرانی حکومت نہ کرتی ہو اور جس کے ذاتی اقتصادی اور سیاسی پہلو کی ذمہ داری حکومت پر عاید نہ ہوتی ہو۔

یہاں بعض ضروریات زندگی ہندوستان سے زیادہ ارزاں دستیاب ہوتی ہیں، باوجودیکہ مزدوری بڑھی ہوئی ہے اور کام کے گھنٹے کم ہیں پھر بھی اشیاء کی قیمت زیادہ نہیں ہے، بعض اخلاقی پہلو یہاں کے لوگوں کے نہایت زبردست ہیں وہ معاملات میں سچے، آزاد اور ملاقات میں متواضع و ہمدرد ہیں۔ صفائی کا خیال ان کی زندگی کا جزو ہے اور وطن پرستی ان کی خلقت کا عنصر عظیم۔

نا واجب اعاظم پرستی ان کے ہاں مفقود ہے، بڑے بڑے قونصل یہاں معمولی انسان سمجھے جاتے ہیں اور کوئی ان کی پرواہ بھی نہیں کرتا، یہ [illegible] ہجوم میں ویسرائے اور گورنر سب گم ہو جاتے ہیں، یہاں ہر شخص کی آئندہ عظمت و حرمت اس کی موجودہ قابلیت پر منحصر ہوتی ہے اور اس سے بحث نہیں ہوتی کہ ماضی میں وہ کیا تھا اور کیا کر چکا ہے، یہاں وزراء بھی کاروباری دنیا میں ایک عام انسان کی سطح پر نظر آتے ہیں۔

حفظان صحت کی بہتری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یہاں بچوں میں اموات کا تناسب گویا نہ ہونے کے برابر ہیں اور بازار کے تمام کھانے پینے کی

چیزوں کی سخت نگرانی ہوتی ہے تاکہ قوم کے افراد مضرت رساں چیزیں استعمال کر کے اپنی صحت کو نہ کھو بیٹھیں۔

طویل قد کے مصائب چھوٹے قد کے لوگ طویل قدوالوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، لیکن اگر ان کی داستان خود ان کی زبانی سنی جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ بھی مصائب میں مبتلا ہیں۔

حال کی بات ہے کہ چکاگو (امریکہ) میں ایک انجمن طویل قدوالوں کی قایم ہوئی ہے، اور اس انجمن کی طرف سے جو صدائے احتجاج بلند کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ سخت پریشان ہیں ان کو شکایت ہے کہ جس مکان میں جاتے ہیں وہاں کی چھت ان کی خبر لیتی ہے۔ ہوٹلوں میں جاتے ہیں تو بستروں سے آدھی ٹانگیں باہر نکلی رہتی ہیں۔ ریل کے سفر میں ان کی کمر تک آ کر رہ جاتے ہیں، اور غسلخانوں کے ٹب میں ان کا جسم نہیں سماتا۔

چونکہ مغرب کا موجودہ عہد ورزش و صحت کا دور ہے اس لئے وہاں کے لوگوں کے قد و قامت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور بقول اخبار ریپبلکن، نظام تمدن کو آخر کار مجبور ہونا پڑیگا کہ تمام اسباب معیشت و معاشرت کی مقدار و تعداد کے ساتھ پیمانوں کی وسعت و پہنائی کی طرف بھی توجہ کرے۔

جاپان کی آبادی جاپان میں تازہ ترین مردم شماری سے معلوم ہوا کہ اس وقت وہاں کی آبادی ۴۹۰۰۰۳۰۰ ہے یعنی ۱۹۲۰ء سے لیکر اس وقت (صرف ۵ سال کے اندر) ۴۰۰۷۷۳ آدمی بڑھ گئے ہیں۔ اگر یہ اضافہ اس نسبت سے ہوتا رہا، تو آئندہ ۲۰ سال میں دس کروڑ آبادی ہو جائے گی۔

جس وقت اس کے اسباب پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑا سبب صرف حفظان صحت کی نگرانی ہے۔ اور یوروپی ممالک کی طرح جاپان نے بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ قوم کی ترقی منحصر ہے اس کی صحت جسمانی پر، اور صحت جسمانی کا مدار ہے، اصول حفظان صحت کی پابندی۔

سات سال کے بعد امریکہ کا ایک آدمی جس کی عمر ۸۰ سال کی ہے اتفاق سے ایک سوئی نگل گیا اور باوجود تمام تدابیر کے وہ سوئی اس کے جسم سے کسی طرح نہ نکل سکی۔ اس واقعہ کے بعد وہ مختلف عوارض میں مبتلا رہا، یہاں تک کہ سات سال گزر گئے، اس دوران میں یہ سوئی برابر خون کے ساتھ جسم میں گردش کرتی رہی ہے، اب یہ سوئی خود بخود اس کی ایڑی سے نمودار ہو کر نکل گئی اور وہ تمام امراض سے پاک ہو گیا۔

حسن کا شفاخانہ اس وقت دنیا کی ہر عجیب چیز کی اختراع کا فخر امریکہ کو حاصل ہے، حال ہی میں وہاں ایک شفاخانہ قایم ہوا ہے، جسے حسن کا شفاخانہ کہنا چاہیے، کیونکہ یہاں صرف وہی اعمال جراحی ہوتے ہیں جن کا تعلق بدصورتی دور کرنے سے ہے۔ چونکہ امریکہ میں روزانہ حوادث کثرت سے ایسے ہوتے رہتے ہیں کہ انسان کے اعضا بیکار و بدصورت ہو جاتے ہیں اور عام شفاخانوں میں ان کا علاج بھی ہوتا ہے، لیکن اب مخصوص طور پر ایسا شفاخانہ قایم ہوا ہے جہاں صرف عورتوں کا علاج ہوگا اور وہی اعمال جراحی زیادہ ہوں گے جن سے انکے اعضاء اور چہرہ کی بدصورتی دور ہو سکتی ہے۔

اس شفاخانہ کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فطری بدصورتی کو بھی اپنے اعمال جراحی سے دور کرے۔ تاکہ رفتہ رفتہ نسل میں تغیر پیدا ہو جائے اور پھر کوئی قبیح صورت شخص وہاں پیدا ہی نہ ہو۔

عجیب گھڑی

صوبہ نیو ہامشایر کا ایک شہر میں ایک شخص کے پاس گھڑی ہے جس کی عمر ۴۱۰ سال کی ہے اور اب تک برابر صحیح وقت دیتی ہے گزشتہ چار سو سال کے درمیان کبھی اس کو درست کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ چاندی کی گھڑی ہے، جو انگلستان کے شہر اورپول میں تھی اور جس کو قابض حال کے دادا کے دادا نے خرید کیا تھا۔ موجودہ مالک کی عمر ۸۱ سال کی ہے اور ۴۰ سال سے یہ گھڑی اس کے قبضہ میں ہے۔

نسائی عزم

انگلستان کی کونٹس کاتھرکرت اپنے ملک کی مشہور لکھنے والی ہے، اور اس کی زندگی کے بہت سے عجیب و غریب واقعات ہیں جن کو موضوع قرار دیکر اس نے ایک ناول لکھا اور امریکہ لے گئی، اس امید پر کہ وہاں اس کو فروخت کردیگی اور کافی دولت حاصل کرسکیگی لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی اور انگلستان واپس آئی، اس حال میں کہ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب اس کوشش میں صرف ہوچکا تھا اور بالکل مفلوک حال تھی۔

یہ صدمہ اس قسم کا تھا جو بڑے سے بڑے مستقل مزاج مرد کو بھی متزلزل کردیتا لیکن کونٹس مذکور کے عزم و ہمت کی داد دینی چاہیئے کہ وہ اب دوسرے ناول کی تیاری میں مصروف ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی وہ مایوس نہیں ہوئی۔ اس کا قول ہے کہ میں یقیناً کامیاب ہونگی اور یہ کامیابی اسی ملک میں ہوگی جس نے میری خدمات کو ایک مرتبہ مردود کردیا ہے۔

۱۷ گھنٹے میں زمین کے گرد

ایک انگلستان کے پروفیسر کی تحقیق ہے کہ ایک قسم کی مکھی ہے جو انتہائی سرعت کے ساتھ پرواز کرتی ہے۔ یہ مکھی بعض جانوروں کی ناک میں پیدا ہوتی ہے، اور چند دن کے بعد اڑ جاتی ہے اور عرصہ تک بغیر غذا کے زندہ رہتی ہے۔ یہ مکھی ایک سکنڈ میں ۲۶۰ میٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ یہ رفتار اس قدر تیز ہے کہ اگر مسلسل .... اسی طرح اڑتی رہے تو سترہ گھنٹے میں زمین کا طواف کرسکتی ہے۔

قدیم روما کے دنگل

دنگل یا باہم زور آزمائی و مقابلہ سپہگری کی نمائش بہت قدیم چیز ہے، لیکن اہل روما میں اس کا خاص ذوق تھا۔ وہاں صرف کشتی ہی کا رواج نہ تھا بلکہ اسلحہ کے ساتھ باہم مقابلہ کرتے تھے اور ان کے جسم سے جو خون جاری ہوتا تھا اس کی حدت و کیفیت حماسیت میں اور زیادہ جوش پیدا ہوتا تھا۔ خاص خاص مدارس تھے جہاں اس فن کی تعلیم دیجاتی تھی، دنگلوں کا قیام مختلف موقعوں پر ہوا کرتا تھا۔ کبھی اس سے محض تفریح مقصود ہوتی تھی، اور کبھی جنگ میں فتح پانے کی خوشی میں اس کا انعقاد ہوتا تھا۔ دنگل میں حصہ لینے والے زیادہ تر غلام ہوتے تھے یا وہ مجرم جن کو سزائے موت کا حکم سنایا جا چکا ہوتا تھا۔ جنگی قیدیوں میں سے بھی قوی و مضبوط لوگ شریک کئے جاتے تھے۔ روما میں تین سو قبل مسیح سے لیکر ۲۰۰ سال بعد مسیح تک اس کا بہت زور رہا۔ ایک دنگل میں کم از کم تین چالیس جوڑیں ہوتی تھیں اور مقابلہ اس وقت تک ختم نہ ہوتا تھا، جب تک کوئی خون آلود ہوکر زمین پر نہ گر پڑے۔ غالب فرد مغلوب کے سینے پر قدم رکھکر کھڑا ہوجاتا اور بادشاہ کی طرف دیکھکر حکم کا منتظر رہتا اگر وہ اجازت دیتا تو چھوڑ دیتا ورنہ نہیں، لیکن اکثر یہی ہوتا کہ غالب مغلوب کو قتل کرڈالتا اور اس کی لاش جانوروں کے سامنے ڈال دیتا۔

اگر مغلوب قوی الجثہ ہوتا اور زخم معمولی ہوتے تو معاف کردیا جاتا اور جب وہ اچھا ہوجاتا، تو پھر مقابلہ کے لئے طلب کیا جاتا۔

صرف شاہ ترا جان کے زمانہ میں دس ہزار آدمی دنگوں میں مقتول ہوئے۔

شہر آتش ریز جاپان کا دارالسلطنت ٹوکیو اپنے کثیر واقعات آتشزدگی کے لحاظ سے شہر آتش ریز کہلائے جانیکا مستحق ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۵ء تک چھ سال کے عرصہ میں ۵۰۰۴ واقع آتشزدگی کے ظاہر ہوئے اور صرف سنہ ۱۹۲۵ء میں ۹۰۰۔ گویا روزآنہ تین جگہ آگ لگی۔

چونکہ یہاں کے مکان لکڑی کے بنے ہیں اور انہیں کے اندر آگ روشن کی جاتی ہے، اس لئے اس قسم کے زیادہ واقع رونما ہوتے ہیں، برقی تاروں کے تصادم و انقطاع سے بھی اکثر آگ لگجاتی ہے۔

یہاں کے سب سے زیادہ مشہور آگ وہ تھی جو سنہ ۱۶۵۷ء میں لگی تھی، اس نے ۵۰۰ بڑے بڑے مکانوں، ۳۵۰ مندر اور ۹ ہزار جانوں کو خاک سیاہ کردیا تھا۔
اب جاپان میں جدید قانون کی رو سے آگ بجھانے کا طریقہ لوگوں کو سیکھنا پڑتا ہے اور ان کو بتایا جاتا ہے کہ آگ اگر لگے تو اس کو کیونکر بجھائیں اور پھیلنے سے کس طرح باز رکھیں۔

صبح وطن مجموعہ ہے پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی کے کلام کا جسے انڈین پریس الہ آباد نے مجلد شائع کیا ہے۔ شروع میں مرحوم کی تصویر ہے، اور اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو کا لکھا ہوا دیباچہ ہے۔ جس میں چکبست کی سیرت پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے کلام پر بھی تنقید کی گئی ہے لیکن ضرورت سے زیادہ جانبدارانہ رنگ کے ساتھ۔

اس مجموعہ کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصہ میں قومی نظمیں ہیں، دوسری میں مذہبی و ادبی، تیسرے میں اکابر قوم کے مرثیے ہیں، چوتھے میں غزلیں اور پانچویں میں وہ ادبی منظومات ہیں جو ان کی ابتدائی مشق کا نتیجہ ہیں۔

چکبست اس دور کے اچھا لکھنے والوں میں تھے اور نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، چونکہ فطرتاً انہیں سیاسیات سے زیادہ دلچسپی تھی اسلئے یہ رنگ ان کے تمام کلام پر چھلکتا ہے۔ حتی کہ غزلیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں۔ اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ چکبست نظم کا نہایت پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اپنے مفہوم کو دلنشیں انداز میں پیش کریں۔ ان کے کلام میں آمد بہت کم پائی جاتی ہے اور ہر نظم بے اختیارانہ جذبات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

جہاں جہاں تشبیہات و استعارات سے کام لیا ہے وہاں بھی کافی جدت و ندرت پائی جاتی ہے، اور اس میں شک نہیں کہ شعرائے لکھنو میں (ان خصوصیات کو دیکھتے ہوئے) وہ ایک خاص امتیاز رکھتے تھے۔

یہ مجموعہ کی کتابت و طباعت بہت صاف ہے اور ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ انڈین پریس الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر ان ۲۸۸ — جلد ۱۰ نمبر ۶

نگار

بھوپال سے ہر ماہ کی پندرہ کو شائع ہوتا ہے، چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین دسمبر ۱۹۲۶ء

خطوط شبلی

بسم اللہ

ایڈیٹر ــــ نیاز ــــ فتحپوری

جلد (۱۰)	دسمبر ۱۹۲۶ء	شمارہ (۶)

ملاحظات

یہ رسالہ دسویں جلد کا آخری پرچہ ہے اور خدا کا شکر ہے کہ یہ سال بھی اسی طرح گزر گیا کہ مجھے ملک کی طرف سے "قدرناشناسی کی" زیادہ شکایت پیدا نہیں ہوئی، اگر زندگی ہے اور زندگی کے ساتھ عزم و ولولہ قایم تو ممکن ہے کبھی وہ زمانہ بھی آجائے جسے عہد کامیابی، سے تعبیر کرسکوں۔ لیکن گذشتہ پانچ سال کے اندر نگار نے جو مرتبہ ملک میں حاصل کرلیا ہے اس پر نگاہ کرتے ہوئے جب اس کی رفتار ترقی کو دیکھتا ہوں تو بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

زمانہ گلشن غنچے کرا بہ یغما داد

کہ گل بہ دامن ما دستہ دستہ می آید

جناب چغتائی نے ۲ دو تصویریں "ماہ نو" اور "در رنج اسیری" چھاپ کر بھیجی ہیں جو آئندہ مہینے کے رسالہ میں شایع کر دی جائیں گی۔ چونکہ چغتائی کی نقاشی سمجھنے کے لئے خاص دماغ کی ضرورت ہے، اس لئے میں نے انھیں لکھا ہے کہ وہ ان پر ایک مقالہ بھی تحریر فرمائیں، اگر انھوں نے یہ درخواست

قبول کریں تو یقیناً نظموں سے زیادہ اُن کی نثر مفید و دلچسپ ہوگی۔

میرے ایک عزیز دوست سید مبارک شاہ جیلانی نے، جو نہایت پاکیزہ و پرجوش ذوق علم و ادب رکھتے ہیں ہندوستان کے ایک ویران حصہ میں عدیم النظیر ایثار و قربانی سے کام لے کر ایک کتب خانہ جیلانی لائبریری کے نام سے قائم کیا ہے۔ آپ ریاست بہاولپور کے ایک گاؤں سنجر پور کے رہنے والے ہیں اور یہ ولولہ دل میں رکھتے ہیں کہ اپنا ہی سا ذوق قرب و جوار کے تمام مسلمانوں میں پیدا کر دیں، چونکہ آپ محض خیال پرست نہیں بلکہ وہ کردار پسند ہیں اس لئے آپ نے یہاں ایک کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈال دی ہے اور اپنے گھر کی تمام کتابیں اس میں منتقل کر دی ہیں۔
کتب خانہ کی عمارت بن رہی ہے۔ کتابیں آ رہی ہیں، لوگوں کو توجہ دلائی جا رہی ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب تک سارا ملک اُنکی مدد نہ کرے وہ کامیاب نہیں ہو سکتے، جس کی بہترین صورت یہی ہے کہ جو مصنف و مولف اپنی کتابیں مفت دے سکتے ہیں وہ اس طرح اعانت فرمائیں اور جو قیمت میں رعایت کر سکتے ہیں وہ اس طرح فائدہ پہنچائیں، ملک کے جرائد و رسائل کی اعانت یہ ہوگی کہ وہ اس کا اعلان کر کے پبلک کو متوجہ کریں چونکہ بہاولپور اور اس کے قرب و جوار میں اردو زبان نہایت خستہ حالت میں پائی جاتی ہے اس لئے سید مبارک شاہ صاحب کی امداد کرنا ہر اس شخص کا فرض ہے جو زبان اُردو کی ترقی کا خواہشمند ہے، پتہ یہ ہے ڈاک خانہ سنجر پور، بہاولپور ریاست۔

اس مہینے کے مضامین میں سید عبد القادر صاحب سروری کا مضمون "فن افسانہ نگاری" جس کا سلسلہ انشاء اللہ نگار میں جاری رہیگا نہایت مفید و دلچسپ ہے، وہ حضرات جنھیں افسانہ نگاری کا شوق ہے انھیں اس کا مطالعہ امعان نظر سے کرنا چاہیئے۔
جناب زور بی۔ اے کا ایک مضمون "غالب کی ذہنیت" پر گزشتہ اشاعت میں ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ جناب عزیز نے اس پر ایک تبصرہ کر کے حضرت زور سے اختلاف کیا ہے، اگر مقصود ذاتی حملہ نہ ہو تو اس نوع کے تنقیدی مقالے نہایت مفید ہیں، مسٹر مالک رام کا مضمون "غالب و ذوق" بھی اسی قسم کی تحریک کا نتیجہ ہے۔
"دکن کی شاعری" پر پروفیسر محمد حفیظ صاحب کا مقالہ بہت زیادہ قابل داد و ستائش ہے، آپ نے یہ مضمون بہت کاوش و محنت سے تیار کیا ہے اور بعض نہایت نادر معلومات ادب پر مشتمل ہے۔

اس سے قبل کسی ماہ کے رسالہ میں جناب افسر میرٹھی کا ایک مضمون "ہماری چند انشا پرداز خواتین" کے عنوان سے شایع ہوا تھا، اس کی موافقت و مخالفت میں دو مضمون موصول ہوئے اور ان دونوں کو میں نے ایک ساتھ درج کر دیا، تاکہ بحث کے دونوں پہلو سامنے آجائیں، سید فیاض علی صاحب نے افسر صاحب کی مخالفت کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اگر عورتوں سے عریاں لٹریچر ترک کرایا جاتا ہے تو مردوں کو بھی ترک کرنا چاہئیے اس میں شک نہیں کہ بالکل جائز مطالبہ ہے، لیکن کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ اس سے قبل یہ فیصلہ ہو جائے کہ جب مرد ایک وقت میں چار عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے، تو عورت کیوں نہ ایسا کر سکے۔ یا پھر مرد کو مجبور کیا جائے کہ وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کرے۔
"تذکرۂ داؤد دکھنی" نتیجہ ہے جناب تمکین کاظمی کی اس محبت کا جو انھیں وطن ہونے کے لحاظ سے سرزمین دکن سے ہے اور اردو زبان کی یہ قسط بھی

نہایت دلچسپ ہے۔ افسانہ "بعد المشرقین" صرف اس خیال کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے کہ شریعت کے اُن احکام کو جو تمدن سے متعلق ہیں وقت کے تقاضہ کے لحاظ سے بدلنا چاہیئے، ورنہ وقت اُن کا ساتھ نہ دیگا۔

مسٹر علی اکبر کاظمی نے اپنے افسانہ "رحمت کا فرشتہ" میں مشرقی عورت کا وہ کیرکٹر پیش کیا ہے جس پر انسانیت جتنا فخر کرے کم ہے۔

حصۂ منظومات میں ہمارے عزیز دوست حضرت وصل بلگرامی کی نظم "حسن خوابیدہ" کہنے کو تو راجرسن کی انگریزی نظم کا ترجمہ ہے لیکن آپ نے اس خاکہ میں خود اپنا رنگ طبیعت بھرا ہے، جس سے آپ کی جودت فکر ظاہر ہے۔ جناب وصل نہایت ذہین و خوش فکر شاعر ہیں اور میرا اعتقاد ہے کہ اگر وہ راجرسن کی اس نظم سے بے نیاز ہو کر خود اس عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تو اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوتے۔

سید علی اختر صاحب نے اپنے ایک ہمنام دوست کی جدائی پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے، گو وہ معمولی مرثیہ کے انداز سے بالکل جدا ہے، لیکن اُس کے ایک ایک لفظ سے اُن کے عمیق تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔

غزلوں میں جناب فانی کی غزل وہ ہے جو انھوں نے بھوپال کے چند گھنٹوں کے قیام میں مجھے سنائی تھی، فانی کا تعارف بیکار سی بات ہے ہر شخص اُن کے ذوق سلیم کا معترف ہے۔ جناب تسنیم کی غزل اسی قدر پاکیزہ و لطیف ہے کہ اُس کی شرح کرتے مجھے اندیشہ ہے کہ مبادا اُس کی لطافت داغدار ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت تسنیم نہایت ہی ستھرا مذاق تغزل کا رکھتے ہیں۔ جناب آزاد کی غزل کے متعلق کچھ لکھنا عبث ہے کیونکہ آپ جس رنگ کے تنہا مالک ہیں وہ اس میں بھی حسب معمول پورے طور پر نمایاں ہے۔

جنوری سال آئندہ کا پہلا پرچہ ہوگا، علاوہ تصاویر کے وہ مضامین کے لحاظ سے بھی نہایت دلچسپ ہوگا۔ "نقاب اُٹھ جانے کے بعد"، کی تیسری کڑی سجے مارٹن کے اعتراضات کا جواب۔ عیسیٰ کے متعلق جو مضامین میری مخالفت میں آرہے ہیں ان سب پر تفصیلی نگاہ اور متعدد دلچسپ فسانے یہ سب جنوری ۲۷ء کے نگار میں ملاحظہ کے قابل ہونگے۔

اس رسالہ کے ساتھ ایک مطبوعہ کارڈ آپ کو ملے گا، کیا اچھا ہو اگر آپ اس کی مکمل خانہ پُری کر کے منیجر نگار کے پاس دو پیسہ کا ٹکٹ لگا کر بھیجدیں۔ آپ چاہیں تو ایک دو خریدار پیدا کرنا دشوار نہیں ہے۔

جن حضرات کا چندہ اس مہینے میں ختم ہو رہا ہے اُن کو بھی ایک مطبوعہ تحریر اس رسالہ کے اندر رکھی ہوئی ملے گی، امید ہے کہ آئندہ خریدار رہنے کی صورت میں چندہ منی آرڈر کے ذریعہ سے بھیجنا پسند فرمائیں گے جس میں خریداروں ہی کا فائدہ ہے۔ اگر کسی صاحب نے شہاب کی سرگذشت کا ابتک مطالعہ نہیں کیا ہے تو اُن کے لئے موقع ہے کہ وہ بجائے ایک روپیہ چار آنہ مع محصول کے صرف ۸ ؍ میں اسے حاصل کر سکیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ نگار کے چندہ کے ساتھ اُس کی قیمت بھی ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما دیں۔ جنوری کے رسالہ کے ساتھ شہاب اُن کے پاس پہنچ جائیگا۔

نیاز ——— فتحپوری

فن افسانہ نگاری

افسانوں کی اہمیت

دنیا مجموعۂ اضداد ہے، جہاں بد تر سے بد تر شئے کے قدر دان موجود ہیں۔ وہیں بعض اشخاص بہترین اشیاء کے مخالف بھی نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ انسان کی وحشیانہ حالت سے تمدنی تبدیلی کو دنیا کی ترقی کا ثبوت اور دوسرا پستی کی دلیل سمجھتا ہے۔ انقلاب فرانس کو ایک شخص احساس آزادی کا بہترین مظہر اور دوسرا شرارتوں کا ماخذ ٹھہراتا ہے اس افراط و تفریط کی اصلی وجہ اختلاف طبائع ہو سکتی ہے۔ افسانوں کے مخالفین کا موجود ہونا کوئی نئی اور تعجب خیز بات نہیں ہے بہت سے ایسے بزرگوار ہیں جن کے پاس باوجود اسکی جگر کاوی کے افسانہ نویس کو وہ رتبہ نصیب نہیں ہو سکتا جو ایک ماہر موسیقی، مصور، یا شاعر کو حاصل ہے۔

افسانہ نگار کو دیگر فنون کے کاملین کا ہم پلہ متصور ہونا، بجائے خود، ان کو نہ صرف ہنسی بلکہ رونا آتا ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے ہماری ذہنیات کو ٹٹولیں تو معلوم ہو جائیگا کہ ہم افسانہ نگار کو کن نظروں سے دیکھتے ہیں؟ ہماری نظروں میں اس کی وقعت وہی ہے، جو کسی زمانہ میں اسٹیج پر نقالی اتارنے والے" یا "سارنگی بجانیوالے"، کی تھی۔ گو علمی دنیا میں یہ خیالات اب تقویم پارینہ ہو چکے ہیں، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ پہلے پہل ممتاز لوگوں کے خیالات بھی اسی ماحول کے مطابق ہوتے ہیں جس میں وہ نشو و نما پاتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ خود اجتہاد کرکے آگے بڑھتے ہیں اور اشیاء کے مطالعہ سے ان کی وقعت کا صحیح لگانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

دیگر علوم و فنون کے ماہرین اور اکثر پیشوں کے ممتاز لوگوں کے خلاف ہم نے کسی افسانہ نگار کو اس کی جگر سوزی کے معاوضہ میں، قومی امتیاز، یا سرکاری خطاب عطا ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ کسی نثر نے "سر" نہ کسی سرشار نے "ڈاکٹر" کا اعزاز حاصل کیا۔ انگلستان جیسے آزاد اور علم دوست ملک میں بھی یہ فرقہ نہایت کس مپرسی کی حالت میں پڑا رہا۔ تھیکرے، ڈکنز، اور جارج ایلیٹ کو کاملین فن ماننے کے باوجود بھی ان کو خطابات سے سرفراز کرنا فضول سمجھا گیا۔ شہنشاہ، امرا، اور اعیان دولت نے بھول کر بھی اس طرف توجہ نہیں کی حالانکہ وہ، ان کے مصنفات کو حرز جان بنائے رکھتے، ہم یہ نہیں کہتے کہ خطابات اور سرکاری امتیازات عطا ہونے سے ان کی عظمت میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔ بلکہ ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں سے محرومی، اس بات کی بآواز بلند شہادت دے رہی ہے کہ حکومت عالمانہ کے خیال میں افسانہ نگاروں کا ایک ایسا گروہ ہے جس کو قومی امتیاز عطا کرنا، اس کا ضائع کرنا ہے۔!

دوسری وجہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں جبکہ ہر جگہ علوم و فنون کے بحر ذخار تلاطم پذیر ہو رہے ہیں، اور دنیا کے ہر گوشہ میں اکثر موسیقی داں اور شاعر کے ساتھ ساتھ اس کے قدر دان بھی کثیر تعداد میں اٹھ رہے ہیں، یہ دیکھکر تاسف ہوتا ہے کہ افسانہ نگاروں کا گروہ اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے، وہی آپس میں ایک دوسرے کی قابلیتوں کے معترف نظر آتے ہیں اور اپنے فن کو عطیۂ قدرت تصور کرکے اپنے دلوں کو تسلی دے لیتے ہیں۔

تیسری بڑی وجہ یہ ہے کہ دیگر فنون کے برخلاف افسانہ نگاروں کی کوئی انجمن یا اکاڈمی مرتب نہ ہو سکی۔ خود یورپ میں جہاں شاعری، مصوری، موسیقی غرض ہر علم و فن کی انجمنیں تشکیل پاتی رہتی ہیں کبھی کسی نے افسانہ نگاروں کی اکاڈمی قایم کرنیکا خیال نہیں کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نہ اس فن کی نمود و نمائش ہو سکی اور نہ تعارف و گفتگو کے ذریعہ اس کی اشاعت۔

افسانہ نگاروں کے نام بھی ہر قسم کی امتیازی ڈگریوں سے قطعی محفوظ رہے، اس فن کو کسی علمی انجمن کی سرپرستی کا فخر حاصل ہے اور نہ کسی جامعہ کے نصاب میں اس کو شریک کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ نگار اپنے فن میں دبستان قایم کرنے سے یا دیگر تخصصات لایعنی پیدا کرنے سے خود محترز ہیں۔ اس کا تصفیہ فی الحال مشکل ہے کہ ان کا یہ فعل سود مند ہے یا مضرت رساں؟

یا یہ کہ حکومت کی جانب سے اگر ان کی قدر کی جاتی یا ان کی اکاڈمی قایم ہوتی تو فن افسانہ نویسی نمایاں ترقی حاصل کر لیتا۔ لیکن ان متذکرہ بالا تینوں اسباب سے اس کا پتہ صاف چلتا ہے کہ افسانہ نگاری کو دیگر فنون لطیفہ کا درجہ کیوں نصیب نہ ہو سکا؟ اور یہ کہ افسانہ نگار کیوں "قصہ گو" کے حقارت آمیز خطاب سے یاد کیا جاتا ہے گو ہم اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حقارت حقیقت میں ایک لطیف بلکہ محبت آمیز حقارت ہے جو ایک عملی شخص کو نظری، قوی کو ضعیف اور عملی ہمدرد انسان کو زبانی ہمدردی کرنیوالے سے ہوا کرتی ہے۔

عام اور عامیانہ خیال افسانہ کے متعلق یہ ہے کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی طرف ایک مدبر، عالم اور سنجیدہ شخص کی توجہ منعطف نہ ہونی چاہئے۔ کیونکہ بعض اہل الرائے حضرات کے پاس قصہ نویسی، سنجیدہ مزاجی کے منافی ہے۔ محض قصہ گوئی کی وجہ سے وہ ایک شخص کو اہم اور عملی معاملات میں قدم رکھنے کے ناقابل سمجھتے ہیں انگلستان کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار ڈزرائیلی الملقب بہ ارل آف بیکنز فیلڈ پر جتنی تنقیدیں ہوئی ہیں ان میں اس احساس کو جاری و ساری دیکھا جاتا ہے کہ ایک ناول نگار کو کبھی "مدبر" جیسا اہم لقب اختیار نہ کرنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ اس پر تعجب کریں کہ "ویوی ین گرے" اور "کاننگس بے"[1] کا مصنف، کیونکر ایک سنجیدہ مدبر "توبۃ النصوح" اور "مرآۃ العروس" کا لکھنے والا کس طرح ایک کامیاب تعلقہ دار ہو سکتا ہے؟

بعض نقاد افسانہ نگار کو حسن و عشق کی بنیادوں پر پادر ہوا عمارتیں بنانیوالا تصور کرتے ہیں اور اسی لئے اہم امور میں ان پر اعتماد کرنے سے انہیں پس و پیش ہوتا ہے تھکرے کی شہرت نے اس کی زندگی ہی میں سارے انگلستان کو مسخر کر لیا تھا، مگر جب وہ شہر آکسفورڈ کا نمائندہ بن کر کھڑا ہوتا ہے تو سخت ناکامی اٹھانی پڑتی ہے۔ کیونکہ لوگوں نے کبھی کسی "ماہر سیاست تھیکرے" کا نام نہیں سنا تھا۔ عوام کے منہ اس کی زنجیر رسوائی کی کڑیاں بن گئی تھیں اور یہ سلسلہ گھر سے گھر اور دکان سے دکان پہنچ گیا تھا کہ یہ شخص جو تم سے رائے طلب کر رہا ہے محض ناول نگار ہے!

ایک گروہ نقادان ادب کا ایسا بھی دکھائی دیتا ہے جو افسانہ کو ایک حد تک فنون لطیفہ میں شمار کرنے کے لئے تیار ہیں لیکن وہ کبھی اس بدعت کو نہیں برداشت کر سکتا کہ فنون لطیفہ میں بھی افسانہ کو بلند رتبہ عطا کیا جائے اس کا اعتراض یہ ہے کہ آخر وہ بھی کوئی اعلیٰ فن ہے جس کے نہ کوئی اساتذہ موجود ہوں اور نہ کوئی درس، جس کی تعلیم کے لئے اسکول موجود ہوں اور نہ اکاڈمی، وہ کون جامعہ ہے جس کے نصاب میں اس فن کو بھی شامل کیا گیا ہے؟ جرمانیہ کے بعض وہ جامعات بھی جن میں ہر فن کی تعلیم دیجاتی ہے اس سے قاصر ہیں، ہم انہیں معلومات کی بنا پر کہہ سکتے ہیں کہ کسی افسانہ نگار نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اپنے فن کے رازوں کو دنیا پر ظاہر کرے یا کم از کم اس کو اکتساب ہی کے قابل بنا دے، غرض کہ وہ اسی قسم کے اعتراضات کی بوچھار لگا دیتے

---

[1] Vivan Gray　Coningsby　ڈزرائیلی کے مشہور ناول ہیں۔

ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ افسانہ نگاری ایک ایسا فن ہے جو بغیر کسی قسم کی جد و جہد کے حاصل ہو سکتا ہے اس کے لئے کوئی قیود نہیں اور نہ پابندیاں کیونکہ اس فن کے متعلم کے لئے کوئی منضبط مواد موجود ہی نہیں۔ یہ فن آپ سے آپ حاصل ہو سکتا ہے یا زیادہ سے زیادہ تقلید کی بدولت۔

نہایت افسوس کا مقام ہے کہ اس قسم کے خیالات ان لوگوں کے دماغوں میں بھی گھوم رہے ہوں جو حسن اتفاق یا سوئے اتفاق سے لکھتے اور پیش پیش رہتے ہوئے اس میدان میں اتر آتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہر شخص افسانہ اور ناول لکھ سکتا ہے پھر وہ کیوں مصنفین کے دائرہ سے خارج ہوں؟ ادبیات کے اس شعبہ میں کام کرنیوالوں کی مایوسی کے خیال سے ہم ایک لفظ بھی ان کے خلاف کہنا نہیں چاہتے، بلکہ ان کی دلجوئی اور دلدہی مقصود ہے، لیکن اس خواہش سے بھی باز نہیں رہ سکتے کہ ان لوگوں کو اس فن کی اہمیت سے مطلع کر دیں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کر کے نہایت ثابت قدمی اور علو ہمتی کے ساتھ اس میدان میں قدم رکھیں اور اسی سنجیدگی کے ساتھ اس فن کا مطالعہ کریں جس کی ایک مصور یا موسیقی داں کو ضرورت ہے، تاکہ افسانوی ادب کا عام معیار جو آج نہایت پست ہو چکا ہے، بلندی کی طرف مائل ہو، اور اس تنزل کا ازالہ ہو جائے جو اردو زبان کے مستند ادیبوں میں مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔

کسی زبان کی تاریخ ادب اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک اس کے افسانوں کو اس میں شامل نہ کیا جائے، اس کا تعین کہ کسی زبان کے افسانوں کو ادبیات میں کیا درجہ حاصل ہے، اسی زبان کے بہترین افسانوں کو ہر دلعزیزی سے ہو سکتا ہے۔ اردو زبان کے افسانوں میں میر امن، سرشار، شرر، حافظ نذیر احمد، رسوا، پریم چند اور سدرشن وغیرہ ہم سے افسانوں کے ذریعہ متعارف ہوتے ہیں اور ہمارے دلوں میں ان کی عظمت کا سنگ بنیاد، خود ان کے افسانوں نے رکھا ہے۔ جو قوم اپنی زبان کے افسانوں کی قدر کرنا نہیں جانتی، یقیناً وہ حسن فطرت کے گوناگوں مظاہر سے متاثر ہونیکی قابلیت نہیں رکھتی، بلکہ ہم قیاس قایم کر سکتے ہیں کہ اس قوم میں شعر فہمی کا مذاق بھی نہیں۔

یہ فطری تقاضہ ہے کہ کمسن بچے جب اپنی حروف تہجی کی تختیاں ختم کر کے مسلسل عبارتیں پڑھنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو سب سے پہلے موقع پر جو شے ان کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، وہ افسانے ہیں، ان کو وہ بار بار پڑھ کر کچھ حیرت اور کچھ خوف نوعض عجیب مزے سے لیکر پڑھتے جاتے اور دوسروں کو سناتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی شخصی قصہ کا نمونہ بنتے دیکھنا چاہتے ہیں، کسی بڑے آدمی کے متعلق مشہور ہے کہ "شاہنامہ" کو پڑھتے ہی اس کے دل میں یہ امنگ پیدا ہوئی کہ میں کیوں رستم ثانی نہ بنوں؟ چونکہ بچے ہی جوان ہوتے ہیں اس لئے ان کی عمر کے ساتھ قصہ گوئی کا جذبہ بھی پختہ ہو جاتا ہے، اور مخصوص ذہنی اثرات سے اتصال پا کر کبھی ایک آدھ ایسا شہ کار دنیا کے سامنے پیش کر دیتا ہے جو زبان کی بقا تک باقی رہتا ہے۔

قدیم افسانے عموماً قوم کی طفلانہ تخیلات کی یادگار اور ان امور کا آئینہ ہوتے ہیں جن میں وہ آنکھ کھولتے ہی دلچسپی لینے لگتی ہے گرد و پیش کی اشیاء جو اس کی حیرت و تعجب کو اکسانے اور نفرت یا غیض و غضب کو تحریک میں لانیکا باعث ہوتی ہیں، مفروضات، جن کو اس کی عقلیں مبہم ادراک کرتی ہیں اور فوق العادت چیزیں جن کو اس کا تصور حقیقت کا جامہ پہنا کر دکھاتا ہے، غرض یہ تمام اشیاء افسانہ کا حقیقی موضوع ہیں۔

یہ طرۂ امتیاز صرف افسانہ ہی کو حاصل ہے کہ وہ دنیا کا سب سے زیادہ قدیم فن ہے جس زمانہ میں کہ مصوری، بت تراشی اور دوسرے فنون لطیفہ کتم عدم میں مستور بلکہ خیال سے بھی دور تھے، افسانہ دنیا سے روشناس ہو چکا، اور اپنے منشائے تخلیق کو بوجہ احسن پورا کر رہا تھا، یونانی نقطۂ نظر سے یہ فن شاعری اور موسیقی کی رب النوع دیویوں سے بھی قدیم ہے کیونکہ جس وقت وہ پیدا ہوئیں، یہ موجود تھا، اور اپنے دلفریب

قصوں سے ان کے کانوں کو لذت اندوز کرتا رہتا، اس کی جہانگیری کا یہ حال ہے کہ کائنات کے کسی گوشہ میں بھی ایسی قوم کا پتہ ملنا دشوار ہے، جس کے کان قصوں سے ناآشنا رہے ہوں!

یہ فن مذہبی حلقہ اثر کو بڑھانے میں بدل معاون ثابت ہوا ہے۔ ہر زمانہ میں، حتیٰ کہ آج بھی مقدس ہستیوں، دیوتاؤں، ولیوں، اور شہیدوں کے کارنامے، سوانح عمریاں اور مصائب، افرادِ عام کے پسندیدہ موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اس کی وسعت اور ہر دلعزیزی کا اندازہ کچھ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ ہر اس مقام میں بھی بے دھڑک گھس جاتا ہے، جہاں مصوری سے آنکھ غیر مانوس اور موسیقی سے کان ناآشنا ہیں۔ یہ فن انسان کا شفیق ترین اور اداشناس معلم ہے کیونکہ اس کے درس سہل الحصول اور فہم آشنا نظر آتے ہیں، یہ وہ مکتب ہے جس میں ہر پیشہ اور ہر حیثیت کا متعلم داخل ہو سکتا اور فلسفہ، حکمت، مذہب، اور دیگر علوم و فنون کے نکات سے واقفیت حاصل کر سکتا ہے، موجودہ افسانے غیر مادی خیالات کو مادی اور محسوس اشکال میں تبدیل کر کے معلومات میں معتدبہ اضافہ کرتے، اعتقادات کو تقویت دیتے اور جذباتِ رحم، ہمدردی اور شرافت کو اکساتے، اور مستحکم بنا دیتے ہیں وہ انسان کو رنج و غم کی پستی سے نکال کر جہات کی بلندیوں کا راستہ بتاتے ہیں۔ افسانہ ہی وہ کتاب ہے جس کو خواندہ لوگوں کی بڑی تعداد پڑھ سکتی ہے، ہر ملک کے کتب خانہ اس کی کثیر تعداد جلدیں، اس بات کا ثبوت ہیں کہ اس فن کی رفتار ہر دلعزیزی کو اکو ئی دوسرا علم و فن نہیں پہنچ سکتا افسانے ہم کو طرزِ تکلم اور گفتگو کو بہترین زیورِ الفاظ و معانی سے آراستہ کرنا سکھاتے ہیں۔ اگر فنِ لطیف کی منتہا بالشان خدمت تہذیب اخلاق تسلیم کی جائے تو اس حیثیت سے بھی یہ فن نہایت اہم ثابت ہوتا ہے، ایک حکیم کا قول ہے کہ "دنیا نے آج تک جو کچھ بھی اخلاقی سبق سیکھے ہیں، وہ قصہ کہانی، لطائف حکایت اور تمثیل کے پیرایہ میں سیکھے گئے ہیں"[1]

کیونکہ بقول ابوالفضل[2] بالراست موعظت و نصیحت انسان اس لئے قبول نہیں کرتا کہ انانیت قلب سدراہ ہوتی ہے۔ یورپ کے ایک ادیب نے افسانہ ایک "جیبی تماشہ گاہ" کے نام سے یاد کیا ہے، جس میں دوسری تماشہ گاہوں کی طرح اخلاقی ڈراما دکھایا جاتا ہے۔

افسانہ اور ادب

اس امر میں ادیبوں کو اختلاف ہے کہ "ادب" کی حدود متعینہ کہاں تک ہیں، بعض ادب کی اصطلاح کو زبان کے سارے مکتوبی مواد پر حاوی تصور کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے تاریخ، فلسفہ، ریاضیات اور سائنس بھی ادب کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ ادب کے اصلی مفہوم میں صرف تخلیقی مکتوب داخل ہیں جس سے ریاضی، فلسفہ وغیرہ خارج سمجھے جانے چاہئیں۔ تمام ادبی ذخیروں کو دو وسیع حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نظم اور نثر، نثر، وزن، اور قافیہ و ردیف کے قیود سے آزاد ہے علاوہ ازیں اس میں ہر موضوع کے اظہار کی کما حقہ قابلیت موجود ہے خواہ وہ عملی ضروریات سے متعلق ہو یا ذہنی سے لیکن نظم میں صرف لطیف اور نازک مضامین کے باندھنے کی اجازت ہے۔ جس کا ارتقا فنی طور پر ہو سکے اس لئے نثر کو بہ نسبت نظم کے ادبی خیال کے اظہار کا زیادہ لچکدار اور آسان ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ باعتبار صورتِ ظاہری نثر، یہ شکلیں اختیار کر سکتی ہے:۔

(۱) —— بیانیہ (۲) —— توضیحی (۳) —— روایتی

---

[1] The Art of Fiction مصنفہ والٹر بیسنٹ

[2] —— دفتر ابوالفضل

۱ —— بیانیہ نثر وہ ہے، جس میں مصنف اپنے اور اکات اور تجربات کی بعینہٖ تصویر کھینچ دیتا ہے۔

۲ —— توضیحی نثر، ایک قسم کی نثر ہے جس کا مقصد کسی خاص مسئلہ کی اشاعت یا کسی موضوع پر استدلالی بحث کرنی منظور ہوتی ہے منطق اور فلسفہ کی کتابیں عموماً اسی طرز میں لکھی جاتی ہیں، اسی لئے اس کا تعلق احساسات کے بہ نسبت عقل سے زیادہ ہوتا ہے۔

۳ —— روایتی نثر میں واقعات کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اگر بیان کردہ واقعات کسی خاص شخص کی زندگی کے بالکل مطابق ہوں تو سیرت یا سوانح عمری کہلائے گی اور اگر اقوام یا جماعتوں کی زندگی کے صحیح حالات بیان کئے جائیں تو ہم اس کو تاریخ کہتے ہیں۔ مگر جب اس میں عام حیات انسانی کے مطابق واقعات کا بیان ہو تو اس کو "حقیقی افسانہ" اور جب کائنات خیالی کی مخلوں کے معاشرتی حالات دکھائے جائیں تو ان کو رومانس یا "مثالی افسانے" کہیں گے اس لحاظ سے عموماً تمام ناول اور مختصر کہانیاں حقیقی افسانوں کے زمرہ میں داخل ہیں، اور حکایات، رومانس، تمثیلات وغیرہ مثالی افسانے کہلائیں گے۔

روایتی نثر کا مقصد یا تو معلومات بہم پہنچانا ہوتا ہے جیسے سیرت اور تاریخ۔ یا صرف مسرت آسانی۔ یہ کام ناول اور مختصر کہانیاں انجام دیتے ہیں۔ اور کبھی اسکے ذریعہ کسی مخصوص نکتہ کی توضیح یا تشریح منظور ہوتی ہے جیسا کہ حکایات اور تمثیلات میں ہوا کرتا ہے۔

افسانہ کی تخلیق

قصہ گوئی انسان کا قدیم ترین اور نہایت دلچسپ مشغلہ رہا ہے، انسان میں تقلید اور نقل اتارنے کا مادہ فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے چنانچہ مسٹر مارڈن کا خیال ہے کہ آنکھ کھلتے ہی انسان نے جن اشیا کو اپنے گردوپیش دیکھا، ان کی نقلیں اتارنی شروع کیں۔ پہلے پہل یہ کام پتھروں اور درختوں کے تنوں پر نقوش اور تصاویر اتارنے تک محدود تھا۔ جو کندہ دن کی شکل میں ہم تک پہونچے ہیں، یہ جذبہ حیات انسانی کے ابتدائی دور میں جس شدت کا تھا، اس کا پتہ متذکرۂ بالا پتھروں کے کندہ نقوش اور تصاویر سے بخوبی چل سکتا ہے، جو اس دور کے قوی ترین آثار ہیں، قدیم مصر کے خط تصویر کی پیدائش اسی احساس کی مرہون منت ہے، جسکے کتبے وادی رود نیل میں بکھرے ہوئے دستیاب ہوتے ہیں۔ انسان کی اختراع اور تنوع پسند طبیعت جب اس مشغلہ سے اکتا گئی اور قوت گویائی بھی بڑھ گئی تو اس نے قصہ گوئی کی طرف توجہ کی، زبان ترقی کے جس قدر مراحل طے کرتی چلی آرہی ہے۔ قصہ گوئی نے بھی کئی پہلو بدلے ہیں، چنانچہ قصہ، کہانی، حکایت، افسانہ، ڈراما اور موجودہ فنی ناول اسی کی مختلف صورتیں ہیں۔

رچرڈ برٹن اپنی کتاب "ماسٹرس آف دی انگلش ناول" کا آغاز اس طرح کرتا ہے کہ:۔

"کہانیاں ساری دنیا کی پیاری ہیں، اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ قصہ گوئی کا اغاز اسی وقت سے ہوا ہو، جس وقت سے کہ انسان نے کھڑا ہونا سیکھا"[۱]

مارڈ لکھتا ہے کہ:۔

"فنی قصہ گوئی، افراد انسانی کا قدیم ترین مشغلہ ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو قلب انسانی میں مستحکم طور پر جاگزیں ہے سب سے پہلے صورت ساز کے ہاتھ، پتھر کی چٹانوں سے ابھی بھدی شکلیں پیدا کرنے کے قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ اس قابلیت کا نشوونما ہو چکا تھا، قدیم نظمیں درحقیقت قصہ کے لباس میں دنیا کے سامنے پیش ہوئی ہیں"[۲]۔

---

[۱] Masters of the English Novel [۲] Modern Literature

غرض افسانہ کی تخلیق کا خیال اور اس کے جد اعلیٰ کی جستجو ہم کو اس قدیم زمانہ تک لیجاتی ہے جس میں زبان کے ابتدائی قواعد مدون تک بھی نہ ہوسکے تھے مگر قصے اور کہانیاں بڑے بوڑھوں کی نوک زبان اور بچوں کے صفحۂ دل پر نقش تھے مقدس ہستیوں کے حالات اور بہادروں کے کارنامے روایتوں کی شکل میں سینہ بسینہ چلے آتے تھے، لیکن قصہ کی وہ شکل موجودہ شکل سے بالکل مختلف اور غیر منتظم تھی اُن میں جانوروں اور بے جان چیزوں سے انسان کا کام لیا جاسکتا تھا، اور اُن میں انسانی لوازمات فرض کرلئے جاتے تھے۔ فوق العادت واقعات اس کے روح رواں سمجھے جاتے تھے۔ ہمارا ہیرو "رستم" یا "حاتم" نا برائے تام انسان مگر سیرت میں فرشتہ، دیو، یا شیطان ہوتا، اور اسی طرح، ہیروئن بھی ہوتی یا تو اژدر کے اکھاڑے کی کوئی خوبصورت پری، یا بھوت چڑیل ہوتی تھی، اس کے پلاٹ کے لئے کسی خاص سرزمین کا ہونا ضروری نہ تھا۔ ہر حال جو چیز ان قصوں میں نمایاں ہے وہ مصنفین کی ذہنیت اور ان کا تخیل ہے اور بس، گویا قدیم افسانے اس سوسائٹی کے خیالات کی نامو ذون یادگار ہیں جس میں ان کی تخلیق ہوئی۔

غیر تہذیب یافتہ زمانے میں طائر تخیل کی پرواز نہایت بلند اور تیز ہوتی ہے اور قوت امتیاز جو اس کی حکمراں طاقت ہے، معدوم رہتی ہے۔ اسلئے

"کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بجائے عقلی علوم کے تخیلی فنون کی ترقی افراد انسانی کے زمانۂ جاہلیت میں زیادہ ہوتی ہے"[۵۱]

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ قدیم افسانہ نگاروں کے بلند تخیلات نے حقائق کی طرف توجہ کرنیکا انہیں بہت ہی کم موقع دیا۔

مسٹر مارٹن نے قدمائی توجہات کا سبب یہ بیان کیا[۵۲] ہے کہ جب انسان نے پہلے پہل جانوروں کو دیکھا ہوگا تو انسانوں کی طرح ان کو بھی چلتا پھرتا اور کھاتا پیتا پایا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس کی نظریں کسی اور فرق کو نہیں دیکھ سکتی تھیں، پھر کس طرح وہ انسان اور حیوان میں تمیز کرسکتا تھا؟ اگر وہ کبھی ان کی طرف جاتا اور وہ بھاگ جاتے تو ان کو ڈرپوک اور جو حملہ کر بیٹھتے تو دشمن تصور کرتا ہوگا۔ یہ تمام اسباب ایسے تھے جو عملی طور پر اس کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کافی تھے کہ انسان اور حیوان میں کوئی مابہ الامتیاز شے نہیں ہے، لہذا وہ حیوانوں کے لئے بھی انسانی لوازمات مثلاً تکلم اور شعور وغیرہ فرض کرلیتا ہے کیونکہ انکی غیر منتظم آواز پر اس کو گفتگو اور ان کو غیر ارادی افعال پر اس کو شعور کا دھوکا ہونا بعید از قیاس بات نہیں۔
اس سے آگے بڑھکر جب انسان کو لکڑی پتھر وغیرہ سے کام لینے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ یہ چیزیں بھی بغیر طاقت و قوت کے استعمال اور کشمکش کے قابو میں نہیں آسکیں تو ان میں بھی روح فرض کرلیتا ہے اور ان کو اپنے مقصد کے موافق تبدیل کرنے میں جو وقت اٹھانی پڑتی ہے اس کو "جنگ" اور جب ان کو اپنے حسب منشا تبدیل کرلیتا ہے تو اپنی "فتح" خیال کرتا ہے آفتاب کی حرارت، پانی یا ہوا سے اس کو نقصان پہنچتا ہے تو انہیں بھی وہ اپنا دشمن تصور کرلیتا ہے۔ مگر جب قوت کے وسیلے سے بھی ان پر قابو نہیں پاسکتا، تو ان کو انسان سے بھی ایک درجہ اور آگے بڑھا کر دیوتا تسلیم کرلیتا ہے اور ان کے خشم و غضب سے بچنے کے لئے ان کے سامنے سر اطاعت خم کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ اسی احساس نے، دنیا کی اکثر اقوام کو دیومالا[۵۳] کی بنا کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس پر آج تک بھی بعض لوگ اعتقاد رکھتے ہیں، کم و بیش یہی اسباب تھے

---

۵۱ دیکھئے The International Library of famous literature کا مقدمہ اور مقدمہ شعر و شاعری (حالی)

۵۲ The Living Past باب ۳ و ۴

۵۳ Mythology

جو خالص فوق الفطرت افسانوں کی تخلیق کا باعث ہوئے،

اس کے بعد کچھ ایسے قصے بھی ہیں جن کے مصنفین کے متعلق اس قسم کا سوء ظن رکھنا، کہ وہ حیوان اور انسان میں تمیز نہیں کر سکتے تھے، ان پر بہتان باندھنا ہوگا۔ "کلیلہ و دمنہ" جو سنسکرت زبان کا غیر فانی کارنامہ ہے "ایسپس فیبلس" جو یونانی زبان کی زندۂ جاوید تصنیف ہے، ان سے ان کے مصنفین کی علمیت مردم شناسی، اور معلم اخلاق ہونیکا نہایت واضح ثبوت ملتا ہے۔ ایسے متبحر حضرات سے، کبھی ایسی غلطی صادر نہیں ہو سکتی، پھر جب وہ حیوانوں سے انسانوں کے کام لیتے ہیں تو اس کے کیا معنی ہوں گے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جو عذر حالی نے شاعروں کی طرف سے حضرات زہاد اور واعظین کی خدمت میں پیش کیا ہے وہی ان افسانہ نگاروں کی طرف سے منطقی دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔ کسی شے پر اس کے متضاد صفات خوب کھلتے ہیں

"سیاہی کا دھبہ جیسے اُجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے ایسا میلے کپڑے پر نہیں ہوتا .... [1]"

انسان میں تکلم اور شعور کا پایا جانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن حیوانوں اور بے جان چیزوں میں روح یا تکلم کا ہونا ایک نئی بات ہے جو خواہ مخواہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے والی ہوگی، اور یہی ان افسانہ نگاروں کا مقصد تھا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، لوگ اس کو توجہ سے سنیں۔ اسی میں علم النفس کا یہ نکتہ مضمر تھا کہ جب کسی شخص کے دل میں کسی بات کو زور دیکر جمانا ہو تو سب سے پہلے اس کے تعجب کو اکسا کر اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایسی حالت میں وہ جو کچھ سیکھتا ہے پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے۔

ہم نے لیلیٰ و مجنوں کے افسانہ کو بارہا پڑھا ہوگا، لیکن سجاد حیدر یلدرم جب اس قصے کے قدیم چوکھٹے میں نئی تہذیب کی تصویریں بٹھاتے ہیں اور ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہماری نظریں عجیب حیرت اور استعجاب سے اس پر گڑ جاتی ہیں، اور اختتام تک وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔ لیلیٰ کا ناقہ و محمل سے اکتا کر موٹر میں تفریح اڑانا اور مجنوں کا تلاش یار میں بائیسکل پر سوار ہو کر نجد کی گلیوں میں مارا مارا پھرنا، خار مغیلاں کی قدیم عداوت کا نئی شکل میں جلوہ گر ہونا یہ تمام ایسے واقعات ہیں جن کو پڑھکر ہم بیساختہ کہہ اُٹھتے ہیں "یہ نئی کارنامہ ہے"!

حقیقت اور افسانہ عام طور سے لفظ "افسانہ" جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے وہ حقیقت یا صداقت کے متضاد ہیں یعنی جب ہم کسی شخص کے بیان کو غلط ظاہر کرنا چاہتے ہیں تو کہتے ہیں "وہ افسانہ کہہ رہا ہے"۔ جھوٹ کے علاوہ اس میں طوالت کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ قدما نے اس اصطلاح کو ہر اس قصہ کیلئے بھی استعمال کیا ہے جسکو انکی عقلیں صحیح یا کم از کم ممکن تصور کرتی تھیں۔ گویا اس کو ادب کے اس پورے شعبے پر حاوی سمجھنا چاہیئے، جس کو قصہ سے ذرا بھی تعلق ہو "فسانۂ آزاد" "فسانۂ عجائب" "قصۂ اگر گل" "باغ و بہار" وغیرہ تمام افسانے ہیں، جن میں فرضی قصے بیان کئے گئے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ متقدمین بھی ان کو فرضی سمجھتے ہوں، بلکہ ہم نے جب اپنی وسیع معلومات کی روشنی میں ان کا مطالعہ کیا تو یہ نہ صرف غلط، غیر فطری اور خلاف قیاس معلوم ہونے لگے، بلکہ مستہزا خیز بھی! اسی لئے ہم نے کسی بیان کو جس میں یہ صفات موجود ہوں "افسانہ" (غلط اور طویل بیان) سے تعبیر کرنے لگے۔

افسانہ کے اندر بھی ایک صداقت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے، مگر یہ صداقت بالکل اسی قسم کی نہیں جس کی ہم حسابی امور سے توقع رکھتے ہیں۔

---

[1] دیباچہ دیوان حالی صفحہ ۶

جہاں ان دونوں میں تصادم کر دیا جاتا ہے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں، افلاطون بھی اسی مغالطہ کی بنا پر تمام تخئیلی ادب کو "دھوکا" سمجھتا ہے کیونکہ اس میں حیات کی بجنسہ صداقتیں مفقود ہوتی ہیں ان کے خیال کے مطابق "ہومر کی شاعری" یا بالفاظ دیگر سارے تخلیقی کارنامے محض "اغلاط کا مجموعہ" ہیں بعض بزرگوار آج بھی ایسے موجود ہیں جو افسانہ اور حقیقت کی صحیح ماہیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے افسانوی ادب کے ذخیرہ کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ ارسطو کے عدیم المثال دماغ نے افلاطون کے اس مغالطہ کو پاکر ہمیشہ کے لئے اس جھگڑے کو طے کر دیا، وہ کہتا ہے کہ ہر تخئیلی پیداوار میں ایک اصولی صداقت موجود ہوتی ہے۔ جس کو حقیقت شعری[1] کے نام سے موسوم کرنا چاہئیے، یہ اس صداقت سے زیادہ عمیق اور زیادہ وسیع ہے جو کسی تاریخی کارنامہ میں نظر آتی ہے، کیونکہ مورخ کو صرف انہیں واقعات تک محدود رہنا پڑتا ہے جو گزر چکے ہیں لیکن افسانہ نگاری کا تعلق "کائنات مثلی" سے ہے، اول الذکر صداقت سے مراد وہ حالت ہے جس میں کوئی شئے دستیاب ہوتی ہے، تاہم انگلستان کے زندہ جاوید انشاپرداز ڈی کوینسی[2] نے "علمی ادب" اور "الہامی ادب" کا فرق قایم کرکے اس مسئلہ کو اور بھی واضح بنا دیا، پہلی قسم کی صداقت کا امتحان حقایق کیساتھ مطابقت سے کیا جاتا ہے اور یہ غیر متبدل نہیں کیونکہ سائنس کی جدید معلومات قدیم نظریوں کو بے بنیاد ثابت کرتی چلی آ رہی ہیں اسی لئے سائنس حیاتیات وغیرہ کی کتابوں کو ہر وقت نئے سرے سے لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی اور تواریخ پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، لیکن دوسری قسم کی صداقت غیر متزلزل ہے، کیونکہ اس کا تعلق فطرت انسانی، اس کے جذبات اور احساسات سے ہے، فطرت انسانی کبھی نہیں بدل سکتی، اس لئے قدیم ترین کتب جن کا تعلق اس صداقت سے ہے آج بھی ویسے ہی قابل قدر ہیں، جیسے لکھے جانے کے وقت تھے، خود ارسطو کے خیالات نئی تحقیقات کی روشنی میں مبہم پڑتے نظر آ رہے ہیں، لیکن "ایلیڈ" "آڈیسی" "مہابھارت" اور "شاہنامہ" وغیرہ کی دلچسپی اور عظمت کے خزانے ہمیشہ معمور رہیں گے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ "افسانہ میں سوائے نام اور تاریخ کے ہر شئے صحیح ہے اور تاریخ میں سوائے نام اور تواریخ کے کچھ صحیح نہیں" کس ظریفانہ انداز میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس پر تمام دنیا کے افسانوں کی لازوال عمارتیں کھڑی ہوئی ہیں۔ ناول نگار کتاب کو جس قالب میں چاہے ڈھال سکتا ہے لیکن کسی حال میں بھی اس قسم باشان حقیقت سے انحراف کرنیکا وہ مجاز نہیں جو "صداقت حیات" کہلاتی ہے" اگر ایسا سقم ہے تو افسانہ میں ہر چیز سقیم ہے! اس کے یہ معنی نہیں کہ افسانہ نگار اپنے طائر تخیل کے پر و بال ہی کاٹ کر رکھدے، موجودہ ناول نگاروں میں ہم صداقت شعاری اور حقیقت نگاری کا شور و غوغا سن رہے ہیں، ان لوگوں نے اس اصول کا عجب بھونڈا استعمال کیا کہ ہر بدتر سے بدتر اور مکروہ سے مکروہ شئے کی عکاسی کو اپنا شعار قرار دے لیا ہے سب سے زیادہ شکایت اس گروہ سے ہے جس کے خیال میں یہ بات بس گئی ہے کہ ناول نگار کو اپنے مشاہدات کی سرحد سے قدم باہر نہ نکالنا چاہئیے، گویا ان لوگوں نے افلاطون کے خیال کا احیا کیا ہے۔ گوئٹے[3] کس قدر پیارے الفاظ میں لکھتا ہے "فنی پیداوار حقیقت ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ ایک حالت پر رہتی ہے۔ مثالی ہے، کیونکہ وہ واقعی نہیں"[4]

عبدالقادر سروری بی۔ اے

[1] مقدمہ شعر و شاعری (حالی)، [2] Thomas De Quincey مشہور مقالہ نگار، و نقاد جو انگریزی شعرا ورڈسورتھ اور کالرج کا ہمعصر تھا۔

[3] Johann Wolfgang Von Goethe جرمنی کا شہرہ آفاق شاعر، ماہر علم السیاست اور ناول نویس، اقبال نے بھی اپنی ایک نظم میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، جو غالب سے متعلق ہے "ہائے تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے، گلشن ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے"

[4] Introduction to the Study of Literature P.P. 222 از ہنری ہڈسن

غالب کی ذہنیت پر ایک نظر

بیا و ر ید گر ایں جا بود زبان دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

نگار کے اگست نمبر میں زور صاحب کا ایک مضمون بعنوان "غالب کی ذہنیت" شائع ہوا ہے، مجھے اس تنقیدی حصہ کے متعلق جس میں غالب اور ذوق کا مقابلہ کیا گیا ہے کچھ عرض کرنا ہے اگر مضمون کے من و عن پر غور کیا جاسے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ صرف جذبۂ ذوق پرستی ہی اس مضمون کا محرک ہے اور آپ نے اسی پیاس کو بجھانے کے لئے نگارش کی تکلیف گوارا کی ہے، گویا آپ مولانا حسرت کی اس آیت کے مفسر ہیں جو انھوں نے دیباچۂ دیوانِ غالب کے آخر میں ذوق، غالب، اور مومن کی اردو شاعری پر تبصرہ فرماتے ہوئے لکھی ہے، کہ اردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کو مرزا پر فوقیت حاصل ہے مجھے اس وقت اس مقبولیت سے بحث کرنا مقصود نہیں جو مولانا کے اس خیال کو ادبی دنیا میں حاصل ہوئی ہے، بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ زور صاحب نے اس مضمون کی نگارش سے پہلے کتنے تعمق اور تدبر سے کام لیا ہے۔

اُن کے ہاں غالب کی مخصوص ذہنیت "رشک" ہے اور اس خصوصیت کو، غالب کے دل و دماغ میں جاری و ساری پاتے ہیں، اس کے بعد انھوں نے رشک کے بالترتیب چند مراتب گنے ہیں، جن کی تعداد آٹھ ہے۔

"اردو" جلد اول کا دوسرا سہ ماہی نمبر (اپریل ۱۹۲۱ء) اس وقت میرے سامنے ہے اس میں "غالب کی بعض خصوصیات" کے عنوان سے مولوی محمد مہدی صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے "ارتقائے رشک" کے نام سے ایک تحتی عنوان قایم کرکے کم و بیش رشک کے اتنے ہی مراتب گنائے ہیں جتنے کہ زور صاحب نے۔ پر اس سے یہ مطلب نہیں کہ سوائے حیدرآبادی مضمون نگار کے "رشک" کے یہ مراتب اور کسی کے دماغ میں آسکتے ہی نہ چاہئیں، بلکہ ہر شخص کی استقرائی جد و جہد کا نتیجہ ضرور ہے کہ یہی ہو۔ لیکن مضمون سے ہرگز یہ تراوش نہیں ہوتا کہ زور صاحب نے کبھی بھی اس غرض کی تکمیل کے لئے غالب کے دیوان کی ورق گردانی کی تکلیف گوارا فرمائی ہو

رہا یہ امر کہ آیا واقعی غالب کی ذہنیت رشک ہی ہے، سو اس کے متعلق مولانا نیاز کی رائے اسی نمبر کے ملاحظات میں ملاحظہ فرمالیں، مجھے اس سے کلی اتفاق ہے، اور میں کسی طرح یہ باور نہیں کرسکتا کہ غالب کا نصب العین "رشک" جیسی ادنیٰ کیفیت ہو۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا
غالب

اس کے بعد زور صاحب نے رشک کے اسباب میں ایک سبب یہ بیان کیا ہے کہ مرزا کی شاعری سہل الفہم نہ تھی، ان کی زبان فارسی اور عربی کی پیچ در پیچ

تراکیب پر مشتمل ہوتی۔ اس واسطے پبلک جو ذوق کی آسان نویسی اور قادر الکلامی کی طرح اور قدرداں تھی، وہ کس طرح غالب کی چیستاں سرائی کی قدر کرتی مرزا کو بھی تو اس حقیقت کا علم تھا کہ میری شاعری پر مضحکہ اڑایا جاتا ہے، اور عام پبلک دماغ اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں تاہم خواص کے حلقوں میں یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ میں ایک اچھا شاعر ہوں ؎

ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے　　غالب

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں "تاہم یہ سب دل کے بہلانے کی باتیں ہیں، مشاعروں میں معمولی معمولی شاعروں کی تعریفیں کی جاتی ہیں، لیکن غالب کی یہ ------- یہاں تک کہ احباب خانگی ملاقاتوں میں بھی اُن کے اشعار کا طرح طرح سے مضحکہ اڑاتے تھے"

اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عوام و خواص سب غالب کو ہرزہ سرا خیال کرتے تھے ایک مختصر سی جماعت بھی ایسی نہ تھی جو غالب کی پایہ شناس قرار دی جا سکے۔

میں تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں، کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت بھی ملک کی اتنی بڑی آبادی میں غالب کی قابل رشک شاعری کی قدرداں نہ رہی ہو۔ ہر زمانہ میں محققین کی ایک جماعت ہوا کرتی ہے جن کی نظریں عام نظروں سے زیادہ دور رس اور جن کے دماغ عام دماغوں سے زیادہ دور رس ہوا کرتے ہیں، وہ محققین کی یہی وہ جماعت تھی جو صحیح معنوں میں غالب کی طرفدار تھی اور انہیں لوگوں کی قدردانیاں تھیں کہ غالب جیسے انسان کی زبان سے جو زمانہ کی سفلہ پروری اور ناقدردانی سے سراپا مضطراب و ہیجان تھا، یہ کہلوا دیا کہ ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

- - - - - - - -

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

- - - - - - - -

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے　　جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

- - - - - - - -

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی　　یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

عام پبلک کی بے معنی باد ہو اور شور و شغب کو جس کی قدر و قیمت کسی زمانہ میں بھی کچھ نہیں ہوا کی، سن کر وہ کبھی متاثر نہ ہوتے، انھیں یقین تھا کہ ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

آگے چل کے آپ لکھتے ہیں، کہ "اب تک تو اُن کی ذہنیت پر رشک کا پھیکا سا رنگ بیٹھا تھا، لیکن جس واقعہ نے اس رنگ کو گہرا کر دیا، وہ شیخ ابراہیم ذوق کی قدر و منزلت تھی" اس میں کوئی شک نہیں کہ ذوق اپنے ہمعصر غالب کی طرح تخیل کے مضامین بہت بلند نہیں اڑاتے تھے، لیکن وہ جانتے

تھے، کہ خیالات کو ادا کرنے کے بہترین اور سہل الفہم ذریعے کون کون سے ہیں، جس پر کسی شاعر کی شاعری اور کسی نثر نگار کی نثر کی عظمت کا دار و مدار ہے "یہ بات مسلم الثبوت ہے، کہ وہی انشا پرداز زبردست مانا جاتا ہے، جو اپنے خیالات کے طریقۂ اظہار پر قابو رکھتا ہو" اگرچہ بیان غالب کی مدافعت میں وہی عذر پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خیالات اس قدر وزنی ہوتے ہیں کہ الفاظ ان کو سنبھال نہیں سکتے، لیکن اس کو مان لینے کے بعد بھی کوئی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ غالب پہلے اردو میں اپنے خیالات ظاہر کرتے وقت زبان پر کافی قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔"

"گوئٹے نے ڈانٹی کے متعلق کہا تھا کہ لوگ اس کو اس لئے زیادہ شوق اور توجہ سے پڑھتے ہیں کہ اس کا بہت سا کلام ادق اور مہمل ہے۔

پس غالباً یہی بڑی وجہ ہے جس نے غالب کے لئے اردو میں ایک غیر معمولی وقعت پیدا کر دی۔"

متذکرہ بالا عبارات زور صاحب کے مضمون سے نقل کی گئی ہیں، جن کا جواب بالترتیب ہم عرض کرتے ہیں۔

آپ نے جس فرضی "رشک" کا الزام مرزا کے سر تھوپا ہے اس کی تردید میں مرزا کا ایک شعر پیش کر چکا ہوں، علاوہ اس کے ہمارے خوددار، فاقہ مست اردو شعرا کا اسوۂ حسنہ آپ کے سامنے ہے، آپ کیوں اسے دیکھ کر مرزا کے اس طرز عمل کو اسپر قیاس نہیں کر لیتے، سودا ایک ذرا سی بات پہ بگڑ کر دربار سے ایسے بھاگے کہ جب تک نواب زندہ رہے ادھر کا رخ نہ کیا۔ وہ بلائے بھی گئے، التجائیں بھی کیں۔ ملک الشعرائی کے خطاب کا لالچ جام شراب بھی پیش کیا گیا، مگر یہ تمام نشے ہرن ہو گئے، جب انہوں نے ناک بھوں چڑھا کر نہایت ترشی سے یہ جواب دیا، کہ جو کچھ کریگا، میرا کلام کریگا نواب کی نوازش ملک الشعرائی سے کیا حاصل، آپ نے دیکھ لیا کہ زمانے نے اس کی تصدیق کی اور تاریخ نے اس کو سنہری نقوش میں قلم بند کیا۔
"میر تقی، گدائے فاقہ مست تھے۔ ۵،۰۰۰ روپیہ کا توڑا اس لئے منظور نہ کیا کہ نواب خود آ کر کیوں ان کے دربار میں یہ نذرانہ نہیں پیش کرتے۔

اگر غالب مرحوم کی دربار سے بیگانگی کے تحت میں یہی جذبہ کارفرما ہو تو آپ کو اس کے تسلیم کرنے میں دقت پیش آتی ہے؟

اس کی تائید میں مرزا کی زندگی کا ایک اور واقعہ پیش کرتا ہوں، کہ جب وہ فارسی پروفیسر کی اسامی کے امیدوار ہو کر پرنسپل کی ملاقات کے لئے گئے، اور محض اس لئے واپس چلے آئے، کہ پرنسپل ان کے استقبال کے لئے دروازہ تک نہ آیا۔ فرماتے ہیں ؎

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

ذرا سنیے، وہ اپنے نصب العین کو اپنی زبان میں کس طرح بیان فرماتے ہیں:-

ڈھونڈے ہے اس مغنیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

انہوں نے اپنے تمام درد و اندوہ، رنج و غم، حسرت و یاس، ناکامی و حرماں، مصائب و تکالیف کی وجہ جسے آپ آتش رشک کی شعلہ افشانیوں سے تعبیر کرتے ہیں، نہایت جامع اور مختصر الفاظ میں یہ بیان فرمائی ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

ذوق کی فضیلت کے باب میں آپ یہ فرماتے ہیں، کہ وہ خیالات کو ادا کرنے میں بہترین اور سہل الفہم ذریعہ سے واقف تھے اور اسی پہ شاعر کی شاعری اور نثر نگار کی نثر کا دارو مدار ہے۔ بخلاف غالب کے کہ وہ اردو میں مطالب ادا کرنے کے لئے زبان پر کافی قابو نہ رکھتے تھے۔

ذوق کا دیوان اگر آپ کے پاس موجود ہو تو اُسے اُٹھا کے دیکھئے، لمبی لمبی غزلیں ہیں، سادگی ہے۔ عامیانہ اور سوقیانہ مضامین ہیں، جو نہایت سوقیانہ اور عامیانہ انداز میں ادا کئے گئے ہیں۔ خیالات زبان کے پابند ہیں، تراکیب سست، بندشیں کمزور، اور مضامین نہایت ہی بے نمک ہیں۔ صحت زبان کا ضرور خیال رکھا جاتا ہے۔ مگر اس کی ذرا پرواہ نہیں کی جاتی ہے کہ خیال کی حیثیت کتنی بلند ہے، بعض جگہ تو بالکل وہی معاملہ ہے

دندان تو جملہ در دہان اند　　چشمان تو زیر ابروان اند　　(الا ماشاء اللہ)

ہم آگے چل کے ذوق کے کلام سے اپنے دعوے کا انشاء اللہ ضرور ثبوت پیش کرینگے؛

اب ہمیں یہ دکھانا مقصود ہے کہ نظم یا نثر کی عظمت کا جو معیار آپنے قائم کیا ہے، اور جس کی تائید میں آپنے ذوق کا کلام پیش کیا ہے کس حد تک درست اور صحیح ہے۔

اُردو کے نثر نگاروں میں سرسید مرحوم اور مولانا ابو الکلام چوٹی کے آدمیوں سے ہیں، سرسید اگر سہل نگاری میں فرد ہیں، تو مولانا مشکل نگاری کے استاد اور یگانۂ دہر، سرسید اور مولانا کی نثر کو اگر ذوق اور غالب کی نظم سے تشبیہ دی جائے تو شاید بیجا نہ ہوگا۔

حضرتِ سالک دیباچۂ لطائف الادب میں رقمطراز ہیں:-

"یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سرسید کی انتہا پسند طبیعت نے عروس اردو کو جو ایران و عرب کے بھاری بھاری اور بوجھل گہنوں کے بارِ گراں سے جھکی جاتی تھی بالکل ننگی بچی کر کے چھوڑ دیا۔ سادگی اور عریانی حسن فطرت سہی، اور الھڑپنے کی ادائیں دلآویز بھی سہی لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ایک چابک دست شاطہ کی ندرت کاریاں زلف برہم کی شانہ کش ہو کر شراب جن میں وہ چند نہیں ہزار چند تندی و کیفیت پیدا کر دینے میں ید طولیٰ رکھتی ہیں، اور جو ہنگامے عشاق کے دلوں میں ایک ننی منی بھی سجائی اور خوش حسینہ کے نظارے سے برپا ہوتے ہیں وہ کسی سر جھاڑ منہ پھاڑ چھوکری کو دیکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتے؛"

جناب سہا دیباچۂ مطالب الغالب میں فرماتے ہیں:-

"اگر شاعری کا مرتبہ نثر سے بلند اور زیادہ موثر ہوتا ہے، تو حالی اور اقبال کی شاعری کے اصلاحی اثرات نہایت نمایاں ہونے چاہئیں، لیکن کیا ایک صاحب نظر بھی ان کے اشعار کے اثرات کو ابو الکلام آزاد کے افسوں تحریر و تقریر پر ترجیح دے سکتا ہے؟"

"حالی کے مسدس نے کبھی رلایا ضرور ہے، اقبال کے اشعار نے ہنگام سماع لذت کش جوش ضرور کیا ہے، لیکن ابو الکلام کے انشاء نے تو جماعتوں کے معتقدات سیاسی و مذہبی میں تزلزل پیدا کر کے ایک قلم بدل دیا ہے"

اس کے بعد آپ خود غور فرما سکتے ہیں کہ آپ کا پیش کردہ معیار کتنا کچھ قابل تسلیم ہے، اگر بفرض محال آپ کا معیار درست اور صحیح ہی ہو تو بھی ذوق

کا کلام اس کسوٹی پہ پرکھنے کے قابل ہے، ذوق کا کلام سہل الفہم ضرور ہے، لیکن اس میں وہ شگفتگی اور رنگینی نہیں، جو کہ ایک عامی اور عالم کے درمیان ما بہ الامتیاز ہے، غالب کا تمام دیوان سوائے چند گنتی کے اشعار کے انہیں دو صفات کا مظہر اور جلوہ گاہ ہے۔

آپ اس عام رجحان اور شغف کی جو تعلیم یافتہ جماعت میں پیدا ہو رہا ہے، اور جس سے غالب کا دیوان روز بروز ان کی نظروں سے زیادہ قابل ہوتا جا رہا ہے وجہ یہ بیان فرماتے ہیں، کہ چونکہ اس کا بیشتر سا کلام ادق بلکہ مہمل ہے اس لئے اردو میں ایک غیر معمولی وقعت حاصل ہو گئی ہے۔

مجھے بے اختیار وہ زمانہ یاد آتا ہے، جب یاس عظیم آبادی نے صفحات مخزن مرحوم پہ غالب کے برخلاف ایک محشر بپا کر رکھا تھا، اور اس پیغمبر سخن کے مقابلہ میں بڑی شد و مد سے آتش لکھنوی کو پیش کیا تھا، یاس نے غالب پہ اعتراض کی ایک بوچھاڑ شروع کر دی تھی ان کے ہوا خواہ بھی پیدا ہو گئے تھے، اور بد خواہ بھی۔ جواب اور جواب، جواب الجواب تک نوبت پہنچی تھی، آخر وہ سب غوغا اور ہنگامہ ہائے بے تمیزی صدا بہ صحرا ثابت ہوا، آج چار دانگ ہند میں منادی کرا دیجئے اور دیکھئے کہ آپ کے اور یاس کے کتنے ہمنوا پیدا ہونگے، آخر اس کی وجہ سوائے اس کے اور کیا بیان کی جا سکتی ہے کہ دنیا میں ایسی چیز کا وجود باقی رہیگا، جو اصلح ہے اور غیر اصلح علی رغم الاعداء فنا ہو کے ہی رہے گی۔

ایک اور نصف صدی گذر لینے دیجئے، کہ اردو میں سوائے معدودے چند دیوانوں کے باقی تمام ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غاروں میں دفن کر دیئے جائیں گے، غالب کے بیسیوں اڈیشن نکل چکے ہیں، متعدد شروح لکھی جا چکی ہیں، کوئی ہی ایسا پڑھا لکھا ہوگا، جسے غالب کے کئی اشعار یاد نہ ہوں بیچارے ذوق کا دیوان ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ ہی اس کا وجود باقی ہے جو اس کے ہوا خواہ ہیں، قدامت پرستی کی تاریک گھٹائیں کافور ہونے کو ہیں علوم جدیدہ کا آفتاب افق کے قریب تر آ چکا ہے، اس کی زر نگار شعاعیں عروس دنیا کو اس طرح پر نور کرنے کو ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی " دقیانوسیت دوست " ایک ایک کر کے چل بسیں گے۔ اور مخبر صادق کے قول " الحق یعلو ولا یعلی " کی تصدیق کے لئے انسانی زندگی کا ہر ہر شعبہ استشہاد کے طور پر پیش کیا جائیگا۔

آخر آپ اتنا تو خیال فرما دیں کہ غالب کے کلام میں ضرور کوئی ایسی بات موجود ہے، جو باوجود ادق ہونے کے طلبا کی دلچسپی کو قایم رکھتی ہے۔ اور کسی چیز کا صرف ادق ہونا ہی جاذب توجہ ہو تو کم از کم میرے لئے حساب، الجبرا، اور علم العروض والقافیہ نہایت ہی دلچسپی کا باعث ہوں۔ لیکن اپنا یہ حال ہے کہ ان علوم کی کتابوں کو ہاتھ لگانا بھی گوارا نہیں کیا جاتا اور ان علوم کی کتابوں کو دیکھکر لرزہ براندام ہو جاتا ہوں، لیجئے ہم آپکو بتاتے ہیں، کہ غالب کی اس غیر معمولی وقعت و اہتمام کی وجہ کیا ہے؟

(۱) سلاطین مغلیہ کا فوری زوال بہت سی بلاؤں اور تاریکیوں کا پیش خیمہ تھا، ملک کے اطراف و جوانب میں علم کے تذکرے خاموش ہو گئے، ہندوستان کے آسمان پہ جہالت کی گھٹائیں چھا گئیں۔ جس کا اندرونی نتیجہ یہ تھا کہ ذوق سلیم کا فقدان ہو گیا! ذوق عامہ کی بن آئی اور اسے ہر لحظہ اور ہر لمحہ ترقی نصیب ہونے لگی۔ اسی کش مکش کے عالم میں غالب اور ذوق کی شاعری کا آغاز ہوا، ذوق عامہ زوروں پہ تھا اور اس کے نام کا ہر طرف ڈنکا بج رہا تھا، ذوق سلیم موت کی نیند سو رہا تھا، اس انتشار و شورش کے عالم میں ہر ایک کو اپنی راہ عمل تلاش کرنا تھی۔

یہ قاعدہ ہے کہ سوسائٹی کا اثر اگر زبردست ہو، تو شاعر کا لائحہ عمل سوسائٹی کے لائحہ عمل میں آ کر مدغم ہو جاتا ہے اور دونو شیر و شکر ہو کر ایک

دوسرے میں فنا ہو جاتے ہیں، لیکن، برخلاف اس کے اگر شاعر کی شخصیت زبردست اور ناقابل تسخیر ہو، تو سوسائٹی اپنا رخ تبدیل کر کے اس کے اتباع پر رضامند ہو جاتی ہے۔

غالب و ذوق کی شاعری کا آغاز اس وقت ہوا جب ذوقِ عامہ اور ذوقِ سلیم، سوسائٹی کا مزاج اور شاعر کی شخصیت باہم دست و گریباں ہو رہے تھے۔ گو ذوقِ عامہ کا اتباع فوری اور ہنگامی کامیابی کا مقدمۃ الجیش تھا۔ مگر جب سودے کا جوش کم ہوا، سطح سمندر پہ کنول دامن کا دور دورہ ہوا، باد صبا آشتی اور صلح کا پیغام سنانے لگی۔ تو حبابوں کے وہ قطار در قطار ہنگامی لشکر جو موج آب کی شورش اور ہنگامہ آرائی کا نتیجہ تھے پانی میں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اور دریا اسی حالت میں بہتا ہوا دیکھا گیا۔

ذوق نے ذوقِ عامہ کا اتباع کیا۔ شاعروں میں ان کو واہ واہ بھی نصیب ہوئی۔ ملک الشعراء اور خاقانی ہند کے خطاب سے بھی سرفراز کیا گیا، مگر کوئی ہے جو اہرام مصر کے بلند ترین مینار پر چڑھ کر تمام دنیا سے سوال کرے۔ لمن الملک الیوم۔ اور پھر اس کا بھی انتظار کرے کہ اسے ہر طرف سے کیا آوازیں آتی ہیں اور اسے اپنے سوال کا کیا جواب ملتا ہے۔

نہ مغلیہ دربار رہے نہ دہلی کی وہ پبلک رہی۔ جو ذوق کے ذوقِ عامہ کے اتباع کا شکریہ ادا کرتی۔ زمانہ کا رنگ ہی بدل گیا ہے، جو امیر تھے وہ آج غریب ہیں، جو بادشاہ تھے وہ گدا ہیں۔ جو عزیز تھے وہ ذلیل ہیں نہ وہ شاعر رہے نہ وہ شاعر دوست، مغلیہ سلاطین کے تخت کا الٹنا تھا: کہ ذوق کی شاعری کا تخت بھی الٹ گیا۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ ایسے وقت میں جب ذوقِ عامہ کی قوت و ابتلاء کا یہ عالم ہو، اس وقت کسی انسان کا اپنی شاہراہ عمل جدا پیدا کرنا بڑی ہی ہمت اور جرأت کا کام ہے۔ اپنا لائحہ عمل تجویز کرتے وقت یہ بھی دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا کوئی وقت آنیوالا ہے کہ دنیا ہمیں بھی قدر کی آنکھوں سے دیکھے گی چنانچہ غالب نے ان تمام امور پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے لئے ایک نیا میدان عمل پیدا کیا، اور گو ذوقِ عامہ کے شیدائیوں سے متعدد مرتبہ اسے بڑی بڑی ناکامیوں کا سامنا کرتے ہوئے کہنا پڑا ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل انکو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

لیکن انھیں یقین تھا کہ ردِ عمل، عمل سے کہیں زیادہ سخت ہوگا، اور وہ وقت کوئی بہت دور نہیں۔ جبکہ میری مے کہن کے، ہندوستانی دنیا کے کونے کونے میں لاکھوں خریدار پیدا ہو جائیں گے اور دنیا اپنی کھوئی دولت کو پھر پائے گی۔

آپ یقین کر لیں کہ جس قدر زمانہ زیادہ ترقی کریگا، آفتاب علم کی روشنی جتنی بھی زیادہ پھیلتی جائیگی، غالب کی شاعری کے قدردان روز بروز بڑھتے چلے جائیں گے اور وہ وقت آجائیگا کہ متقدمین میں سے شاید سوائے غالب اور میر کے دیوانوں کے باقی سب دفتر گاؤخورد ہو جائیں۔

انھیں حالات سے متاثر ہو کر ڈاکٹر بجنوری مرحوم اپنے مقدمہ میں فرماتے ہیں:۔

"غالب ان اہلِ کمال میں ہیں جن کو بقائے دوام کے کشور میں داخل ہونے کے لئے موت کے دروازہ سے گزرنا پڑتا ہے

------ غالب کا کلام اب مقبول ہوا، اور آئندہ نسلیں اس بات کا موازنہ کریں گی کہ ان کی ترقی میں غالب کے

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر بہت مشہور ہے۔

کلام کا جزو اعظم کہ انتک مدد اور معاون ہوا ہے۔"

(۲) جب اردو کی شاعری دلی کی گلیوں اور لکھنؤ کے کوچوں کی شاعری رہی اس وقت تک یہی رنگ برسر اقتدار رہے، جن کی شاعری کو دلی یا لکھنؤ کی آب و ہوا راس آئی، لیکن جب اس کا دائرہ عمل وسیع ہوا اور اردو کی شاعری دلی و لکھنؤ کی قیود سے آزاد ہو گئی تو آتش کی آتش بیانی کام آئی اور نہ ذوق کی سادگی دونوں اس معیار پر کھوٹے نکلے اور زمانے نے بیکار سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا، لیکن چونکہ غالب کی شاعری ان قیود سے آزاد تھی آج مہذب دنیا اس کے کلام کو سر سے لگائے رکھتی ہے۔ اور غالب کے کلام کا وہ مجموعہ جسے زمانہ کی ناقدر شناسی نے گلدستۂ طاق نسیاں بنا دیا تھا پھر تلاش کر کے مارکیٹ میں لایا گیا۔ اور قدر دانوں نے اسے اس طرح سر آنکھوں پر رکھا جس طرح کوئی برسوں کا بچھڑا عاشق اپنے محبوب سے گلے لگ کر ملتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ اگر ذوق کے کلام کا انتخاب کیا جائے، تو صاف معلوم ہوگا کہ ذوق نے فلسفۂ فطرت اور دیگر امور پر غالب سے کم روشنی نہیں ڈالی۔

انتخاب کے متعلق تو شاید اتنا عرض کر دینا کافی ہوگا، اگر ذوق کے کلام میں دلبستگی اور دلچسپی کے سامان ہوتے تو کوئی وجہ نہیں کہ میر کا انتخاب شائع ہو جائے اور کوئی ایسا پیدا نہ ہو کہ ذوق کے کلام کے انتخاب کی تکلیف گوارا کرے۔

باقی رہا باہمی مقابلہ کا معاملہ گو آپ نے اسے اپنے موضوع سے خارج سمجھ کر نظرانداز فرما دیا ہے لیکن ہم دونوں کے کلام کے چند نمونے قارئین کے سامنے مختصراً پیش کرتے ہیں کہ وہ خود موازنہ کر کے فیصلہ فرما لیں۔

شاعر	مصرع اول	مصرع ثانی
ذوق	جو رنگ رنج و ماتم کا بیاں موزوں ہوتا	تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا
غالب	رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا	جسے غم سمجھ رہے ہو وہ اگر شرار ہوتا
ذوق	ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں	شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا
غالب	ہم نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے	اس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا
	اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل	سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے آج
ذوق	سنتے ہو زاہد و ناصح جو ہمیں سمجھاتے ہیں	کیا دل دیوینگے یہ اور ہیں دل جاوینگا
غالب	حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ	کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائنگے کیا
ذوق	خط لکھا مجھکو تو اس میں نام بھی پورا نہ تھا	کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا
غالب	قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں	میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
ذوق	کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے	ان کو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا
غالب	نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن	بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے
ذوق	معلوم جو ہوتا ہمیں انجام محبت	لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نام محبت

غالب — دہن شیر میں جا بیٹھیے لیکن اے دل / نہ کھڑے ہو جیے خوبانِ دل آزار کے پاس

ذوق — دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کسو گل / زیب تن سر کو ہیں مرے داغ جنوں گل

مرزا کس انداز سے فرماتے ہیں:۔

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو / مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

ذوق — بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب مگر / تھی جو بگڑی ہوئی قسمت تو بنی خوب نہیں

غالب — نکتہ چیں ہے غم دل اس کو سنائے نہ بنے / کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

مقطع بھی سن لیجیے:۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

ذوق — دل وہ کیا جس کو نہیں تیری تمنائے وصال / چشم وہ کیا جسکو تیری دید کی حسرت نہیں

مرزا ذرا مضمون بدل کر فرماتے ہیں:۔

رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے / انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

ذوق — ہم نے ان سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی / دیکھیے کیا چاہتا تھا ہم نے اور کیا ہو گیا

غالب — خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے / کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

ذوق — ہوں گے وہ کب قائل قیامت جو تیرا قامت نہ دیکھ لیں گے / رہیں گے رویت کے بھی وہ منکر جو تیری صورت نہ دیکھ لیں گے

غالب — جب تک کہ نہ دیکھا تھا قد یار کا عالم / میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

ذرا اور ترقی کرکے فرماتے ہیں:۔

ترے سرو قامت سے اک قد آدم / قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

ذوق — آزار محبت کا مزا کیا کہوں جس کی، / ہے درد دوا، دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے

غالب — عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا / درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا

ذوق — دیکھنا اے ذوق ہوں گے آج پھر لاکھوں کے خون / ہے جمایا اس نے لعل لب پہ لاکھا پان کا

غالب — تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے / دیکھنے ہم بھی گئے پہ تماشہ نہ ہوا

ذوق — اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک / ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک ہے ز؟

غالب — قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب / وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

ایک شعر بھی سن لیجیے:۔

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ / تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

جو کچھ ہم بیان کرنا چاہتے ہیں یہ اس کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

یہ وہ خیالات ہیں جن پر ذوق اور غالب نے بہم طبع آزمائی کی ہے، ہم نے متحد المضمون اشعار انتخاب کرکے نقل کر دیے ہیں اور اپنی طرف سے کوئی حاشیہ آرائی نہیں کی، تاکہ آپ آزادی سے غور و خوض کر سکیں، اور ہم پر بلا وجہ جانب داری کا کوئی الزام بھی عاید نہ ہو۔

بعض اوزان ایسے ہیں جن پر ذوق اور غالب دونوں نے طبع آزمائی کی ہے ہم قارئین کی ضیافت طبع کے لئے اس قسم کی غزلوں سے تین تین چار چار اشعار نقل کرتے ہیں۔

(ذوق)

ہوا پر سینہ یکسر خار زار دشت غم میرا — کہ آیا پا جنوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا
وہ ہوں میں آتش گل تازہ نخل شمع الفت کا — نہیں ہے کوئی گلچیں غیر مقراض ستم میرا
وہ ہوں میں آہوئے وحشی رمیدہ دام ہستی سے — کہ ہے اس کوچہ رم جادہ دشت عدم میرا

(غالب)

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موج بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا
سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
سراغ آوارۂ عرض دو عالم شور محشر ہوں — پر افشاں ہے غبار آنسوئے صحرائے عدم میرا

(ذوق)

وہ اپنی برش تیغ نظر کو دیکھتے ہیں — جدھر کو آپ نہوں ہم ادھر کو دیکھتے ہیں
ہماری وصل کی شب ہے دیا شب محشر — کہ اٹھ کے صبح قیامت سحر کو دیکھتے ہیں
نہ پوچھ شغل اسیری میں ہم غریبوں کا — کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

(غالب)

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں — کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے — کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو — یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

(ذوق)

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھ کر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں — کیا جانے لکھ دیا انہیں کیا اضطراب میں
بے بادہ ہو گئی ہے ہوا ذوق — کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب میں

[illegible] کے کارخانہ [illegible] ملک شاہ نو لکھا [illegible] آباد [illegible]

(غالب)

مجھ تک کب انکی بزم میں آتا تھا جام مے — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

(ذوق)

یہاں تک لاغری ہے اس ترے بیمار کے تن کو — عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشم سوزن کو
زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امارہ — یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس مار رہزن کو
کمند نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی — لپٹ کر مثل طوق فاختہ عنقا کی گردن کو

(غالب)

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو
وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو
نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

(ذوق)

ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا — ترے ہر ناز پر سو سو کا دم لے نازنیں نکلے
زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیر جانے کا — الہی ساتھ سے تیرے مری جان حزیں نکلے
گئے تم چین ابرو ہو کے تیر قتل کے در پے — جھجکنے سے تمہارے جوہر شمشیر کیں نکلے

(غالب)

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا — اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے
مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے — ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے
محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

دونوں کے کلام کا انتخاب آپ کے سامنے ہے، آپ خود ہی فیصلہ فرمالیں، کہ اس میدان کا شہسوار کون ہے، اور مہذب دنیا جو غالب کی شیدائی ہو رہی ہے آپ اس کو معذور خیال کرتے ہیں؟ یا نہ

من آنچہ شرط بلاغ است با تو مے گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

آپ اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں، کہ ہم نے ذوق کا انتخاب اچھا نہیں کیا۔ سو اس کے متعلق یوں عرض ہے کہ علاوہ رباعیات، قطعات، و قصائد کے

ذوقؔ کے اشعار کی تعداد کم وبیش تین ہزار ساٹھ ہے، اور غالبؔ کے اشعار قدیم نسخہ دیوان کے لحاظ سے ایک ہزار چار سو چھپن ہے تو آپ کے انتخاب کے یہ معنی ہوئے کہ ہر شعر کے بعد ذوقؔ کا دوسرا شعر اس لحاظ سے انتخاب میں آنا چاہیئے، اور آپکے خیال کے مطابق وہ غالب کے کلام کا مقابلہ کر سکے گا، لیکن آپ خود ہی غور فرمالیں کہ اس میں کتنی کچھ واقعیت ہو سکتی ہے۔

اب آپ کے لئے دو ہی صورتیں ہیں، یا تو ذوقؔ کا انتخاب کرکے غالبؔ کے انتخاب شدہ اشعار سے مقابلہ کیجئے، اور یا چونکہ غالبؔ کے دیوان کا جدید نسخہ طبع ہو چکا ہے، غالبؔ کے دیوان سے اُتنے ہی اشعار اور زیادہ کر دیے جائیں، جتنے کہ ذوقؔ کے موجودہ دیوان کی نسبت غالبؔ کے دیوان میں کم ہیں، دونوں صورتوں سے جس کو آپ مناسب اور آسان خیال فرمائیں، وہی اختیار کر سکتے ہیں، لیکن میں اتنا عرض کر دوں کہ موخرالذکر صورت میں شاید آپ کو خسارہ رہے کیونکہ غالب کے دیوان کے نسخہ جدیدہ کے اس کلام میں بھی جس کو غالبؔ نے ابنائے زبان کی کم فہمی سے دق ہو کر اپنی زبان سے نکال پھینکا تھا ایسے ایسے اعلیٰ اشعار موجود ہیں، جن کو انتخاب کرتے وقت یقیناً آپ چھپائیں گے، رہی صورت اوّل جو اسکے اختیار کرنے میں ہم ضرور آپ کی سعی کے مشکور ہونگے، لیکن قبل از انتخاب ضرور اندازہ فرما لیجئے گا کہ کہیں انتخاب کے بعد دیوان چند اشعار کی ایک بیاض ہی نہ رہجائے۔

آپ فرماتے ہیں " ذوقؔ دلی کے ٹھیٹ شاعر تھے۔ انھوں نے متنبی کی طرح اپنے ملک وقوم اور زمانے کے جذبات، حالات اور زبان کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی اور یہی وہ بنیادیں ہیں، جن پر ملک الشعراء بنائے جانے کے مستحق تھے، جن کے اثرات اُن کے کلام میں محاوروں کی بندش، زبان کی فصاحت و روانی اور لہجے کی دلچسپی اور شگفتگی پیدا ہو گئی تھی، اور جن کے طفیل بہت سے شاعروں کو اپنا شیفتہ بناکر داد تحسین حاصل کر لیتے ہیں " میں ذوقؔ کی مقبولیت نہایت تفصیل سے بیان کر چکا ہوں، اور صراحتاً وضمناً ان تمام امور کے جواب کا ذکر کیا جا چکا ہے، اس لئے پھر اعادہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ من شاء التفصیل فلیرجع الیہ۔

ہاں البتہ زور قلم سے ہم ضرور التجا کریں گے کہ وہ ذوقؔ کے کلام سے ان تمام خوبیوں کی مثالیں پیش کریں جن کا انھوں نے اوپر تذکرہ فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مرزا، ذوقؔ کو اسلئے کم فہم، بدمذاق اور کم لیاقت خیال کرتے تھے، کہ مرزا بڑے خود دار اور قدرتی طور پر مغرور واقع ہوئے تھے۔ ہرگز نہیں، معاف کیجئے گا۔ بلاشبہ ذوقؔ بدقسمتی سے شاعری کے باب میں کچھ بدمذاق ہی واقع ہوئے تھے، وہ عالم متبحر تھے، قادر الکلام بھی تھے، بہت بڑے قصیدہ گو لیکن شاعر نہیں تھے اور یقیناً نہیں تھے۔ مرزا کا اُن کے حق میں جو فیصلہ تھا وہ یقیناً درست اور صحیح تھا، چونکہ مضمون بہت لمبا ہو گیا ہے اس لئے ہم اس کو کسی آئندہ صحبت کے لئے اُٹھا رکھتے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ جب مرزا خود فرماتے ہیں۔ کہ،

میں کون اور ریختہ ہائے اس سے مدعا　　جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے

تو اس قسم کے وعدے کے بعد مرزا کو چاہیئے تھا کہ ریختہ سے دست بردار ہو جاتے، سو اس کے جواب میں ہم ایک عرب شاعر کا ایک شعر جو غالباً اسی ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا نقل کرکے اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں ؎

ولمّا رایتُ الجہل فی الناس فاشیاً　　تجاہلتُ حتیٰ قیل انی لجاہلُ

ذالک ما اردناہ۔ ان زدتم زدنا۔ ولدینا مزید

ــــــــــ

بعد المشرقین

(افسانہ)

—— (۱) ——

احمد علی خانصاحب یُوں یقیناً خوش قسمت تھے کہ اپنی اولاد کی اولاد دیکھکر مرے۔ اور شروع سے لیکر آخیر تک یکساں زندگی بسر کی۔ اُن کے دونوں بیٹے شوکت علی خاں، شفقت علی خاں بے انتہا فرمانبردار و مطیع تھے، لیکن باوجود اس کے کہ دونوں کی تربیت یکساں طور پر ہوئی، اُن کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شوکت علی قدرت کی طرف سے سوچنے والا دماغ لیکر آئے تھے اور اجتہادی مادہ اُن میں زیادہ تھا، برخلاف شفقت علی کے کہ یہ ہر قدیم چیز کو اچھا اور ہر برائی لیکر آنیوالی شے کو برا سمجھتے تھے، چنانچہ اسی تفریق کا نتیجہ تھا کہ شوکت علی نے اپنی لڑکی اقبال جہاں کو شروع ہی سے انگریزی نرس کے سپرد کر دیا اور شفقت علی نے اپنے بیٹے سعادت علی کو ایک مکتب کے ملا کی نگرانی میں دیدیا۔

احمد علی خانصاحب اپنے دونوں بیٹوں کے اس تباین ذوق کو محسوس کرتے تھے اور چونکہ وہ خود بھی ذرا قدیم خیال کے انسان تھے، اس لئے قدرتاً شفقت علی سے زیادہ مانوس تھے، لیکن چونکہ شوکت علی نے جائداد کا سارا بار اور املاک کا کل انتظام اپنے سر لے رکھا تھا اور ان کی محنت و ذہانت سے برابر آمدنی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس لئے وہ شوکت علی سے مرعوب تھے اور اکثر کہا کرتے تھے کہ شفقت میرا دین ہے تو شوکت میری دنیا، اور اس سے زیادہ ایک شخص کی خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ اُس کے دین و دنیا دونوں اچھے ہوں۔

اتفاق سے ان دونوں کی اولاد بھی ایک ہی سال شاید دو مہینے کے فرق سے ہوئی اور احمد علی خانصاحب نے اپنے سامنے ہی جب کہ اقبال اور سعادت کی عمر پانچ پانچ سال کی تھی نکاح کرا دیا۔ شوکت علی نے عذر بھی کیا کہ جلدی کیا ہے، لیکن من جملہ میں احمد علی خاں نے کسی کی نہیں سنی اور آخرکار شوکت علی نے بھی اپنے دل کی تسکین اس طرح کر کے کہ اچھا ہے جائداد ایک ہی جگہ رہیگی، اجازت دیدی۔

—— (۲) ——

احمد علی خاں کا انتقال ہو گیا، اور دوسرے سال جب کہ اقبال جہاں بی۔ اے میں کامیاب ہوئی اور سعادت علی دیوبند سے دستار فضیلت لیکر آئے ہیضہ کی وبا میں شوکت علی خاں اور شفقت علی خاں بھی چل بسے۔ چونکہ اقبال شوکت علی کی تنہا بیٹی اور سعادت علی شفقت علی کے اکلوتے بیٹے تھے، اس لئے ساری جائداد (جس کو اقبال اور سعادت علی کے درمیان نصف نصف تقسیم ہونا چاہیئے تھا) اقبال اور سعادت کے باہم شادی ہو جانیکی وجہ سے ایک ہی جگہ رہی اور ان دونوں کو اول مرتبہ اس امر کا موقع ملا کہ ایک دوسرے کا قریب سے مطالعہ کریں، رخصت رسم ابھی ادا نہ ہوئی تھی اور یہ دونوں حویلی کے دو قطعوں میں علیحدہ علیحدہ رہتے تھے۔ ہر چند اقبال پردہ کی زیادہ پابند نہ تھی لیکن پھر بھی خاندان کے رسم و رواج کو

دفعتاً توڑ نہ سکتی تھی اور سعادت علی سے جو پردہ اب سے دس سال پہلے قائم ہو چکا تھا برستور باقی تھا۔ جب چالیسویں وغیرہ سے فراغت ہوئی اور اعزہ کی عورتیں جمع ہوئی تو یہ سوال بھی اٹھا اور صفیہ خاتون نے جو اقبال کی رشتہ میں دادی ہوتی تھیں اور جو خاندان میں سب سے زیادہ معمر خاتون تھیں اسکی تحریک کی۔

اقبال یقیناً تمام عورتوں اور خصوصاً صفیہ خاتون کے اصرار سے رسم رخصت کی اجازت دیدیتی لیکن اتفاق سے اسی وقت اس کی نگاہ چلمن کی راہ سے نیچے صحن میں پہنچی جہاں بہت سے مرد جمع تھے اور انہیں میں سعادت علی بھی تھے جو سر سے لیکر پاؤں تک مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے، اقبال انکو نہ پہچانتی تھی اس لئے اُس نے مزاحاً صفیہ خاتون سے پوچھا کہ ماشاء مسند کے داہنے جانب یہ کون بالکل شرع شریف بنے بیٹھے ہیں اور جب اُس کو یہ جواب ملا کہ "تم اپنے دولھا کو بھی نہیں پہچانتیں" تو جذبۂ انفعال سے زیادہ جس کیفیت سے متاثر ہوئی وہ وہ تھی جسے "پاؤں تلے سے زمین نکلجانا کہتے ہیں؛

وہ یہ تو جانتی تھی کہ سعادت علی علوم عربیہ کے فاضل ہیں اور اس لحاظ سے وہ خوش تھی، کیونکہ وہ خود ان علوم سے بالکل نا آشنا تھی اور سمجھتی تھی کہ اس طرح دونوں مل کر ایک مکمل زندگی بنا سکیں گے لیکن جب اس نے ان کی صورت اور وضع دیکھی تو بہت گھبرا گئی اور ایک لمحہ کے لئے یقین کر لیا کہ وہ ایسے انسان کے ساتھ ایک دن بھی اپنی زندگی بسر کر سکے گی اگر ظاہری صورت کی طرح سیرت بھی نکلی۔

اُس نے کچھ سوچکر ساری بیویوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں آپ لوگوں کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور جس بات پر آپ زور دے رہی ہیں وہ خود بھی میرے نزدیک کم ضروری نہیں ہے لیکن مجھے مجبور نہ کیجئے کہ میں اس صحبت میں کوئی قطعی جواب دیدوں، مجھے سوچنے کا موقعہ دیجئے ممکن ہے آپ کو دوبارہ تقاضہ و اصرار کی ضرورت نہ پڑے"

صفیہ خاتون بولیں کہ "بیٹی، ہم لوگ تو جاہل ہیں اور تم ماشاء اللہ نہ جانے کیا کیا پڑھ لکھ گئی ہو تمہیں مجبور تو کوئی نہیں کر سکتا، لیکن ہاں ہم لوگوں کی آرزو یہی ہے کہ جلد اس مرحلہ سے بھی فارغ ہو جاؤ اور پھر اطمینان سے اپنے باپ دادا کی جائداد کا انتظام کرو۔ سعادت علی اپنے باپ سے بھی زیادہ نیک ہے اور اس کے بس کی بات نہیں ہے کہ ساری جائداد کا انتظام اکیلا کر سکے، یہ بھی اُس کی قسمت ہے کہ تم جیسی بیوی اسے ملی جو ہزار مردوں سے زیادہ عقل رکھتی ہے"

اقبال یہ سُن کر خاموش ہو گئی، اور تھوڑی دیر کے بعد یہ مجمع منتشر ہو کر اس کو تنہا سوچنے اور سمجھنے کے لئے چھوڑ گیا۔

(۳)

"کیا یہ واقعی مشرق و مغرب کی ذہنیت کا فرق ہے یا طریق تعلیم و تربیت کا، اگر میں دیکھتی ہوں کہ مشرق کی دماغی اہلیت کسی طرح مغرب سے کم نہیں ہے اس لئے یقیناً یہ فرق پیدا ہوا ہے، اصول تعلیم و اسلوب تربیت سے ماحول کا اثر انسان کی زندگی پر بہت پڑتا ہے چچا میاں شفقت علی خاں، خود بھی قدیم وضع و خیال کے انسان تھے بڑا اثر تو ہوا اس کا، اس کے بعد مکتب میں ملا کی صحبت نے اُس کو اور ترقی دی اور پھر دیوبند جا کر اس کی تکمیل ہو گئی۔ قصور اُن کا نہیں ہے بلکہ اس نظام کا ہے جس کے ماتحت علوم مشرقیہ کی تعلیم دی جاتی ہے، میں نہیں

سمجھ سکتی کہ اچھی خاصی صورت کو بگاڑ لینا، مضحک وضع و لباس اختیار کرکے خواہ مخواہ لوگوں کو "دیکھو اور ہنسو" کی دعوت دینا کیوں ہے۔ ہندوستان کی عربی تعلیم واقعی ضرورتِ توجہ ہے، کیا عالمِ دین کے ماہر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی حالت کو اس قدر حیا ناک بنائے کہ لوگوں کو سامنے آتے ہوئے ڈر لگے کیا اپنے آپ کو بلند تر ثابت کرنے کے لئے مہیب تر بنانے کی ضرورت ہے۔

ترکی و مصر میں بھی عربی تعلیم ہوتی ہے، وہاں بھی بڑے بڑے فاضل موجود ہیں، لیکن ان کی تصویریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر مہذب و شائستہ ہیں۔ وہی کوٹ پتلون جو ساری دنیا پہنتی ہے وہ بھی پہنتے ہیں داڑھی بھی منڈاتے ہیں، مغربی وضع کے بال بھی رکھتے ہیں، اصول معاشرت بھی ان کے نہایت پاکیزہ ہیں اور اسبابِ معیشت بھی حد درجہ نفیس و مہذب۔

اگر دینی و مذہبی تقشف کوئی دینی چیز ہے تو اس کا تعلق انسان کے خیال و احساس سے ہونا چاہیئے نہ کہ لباس و وضع سے۔ اگر اس سے مقصود اپنی مذہبیت، اپنی دینی برتری، اپنے علمی تفوق کا اعلان ہے، اگر اس سے مراد یہ ہے کہ گھٹے ہوئے سر، منڈی ہوئی مونچھ، لمبی سے لمبی داڑھی، کفنی نما کرتہ، ٹخنے کھلے ہوئے پاجامہ، بے بوٹے کے پاؤں اور بدنما بھدے جوتے کو دیکھکر دور ہی سے ایک شخص پہچان لے کہ "وہ آرہے ہیں" اور بگڑی ہوئی صورت دیکھنے کے بعد کترا کر راستہ کاٹ جائے، تو مذہبی پیشوائی اور دینی رہنمائی کا فرض کیونکر ادا ہو سکتا ہے اگر ایک "مولانا" نام ہے خشک چہرہ، پرشکن پیشانی، اور تو نخوار صورت کا، تو یقیناً وہ رند اچھا ہے، جو شراب پیتا ہے، لیکن اپنے اخلاق سے نظام تمدن کے قیام میں اعانت کر رہا ہے۔

اگر وہ غریب طلبہ جو بالکل بے سر و سامانی کی حالت میں ایک یتیم کی سی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور خیرات کی روٹیاں کھا کھا کر علم دین صرف اس لئے حاصل کرتے ہیں کہ سردہ کی نماز پڑھ کر جانماز کی چادر لے لیا کریں، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی مسجد میں اذان و امامت کی مشترکہ خدمت انجام دیکر اہل محلہ کے ہاں سے ایک ایک روٹی جمع کرکے کچھ کھا لیا کریں اور کچھ خشک کرکے فروخت کر دیا کریں، ہاں اگر ایسے غریب الدیار، وطن آوارہ اور صعلوک الحال طلبہ ایسی حالت میں رہیں تو معذور ہیں، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ یہ حضرت بھی (جنھیں ہمیشہ پچاس روپیہ ماہوار دیوبند کے زمانۂ قیام میں دیا گیا) ایسے ہی نظر آتے ہیں، جیسے ابھی بھیک کا ٹھیکرا رکھکر آئے ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ اسی عالمِ بیکسی میں علمِ دین کی طرف سب سے پہلے غرباء نے توجہ کی، اور عسرت و افلاس کی وجہ سے وہ مجبور تھے کہ خراب حال میں رہیں، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ حالت عربی طلبہ کی زندگی کا ضروری جزو سمجھی جانے لگی، اور چونکہ اساتذہ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اس لئے اس کی کوئی اصلاح بھی نہ ہو سکی۔

حضرت اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے بطور نمونہ بھی منگا کر ملاحظہ فرمائیے

لیکن کیا اس وقت تک کوئی سوچنے والا دماغ اس جماعت میں ایسا پیدا نہیں ہوا جو حقیقت پر غور کرتا، اور اس مکروہ فضا میں تغیر پیدا کر دیتا۔

اس ناکارہ بنا دینے والی رہبانیت کی یادگار ہے جسے مذہب نے ممنوع قرار دیا ہے، اور جو ایک قوم کے لئے حد درجہ خطرناک بات ہے۔

ان لوگوں کے حوصلے پست، ارادے کمزور، نیتیں خراب اور دماغ تاریک ہیں، یہ کیا قوم کی رہبری کر سکتے ہیں، اور ان سے کیا امید ہو سکتی ہے کہ اسلام کی شان کو دیگر ترقی یافتہ اقوام کے مقابلہ میں قائم رکھ سکیں گے۔

یہ علوم جدیدہ سے بے خبر لوگ، ترقی کے اصول سے ناآشنا، جذبۂ قومیت کے مفہوم سے نابلد انسان زمین کو اب تک مسطح اور چپٹا اور آسمان کو ٹھوس چیز سمجھنے والے جاہل، میری سمجھ میں نہیں آتا کیا خاک ترقی کر سکتے ہیں، اور بقاء اصلح کا قانون کب تک ان ناکارہ زندگی کو روئے زمین پر گوارا کرتا رہیگا۔

گمراہی اور جہل کی حد ہے کہ ترکی قوم نے جو جدید اصول پر ترقی شروع کی تو اس سے منحرف ہو گئے، اس نے عورتوں کا پردہ توڑا تو کافر، تعدادِ ازدواج کو روکا تو کافر۔ قانون مذہب میں ضرورِیاتِ زمانہ کے لحاظ سے تغیر کیا تو کافر، اس نے ہیٹ اختیار کی تو کافر، الغرض ان کے ہاں کفر نام ہے ہر اچھی چیز کا، اور اسلام مجموعہ ہے ان تمام باتوں کا جن میں مطلقاً کوئی دلچسپی نہ ہو۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ ایسے شخص کے ساتھ میری زندگی کیونکر بسر ہو سکتی ہے لیکن ممکن ہے کہ ان کے خیالات پست اور ذوق گراہوا نہ ہو۔ پھر چنداں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر اتنی صلاحیت بھی ہوئی تو لباس و وضع کا بدلنا دشوار نہیں چند دن کا کام ہے۔ بہر حال یہ ضروری ہے کہ میں ان سے ایک مرتبہ تفصیلی گفتگو کروں، اور پھر فیصلہ کروں ——"

اقبال ساری رات اسی ادھیڑ بن میں مبتلا رہی، اور صبح کو جو کام سب سے پہلے اس نے کیا یہ تھا کہ ایک تحریر سعادت علی خاں کے نام بھیجی کہ:۔

——"ممکن ہو تو شام کو مجھ سے مل لیجئے، ضروری گفتگو کرنا ہے"——

——(۴)——

سعادت علی خاں (جنھیں آئندہ صرف مولانا کے لفظ سے یاد کیا جائیگا) مردانہ خانہ میں ظہر کی نماز پڑھکر بیٹھے ہوئے ہیں اور محلہ کی مسجد کے امام، حافظ امیر الدین جن کو دس روپیہ ماہوار انھیں کے ہاں سے ملتے ہیں اور موذن نوری بھی موجود ہیں، ادھر ادھر پڑوس کے اور دو چار معمر لوگ بھی بیٹھے ہیں، جن کے ماتھے کے ابھرے ہوئے نشانوں سے پتہ چلتا ہے کہ فرش مسجد کی خاک کا کافی حصہ ان میں جذب ہو کر جزو پیشانی بن گیا ہے، ادھر ادھر کی مذہبی باتیں ہو رہی ہیں، اور چونکہ مولانا کا علم تازہ تھا اور حال ہی میں دیوبند سے تشریف لائے

تھے اس لئے کچھ تو جوش دینی کے جذبہ سے مجبور ہوکر اور کچھ حاضرین پر اپنی قابلیت اور فضل و کمال کا سکہ بٹھانے کے لئے نہایت زور زور سے تقریر فرمارہے تھے اور جن قدر ادق و مشکل الفاظ ان کو یاد تھے سب صرف کر رہے تھے اور بعض بعض مرتبہ تو فقرے کے فقرے عربی کے بولتے چلے جاتے تھے مثلاً:

تزلزل القلوب ——— تسکین ثائرۃ الفتنہ ——— اصحاب الزیغ والابتداع ——— اجزاء منفصلہ متبائن الحقیقت ——— ہیئت ترکیبیہ جلیہ ——— لا یصدر من الواحد الا الواحد ——— کون الشئ للشئ ——— لا تقف مالیس لک بہ علم غایۃ مافی الباب ——— اور ——— من کل الوجوہ تو ان کا تکیہ کلام تھا۔ لیکن سب سے زیادہ پر لطف منظر یہ تھا کہ نوری موذن بھی ہاں میں ہاں ملارہا تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا کا ایک ایک لفظ گویا پہنچنے ہی سے اس کے ذہن میں تھا۔

اتفاق سے اس وقت اقبال بھی کسی خاص ضرورت سے مکان کے اس حصہ میں آئی اور چلمن کے پاس پہنچکر اس نے مولانا کا بلند بانگ وعظ سُنا تو وہیں ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی اور دیر تک نہایت غور سے اُن کی تقریر سنتی رہی۔

دوران تقریر میں پردہ کا ذکر آیا اور مولانا نے اس کی سختی پر نہایت شدت کے ساتھ زور دیا، ابن سعود کے طرز عمل کا سوال پیدا ہوا اور انھوں نے اُس کی تعریف کی: اور آخر میں جب مرد و عورت کے باہمی تعلق پر گفتگو فرماتے ہوئے انھوں نے الرجال قوامون علی النساء کی تفسیر بیان کی جسکے ایک ایک لفظ سے عورت کا ایک لونڈی کی طرح محکومانہ و مجبور زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا ثابت ہوتا تھا، تو اقبال غصہ سے بیتاب ہوگئی، اور جس کام کو گئی تھی وہ بھول کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔

وہ مولانا کی پہلی ہی گفتگو کو سُن کر سمجھ گئی تھی کہ یا تو انتہا سے زیادہ احمق ہیں کہ جاہلوں کے سامنے بھی فقہ و منطق کی رٹی ہوئی اصطلاحیں استعمال کرنے میں پس و پیش نہیں کرتے یا پھر ضرورت سے زیادہ مغرور ہیں کہ اس طرح بے محل اپنی قابلیت کا اظہار کر رہے ہیں، لیکن جس وقت انھوں نے پردہ اور عورت کے متعلق گلفشانی فرمائی تو اقبال سمجھ گئی کہ یہ نہ تنہا احمق و متکبر ہیں بلکہ جابر و ظالم بھی ہیں، اور اُس نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔

——— (۵) ———

شام ہوگئی ہے، اقبال اندر بیٹھی ہوئی ہے، چلمن کی دوسری طرف مولانا تشریف فرما ہیں اور گفتگو ہو رہی ہے۔

اقبال ——— آپ کو میں نے اس لئے تکلیف دی ہے کہ ایک خاص معاملہ میں گفتگو کروں اور جلد سے جلد آپ کو مطلع کردوں کہ آئندہ آپکے اور میرے تعلقات کی کیا صورت ہوگی۔

مولانا جو اقبال کو اپنی بیوی کی حیثیت سے ہمیشہ اپنی ملکیت سمجھتے تھے اس وقت اس کی گفتگو کے انداز سے ذرا چونکے، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ ممکن ہے جدید تعلیم و تہذیب میں اظہار خصوصیت کا یہی طریقہ ہو، بدظنی دل سے دور کر دی، اور نہایت مسرور انداز سے مسکرا کر جواب دیا کہ

مجھے مطلع کرنے کی کیا ضرورت ہے، تم اور تمہاری ---------

اقبال نے مولانا کی بات کاٹ کر کہا کہ :-

" مولانا۔ جب تک میں ایک شخص کو لفظ آپ سے خطاب کرتی ہوں، تو یہ بھی توقع رکھتی ہوں کہ وہ بھی اسی تہذیب سے کام لے میں تم اور تمہاری کے الفاظ سننا پسند نہیں کرتی "

مولانا نے اقبال کی یہ گفتگو سن کر اس طرح پیچ و تاب کھایا جس طرح ایک مالک اپنے غلام و مملوک کی گستاخی پر برہم ہو سکتا ہے، لیکن خدا جانے کس خیال سے انھوں نے بے انتہا ضبط سے کام لیا اور پوچھنے لگے :-

" اقبال میں یہ کیا سن رہا ہوں، تم نہ صرف "

اقبال " پھر آپ نے تم کہا! دیکھئے میں پھر عرض کرتی ہوں کہ تہذیب سے کام لیجئے، اور اگر آپ نے دوبارہ اس بے تکلفی پر اصرار کیا تو میں اُٹھ کر چلی جاؤں گی اور قطعاً کوئی گفتگو نہ کروں گی "

مولانا کے جذبۂ نخوت و پندار پر یہ دوسرا شدید حملہ تھا، اور یقیناً ناقابل برداشت تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی جس طرح ایک خود غرض انسان اپنے حصول مدعا کے لئے ہر خلاف بات کو گوارا کر لیتا ہے۔ مولانا بھی پی گئے اور یہ خیال کر کے کہ قابو پا لینے کے بعد اس کا انتقام لے لونگا اپنے آپ کو مشتعل ہونے سے باز رکھا اور بولے کہ :-

بہتر ہے میں آئندہ اس کا خیال رکھونگا۔ فرمائیے آپ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں "

اقبال " غالباً اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ میں آپ سے نامزد ہو چکی ہوں "

مولانا " نامزد! لیکن مجھے تو بتایا گیا ہے کہ نکاح بھی ہو چکا ہے "

اقبال " جی ہاں، سن بلوغ سے پہلے کا نکاح زیادہ سے زیادہ " نامزدگی " ہی کہلایا جا سکتا ہے "

مولانا " ہمارا مذہب تو یہ نہیں کہتا، شرع کا حکم تو یہ ہے کہ اگر باپ یا دادا، ولی کی حیثیت کسی لڑکے یا لڑکی کا نکاح کر دیں تو سن بلوغ کے بعد بھی وہ فسخ نہیں ہو سکتا "

اقبال " یہ اس وقت کا حکم ہے جب عورتوں کی پستی تعلیم اور نظام تمدن میں ایک اسلوب پیدا کرنے کی ضرورت اس کی مقتضی تھی، لیکن اب زمانہ کا اقتضا یہ نہیں ہے، اگر ازدواج کوئی سوشل اجتماعی مسئلہ ہے تو سوسائٹی کی ضرورت کے مطابق اس کے احکام میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی اور اس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ سوسائٹی کی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں "

مولانا " میں آپ کی یہ دلیل نہیں سمجھ سکا، میں تو یہ یقین رکھتا ہوں کہ احکام شرع جو ایک مرتبہ مقرر ہو گئے ہیں، وہ کسی زمانہ اور کسی حال میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتے اور نہ کسی تبدیلی کی ضرورت، کیونکہ وہ ہر نوع مکمل ہیں "

اقبال " معاف فرمائیے آپ کا دعویٰ قابل تسلیم نہیں، یہ تو آپ بھی مانتے ہونگے کہ موجودہ احکام شرع اتنے ہی نہیں ہیں جتنے عہد رسالت میں نافذ ہوئے تھے اور نہ اتنے ہیں جس قدر خلفاء اربعہ کے زمانہ میں مرتب ہوئے تھے، بلکہ اس سے بہت زاید ہیں، پھر اگر عہد امویین و عباسیین میں بعض جدید احکام شرع قایم ہو سکتے تھے تو کوئی وجہ نہیں کہ اب ان میں کوئی اضافہ نہ ہو سکے

جب کہ اس زمانہ سے کہیں زیادہ اب تمدن وسیع ہوگیا ہے۔ مثلاً ابو حنیفہ کے زمانہ میں ریل، تار، ہوائی جہاز اور بنک نہ تھے لیکن جب یہ چیزیں ایجاد ہوئیں تو علما کو یہ بھی بتانا پڑا کہ ریل اور ہوائی جہاز میں نماز کی یہ صورت ہوگی، تار کی خبر کو اس حد تک معتبر مانا جائیگا اور بنک کے نفع کو اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائیگا۔ اسی طرح نکاح کا مسئلہ ہے کہ اس وقت ضرورت تھی کہ باپ دادا کے فیصلہ کو لڑکی یا لڑکے کی رضامندی پر ترجیح دیجائے، اور قومی افتراق کے خیال سے انفرادی ارادوں کو پس پشت ڈالدیا جائے، لیکن اب تو اس پر عمل نہیں ہوسکتا، جب کہ عورتیں تعلیم یافتہ ہیں، اپنے نفع و نقصان کو جانتی سکتی ہیں اور نکاح کے فلسفہ کو پوری طرح سمجھ سکتی ہیں اور اس پر عمل کرنے سے اجتماعی قوت کو اور زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے"

مولانا "خیر، اس بحث سے کیا فائدہ، آپ منکوحہ نہ سہی "نامزد" سہی، اس کے بعد فرمائیے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔"

اقبال "میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اس وقت تک جو اطلاعات مجھے آپ کے اخلاق و مزاج کے متعلق حاصل ہوئی ہیں، وہ مجھے مجبور کرتی ہیں کہ اپنی آئندہ زندگی کے متعلق آپ کی رائے یا فیصلہ معلوم کروں۔ اس لئے براہ کرم بتائیے کہ اگر اس نامزدگی کو میں کسی وقت نکاح تسلیم کرکے آپ کو اپنا شوہر مان لوں تو آپ کی توقعات مجھ سے کیا ہونگی، اور آپ مجھے کس زندگی میں دیکھنا پسند کریں گے"

مولانا میری توقعات وہی ہونگی جو ایک شوہر کے دل میں بیوی کی طرف سے پیدا ہونی چاہئیں، اور میں آپ کو اسی زندگی میں دیکھنا پسند کروں گا جو ان توقعات کو پورا کرسکیں، یعنی شوہر کی اطاعت و فرمانبرداری، دلجوئی و خدمتگذاری، پاس عہد و عفت مآبی"

اقبال "اس کے عوض میں آپ کے طرف سے کیا چیز پیش کی جائیگی؟"

مولانا "حقوق کا ادا کرنا، اور خلوص و محبت کا اعتراف"

اقبال "بجا ہے، اتنی بڑی قربانیوں کا معاوضہ آپ یہ دیں گے۔ سبحان اللہ، عورت رات دن مرد کی خدمت کرے، اپنے عیش و آرام کو خاک میں ملا دے، شوہر کی مزاج پرستی میں اپنے آپ کو فنا کردے، اور شوہر صاحب اس کے عوض میں صرف "حقوق" ادا کریں، یعنی کھانے کپڑے کی ذمہ داری اپنے سر لیں، خلوص و محبت کا اعتراف کریں، یعنی عورت کو برا بھلا نہ کہیں، یہ اصول تو آپ کا اس صورت میں قابل عمل ہو سکتا ہے جب کوئی کمتر درجہ کی جاہل عورت آپ کو ظلم کرنے کے لئے ملجائے لیکن اگر وہ مرتبہ میں ہر لحاظ سے آپ کی ہمسر ہو تو آپ کیا کریں گے؟ اور کیا چاہیں گے؟"

مولانا عورت کبھی مرد کی ہمسر نہیں ہوسکتی، اور اس کو کبھی مرد کی برابری کرنے کا حق حاصل نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ پاک نے کلام مجید میں مردوں کو غالب اور عورتوں کو ناقص العقل بتایا ہے"

اقبال "اللہ پاک نے تو کیا بتایا ہوگا، یہ کہئے کہ آپ نے غلطی سے سمجھ لیا ہوگا، اور ہاں پردے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

مولانا کی ذات اور ان کی قابلیت پر یہ سخت ترین حملہ تھا کہ ان پر غلط فہمی کا الزام عاید کیا جائے، اس لئے اب وہ قابو سے باہر ہوگئے اور نہایت برہم انداز میں جواب دیا کہ،

"کیوں ان فضول باتوں سے وقت خراب کیا جاتا ہے، تم شرعاً و قانوناً میری بیوی ہو، اور اس پابندی سے نکل نہیں سکتیں، اس لئے میں جس طرح چاہوں گا رکھوں گا، اور جو میرے جی میں آئیگا تمہاری زندگی کے متعلق فیصلہ کروں گا، باپردہ سو ظاہر ہے کہ میں تمہاری آواز بھی پردہ سے باہر جانا گوارا نہیں کر سکتا۔"

اقبال کا یہ سننا تھا کہ سارے بدن میں آگ لگ گئی اور نہایت بلند آواز سے بگڑ کر بولی کہ:

میں اس قانون و شرع کا مطلق پروا نہیں کر سکتی جو ظالمانہ فیصلہ صادر کرے اور دنیا کی کوئی قوت میرے سر کو اس کے سامنے نہیں جھکا سکتی، اس لئے آپ اس وقت ہمیشہ کے لئے سن لیجئے کہ میں اپنی نامزدگی کو منسوخ کرتی ہوں، اور آپ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے دماغ میں یہ سودا نہ پکائیے گا کہ آپ میرے شوہر ہو سکتے ہیں اور اپنے اس عزم و فیصلہ کے ثبوت میں سب سے پہلے جو چیز کرتی ہوں وہ یہ ہے کہ میں اس وقت سے ہمیشہ کے لئے پردہ توڑے دیتی ہوں"

یہ کہکر اقبال بپھری ہوئی شیرنی کی طرح چلمن سے باہر آ گئی اور خادمہ کو حکم دیا کہ فوراً گاڑی تیار کرائے میں سنیما تماشہ دیکھنے جاؤں گی۔

مولانا کے لئے اقبال کا یہ فیصلہ اور اس کے ساتھ ہی اس کا یہ عمل ایسا معمولی منظر نہ تھا کہ وہ متاثر نہ ہوتے، جس وقت اقبال باہر آئی، انھوں نے اپنے اندر شدید جذبۂ غیرت و خودداری محسوس کیا اور شاید وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اندر کر دیتے اگر اقبال کے حسین تیور دیکھکر وہ مغلوب حسن نہ ہو جاتے۔

شور و ہنگامہ سن کر محلہ کی عورتیں آ گئیں، کنبہ بھی جمع ہو گئیں لیکن اقبال نے کسی کی پرواہ نہ کی، اور کمرے کے اندر جا کر جلدی جلدی جاس بدلا اور آدھ گھنٹہ کے اندر گاڑی پر سوار ہو کر بے پردہ باہر چلی گئی۔

(۶)

گذشتہ واقعہ کو ایک مہینے سے زیادہ گذر گیا ہے اور اقبال و مولانا کی مخالفت کا ہر جگہ چرچا ہے، اقبال نے تنسیخ نکاح کی درخواست دی ہے اور مولانا نے اس کے رخصت کرانے کا دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ ہر چند مولانا کو علم ہے کہ اگر وہ اس میں کامیاب ہو گئے تو بھی ایک بیوی کی حیثیت سے اس کو گھر کے اندر رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے، لیکن اب جو کچھ کر رہے ہیں اس کا تعلق صرف جذبۂ انتقام سے ہے اور باوجود تمام اعزہ و احباب کے سمجھانے کے وہ کسی طرح اس خیال کے ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے۔

ہر چند اقبال کی طرف سے شہر کے نہایت مشہور وکلاء و بیرسٹر پیروی کر رہے ہیں لیکن چونکہ نکاح کا واقعہ صحیح ہے جس سے اقبال بھی انکار نہیں کر سکتی اس لئے اس کا پہلو بہت کمزور ہے اور کوئی امید کامیابی کی نہیں ہے، تاہم اقبال بہت مطمئن ہے اور اپنے وکیلوں کو یقین دلا رہی ہے کہ وہ کامیاب ہونگے۔

فیصلہ سنانے کی تاریخ آ گئی ہے۔ عدالت گاہ میں لوگوں کا ہجوم ہے، اور ہر شخص بے چینی سے حکم عدالت کا منتظر ہے، پیشکار نے کاغذات پیش کئے اور جج نے ان کو دیکھکر اقبال کے وکلاء سے مخاطب ہو کر کہا کہ:

"اس وقت تک آپ لوگوں کی طرف سے کوئی صفائی اس امر کی پیش نہیں ہوسکی ہے کہ مس اقبال کا نکاح ان کے باپ نے سعادت علی خاں سے

نہیں کیا۔ پھر چونکہ نکاح کرنے والا ولی باپ تھا اس لئے شرع محمدی کی رو سے یہ نکاح ناجائز قرار نہیں پا سکتا، اور مس اقبال کو اب فسخ نکاح کرانے کا کوئی اختیار نہیں ہے، خاصکر ایسی حالت میں جبکہ بالغ ہونے کے بعد بھی وہ اتنے دنوں تک خاموش رہیں، کیا مس اقبال تکلیف کر کے کوئی وجہ بتا سکیں گی، کہ کیوں نہ سعادت علی خاں کے حق میں فیصلہ صادر کیا جائے۔ اور کیوں نہ وہ رسم رخصت کی منظوری پر مجبور کی جائیں"

حقیقتاً اقبال کے وکلا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا لیکن قبل اس کے کہ وہ جج کی یہ گفتگو سن کر جواب میں کچھ کہتے، اقبال بڑھ کر آگے آئی اور بولی کہ:-

"باوجود اس کے کہ میں نکاح ہونے کو تسلیم کرتی ہوں، باوصف اس کے کہ نکاح میرے باپ نے کیا تھا، اور اب شرع اسلام کے مطابق میں اس کو فسخ نہیں کرا سکتی جبکہ بالغ ہونے کے بعد بھی میں عرصہ تک خاموش رہی اور باوجود اس کے کہ عدالت میرے خلاف فیصلہ کرنے پر مجبور ہے، میں کہتی ہوں کہ سعادت علی خاں کے ساتھ میرا نکاح اگر پہلے ناجائز نہیں تھا تو اب ہو گیا ہے اور اگر کل تک میں اپنے آپ کو مجبور پاتی تھی تو آج بالکل آزاد ہوں اور اپنی آزادی کو نہ صرف عدالت بلکہ ساری دنیا سے تسلیم کرا سکتی ہوں"

عدالت — کیونکر؟

اقبال — "اس طرح کہ اگر کل میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسلامی قانون کی پابند تھی تو آج عیسائی ہونے کے لحاظ سے مسیحی قانون کی پابند ہوں اور مسیحی قانون مجھے انتخاب شوہر کے مسئلہ میں بالکل آزادی دیتا ہے"

یہ سن کر عدالت گاہ کا ہر ہر فرد متحیر تھا اور ہنوز چاروں طرف خاموشی تھی کہ شہر کے بڑے کلیسہ کا پادری نمودار ہوا، اور اس نے اقبال کے بیان کی تصدیق کر کے رجسٹر پیش کیا اور آخرکار عدالت کو مجبور ہو کر مولانا کا مقدمہ خارج کر دینا پڑا۔

تین باتیں

۱ اگر رسالہ نہ پہونچنے کی اطلاع ہر ماہ کی بیس تاریخ تک نہ دیجائے گی تو رسالہ مفت نہ دیا جائے گا۔ آٹھ آنے کے ٹکٹ بھیجکر رسالہ حاصل کیجئے۔

۲ خط و کتابت کے وقت نمبر خریداری نہیں لکھا ہے تو جواب کی امید نہ رکھئے۔ ہر خریدار کا نمبر خریداری رسالہ کے ریپر پر سیدھی جانب لکھا رہتا ہے۔

۳ دو مہینے سے برابر عرض کیا جا رہا ہے کہ مضامین صاف و خوشخط آنے چاہئیں لیکن اس پر کچھ توجہ نہیں کیجاتی جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ بندہ نواز مضامین صاف و خوشخط اور اچھے کاغذ پر لکھکر روانہ فرمایئے تاکہ پڑھنے میں دردسری اور بیکار وقت ضائع نہ ہو۔

مینیجر

غالب اور ذوق

ان دنوں "غالب پرستی" کچھ اس طرح ہمارے نوجوانوں کے رگ و ریشہ میں جاری وساری ہو گئی ہے کہ وہ اس رَو میں بہتے ہوئے کسی اور طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض قابل قدر شعرا کو نظرانداز کر دیا گیا، حالانکہ اگر ان کا بھی اسی طرح مطالعہ کیا جاتا، جس طرح غالب کا کیا گیا ہے تو نتیجہ کسی طرح بھی اس کے سوائے نہ ہوتا کہ ان کو بھی غالب کی طرح بلند پرداز، صاحب تخیل اور خلاق معانی وغیرہ ناموں سے پکارا جاتا، اس تغافل کے شکار ذوق اور مومن بھی ہیں اور آخرالذکر کو تو خیر کسی حیثیت سے غالب کا مدمقابل مان بھی لیا جاتا ہے، لیکن بیچارے ذوق کو تو اس قابل بھی خیال نہیں کیا جاتا، کہ اُس کا نام بھی غالب کے نام کے ساتھ لیا جاوے۔

شاعر وہ ہے جو کسی ملک قوم کے لئے کوئی پیغام لاوے لیکن ہندوستان میں سوائے دو تین کے ہم کسی کو اس صفت کا حامل نہیں پاتے، اور اگر بنظر انصاف دیکھا جاوے تو یقیناً غالب بھی کسی خاص پیغام کے لانے والے نہ تھے، اُن کے کلام کی جو متعدد شرحیں چھپی ہیں اُن میں اس قدر دور از کار اور عجیب و غریب تاویلیں کی گئی ہیں کہ شاید خود غالب کے وہم میں بھی نہ آئی ہوں۔

دیوانِ غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں میں فاضل مقدمہ نگار نے اُن کو قوم پرست، فدائے ملک ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے، اور اسکے ثبوت میں "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک" وغیرہ دو چار غزلیں پیش کی ہیں۔ ارباب فہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں اور اُن کی وہ تاویلیں کہاں تک درست ہیں۔

"نسخۂ حمیدیہ" کے مقدمہ نگار یوں شروع کرتے ہیں کہ:-

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، مقدس وید اور دیوانِ غالب"

یہ ایک قابل نقاد کے الفاظ ہیں جو انہوں نے صرف خوش اعتقادی کے جوش میں لکھ دیے ہیں۔

ایک اور "جدید ترین اور بہترین شرح" لکھنے والے صاحب نے مقدمہ میں جہاں شعرا متقدمین اور متاخرین کے کلام کی خصوصیات گنائی ہیں وہاں لکھتے ہیں "لیکن غالب کے مقابلہ میں یہ سب ہیچ ہیں اور مرزا کا کلام ان تمام خصوصیات کا مجموعہ ہے" (ممکن ہے الفاظ کچھ تبدیل ہو گئے ہوں، کیونکہ مجھکو یاد نہیں رہے)

ایک اور صاحب جولائی کے اردو رسالہ میں "شارحین غالب" کا ذکر کرتے ہوئے ذوق کی نسبت یوں فرماتے ہیں "ذوق کی شاعری کیا ہے متعفن لاشوں کا مقبرہ" خدا معلوم اس سے اُن کی مراد کیا ہے، لیکن اگر اس سے ان کا مقصد صرف غالب کی شاعری کو بہت ارفع دکھانا تھا تو پھر لکھونگا، کہ یہ مقصد ذوق پر اس غلط اور ناجائز حملہ کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا تھا۔

غرض اس طرح ہر ایک نے ان کو کچھ کا کچھ بنا دیا ہے۔ اس مضمون میں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ ذوق، غالب کے مقابلہ میں کسی طرح کم نہیں، میں اس

ہز عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے منگائیے

مضمون کو مکمل نہیں کر سکتا، لیکن میں نے کوشش یہی کی ہے۔

مرزا فارسی زبان کے شاعر تھے، اور خود بھی انھوں نے جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے، اس کا نتیجہ ضروری یہی تھا کہ اُن کی فارسی کا اثر ان کے اردو نظم و نثر پر پڑتا۔ سو وہ سب کے سامنے ہے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی بدولت اردو میں بہت سے نئے الفاظ اور خیالات کا اضافہ ہوا، لیکن کیا کوئی اِن الفاظ کو اپنی تحریر میں استعمال کرتا ہے، یا کر سکتا ہے، کیا ہم ایسی نثر کو مستحسن نگاہوں سے دیکھیں گے، جس میں قدم قدم پر "بیک کف بردن" "حباب موجۂ دریا" "بجوئے غلطیدن" "دام شنیدن" وغیرہ جیسی نادر ترکیب ہوں۔ باقی رہے خیالات۔ یقیناً ان سے ایک بہت خوبصورت عمارت کھڑی ہو سکتی ہے، لیکن معمار قابل اور سمجھدار ہو تو۔ ورنہ یوں کون بتا سکتا ہے کہ اس کوشش میں کتنے شاعر مہمل گو ہو گئے، انہوں نے یہ سمجھا کہ غالب کو غالب کس چیز نے بنایا یقیناً وہ مشکل اور الفاظانہ تھے، بلکہ وہ صاف اشعار تھے جن کی بدولت وہ غالب ہو گئے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ایسے الفاظ کے استعمال کرنے پر مجبور تھے، کیونکہ خیالات نئے تھے اور اُن کے لئے اس سے پیشتر کوئی ایسا آسان ذخیرۂ الفاظ موجود نہ تھا، لیکن میں جہاں ذوق اور غالب کے ہم معنی اشعار لکھونگا وہاں ایک دیکھیں گے کہ وہی خیالات نہایت صفائی اور عمدگی سے نظم ہو گئے ہیں۔

دوسری بات غور طلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو ذوق کو غالب کے مقابل ہیچ شمار کرتے ہیں کیا اُن کا یہ خیال ہے کہ اگر دو سپہ سالاروں میں سے ایک کو فتح نصیب ہو اور دوسرے کو شکست۔ تو دوسرے کو مردود قرار دیا جاوے، یہ بات ہوتی، تو ولنگٹن کے مقابلہ میں دنیا کبھی کا نپولین کو بھول گئی ہوتی۔ ذوق کے دیوان کا بیشتر حصہ آجتک نہ مل سکا، جو کچھ ہے وہ آپ کے سامنے ہے اور اگر بقول شخصے اس سے بھی غالب کے کلام کی طرح انتخاب کیا جاوے تو کون جانتا ہے کہ خیالات کی موجودہ رو کیا رخ اختیار کرے۔

اب ہم دونوں کے چند وہ اشعار پیش کرتے ہیں، جن کو انھوں نے اپنے اپنے طریقہ سے نظم کیا ہے یا ایک ہی طرح کی غزلیات میں ایک ہی قافیہ کو دونوں نے کس طرح باندھا ہے۔

غالب ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:۔

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بد دماغی ہے کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ذوق نے بھی اسی زمین میں یہ قافیہ اور یہی مضمون باندھا ہے، لیکن افسوس ہے کہ دیوان میں اُس کا دوسرا مصرعہ پڑھا نہ گیا۔ ہاں ایک جگہ اور اسی مضمون کو یوں لکھا ہے۔

ہے نگہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے چڑ بن آتا ہے مرا ناک میں دم اور زیادہ

غالب کی "بد دماغی" کی وجہ تو وہ خود جانیں یا خدا۔ لیکن ذوق نے "چڑ بن" کہہ کر شعر کو زیادہ صاف کر دیا۔ طرز بیان کا فرق ظاہر ہے، دوسرے کیا بد دماغی کا استعمال یہاں ٹھیک ہے۔ محاورہ میں اسکے معنی مغلوب الغضب، اور مغرور وغیرہ کے ہیں۔

غالب کی اسی غزل کا مطلع ہے:۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

ذوق کے ہاں یوں ہے۔

وہ ہوں میں ذرۂ شوق میرے تماشا ہے　　برنگ سایۂ مرغ ہوا نقش قدم میرا

"نقش قدم" کی دونوں تشبیہیں "حباب موجۂ رفتار" اور "سایۂ مرغ ہوا" بہت خوب ہیں، لیکن حباب سے (جو کبھی مٹتا ہے کبھی ٹوٹتا ہے) سایہ (جو ہمیشہ صاف اور یکساں رہیگا) کی تشبیہ زیادہ عمدہ نہیں، اور کیا غالب کے "طلسم" سے دو سرا مات شعر زیادہ قابل تعریف نہیں۔

ایک اور غزل "شراب تو دے۔ جواب تو دے" میں غالب ساقی کو یوں مخاطب کرتے ہیں۔

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے　　پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

ذوق دیکھیے اسی مضمون کو کس بیخودانہ انداز سے نظم کرتے ہیں۔

کہاں تلک کہوں ساقی کو لا شراب تو دے　　نہ دے شراب ڈبو کر کوئی کباب تو دے

غالب کے شعر کے اعلیٰ ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، لیکن کیا کوئی منصف مزاج اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ذوق کا شعر غالب کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

اسی غزل میں داب کا قافیہ یوں باندھتے ہیں

غالب　　اسد خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے　　کہا جو اُس نے ذرا پاؤں میرے داب تو دے

ذوق　　خنک دلوں کی اگر دشت خاک دوزخ میں　　پڑے تو واقعی اک بار آگ داب تو دے

غالب کا مضمون رکیک تھا لیکن اُن کی استادانہ بندش اور محاورہ اور رعایت لفظی نے شعر کو بنا دیا، بمقابلہ اس کے ذوق کا شعر جیسا ہے، وہ صاحب فہم سے مخفی نہیں۔

ایک اور غزل میں غالب یوں فرماتے ہیں۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر　　کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

اسی قافیہ اور زمین میں ذوق کا شعر ہے۔

صبا جو آئی خس و خار گلستاں کے لئے　　قفس میں کیونکہ نہ تڑپے دل آشیاں کیلئے

غالب کا شعر تعریف سے مستغنی ہے لیکن ذوق کے شعر میں جو درد و غم کا نقشہ ہے، وہ کسی طرح اس سے کم درد انگیز نہیں۔

غالب　　بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے　　رکھوں کچھ اپنی بھی مژگان خونفشاں کیلئے

ذوق　　نہ دل رہا نہ جگر دونوں جل کے خاک ہوئے　　رہا ہے سینہ میں کیا چشم خونفشاں کیلئے

غالب کے شعر سے یقیناً اُن کے فطری جذبہ کا اظہار ہوتا ہے، لیکن کیا ہم "مژہ" کی تکرار کے نقص کو نظر انداز کر سکتے ہیں، بخلاف اس کے ذوق کے شعر کی روانی صفائی، اور چستی ہر بات قابل تعریف ہے، غالب کا شعر یقیناً اس سے پست ہے۔

غالب　　وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر　　نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لئے

ذوق　　اگر امید نہ ہمسایہ ہو تو خانۂ یاس　　بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے

غالب نے ایک پرانے اور فرسودہ خیال کو لیا ہے، اور ذوق نے اس کے مقابلہ میں ایک مضمون پیدا کیا ہے، فرق ظاہر ہے، یہ شعر تو وہ تھے، جن میں زمین وغیرہ ایک تھی اب چند اشعار ایسے پیش کرتا ہوں جن میں دونوں نے ایک ہی مضمون کو مختلف انداز سے نظم کیا ہے۔

غالب معشوق کی بے پروائی کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش　　　تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں

اسی مضمون پر ذوق کا ایک مطلع ملاحظہ ہو ؎

میں اور لاکھ نالۂ سخن اضطراب میں　　　واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

بیشک غالب نے خوب لکھا تھا، لیکن جس صفائی اور عمدگی سے ذوق نے نظم کیا ہے وہ لاجواب ہے۔

"تاریکی خانہ" کا مضمون دونوں کے ہاں یوں ہے۔

غالب　　ظلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے　　اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

ذوق　　دود دل سے ہے یہ تاریکی مرے غمخانے میں　　شمع ہے اک سوزن گم گشتہ اس کاشانے میں

اگرچہ ذوق کے ہاں غالب کے سے بلند آہنگ اور پرشکوہ الفاظ نہیں، اور ایسے الفاظ یہاں چاہئیے بھی نہیں، لیکن کیا غالب کے شعر کو ذوق کے شعر پر ترجیح دی جا سکتی ہے؟ یا ذوق نے اک سوزن گم گشتہ کو شمع کے ساتھ جو تاریکی کا نقشہ پیش کیا ہے، وہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے؟

گریہ کے مضمون کو یوں باندھا ہے۔

غالب　　میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے　　اس کے سیل گریہ میں گردوں کف سیلاب تھا

ذوق　　ذکر تا ضبط میں گریہ تو ذوق اک گھڑی بھر میں　　کٹورے کی طرح گرداب غرق آسماں ہوتا

غالب کا گریہ اپنی سطح آسمان کو بناتا ہے، اور اس کو کف۔ بخلاف اس کے ذوق اس کو تہ میں غرق کرتا ہے۔ احسان اٹھانے کی مذمت غالب نے طرح طرح سے کی ہے، مثلاً ایک جگہ یوں فرماتے ہیں۔

دیوار بار منت مزدور سے ہے خم　　اے خانماں خراب نہ احسان اٹھائیے

لیکن کہیں بھی کسی ایسی حالت کا اشارہ نہیں کیا۔ جس میں آدمی پریشان اور نا امید ہو کر کسی سے مدد کا طالب ہو جاتا ہے یقیناً ایسی حالت میں احسان اٹھانے سے انکار کر دینا انتہائے غیرت ہے، ذوق ایک جگہ یوں کہتے ہیں ؎

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا　　کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

اور ایک جگہ:-

نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب فنا میں ہم　　کہ بہتر ڈوب کر مرنیسے ہے جینا سہارے کا

کیا یہ انداز زیادہ موثر نہیں؟

حسرت دیدار کا مضمون؛

غالب　آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا　　تجھ پہ کھل جائے اسکو حسرت دیدار ہے
ذوق　یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مہر　　آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

مضمون کچھ بھی نہیں تھا، لیکن یہی ملاحظہ ہو کہ کس کے شعر سے زیادہ شوق ٹپکتا ہے، غالب کے مندرجہ ذیل دونو شعر ایک ہی مضمون کے ہیں

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب　　یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت
مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے　　خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

ذوق کا مطلع اسی مضمون کا دیکھئے کیا خوب ہے، اور لاجواب ہے کہ نہیں۔

وقت نزع دیکھا دلآرام کو　　عید ہوئی ذوق دمِ شام کو

وحشت اور دیوانگی کے مضمون کو غالب نے یوں لکھا ہے

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں　　یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

ذوق کا شعر ملاحظہ ہو، ایک مرقع حسرت ہے۔

نچھوڑا تار وحشت نے ہمارے جیب داماں میں　　مگر تار نفس سینہ میں ہے جو یا گریباں میں

غالب کا شعر ہے۔

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست　　لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ذوق اسی مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں۔

اس حور وش کا گھر مجھے جنت سہی ہے سوا　　لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں
غالب　کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز　　کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
ذوق　تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ　　ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

مضمون ایک تھا، لیکن غالب نے اس کو اپنی عادت کے موافق ایک معمہ بنا دیا اور ذوق نے صاف اور سلیس طریقہ سے باندھ دیا، او کسی طرح کم نہیں رہا۔

غالب دفورِ شکایت کے مضمون کو یوں لکھتے ہیں۔

پر ہوں شکوہ سے میں یوں راگ سے جیسے باجا　　اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے
ذوق　دیکھا آخر نہ یہ ہونٹ کسیطرح ہونٹ سیے　　ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں تم نے چھیڑا ہم کو

غالب نے ذرا لطیف چیز سے تشبیہ دی ہے، لیکن شکوہ یقیناً کوئی راگ نہیں ہوگا۔ بلکہ چند جلی کٹی ہونگی یا کچھ درد انگیز نالے ہوں گے۔

اب ذرا ایک شعر مبالغہ کا ملاحظہ ہو، گرمی وحشت اور اندیشہ کا مضمون ہے۔

غالب　عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں　　کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

ذوق — اف گرمیٔ وحشت کہ مری ٹھوکروں میں — پتھر بھی پہاڑوں کے اڑے جاتے ہیں تنکے سے

اب ہم دونوں کے سہروں کو دیکھتے ہیں، اگرچہ یہ ایک پرانا بحث ہے لیکن یہاں بھی اس کا اعادہ لطف سے خالی نہ ہوگا۔

غالب کا مطلع ہے — خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا — باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

اور ذوق کا مطلع ہے — اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا — آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

غالب نے یہ تو بتایا کہ سہرا کس کے سر ہے لیکن ذوق نے یمن و سعادت کا سہرا لکھ کر شعر بلند کر دیا۔

پھر غالب کہتے ہیں۔

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے — ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا

ذوق کے ہاں اس کے جواب میں دو تین شعر ہیں۔ از انجملہ ایک یہ ہے۔

سر پہ طرہ ہے مزین تو گلے میں بدھی — کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

پھر غالب کہتے ہیں:- سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ — مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ذوق لکھتے ہیں:- ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دم آرائش — سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

پھر غالب — ناؤ بھر کر ہی فراہم کئے ہونگے موتی — ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

ذوق — آج وہ دن ہے کہ لائے در انجم سے فلک — کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

یہ شعر بھی غالب کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔

سات دریا کے فراہم کئے ہونگے موتی — تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

ذوق — اک گہر بھی نہیں صد کان گہر میں چھوڑا — تیرے بنوایا ہے لے کے جو گوہر سہرا

غالب کی سات دریا کی تخصیص اس کے مقابلہ میں کان گوہر جس میں بحر و بر دونوں شامل ہیں اس سے شعر بڑھ گیا۔

غالب — رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا — ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا

ذوق — روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے موتی — تار بارش کا بندھا ایک سراسر سہرا — فرق ظاہر ہے

غالب — جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز — چاہیئے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

ذوق — پھرتی خوشبو سے ہے اترائی ہوئی باد صبا — اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر[*] سہرا

غالب — رخ روشن کی چمک گوہر غلطاں کی دمک — کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا

ذوق — دہ سکے صل علیٰ یہ کہے سبحان اللہ — دیکھ مکھڑے پہ ترے جو مہ و اختر سہرا

غالب کے یہاں ایک دو قافیہ لاجواب ہیں، لیکن مجموعی طور پر ذوق کا سہرا بڑھ گیا ہے۔

اب میں ایک نامکمل سا انتخاب پیش کرتا ہوں جس سے ناظرین ضرور لطف اٹھائیں گے۔

---

[*] معطر اصغر علی محمد علی سے بہتر نہیں مل سکتا۔

آتی ہے صدائے جرسِ ناقۂ لیلیٰ　　صد حیف کہ مجنوں کا قدم اٹھ نہیں سکتا
ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے　　جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اٹھ نہیں سکتا
کیوں اتنا گرانبار ہے جو زادِ سفر بھی　　لے زاد رہِ ملکِ عدم اٹھ نہیں سکتا

- - - - - - - - - - - - - - -

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ　　اپنا آئینہ مرا دیدۂ پُر آب بنا

- - - - - - - - - - - - - - -

ہے مقامِ زندگی زیرِ دمِ شمشیرِ مرگ　　جو گیا جس طرح کوئی دم گزارا ہو گیا

- - - - - - - - - - - - - - -

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا امید　　تو ہماری جان لیکن کیا بھروسہ جان کا

- - - - - - - - - - - - - - -

شکر پردے ہی میں اس بت کو خدا نے رکھا　　ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا

- - - - - - - - - - - - - - -

ملے اکسیر گر اس کشتہ و خوں سے میں لوں ہرگز　　مرے مذہب میں خوں کرنا ہی کشتہ کرنا یار کا
خریدار اس کی رحمت عنبسِ عصیاں کی ہے گر یہ　　جھڑک کر بیچتا ہوں نفع پر سودا خسارے کا

- - - - - - - - - - - - - - -

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر　　جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا
بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا　　لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

- - - - - - - - - - - - - - -

اس تپش کا مزہ ہے دل ہی کو حاصل ہوتا　　کاش میں عشق میں سر تا بقدم دل ہوتا

- - - - - - - - - - - - - - -

یوں لائے ہم وہاں سے دل صد پارہ ڈھونڈ کر　　دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

- - - - - - - - - - - - - - -

ٹھہری ہے اُن کے آنے کی یاں کل پہ صلاح　　اے جانِ برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح
رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ　　جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

- - - - - - - - - - - - - - -

کل گئے تھے تم جسے بیمارِ ہجراں چھوڑ کر — چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر
اہلِ جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک — لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں — وہ پھر کے بزم میں دیکھیں کدھر کو دیکھتے ہیں
خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں — کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں
یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں — واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

اک دم عمرِ طبیعی ہے یہاں مثلِ حباب — فکرِ امروز نہ ہے نے غمِ فردا ہم کو
تو ہنسی سے یہ نہ کہہ مرتے ہیں ہم بھی تم پہ — مار ہی ڈالیگا بس رشک ہمارا ہم کو

ہے باغِ جہاں میں تجھے گر ہمتِ عالی — کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ
لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمردار کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ
جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر — ہے ذوق برابر انہیں کم اور زیادہ

رخصت اے زندانِ جنوں زنجیرِ در کھڑکائے ہے — مژدہ خارِ دشت پھر تلوہ مرا کھجلائے ہے

اے شمع تیری عمرِ طبیعی ہے ایک رات — رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے
بے فیض گر ہے چشمۂ آبِ بقا تو کیا — مانگو تو ایک قطرہ نہ آئینہ دار دے
پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی — جب قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

کون وقت اے وائے گزرا جی کو گھبراتے ہوئے — موت پڑتی ہو اجل کو یاں تلک آتے ہوئے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے — مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی — جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائیں گے

مالک رام ابو دیجہ

دکن کی اردو شاعری

جن وجوہ کے باعث دکھن میں اردو شاعری کو یک لخت حیرت انگیز ترقی نصیب ہوئی، اُن کا معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ یہ توقع کرنا قدرتی امر تھا کہ اردو شاعری اپنی جنم بھوم یعنی دہلی میں اپنی زندگی کی ابتدا کرتی، لیکن برعکس اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ دکھن کی شاعرانہ گرم بازاری کا مرکز اس کی جائے پیدائش سے اس قدر دور واقع ہوا ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اس اہم سوال کا جواب دینے کی اب تک کوئی کوشش عمل میں نہیں آئی اور اس حیرت انگیز واقعہ کی تشریح کرنے کے لئے دکھن کی اس دور کی تاریخ کی جانب رجوع کرنا ضروری ہوگا۔ سلطنت بہمنی کا بانی برہمن گنگو نامی کا ایک عقیدت مند مرید تھا، جب وہ تخت پر متمکن ہوا تو اُس نے نہ صرف ادب واحترام سے اپنے گرو کے نام کو اختیار کرلیا، بلکہ گنگو کو اپنا وزیر مال بنالیا "عام عقیدہ یہ ہے کہ گنگو ہی وہ پہلا برہمن ہے جس نے کسی اسلامی بادشاہ کی ملازمت قبول کی ہو اور یہ کہ اس سے پیشتر برہمن کاروبار سلطنت کی انجام دہی کے لئے ملازم نہیں رکھے جاتے تھے، بلکہ وہ محض مذہبی خدمات کی بجاآوری میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے ------ جب سے گنگو نے ملازمت قبول کی اس وقت سے محکمۂ مال کا انصرام دکھن کے تمام فرمانرواؤں کی جانب سے برہمنوں ہی کو تفویض ہوتا رہا ہے" محکمۂ مال میں ہندوؤں کے ملازم ہوجانے سے زبان کو فوری عروج ہوا اور اس سے ضمناً اُن دوستانہ تعلقات پر بھی روشنی پڑتی ہے جو اس زمانہ میں دونوں قوموں میں رائج تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے غیر ملکیوں کی بجائے دکھنیوں کو ملازم رکھا اور اس کے حکم سے سرکاری حسابات جو پہلے فارسی میں رکھے جاتے تھے برہمنوں کی زیر نگرانی جنھوں نے رفتہ رفتہ اس کی حکومت میں بہت رسوخ پیدا کرلیا تھا، ہندی میں رکھے جانے لگے یہ درحقیقت ملکی زبان کی بہت بڑی فتح تھی، جس نے اب دفتری زبان کی حیثیت اختیار کرلی تھی، اور اسی باعث اس نے معتدبہ ترقی کی، ہندو بہ لحاظ تعداد جنوبی ہند میں نظر انداز کئے جانے کے قابل نہ تھے اور یہی سبب ہے کہ زمانۂ مابعد میں مسلمان فرمانرواؤں نے حصول طاقت کے لئے جو بیشمار سازشیں اور لڑائیاں کیں ان میں انھوں نے ہمیشہ طاقتور ہندو راجگان کی امداد طلب کی۔ کبھی انھیں ایک فریق اپنی طرف ملالیتا تھا اور کبھی فریق مخالف اُن کی دلجوئی کرتا تھا اور اس امر کی ترغیب دیتا تھا کہ فلاں خطرناک اور ظالم ہمسایہ کے خلاف جتھابندی کرلینی چاہیئے۔ بعض دفعہ مسلمان بھی ہندو سردار کے خلاف متحد ہوجاتے تھے۔ اُن جنگی کارروائیوں اور سیاسی تعلقات کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات بہت قریبی ہوگئے تھے، جس سے ملکی زبان کو کچھ کم فائدہ نہ پہنچا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی سہ صد سالہ خودمختاری کے زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین ہندوستان کے دیگر حصص کے مقابلہ میں کہیں زیادہ میل ملاپ تھا۔ ان دونوں میں نہ صرف باہمی رواداری تھی بلکہ ہندو رعایا اور مسلم بادشاہوں کے درمیان بے انتہا جذبۂ محبت موجود تھا۔ جس میں صرف اس وقت تزلزل پیدا ہوا، جبکہ سلطنت بیجاپور کے زوال کے حالت میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کی جانب غیر ضروری نرمی کا اظہار کیا گیا۔ ان دونوں قوموں کے باہمی تعلقات اس قدر خوشگوار اور گہرے تھے کہ دکھن کے مسلم شاہزادگان اور امرا ہنود عورتوں سے شادیاں رچاتے تھے، اور ہندو راجگان بھی مسلم عورتوں سے سلسلۂ ازدواج قائم کرنے میں

کبھی ہم کا عار نہ سمجھتے تھے۔ اس رواداری اور تحمل و برداشت کی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ نظام سلطنت میں بہت سے ہندو ملازم ہو گئے، اگرچہ ان کے درمیان لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، تاہم سلاطین گجرات اور بہمنی خاندان کے بادشاہوں کو شاہان دہلی کے مقابلہ میں جنھوں نے متعدد بار جانب شمال سے حملوں اور بدامنی کے مناظر دیکھے تھے، استحکام سلطنت اور پرامن ترقی کے لئے بہت زیادہ مواقع نصیب ہوئے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی خوشگوار تعلقات، نظام سلطنت میں بہت سے ہندوؤں کی ملازمت، حسابات اور دستاویزات، دفتری کو رکھنے کے لئے ملکی زبان کا استعمال، رواداری کی عام پالیسی پر عملدرآمد، الغرض ان تمام باتوں نے دکھنی زبان کو مستحکم کرنے، ترقی دینے اہم عاملے اور اسے ادبی زبان کے رتبہ تک پہنچا دینے میں بیحد امداد دی، جنوبی ہند کے صوفی بھی جو مذہب و زبان کے تمام اختلافات سے بالاتر رہتے تھے، بالعموم اسی زبان کو ترجیح دیتے تھے تاکہ اس کے ذریعہ وہ جمہور کے تمام طبقوں تک پہنچ سکیں ابتدائی دور کے اکثر شعرا صوفی مشرب تھے اور عوام ہی کی زبان میں شعر کہا کرتے تھے۔

اس دور کی اردو شاعری کی تاریخ پر جو پردہ پڑا ہوا تھا، وہ اب تک صرف تھوڑا سا اٹھا ہے مصنفین کے حالات بھی محض جزئی طور پر معلوم ہوئے ہیں اس زمانہ کا کوئی تذکرہ ایسا نہیں جو اس دور کے مصنفین اور شعرا پر روشنی ڈال سکے، صرف چند نام ہم تک پہنچے ہیں اور ان کے کلام کا معمولی سا جزو ان چند تذکروں میں موجود ہے جو ان کے کئی سال کے بعد معرض تحریر میں آئے، اور جو خوش قسمتی سے محفوظ رہ گئے ہیں، ادبی دلچسپی کا جذبہ حال ہی میں بیدار ہوا ہے، اور یقین ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ پرجوش فضلا کی تحقیقات اس پر بہت کچھ روشنی ڈال سکے گی۔

پہلا قابل ذکر اردو شاعر شجاع الدین نوری ہے جو گجرات کا باشندہ تھا اور فیضی کا دوست اور اکبر کا ہمعصر تھا، وہ سلطان ابوالحسن قطب شاہ والی گولکنڈہ کے وزیر کا فرزند تھا۔ چند اشعار جو اس کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں، پرانے تذکروں بالخصوص تذکرۂ قائم میں محفوظ ہیں۔ وہ اشعار اپنی شعریت کے لئے اس قدر شہرت نہیں رکھتے جس قدر تاریخی اعتبار سے مشہور ہیں۔

گولکنڈہ اور بیجاپور کے سلاطین سب کے سب تعلیم یافتہ، مہذب اور متمدن تھے، انھوں نے نہ صرف شعرا کی سرپرستی کی بلکہ خود بھی فارسی اور دکھنی میں (اور یہ وہ نام تھا جو جنوبی ہند میں اردو کو دیا گیا تھا) اچھے شعر کہتے تھے، وہ ادبا اور فضلا جو ان کے درباروں سے وابستہ تھے بلا استثنا فارسی کے زبردست ماہر اور ادیب تھے اور مسلمانوں کی ادبی زبان کی حیثیت سے جو ترقی فارسی کو نصیب ہوئی، اسے انھیں درباروں کا طفیل سمجھنا چاہئے۔ جدید زبان اجنبی زبانوں مثلاً تلنگی، مرہٹی اور کنڑی سے گھری ہوئی تھی جن سے وہ کسی قسم کا تمتع نہ اٹھا سکتی تھی، اسلامی سلاطین کے درباروں کے فارسی ادیبوں کے ہاتھ میں ہونے اور فارسی کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے کسی طاقتور اثر کی عدم موجودگی کے باعث جدید زبان نے قدرتاً اپنے آپ کو فارسی کے معیار پر ڈھالنا شروع کر دیا۔

گولکنڈہ ان نوریں ادبا و فضلا کا مرکز تھا اس سلطنت کی بنیاد سنہ ۱۵۱۸ء میں پڑی تھی، اور وہ خوشحالی اور کامیابی کی اعلیٰ منازل کو طے کر چکی تھی، سلطان قلی قطب شاہ ثانی جو قلی قطب شاہ کے نام سے بھی مشہور ہے، ابراہیم قطب شاہ کا بیٹا تھا جس کے سنہ ۱۵۸۰ء میں وفات پا جانے پر وہ بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ سنہ [illegible] میں اس نے عادل شاہ والی بیجاپور سے صلح کر لی، اور اپنی بہن کی شادی اس سے رچا دی وہ اکبر اور شاہ عباس والی ایران کا ہمعصر تھا موخرالذکر شہنشاہ نے اپنے ایک لڑکے کے ساتھ اس کی لڑکی کی شادی کر کے اتحاد کرنے کی

خواہش ظاہر کی تھی اور قطب شاہ نے شہنشاہ کے ساتھ اس تعلق کو اپنی عزت خیال کرکے اس کی درخواست کو منظور کر لیا۔ اس نے گولکنڈہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ایک جدید شہر کی بنیاد ڈالی جس کا نام اس نے اپنی معشوقہ جو ایک درباری طوائف تھی) کے نام پر بھاگ نگر رکھا۔ لیکن بعد میں اپنے اس تعلق سے نادم ہو کر اس نے اس شہر کا نام حیدرآباد کر دیا جو نظام کا موجودہ دارالسلطنت ہے، وہ علم ادب اور فنون لطیفہ کا دلدادہ تھا۔ اس کو فن تعمیر سے بہت دلچسپی تھی۔ اور اسی ذوق کا تقاضہ تھا کہ اس نے بہت سی عمارات تعمیر کیں جن میں سے خداداد محل اور بارگاہ خسروی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ علم و ہنر نے اس کے دور میں بہت ترقی کی یہاں تک کہ شعرا اور فضلا اس کی داد و دہش کی وجہ سے ایران اور عرب سے آکر اس کے درباری متوسلین میں شامل ہو گئے تھے، اس نے ایک وقت مقرر کر رکھا تھا کہ اس وقت ادبی مباحث کیا کرے، فن خطاطی نے بھی اس کے زمانہ میں اعلیٰ ترقی کی تھی اور ایران اور عراق کے بہترین خطاط حیدرآباد میں مجتمع ہو گئے تھے۔ اس کے دربار میں مشہور ترین فضلا میں میر محمد استرآبادی اور میر جملہ بھی تھے، اسے مذہبی مباحث سے بہت شغف تھا اور اس نے ہمیشہ شیعی مذہب کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے گولکنڈہ میں اس خاندان کے بانی نے اختیار کر لیا تھا، اسی شیعی عقیدہ کی گرویدگی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے مرثیے معرض تحریر میں آگئے۔

یہ سلطان نہ صرف مختلف فنون اور علم ادب کا زبردست مربی تھا بلکہ خود بھی اچھے شعر کہہ لیتا تھا، اس نے دکھنی، فارسی، اور تلنگی میں اشعار کہے ہیں، اس کا ضخیم کلیات موجود ہے جو ۱۸۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

محمد قلی قطب شاہ فارسی میں قطب شاہ تخلص کرتا تھا اور دکنی میں معانی اس کا کلیات مختلف اصناف شاعری پر حاوی ہے جو حسب ذیل ترتیب میں لکھی گئی ہیں۔

مثنویاں		قصائد
ترجیع بند		فارسی مرثیے
دکھنی مرثیے	اور	رباعیات

جس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد قلی شاہ نے ۵۰ ہزار اشعار نظم کئے تھے۔

سادگی اور سلاست اس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات ہیں اور تصوف اور محبت وہ طاقتور جذبات ہیں جو اس کی شاعری پر تمام و کمال مسلط ہیں، لیکن ان کے علاوہ اور بھی جذبات اس کی شاعری میں پائے جاتے ہیں وہ اپنے میدان کو وسیع کرتا ہے اور انسانی سوسائٹی اور فطرت کی رنگینیوں پر بھی قلم اٹھاتا ہے اور اس صفت میں اس کی شاعری سودا اور نظیر اکبرآبادی کے خیالات سے بہت کچھ مشابہ ہے، خالص ہندوستانی میوہ جات کے متعلق بہت سی مثنویاں لکھی گئی ہیں، ہندوستانی ترکاریوں پر بھی ایک مثنوی ہے اور ایک مثنوی ان پرندوں کے بارے میں ہے جو ہندوستان میں پائے جاتے ہیں، بہت سی نظمیں ان رسوم سے متعلق ہیں جو شادیوں اور تقاریب سالگرہ کے مواقع پر برتی جاتی ہیں، یا جنھیں ہندو اور مسلمان اپنے تہوار و مثلاً ہولی، دیوالی، شب برات، عید، میلادالنبی، بسنت، وغیرہ کے موقعوں پر برتتے ہیں، اور بعض عام نظمیں مثلاً ہاتھی، ہندوستان کا موسم برسات وغیرہ سے متعلق ہیں، ایک دلچسپ نظم میں سانو وخرم کا باہمی مکالمہ دکھایا گیا ہے اس نے راجہ محمد شاہی کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ تحریر کیا ہے

اور حمد، نعت اور منقبت، صحابۂ کرام میں بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں، وہ کربلا کے دردناک سانحہ پر بھی قلم اُٹھایا ہے، چند پُر درد مرثیے اُس کی کاوشِ دماغی کا پتہ دینے کے لئے باقی رہ گئے ہیں۔

قلی قطب شاہ ہی وہ پہلا اُردو شاعر ہے جس کا کلام جوں کا توں محفوظ ہے زبان میں نمایاں حد تک ترقی اور استحکام پائے جاتے ہیں، اور یہ غالب ہے کہ اس سے قبل بھی بہت سے شعرا گذر چکے ہوں گے مگر اُن کا کلام ابھی تک عدم میں ہے اور عالم شہود میں نہیں آیا، البتہ قلی قطب شاہ کے زمانہ سے قبل کی کچھ مذہبی مثنویاں ملتی ہیں لیکن انھیں کسی نوع کی ادبی حیثیت نہیں دی جاسکتی، پہلی مرتبہ ادبیت کی شان قطب شاہ کے کلام سے ظاہر ہوتی ہے، وہ پہلا شاعر ہے جس نے شاعری میں اہل ایران کا تتبع کیا ہے اور ان کی رسم کے مطابق اپنے دیوان کو حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا۔ اور یہ وہ عزت ہے جو اب تک صرف ولی کے حصہ میں آئی تھی اس نے نہ صرف نظم کے معمولی اصناف میں زور قلم صرف کیا ہے بلکہ مقامی دلچسپی کے مضامین کے بارے میں جو کچھ اُس نے تحریر کیا ہے اس سے اس کی جدتِ خیال اور اعلیٰ درجہ کی شستگی زبان ظاہر ہوتی ہے اس کا پورے طور پر فارسی اثرات کو قبول نہ کرنا اس امر سے واضح ہے کہ اس کی تصنیفات میں ہندی اثر بہت جلوہ گر ہے وہ کثرت کے ساتھ ہندی الفاظ اور مخصوص ہندی ساختیں برتتا تھا، مقامی رنگ میں اپنے کلام کو رنگتا ہے، ایسے تلمیحات اور کنایوں کا استعمال کرتا ہے جو ہندوستان سے متعلق ہیں، فارسی الفاظ کو ہندی کا جامہ پہناتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا میں ہندی القاب برتتا ہے ہندوؤں کے بھاندوں اور نہ دستانی داستانوں کو ہندوؤں کی رزمیہ شاعری سے مستعار لیتا ہے، عورت کی محبت کو جو اسے مرد سے ہوتی ہے خوب سراہتا ہے، اس کی شاعری اُس سوقیانہ پن اور بدمذاقی سے مبرا ہے، جو مابعد کے اردو شعرا میں پائی جاتی ہے، مگر وہ فارسی کو بالکل بھول نہیں جاتا۔ اور اس سے بحور اصناف شاعری، الفاظ، محاورات، ساختیں، خیالات، تشبیہات، اور استعارات مستعار لیتا ہے علمیت بگھارنے یا دکھا دے کی غرض سے وہ عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار نہیں کرتا بلکہ جس طرح وہ روزمرہ استعمال میں آتے ہیں اُسی طرح بے تکان اُن کا استعمال کرتا ہے، بغیر اس بات کی پرواکئے کہ آیا ان کا استعمال از روئے صرف صحیح ہے یا نہیں، زبان کی کھنگی اور ایسی عجیب و غریب ساختوں اور الفاظ کی موجودگی جو اب مدت دراز سے متروک ہو چکے ہیں، دکھنی شاعری کا مطالعہ کرنے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کر رہی ہے اور ابھی عرصہ دراز چاہیئے کہ قطب شاہ اپنی جائز جگہ حاصل کرلے اور لوگ اس کے کلام کو اچھی طرح سمجھنے لگیں۔

قطب شاہ ہی سب سے پہلا شخص ہے جس نے ادبی حیثیت سے کسی قدر اہمیت حاصل کی ہے جس نے بہت کچھ لکھا ہے اور خوب ہی لکھا ہے، جس نے ادبی زبان کے اعتبار سے اُردو کی اہلیت کا علمی ثبوت پیش کیا ہے جس نے شریفانہ علم ادب کی بنا ڈالی اور جس نے اپنے سے بڑے شعرا کی آمد کو پہلے سے پہچان لیا۔ ان امور کے لحاظ سے وہ اس قابل ہے کہ اُس کا شمار اردو شاعری کے قابل ذکر بانیوں میں کیا جائے۔

سلطان محمد قطب شاہ، سلطان قلی قطب شاہ کا برادرزادہ اور جانشین تھا، وہ گولکنڈہ میں سنہ ۱۵۹۱ء میں پیدا ہوا تھا اُس کی شادی اُس کی چچازاد بہن سلطان قلی قطب شاہ کی دختر نیک اختر سے ہوئی، وہ انتہائی درجہ کا مذہبی آدمی تھا اور اپنی زندگی کے دن بالکل احکام مذہب کے مطابق صرف کرتا تھا، وہ بہت فیاض اور فن تعمیر کا بیحد مشتاق تھا۔ مشہور عمارتوں میں الٰہی محل جامع مسجد جو عام طور سے مکہ مسجد کے نام سے مشہور ہے، محمدی محل، ڈنل محل وغیرہ اُس کی تعمیر کردہ ہیں، وہ نظم و نثر دونوں میں کامل دستگاہ رکھتا تھا اور دکھنی اور فارسی دونوں

ہر عطر اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ سے ملتا ہے۔

زبانوں میں شعر کہتا تھا، دو دیوان اُس کی یادگار رہ گئے ہیں، ایک دکھنی میں اور دوسرا فارسی میں جو شاعری کی تمام اصناف پر مشتمل ہیں۔ فارسی میں ظل اللہ تخلص کرتا تھا اور اردو میں قطب شاہ۔ موخرالذکر تخلص کی وجہ سے ایک گونہ دھوکا ہو جاتا ہے کیونکہ اُس کا پیشرو قطب علی شاہ بھی فارسی لکھتے وقت یہی تخلص برتتا تھا۔ سلاست، سادگی اور لطافت اُس کی شاعری کی نمایاں خصوصیات شمار کی جاتی ہیں۔

عبداللہ قطب شاہ ——— سلطان محمد قطب شاہ کا فرزند تھا۔ اور حیدرآباد میں گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کا چھٹا سلطان تھا سنہ ۱۶۱۴ء میں پیدا ہوا اور اپنے باپ کی موت کے بعد جو سنہ ۱۶۲۵ء میں واقع ہوئی تخت پر متمکن ہوا، اس نے اپنے تئیں شاہجہاں کا باجگذار تسلیم کر لیا اور سالانہ معتد بہ رقم بطور خراج دیکر خود کو اُس کی حفاظت میں دیدیا سنہ ۱۶۵۶ء میں اس پر شاہی عتاب نازل ہوا، اور شاہزادہ اورنگ زیب نے جو اس وقت دکن میں شاہی علاقہ جات کا گورنر تھا۔ سلطان کے طرز عمل سے رنجیدہ ہو کر حیدرآباد پر دھاوا بول دیا اور قبضہ کر کے اُسے تاراج و برباد کر ڈالا۔ بعد ازاں عبداللہ نے سر تسلیم خم کر دیا اور نہایت ہی ذلت آمیز شرائط صلح کو قبول کر لینا گوارا کیا۔ اس واقعہ کے بعد سے اُس کی حیثیت سلطنت مغلیہ کے ماتحت صوبہ کی سی ہو گئی، بہرحال وہ بھی علوم و فنون اور بالخصوص علم ادب کا مربی تھا اور اُس کا محلات بنانے کا شوق خبط کے درجہ تک پہنچ گیا تھا۔ ایران اور عرب کے فضلا اور قابل اشخاص اُس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے اور وہ ان سب پر فیاضانہ داد و دہش کرتا رہتا تھا۔ اکثر مصنفین نے اپنی تصانیف اس کے نام پر معنون کی ہیں، ایسی کتابوں میں برہان قاطع اور لغات فارسی قابل ذکر ہیں، وہ فارسی اور دکھنی دونوں زبانوں میں شعر کہا کرتا تھا اور عبداللہ تخلص کرتا تھا، اس نے ریختہ اور فارسی میں کئی دیوان چھوڑے ہیں اس کے اشعار میں بے ساختہ پن آمد اور لطافت پائی جاتی ہے، آصفی بلکہ پوری نے اپنے تذکرہ "شعرائے دکھن" میں دکھنی زبان کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں۔

اس کے دور میں ایک اہم دکھنی شاعر گذرا ہے جس کا نام ابن نشاطی تھا اُس کی زندگی کے حالات کے متعلق سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ وہ دکھنی مثنوی موسومہ "پھول بن" کا مصنف ہے، یہ ایک عشقیہ قصہ ہے جس کا نام ہیروئن کے نام پر رکھا گیا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسی فارسی مثنوی "بساتین" کا ترجمہ ہے اس میں اسکندر اور نجمین کا قصہ درج ہے، اور اس میں ایک خیالی شہر کنچن پٹن (سونیکا شہر) کا ذکر ہے جسے مشرق کی سرزمین کوکین[۱] سمجھنا چاہیئے۔

غواصی نے شاہ مصر کے بیٹے سیف الملوک کی داستان تحریر کی ہے جس کی ماں بدیع الجمال تھی مصنف جس کا صرف تخلص ہی معلوم ہے باعتبار مذہب شیعہ تھا اور عبداللہ قطب شاہ کے دربار سے وابستہ تھا۔ یہ دلچسپ داستان عشق غالباً الف لیلہ کے فارسی ایڈیشن کی کسی کہانی سے ماخوذ ہے، ابتدا میں حمد و نعت کے بعد چاروں خلفا اور اولیا کی منقبت اور گولکنڈہ کے حکمراں بادشاہ کی مدح کی گئی ہے، شاعر نے پہلی نظم کے اٹھارویں شعر میں اپنا نام بھی نظم کیا ہے، وہ مثنوی طوطی نامہ کا بھی مصنف ہے جسے سر چارلس لائل نے غلطی سے ابن نشاطی سے نسبت دی ہے۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں ان کہانیوں کا ضیا نخشبی کے فارسی طوطی نامہ سے ترجمہ ہوا تھا، تمہید میں اُس شہنشاہ کی بیحد تعریف و توصیف کی گئی تھی۔ یہ کتاب درحقیقت ماخوذ ہے سنسکرت کی کتاب سوکا سپتتی سے اور یہی وہ کتاب ہے جس نے

---

[۱] اس سے مراد ایک خیالی شہر ہے جہاں رہنے والوں کو کچھ کام کاج نہیں کرنا پڑتا اور ہر وقت عیش رہتا ہے۔

بعد ازاں فورٹ ولیم اسکول کے ایک ابتدائی مصنف حیدر بخش کی تصنیف کے لئے مسالہ بہم پہنچایا۔ حیدر بخش کے مشہور معروف طوطی نامہ کا سن تصنیف سنہ ۱۸۰۱ء ہے۔ غواصی نے اس مثنوی کے ایک مصرعہ میں اپنا نام ظاہر کر دیا ہے اور یہ مصرعہ ہر کہانی کے آخر میں دہرایا گیا ہے تاریخ تصنیف حسب الہ خاتمہ سے ظاہر ہے سنہ ۱۰۴۹ھ (یکم رجب سنہ ۱۶۳۹ء) ہے

تحسین الدین نے جو ممکن ہے کہ اسم معروف ہو یا تخلص۔ عزلتی لقب ہو۔ قصۂ کامروپ و کلا کے نام سے تقریباً اس زمانہ میں ایک مثنوی لکھی ہے ہیروئن کلا سیلون کے بادشاہ کی لڑکی ہے اور کامروپ (ہیرو) اودھ کے بادشاہ کا بیٹا ہے وہ خواب میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور الف لیلہ میں چین کی جس شاہزادی کا ذکر ہے، اس کی طرح وہ فوراً ایک دوسرے پر عاشق ہو جاتے ہیں، کامروپ اس کے بعد میں اپنی محبوبہ کی تلاش میں نکلتا ہے اور بیشمار مصائب بھگتنے اور غیر ممالک میں بہت زیادہ سیاحت کرنے کے بعد وہ بالآخر اپنی محبوبہ سے جا ملتا ہے اس سے عقد کر لیتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ یہ تصنیف مصنف کے زور دماغ کا نتیجہ ہے تاہم داستان میں جن اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کے سب ہندو ہیں۔ یہ مثنوی گارسن دی تاسی نے "سرگذشت کامروپ" کے نام سے سنہ ۱۸۳۵ء میں شایع کر دی ہے یہ بات دلچسپی سے پڑھی جائے گی کہ مشہور عالم جرمن شاعر گیٹے نے جب اس کتاب کا ترجمہ پڑھا تو کہا کہ اس سے مجھے بیحد مسرت حاصل ہوئی ہے۔

گولکنڈہ کا آخری تاجدار اگرچہ عیاش مزاج اور کاہل تھا، تاہم نہایت تعلیم یافتہ تھا اور ادبا و فضلا کا قدر دان ہونے کے علاوہ خود بھی باکمال شاعر تھا، تانا شاہ تخلص کرتا تھا، خیال یہ ہے کہ اس کا صرف ایک شعر باقی رہ گیا ہے۔ جسے لطف نے اپنے تذکرہ موسومہ "گلشن ہند" میں درج کر دیا ہے، وہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا، اور اس کی وفات پر تخت پر متمکن ہوا، اورنگ زیب نے سات ماہ کے محاصرہ کے بعد گولکنڈہ پر سنہ ۱۶۸۷ء میں قبضہ کر لیا اور اسے سلطنت مغلیہ میں ملا دیا۔ اس وقت ابوالحسن قید کر لیا گیا اور اس کی باقیماندہ عمر حالت قید ہی میں کٹی۔ وہ تمباکو نوشی کا بیحد عادی تھا۔ اور زمانہ قید میں بھی تمباکو نوشی کی خاص طور پر اجازت حاصل کر لی تھی۔

اس سلطان کے دربار میں بہت سے شعرا بھی تھے جن میں طبائی بھی تھا جو قصۂ بہرام و گلبدن کا مصنف ہے۔ یہ دیو پری کی کہانی ہے، اور فارسی سے ماخوذ ہے، مصنف کے حالات پردۂ اخفا میں ہیں، اس مثنوی میں ۳۴۰۰ اشعار ہیں اور سنہ ۱۶۷۰ء میں معرض تحریر میں آئی تھی۔ یہ کتاب شاہ ابوالحسن والی گولکنڈہ کے نام پر معنون ہوئی ہے۔

دربار بیجاپور بھی قریب قریب اسی ترقی یافتہ حالت پر تھا اور اپنی علمی فیاضی اور علم ادب کی سرپرستی کے لئے خاص طور سے مشہور تھا، ابراہیم عادل شاہ ثانی کو فن تعمیر سے خاص لگاؤ تھا اور وہ ادبا و فضلا کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ فارسی زبان کا مشہور معروف شاعر ظہوری جو بیجاپور میں سنہ ۱۵۸۰ء میں وارد ہوا اور جس کا سنہ ۱۶۱۶ء میں انتقال ہوا، اسی دربار میں رہ کر معراج شہرت کو پہنچا ہے۔ اس نے اپنی دو تصانیف خوان خلیل اور گلزار ابراہیم کو ابراہیم عادل شاہ سے منسوب کیا اور ابراہیم عادل شاہ کی تصنیف نورس کے لئے تین دیباچے تحریر کئے جنھیں فارسی نثر کا معرکۃ الآرا کارنامہ سمجھا جاتا ہے، فارسی کے دو اور شعرا میر سنجر اور ملک قمی بھی اسی دربار سے وابستہ تھے۔

ابراہیم عادل شاہ نے ہندی نظم میں موسیقی پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام اس نے نورس رکھا تھا۔

علی عادل شاہ ثانی والی بیجاپور بھی اپنے دربار کو علما و فضلا سے معمور رکھتا تھا، اس کے پر امن عہد حکومت میں مرہٹوں کے مشہور لیڈر سیواجی

نے علمِ بغاوت بلند کرکے نہ صرف کئی قلعوں پر قبضہ کرلیا، بلکہ بیجاپور کے جرنل افضل خاں کو بھی قتل کر ڈالا۔ اُس کے عہد حکومت میں (سنہ ۱۶۵۶ء تا سنہ ۱۶۷۲ء) نصرتی بہت مشہور شاعر ہو گزرا ہے اس کا نام محمد نصرت تھا، وہ کرناٹک کا رہنے والا تھا لیکن بچپن ہی سے اپنی ساری عمر اور زندگی کا بیشتر حصہ میں گذار دی طویل زمانہ بسر کیا۔ وہ بیجاپور میں آیا، اور علی عادل شاہ کے دربار میں منصب دار بن گیا، اور رفتہ رفتہ یہاں تک ترقی کی کہ بادشاہ کا مشیر بن گیا سنہ ۱۰۷۶ھ (مطابق سنہ ۱۶۶۵ء) میں اس نے ایک رزمیہ مثنوی موسومہ علی نامہ تحریر کیا جس میں علی عادل شاہ ثانی کے عہد کے واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اور جس میں اُس نے اپنے آقا اور ولی نعمت کی نہایت درجہ تعریف کی ہے اس میں چند قصائد اور مطلع بھی ہیں جو تعریفی بند لئے ہوئے یہ دکھنی زبان کی پہلی نظم ہے جو کسی بادشاہ کی تعریف میں لکھی گئی ہے۔ علی عادل شاہ نے نصرتی کو ملک الشعرا کا خطاب دیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اس عزت کا بجا طور پر مستحق تھا، اُس نے دکھنی میں گلشنِ عشق کے نام سے ایک اور بھی مثنوی لکھی ہے جس کا سن تصنیف (سنہ ۱۰۶۸ھ / سنہ ۱۶۵۷ء) ہے۔ اس میں سوبیج بھانو کے صاحبزادے کنور منوہر اور مدمالتی کے حسن و عشق کا افسانہ پیش کیا گیا ہے۔ اس مثنوی پر مختلف مصنفوں نے پرانے طریقہ پر بہت کچھ خامہ فرسائی کی ہے، اور اس کے بہت سے نسخے ابھی تک موجود ہیں، داستان کی ابتدا طویل تمہید سے کی گئی ہے جس میں مصنف کے مربی کی بھی مدح و ثنا شامل ہے، اُس نے گلدستۂ عشق بھی سنہ ۱۶۵۸ء اور سنہ ۱۶۷۲ء کے درمیان تحریر کیا۔ جو دکھنی غزلوں اور عشقیہ نظموں کا اچھا خاصہ مجموعہ ہے، جسے اُس نے اپنے ممدوح سلطان کے نام معنون کیا تھا۔ نصرتی نے سنہ ۱۰۹۶ھ (سنہ ۱۶۸۵ء) میں انتقال کیا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا وہ برہمن تھا جیسا کہ سر چارلس لائل نے بیان کیا ہے، وہ دراصل سُنی تھا اور شاہ بندہ نواز، گیسو دراز کے خاندان سے بیعت تھا، وہ کئی جگہ اپنے پیر روشن ضمیر کی بھی تعریف کرتا ہے۔ اس کی نظمیں اگرچہ قدیم زبان میں لکھی گئی ہیں جو اب بہت کچھ متروک ہوگئی ہے اور جس کا سمجھنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ تاہم اُن میں سلاست، آمد اور روانی پائی جاتی ہے۔

نصرتی کا ایک ہمعصر جو عہد علی عادل شاہ ثانی کے زمانہ میں تھا ہاشمی تخلص کرتا تھا جو شاہ ہاشم ساکن بیجاپور کا اختیار کردہ نام ہے۔ بدقسمتی سے وہ مادر زاد اندھا تھا لیکن بلا کا ذکی و ذہین تھا، وہ ہندی زبان میں اعلیٰ درجہ کے اشعار کہا کرتا تھا، اُس نے دکھنی زبان میں یوسف و زلیخا کے قصے کو نظم کیا ہے، اُس کے کلام سے صاف طور پر بھاشا کا اثر نظر آجاتا ہے، کیونکہ وہ جابجا ایہام یعنی ذو معنین کی صنعت برتتا ہے اور فارسی شاعری کے برعکس عورت کو عاشق قرار دیتا ہے اس کے کلام سے یہ بھی پایا جاتا ہے کہ اس نے ریختی کی بھی بنیا ڈالی تھی، اس کا سن وفات سنہ ۱۱۰۹ھ (سنہ ۱۶۹۷ء) ہے۔ دکھنی شعرا کے سلسلہ میں دولت کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے جس نے سنہ ۱۶۴۰ء میں قصہ شاہ بہرام و بانو حسن تحریر کیا ہے جو ایران کے ایک بادشاہ بہمن اور ایک خوبصورت پری بانو کا قصہ ہے اور بصورت مثنوی تحریر کیا ہے اس میں دیو سفید کے شہر میں بہرام گور کے عجیب و غریب واقعات دکھائے گئے ہیں نیز بانو حسن کے ساتھ جو پری ہونے کے باوجود شاہی باغات میں اکثر آمد و رفت رکھتی تھی اس کے حسن و عشق کے تعلقات دکھانے کے بعد اُن کی شادی کا حال تحریر کیا گیا ہے۔ فیضی جس کے حالات زندگی کچھ بھی معلوم نہیں چین کے بادشاہ رضوان شاہ اور پری شہزادی روح افزا کی داستان کا مصنف ہے، اس مثنوی کی تکمیل سنہ ۱۰۹۴ھ سنہ ۱۶۸۳ء میں ہوئی یہ کتاب ایرانی نثر سے ماخوذ ہے۔

محمد حفیظ سید بی۔اے

انشاپرداز خواتین پر بیجا حملہ

ماہ جون کے نگار میں جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی نے چند انشاپرداز خواتین کی شاعری اور مضمون نگاری پر نہایت بیدردی اور بے انصافی سے دل کھولکر نکتہ چینی فرمائی ہے۔ جناب موصوف فرماتے ہیں کہ "حیا عورت کا زیور ہے اور جس عورت میں حیا نہیں وہ عورت کے معزز لقب کی مستحق نہیں" اور وہ چند انشاپرداز خواتین پر اس لئے آگ برسانے کے لئے تیار ہیں کہ ان کے اشعار اور مضامین صفت حیا سے معرا نظر آتے ہیں" جناب ممدوح کا یہ بھی خیال ہے کہ زنانہ لٹریچر کو مردانہ لٹریچر کی ہمسری کرنیکا کوئی حق نہیں، یعنی زنانہ لٹریچر حیا سے رنگین سے رنگین ہونا چاہیئے، اور مردانہ لٹریچر میں اگر رندی، بیخودی، سرمستی اور آزادی ہو تو کوئی مضائقہ نہیں، میں حیران ہوں کہ افسر صاحب یہ عجیب و غریب ادبی اصول کس دنیا سے قرض لے آئے ہیں اور یہ حیرت انگیز کلیہ انھوں نے کس شریعت کی بنیاد پر قائم کیا ہے، کیا حیا کے لئے عورت ہی مکلف ہے مرد نہیں؟ کیا حیا عورت کا زیور ہے اور بیحیائی مرد کا طرۂ امتیاز ہے؟ کیا مضامین اور اشعار کی عریانی عورت کے لئے باعث ذلت، اور مرد کے لئے مایۂ افتخار ہے، ممکن ہے کہ مردوں کے بنائے ہوئے یکطرفہ قوانین اور موجودہ نقطۂ نظر کے لحاظ سے افسر صاحب کے ان خیالات کی تائید ہوسکے مگر میں بلاخوف تردید یہ دعویٰ کرسکتا ہوں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے انعا۔ پرہیزگاری۔ نیک چلنی خوش اطواری کی طرح حیاداری بھی مردوں کے لئے اسی قدر ضروری اور لازمی ہے جس قدر کہ عورت کے لئے۔ اسلام کے اخلاقی قوانین مرد اور عورت کے لئے یکساں ہیں۔ وہ مرد کے لئے بیحیائی عورت کے لئے حیاداری، مرد کے لئے رندانہ زندگی اور عورت کے لئے زہد و تقویٰ، مرد کے لئے بدکاری اور عورت کے لئے پرہیزگاری روا نہیں رکھتے۔ مساوات پسند اسلام کو ہرگز ایسی بیجا تفریق گوارا نہیں۔ جو صاحب یہ فرماتے ہیں کہ جس عورت میں حیا نہیں، وہ عورت کے معزز لقب کی مستحق نہیں، ان سے پوچھنا چاہیئے کہ جس مرد میں حیا نہیں کیا وہ مرد کے معزز لقب کا مستحق ہے؟ اسلامی اخلاق اور تہذیب کے مسلمہ قوانین کے مطابق تو بیحیا مرد ایسا ہی قابل نفرت ہے جیسی کہ ایک بیحیا عورت۔ لہذا اگر کسی انشاپرداز خاتون کے کسی شعر یا مضمون پر افسر صاحب بیدردی سے نکتہ چینی کرسکتے ہیں تو پھر انشاپرداز مردوں کے اشعار اور مضامین پر بھی اسی نقطۂ نظر سے کہیں زیادہ بیدردی سے نکتہ چینی ہوسکتی ہے اور اس کو اپنی صفائی میں یہ کہنے کا حق ہرگز نہ ہوگا کہ "ہم مرد ہیں اس سے ہمیں بیحیائی کرنیکا خداداد استحقاق حاصل ہے" پس اگر افسر صاحب کو اعتراض ہی کرنا تھا تو دور حاضر کے لٹریچر پر اعتراض کرتے۔ اس کی خامیاں اور خرابیاں دکھاتے، اس کی عریانی، اور بے حیائی پر لعن طعن کرتے۔ جناب ممدوح نے چند بدقسمت خواتین کو مشق ستم کے لئے کیوں چن لیا؟ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر مرد شاعری یا فسانہ نگاری کرے تو اسے تو شراب و کباب نغمہ و رباب۔ حسن و عشق وصل و ہجر گل و بلبل۔ زلف و کاکل پر جدت طرازیاں کرنیکا پورا حق دیا جائے اور اگر عورت شاعری یا فسانہ نگاری کی جرأت کرے تو اسے بجز فقہ اور دینیات کے پیچیدہ مسائل وضو کے طریقے حج اور قربانی کے فرائض۔ تیمم کے دلچسپ قاعدے بیان کرنے کے اور کسی مضمون پر قلم اٹھانے کی اجازت نہ دی جائے، یہ کس طرح جائز

ہے کہ اگر ناول میں مرد حسن و عشق کے تمام راز ہائے سربستہ کھول کر پبلک کے سامنے رکھ دے تو اُس کی تعریف سے کرۂ زمین کا کونہ کونہ گونج اُٹھے اور اگر عورت سے یہ گناہ سرزد ہو تو اسے صرف اس لئے سنگسار کیا جائے کہ وہ عورت ہے، جن اقتباسات کا افسر صاحب نے اپنے مضمون میں حوالہ دیا ہے اور انہیں حیا سوز قرار دیکر خوب بُرا بھلا کہا ہے اُن میں سے کوئی عبارت ایسی نہیں جس سے زیادہ حیا سوز عبارتیں مشہور ترین ناول نویسوں کی تصانیف سے پیش نہ کی جا سکتی ہوں۔ اُن میں سے کوئی شعر ایسا نہیں جس سے زیادہ شرمناک اور عریاں اشعار بہترین شعراء کے کلام اور اُن کے دیوانوں میں نہ مل سکتے ہوں، مگر میں اُن کا حوالہ اس مضمون میں مناسب خیال نہیں کرتا، پھر ان بیچاری انشاپرداز خواتین نے دنیا کو ایسا کیا نقصان پہنچا دیا جس کی وجہ سے اُن پر تو آگ اُگلی جائے اور عریانی پسند مردوں پر پھول برسائے جائیں، یہ تو مردوں کی اسی ذہنیت کا ایک نمونہ ہے جو مرد کے لئے بے اندازہ آزادی اور عورت کے لئے انتہائی قیود روا رکھتی ہے جو مرد کی بدترین بدکاریوں سے چشم پوشی کرتی ہے، اور عورت کی ذرا سی لغزش پر اُسے گردن زدنی قرار دیتی ہے، بقول جناب اکبر ؎

هم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ افسوسناک ذہنیت آج کل کے رسم و رواج کے اصنام کی پرستش اور اسلام کی مساوات پسند شریعت سے گریز کا دردناک نتیجہ ہے افسر صاحب کی بے محل برافروختگی بھی اسی قسم کی ذہنیت کی کرشمہ سازی ہے، علاوہ اس کے ہمکو افسر صاحب سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ انھوں نے فنِ شاعری اور فنِ فسانہ نگاری کی اصل ماہیت اور حقیقی مقاصد پر مضمون لکھتے وقت نظر غائر نہیں ڈالی، ہر نقاد کو جو شاعری یا فسانہ نگاری پر رائے زنی کرے، کم از کم یہ نہ فراموش کر دینا چاہیئے کہ شاعر یا مصور یا ڈرامائسٹ یا ناولسٹ انسانیت کا بہترین نمائندہ اور انسانی جذبات خیالات اور تجربات کا روشن ترین آئینہ ہوتا ہے قاعدے سے اُس کی شخصیت کو اُس کے فن میں داخل نہ ہونا چاہیئے بلکہ اُسے اپنی شخصیت کو انسانیت کے جذبات و خیالات میں فنا کر دینا چاہیئے اُس کو محض فطرت اور انسانیت کا ایک ایسا جاندار آئینہ ہونا چاہیئے جس میں ہر ذہنیت ہر مزاج ہر طبیعت کا شخص اپنے مختلف حالات میں پیدا ہونے والے مختلف جذبات اور خیالات کا خوبصورت عکس دیکھ سکے، اُس کو اُن جذبات کا اظہار کرنا چاہیئے جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں مگر جن کو وہ شاعر مصور یا ناولسٹ نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر نہیں کر سکتا، اس میدان میں قدم رکھنے کے قبل اس کو اپنی شخصیت باہر چھوڑ آنا چاہیئے۔ اسی وجہ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاعر، مصور، ناولسٹ، ڈرامائسٹ کی کوئی جنس یا شخصیت نہیں ہوتی نہ وہ مرد ہوتا ہے نہ عورت وہ صرف ایک آئینہ ہوتا ہے جس میں ہر انسان اپنی صورت دیکھ لے۔ لہٰذا ہر شعر یا فسانے کو بطور ایک شعر یا فسانے کے دیکھنا چاہیئے، اس کا لحاظ نہ کرنا چاہیئے کہ شاعر یا فسانہ نگار کون ہے وہ مرد ہے یا عورت، بڈھا ہے یا جوان، شادی شدہ ہے یا کنوارا، دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس شعر یا فسانے میں مناظر فطرت یا جذبات انسانی کی کس حد تک اور کس خوبصورتی یا کامیابی کے ساتھ عکاسی کی گئی ہے، اور جس قدر شاعر یا ناولسٹ کو اس مقصد میں کامیابی ہوئی ہوگی، اُسی قدر وہ اپنے فن میں کامل ہوگا، چنانچہ شیکسپیر اور ٹیگور کو ادبی دنیا میں اس درجہ عروج اور مقبولیت صرف اسی سبب سے حاصل ہے کہ وہ انسانی جذبات کے بہترین مصور ہیں، اور اُن کی تصانیف میں انسانی جذبات و خیالات اپنی پوری دلفریبی اور رعنائی کے ساتھ جلوہ نما ہیں، جس وقت زیب النساء دنیا کے اسٹیج پر شاعرہ کا سوانگ بھر کر آئے اُس وقت دیکھنے

والوں کو یہ بھول جانا چاہیئے کہ وہ ایک کنواری لڑکی ہے ان کو اس کی تحقیقات کرنے کا کوئی حق نہیں کہ اس کا مخاطب کون ہے، انہیں صرف اسکے اشعار کی لطافت اس کے خیالات کی ندرت پر وجد کرنا چاہیئے، جس وقت ہندوستان کی بلبل ہزار داستان مسز سروجنی نائڈو رموز حسن و عشق بیان کرتی ہوئی شاعری کے میدان میں قدم رکھے تو ہمیں اس کی پرستش محض بطور ایک شاعرہ کے کرتی چاہیئے۔ یہ فراموش کردینا چاہیئے کہ وہ ایک شادی شدہ خاتون ہے اس کی تحقیقات نہ کرنا چاہیئے کہ اس کا روئے سخن مسٹر نائڈو کی طرف ہے یا کسی اور کی طرف ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے اور ہر انسان کے دلی جذبات وخیالات حسن ومحبت کے مختلف حالات تجربات اور رموز وہ اپنی زبان سے کس سچائی اور کس خوبصورتی کے ساتھ ادا کر رہی ہے، فن نقادی کا یہ بالکل غلط اور مہمل اصول ہے کہ اگر کوئی شعر حافظ یا ٹیگور کی زبان سے نکلے تو اس پر واہ وا ہو اور اگر وہی شعر زیب النسا یا سروجنی کی زبان سے ادا ہو تو افسر صاحب کی طرح ہم انہیں بے حیائی کے فرضی جرم پر سولی کا حکم لگا دیں، ایسا طرز عمل نہ صرف خلاف انصاف ہے بلکہ خلاف عقل بھی ہے۔

ایشیا اور یوروپ۔ مغرب اور مشرق میں مردانہ اور زنانہ لٹریچر میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ میری کارلی اور ایچ جی ولز، زیب النسا اور حافظ شیرازی سروجنی اور ٹیگور کی تصانیف پر تنقید وتبصرہ کرتے ہوئے اس امر کا ہرگز لحاظ نہیں کیا جاتا کہ ایک حضرت حوا کی لڑکی اور دوسرا حضرت آدم کا لڑکا ہے، مرد کی تصانیف کے لئے ایک معیار اور عورت کی تصانیف کے دوسرا معیار نہیں ہوتا، اگر کوئی شعر یا فسانہ یہ لحاظ فن کے غیر ضروری طور پر عریاں ہے تو عام اس سے کہ وہ مرد کا ہو یا عورت کا اس پر جس قدر سختی سے بھی نکتہ چینی ہو کم ہے کیونکہ بے حیائی اور عریانی نہ مرد کو زیبا ہے نہ عورت کو، مگر کسی نظم یا فسانے کو صرف اس لئے حیا سوز نہیں کہہ سکتے کہ وہ کسی عورت کی تصنیف ہے حالانکہ اگر اس کا ذمہ دار کوئی مرد ہوتا تو اسے کوئی حیا سوز اور عریاں نہ سمجھتا۔ میرے خیال میں یا تو جس طرح حق فراموش مردوں نے عورتوں کو کمزور پاکر ان پر جائز آزادی کے دروازے بند کردیئے ہیں اسی طرح فسانہ نگاری اور شاعری کے بھی دروازے ان پر بند کردیے جائیں یا اگر ان کو شاعری یا فسانہ نگاری کی اجازت دیجاتی ہے تو ان کو بھی وہی حقوق آزادی ملنی چاہیئے جو ایک شاعر یا ناولسٹ کو دنیا نے مسلمہ طور پر دی ہے۔

یہ مصنوعی شرم اور جھوٹی حیا ہے کہ اگر عورت رموز حسن وعشق کی مصوری کرے تو حیا کے دیوتاؤں کو شرم آجائے اور اگر مرد کسی بدمست شرابی کی طرح ہذیان بکے تو حیا کے دیوتا اس پر بیخودی میں جھومیں اور رقص کریں یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اگر مرد ننگے پھریں تو کوئی حرج نہیں اور اگر کسی عورت کا دوپٹہ باوجود احتیاط کے کبھی ذرا سر سے ڈھلک جائے تو اس پر ایک چھوٹی موٹی قیامت برپا کردی جائے۔

افسر صاحب نے اپنے آتش فشاں مضمون میں ایک دلچسپ غلطی بھی کی ہے کہ فسانے یا شعر میں جن حالات اور جن خیالات کا اظہار ہے ان کو انہوں نے مصنفہ کے تجربات کا روزنامچہ تصور کیا ہے۔

فن تنقید کا ہر مبتدی جانتا ہے کہ اشعار میں جو کچھ شاعر کہتا ہے وہ اس کے ذاتی تجربات اور مشاہدات نہیں ہوتے اور ناول میں جو کچھ ہر ایک کریکٹر کی زبان سے خیالات کا اظہار ہوتا ہے وہ ناولسٹ کے ذاتی خیالات نہیں ہوتے، بلکہ وہ وہی خیالات ہوتے ہیں جو اس مخصوص کریکٹر کی زبان سے ادا ہونا چاہیئے۔ مثلاً فسانے سے جو اقتباسات افسر صاحب نے کئے ہیں وہ بظاہر کسی آزاد خیال بیباک اور شوخ طبع لڑکی کی ڈائری یا سوانحعمری کے اجزا معلوم ہوتے ہیں۔

گو اخترؔ صاحب نے غالباً مصلحتاً یہ ظاہر کرنا نہیں چاہا کہ قصہ کیا ہے، کس سلسلہ میں وہ عبارت پائی جاتی ہے، اور جس لڑکی کی زبان سے وہ الفاظ ادا ہوئے ہیں اُس کا کیا کریکٹر دکھایا گیا ہے، ایک آزاد خیال شوخ طبع اور بیباک لڑکی سے ایسے ہی خیالات اور جذبات کی امید کی جا سکتی ہے، تقاضائے فسانہ نگاری یہی ہے کہ وہ اسی قسم کی باتیں کرے، اور ایسی ہی حرکتیں اس سے سرزد ہوں، اس لڑکی سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ حضرت محی الدین، ابن عربی یا امام فخر رازی کے فلسفے پر لکچر دے ایک ایسی دردانگیز ستم ظریفی ہوگی جس کے جواز کیلئے ہمیں مجبوراً اخترؔ صاحب کی انقلاب پسند ادبی شریعت ہی سے مدد لینا پڑیگی۔ اخترؔ صاحب کو ان حرکات اور خیالات کا الزام مصنفہ پر نہ لگانا چاہیئے ورنہ پھر ہمیں شیکسپیئر کو آئیگو کی نفرت انگیز مکاریوں اور لوکریشیا کی آبروریزی کا مجرم قرار دینا پڑیگا۔ - - - - - - - - - - - -

اور صرف شیکسپیئر . . . . پر کیا موقوف ہے دنیا کے تمام شعراء اور ناول نویسوں کا بھی نام بدمعاشوں کے رجسٹر یا جرائم پیشہ قوموں کی فہرست میں فوراً درج کرا دینا ہر نقاد کا بعد نماز کے پہلا فرض ہوگا۔ اخترؔ صاحب کے اقتباسات میں سے ایک شعر یہ بھی ہے جس پر وہ سخت برہم ہیں ؎

دو رعبِ حسن تھا غالب بوقتِ دیدِ جمال
ہم اپنا حال اشاروں سے بھی بتا نہ سکے

اگر یہ شعر اخترؔ صاحب کے ادبی مذہب کو حیاسوز نظر آتا ہے تو زیب النساء کی اس مشہور رباعی پر وہ کیا حکم لگائیں گے ؎

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد — کور بہ چشمے کہ لذت گیرِ دیدارے نشد
صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت — غنچۂ باغِ دلِ من زیبِ دستارے نشد

اور ان اشعار پر زیب النساء کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے ؎

کارِ معشوقاں نمک بر زخمِ پنہاں ریختن — کارِ عاشق خونِ خود در پائے جاناں ریختن

حجابِ نو عروساں در برِ شوہر نمی ماند — اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمی ماند

گرچہ من لیلیٰ اساسم دل چو مجنوں در نواست — سر بصحرا می زنم لیکن حیا زنجیرِ پاست

بلبل از گل بگذرد گر در چمن بیند مرا — بت پرستی کے کند گر برہمن بیند مرا
در سخن پنہاں شدم چوں بوئے گل در برگِ گل — ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اور اس قسم کے سیکڑوں اشعار ہیں جو صرف زیب النساء ہی نے نہیں بلکہ اور نامور مومنین نے بھی کہے ہیں۔ اخترؔ صاحب ایسے ادبی ابن سعود کو ان حیاسوز اشعار پر ان خواتین کی کوئی سخت سزا تجویز کرنا چاہیئے۔ تعجب ہے کہ زیب النساء وغیرہ دار پر کیوں نہیں چڑھائی گئیں۔ شاید اس زمانہ میں اخترؔ صاحب کا زن افگنی فلسفہ رائج نہ تھا!!!

افسر صاحب فرماتے ہیں :-

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس قسم کے عریاں جذبات کے اعلان سے ہماری انشا پرداز خواتین کا کیا مقصد ہو سکتا ہے"

اس کے جواب میں غیب سے ندا آتی ہے کہ :-

"ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتا کہ آخر اس قسم کے عریاں جذبات کے اعلان سے ہمارے انشا پرداز مردوں کا کیا مقصد ہو سکتا ہے"

عورتوں کا بھی غالباً وہی مقصد ہوگا جو مردوں کا ہوتا ہے ؛

میں نہایت ادب کے ساتھ دریافت کرتا ہوں کہ نوجوان مرد جن کی شادیاں نہیں ہوئی ہیں جب اپنے اشعار رسالوں میں شایع کراتے ہیں تو انکا مخاطب کون ہوتا ہے ؟ اور ان عریاں جذبات کے اعلان سے اُن کا کیا مقصد ہوتا ہے ؟ کیا یہ نوجوان ہندوستان کی نوعمر لڑکیوں کو بقول افسر صاحب دعوت عشق نہیں دیتے ؟ پھر ان نوجوانوں کی افسر صاحب سرکوبی کیوں نہیں کرتے ؟ اور جن حضرات کی شادیاں ہو گئی ہیں (خاص کر سن رسیدہ اور سفید ریش شعرا) وہ تو تمام اشعار غالباً اپنی منکوحہ بیویوں ہی کے لئے کہتے ہوں گے ؟ یا اگر اوروں سے خطاب ہے تو اس اعلان سے کیا مقصد ہے ؟ " دعوت عشق یا کچھ اور " ؟ اور اگر ہر مرد کے اشعار کی مخاطب اُس کی منکوحہ بیوی ہوتی ہے تو بقول افسر صاحب (مع چند ترمیمات کے) ان جذبات کو پبلک میں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے ، وہ خود اپنا اور اپنی بیوی کا تماشہ کیوں بناتے ہیں ؟ محبت ایسی چیز نہیں جس کا اظہار الفاظ کی اعانت کا محتاج ہو بلکہ الفاظ عموماً محبت کا وقار کھو دیتے ہیں اور اس کی لطافتیں زبانی باتوں کی رو میں بہ جاتی ہیں ------ ؟

کیا تعلیم یافتہ طبقہ کی " بہو بیٹیاں " اردو رسالوں کے اشعار اور افسانے نہیں پڑھتیں ، پھر ان مردوں کی حیا پرور تحریروں کا کیا اثر پڑتا ہوگا ۔ اور کیا مردوں کی طرف سے یہ عشق و محبت کی دعوتیں عین تقاضائے حیا ہیں اور مستحق ہزار آفریں ہیں ؟ مختصر یہ کہ اگر افسر صاحب کے نقطۂ نظر سے شاعری یا فسانہ نگاری پر رائے زنی کی جائے تو مندرجہ بالا سوالات کے علاوہ اور بھی بہت سے دلچسپ سوالات پیدا ہو سکتے ہیں ، جن کے جواب میں افسر صاحب کو بہت سی دردناک مشکلات محسوس ہونگی ، مگر جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں شاعری یا فسانہ نگاری کی تنقید میں اس قسم کے مہمل اور مضحکہ انگیز سوالات نہ پیدا ہوئے ہیں اور نہ افسر صاحب کی طرح انھیں پیدا کرنے چاہئیں ، ان غیر متعلق فروعات سے شاعری یا فسانہ نگاری کو کوئی نسبت ہی نہیں ، انسانی جذبات کی نقاشی کا دوسرا نام شاعری ہے ، واقعات و تجربات کی زندگی کی سچی اور خوبصورت مصوری کو فسانہ نگاری کہتے ہیں ۔ شاعر یا فسانہ نگار کی شخصیت سے اور اس کے اشعار یا فسانے سے کوئی تعلق کوئی سروکار نہیں ، شاعروں کے دیوان اُن کے روزنامچے نہیں ہوتے ، ناول نویسوں کے افسانے اُن کی سوانح عمریاں نہیں ہوتیں ، ورنہ پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ شاعر سے زیادہ شرابی عیاش ، لامذہب ، اور بد اطوار کوئی ہستی نہیں ، اب رہی یہ بات کہ بعض اشعار مثلاً حضرت ریاض کے اشعار بعض زاہدانِ خشک اور شہیدانِ متانت کو بہت عریاں معلوم ہوتے ہیں اور وہ اُنسے چراغ پا ہوتے ہیں ۔ اور بعض شوخی پسند طبیعتوں پر غالب کے ادق اور معنی خیز اشعار گراں گذرتے ہیں اور وہ اُن سے بددل ہوتے ہیں ۔ تو یہ تو طبیعتوں کا اختلاف ہے ہر شعر اپنے رنگ اور اپنے زمانے کے لحاظ سے قابل قدر ہوتا ہے ۔ ورنہ حضرت جرات اور جان صاحب کے لئے تو پھانسی کی سزا بھی کم تھی ، اپنا اپنا رنگ ، اپنی اپنی پسند ہوتی ہے جو جس کو پسند آجائے ، اشعار پرکھنے کا کوئی آہنی قاعدہ نہیں قایم کیا جا سکتا ، بقول خیام ؎

زاہد بہ نماز و روزہ ضبطے دارد   عاشق بہ شراب ناب ربطے دارد
معلوم نہ شد کہ یار خوشنود کیست   ہر کس بخیال خویش خبطے دارد

افسر صاحب کا بھی ایک خاص مذاق ہے وہ انھیں مبارک رہے مگر اس کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ساری دنیا کو اپنے عجیب و غریب مذاق کے معیار پر لانے کی سعی لاحاصل فرمائیں، اور جو اُن کے امتحان میں پورا نہ اترے اس پر جہاد کر دیں؟ دنیا میں جناب افسر صاحب کے علاوہ اور بھی خدا کے نیک بندے ہیں ممکن ہے کہ جو اشعار یا مضامین جناب افسر صاحب کو ناپسند ہیں وہ خدا کے اور نیک یا گنہگار بندوں کو پسند آجائیں۔ انشاپرداز خواتین پر اس قسم کے بیجا حملے بہت نازیبا ہیں۔ عورتیں جو بمقابلہ مردوں کے زیادہ حساس طبیعت رکھتی ہیں اور اُن کی قوت تخیل زیادہ بلند پرواز ہوتی ہے شاعری اور فسانہ نگاری کے لئے ایک حد تک زیادہ موزوں ہیں، لہٰذا اُن کی حوصلہ افزائی کرنا ہمارا فرض ہے افسر صاحب کی طرح اس بیدردی سے خشک اور بیہیت ناک لکچر دیکر اُن کی دل شکنی کرنا اور خواہ مخواہ ایک طوفان اٹھا دینا ادب کی خدمت کرنے کے بجائے ادب کو نقصان پہنچانا ہے، آخر میں میں انشاپرداز خواتین کے روز افزوں گروہ سے یہ درخواست کرونگا کہ افسر صاحب کے مذاق کی رعایت کرکے یا بطور شاعری کے ذکوٰۃ کے اُن میں سے چند خواتین ضرور اس قسم کے نغز اشعار کہنے کی عادت ڈالیں جیسے

رب کا شکر ادا کر بھائی   جس نے ہماری گائے بنائی
دودھ دہی اور میٹھا مسکا   دے نہ خدا تو کس کے بس کا   وغیرہ! وغیرہ!!

اور نثر میں "بلی چوہے کی کہانی" "مرغیاں پالنے کے طریقے"، "بال بڑھانے کے قاعدے"، "شوہروں کے مظالم"، اور "اونٹوں کے اوصاف" وغیرہ پر مضامین لکھنے کی شوق ڈالیں، بہت ممکن ہے کہ جناب افسر صاحب کو اس نوع کی شاعری اور اس قسم کی فسانہ نگاری پسند آ جائے۔

فیاض علی (بی اے آل بی علیگ)

کلام فانی

خود ہوش سے پیدا کر ہر لغزشِ مستانہ   ترکِ مے و مینا کر لے جرأتِ رندانہ

دل معنیٔ صورت ہے اور صورتِ معنی بھی   فرزانہ کا فرزانہ، دیوانہ کا دیوانہ

کچھ تذکرۂ جنّت، کچھ تذکرۂ کوثر   کیا یوں بھی نہیں جائز ذکرِ مے و میخانہ

ہر موجِ شکن سے اک سیلابِ بہار اٹھا   جھاڑا مری وحشت نے جب دامنِ ویرانہ

حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے   اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوۂ جانانہ

ہر کلمۂ الحق میں اِک کیفِ انا بھر دوں   تو بہ سے جو ٹکرا دوں الٹا ہوا پیمانہ

جو مومن و کافر ہیں وہ دل ہی نہیں رکھتے   دنیائے محبت میں کعبہ ہے نہ بتخانہ

ہے جو کوئی منکر ہو اب شمع کی تمکیں کا   گم ہو گئی شعلوں میں خودداری پروانہ

فانی ہی نہیں فانی میں درسِ فنا بھی ہوں
افسانۂ عبرت ہوں اور عبرتِ افسانہ

شوکت علیخاں فانی
(بی۔ اے ال ال بی علیگ)

موجِ تسنیم

بیاں ہو تسنیم مجھ سے کس طرح ماجرائے دراز میرا
مری محبت کی نسبتوں سے بڑھا ہے عرضِ نیاز میرا

دہن میں پنہاں زبانِ نغمہ سخن میں فوقِ بیانِ نغمہ
بنا ہے روحِ روانِ نغمہ شکستہ ہو ہو کے ساز میرا

شکوہِ تاجِ شہی سے دبنا نہ فرقِ شاہنشہی سے جھکنا
یہ عادتیں جس نے ڈالدی ہیں وہی ہے اٹھا گیا ناز میرا

ہوا کسی طرح جو نہ افشا لحد میں جا کر ہوا وہ رسوا
رہا امانت کی طرح برسوں حریمِ ہستی میں راز میرا

بقا کی آنکھوں کو کھول دیکھا فنا کی منزل میں تول دیکھا
تری حقیقت سے کم نہ نکلا کسی طرح بھی مجاز میرا

کبھی یہاں خاکِ رہگذر ہوں کبھی وہاں تابشِ قمر ہوں
فریبِ ہستی کی داستاں ہے نشیب میرا فراز میرا

وہ وحشت آرائیاں نہیں اب وہ دشت پیمائیاں نہیں اب
وہ کار فرمائیاں نہیں اب کہاں گیا کارساز میرا

کرم کی عادت ہی اور ہوتی عمل کی نیت ہی اور ہوتی
تری طبیعت ہی اور ہوتی جو اس میں ہوتا گداز میرا

سید سرفراز حسین تسنیم

فکرِ آزاد

مجرموں کو بخش دینا اُن کو شرمانا بھی ہے — غیرو! جب رحم فرمانا ستم ڈھانا بھی ہے

آپ نے یہ کیا کہا، تو نے ہمیں جانا بھی ہے — بندہ پرور! میں نے جانا ہی نہیں مانا بھی ہے

آپ پر مرنے کی حسرت ہو تو کیا جائے عجب — آپ پر مرنے کا مطلب زندگی پانا بھی ہے

او ستمگر! آج تیرا ہر ستم برحق ـــــ مگر — یاد رکھ اک دن تری قسمت میں پچھتانا بھی ہے

ہم کو اس در پہ جبیں سائی کا سودا کیوں نہ ہو — ہم کو اپنا اخترِ تقدیر چمکانا بھی ہے

مہرباں! مجھ پر یہ بے مہری کا بہتانِ عظیم — تم نے جانا بھی ہے؟ تم نے مجھکو پہچانا بھی ہے

دونوں عالم کیوں نہ مجھ سے دشمنی کرنے لگیں — ایک تم نے مجھکو اپنا دوست گردانا بھی ہے

وہ خدا ناکردہ ترکِ سرد مہری کیوں کرے — میرے دل کی آتشِ پنہاں کو بھڑکانا بھی ہے

محرمانِ راز سے اتنا حجاب اچھا نہیں — ایک دن بے پردہ اُنکے سامنے آنا بھی ہے

باعثِ تخلیقِ ہفت افلاک کیا ہے کچھ نہ پوچھ — ایک مجھکو پائمالِ جور فرمانا بھی ہے

شرحِ دردِ دل سے شرحِ درد ہی مطلب نہیں — خود تڑپنا بھی ہے، دنیا بھر کو تڑپانا بھی ہے

کیوں نہ اپنی آن رکھوں کیوں نہ اپنی جان دوں — زندگی کا ماحصل دنیا کو سمجھانا بھی ہے

دوستو! اب مقصدِ کوشش فقط کوشش نہیں — بلکہ اب کوشش کو تا انجام پہنچانا بھی ہے

آپ کو دل کیا دیا۔ آزاد مطلق ہو گیا
ایک شے آزاد ناداں ہی نہیں دانا بھی ہے

آزاد انصاری

ہماری چند انشا پرداز خواتین

رسالہ نگار بابت ماہ جون سنہ ۱۹۲۶ء میں مندرجہ بالا عنوان پر جناب حامد اللہ صاحب افسر (میرٹھی) کا ایک مضمون شایع ہوا ہے، اس میں جناب افسر صاحب نے بعض انشا پرداز خواتین کے انشار لطیف کے چند نمونے پیش کئے ہیں، اور تمام اردو اخباروں اور رسالوں کے مدیروں سے درخواست کی ہے کہ کم سے کم وہ خواتین کی ایسی حیا سوز تحریروں کو اپنے رسالوں میں جگہ نہ دیں، سب سے پہلے جناب مولانا نیاز فتحپوری صاحب نے آواز بلند کی کہ خواتین کے ایسے مضامین کی اشاعت جو نسائیت کے منافی ہوں نہ کی جائے، اور اس کے متعلق اپنی رائے صائب کا وقتاً فوقتاً اظہار کرتے رہے لیکن افسوس ہے کہ رسالہ کے مدیروں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، اب بھی متعدد رسائل خواتین کے عشقیہ مضامین اور غزلیات کی اشاعت کرکے ان کی ہمت افزائی کر رہے ہیں۔

آج میں اس مضمون پر ایک دوسرے نقطۂ نظر سے بحث کرنا چاہتا ہوں، فرض کر لیجیے کہ رسائل و جرائد کے مدیر خواتین کے عشقیہ مضامین اور غزلیات کی اشاعت سے احتراز کریں، لیکن آپ ان خواتین کے خیالات میں کیونکر اصلاح کر سکتے ہیں، آپ ان خواتین کو اردو غزلیات کے مطالعہ سے جو عشقیہ جذبات کے سرچشمے ہیں کیسے باز رکھ سکتے ہیں، آپ ان خواتین کو ناولوں کے پڑھنے سے جن کا موضوع حسن و عشق ہوتا ہے کیسے روک سکتے ہیں، ان غزلیات اور ناولوں کے مطالعہ سے جو اثر ان کے خیالات اور جذبات پر ہوگا اس کو آپ کیسے دفع کر سکتے ہیں، اس کا علاج صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ خواتین کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔

اتنے وسیع ملک میں کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں کہ ہماری خواتین اعلیٰ تعلیم پا سکیں، آج تک یہ مسئلہ طے نہیں ہوا کہ ان کو کیونکر اعلیٰ تعلیم دی جائے، کس قسم کے کالج قایم کئے جائیں، اور کس نوع کے نصاب مقرر ہوں، تعلیم کا طریقہ جو اس وقت رائج ہے وہ ان کے لئے موزوں نہیں! اور یہی وجہ ہے کہ ہماری خواتین اعلیٰ تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں، سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء کے تعلیمی اعداد و شمار جو حال ہی میں شایع ہوئے ہیں ان سے ان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ سنہ ۲۵-۱۹۲۴ء میں تمام ہندوستان (برٹش انڈیا) میں صرف بیس مسلم لڑکیاں کالجوں میں تعلیم پا رہی ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہماری خواتین کی اعلیٰ تعلیم کا کیا حال ہے۔

زیادہ تر لڑکیاں محض معمولی تعلیم پاکر مدارس سے نکل آتی ہیں، کیونکہ ان کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں ہے، اعلیٰ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے نیک و بد لٹریچر میں اچھی طرح سے تمیز نہیں کر سکتیں، خواہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں! ان کو ناول اور غزل کی کتابیں بالطبع مرغوب ہوتی ہیں، جن لڑکیوں کو مطالعہ کا شوق ہوتا ہے وہ بھی انھیں کتابوں کو پڑھتی ہیں، حسن و عشق کے بیان سے ان کے جذبات بھی قدرتاً برانگیختہ ہوتے ہیں، جو خواتین ذرا طبیعت کی تیز ہوتی ہیں وہ عشقیہ افسانہ نگاری پر اتر آتی ہیں یا شاعری شروع کر دیتی ہیں اور اس میں عشقیہ جذبات کا آزادانہ

اظہار کرتی ہیں؛

خواتین کی ان حرکتوں کی ذمہ داری تعلیم یافتہ مردوں پر بھی ایک حد تک عاید ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ اس کا بہت کم خیال رکھتے ہیں کہ اپنی خواتین کے لئے کس قسم کا لٹریچر فراہم کرنا چاہیئے اور کس نوع کے لٹریچر کے مطالعہ سے ان کو باز رکھنا چاہیئے۔ کتنے تعلیم یافتہ مرد ایسے ہیں جنھوں نے اپنی بہو، بیٹیوں اور بیویوں کے لئے صحابیات کی ایک جلد خرید کر لا دی ہے تاکہ وہ ناول اور غزلیات کی بجائے اس کو پڑھیں، کتنے تعلیم یافتہ مردوں نے سیرت نبوی کی جلدیں خرید کرا تی بہو، بیٹیوں اور بیویوں کو دی ہیں اور ان کے مطالعہ کا شوق دلایا ہے، کتنے تعلیم یافتہ مردوں نے مولانا نذیر احمد مرحوم، مولانا حالی مرحوم اور مولانا شبلی مرحوم کی تصانیف کی طرف اپنی خواتین کی توجہ مبذول کرائی ہے، میرے خیال میں ہزار میں ایک تعلیم یافتہ مرد بھی مشکل سے ملیگا جس نے ایسا کیا ہو، برخلاف اس کے مجھے ایسے واقعات بھی معلوم ہیں کہ بعض تعلیم یافتہ مردوں نے ناولوں اور غزلوں کی کتابیں لا کر اپنی خواتین کو دی ہیں، اور اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ ان کو ان کتابوں کے پڑھنے کا شوق بھی دلایا اور اپنی تفریح طبع کے لئے اکثر ان سے ناولیں اور غزلیات پڑھوا کر سنیں، کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ حیا سوز مضامین جن کا حوالہ جناب افسر صاحب نے دیا ہے ان کو خواتین نے بغیر مردوں کی اجازت کے شایع کرایا ہوگا؟ ——— ہرگز نہیں؛

لہٰذا، مرد اگر اس کے خواہشمند ہیں کہ خواتین اس قسم کے حیا سوز جذبات کا اظہار اپنے مضامین میں نہ کریں اور ان کے خیالات اور مضامین صنف لطیف کے شایانِ شان ہوں تو ان کو چاہیئے کہ خواتین کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کریں، ان کے لئے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کریں اور ان کے واسطے اچھے لٹریچر فراہم کریں جب تک کہ اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ سے ان کے دماغ کو روشن نہ بنایا جائے اور ان کے خیالات میں وسعت نہ پیدا کی جائے تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ کس قسم کے مضامین نسائیت کے منافی ہیں اور ان کا اثر عام اخلاق پر کیسا پڑے گا، اس وقت ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ عشقیہ افسانہ نگاری یا حیا سوز مضامین کی اشاعت سے احتراز کریں لاحاصل ہے؛

عبدالسلام (ایم۔ اے)

جذباتِ صادق

توڑ کر دم زندگی کی کلفتیں کم کیجئے ۔۔۔ آج اس شیرازۂ حسرت کو برہم کیجئے

سننے بیٹھے ہیں وہ میرا ماجرائے دردِ دل ۔۔۔ ہائے اب کیونکر بیان قصۂ غم کیجئے

مجھ پہ مرنے کا بجا الزام لیکن آپ بھی ۔۔۔ اک ذرا اندازۂ صدماتِ پیہم کیجئے

ڈبڈبا آئے کسی کے دیدۂ مستِ طرب

ختم صادق آپ بھی افسانۂ غم کیجئے

صادق ایوبی
(ڈیرہ غازیخاں)

حسنِ خوابیدہ

(۱)

اک آفت ترا حسنِ خوابیدہ ہے — قیامت ترا حسنِ خوابیدہ ہے
ادا یہ بھی ہے ہوش کی کھونے والی — اسی طرح ہاں سوئے جا سونے والی
کئے جاؤ تم سیرِ باغِ جناں کی — خبر لا اس عالم میں کوئی مکاں کی
یونہی محوِ گلگشت رہ اور کچھ دیر — ذرا دیکھ لیں ہم بھی یہ دور کچھ دیر
وہ خندہ نگاہ آنکھیں ہیں برق تاباں — گلابی لبوں پر تبسم نمایاں
یہ آہستہ آہستہ لب ہل رہے ہیں — شگوفے نئی طرح کے کھل رہے ہیں

ہر اک سانس سے آہ دلدوز پیدا
قیامت کا ہر آہ میں سوز پیدا

(۲)

شباہت میں مینائے مے ہے وہ گردن — حقیقت میں نایاب شے ہے وہ گردن
وہ رخسار آیا کرے پیار جن پر — وہ ہلکی سی سرخی نمودار جن پر
وہ لو اُسکے ہونٹوں سے آواز نکلی — لئے اپنے ہمراہ اک ساز نکلی
خیالوں کے طوفاں سے گھبرا رہی ہے — زباں پردہ کچھ رازِ دل لا رہی ہے
ادھر شوق، یہ راز معلوم ہوتے — لبوں سے بھی اعجاز معلوم ہوتے
مگر ان کے سنتے ہوئے ڈر رہا ہوں — کہوں کیا عجب کشمکش میں پھنسا ہوں

غضب کا ہے شوق اور قیامت کا ڈر ہے
اِدھر بھی خطر ہے اُدھر بھی خطر ہے

(۳)

وہ سونے سے اب دفعتاً چونک اُٹھی — مگر آنکھیں ہیں خوف سے بند اُسکی
وہ سہمی سی ہے، روتی ہے، کانپتی ہے — کسی وجہ سے سوتے میں ڈر گئی ہے
ابھی محو تھی خواب میں کس ادا سے — وہ سینے پہ دل کی طرف ہات رکھے
پریشان ایسی ہوئی کیا سبب ہے — وہ بے چین کیوں ہو رہی ہے غضب ہے
نہیں لو وہ پھر سو گئی لے کے کروٹ — لبوں پر پھر آئی وہی مسکراہٹ
وہ رخساروں پر آگئی فی الفور سُرخی — اِن انگاروں پر آگئی آب اُسکی سرخی

بتاتی ہے یہ حالت خواب اُسکی
کہ ہے پاکدامن کوئی حور سوتی

(۴)

یونہی سوئے جا، تیرے سونیکے صدقے — ترے مطمئن ہو کے سونیکے صدقے
وہ سونا ترا جس پہ قابو نہیں ہے — مقید کسی طرح اب تو نہیں ہے
تری نیند ہے، تیرے قابو سے باہر — نہ اس پر مرا، میرے قابو سے باہر
بہشت بریں والے قربان تجھ پر — عجب کیا جو لے آئیں ایمان تجھ پر
خیال اہلِ فردوس کے مثل تیرا — کمال اہلِ عرفاں میں بے مثل تیرا
رہیں تیرے سینہ کے اسرار محفوظ — یہ سربستہ روحانی انوار محفوظ

وہ اسرار، سینہ پُر انوار جن سے
وہ انوار، کامل ہوں اسرار جن سے

وصل بلگرامی

(ترجمہ از انگریزی)

رحمت کا فرشتہ

(فسانہ)

برسات کا موسم تھا، دن کے آٹھ بجے تھے، پورب کو جانیوالا میل گرینڈ کورڈ والی گھنڈی اسٹیشن سے گذر کر ہزاری باغ کے پرفضا کوہستانی سلسلوں کو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے طے کر رہا ہے، مطلع ابرآلود تھا، اور ارد گرد کے سر بفلک پہاڑ ہرے ہرے شاداب درختوں اور خوشرنگ خودرو جنگلی پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ دور، دور برابر پہاڑ کی چوٹیوں سے ملے ہوئے نظر آتے تھے، کہیں کہیں ننھی ننھی پھواریں بھی پڑ رہی تھیں گھاٹیوں اور وادیوں میں آبشاروں اور جھرنوں کا پانی تیزی سے بہ بہ کر دلکش نغمے پیدا کر رہا تھا۔

سکنڈ کلاس کے ایک درجہ میں ایک شخص ہلکی چادر اوڑھے محو خواب تھا، اس کے بائیں ایک حسین لڑکی جس کی عمر مشکل سے بیس سال کی ہوگی ہاتھ میں ایک کتاب لئے خاموش بیٹھی تھی، کبھی وہ کتاب پر ایک سرسری نگاہ ڈالتی، کبھی کھڑکی سے سر نکال کر قدرت کے اس پر نزہت اور جلد جلد بدلنے والے منظر کی سیر میں محو تھی اور کبھی اس سوتے ہوئے شخص کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لیکر رہجاتی؛

دفعتاً انجن نے ایک لمبی سیٹی دی، انجن کی غیر معمولی چیخ سے متحیر ہو کر لڑکی نے کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا، لائن کے سامنے پہاڑ میں ایک درہ نظر آ رہا تھا لڑکی عجلت کے ساتھ کھڑکیاں گرا کر اپنی جگہ پر آ بیٹھی، انجن سیٹی دیتا ہوا درہ کے اندر داخل ہو گیا، گاڑیوں میں آہستہ آہستہ تاریکی پھیلنے لگی، خود بخود بجلی کے قمقمے روشن ہو گئے، لیکن ابھی ٹرین ۲۲ منٹ بھی نہ چلی ہو گی کہ ایک مہیب اور ہولناک دھماکے کی آواز آئی، گاڑیاں جھٹکے کے ساتھ رک گئیں، بعض گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں، اور بعض دیا سلائی کی ڈبیا کی طرح چکنا چور ہو گئیں، گاڑیوں کے اندر گیس کے پیپے دنادن پھٹنے لگے، اور ان میں آگ لگ جانے سے ساری ٹرین میں آگ لگ گئی، مسافروں کی ہولناک چیخ پکار اور دل ہلا دینے والے نالوں سے ایک ہنگامۂ محشر برپا ہو گیا!-----------

کوہستانی درہ کے یکایک پھٹ جانے سے اس پر بڑی بڑی چٹانیں گر پڑی تھیں جن سے ٹکراتے ہی انجن آن کی آن میں چکنا چور ہو گیا، اور یہ حادثہ وقوع میں آیا!

- -

"انیس، انیس کدھر ہو؟ خدا کے لئے بولو کدھر ہو؟" ایک درجہ کی خوفناک تاریکی میں لڑکی کی خوف زدہ آواز عجیب بیتابی سے پکار رہی تھی لڑکی پہیہ کے تختوں سے بالکل دبی ہوئی تھی، پیشانی سے خون کی دھار جاری تھی، لڑکی ہچکیاں سے لیکر اور کرب کی آواز سے رو رو کر اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انیس کو گاڑی کی تاریکی میں ڈھونڈھنے لگی، یک بیک اس کا ہاتھ ایک بے حس و حرکت جسم پر جا پڑا، اور وہ ایک جگر خراش

چیخ کے ساتھ اس میت سے چمٹ کر اس کے بےحس جسم کو جھنجھوڑنے لگی " انیس، انیس " کی دلخراش اور دل ہلا دینے والی آواز پھر بلند ہوئی؛ چند منٹ کے بعد اس بےحس جسم کو ایک خفیف سی حرکت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک نحیف اور مدہم آواز " رحمت، رحمت " پکارنے لگی، رحمت کا سارا جسم اس آواز کے سنتے ہی کانپ اٹھا، اس کی تھرتھرائی ہوئی زبان سے پھر " انیس، انیس " نکلا اور وہ اسی سے چمٹ کر بیہوش ہو گئی؛ جب تک رحمت غش کے عالم میں رہی انیس " رحمت، رحمت " پکارتا رہا، جب رحمت کو ہوش آیا تو اس نے اپنی گاڑی کو بھی جلتا ہوا پایا گاڑی کی چھت شق ہو گئی تھی اور دروازہ کھلا ہوا تھا ... آفتاب کی روشنی انیس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، انیس بھی بینچ کے نیچے دبا پڑا تھا، اور کمر کے نیچے کا حصہ بالکل بیکار ہو گیا تھا؛

انیس کا چہرہ ایک سیاہ نقاب سے چھپا ہوا تھا، جس کا فیتہ وہ اپنی بیتاب اور مرتعش انگلیوں سے ڈھونڈھ کر نقاب جدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا " رحمت، رحمت، میرے چہرے سے نقاب ہٹا دو، جلدی کرو، جلدی؛ رحمت کیا تم دیکھتی نہیں، ارے گاڑی جل رہی ہے "۔ رحمت فوراً انیس کی طرف متوجہ ہوئی، اور چند لمحوں تک اسے متحیر اور متجسس نظر سے دیکھ کر رک رک کر بولی؛

" لیکن انیس، تمہیں آگ کی کیونکر خبر؟ کیا تم اب دیکھ ----------؟"

ہاں، ہاں رحمت جلدی کرو، میں دیکھتا ہوں جلدی کرو " اور انیس کی بیتاب انگلیاں پھر نقاب الگ کرنے کی کوشش کرنے لگیں، رحمت نے پھر متحیر ہو کر پوچھا

" لیکن انیس تم کیسے دیکھتے ہو، تم تو ....؟ "

" ہائے پھر بحث کرتی ہو۔ ارے مجھے معلوم ہے کہ میں عرصہ سے اندھا ہوں، لیکن اب نہیں ہوں یہ دیکھو آفتاب میری آنکھوں پر چمک رہا ہے "

رحمت نے جلد جلد انیس کے چہرہ کی نقاب جدا کر دی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا، لیکن اس ہولناک منظر کی تاب نہ لا کر ایک چیخ کے ساتھ بیہوش ہو گیا۔

انیس کا چہرہ کس قدر بھیانک اور نفرت خیز تھا! اور اسی لئے اس کے چہرے پر نقاب پڑی رہتی تھی، اس کی ناک اور ایک طرف کا گال کسی وجہ سے بالکل غائب ہو گیا تھا، اور دوسری طرف کا گال جل کر سیاہ ہو گیا تھا، پیشانی پر کئی جگہ کاری زخموں کے گہرے نشان تھے، جلد کے نیچے کا لال لال گوشت، گلابی اور کچا چمڑا باہر نکلی ہوئی سفید سفید ہڈیاں، اور دانت چہرے کو عجیب بھیانک اور خوفناک بنا رہے تھے جن کو دیکھ کر ایک انسانی شکل تصور کرنا محال تھا، لیکن یہ بدہیئت، اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا چہرہ رحمت کی محبت بھری نگاہ میں کوئی تغیر نہ پیدا کر سکا؛ وہ اسی طرح محبت و الفت کی مجسم تصویر بنی ہوئی انیس کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہی ہے، لیکن کس طرح؟ جھنجھوڑ جھنجھوڑ اور پکار، پکار کر "

رفتہ رفتہ انیس کو پھر ہوش آیا، آنکھیں کھولکر پھر اس نے اپنے اردگرد کے ہولناک منظر کو خوف زدہ آنکھوں سے دیکھا، اور گھبرا کر اٹھ بیٹھنا چاہا، لیکن بینچ سے دبے رہنے کی وجہ سے " آہ " کہکے مجبور ہو گیا، اور وہ آنکھیں جو آج پورے دو برس سے روشنی سے غیر آشنا تھیں رحمت کو بغور دیکھنے میں مصروف ہو گئیں، انیس رحمت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور غور کر رہا تھا، اس کا دماغ کچھ یاد کرنے کی کوشش

کر رہا تھا۔ حافظہ کسی بھولی ہوئی صورت اور کسی دھندلی تصویر سے رحمت کی صورت کا تقابل کر رہا تھا، رحمت اُس کی متجسس نظر کی تاب نہ لا سکی اس کی نظر نیچی ہو گئی، دل میں ایک گھبراہٹ اور بےچینی پیدا ہوئی، بدن میں کپکپی شروع ہو گئی، اُنگلیاں ایک خاص تشنجی کیفیت کے ساتھ اینٹھنے لگیں سانس جلد جلد آنے لگی اپنے دماغ پر بہت زور دینے کے بعد بھی انیس فیصلہ کرنے سے قاصر رہا اور مجبور ہو! پوچھنے لگا،

"رحمت، رحمت کیا تم ہی رحمت ہو؟"

رحمت خاموش تھی اور آنسو کے قطرے بیتابی سے اس کے دامن پر گر کر اس کی مجبوری کا اظہار کر رہے تھے، کچھ دیر کے بعد انتظار کر کے انیس نے پھر پوچھا،۔

"رحمت، آخر بولتیں کیوں نہیں؟"

لیکن رحمت کہتی تو کیا کہتی، حجاب و انفعال کی تصویر مجسم بنی چپکی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی، اب انیس بھی بیقرار ہو گیا، گاڑی میں آگ لگی ہوئی تھی، لکڑی کے تختے آگ کی حدت سے چٹخ رہے تھے، لوہے کے شہتیر اور کڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر ادھر اُدھر گر رہی تھیں:

"رحمت! موت قریب ہے، خدا کے لئے جلد بتاؤ کہ تم کون ہو"؟

رحمت نے کانپتے ہوئے پوچھا "آخر میں رحمت کیوں نہیں ہوں"؟

"تم رحمت کیوں نہیں ہو؟ اس لئے کہ وہ عورت جو آج دو سال سے ہر وقت میری خدمت کرتی رہی ہے وہ رحمت تھی، لیکن تم نہیں ہو سکتیں"

"یہی تو پوچھتی ہوں کہ آخر میں وہی عورت کیوں نہیں ہوں، جو آج دو برس سے آپکے ساتھ ہے"؟

اب انیس کو غصہ آ گیا اور چلا کر کہنے لگا۔

"پھر پوچھتی ہو کہ کیوں نہیں ہو، تم مجھ سے اس کا سبب دریافت کرتی ہو کہ تم رحمت کیوں نہیں ہو سکتیں؟ تو سنو، تم سے شاید میں واقف نہیں ہوں، اور اگر میں نے تمہیں کبھی دیکھا بھی تھا تو مجھے یاد نہیں پڑتا، لیکن رحمت سے میں کیمبرج جانے کے پہلے ہی سے اچھی طرح واقف تھا، وہ ایک بدصورت، بدہیئت، اور چیچک رو عورت تھی، لیکن ...... تم؟ نہیں ہرگز نہیں تم رحمت ہو ہی نہیں ...."

آگ کے شعلے قریب آتے جا رہے تھے، گاڑی کرۂ ناری ہو گئی تھی۔

انیس رحمت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، اُس کی پیشانی پر شکن تھی، اور اس کا دماغ فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"او خدا! ہو ہی نہیں سکتا، ممکن ہی نہیں، بھلا کہاں رحمت اور کہاں تم، ناممکن ....."

رحمت اب گھبرا سی گئی، اور پھر مجبور ہو کر آہستہ سے بولی "آخر کیوں نہیں"؟

"پھر وہی کیوں نہیں اچھا سنو، رحمت بچپن ہی سے بدصورت پیدا ہوئی تھی، چیچک اُس کے چہرے کو بالکل خراب کر چکی تھی، میرے انگلینڈ جانے سے پہلے اُس کے ماں باپ مر چکے تھے، اور اس کے بہت پہلے اُس کا شوہر بھی مر چکا تھا، میری ماں اُس کی مصیبت پر رحم کر کے اُسے اپنے گھر اُٹھا لائی تھیں ...."

انیس کی سانس چڑھ گئی تھی لیکن دم لیکر کہنے لگا۔

کیمبرج کی تعلیم ختم کرکے میں جرمنی کے سب سے بڑے آلات حرب کے کارخانہ یعنی کرپ کمپنی میں داخل ہوگیا، وہاں میں نے ایک نئی بارود بنائی جو ایک دن میرے ہاتوں میں پھٹی، میری آنکھیں اندھی ہوگئیں، اور میرا چہرہ بگڑ گیا مگر انسانی چہرہ باقی ہی رہا، میرا سارا جسم زخمی ہوگیا، بظاہر بچنا محال تھا بچ گیا ورنہ میری زیست کا کسی کو یقین نہ تھا، میں زندہ تو رہ گیا لیکن اس طرح کہ لوگ میری صورت سے نفرت اور میرے سایہ سے پرہیز کرنے لگے کارخانہ کے مالکوں نے میری مجبوری پر ترس کھا کر ایک جرمن نرس کے ساتھ مجھے ہندوستان بھجوا دیا"

آگ کے شعلے لپک لپک کر اب ان دونوں بیکسوں کے بہت قریب آ رہے تھے۔

"جب وہ جرمن نرس مجھے گھر پہنچا کر واپس جا چکی تو میرے اباجان نے میری خدمت کے لئے نوکر مقرر کرنا چاہا، مگر تمام نوکروں نے اظہار نفرت کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا، میری ماں میرے زخمی ہونے کی خبر سنتے ہی مر چکی تھیں، اب میری خبر لیتا تو کون؛ مجھ پر ترس کھاتا تو کون، میری صورت نفرت خیز، آنکھیں بیکار، ہائے مصیبت تو یہ تھی کہ اپنے ہاتوں مرنا بھی اپنے اختیار میں نہ تھا، میں نے اباجان سے تنہائی میں زہر کی درخواست کی، سمجھایا، منت کی، ہاتھ جوڑے، رو رو کر التجا کی، خدا کا واسطہ دیا، لیکن باپ کا دل تھا؛ میری اس مجبوری پر بھی زہر دینے پر راضی نہ ہوا، اب جب ہر طرف سے ناامیدی ہی ناامیدی نظر آنے لگی تو اباجان کو رحمت یاد آئی، جو اس وقت تک رنڈاپے کی سزا میں اپنے زندگی کے بقیہ دن مصیبت سے کاٹ کر موت کی آمد کا انتظار کر رہی تھی، اباجان نے بڑی منت وسماجت کے بعد اُسے میری خدمت پر راضی کیا، اس دن سے آجتک یعنی آنکھ کے علاج کے لئے کلکتہ چلتے وقت تک میں یہی جانتا ہا کہ رحمت ہی میری خدمت کرتی ہے، لیکن تم؛ اور رحمت ممکن ہی نہیں"

آگ کے شعلے اب بہت قریب تھے۔ گرمی کے مارے انیس کا دم رکنے لگا، رحمت کی ساڑی میں بھی آگ لگنا چاہتی تھی کہ اُس کی زبان سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی۔

"انیس تم اپنی داستان غم کہہ چکے، تو میری بھی رام کہانی سن لو! ہاں میں رحمت نہیں۔ میں زہرہ ہوں،

"کون زہرہ؟ ابھر ماموں کی لڑکی؟"

"ہاں وہی زہرہ، وہی کم بخت اور بدنصیب زہرہ، جو بچپن سے تم سے منسوب تھی، اب کاہیکی شرم، کس دن کے لئے؛ اور کتنی مدت کے لئے؛ ہاں وہی زہرہ جو بچپن سے تمہاری تھی؛ اور آج تک تمہاری رہی اور اب خدا کے فضل سے روز حشر تک تمہاری ہی رہیگی"

"انیس جب تم جرمنی سے معذوری و مجبوری کے تصویر بن کر واپس آئے تو میرے والدین نے جو اس وقت تمہیں اپنی اولاد گننے کے متمنی تھے، اور تم سے رشتہ جوڑنا فخر سمجھتے تھے، تمہاری مجبوریوں کو دیکھکر صاف انکار کر دیا، ملازموں نے بھی تمہاری خدمت سے انکار کیا، اور جب رحمت مجبور کی گئی تو اس نے بھی زہر کھا کر جان دیدی، اور اس طرح انکار کا اظہار کیا، یہ سب واقعات تمہارے گھر آنے کے تین دن کے اندر گزرے، میرے دل کا عجیب عالم تھا، یہ سب دیکھ رہی تھی، لیکن کچھ نہ کر سکتی تھی، کنواری تھی زبان بھی ہلا نہ سکتی تھی کلیجہ امنڈتا تھا لیکن اُف بھی نہ کر سکتی تھی، بس میں تھی اور بے بسی کا رونا، نماز تھی اور سجدے۔ رات دن خدا سے سیدھی راہ دکھانے کی

التجا؛ اور اپنی قسمت کا فیصلہ کر لینے کی قوت کی درخواست، تیسرے دن اُدھر رحمت نے جان دی اور اِدھر میرے دل کو یکسوئی ہو گئی۔ میں اُٹھی سیدھی ماں کے پاس آئی، عرض حال کیا، روئی، گڑگڑائی، قدموں پر گری، ابّا پر بھی راضی نہ ہوئیں تو افیون کی گولی کھا کر جان دینے کی دھمکی دی، بس اس طرح اُن سے تمہاری خدمت کرنے کی اجازت حاصل کر کے تمہارے پاس آئی اور رحمت کی جگہ تمہاری خدمت میں مصروف ہو گئی۔"

زہرا ہانپنے لگی، اس کا بھی دم رکنے لگا، انیس کی آنکھیں حسرت کے آنسو بہا رہی تھیں اس نے لرز لرز کر آہستہ سے پوچھا۔

"لیکن زہرہ، تم نے مجھ جیسے کے لئے اپنی عمر کیوں خراب کی؟"

"نہ پوچھو انیس خدا کے لئے نہ پوچھو، میری شرم قایم رہنے دو، ہائے پوچھتے ہو میں نے اپنی زندگی کیوں خراب کی، ارے میری زندگی میں رکھا ہی کیا تھا، تمہارے بغیر وہ زندگی موت سے بدتر تھی، اور صرف اس لئے کہ خدا نے تمہیں مجبور کر دیا تھا ورنہ اگر تم اچھے رہتے تو میں ضرور تمہاری ہوتی، تو کیا تمہارے ایسے برے وقت میں مجھے صرف اپنے آرام و آسائش کا خیال لازم تھا؟ تمہاری ماں مر چکی تھیں باپ سے تمہاری خدمت ممکن ہی نہ تھی۔ رحمت نے جان دے دینی گوارا کی، اب میرے سوا کون تھا جو تمہارا ساتھ دیتا، نہیں انیس آہ یہ نہ کہو کہ کیوں یہ زندگی ختم ہو گئی لیکن میں خوش ہوں کہ میں اپنا فرض ادا کر سکی، شاید یہی میری بخشش کا ذریعہ ہو، شاید میں اسی لئے پیدا کی گئی تھی،"

آگ کے شعلے انیس اور زہرہ سے لپٹ گئے، بدن جلنے لگا، انیس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"رحمت کی دیوی، وفا کے فرشتہ، آ، مجھ پر قربان ہوتے وقت، علیٰ اور آخری بار گلے تو مل لے"

دونوں نے ہاتھ پھیلا دیے، گیس کا پیپہ پھٹا، اور دونوں کے طائر روح ساتھ ساتھ الفت و محبت کے شیریں نغمے گاتے ہوئے، بہشت کی طرف اُڑ گئے۔

علی اکبر کاظمی
بی۔اے (کیمبرج)

اختر مرحوم سے

مرنا تو ہمیں بھی ہے اختر بے وقت سہی، ناکام سہی
فطرت کا اٹل آئین ہے یہ گر صبح نہیں تو شام سہی

یہ اوس کے دھندلے پردے میں ویسی ہی تجلی لرزاں ہے
تنویر سحر، یا روح کی تابش رنگ شام غریباں ہے

لہروں میں نمایاں ہے جنبش، اک جوش ہے سیل برپا میں
کچھ لوگ کھڑے ہیں ساحل پر کچھ ڈوب رہے ہیں دریا میں

قانونِ تغیر گرم عمل ہے پست و بلندِ دنیا پر
تعمیر حریم گیتی ہے مبنی متلون اجزا پر

میعاد مقرر تک رہنا، اسطرح کہ واپس جانا ہے
مرنے کی شکایت کیا، مرنا، انجام حیات دنیا ہے

رونا تو یہ ساری عمر کا ہے اللہ کی رحمت ہو تجھ پر
پرسش کی گراں مرنے والے مرقد میں سعادت ہو تجھ پر

تم کیوں مرتے، کیا میں نے کہا تم زندہ ہو تم زندہ ہو
ہم منتظر آزادی، تم آزادِ جفائے دنیا ہو

جب تک کہ ہمارے ساتھ رہے آئینہ خلق احسن تھے
تم ایک گل خوش منظر تھے ایسے کہ سراپا گلشن تھے

وہ عمر فنا تھی، زندگی آزاد تمہاری باقی ہے
عبرت کا سبق دینے کیلئے اب یاد تمہاری باقی ہے

آقا سے ملے، جنت پائی، سب دل کی تمنا بر آئی
عنوانِ حیات سرمد ہے اسطرح، اجل بھی گر آئی

جنت کی خوشی میں بھول نہ جانا عرض ارادت کر دینا
مولیٰ سے غلاموں کا اختر اظہار عقیدت کہ دینا

سید علی اختر، اختر

آپ کہیں گے ہمیں یاد نہ دلایا، آخیر سال ہے جنوری میں نگار کے لئے نئے خریدار پیدا کیجئے آپکی یہی اعانت ہے — منیجر نگار

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(مسلسل)

دہلی - راجپوتانہ

۲۲ جنوری ———

دہلی کے اسٹیشن پر اکرام اللہ خاں، نواب علاؤالدین احمد خاں والیِ لوہارو، شاہزادہ مرزا سلیمان جاہ اور امیرالدین فرخ مرزا موجود تھے نواب صاحب ہوٹل تک ساتھ گئے جہاں انھوں نے ہمارے لئے چند کمرے پہلے سے رکھے تھے چونکہ وہ انگریزی میں بات چیت کر سکتے ہیں اس لئے بہت دیر تک مسئلۂ مصر کے متعلق گفتگو ہوتی رہی، لیکن انھیں وہاں کے حالات سے مطلق واقفیت نہ تھی، انھوں نے سلطان المعظم کے متعلق خصوصیت کے ساتھ سوال کیا، میں نے کہا کہ انسان ہونے کی حیثیت سے وہ اعلیٰ خصائل سے متصف ہیں، لیکن دنیا سے واقف نہیں ہیں، وہ اپنی سلطنت کو ترقی دینے کی خواہش رکھتے ہیں، مگر وہ ہر وقت لالچی یا خوشامدیوں کے نرغے میں گھرے رہتے ہیں، مجھے ترکی سلطنت کے لئے ہندوستان میں کچھ جوش نظر نہیں آتا، البتہ سلطان المعظم کے لئے کچھ جوش ضرور پایا جاتا ہے۔

سہ پہر کو میں نواب اور شاہزادگان کی ملاقات بازدید کے لئے گیا، نواب نے کہا میں ترکی النسل ہوں اور تین نسلیں ہوئیں کہ میرے بزرگ سمرقند سے آئے تھے، ہم لوگ اپنے ہی رشتہ داروں میں شادی بیاہ کرتے ہیں، میں گذشتہ سال تک نیم خود مختارانہ حالت میں تھا لیکن اب میں نے اپنے صاحبزادے کے حق میں دست برداری دیدی ہے، انھوں نے مجھے بتلایا کہ میرے چچا (جو میرے دادا کے حرام کے لڑکے تھے) مسٹر ولیم فریزر (William Fraser) کو قتل کرنے کے جرم میں دہلی میں پھانسی پر چڑھا دیئے گئے، گورنمنٹ دراصل ان کی وسیع جائداد کو ضبط کرنا چاہتی تھی، یہ پرانی وضع کے عجیب و غریب آدمی ہیں، انگریزی اچھی جانتے ہیں اور مشہور یہ ہے کہ عربی فارسی میں بھی انھیں کافی دستگاہ حاصل ہے، خدا کا شکر ہے کہ ان کی ایک ہی بیوی ہے۔

شاہزادے سے میں نے عربی میں بات چیت کی، وہ اکثر ہندوستانیوں سے بہتر عربی بولتے ہیں، مہدی، وہابی، سلطان المعظم اور توفیق کے متعلق گفتگو رہی، وہ یہ دیکھکر محظوظ ہوئے کہ میری رائے مہدی کے متعلق اتنی اچھی ہے۔ انھوں نے جمعرات کے دن قطب صاحب کی سیر کرانیکا وعدہ کیا ہے۔

اکبر حسین نے مجھ سے ایک واقعہ بیان کیا تھا اور اسے میں یہاں درج کئے دیتا ہوں:

ایک انگریز کے کسی ہندو عورت سے ناجائز تعلقات تھے، اس عورت کے خاوند کے رشتہ داروں نے اسے ناکارہ سمجھکر مار ڈالا، اور اس کی لاش کو

انگریز کے حیمہ کے سامنے ڈال دیا، بہرحال مقدمہ چلایا گیا اور اگرچہ واقعہ کے متعلق کسی قسم کے شبہات نہ تھے۔ تاہم گورنمنٹ نے مقدمہ کرنیوالوں کو تین تین مہینے کی سزائے قید دی اور ایک ایک ہزار روپے جرمانہ کیا، میرے مخبر نے واقعہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ کسی انگریزی افسر کے خلاف الزام کو ثابت نہیں ہونے دیا تاکہ مبادا انگریزی کیرکٹر کو صدمہ پہنچ جائے؛

۲۳-جنوری ——————

اکرام اللہ اپنے ہمراہ چار مسلمانوں کو لائے جن سے اس امر پر گفتگو رہی کہ میدان سیاست میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے ان کی متفقہ رائے یہ تھی کہ ہندوؤں سے متفق ہو کر کام کرنا چاہیئے۔

اس کے بعد ہم اپنے حبشی میزبان مسٹر رابنسن (Robinson) کے ساتھ قلعہ اور جامع مسجد کو دیکھنے نکلے مسجد عجائبات عالم میں شمار ہوتی ہے مسجد بھی نہایت شان و شوکت کی ہے اور قلعہ بھی نہایت خوبصورت ہے اور محل کو مستثنیٰ کرکے کوئی عمارت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی محل مختلف دلچسپ واقعات کا مرکز رہا ہے اور آخری مغل بادشاہ پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا اس کی سماعت بھی یہیں ہوئی تھی، ایک دنداں ساز جس سے آج ہماری ملاقات ہو گئی کہتا تھا کہ دوران مقدمہ میں موجود تھا، مغل شہنشاہ فوجی کمشنر کے سامنے خمیدہ حالت میں بیٹھے ہوئے تھے ٹاٹ کا لباس زیب تن تھا، اور سر پر قلیوں کی سی پگڑی تھی، یہاں انگریزوں نے ۱۰۰ انگریزوں کے خون کے بدلے میں ہزاروں بیگناہ آدمیوں کو تباہ و برباد کر دیا۔ نواب لوہارو ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ شہر پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد آٹھ مہینے تک جو آدمی دار پر چڑھائے گئے یا ان کو بندوق بنائے گئے یا توپوں سے اڑا دیے گئے ان کی تعداد ۲۶ ہزار سے کم نہ تھی، لوگ شہر خالی کرکے بھاگ گئے تھے۔ اور گرد کے تمام مقامات بالکل زمین کے برابر کر دیئے گئے تھے، یہ سب جدید تہذیب کے کرشمے ہیں، دنداں ساز کہتا ہے کہ میں نے ۱۹ آدمیوں کو ایک ہی مقام پر پھانسیوں پر لٹکے ہوئے دیکھا تھا، میرا خیال ہے کہ کوئی انگریز واقعات غدر کی صحیح تفصیل لکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

نواب اور ان کے صاحبزادے سلیمان جاہ اور اکرام اللہ کے ساتھ کھانا کھایا، امیر الدین فرخ مرزا نے جو آج کل لوہارو میں حکومت کرتے ہیں نہایت دلچسپ داستان سنائی کہ انگریزی حکومت (جیسا کہ وہ نابالغوں کی حکومت قرار دی جاتی ہے) نوجوان شاہزادوں کو کس طرح سے تعلیم و تربیت دیتی ہے، انھیں گھوڑے کی سواری سکھائی جاتی ہے، ٹینس سکھایا جاتا ہے اور اس کے بعد ریزیڈنٹ لکھتا ہے کہ شاہزادے روشن خیال اور وفادار ہیں، بعد ازاں وہ تخت نشین کرائے جاتے ہیں لیکن گردو پیش کے حالات کو غیر دلچسپ دیکھ کر کچھ دنوں کے لئے کلکتہ چلے جاتے ہیں جہاں وہ سلدار روپیہ ضائع کر ڈالتے ہیں، واپسی پر وہ اپنی رعایا پر ٹیکس پر ٹیکس لگاتے ہیں اور اس کے بعد ریزیڈنٹ لکھتا ہے کہ وہ وحشی ہیں اور حکومت کرنے کے قابل نہیں ہیں، آخر میں گورنمنٹ مداخلت کرتی ہے، اور انتظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ یہ بہت سمجھدار ہیں اور میرا خیال ہے کہ ہماری جدید پالیسی کی تمام اندرونی باتوں کو سمجھتے ہیں، بوڑھے آدمی عجیب وضع کے ہیں، وہ ایام غدر میں شہر سے باہر نہیں گئے اور انگریزوں سے ان کا نامہ و پیام برابر جاری تھا، یہی سبب ہے کہ وہ پھانسی پر چڑھنے سے رہ گئے اور جائداد بھی ضبط نہیں ہوئی، مجھے ان کی گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اظہار وفاداری کرنے کے ان کی ہمدردی قدیم طرز حکومت کے ساتھ ہے۔ باغیوں کے متعلق انھیں یہ بات ناپسند تھی، کہ ان میں اکثر ہندو تھے، لیکن اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے اگر انھیں انگریزوں سے محبت ہو، لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اور اگر نئی بغاوت رونما ہوئی تو اس میں ہر شخص خواہ

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کا عطر بہت مشہور ہے۔

ہندو ہو یا مسلمان نوجوان ہو، یا بچہ، مرد ہو یا عورت سب کے سب اس میں شریک ہونگے۔ نواب کو بے معنی آدمی معلوم ہوتے ہیں، وہ جس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں وہ جلدی ناپید ہونیوالا ہے۔ یعنی وہ گروہ جس نے اپنے نفع کی خاطر انگریزوں سے اتحاد کر لیا تھا، بوڑھے آدمی کی وفاداری لفظوں تک محدود رہگئی ہے:

۲۴ جنوری ——————

آج ہم شاہزادہ سلیمان کے ساتھ قطب صاحب کی سیر کو جانیوالے تھے لیکن چونکہ کرنل مور میرٹھ سے آگئے ہیں اس لئے اُسے ملتوی کردیا گیا۔ یہی ایک انگریز مجھ سے ابتک ایسے ملتے ہیں جو ہندوستانیوں کو اچھی طرح سے سمجھتے ہیں۔ دراُن کے جذبات سے ہمدردی رکھتے ہیں، وہ ڈیوک آف کناٹ کے اسٹاف میں ہیں لیکن خوش نہیں ہیں اس لئے کہ ڈیوک اور ان کی بیوی ہر دو ہندوستانیوں سے ہمدردی نہیں رکھتے۔ اور انگریزی حکومت ہند نے متعلق پرانے خیالات رکھتے ہیں، ہم نے ہندوستانی صورت حالات کے بارے میں گفتگو کی اور اس پر اتفاق رائے ظاہر کیا کہ ناممکن ہے کہ ایسی حکومت کی جو کلیتہً غیر ہمدردانہ ہو، کسی نہ کسی دن رعایا سے آخری آویزش نہ ہو جائے، ہندوستانی دنیا میں سب سے زیادہ حلیم الطبع آدمی واقع ہوئے ہیں اور ان پر نہایت آسانی سے حکومت کی جا سکتی ہے، ورنہ یہاں ایک گھنٹہ کے لئے بھی رہنا دشوار تھا، مصر میں ترجمان کے عہدہ پر فائز تھے اور تمام و کمال پامر (Palmer) کی تاریخ سے واقف تھے اور اس رپورٹ کا مطالعہ کر چکے تھے جس کے ذریعہ سے گورنمنٹ انکاری ہے رپورٹ مذکور میں پامر نے لکھا تھا کہ غازہ اور سویز کے مابین جو سفر میں نے کیا تھا، اس میں ۲۵ ہزار پونڈ بدوؤں کو رشوت دینے میں صرف ہوئے تھے یہ روپیہ خفیہ رکھا تھا، خدیو کے داخلہ کے دن وہ بازار میں تھے اور انھوں نے لوگوں کو خدیو اور انگریزوں کو گالیاں دیتے سُنا، انھوں نے اس بنا پر مصر میں رہنے سے انکار کر دیا تھا کہ عربی نہ جاننے کے باعث میں بہرا ہے، عزتی قبول کرتا گوارا نہیں کر سکتا۔ باوجود اس کے وہ عربی بادشاہ کے طرفدار نہ تھے، وہ عربی کی حب الوطنی کے بھی قائل نہ تھے۔

کرنل مور ہمیں بیرون شہر کی سیر کرانے کے لئے لے گئے، انھوں نے وہ پہاڑی دکھائی جس پر انگریز دوران محاصرہ میں قابض تھے، اور ساتھ ہی تمام جنگی امور کی تشریح بھی کی، انھوں وہ جگہ بھی دکھائی جہاں ہڈسن (Hodson) نے بادشاہ کے دو بیٹوں کو نشانہ بندوق بنایا تھا۔ اس نے ان دونوں کو ہمایوں کے مقبرہ میں گرفتار کیا تھا، اور ان کی جان بخشی کا بھی وعدہ کر لیا تھا، لیکن چونکہ ایک بہت بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا، اس لئے اُس نے ایک فوجی سے بندوق لی اور گاڑی میں جس جگہ وہ بیٹھے تھے وہیں انہیں بیٹھے بیٹھے نشانہ بندوق بنایا، مگر بادشاہ کی اُس نے جان بخشی کردی، اور اسے مرنے کے لئے رنگون میں بھیجدیا۔ یہ سرتاپا خوفناک داستان ہے اور یہ سچ ہے کہ ہر سو انگریزوں کے بدلے میں ایک ہزار ہندوستانیوں کا خون بہایا گیا، جن میں سے اکثر بے گناہ تھے۔ اسی طرح وارن (Warren) نے پامر کے قتل کے عوض میں جن بدوؤں کو گرفتار کیا وہ بدو نہ تھے جو قتل کے مرتکب ہوئے تھے، مور جیسے شخص کی زبان سے یہ تمام واقعات معلوم کرنا نہایت اہمیت رکھتا ہے انھوں نے کہا کہ مصر کے متعلق انگریز اس شدت سے جھوٹ بولے ہیں کہ یقین نہیں آتا۔

ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں پرم روز کا خط ملا، یہ خط بیرنگ کی طرف سے آیا تھا، جس میں شریف پاشا کا یہ پیغام درج تھا کہ مسٹر بلنٹ کو مصر میں اترنے کی اجازت نہیں دیجائے گی، مور یہ دیکھکر مسکرائے۔ میرا خیال ہے کہ جو باتیں میں نے بیرنگ سے کہیں تھیں، وہ وقوع پذیر ہوگئی ہیں

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنو کی دوکان بہت مشہور ہے

اور اس لئے بیرنگ ناراض ہو گئے ہیں برخلاف اس کے بریم روز نے یہ تار بھیجا ہے کہ آپ کارڈری کے دعوت نامہ کو قبول کر سکتے ہیں، اور ریزیڈنسی میں ٹھیر سکتے ہیں، فی الحال مصر کی سیاحت سے یہ معاملہ کہیں زیادہ اہم ہے، مجھے دکھائی دیتا ہے کہ یونیورسٹی کی اسکیم کامیاب ہو گی؛

۲۵ جنوری ———

دکن یونیورسٹی کا میں نے خاکہ تیار کر لیا ہے اور اسے نظام کی خدمت میں ایک چھٹی کے ساتھ سالار جنگ کو بذریعہ ڈاک بھیج دیا ہے۔ گارڈن کو بھی انکے سوڈانی مہم کے متعلق ایک خط لکھا ہے جس کا اعلان دو دن ہوئے بذریعہ تار ہو چکا ہے، میرا خیال یہ ہے کہ اگر وہ اپنی گذشتہ رائے پر قایم رہے یعنی یہ کہ مصر کے لئے خرطوم حاصل کریں تو اس کا نتیجہ برا نکلے گا۔ کارڈن کے نام جو چھٹی میں نے بھیجی تھی وہ حسب ذیل ہے:۔

دہلی ۲۴ جنوری ۱۸۸۴ء

میرے پیارے جنرل،

میں آپ کی سوڈانی مہم کے متعلق آپ کی خدمت میں یہ خط بھیجنے پر مجبور ہوں۔ آج کے تاروں میں اس تقرری کا اعلان کیا گیا ہے لیکن مقصد پر روشنی نہیں ڈالی گئی، اور میں آپ کو صرف متنبہ کر دینا چاہتا ہوں، ممکن ہے اس خیال سے جا رہے ہوں کہ مہدی اور مصر میں ہماری افواج کے مابین صلح کرا دیں، سوڈان میں مصر کی شہنشاہیت کو تسلیم کرلیں، اور انخلائے خرطوم کی شرائط طے کریں، اگر آپ کا مقصد یہ ہے تو خدا کرے کہ آپ جلد سے جلد کامیاب ہوں! یہ کام اچھا ہے اور آپ اسے بالضرور پایۂ تکمیل تک پہنچا لیں گے، لیکن اگر (جیسا کہ مجھے چند افسروں کی پرانی روایات سے اندیشہ ہے) آپ کے مشن کا مقصد اس غرض سے اقوام میں پھوٹ ڈلوانا ہے کہ ہم اس ملک کا کچھ حصہ خدیو کے لئے حاصل کرلیں، اس کے لئے افواج مہیا کریں اور روپیہ ضائع کریں تو یہ کام برا ہے، اور آپ اس میں ناکام رہیں گے، مجھے وہاں کے حالات سے پوری واقفیت ہے، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مصر، شمالی افریقہ اور عرب کا ہر ایماندار مسلمان مہدی کے مقاصد سے ہمدردی رکھتا ہے، اور اگرچہ وہ اسکے مشن کو الہامی نہیں سمجھتا، تاہم وہ یہ ضرور سمجھتا ہے کہ مہدی "آزادی، انصاف اور مذہبی حکومت (جو سراسر خدائی نعمتیں ہیں) کی نمایندگی کرتا ہے، اس خیال سے صرف گروہ شیاطین آپ کا ساتھ دے گا، اور بالآخر آپ کے ساتھ دغا کرے گا۔

میں آپ سے بمنت درخواست کرتا ہوں کہ آپ ہوشیار اور محتاط رہیں، اس قدیم ہمدردی پر اعتماد نہ کریں، جو انگریزوں اور عربوں کو متحد کئے ہوئے تھی، میرا خیال ہے کہ اب اسے تقویم پارینہ سمجھنا چاہیئے: اور یہ کہ آپ کا قابل احترام نام بھی آپ کی حفاظت نہیں کر سکے گا۔ ذرا اس کا خیال کیجئے کہ آپ کی وفات کے معنی کیا لیئے

ــــــــــــ

له Ocean Mission. (ضمیمہ میں دیکھو)

جائیں گے، انگلستان میں انتقام کی آواز بلند کی جائے گی، اور ان لوگوں کو بہانہ ہاتھ آجائیگا جو ملک فتح کرنیکی غرض سے جنگ سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں رکھتے، کاش مجھے اس بات کا یقین دلا دیا جائے کہ جو لوگ آپ کو بھیج رہے ہیں وہ آپ کے اس انجام کے متوقع نہیں ہیں، اگر میرے اندیشے غلط ہوں تو مجھے معاف کرنا، اور گزشتہ سال کی یاد میں مجھے ہمیشہ اپنا دوست سمجھنا۔

ولفرڈ اسکیون بلنٹ

"لوہارو والوں اور شہزادہ سلیمان جاہ کے ساتھ ہم نے دہلی کے جنوبی حصہ کی سیر کی، ہمایوں کے مقبرہ میں کھانا کھایا، قبر پر لوہارو والوں نے فاتحہ پڑھی، کیونکہ یہ ان کے بزرگ ہیں، اتنی مدت کے وفات یافتہ شخص کے مزار پر پھول چڑھانا دل میں رقت پیدا کر دیتا ہے، پرنس سلیمان نے ہمیں قریب کا ہندوؤں کا قلعہ بتایا اور ہمایوں کی تاریخ بیان کی اور کہا کہ وہ کس طرح ستاروں کا مطالعہ کرتے وقت نیچے گر کے وفات پا گئے وہ کہتے ہیں کہ یہاں قرب و جوار میں دہلی کے ۲۵ بادشاہوں کی قبریں موجود ہیں، باوجود اس کے کہ اس مقبرہ کے مجاور اور خدام موجود ہیں، تاہم طوطے آزادی سے دیواروں کی درازوں میں اپنے گھونسلے بناتے رہتے ہیں، مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ اور ان کے دو بیٹوں کو ہڈسن نے یہیں گرفتار کیا تھا جبکہ وہ حالت نماز میں تھے۔ میں نے پوچھا کہ بادشاہ کے دونوں بیٹوں کو نشانۂ بندوق بنا چکنے کے بعد دفن کرنیکی غرض سے یہاں لایا گیا تھا، وہ طنزاً مسکرائے اور کہا کہ کتوں کی لاشوں کی طرح انہیں دہلی کے بازاروں میں پھینکدیا گیا تھا، اور کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں دفن ہیں، خود بادشاہ کی قبر رنگون میں ہے، یہاں سے ہم ایک ایرانی شاعر[۱۵] کی قبر پر گئے جو اس وقت پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی، ہمارے دوست ان بہادروں کا ذکر کرتے رہے اور کہا کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں، انھوں نے کہا کہ ہمارا ملک شاعروں، بادشاہوں، اور فاضلوں سے پُر ہے، میں نے سمجھا کہ شاید وہ موجودہ حالت کو بیان کر رہے ہیں، لیکن درحقیقت وہ ان زندہ اشخاص کا ذکر کر رہے تھے جو زیر زمین دفن ہیں، ان مقامات کے بظاہر زندہ اشخاص تو محض غریب مجاور ہیں جو خیرات پر اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔

قطب صاحب کی لاٹھ پر چڑھا، اور ارد گرد کے کھنڈرات پر اپنے دوستوں کی طرح آنسو بہائے یہی وہ مقام ہے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کی نہایت خوفناک جنگ ہوئی تھی، اور جس میں ۲ لاکھ آدمی مارے گئے تھے، ہم نے تیمور لنگ کے بارے میں بھی گفتگو کی، میں نے اس کے مسلمان ہونے سے انکار کیا، لیکن میرے دوستوں نے نہایت گرمجوشی سے کہا کہ وہ سیّدوں کا بہت احترام کرتا تھا، اگرچہ، انہیں اس کی سفاکیوں اور انسانی کھوپڑیوں کے ڈھیر کا حال معلوم ہے بہرحال اس کا شمار ان کے بزرگوں میں ہے۔

گھر آنے پر ہم نے یونیورسٹی کی تجویز پر بحث کی، سب کے سب سید احمد کو نیچری کہتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، یونیورسٹی کی اسکیم گرمجوشی سے پسند کی گئی۔

۲۶-جنوری ———

دہلی سے الور کو روانہ ہوئے، اسٹیشن پر دیوان اور ریاست کے مسلمان ملازمین موجود تھے، ہم ہز ہائنس کے ڈاکٹر، ڈاکٹر موہن

---

[۱۵] غالباً غالب مرحوم کی قبر کی طرف اشارہ ہے، مترجم

تو آئرلینڈ کے رہنے والے ہیں، اور لوگوں سے بہت بہتر، دیر رکھتے ہیں، کے یہاں جاکر اترے، اُن کا بیان ہے کہ آلور میں ٹیکس کی مقدار بہت ہلکی ہے، کرنل پاؤلٹ نے جو لگان آراضی تجویز کیا تھا وہ پیداوار میں سے اخراجات وضع کرنے کے بعد ½ حصہ ہے اور اس پر بھی مہاراجہ بقایا لگان کو معاف کرتے رہتے ہیں وہ مہاراجہ کی بہت تعریف کرتے ہیں، وہ ہندوستان کے متعلق عمدہ خیالات رکھتے ہیں، لیکن انھوں نے اس جذبۂ نفرت کو تسلیم کیا جو ہندوستان کے بعض حصوں میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان پایا جاتا ہے، اُن کا خیال ہے کہ غدر کے سبق کے بعد وہ دوبارہ کبھی بغاوت پیدا نہیں کریں گے۔ یہاں مجھے اُن کی رائے سے اختلاف ہے۔

شام کو مہاراجہ سے ملاقات ہوئی وہ لان ٹینس میں بیٹھے ہوئے کھیل دیکھ رہے تھے، وہ گھوڑوں کے بہت شائق ہیں، آلور کے مسلمان بہت خراب حالت میں ہیں، شیخ واجد کہتے ہیں کہ ان میں سے اکثر محض نام کے مسلمان ہیں مہاراجہ مسلمانوں سے فیاضانہ طریقہ سے پیش آتے ہیں، انھوں نے کہا کہ ہمیں یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ آپ اسلام کے بھی خیر خواہ ہیں، وہ سید احمد کو پسند نہیں کرتے۔

۲۷-جنوری

شہر کا محل دیکھا، لائبریری کا بھی معائنہ کیا، وہاں ایک نہایت شاندار قرآن مجید موجود ہے بابر، ہمایوں، اور اکبر کی تصاویر بھی دیکھیں، سلاح خانہ بھی شام کو جے پور آگئے۔

۲۸ جنوری

جے پور، آلور کے مقابلہ میں کم دلچسپ جگہ ہے، اور ہم نے بھی اسے غیر دلچسپی سے دیکھا، ہماری رحیم واحد مسلمان سے ملاقات ہوئی، وہ ہوٹل کا مالک ہے اور آگرہ کالج کا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہاں مسلمانوں کی خاص تعداد ہے جن میں سے اکثر زمیندار اور تجارت پیشہ ہیں، ہم رات کو عازم بمبئی ہوگئے۔

۲۹ جنوری

راستہ میں ایک انگریز بیرسٹر سے بات چیت رہی، یہ شخص حیدرآباد میں پریکٹس کرتا ہے اس لئے وہاں کے بہت سے دلچسپ واقعات سنا دیے؛ سر سالار جنگ کی وفات کے وقت وہ وہاں موجود تھے اُن کا خیال ہے کہ وہ طبعی موت نہیں مرے اگرچہ ریزیڈنسی کے ڈاکٹروں نے یہ تصدیق کردی تھی کہ انہیں ہیضہ ہو گیا ہے۔ مگر وفات کے بعد پوسٹ مارٹم[۵] نہیں کیا گیا، سالار جنگ کی وفات اچانک واقع ہوئی حتیٰ کہ وہ کوئی وصیت بھی نہ کرسکے۔

۳۰ جنوری

بمبئی پہنچ گئے اور کھانا کھایا، گارڈن خرطوم سے اب آدھے راستہ پر ہیں اور اپنے ساتھ وہ آرلوز کے سابق نماد کو بھی لے گئے ہیں یقیناً اس کا انجام خراب ہوگا، مجھے بھروسہ ہے کہ میری چٹھی انہیں بروقت مل جائے گی۔

مالاباری سے ملا، مگر وہ البرٹ بل کے سمجھوتہ پر اپنی کارروائی سے کچھ شرمندہ سے تھے اب اُن کی یہ رائے ہے کہ انقلاب کئے بغیر ہم کچھ حاصل نہیں کرسکتے، گورنمنٹ پلیڈر مسٹر منڈلک سے ملاقات ہوئی، میں نے اُن سے پونہ کا واقعہ بیان کیا، انھوں نے مجھ سے کہا کہ میری تمام

---

۵ Post mortem

متعدد بار کی جا چکی ہے، ایک دفعہ تو بنارس اور الہ آباد کے درمیان مجھے گردن پکڑ کر گاڑی سے باہر نکال دیا گیا، بمبئی میں ہر ہندوستانی کا کم و بیش یہی تجربہ ہے۔

۱۰ فروری ——————

دوپہر کو حیدرآباد روانہ ہو گیا۔

۲۔ فروری ——————

دن بھر ٹرین میں گزرا، ٹرین ذرا دیر سے پہنچی اس لئے کہ بہت سے لوگ تخت نشینی کے موقع پر موجود رہنے کی غرض سے آ رہے تھے، وائسرائے کی ٹرین چند گھنٹے پیشتر نکل گئی، واڑی پر جس قدر کھانے کی چیزیں تھیں سب کی سب وائسرائے کھا گئے؛ تمام اسٹیشن جھنڈیوں سے سجے ہوئے تھے ۹ بجے رات کو حیدرآباد پہنچے، وہاں معلوم ہوا کہ کار گاڑی اور ان کے تمام مہمان بلارم میں ہیں، اس کے یہ معنی ہیں کہ ابھی گیارہ میل کی مسافت اور باقی ہے؛

(باقی)

ض۔ ا۔ ب (بی۔ اے)

غزل

در چمن بوئے چو زاں طرۂ پیچاں گزرد		سنبل آشفتہ شود گل ز گریباں گزرد
بر کشد یار گر از چہرۂ پوشیدہ نقاب		کافر از کفر و ز اسلام مسلماں گزرد
یارب ایں چیست کہ سودا زدہ زلف بیا		ہم ز معمورہ رود ہم ز بیاباں گزرد
صبح عمرم ہمہ شب گشت تمنا سوز است		نہ بکاشانہ آں شمع شبستاں گزرد
گر ہمی گریہ ات اے چشم بود خواہی گشت		چوں حبابے کہ سراسیمہ بہ طوفاں گزرد
بیتو در محفل آتش نفساں شمع است		دود پیچاں ز لب سوختہ جاناں گزرد

جز لب عارف خود رفتہ کہ با تشنہ داند
برود بر سر پیمانہ ز پیماں گزرد

عارف اجمیری

داؤد دکھنی

انجمن ترقی اردو کے قیام کے بعد سے لوگوں کو دکھنی لٹریچر سے دلچسپی پیدا ہوگئی، اور اکثر لوگوں نے نہایت ہی تیزی اور سرگرمی سے مواد فراہم کرنا شروع کردیا ہے۔ خود انجمن ایک معتدبہ سرمایہ کی مالک ہے، آغا حیدر حسین صاحب دہلوی نے نہایت ہی عمدہ ذخیرہ فراہم کرلیا ہے اور آئے دن جمع کرتے جاتے ہیں، محترم نواب عالی رزاعی معتمد انجمن ارباب اردو نے بھی معتدبہ مواد پیدا کرلیا ہے، مولوی ابوعمر صاحب یافعی کے پاس بھی خاصا ذخیرہ موجود ہے، مکرمی وفا صاحب مدیر رسالہ تاج (حیدرآباد) کو بھی شوق ہوا ہے، اور چند نایاب کتابیں پیدا کرلی ہیں، امام علی صاحب اورنگ آبادی ڈرائنگ ماسٹر مدرسہ فوقانیہ رائچور (دکن) کے پاس بھی چند کمیاب نسخے ہیں، اور وہ بھی قدیم لٹریچر کے شوق میں سرگرداں ہیں، مگر افسوس ہے کہ ان اصحاب نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا۔ آغا صاحب کے چند مضامین البتہ دیکھنے میں آئے مگر اس کے بعد سے وہ بھی خاموش ہیں، مولوی ابوعمر صاحب نے رسالہ تحفہ (دور اول) میں ایک سلسلہ شروع کیا تھا، مگر وہ بھی رک گیا، سنا ہے کہ آغا صاحب ایک دکھنی لغت مرتب کررہے ہیں، اور وفا صاحب "دکن کے ضرب الامثال" خدا کرے یہ دونوں چیزیں جلد شائع ہوں، یہ وہ اصحاب ہیں جو فی الوقت دکن میں ہیں، مگر بعض اصحاب باہر بیٹھے ہوئے بھی اسی فکر میں ہیں، مولانا احسن نے "اردوئے قریبہ الوطن" اور "ولی" پر مضامین لکھکر ایک عظیم الشان احسان کیا۔ ایک صاحب نے معارف اعظم گڈھ میں "سراج اورنگ آبادی" پر ایک سلسل مضمون لکھا ہے، حیدرآباد کے ایک قدیم مقالہ نگار مولوی شمس اللہ صاحب قادری نے "اردوئے قدیم" اور نصیر الدین صاحب ہاشمی نے "دکن میں اردو" لکھ کر ایک کارآمد چیز محفوظ کردی مگر افسوس ہے کہ اول الذکر رسالہ تو خیر کسی قدر معلومات میں اضافہ تو کرتا ہے مگر ثانی الذکر تالیف اگر طبع نہ بھی ہوتی تو بھی اردو کو کچھ نقصان نہ پہونچتا، اس میں کوئی بات اس قابل نہیں جو فائدہ بخش کہی جاسکے، افسوس ہے کہ اس وقت موقع نہیں ہے ورنہ ایک بسیط تنقید لکھنے کا ارادہ تھا!

اس مختصر تمہید کا مقصد یہ تھا کہ دکھنی لٹریچر سے عام دلچسپی پیدا ہوئی ہے اور وہ دن قریب ہے کہ اردو کی صحیح تاریخ مرتب کیجا سکے، اب تک ولی دکھنی ہی اردو کا پہلا شاعر مانا جاتا تھا، مگر اب یہ خیال غلط ثابت ہوا ہے، اور ولی سے پہلے کے شعرا کا کلام مل چکا ہے، اردو کی پیدائش عہد بہمنیہ میں ہوئی حضرت خواجہ بندہ نواز قدس سرہ (۸۲۵ھ) کے زمانہ میں دکھنی یا اردو میں شعر موزوں کئے جاتے تھے۔ چنانچہ خود حضرت نے چند شعر کہے ہیں ؎

بہو کوں مرنے سوں خدا کچہ اپڑتا ہے	خدا کوں اپڑنے کی استعداد ہور ہے
پانی میں نمک ڈال مزاں دیکھنا اسے	جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے
یوں کھوئے خودی اپنی خدا ساتھ محمدؐ	جب گل گئی خودی تو خدا ہی کوئی دسے
آنتوں طبلہ واتوں تو نہ	پتین کے گہر جائے کون

اگر سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر ڈھونڈھا جائے تو سلطان قلی قطب شاہ المتوفی سنہ ۱۰۲۰ھ تھا جس نے دیوان مکمل کیا ہے اس کے بعد اور کئی شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے مرثیے، مثنویاں وغیرہ لکھیں، اس میں شک نہیں کہ ولی نے صنعات سخن پر توجہ کی ہے اور ہر ایک صنف تقریباً مکمل کی ہے مگر اسی کو "بابا آدم" بنا دینا غلطی ہے، ولی کے کارنامہ میں اردو شاعری کی اچھی حالت تھی ان کے شاگردوں کی اور معاصرین کی تعداد بھی خاصی تھی جن میں اکثر صاحب دیوان ہیں۔

میرزا داؤد، ولی کے ہم وطن اور ہمعصر تھے، بعض تذکرہ نویسوں نے ان کو ولی کا شاگرد بھی لکھا ہے، مگر یہ ایک لطیف مغالطہ ہے۔ اس کے ذمہ دار خود داؤد ہی ہیں اس لئے کہ انھوں نے ہر جگہ ولی کی تعریف کی ہے اور بہت سراہا ہے مگر کہیں بھی کھلے لفظوں میں شاگردی کا اعتراف نہیں کیا اگر وہ ولی کے شاگرد ہوتے تو یقیناً فخر سے اظہار کرتے مگر ایسا نہیں کیا،

داؤد اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں انتقال کیا ع

گو برفتہ میرزا داؤد فانی از جہاں

تاریخ وفات (سنہ ۱۱۶۰ھ) ہے آپ کے ایک فرزند جان اللہ عشق تھے جنھوں نے وراثتاً شاعری پائی تھی، ہمارے تذکرہ نویسوں نے نہ تو تاریخ ولادت لکھنے کی کوشش کی ہے اور نہ تاریخ وفات نہ تفصیلی حالات اگر کسی شاعر سے محبت یا عقیدت تھی تو بہت سا کلام نقل کر دیا اور تعریف کر دی ورنہ بہت ہوا تو دو تین مہمل شعر نقل کر کے "از پوچ گویان این دیار" لکھ دیا، یہی وجہ ہے کہ کسی شاعر کا تفصیلی حال نہیں ملتا، میرزا داؤد کی گمنامی بھی اسی عنوان کے تحت ہے، کسی نے بھی ان کا حال نہیں لکھا، آصفی ملک پوری مرحوم نے البتہ بہت سے شعر نقل کئے ہیں ہم کوشش کریں گے کہ داؤد ہی کے اشعار سے ان کے حالات معلوم کر سکیں، گو شاعری انسان کے خصائل اور عقائد کی صحیح تصویر نہیں پیش کر سکتی مگر اس کے حالات اور خیالات کی ضرور ترجمان ہے؛

داؤد کے مذہب کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا، انھی کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ سنی المذہب مسلمان تھے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

ہوں عندلیب دین محمدؐ کے باغ کا — ہیں چار یار میری نظر میں چہار گل

صرف یہی ایک شعر ہے جس میں "چار یار" کی طرف اشارہ ہے، ورنہ اور کسی جگہ ایک لفظ تک نہیں کہا، ؎

جہاز دل اگرچہ غرق ہے دریائے عصیاں میں — میسر ہے اسے ساحل محمدؐ کی شفاعت کا

سر اوپر جیکے افسر سایۂ داماں احمدؐ ہو — اسے کیا باک ہے داؤد خورشید قیامت کا

اور ایک شعر بڑے مزے کا ہے ؎

محمد مصطفیٰ کی یاد سیتیں — مرا دل قلعۂ احمد نگر ہے

شاید ان کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ میں محمد مصطفیٰ کو یاد کرتا رہتا ہوں اس لئے میرا دل قلعۂ احمد نگر کی طرح مضبوط اور مستحکم ہے کتنا نیا مضمون ہے آج تک کسی نعت گو کو نہیں سوجھا!

مولوی عمر صاحب نے داؤد کے وہ اشعار الگ کر لئے ہیں جو جناب امیر علیہ السلام سے عقیدت کا پتہ دیتے ہیں ؎

اعطر علی محمد علی تاجر عطر کا عطر زمانہ میں مشہور ہے

اے ہر باد مخالف سوں ناحق کیا خوف — علیؓ کے عشق میں جو دل کے تیں حصار کیا

کیا ہی داؤد نے روز جزا سوں زیاں — حب علیؓ جس کے تئیں پایہ ایمان ہوا

مجکو اے داؤد کیا تاریکی عصیاں سوں خوف — حب حیدر دلمیں میرے شمع نورانی ہوا

یہیں بجا ہے اے داؤد خاک راہ اولاد علی — شعر میرا وہ پڑھے جو ہو محب بوتراب وغیرہ وغیرہ

داؤد ایک فقیر منش، عاشق مزاج، شاعر معلوم ہوتے ہیں، ذیل کے اشعار ان کی قناعت پسندی ظاہر کرتے ہیں ؎

جو رکھا ملک قناعت بیچ ہو ثابت قدم — اس کو نقش بوریا نقش سلیمانی ہوا

جسنے سیماب نفس اپنے کو مارا خاکساری میں — یقین کر جان اسکو کیمیا گر ہے قناعت کا

نگین مانند حاصل ہے اسے آخر سیہ روئی — جسنے خواہش ہے اے داؤد جگ میں نامداری کی

تجھ کوں ہونا ہے اگر اہل نظر — مت نظر رکھ اپنی سیم و زر طرف

گر تو چاہے ہے سکندر وقت ہوئے — سیر کر ملک دل کے بحر و بر طرف

نہ رکھ دل میں غم مسند نشینی — بساط اہل دل فرش زمیں ہے

عشق کے متعلق نہایت ہی گہرے اور عمدہ خیالات رکھتے تھے، کہتے ہیں ؎

جگت میں جس نے علم عشق حقیقی کا کیا حاصل — لیا ہے درس اول نسخۂ عشق مجازی کا

طبیعت پر فقر و گوشہ نشینی کے ساتھ عزلت گزینی اور مذہب کا بھی رنگ چڑھا ہوا تھا، چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہزار حیف گنوایا وہ لذت عقبیٰ — جو کوئی لذت دنیا کوں اختیار کیا

مگر اس خاکساری میں بھی خود داری موجود ہے ؎

اہل جوہر ہیں آرسی مانند — کیا ہوا اگرچہ خاکسار ہیں ہم

مگر بے قدری کا رونا بھی روتے ہیں ؎

پوچھتا کوئی نہیں ہماری قدر — بسکہ محتاج روزگار ہیں ہم

نیلے زمانہ کی شکایت کرتے ہیں، اور کس بہترین پیرایہ میں کہتے ہیں ؎

نیلے زمانہ سبتیں غمناک ہوا ہے — اس واسطے ہر غنچۂ دل چاک ہوا ہے

بروجد "کے بھی قایل ہیں اور کس مزے سے کہتے ہیں ؎

غیر گردش کے پوچھتا نہیں رزق — شاید اس کے ہیں آسیا سے تنگ

ولی سے بہت عقیدت تھی اور کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے ؎

بعد از ولی ہوئے ہیں کئی شاعراں ولیکن — داؤد شعر تیرا مشہور ہے دکن میں

کہتے ہیں سب اہلِ سخن اس شعر کوں سُن کر تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

حق نے بعد از ولی تجھے داؤد صوبۂ شاعری بحال کیا ؛

تجھے تو بس ہے یہی مصرع ولی داؤد کہ "مجھکوں شورِ قیامت سی بے نیاز کیا"

ہوا معلوم مصرع سوں ولی کے "پری رخسار سے ملنا ہنر ہے"

راست لے داؤد کہتا ہے ولی "عشق میں صبر و رضا درکار ہے"

کیا مجھ صید مصرع نے ولی کے "تمنا کا انداز دل و من ہرن ہے"

ولایت کے ہی وہ دفتر سوں منکر رکھے جو نام دیوانِ ولی کو

اکثر غزلیں ولی کی غزلوں پر کہی ہیں اور بڑے احترام سے ولی کا نام لیا ہے جب اس قدر عقیدت کا اظہار کرتے ہیں تو شاگردی کے اظہار میں کون امر مانع تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ ولی سے تلمذ نہ تھا ورنہ ضرور تذکرہ کرتے ؛

ولی کے آگے اپنے آپ کو ہیچ تصور کرتے تھے، مگر اپنی شاعری پر فخر بھی تھا ؎

شعر تیرا مثال میں داؤد غزلِ صائب صفاہاں ہے

ہر بیت اپنی لوح دل اوپر کریگا نقش داؤد کا جو شعر جسے تم سُناؤ گے

بوالہوس کیا سمجھ سکے داؤد شعر تیرا تمام رازی ہے

حلاوت فہم کی مجلس میں داؤد تیرا ہر شعر شیریں جیوں شکر ہے

شعرِ داؤد کا ہر جا نہ پڑھو اے یاراں جز سخن فہم کہیں اس کو نمایاں نہ کرو

علم باندھا ہوں لے داؤد مژگاں غزالاں سوں کہ رکھتا ہے مرا ہر مصرع اقسامِ رمِ آہو

تیرا یہ شعر لے داؤد کیا سمجھے ہر اک اجہل سخن سنج تو پاوے اسکے معنی کی لطافت کو

جو کہ رنگیں خیال ہے داؤد وہ پڑھے تیرے شعر رنگیں کوں

داؤد سُن کے تیرے سخن کا بہار رنگ کرتے ہیں خوان نقد زر اپنا نثار گل

جو سُنے داؤد یو شیریں سخن تا رہے رغبت اسے شکر طرف

درد سُنوا را اس کو بھاتا نہیں شعرِ داؤد کا کیا جو گوش

شعر بھاتا نہیں لئے داؤد جسنے اہلِ سخن نہیں دیکھا

ہر ایک بیت ہے مجھ شعر کی خیالِ محال بجا ہے مجھکو کہیں آج کل جلال اسیر

شعرِ داؤد کا مثالِ خار حاسداں کے جگر میں سلتا ہے

شاہ سراج اورنگ آبادی معاصر تھے آپ نے انپر بھی چوٹ کی ہے ؎

جب سے روشن ہے مجھ سخن کا شمع
رشک ستیں سراج جلتا ہے

تو بس نہ جانے کون تھے کہ داؤد نے جس کی غزل پر غزل کہی ہے، اور ان کے مصرع پر اس طرح مصرع لگاتے ہیں ؎

یکھ یو مصرع قابل ہے راز معنوی
صنم کے ناز پہ میں سر کیتیں نیاز کیا

ولی کے بعد صوبہ کا شاعر جسے حقدار حقیقتہً داؤد ہی تھے، ولی کے معاصرین میں دیکھا جائے تو ایک داؤد ہی ایسے نکلیں گے جو پُرگو اور ولی کا تتبع کرنے والے تھے، اور اپنے کلام میں ولی کا انداز رکھتے تھے، بعض بعض بہترین شعر کہتے تھے اور اصناف سخن کی طرف بھی توجہ کی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ لاابالی تھے، کسی کام کو پورا نہیں کیا ؎

تجھ سخن کے طلا کوں لے داؤد
محک دل میں یار کستا ہے

دیکھئے کس قدر سے مطلع ہو گئے، بعض ایسی زمینوں میں بھی فکر کی ہے اور نہایت ہی شگفتہ شعر نکالے ہیں، چنانچہ یہ غزل ملاحظہ ہو ؎

نگاہ یار سے پایا جو پیغام رم آہو
لئے حاصل ہے عالم میں سدا کام رم آہو

بنے جو تیغ عشق زلف پرواز وحشت میں
صنم کی چشم میں لبریز ہے جام رم آہو

دل یساں وحشی کیوں نہ ہو اس چشم وحشی سوں
کہ یک گردش میں جس کے ہے سرانجام رم آہو

غزالاں دیکھ تجھ کوں اے صنم پابند ہوتے ہیں
ہوا معلوم ہے تیری نگہ دام رم آہو

چنے لے خوش نہیں دیکھا ہے تجھ انکھیاں کی گردش کو
نہیں لیتا زباں پر دہ کبھی نام رم آہو

علم باندھا ہوں اے داؤد فن گان غزالاں سوں
کہ رکھتا ہے مرا ہر مصرعہ انداز رم آہو

ساحل غزلیں سب کے پہلے ولی نے کہی ہیں مگر داؤد نے بھی اس کا تتبع کیا ہے اور مسلسل باندھے ہیں ؎

گلبدن ہے سحاب باراں ہے
باغ ہے مطرب خوش الحاں ہے

ساقیا لا شراب کشتی سے
موج آب ہوا کا طوفاں ہے

عشرت موسم شباب بدل
جام سے عشق خوب ارزاں ہے

بس ہی اسکوں کباب لخت جگر
آتش عشق سوں جو بریاں ہے

دل صد چاک آج مثل انار
خوں فشانی میں اپنی خنداں ہے

برق ہے آہ سوں میرے بیتاب
ابر مجھ غم سوں اشک ریزاں ہے

اس صنم کے خیال زلف ستیں
دل بے تاب نت پریشاں ہے

اہل جوہر جو جگ میں ہے داؤد
آرسی کی مثال حیراں ہے

بعض جگہ بہترین استعارات و تشبیہات کا استعمال کیا ہے، دیکھئے کس لطف سے رقیب کو راہزن بتاتے ہیں۔

کیوں نہ ہو عاشقی میں فکر رقیب ۔۔۔ ہر سفر میں خطر ہے راہزن کا

منقار طوطی کے سرخ ہونے کی وجہ کیا بہتر ہے

نا پڑے اب سخن کو کام آہن دل سیتی ۔۔۔ ہر سخن طوطی کی خونیں سوں ہے منقار سرخ

محبوب جب مہندی لگاتا ہے تو آپکے تلوں سے آگ لگتی ہے شاید اسلئے کہ آنچ نہ جائے، کہا ہونٹے کے مہندی لگائی یا اس لئے کہ مہندی لگانیکی وجہ سے وہ ان تک نہ آ سکیگا۔

آگ لگتی ہے مجھ کوں تلووں سے ۔۔۔ جب حنا پاؤں میں لگانے ہیں

شبنم کا شان نزول بھی ان کے عقیدے کے موافق سن لیجیے

شبنم نہیں محبان آل نبی کے غم سوں ۔۔۔ دتے ہیں قدسیاں سب برات کوں گل پر

اپنی بیتابی کی وجہ کس عمدگی سے بیان کرتے ہیں

کیوں نہ ہو تجہ چشم کا مخمور پیارے بیتاب ۔۔۔ جام مئی جنسے پیا اسکوں نہیں آرام و تاب

ایک پرانے مضمون کا جسے ۔۔۔۔ فارسی شعرا نے اکثر باندھا ہے کس خوبی سے ترجمہ کرتے ہیں

روز بد کوئی رفیق نہیں کسی کا ۔۔۔ سایہ وقت زوال ڈھلتا ہے

کسی استاد کا شعر ہے صبح صادق مرہم کافور دارد در بغل ہ گر علاج جنس عصیاں کن ہشیار باش ۔ اس کا ترجمہ کس خوبی سے کرتے ہیں

چاک ہے دل زخم عصیاں سوں اگر ۔۔۔ صبح صادق مرہم کافور ہے

کبھی جامہ گلابی دیکھکر گرمی عشق فرو ہو جاتی ہے

کیوں نہ اب فرو ہووے گرمی دل عاشق ۔۔۔ بر میں اس رنگیلے کے جامہ گلابی ہے

معلوم ہوتا ہے کہ کسی "دہرم چند" نامی پر فریفتہ تھے ایک جگہ اس کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

حسن کوں راہ عشق میں کردان ۔۔۔ نام تیرا اگر "دہرم چند" ہے

جنت سے بالکل بے غرض ہیں اس واسطے کہ گندم گوں پر فدا ہیں اور ظاہر ہے کہ گندم پرست جنت میں نہیں رہ سکتا

مثل آدم کے غرض مجھ کو نہیں جنت سوں

حسن اس یار ستمگار کا گندم گوں ہے

تمکین کاظمی گلبرگہ

اگر آپ کے خط کا جواب نہ پہنچے تو سمجھ لیجیے

کہ آپنے اپنے خط میں نمبر خریداری نہیں لکھا

مینیجر

آل انڈیا افیونی کانفرنس لکھنؤ

(نگار کے نمایندۂ خصوصی کے قلم سے)

میں سمجھتا تھا کہ تجارت افیون کے متعلق حکومت ہند کی جدید پالیسی یقیناً ہندوستان کی ایک جماعت کو بیدار کئے بغیر نہ رہیگی، اور جس وقت میں نے اخبار ہمدم لکھنؤ میں (جو بلاشبہ اپنے جامۂ اشاعت اور وسعتِ ادارت کے لحاظ سے ہندوستان کا تنہا افیونی اخبار کہا جا سکتا ہے) شاہزادہ؟ غاسنے کی طرف سے (جو نہ صرف بلحاظ کمیت و کیفیت بلکہ نسلی روایات کی بنا پر بھی ہندوستان کے قدیم ترین افیونی ہونے کا فخر رکھتے ہیں) وہ اعلان دیکھا جس کی سرخی میں یہ شعر درج تھا ؎

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد

روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد۔

تو میں اپنے تصور و خیال کی پیشین گوئی کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر پھڑک گیا۔ ممکن ہے بعض حضرات اس شعر کے محل استعمال کو دیکھ کر اعلان کرنیوالے کی ہنسی اُڑائیں لیکن جن "خلوتیانِ راز" کو میری طرح "مراقبہ فرمایانِ سلوکِ راہِ افیون نوشی" میں شریک ہونے کا فخر حاصل ہو چکا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اس سے زیادہ موزوں شعر کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا تھا اور بعض تو یہاں تک خیال کرتے ہیں کہ شاعر یقیناً کوئی افیونی ولی تھا (اور افیونی کون ایسا ہے جو ولی نہ ہو) جس نے سینکڑوں سال پہلے اس حادثہ کی خبر اس شعر کے ذریعہ سے کر دی تھی۔

عام طور پر اس شعر کا استعمال اس وقت کیا جاتا ہے جب کوئی لطف بہت عارضی و ناپائدار ثابت ہو، پھر اس حال میں جب کہ "افیون نوشی" کی تاریخ بالکل عہد طفلی میں تھی، اور اس کی ابتدا کو چار پانچ ہزار سال سے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا، حکومت ہند کا یہ قہرمانی عزم کیا "چشم زدن" کا منظر پیش نہیں کرتا۔ خدا افیون سے بھرے ہوئے حوض میں جگہ دے چو چو مرحوم فغفور چین کو جس نے ۰۰۰ سال قبل مسیح، اشراقی اصول کے ماتحت دنیا پر ثابت کر دیا تھا کہ اگر میرے بعد کم از کم ۲۵ ہزار سال تک اس مسلک کی پیروی جاری رہی، تب کہیں جاکر اخلاق انسانی درست ہوں گے، اور عالم میں ایک عام دور امن و صلح کا رونما ہوگا، پھر کیا اب بھی کوئی شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ "چشم زدن" کا استعمال غلط تھا۔ اب رہ گیا "صحبتِ یار" کا فقرہ سو غالباً اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ صحیح معنی میں "پیرِ من و جوانِ من ست" کا اطلاق جیسا افیون پر ہو سکتا ہے، کسی اور چیز پر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے مصرعہ کا تعلق بالکل افیون کی شکایت سے ہے، اور جنھوں نے کوکنار کے پھولوں کو کھیتوں میں کھلتے ہوئے دیکھ کر ان کا لطف اُٹھایا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ "روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد" کس قدر موزوں مرثیہ ہے۔

افسوس ہے کہ مجھے اس اعلان کا علم بہت دیر میں ہوا، استغراق اور مراقبہ کی کثرت سے روزانہ اخبار بھی ایک ایک ہفتہ کے بعد دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ ہمدم میں یہ اطلاع چند روز پہلے ہی درج ہوئی تھی لیکن میں دیکھ سکا اُس وقت جب صرف ایک آخری ریل مجھے بر وقت پہنچانے کے لئے رہ گئی تھی، اسی لئے میں اپنے ہاں کے نمایندوں کو بھی ساتھ نہ لیجا سکا، الغرض جلدی جلدی ڈبیہ جیب میں ڈالی، حقہ ساتھ لیا، چٹائی بغل میں دابی (شرکا کے لئے یہ ضروری شرط تھی تاکہ اسٹیشن پر آسانی سے پہچان لئے جائیں) اور اسٹیشن روانہ ہوگیا۔

ریل میں بیٹھتے ہی چونکہ پھر اشراقی کیفیت مجھ پر طاری ہوگئی، اس لئے لکھنؤ تک کا سفر کیونکر طے ہوا، میرے درجہ میں کون کون لوگ تھے اس کی مجھے خبر نہیں

جس وقت لکھنؤ اسٹیشن کے ہنگامہ سے میں بیدار ہوا، اور تمام مسافروں کے اترنے کے بعد میں پلیٹ فارم پر آیا تو دیکھا کہ دس پندرہ حضرات اور بھی مختلف درجوں سے آہستہ آہستہ سرکتے ہوئے آرہے تھے اور کانفرنس کے والنٹیر نیم خفتہ و نیم بیدار حالت میں ان لوگوں کی پذیرائی کے لئے بڑھ رہے تھے۔ میں بھی اسی جماعت میں شامل ہو گیا جو "زیر قدمت ہزار جان ست" پر عمل کرنے کے خیال سے کم از کم پندرہ منٹ میں باہر پہنچی۔

اب یہ سوال پیدا ہوا کہ فوراً جائے قیام پر جانا چاہئے یا کچھ دیر یہاں آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ آخرکار باہم مشورہ سے یہی طے پایا کہ ایسی جلدی نہیں اور وہیں ایک درخت کے نیچے چٹائیاں جن پر تو نوں کی آگ نے اکثر جگہ منجزبا دیا تھا بچھا دی گئیں۔ حقے تو پہلے سے رکھے ہوئے تھے اور تھیلیاں کھول کھول کر تمباکو، کوئلے کی ٹکیاں، دیاسلائی، پیالیاں، اور افیون کی ڈبیاں نکال کر شغل شروع ہوا۔ کوئی کو ملہ پھونک رہا تھا، کوئی حقہ بھر رہا تھا، کوئی پیالی میں افیون گھول رہا تھا، کوئی گن گنا رہا تھا۔ کوئی روم و روس کی جنگ کا افسانہ سنا رہا تھا، کوئی لندھور بن سعدان کا قصہ کہہ رہا تھا، الغرض یہی طرح طرح کی میگوئیاں ہو رہی تھیں، کہ لوگوں کا ہجوم ہو گیا اور بیک وقت تیس چالیس افیونیوں کو شاہراہ عام پر دیکھنے کیلئے قلی، دوکاندار، یکہ تانگے والے، اور مسافر سبھی دوڑ پڑے، لیکن ان بندگان خدا نے مطلق پرواہ نہیں کی اور اپنے شغل میں نہایت سنجیدگی و متانت کے ساتھ منہمک رہے۔ الہ آباد کے میر باقر حسین نے ایک مرتبہ نگاہ اٹھا کر دیکھا تو صرف یہ بولے کہ "بھائیو کیا دیکھتے ہو، مصیبت میں مبتلا ہیں، حکومت پامال کر رہی ہے، ہو رہے ہیں، تم بھی ہنس لو اگر تمہارا جی چاہے، چند دن کے مہمان ہیں ورنہ ۱۹۲۹ء کے بعد پھر کہاں تم کہاں ہم" یہ کہکر انھوں نے ٹھنڈی سانس لی اور آبدیدہ ہو کر پیالی منہ کو لگائی، اور پھر حقہ میں مصروف ہو گئے۔

صبح سات بجے ریل لکھنؤ اسٹیشن پر پہنچی تھی۔ لیکن ٹھیک دس بجے عیش باغ کے اس میدان میں پہنچ سکے، جہاں بہت سے جھونپڑے مہمانوں کے لئے ڈالدیئے گئے تھے، ہر جھونپڑے میں کم از کم دو مہمان رکھے گئے تھے اور خوش قسمتی سے میرا ساتھ میر باقر حسین صاحب ہی کا ہوا، جو نہایت معقول و سنجیدہ اور درجہ خوش تقریر انسان تھے۔

اس کانفرنس میں باہر کے نمائندے دو سو سے زیادہ نہ تھے لیکن مقامی شرکا کی تعداد معہ والنٹیروں کے کسی طرح .. ۵ سے کم نہ تھی، پنڈال بھی پھونس کا بنا ہوا تھا، اور بعض لوکل اخباروں نے اس طرف توجہ بھی دلائی کہ جس کانفرنس کے شرکا کا ضروری جزو معاشرت آگ بھی ہو اس کے لئے مناسب نہیں ہے کہ وہ پھونس کے پنڈال کا انتظام کرے، لیکن شاید یہ اعتراض استقبالیہ کمیٹی کی نظر سے نہیں گزرا، اور دیکھا بھی ہو تو توجہ نہ کی گئی ہو کیونکہ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ انتظام قصداً کیا گیا تھا، تاکہ جب آگ بنانے کی ضرورت ہو، تو فوراً ایک پولا نکالکر دیاسلائی دکھا دی جائے اور جہاں تک مجھے علم ہے اس پر عمل بھی نہایت آزادی سے کیا گیا، کیونکہ جس وقت کانفرنس ختم ہوئی ہے تو پھونس کے جھونپڑوں اور پنڈال کی ویرانی کا یہ عالم تھا جیسے آندھی سارا ہی گھاس کو اڑا لے گئی ہو۔ میں یہاں کے اور انتظام کا ذکر نہیں کرونگا کیونکہ وہ اس قدر اہم نہیں تھے، لیکن مختصراً یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ چار کھانے، تمباکو، افیون، مٹھائی اور گنے وغیرہ کا انتظام معقول تھا۔ اور ہر شخص اہل لکھنؤ کی مہمانداری و تواضع کا شکر گذار تھا۔

دوسرے دن دس بجے سے کانفرنس شروع ہونیوالی تھی، لیکن بارہ سے پہلے تمام نمائندے جمع نہ ہو سکے، پنڈال میں چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں اور وسط میں ایک چوکی صدر کے لئے رکھدی گئی تھی۔

جب جناب صدر (سید علی نقی صاحب المتخلص بہ مسکین سندیلوی) تخت پر چار زانو ہو کر بیٹھ گئے تو شاہزادہ آغا منے نے (جو استقبالیہ کمیٹی کے

صدر نے اپنا خطبہ شروع کیا جس کا متن ذیل میں درج ہے:-

"جناب صدر و برادران ملت

ہم لوگوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس طرح ایک جگہ جمع ہوئے ہیں اور بلاشبہ اس سے زیادہ باعث مسرت اور کیا ہو سکتا تھا، لیکن افسوس ہے کہ جس غرض کو لیکر ہم لوگ یہاں آئے ہیں وہ صد درجہ افسوسناک ہے۔ کیا آپ نے کبھی غور کیا ہے؟ ہندوستان کے طول و عرض میں غالباً ہماری ہی ایک جماعت ایسی ہے جو صحیح معنی میں امن پسند شہری کہلائی جا سکتی ہے اور ہمارا ہی ایک گروہ ایسا ہے جس کی طرف سے کبھی حکومت کو فساد و سرکشی کا اندیشہ پیدا نہیں ہوا لیکن افسوس ہے کہ حکومت نے اس حقیقت کو بالکل نظر انداز کر دیا اور افیون نوشی کے انسداد کے سلسلے میں اس امر پر غور نہیں کیا کہ اس طرح ہندوستان کی اس تنہا جماعت کو برباد کر رہی ہے جو ہزاروں سال سے یکساں طور پر اپنی متانت و سنجیدگی، حلم و بردباری، امن جوئی و صلح پسندی ایثار و رواداری کی قدیم روایات کو لئے ہوئے نہ صرف تہذیب کا اصلی نمونہ پیش کر رہی ہے، بلکہ خود حکومت کے لئے بھی مادی فلاح کے غیر معمولی اسباب پیدا کرنے میں استخوان پشت کا کام دے رہی ہے۔ یقیناً یہ سوال غور طلب ہے کہ حکومت ہند نے کیوں اپنے کروڑوں روپیہ سالانہ کی آمدنی کی پرواہ نہ کرکے ایسا عزم کیا اور وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر اپنے ملک میں بسنے والی آبادی کے ایک حصہ کو پامال کرنیکا قصد کر لیا۔ میں اپنے ذاتی گہرے مطالعہ سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ بظاہر بعید از قیاس معلوم ہوگا لیکن حقیقت حقیقت ہے خواہ کسی کا ذہن قبول کرے یا نہ کرے۔

بعض کا گمان ہے کہ حکومت کا یہ طرز عمل ہماری اصلاح کے خیال پر مبنی ہے اور ہندوستان کی ان جماعتوں کے اصرار کا نتیجہ ہے جو لفنگے پن ذرا میں افیون کے استعمال کو صحت کے لئے مضر اور قوت عمل کے لئے نقصان رساں سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک یہ حسن ظن سے زیادہ نہیں ہے، کیونکہ اول تو یہی ثابت کرنا ممکن ہے کہ افیون صحت کیلئے مضر ہے اور قوت عمل کو مفقود کر دیتی ہے اور اگر بفرض محال اسے درست سمجھ لیا جائے تو میں پوچھونگا کہ کیا برطانیہ کی تاریخ حکومت اس وقت تک کوئی ایسا واقعہ پیش کر سکتی ہے جس میں اس نے صرف رعایا کے مفاد پر اپنی مادی منفعت کو قربان کر دیا ہو (نہیں نہیں کبھی نہیں) پھر اگر ماضی اس کا جواب نفی میں دیتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل اسے اثبات کی صورت میں پیش کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مسئلہ کا تعلق اندرونی اصلاح سے نہیں ہے بلکہ یہ وابستہ ہے بیرونی سیاست سے اور اس کا مدعا یہ ہے کہ اگر آج حکومت چند کروڑ روپیہ سالانہ کا نقصان برداشت کر رہی ہے تو کل اسے اس سے دو چند سہ چند ملنے کی توقع رکھتی ہے۔ میں اس مسئلہ کو واضح طور پر سمجھانے کے لئے آپ حضرات کی توجہ چین کی طرف منعطف کراؤنگا، اس حقیقت سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں چین ہی ایک ایسا ملک ہے جو بودھ ہونے سے زیادہ افیونی مذہب رکھنے کا مدعی ہو سکتا ہے، وہاں اس تریاق کا استعمال بچے کی گھٹی سے شروع ہوتا ہے اور نزع کے وقت تک ساتھ دیتا ہے، وہاں کی کوئی صحبت مذہبی ہو یا سیاسی، ادبی ہو یا علمی، اقتصادی ہو یا صنعتی، اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس مبارک چیز کی نام پر اس کا افتتاح نہ ہوا ہو، پھر چونکہ چین اپنی کثرت آبادی کے لحاظ سے بھی (جو یقیناً نتیجہ ہے استعمال افیون کا) تمام ممالک سے بڑھا ہوا ہے، اس لئے خود وہاں کی کاشت ان کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی اور یہ فخر ہندوستان ہی کو حاصل تھا کہ وہ اپنے پڑوسی ملک کی اس اہم ضرورت کو پورا کرتا تھا، اس کے متعلق مجھے زیادہ تفصیل سے کام لینے کی ضرورت نہیں دنیا اس حقیقت سے آگاہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا حکومت افیون کی برآمد چین کو اس لئے کرتی تھی کہ اہل چین کو اس کی ضرورت ہے نہیں، بلکہ صرف اس بنا پر کہ اس طرح حکومت ہند کروروں روپیہ چین کا حاصل کر لیتی ہے، آپ لوگوں کو واقعہ یاد ہوگا جبکہ اب سے چند سال قبل چین نے ہندوستان سے افیون لینے کا

خیال ترک کرنا چاہا تو حکومت ہند نے جنگ کی دھمکی دی، اور آخر کار اسے مجبور ہو کر یہ سودا قایم رکھنا پڑا۔

پس یہ سوال ذرا پیچیدہ ہے کہ جب اب سے قبل حکومت ہند یا چین دہاں افیون بھیجنے پر بھی مُصر تھی تو اب اُن کی اس قدر مخالف کیوں ہو گئی ہے کہ سرے سے اس کی کاشت و تجارت ہی ممنوع قرار دیری ہے میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس کا تعلق بھی چین ہی سے ہے وہاں کی موجودہ سیاسیات جس قدر پیچیدہ ہو رہی ہے کسی سے مخفی نہیں، یورپ کا ہر ملک کوشش کر رہا ہے کہ وہاں کی بدامنی و بیچینی سے فائدہ اٹھا کر اپنا اقتدار قایم کرے اور اس کے لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے پر آمادہ ہے، اور ایک ملک یا قوم کو مجبور و عاجز کرنے کی بہترین تدبیر سوائے اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے اسباب حیات کو اس پر تنگ کر دیا جائے، تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے قلعوں کا جب محاصرہ کیا جاتا ہے تو اس کا مقصود صرف یہی ہوتا ہے کہ ضروریات زندگی اہل قلعہ کو نہ مل سکیں اور آخر کار وہ مجبور ہو کر ہتھیار ڈالدیں۔ پس حکومت ہند کا یہ فیصلہ کہ ہم افیون کی کاشت و تجارت رفتہ رفتہ دس سال کے اندر بند کر دینگے اور سنہ ۳۶ء آخری سال ہوگا جب افیون کی برآمد تجارتی نقطۂ نظر سے کیجائے گی، حقیقتاً اہل چین کے محاصرہ کا اعلان ہے اور دوسرے لفظوں میں گویا انپر یہ ظاہر کرنا ہے کہ چونکہ تم ہمارے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے اس لئے ہم بھی افیون کو تم پر حرام کئے دیتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ کس طرح تم بغیر ہماری مدد کے زندہ رہ سکتے ہو! کوئی مانے یا نہ مانے لیکن میرے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہے کہ چین کو اس دس سال کی مہلت میں یقیناً اپنا طرز عمل بدلنا پڑیگا اور اسے مجبور ہو جانا پڑیگا کہ وہ برطانیہ کی سیادت کو تسلیم کرے پھر آپ دیکھیں گے کہ نہ حکومت ہند کو اصلاح کا خیال رہیگا، اور نہ ملک کی صدائے احتجاج کا، وہی کھیت ہونگے اور کوکنار کے زرد زرد پھول، وہی کلکتہ ہوگا اور افیون کے معطر صندوقوں کا نیلام۔

لیکن اس وقت تک کہ ایسا ہو، ہمیں کیا کرنا چاہیئے، اسی پر غور کرنے کے لئے آپ حضرات کو دعوت دی گئی ہے تاکہ تمام مراحل کو سمجھکر ایک صحیح لائحہ عمل مرتب کیا جائے اور اپنے بقاء حیات کے مسئلہ کو صرف حکومت کے رحم پر نہ چھوڑا جائے۔

آخر میں، میں جناب صدر و دیگر شرکائے کانفرنس کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے تکلیف فرما کر میری دعوت کو قبول کرنے کی زحمت گوارا کی اور دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے ہماری کوششیں جلد بار آور ہوں اور ہم دنیا کے اس کلیہ کو غلط ثابت کر سکیں کہ افیون کا استعمال صحت کے لئے مضر ہے۔

اس کے بعد جناب صدر کی تقریر ہوئی جو تقریباً اسی کے خیالات پر مشتمل تھی لیکن بعض بعض باتیں نئی بھی اس میں پائی جاتی تھیں مثلاً بعض حقایق کا اظہار اس طرح کیا کہ:-

(۱) دنیا میں کوئی اہم کام اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک افیون کا استعمال نہ کیا جائے اور کانگریس کی ناکامیابی کا سبب یہی ہے کہ اس نے اس طرف توجہ نہیں کی، اگر چرخہ کاتنے کی بجائے اس کو ضروری قرار دیا جاتا تو اب تک کبھی کا سوراج مل گیا ہوتا۔

(۲) دنیا میں جتنے بڑے بڑے شاعر، فلاسفر اور مصلح و فاتح گزرے ہیں وہ سب یا تو افیون پیتے تھے یا چانڈو کا استعمال کرتے تھے، چنانچہ ہومر، سعدی فردوسی، ارسطو، افلاطون، نپولین، سکندر اعظم وغیرہ سب افیون کا استعمال کرتے تھے۔

(۳) کوئی افیونی کسی وبائی امراض میں مبتلا نہیں ہوتا اور عمر طبیعی سے پہلے کبھی اس کی موت نہیں آتی اسی طرح سانپ کے زہر کا بھی اُس پر اثر نہیں ہوتا۔

(۴) کوکنار ہی ایک ایسا درخت ہے جس کی ہر چیز (پھول، چھال، گوند) کارآمد ہے جس کی مدد سے بڑے بڑے شدید امراض دور کئے جاتے ہیں۔

صاحب صدر کی تقریر کے بعد رزولیوشن پیش ہوئے، اور مختصر تقریروں کے ساتھ باتفاق انہیں منظور کیا گیا۔ تجاویز یہ تھیں کہ:-

(۱) ایک وفد چین کو بھیجا جائے اور وہاں کے ارباب فکر کو توجہ دلائی جائے کہ وہ حکومت ہند کو اس طرف متوجہ کریں اور اس مسئلہ کو بین الاقوامی قرار دیکر حکومت ہند کے اس فیصلہ کو ناجائز قرار دیں۔

(۲) ایک وفد حضور وائسرائے کی خدمت میں حاضر ہوکر حکومت ہند کے اس فیصلہ کی ناعاقبت اندیشی پر توجہ دلائے

(۳) ہر ضلع میں ایک کمیٹی مرتب کی جائے جس کا تعلق صدر مقام لکھنؤ سے ہو اور ہر جگہ سے ہفتہ وار جلسہ مقرر کرکے صدائے احتجاج بلند کیجائے۔

(۴) کانفرنس ایک روزانہ اخبار جاری کرے اور اس کے ذریعہ سے ہندوستان اور غیر ممالک کی پبلک کی ہمدردی اس مسئلہ میں حاصل کی جائے۔

(۵) ہندوستان کے ہر ہر مقام میں مبلغین بھیجے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہر گاؤں میں کم از کم ایک "افیون خانہ" قائم ہو جائے، اسی کے ساتھ کاشتکاروں کو بھی بتایا جائے، کہ ان کے اوپر حکومت کس قدر ظلم کر رہی ہے اور ان میں قومی احساس پیدا کرکے ان کو بھی آمادہ کیا جائے کہ اپنی کانفرنس قائم کرکے حکومت کو متوجہ کریں۔

(۶) اخبار افیون کے دفتر سے متعلق ایک تجربہ گاہ قائم کی جائے، جس میں جدید آلات و جدید فن کیمیا کی مدد سے افیون کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے فوائد سے کتابوں، رسالوں، اور اشتہاروں کے ذریعہ سے لوگوں کو مطلع کیا جائے۔

- - - - - - - - - -

ان کے علاوہ ایک اور آخری تجویز نہایت اہتمام سے پیش ہونیوالی تھی اور محرک اٹھکر کچھ کہنا چاہتے تھے کہ دفعتہً وہ اونگھ کر گر پڑے اور اس آواز سے جو میری آنکھ کھلی، تو سخت تعجب ہوا کیونکہ آفتاب بلند ہو چکا تھا، آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سورج نکلنے سے پہلے میں بیدار نہ ہو جاتا ہوں مگر چونکہ رات دیر تک جاگا تھا اور اسی مسئلہ افیون ہی کے متعلق مختلف اخباروں کی رائے دیکھتا رہا، دیکھتے دیکھتے وقت زیادہ گزر گیا تھا، اس لئے نیند پوری نہ ہوئی اور سخت افسوس ہوا جب گھر میں جاکر دیکھا کہ چاء بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔!

استفسارات

عیسیٰ علیہ السلام

(جناب عزیز۔ پنڈی گھیب)

"استفسارات" کے عنوان کے ماتحت آپ کا جواب متعلقہ حیات و ممات مسیح علیہ السلام نظر سے گذرا، اصولی طور پر مجھے اس سے بہت کچھ اختلاف ہے اور جو دلائل آپنے بیان فرمائے ہیں وہ بہت کچھ محل تعرض ہیں، لیکن اس بحث کو کسی فرصت پر اٹھا رکھا گیا ہے، اور اس وقت آپسے صرف ذیل کی آیت کے متعلق استفسار کرنا ہے۔

قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یہلک المسیح ابن مریم و امہ ومن فی الارض جمیعا وللہ ملک السموات والارض وما بینہما یخلق ما یشاء واللہ علی کل شیءٍ قدیر (۶۔ مائدہ) اس آیت میں قرآن حکیم مسیح کے الوہیت کے بطلان کی ایک وجہ یہ فرماتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مسیح بن مریم، مریم اور تمام اہل دنیا کو ہلاک کر دے تو انہیں اس سے کون بچا سکتا ہے، اب اگر مسیح بن مریم اور مریم کو زندہ نہ تسلیم کیا جائے، تو استدلال غلط ہے کیونکہ ثبوت الشئے للشئے یستدعی وجود الموضوع لہ اور یہاں مسیح اور مریم چونکہ موضوع ہیں اس لئے انکے وجود کا ہونا ضروری ہے، جب ہلاکت کا ثبوت ان کیلئے قرار دیا جائیگا، لیکن آپ سرے سے جب انکی زندگی کے ہی قائل نہیں تو ان کے لئے ہلاکت کیسی، اور مرے ہوئے کو مارنے کے کیا معنی۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ ہاں تو مسیح کے ساتھ اس کی ماں بھی زندہ تسلیم کرنی پڑتی ہے، جو کہ اہل سنت سے کسی کا بھی مذہب نہیں، سواسکے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر آیت سے اصولاً میرے استدلال میں کوئی غلطی نہیں تو اس آیت کا جواب جس طرح میرے ذمہ ہے اسی طرح آپکے ذمہ بھی ہے اسلئے خواہ مخواہ قبل از وقت میں اسکی جوابدہی اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہوں۔

من فی الارض سے ممکن ہے کہ مرزائی جماعت کی طرح آپ بھی وہ لوگ سمجھیں جو مسیح کے وقت میں پائے جاتے تھے، لیکن آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسا سمجھنا سخت غلطی ہے کیونکہ اگر اوپر ذکر کردہ قاعدہ درست ہے کہ ثبوت الشئے للشئے یستدعی وجود الموضوع لہ، اور من فی الارض جو موضوع ہے تو کس طرح من فی الارض سے وہ لوگ مراد لئے جاسکتے ہیں جو مسیح کے زمانہ میں پائے جاتے تھے، اس لئے کہ اس آیت کے نزول کے وقت ان لوگوں میں سے کوئی بھی موجود نہ تھا، تو ضرور ہے کہ من فی الارض سے اسوقت کے لوگ مراد ہیں جو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے، لیکن مجھے ڈر ہے کوئی نہ کہدے۔ کہ اب بھی تو وہ لوگ جو آیت کے نزول کے وقت موجود تھے موجود نہیں، لیکن ایسا کہنا بھی ایک دوسری سخت غلطی ہے، کیونکہ ذکر کردہ قاعدہ یہ چاہتا ہے کہ من فی الارض

سے وہ لوگ مراد ہوں جو اس آیت کی تلاوت کے وقت دنیا میں پائے جائیں، اس لئے ہر زمانہ کے لوگ اس آیت کے مصداق سمجھے جاتے رہے اور ہوتے رہیں گے جب موضوع کی ایک جزو کا وجود از روئے قاعدہ تسلیم کرنا پڑا تو اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ اس کے باقی دو اجزا کا وجود بھی تسلیم کیا جائے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہاں وجود سے آپ منطقی وجود نہ مراد لے لیں، بلکہ یہاں وجود بمعنی زندگی ہے کیونکہ مقام مہلک ہلاکت بمعنی موت ہے اور ضروری ہے کہ ہلاکت یعنی موت کا ورود اسی چیز پر ہو جو کہ اسکی اہل ہو، اور وہ بمعنی زندگی ہے نہ کہ وجود منطقی۔

یہاں اسی قسم کا ایک اور حربہ جو آپ نے قال کیف نکلم من کان فی المہد صبیا میں استعمال فرمایا ہے آپ خیال فرماسکتے ہیں کہ آیۂ مذکورہ میں لفظ کان مراد ہے جو کہ ماضی کا صیغہ ہے، لیکن اگر آپ اس پر غور فرمائیں گے کہ قرآن حکیم بطریق استدلال یہ کہہ رہا ہے کہ مسیح کی الوہیت باطل ہے کیونکہ اگر ہم اسے مع اس کی ماں کے ہلاک کر دیں تو اسے کون ہم سے بچا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے معنی یہ لئے جائیں کہ اگر ہم اسے ہلاک کر دیتے تو اسے کون بچا سکتا، تو پھر آپ ہی کہدیں کہ یہ کتنا کچھ مضحکہ خیز ہوگا۔

مسیح مر چکا، اسکی ماں بھی مر چکی، من فی الارض بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے، لیکن ابھی تک اللہ میاں کہے جا رہے ہیں کہ اگر ہم ان کو ہلاک کر دیتے، تو انکو ہم سے کون بچا سکتا۔ ممکن ہے آپ یہ فرمائیں کہ جب مسیح کا نزول حسب عقیدہ اہل السنت والجماعۃ ہوگا اور وہ اپنی مدت حیات کے بعد انتقال فرما گئے تو اس وقت اس آیت کے کیا معنی ہوں گے۔ ؟

سو عرض یہ ہے کہ اگر مسیح کا نزول حسب عقیدہ اہل سنت ہوا اور وہ مدت حیات بسر کر کے چل بسے تو اس وقت تو ساری دنیا کے سامنے ہوگا کہ ان کی حیات و ممات معمولی انسانوں کی طرح ہے اور وہ یقیناً انسان ہیں، غضب تو یہی ہے کہ انکو مرتے کسی نے نہیں دیکھا، اور لوگوں میں مختلف قسم کے شبہات پیدا ہوگئے۔ اسوقت نہ کوئی اس کی الوہیت کا قائل ہوگا، اور نہ قرآن کی یہ آیت بطور استدلال پیش کی جائے گی۔

(نگار) مجھے مسرت ہوئی کہ آپ نے اس مسئلہ میں اہل علم و تحقیق کی طرح گفتگو کی اور دیگر مخالفین مذہب کے مثل صرف مجھے کافر، ملحد، بیدین، مرتد وغیرہ کہنے کو کافی نہیں سمجھا، آپ یاد رکھئے کہ میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ جذبۂ پندار اپنے اندر نہیں پاتا کہ جو کچھ میں کہتا ہوں حقیقتاً وہی صحیح ہے بلکہ جو کچھ میری سمجھ میں آتا ہے اور جس حد تک میں ایک بات کو اپنے نزدیک صحیح و درست سمجھتا ہوں (حالانکہ میں کیا اور میری سمجھ کیا) عرض کر دیتا ہوں میری دلی تمنا ہے کہ اگر کسی مسئلہ میں میں غلطی پر ہوں تو کوئی صاحب اس کی صحت فرمادیں اور اگر میں گمراہی و ضلالت میں مبتلا ہوں تو کوئی بزرگ مجھے اس سے باہر نکالیں، لیکن مجبور کر کے نہیں بلکہ دل میں کیفیت مطمئنہ پیدا کر کے۔

میرا یہ اعتقاد ہے اور کبھی میں اس اعتقاد سے منحرف نہیں ہو سکتا کہ اسلام فطری مذہب ہے اور اس کی کوئی تعلیم، کوئی عقیدہ ایسا نہیں ہے جو خلاف عقل یا اصول قدرت کے منافی ہو، اسی کے ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی کر جائے، علوم خواہ کتنے ہی وسیع و عمیق ہو جائیں لیکن اسلام کبھی خارج المعیار نہیں ہو سکتا۔

وہ حضرات جن کی نگاہیں تنگ ہیں اور جن کے ہاں اسلام کا مفہوم صرف تقلید آب و جد و کورانہ اتباع سلف ہے وہ یا تو صرف تکفیر کو کافی جواب سمجھتے ہیں یا ایک ہمارے مہربان قاضی صاحب کی طرح (جواب میرے نام کو سن کر غصہ سے کانپ کانپ اٹھتے ہیں اور ہر نماز کے بعد مجھے گالیاں دینا اُن کے بہترین اوراد میں سے ہے) یہ کہہ کر کہ "جب عطار و مولانا روم ایسا کہہ گئے ہیں تو یہ کیا ان سے زیادہ لائق ہے جو اس کی بات کو تسلیم کیا جائے" اپنے نزدیک گویا ہفتخوان رستم طے فرما لیتے ہیں، حالانکہ یہ غریب اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ عطار و مولانا روم نے جو کچھ کہا ہے اُس کا مدعا کیا ہے اور اُس سے عوام میں کس کیفیت کا پیدا کرنا مقصود ہے مجھے ایسے حضرات پر ہنسی آتی ہے کہ میں تو کلام مجید کی آیتیں پیش کر کے اُن سے بحث کرتا ہوں اور وہ اسکے جواب میں عطار و منصور کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں ؎　　حریفان زہ دیر گردند گم بد نویں اہم ثم دیل اہم

اسلام اگر کوئی محدود مذہب ہے اور وہ صرف انھیں لوگوں میں پایا جا سکتا ہے جو پشتہا پشت سے مسلمان چلے آرہے ہیں اور اُس میں کوئی تبلیغی شان موجود نہیں تو یہ مذہب سوائے میرے سب کو مبارک ہو، لیکن اگر حقیقت اس کے خلاف ہے یعنی اسلام تمام اقوام عالم پر پیش کیا جا سکتا ہے تو پھر ہر عہد زمانہ کے عقول و افکار کے مطابق اس پر بحث ہونی چاہئیے اور اس کے عقائد کو مجموعہ عجائب و غرائب سمجھ کر اس پر کوئی پردہ بھی نہ ڈالنا چاہئیے جس کا اٹھانا غیر کے لئے ممنوع ہو، بہرحال میرے نزدیک تحقیق کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور کلام پاک اور اس کی تعلیمات سے بحث کرنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے، اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو آپ اس کی اصلاح تو کر سکتے ہیں لیکن ملعون و کافر کہہ کر اُس کو خاموش نہیں کر سکتے، کیونکہ اس سے زیادہ تنگ نظری ایک مذہب کی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

آپ کے ایراد کے سلسلہ میں اس قدر گفتگو شاید بے محل نظر آئے، لیکن چونکہ حیات و ممات مسیح کے مسئلہ میں بعض ایسی تحریریں بھی موصول ہوئی ہیں جن کا جواب میں صرف یہی دے سکتا تھا، اس لئے میں تحریر کے اس قدر حصہ کو ان کے لئے وقف کر کے آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

آپ کے اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسیح کو زندہ نہ تسلیم کیا جائے تو پھر سورہ مائدہ کی اس آیت کا کیا مفہوم ہوگا جسے آپ نے نقل کیا ہے، اس کے جواب کی ایک الزامی صورت تو یہ ہے کہ اس آیت کے جو معنی آپ نے کئے ہیں اُن کو آپ ہی کے بیان کے مطابق غلط ثابت کر دیا جائے، اور دوسرا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح مفہوم پیش کر کے آپ کے اعتراض کو دفع کر دیا جائے۔ سورہ مائدہ کی اس آیت کو میں پھر اس جگہ لکھتا ہوں:-

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئاً ان اراد ان یھلک المسیح ابن مریم و امہ و من فی الارض جمیعا

آپ کے ارشاد کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہوا کہ:- "وہ لوگ کافر ہیں جو کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم خدا ہیں، اُن سے کہہ دو کہ کون روک سکتا ہے اللہ کو اگر وہ ارادہ کرے مسیح، اُن کی ماں اور تمام ان لوگوں کی ہلاکت کا جو زمین میں پائے جاتے ہیں" اس مفہوم کی بناء پر یقیناً یہ ماننا پڑیگا کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی ہے کم از کم اس وقت ضرور مسیح کو زندہ تسلیم کر لیا جاتا تھا اور وہ حقیقتاً زندہ تھے جیسا کہ خود کلام مجید سے ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اس مفہوم کو صحیح سمجھنے کے بعد جو سب سے بڑا اعتراض آپ پر وارد ہوتا ہے یہ ہے کہ کلام مجید سے تو مسیح کے ساتھ اُن کی ماں کا بھی زندہ رہنا پایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں، آپ نے خود اس شبہ کو لکھا ہے لیکن آپ اس کی جوابدہی اپنے ذمہ نہیں لیتے حالانکہ جب آپ نے آیت کا یہ مفہوم لیا ہے تو جواب بھی آپ ہی کو دینا چاہئیے نہ کہ مجھے جو اس کا مفہوم یہ قرار نہیں دیتا۔

اسی کے ساتھ یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر آپ کا بتایا ہوا مفہوم درست ہو تو پھر خدا کو بطلان الوہیت مسیح کے ثبوت میں ساری دنیا کے ہلاک کر سکنے کی

سے انکار کیوں کیا، جب کہ آپ کے عقیدے کے مطابق مسیح کے حیات کا مسئلہ دیگر انسانوں کی حیات سے اپنی نوعیت میں بالکل علیحدہ چیز ہے! اور جبکہ خدا نے واقعی اس زمانہ کے سارے آدمیوں کو اسی وقت ہلاک کر کے اس کو ثابت بھی نہیں کیا، الغرض اس آیت میں مسیح کی ماں اور من فی الارض کا ذکر آپ کے عقیدہ مفہوم کے مطابق بالکل بیکار معلوم ہوتا ہے۔ پھر جب آیت کے یہ معنی لینے میں کھلے ہوئے نقائص نظر آتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اسکا مفہوم کچھ اور ہوگا اور یقیناً ہے۔ آپ نے یقیناً اس پر بھی کبھی غور کیا ہوگا کہ عربی میں لفظ ان کن کن معنے میں آتا ہے اور غالباً یہ بھی آپ کے علم میں ہوگا کہ لفظ ان کے معنی عربی زبان میں اگر کے علاوہ جب کے بھی آتے ہیں، اور میرے نزدیک یہاں یہی معنی ہیں، اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا " وہ لوگ کافر ہیں جو مسیح کو خدا کہتے ہیں، ان سے کہو کہ کون روک سکتا تھا اللہ کو جب اس نے ارادہ کیا مسیح، اس کی ماں اور ان لوگوں کی ہلاکت کا جو زمین میں تھے" یعنی وہ لوگ جو مسیح کو خدا کہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اب تک وہ زندہ ہیں، اتنا نہیں سمجھتے کہ خدا کو مسیح کے ہلاکت سے کون روک سکتا تھا، بالفاظ دیگر اس کا مفہوم یوں بھی ادا ہو سکتا ہے۔ " تم لوگ مسیح کو خدا اور زندہ سمجھتے ہو حالانکہ خدا نے صرف مسیح کو بلکہ ان کی ماں کو اور ان تمام لوگوں کو جو اس وقت پائے جاتے تھے ہلاک کر چکا ہے" مسیح کے بعد امہ اور من فی الارض کے ذکر سے گویا وفات مسیح کو اور یقینی طور پر ثابت کیا گیا ہے۔ یعنی جس طرح تم مسیح کی ماں اور اس وقت کے تمام لوگوں کی ہلاکت سے انکار نہیں کر سکتے، اسی طرح مسیح کی وفات کو بھی یقینی سمجھنا چاہیے۔ اسی سورہ مائدہ میں آگے چل کر بطلان الوہیت مسیح کے متعلق اور بھی آیتیں ہیں اور انہیں میں سے ایک آیت یہ بھی ہے:۔

" ما المسیح ابن مریم الا رسول۔ قد خلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقۃ کانا یاکلن الطعام "

" یعنی مسیح ابن مریم تو صرف ایک رسول تھا اور اس طرح کے اور بہت سے رسول اس سے پہلے گزر چکے ہیں، اور اس کی ماں پاکباز تھی اور وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے " اس آیت میں قد خلت من قبلہ الرسل سے نمایاں طور پر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس طرح اور بہت سے رسول پہلے آئے اور فنا ہو گئے اسی طرح مسیح بھی آئے اور اپنی عمر ختم کر کے چلے گئے ورنہ قد خلت من قبلہ الرسل کہنے کی کیا ضرورت تھی، یاکلن الطعام کہکر اس کو اور زیادہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جس مسیح کو تم کہتے ہو کہ خدا تھا اور اب تک زندہ ہے، اس کا تو یہ حال تھا کہ معمولی آدمیوں کی طرح بقاء حیات کے لئے کھانا کھانے پر بھی مجبور تھا، یعنی چونکہ اس کا طریق زندگی یا وسیلہ بقاء حیات عام انسانوں سے مختلف نہ تھا، اس لئے عام انسانوں کی طرح اس کی وفات بھی ہونی اور ہو چکی چاہیے تھی، اگر یاکلن الطعام کے ذکر سے اس مفہوم کو علیحدہ کر دیا جائیگا تو یہ فقرہ سیاق و سباق سے بالکل بے تعلق ہو جائیگا اور کلام الہی کو حشو و زوائد سے پاک ہونا چاہیے! میں ممنون ہوں کہ آپ نے سورہ مائدہ کی اس آیت کا ذکر کر کے مجھے گویا موقع دیا کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک دلیل اور پیش کر سکوں جسے میں پہلی مرتبہ نظر انداز کر گیا تھا

پردہ

(جناب م م صاحب۔ بھوپال)

" پردہ کے متعلق جناب کے کیا خیالات ہیں۔ بذریعہ نگار مطلع فرمائیے ممنون ہونگا "

نگار بک ایجنسی

تصانیف علیاحضرت فرمانروائے بھوپال

نام کتاب	قیمت
سبیل الجنان:- مذہبی و عالمانہ تقریرون کا بے مثل مجموعہ خواتین ہند کے لیے عجیب و غریب نعمت ہی	عہ ۴/
سیرتِ مصطفےٰ - سیرتِ رسولؐ کے متعلق بیمثل کتاب نہایت مستند روایات پر	عہ/
عفت المسلمات - پردہ کے مسئلہ پر اس سے بہتر کوئی کتاب اسوقت تک شایع نہین ہوئی جسمین مشرق و غرب کے تمام علمار کے آرا کا نچوڑ ہے -	عہ/
اخلاقی سلسلہ - اس مین اکابر و بزرگانِ اسلام کے تاریخی واقعات یکجا کرکے مکمل درس اخلاق دیا گیا ہی بچون عورتون اور مردون کے مطالعہ کے لیے بے مثل مجموعہ ہے قیمت چارون حصون کی حسب ترتیب ۸/ ۸/ ۱۴/	۱۲/
مہذب زندگی - اخلاقی سلسلہ کا پانچوان حصہ	عہ/
تربیت اطفال - عورتون کے لیے بے مثل کتاب	۸/
مقصد ازدواج - نکاح کے پر تمدن و معاشرت نقطۂ نظر سے بے مثل محاکمہ	۸/
حفظ صحت - خواتین کو اسکا مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے -	۱۳/
تندرستی - اس کتاب کا بھی ہر گھر مین رہنا ضروری ہے	عہ/
درس حیات - اخلاق و آداب کے پیرائے مین فرائض لوجی کے تمام ضروری مسائل مع متعدد تصاویر - دوم	سے ۴/
اسلام اور عورت - اس کتاب کا مطالعہ ہر خاتون پر فرض ہے	۴/

نام کتاب	قیمت
معیشت و معاشرت - یہ دونون کتابین اس پایہ کی ہین کہ اگر عورتین ان کا مطالعہ کرلین تو پھر امور خانہ داری کے متعلق کوئی بات اُنسے فروگزاشت نہین ہوسکتی بیمثل کتاب ہے اور ہر گھر کے لیے ضروری ہے - عہ	عہ ۱۲/
تہذیب النسوان - یہ کتاب بھی امور خانہ داری کے متعلق ہے اور نواب شاہجہان بیگم خلد مکان کی بہترین تصنیف خیال کی جاتی ہے -	عہ ۶/
بچون کی پرورش - اس کتاب کی خوبی و اہمیت نام ہی سے ظاہر ہے اسمین ۱۱۰ مضامین ہین بچون کے متعلق ابتدائے حمل سے لیکر آن کی نشو و نما تک کے حالات امراض و علاج وغیرہ نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کیے گئے ہین -	عہ ۸/
ہندوستانی گھرون مین تیمارداری جسمین نقشہ شامل ہین	عہ/
فرائض باغبانی ہدایا باغبانی - یہ دون ہر متمدن خاندان کے لیے ضروری ہین -	عہ ۵/
باغ عجیب - تین حصون مین مع تصاویر بچون کے لیے اخلاقی سبق دلچسپ قصون کی صورت مین نہایت دلچسپ کتاب ہے - ۹/ ۸/	۵/
ہدیۃ الزوجین - نکاح کے پہلے اور اس کے بعد ہر مرد اور عورت کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ہی ضروری ہے -	۸/

تصانیف جناب میمونہ سلطان بانو بیگم صاحبہ

سیرت ... - سیرت النبی سے متعلق بے مثل کتاب ہے د،

خلافت راشدہ - اسکا موضوع نام سے ظاہر ہے بچون کے لیے اس سے بہتر کتاب اس موضوع پر نہین لکھی گئی ... ۴،

سلک مروارید - اکابر اسلام کے دلچسپ تاریخی واقعات ہم مضمون ... ۸

گل و ریحان - بچون کے لیے نہایت دلچسپ اور مفید کہانیان ۸

فرائض مادری - نام ہی سے اسکی خوبی ظاہر ہے ... ۱۲

سیاحت سلطانی بیگم صاحبہ بھوپال کے سفر ... کے نہایت حالات ... قیمت قسم اعلیٰ عہ قسم دوم ...

فرائض النساء - فرائض خانہ داری پر بے مثل کتاب - ہر ... مین اس کتاب کا ہونا ضروری ہے ....

عجائبات قدرت - سائنس کے مسائل نہایت ... زبان مین بچون کے لیے ....

دیگر مصنفین

جہان آرا بنت شاہجہان کی سوانح عمری - اگر آپ عہد مغلیہ کی خواتین کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتے ہین تو اس کتاب کو ضرور ملاحظہ کیجیے بے انتہا دلچسپ و سبق آموز ہے .... قیمت ۱

تذکرہ حضرت بلھے شاہ - پنجاب مین کوئی شخص ایسا نہین ہے جو بلھے شاہ سے واقف نہ ہو - آپ سترھوین صدی کے نہایت مشہور بزرگ تھے - اور آپکے حالات ناپید تھے اب نہایت مستند ذرایع سے فراہم کرکے یکجا کیے ہین اور آپکی شاعری پر بھی مفصل تنقید کی گئی ہے ..... قیمت ۸

نمکدان فصاحت - فارسی، عربی، اردو کے بہترین علمی، تاریخی، ادبی لطائف اس کتاب مین کوئی لطیفہ ذوق صحیح سے گرا ہوا نہین ہے عہ

لسان الغیب - حافظ شیرازی کی مکمل سوانح عمری اور انکے دیوان شرح و حل دیکھنا چاہتے ہین تو لسان الغیب کی دونون جلدین طلب فرما... جلد اول مع مکمل سوانح عمری ۴۳۰ صفحات ۲، جلد دوم ۴۶۰ صفحات قیمت ...

کاس الکرام - یعنی عمر خیام کے مفصل حالات زندگی اور اسکی رباعیات کی مکمل شرح - تمام ارباب سخن کی رائے ہے کہ اردو مین اس موضوع پر اس سے زیادہ مکمل و مبسوط کتاب ابتک شایع نہین ہوئی ضخامت ۴۰۰ صفحات قیمت ...

بندگی - امام ابن تیمیہ کی مشہور عالم کتاب "العبودیت" کا اردو ترجمہ حقایق دینی و عقائد اسلامی اور تصوف کے صحیح مفہوم سے بحث کر کے فیصلہ کیا گیا ہے - ضخامت ۱۴۰ صفحات قیمت ..... عہ

تصانیف مسٹر جی بخش پرسنل سکریٹری حضور سرکار عالیہ

جواہر ریزے :- اونی ریشمی کپڑون کے دھونے اور داغ دھبہ دور کرنے کی ترکیبین صنعت و حرفت کے بہت سے مجرب نسخے

منٹنگ :- موزہ بنیائن اور بیلین بننے کی ترکیبین مع متعدد تصاویر کے .... اول عہ دوم ۱۲

سیر یورپ :- ہزہائنس نازنین بیگم جنجرہ کا بے مثل سفرنامہ یورپ مع متعدد تصاویر کے ....

مطبوعہ مقبول المطابع نظیر آباد لکھنؤ — مینجر "نگار" بھوپال — باہتمام سید مقبول حسین وصل بلگرامی